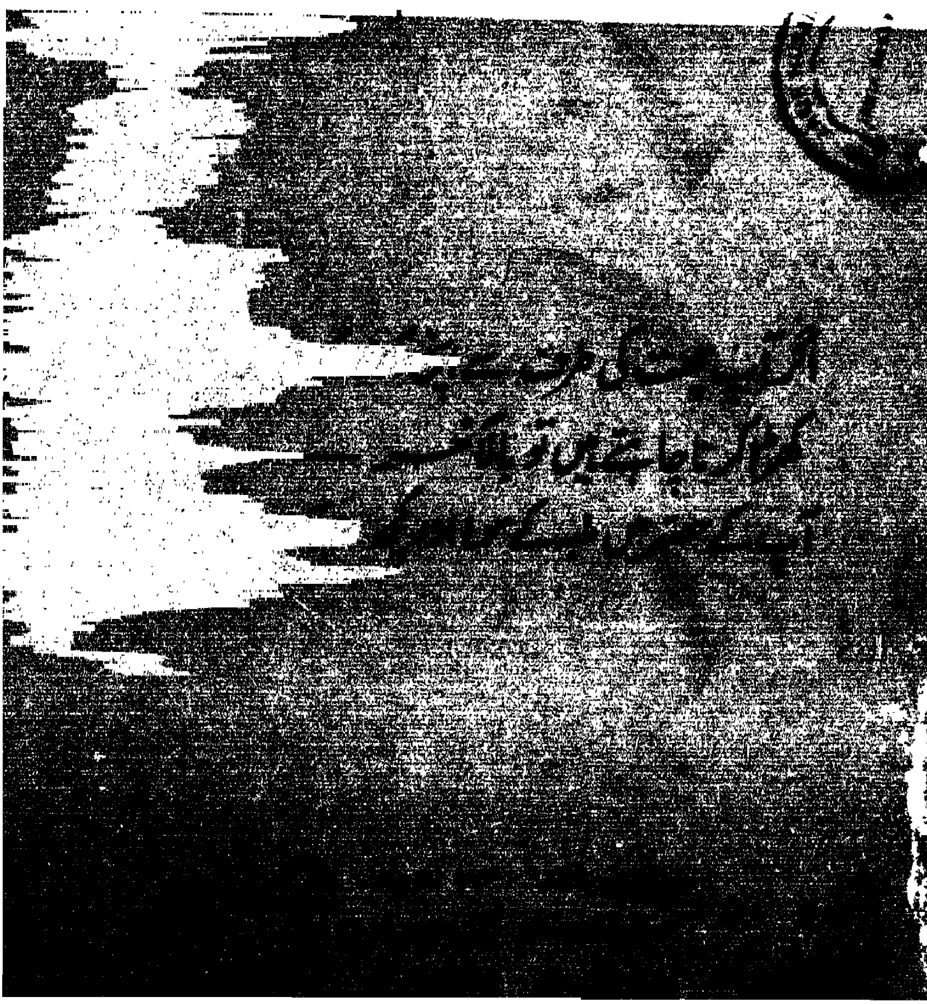
الرسالہ

سرپرست

مولانا وحید الدین خاں



آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے
براہ کرم اپنا زرتعاون روانہ فرمائیں

الرسالہ

جنوری ۱۹۸۱
شمارہ ۵۰

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دہلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اجتماع

ماہنامہ الرسالہ جس دینی اور تعمیری مقصد کے لئے جاری کیا گیا ہے وہ اب خدا کے فضل سے ایک تحریک بن چکا ہے۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ اب اس تحریک کو تنظیم کی صورت دے دی جائے۔ چنانچہ اس کے پہلے اجتماع کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اس اجتماع میں الرسالہ کی تحریک سے ہمدردی رکھنے والوں کو شرکت کی دعوت دی جائے گی اور اس موقع پر انشاء اللہ اس کام کو مزید مؤثر اور منظم بنانے کی بابت فیصلے کئے جائیںگے۔

اجتماع کے مقام، تاریخ اور دوسری تفصیلات کی بابت عنقریب اعلان کیا جائے گا۔ اجتماع میں شرکت کرنے والوں کو اپنا خرچ خود برداشت کرنا ہوگا۔ جو لوگ شرکت کا ارادہ رکھتے ہوں وہ براہ کرم بذریعہ خط مطلع فرمائیں تاکہ شرکا کی تعداد کا پیشگی اندازہ کیا جا سکے۔

ادارہ الرسالہ

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی Al-Risala Monthly لکھیں

یہ بھی ممکن ہے

بیٹے نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ماں کو مارا۔ ماں نے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معاملہ جو بظاہر مار کا معاملہ تھا اس کو ماں نے محبت کا معاملہ بنادیا۔ اس نے "برائی" کو "بھلائی" کے خانہ میں ڈال دیا۔ اس نے ایک قابل سزا چیز کو قابل انعام چیز قرار دے دیا۔ یہ واقعہ جو ہر گھر میں گزرتا ہے، یہ خدا کی صفات کمال میں سے ایک صفت کی ہلکی سی جھلک ہے جو ماں کے رویہ کی صورت میں دکھائی گئی ہے۔ یہ خدا کی ایک نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی رحمتوں کے کیسے عجیب نمونے اس دنیا میں بکھیر دئے ہیں۔ شفقت کی یہ انوکھی قسم جو ماں کے اندر پائی جاتی ہے اس کو ماں نے خلق نہیں کیا ہے۔ اس کا خالق اللہ ہے۔ پھر جو اس کا خالق ہے اس کے اندر یہ صفت کمال درجہ میں پائی جانی چاہئے۔

آدمی غیب کو نہیں جانتا، اس بنا پر اس کو دنیا کی زندگی میں طرح طرح کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی قوت ارادی کمزور ہے، اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی سطحی جذبہ سے مغلوب ہو جاتا ہے اور بڑی بڑی غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔ آدمی کے وسائل محدود ہیں، اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ باہر کے اسباب و عوامل پر وہ قابو نہیں پاتا اور شکست کھا جاتا ہے۔ اس قسم کی چیزوں نے دنیا میں انسان کی زندگی کو ایک المیہ بنا دیا ہے۔ زمین پر چلنے والا ہر آدمی خواہ وہ کوٹھی میں ہو یا جھونپڑی میں، اس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ ایک ناکام انسان ہے، وہ جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا اس کو وہ حاصل نہ کرسکا۔ یہاں کا ہر انسان ایک مایوس انسان ہے، خواہ بظاہر وہ فربہ جسم اور ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

کیا اس المیہ کو طربیہ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی کی منزل پر ہم اس حال میں پہنچیں کہ ہماری ناکامیاں کامیابیوں کی صورت اختیار کر چکی ہوں، ہمارے قصور کو انعام کے خانہ میں ڈال دیا گیا ہو۔ ماں کی زندگی میں خدا نے اپنی صفات کی جو ایک جھلک دکھائی ہے وہ اسی سوال کا ایک مثبت جواب ہے۔ خدا اپنے بندوں کے لئے اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر اس واقعہ کو رونما کرسکتا ہے جو ماں اپنے بچہ کے لئے بہت چھوٹے پیمانہ پر ظاہر کرتی ہے۔ ماں کے رویہ کی صورت میں خدا نے دنیا میں جو نشانی قائم کی ہے وہ اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ مانگنے والے کو یہ انعام بھی دیتا ہے کہ — وہ اس کے "نہیں" کو "ہے" میں تبدیل کر دے۔ مگر ایسا انعام صرف اس شخص کے لئے مقدر ہے جو خدا کو اپنی "ماں" کا درجہ دے کر اپنے آپ کو اس کا "بیٹا" بنا چکا ہو۔

عقل سے کام نہ لینا

ایک شخص پردیس میں ہے۔ اس کے پاس گھر سے تار آتا ہے کہ لڑکا سخت بیمار ہے، فوراً آجاؤ۔ تار کو پڑھتے ہی وہ تڑپ اٹھے گا اور خواہ اس کے پاس سفر نہ کرنے کے کتنے ہی عذر ہوں وہ تمام عذرات کو نظر انداز کر کے وطن کے لئے روانہ ہو جائے گا۔ وہ اپنے آرام کو چھوڑے گا، اپنے مال کو خرچ کرے گا، اپنے معاشی فائدہ کو خطرہ میں ڈالے گا۔ غرض ہر دوسری چیز کو ثانوی اہمیت دے کر جلد سے جلد اپنے بیٹے کے پاس پہنچے گا۔ وہ اپنے گھر سے آئے ہوئے پیغام کی لازماً پیروی کرے گا، خواہ اس کی وجہ سے اس کو تمام دوسرے تقاضے چھوڑ دینے پڑیں۔

مگر اسی شخص کے پاس ایک اور پیغام آتا ہے۔ یہ خدا کا پیغام ہے۔ اس پیغام میں بھی ایک بلاوا ہے۔ اس میں بھی اس کو کسی چیز کی طرف پکارا گیا ہے۔ مگر وہ اس کو پڑھ کر بے قرار نہیں ہوتا۔ وہ اس کا ساتھ دینے کے لئے نہیں اٹھتا۔ وہ طرح طرح کے سوالات میں الجھ کر اس کی طرف بڑھنے سے رک جاتا ہے — اس پیغام کو لانے والا تو ایک معمولی آدمی ہے، اکابر میں سے کسی کا اس کے اوپر دستخط نہیں۔ اس پیغام کو قبول کرنے میں بہت سے مفادات اور مصالح مجروح ہوتے ہیں۔ اگر میں اس کو مان لوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میری اب تک کی ساری زندگی غلط تھی۔ غرض گروہی عصبیت، مصلحت اندیشی، عزت نفس اور "میں" کا سوال اس کو اس پیغام کی طرف جانے سے روک دیتا ہے۔ کوئی سرے سے انکار کر دیتا ہے، کوئی اس کی صداقت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک "مگر" لگا کر اپنے لئے جائز کر لیتا ہے کہ وہ اس کے لئے نہ اٹھے، وہ اس کا ساتھ نہ دے۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: اور نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ایمان لائے مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے (یونس ۱۰۰) خدا نے عقل اسی لئے دی ہے کہ جو بات عقل سے صحیح ثابت ہو اس کو فوراً مان لیا جائے۔ مگر جب آدمی عقل کی پیروی نہیں کرتا تو وہ خواہشات کا پیرو بن جاتا ہے اور خواہش آدمی کو بربادی کے سوا اور کہیں نہیں لے جاتی۔

امتحان کی اس دنیا میں آدمی کے سامنے ہمیشہ دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک بات جب واضح دلائل سے ثابت ہو رہی ہو تو اس کو مان لیا جائے۔ دلائل کے سامنے آنے کے بعد کسی دوسری چیز کو اہمیت نہ دی جائے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ آدمی دلائل پر ٹھہرنے اور سوچنے کے لئے تیار نہ ہو، اس کے بجائے

اس کا ذہن دوسری دوسری سمتوں میں کام کرنے لگے۔ وہ اس میں غیر ضروری موشگافیاں پیدا کرے۔ وہ دنیوی مفادات اور گروہی مصلحتوں کو اہمیت دینے لگے۔ یہ دیکھے کہ بات اپنے ذوق کے مطابق ہے یا اپنے ذوق کے خلاف۔ یہ احساس اس کو مغلوب کرے کہ اگر میں نے اس کو مان لیا تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا، وغیرہ۔ ان دونوں راستوں میں سے پہلا راستہ عقل کا راستہ ہے اور دوسرا راستہ گندگی کا راستہ۔ جب کوئی شخص خدا کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتا تو گویا وہ شیطان کو اپنے اندر گھسنے کا موقع دے رہا ہے۔ ایسے شخص کو شیطان اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے۔ وہ دلائل سے ثابت شدہ بات کو اس کی نظر میں گھٹاتا ہے اور دوسری دوسری باتوں کو اسے اہم بنا کر دکھاتا ہے۔ شیطان اپنی تمام گندگیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو فطرت کے سیدھے راستہ سے ہٹا کر خود اپنے بنائے ہوئے ٹیڑھے راستوں میں بھٹکا دیتا ہے۔

خدا کی طرف سے ہدایت کی توفیق اسی شخص کو ملتی ہے جو خدا کے تخلیقی ڈھانچہ کی پیروی کرے۔ خدا کا تخلیقی ڈھانچہ کیا ہے۔ خدا نے ہر آدمی کے اندر ضمیر رکھ دیا ہے جو ہر معاملہ کے وقت اندر سے اشارہ کرتا رہتا ہے کہ کون سا راستہ فطرت کے مطابق ہے اور کون سا فطرت کے خلاف۔ اب خدا کے تخلیقی ڈھانچہ کی پیروی یہ ہوگی کہ جس چیز کے بارے میں آدمی کے ضمیر کے اندر کھٹک پیدا ہو اس کو وہ چھوڑ دے اور جس چیز پر اس کا ضمیر مطمئن ہو اس کو پکڑ لے۔ اسی طرح ہر آدمی کے اندر عقل ہے جو اس بات کو سمجھنے کی خداداد صلاحیت رکھتی ہے کہ کیا چیز ثابت شدہ ہے اور کیا چیز ہے جس کے حق میں کوئی حقیقی ثبوت نہیں۔ اب خدا کے تخلیقی ڈھانچہ کی پیروی یہ ہوگی کہ آدمی ثابت ہونے والی بات کو لے لے اور جس بات کے حق میں ثبوت نہیں ہے اس کو چھوڑ دے۔ اسی طرح ہمارے گرد و پیش خدا کی ایک پوری دنیا ہے جو کامل درجہ صحت کے ساتھ چل رہی ہے۔ جب بھی ہم کسی معاملہ میں کوئی رویہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کائنات کا نظام خاموش زبان میں بتاتا ہے کہ یہ رویہ اس کے مقررہ نظام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اب خدا کے تخلیقی ڈھانچہ کی پیروی یہ ہوگی کہ آدمی جس رویہ کو خدا کی وسیع تر کائنات کے مطابق پائے اس کو اختیار کرے اور جو رویہ اس کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دے۔

قرآن اسی حق پرستانہ زندگی کو پانے اور اس پر چلنے کے لئے ایک رہنما کتاب ہے۔ قرآن کارخانۂ عالم کی گائڈ بک ہے۔ اگر آدمی سنجیدہ ہو اور فطرت کی آواز پر دھیان دینے کے لئے تیار ہو تو وہ اس کتاب کی رہنمائی میں ضرور حقیقت کو پالے گا۔ اور جب آدمی سنجیدہ نہ ہو تو الفاظ کی زبان اس پر کام نہیں کرتی۔ ایسا شخص تو اسی وقت جاگتا ہے جب کہ حقیقت پردہ پھاڑ کر عیاناً اس کے سامنے آجائے۔

یہ انسان!

حضرت مسیح کے وعظوں میں سے ایک وعظ میں داعی اور مدعو کی تمثیل ہے۔ یہاں ہم اس تمثیل کا عربی اور اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں:

ویمن اُشبّہ ھٰذا الجیل۔ یُشبِہ اولاداً جالسین فی الاسواق ینادون الی اصحابھم ویقولون: زمّرنا لکم فما رقصتم وندبنا لکم فما بکیتم (متی ۱۱: ۱۶)

پس اس زمانہ کے لوگوں کو میں کس سے تشبیہ دوں وہ ان لڑکوں کی مانند ہیں جو بازاروں میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہتے ہیں۔ ہم نے تمھارے لئے بانسری بجائی اور تم نہ ناچے۔ ہم نے ماتم کیا اور تم نہیں روئے

خدا کا داعی خدا کے سمندر میں نہاتا ہے۔ اس طرح اس کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کے گیت گائے۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کے ابدی نغمے چھیڑے۔ ان نغمات میں ایک طرف خدا کے حسن و کمال کی تجلیاں ہوتی ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو سن کر آدمی رقص کر اٹھے۔ دوسری طرف ان نغمات میں خدا کی پکڑ کی تنبیہات ہوتی ہیں جو ایک حساس انسان کو تڑپا کر اسے رلا دیں۔ داعی خدا کے جمال و جلال کا مظہر ہوتا ہے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ ان چیزوں سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ داعی کے کلام کی صورت میں خدا بالکل اس کے قریب آجاتا ہے۔ مگر اس وقت بھی وہ خدا کو نہیں پاتا۔ اس میں نہ حمد خداوندی کی کیفیات جاگتیں اور نہ خوف خدا سے اس کی آنکھیں تر ہوتیں۔ وہ نازک ترین پیغامات کو بھی پتھر کی طرح سنتا ہے نہ کہ اس انسان کی طرح جس کو خدا نے وہ عقل دی ہے جو باتوں کی گہرائی کو پالے اور وہ دل دیا ہے جو درد سے تڑپ اٹھے۔

خدا کی طرف سے ایک پکارنے والے کا وجود میں آنا کسی مشین پر بجنے والے ریکارڈ کا وجود میں آنا نہیں ہے۔ یہ روح انسانی میں ایک ایسے انقلاب کا برپا ہوتا ہے جس کی شدت آتش فشاں پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ داعی کا بولنا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر لانا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اپنے خون کو سیاہی بنانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس کے نغمے محض نغمے نہیں ہوتے بلکہ روح انسانی میں ایک خدائی بھونچال کی آواز ہوتے ہیں۔ مگر اس دنیا کا شاید یہ سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے کہ ایسے ربانی کلمات بھی انسان کو متاثر نہیں کرتے۔ داعی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے "نذیر عریاں" بن جاتا ہے، اس کے باوجود وہ اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔ انسان کے سامنے جنت کی کھڑکیاں کھولی جاتی ہیں پھر بھی وہ وجد میں نہیں آتا۔ اس کو بھڑکتے ہوئے جہنم کا نقشہ دکھایا جاتا ہے پھر بھی اس پر گریہ طاری نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے خدا خود آکر کھڑا ہو جاتا ہے پھر بھی وہ سجدہ میں نہیں گرتا۔ انسان سے زیادہ نازک مخلوق خدا نے کوئی نہیں بنائی مگر انسان سے زیادہ بے حسی کا ثبوت بھی کوئی نہیں دیتا۔

شیر کا سبق

جم کاربٹ (Jim Corbett) شیر کے مطالعہ کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے نام پر ہندوستان میں حیوانات کا ایک پارک بنا ہوا ہے۔ جم کاربٹ نے لکھا ہے کہ کوئی شیر کسی آدمی پر اس وقت تک حملہ نہیں کرتا جب تک کہ اس کو اپنی طرف سے کوئی کارروائی کر کے بھڑکا نہ دیا جائے:

No tiger attacks a human being unless proveked

جو لوگ جنگل کے علاقوں میں رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کبھی ان کا سابقہ شیر سے پڑ جائے تو اس میں خطرہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ شیر اپنا راستہ چلتا ہوا گزر جائے گا بشرطیکہ اس کو چھیڑا نہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان دشمن جانور نہیں۔ شیر کے لئے "مردم خور" کا لفظ صرف اتفاقی معنی میں صحیح ہے۔ شیر پیدائشی طور پر مردم خور نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض نادان انسانوں کی کارروائیاں کسی شیر کو مردم خور بنا دیتی ہیں۔ کسی شیر کو مردم خور بنانے والے اکثر وہ غیر ماہر شکاری ہوتے ہیں جو کافی تیقن کے بغیر شیر کے اوپر اپنا کارتوس خالی کر دیتے ہیں۔ وہ شیر مارنے کے شوق میں شیر پر گولی چلاتے ہیں۔ مگر کافی مہارت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی گولی صحیح نشانہ پر نہیں پڑتی اور اچٹتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ شیر معمولی طور پر زخمی ہو جاتا ہے مگر وہ مرتا نہیں۔ اس قسم کا زخم خوردہ شیر انسان کا دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی انسانی صورت کو دیکھتا ہے اس کو اپنا دشمن سمجھ لیتا ہے اور اس پر حملہ کر کے اسے ختم کر دیتا ہے۔ یہی حال اکثر درندہ جانوروں کا ہے۔

اس مثال میں ہمارے لئے دو بہت بڑے سبق ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کو ہمیشگی طور پر اپنا "دشمن" سمجھ لینا درست نہیں۔ حتیٰ کہ ایک درندہ صفت انسان کو بھی نہیں۔ کوئی شخص اسی سے دشمنانہ معاملہ کرتا ہے جس کو وہ اپنا دشمن سمجھ لے۔ اگر ہم اپنے کو دشمن ظاہر نہ کریں تو دوسرا بھی ہم سے دشمن کا سلوک نہیں کرے گا۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ ناکافی تیاری کے بغیر کبھی کسی کے خلاف کارروائی نہیں کرنا چاہئے۔ اگر آپ اپنے حریف پر ایسے اقدامات کریں جو کافی تیاری کے بغیر کئے گئے ہوں اور اس بنا پر وہ فیصلہ کن نہ بن سکیں تو ایسا اقدام آپ کے حریف کو پہلے سے زیادہ مشتعل کر کے آپ کے مسئلہ کو اور زیادہ سنگین بنا دے گا۔

ہر شخص خود اپنے اندرونی تقاضے کے تحت اپنی ضرورتوں کی تکمیل میں مشغول رہتا ہے اور اگر ضرورتیں پوری ہو جائیں تو ہوس کی تکمیل میں۔ یہ ایک قدرتی انتظام ہے جو لوگوں کو ایک دوسرے سے روکے رہتا ہے۔ آپ دوسرے کو نہ چھیڑئے اور آپ دوسرے کے ظلم سے محفوظ رہیں گے۔ کیوں کہ یہاں ہر ایک اپنے آپ میں اتنا مشغول ہے کہ اس کو دوسرے کے خلاف سوچنے کی فرصت نہیں۔

غلطی مان لینے سے

ایک پریس نے ایک مرتبہ ایک بڑے ادارہ کی کتاب چھاپی۔ کتاب کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ کتاب جب چھپ کر اور مکمل ہو کر ادارہ میں پہنچی تو اس کے بعد ادارہ کے منیجر کا ٹیلی فون آیا۔ وہ کہہ رہا تھا "آپ فوراً یہاں آکر مجھ سے ملئے" پریس کا مالک پہنچا تو ادارہ کا منیجر اس کے اوپر برس پڑا۔ اس نے مطبوعہ کتاب کے چند نسخے دکھاتے ہوئے کہا "یہ دیکھئے، اس کی کٹنگ کتنی غلط ہوئی ہے"۔ پریس کے مالک نے دیکھا تو واقعی کٹنگ ترچھی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ایک طرف کا کونا زیادہ نکلا ہوا تھا۔ پریس کے مالک نے دیکھا اور خاموش رہا۔ دوسری طرف ادارہ کا منیجر مسلسل بگڑے چلا جا رہا تھا آخر جب وہ اپنے تمام الفاظ ختم کر چکا تو پریس کے مالک نے سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں نقصان تو ہمارا ہوا ہے، ہم کو پریشان ہونا چاہئے۔"

"کیا مطلب، آپ کا نقصان کیسا"

"ظاہر ہے کہ اس حالت میں میں آپ کو کتاب نہیں دے سکتا۔ اس کو تو میں واپس لے جاؤں گا اور دوبارہ آپ کو دوسری کتاب چھاپ کر دوں گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ خواہ مجھے کتنا ہی نقصان ہو مگر مجھے آپ کو صحیح کام دینا ہے"

پریس کے مالک کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ ادارہ کے منیجر کا لہجہ یکایک بدل گیا۔ وہی شخص جو پہلے بگڑے ہوئے انداز میں بول رہا تھا اب اس کا رویہ ہمدردانہ ہو گیا۔ کیونکہ پریس والے نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ ادارہ کے منیجر کو عام رواج کے مطابق اس کی امید نہیں تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ نہ صرف اپنی غلطی مان رہا ہے بلکہ اس کی پوری تلافی کرنے کے لئے تیار ہے تو اس کا متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔

"نہیں آپ اتنا نقصان کیوں برداشت کریں" اس نے اپنا انداز بدلتے ہوئے کہا۔ جب پریس کے مالک نے دیکھا کہ منیجر کا دل نرم پڑ چکا ہے تو اس نے منیجر سے کہا: ایک شکل سمجھ میں آتی ہے۔ آپ مجھے چند کتابیں دے دیجئے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ اگر کامیابی ہو گئی تو دوبارہ چھپوانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ منیجر نے کہا: بڑے شوق سے، آپ ضرور کوشش کیجئے۔ اس کے بعد پریس کا مالک کتاب کے دس نسخے لے کر واپس آگیا۔ اس نے اچھی مشین میں احتیاط سے کٹا کر کتاب کے چاروں کونے دوبارہ صحیح کرائے۔ اب پریس کا مالک اس کو لے کر ادارہ کے منیجر کے پاس گیا۔ منیجر اس کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے کہا، بالکل ٹھیک ہے، اسی طرح آپ سب کتابیں درست کرا دیجئے۔

"گاہک کی نظر میں جو غلطی ایک انچ کی ہوتی ہے اس کو میں ایک فٹ کے برابر ماننے کے لئے تیار رہتا ہوں" پریس کے مالک نے کہا "یہ درحقیقت کسی کاروبار میں کامیابی کے لئے بے حد اہم ہے۔ گاہک کو مطمئن کر کے آپ گاہک کو ہر چیز پر راضی کر سکتے ہیں۔" "بلکہ میرا تو یہ حال ہے،" پریس کے مالک نے مزید کہا "کہ اگر میرے کام میں غلطی ہو گئی ہے اور وہ میری نظر میں آجاتی ہے تو میں خود ہی گاہک کو بتا دیتا ہوں کہ مجھ سے فلاں غلطی ہو گئی ہے۔ اب تلافی کی جو شکل بتاؤ، میں اس کے لئے تیار رہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گاہک کو ہمدردی ہو جاتی ہے۔ اور بغیر کسی ناخوش گواری کے معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

تنگی میں وسعت

ایک آدمی نے شہر میں عینک کی دکان کھولی۔ عینک بیچنے والوں کو اپنے گاہکوں کی سہولت کے لئے آنکھ کے ٹسٹ کا انتظام بھی کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ آدمی ایک ہی جگہ اپنی آنکھوں کی جانچ کرائے اور وہیں سے عینک بھی لے لے۔ مگر اس آدمی کی دکان ٹسٹ کی ضرورت کے لئے چھوٹی تھی۔ آنکھ کے ٹسٹ میں دور کی نگاہ جانچنے کے لئے اصولاً ۱۸ فٹ کے فاصلہ سے پڑھوایا جاتا ہے، جب کہ اس دکان میں صرف اس کے نصف کے بقدر گنجائش تھی۔ یعنی گاہک کو بٹھانے کی جگہ سے لے کر دیوار تک کا فاصلہ بمشکل ۹ فٹ بنتا تھا۔

"نو فٹ کو شیشہ لگا کر اٹھارہ فٹ کرلیں گے" دکان دار نے اپنے دوست کے سوال کے جواب میں کہا۔ دوست نے اس سے پوچھا تھا کہ تم اتنی چھوٹی دکان میں آنکھوں کے ٹسٹ کا انتظام کیسے کروگے۔ دکان دار نے بتایا کہ پڑھانے والے حروف کا چارٹ جس دیوار پر لٹکا ہو، اس کے بالکل سامنے دوسری دیوار پر اگر آئینہ لگا دیا جائے اور ٹسٹ کرانے والے کو اصل چارٹ کے بجائے آئینہ کے عکس میں پڑھوایا جائے تو پڑھنے والے شخص اور پڑھی جانے والی چیز کے درمیان کا فاصلہ خود بخود دگنا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی نگاہ پہلے ۹ فٹ کا فاصلہ طے کر کے آئینہ کو دیکھتی ہے۔ پھر آئینہ کی مدد سے اس کی نگاہ مزید ۹ فٹ کا فاصلہ طے کر کے چارٹ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح کل اٹھارہ فٹ ہو جاتے ہیں۔ دکان دار نے ایسا ہی کیا۔ چھوٹی دکان کے باوجود اس کے یہاں آنکھوں کے ٹسٹ کا ویسا ہی انتظام ہو گیا جیسا بڑی دکانوں میں ہوتا ہے۔

یہی اصول زندگی کے ہر معاملہ میں چسپاں ہوتا ہے۔ آپ کے مواقع اگر کم ہوں، آپ کے لئے پھیلنے کا دائرہ تنگ ہو تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی عقل کو استعمال کر کے اپنے "نو فٹ" کو "اٹھارہ فٹ" بنا سکتے ہیں۔ آپ کا مکان چھوٹا ہو تو دو منزلہ بنا کر اس کو وسیع کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس سرمایہ کم ہو تو دیانت داری کا ثبوت دے کر اس کی تلافی کر سکتے ہیں۔ آپ کی ڈگری چھوٹی ہو تو خوش اخلاقی کے ذریعہ اس کو زیادہ کارآمد بنا سکتے ہیں۔ لڑکر آپ کے لئے جیتنے کے مواقع نہیں ہیں تو حکمت کا طریقہ اختیار کر کے اپنے حریف کو قابو میں لا سکتے ہیں۔ سیاسی اقتدار میں آپ کو کم حصہ ملا ہے تو اقتصادی میدان میں ترقی کر کے اپنے آپ کو آگے لے جا سکتے ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے اگر آپ اقلیت میں ہیں تو اتحاد اور تنظیم میں اضافہ کر کے آپ اکثریت کی برابری کر سکتے ہیں۔

ہر چھوٹی "دکان" بڑی دکان بن سکتی ہے۔ کوئی دکان اسی وقت تک چھوٹی ہے جب تک دکان دار نے اس کو بڑھانے والی حکمت کو استعمال نہ کیا ہو۔ بڑھانے والی حکمت کو استعمال کرنے کے بعد اس دنیا میں کوئی دکان چھوٹی دکان نہیں۔

سب سے بڑی ضمانت

لارڈ ولیم وینٹنگ انیسویں صدی کے ربع ثانی (۱۸۲۸-۱۸۳۵) میں ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔ انھوں نے ایک بار حکم دے دیا تھا کہ تاج محل کو گرا دیا جائے مگر عملاً وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کا انکشاف ۷ فروری ۱۹۰۰ کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے کیا تھا۔ لارڈ کرزن نے کلکتہ کے ایک جلسہ عام میں کہا کہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی تھی۔ کمپنی کو اقتصادی بحران سے نکالنے کے لئے سابق برطانوی گورنر جنرل (لارڈ وینٹنگ) نے چاہا کہ تاج محل کے سنگ مرمر کو فروخت کر دیں۔ اس سے ان کو اس زمانہ میں ایک لاکھ روپیہ حاصل ہونے کی امید تھی۔ جب یہ خبر پھیلی تو لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ اب لارڈ وینٹنگ بگڑ گئے اور انھوں نے غصہ میں آکر یہ حکم دیا کہ تاج محل کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا جائے۔ ان کے اس حکم کے بعد عوام کی مخالفت اور زیادہ بڑھ گئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر شدید احتجاج کیا۔ حتیٰ کہ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اگر تاج محل کو گرایا گیا تو عوامی بغاوت پیدا ہو جائے گی۔ لارڈ وینٹنگ کے مشیروں نے ان کو صورت حال کی نزاکت بتائی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا حکم واپس لے لیا (نو بھارت ٹائمز ۱۸ جون ۱۹۶۹)

"تاج محل کو عوام نے نہیں بچایا" اس خبر کو پڑھ کر ایک شخص نے کہا "بلکہ تاج محل کو اس کے اپنے حسن نے بچایا۔ تاج اگر اتنا حسین نہ ہوتا تو برطانوی اقتدار کے مقابلہ میں اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی اتنی بڑی حمایت حاصل نہیں ہو سکتی تھی"

عمارت کا یہی انجام اس کے معماروں کے لئے بھی مقدر تھا۔ مگر افسوس کہ معمار اپنے اندر وہ "حسن" پیدا نہ کر سکے جو انھوں نے سنگ مرمر کے خاموش مجموعہ میں اپنی مہارت سے پیدا کر دیا تھا۔

آدمی کے اندر کوئی خوبی ہو تو یہ خوبی ہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہوتی ہے۔ وہ دشمنوں میں بھی اپنے دوست پا لیتا ہے۔ اغیار کی صفوں میں بھی اس کو اپنے قدرداں مل جاتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی کے اندر کوئی واقعی خوبی ہو، اس کے باوجود دنیا میں اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔

تاہم اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کا یہ حسن سانپ کا حسن نہ ہو۔ ایک سانپ خواہ وہ کتنا ہی حسین ہو آدمی اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جس آدمی کا حال یہ ہو کہ اس کے اندر ایک خوبی تو ہو مگر اسی کے ساتھ اس کی زبان میں "ڈنک" ہو، وہ لوگوں کے سیاسی اور معاشی مفادات کو چیلنج کرنے لگے، وہ لوگوں کے ساتھ تعلقات میں بار بار جارحیت پر اتر آتا ہو، وہ اپنی جذباتی کارروائیوں سے لوگوں کو اپنا مخالف بنا لے۔ ایسا آدمی خواہ وہ کتنا ہی زیادہ خوبیوں والا ہو، لوگوں کا محبوب نہیں بن سکتا۔

تاج محل لوگوں کا محبوب اسی وقت بنتا ہے جب کہ وہ خاموش حسن میں ڈھل جائے۔ اگر وہ جارح حسن کا نمونہ ہو تو ایسے تاج محل کو کوئی نہیں بخشے گا۔

آسانی ہمیشہ مشکلوں کے بعد آتی ہے

گرمیوں کے موسم میں گرد و غبار سے بھری ہوئی آندھی جب اٹھتی ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصیبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر روس کے ماہرین موسمیات نے قراقرم کے ریگستانوں میں تحقیقات کے بعد بتایا ہے کہ گرد بھری ہوئی آندھیاں زمین پر موسم کی سختی کو کنٹرول کرنے کا ایک قدرتی ذریعہ ہیں۔ جب آندھیاں چلتی ہیں تو ان کی وجہ سے گرد اٹھ کر اوپر چھا جاتی ہے اور فضا میں ایک غلاف کی صورت بنا لیتی ہے۔ اس طرح یہ آندھیاں زمین کی سطح کو گرمی کی تپش سے محفوظ رکھتی ہیں۔ روسی سائنس دانوں نے مختلف آلات اور جہازوں کا استعمال کرکے آندھیوں کی خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سخت گرمی کے دنوں میں بھی ریگستان کی تپتی ہوئی سطح اس وقت ٹھنڈی ہو جاتی ہے جب گرد سے بھری ہوئی آندھیاں چلنا شروع ہوتی ہیں۔ گرد کے یہ سایہ دار بادل محدود فضا میں بھی چھا سکتے ہیں اور کافی دور تک بھی، جیسے عرب سے جنوبی امریکا تک اور وسط ایشیا سے بحر آرکٹک تک۔

قدرت کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ ہر مفید واقعہ کسی پُرمشقت عمل کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ یہ ایک سبق ہے جو بتاتا ہے کہ ہم جب اپنی زندگی کے بارے میں کوئی منصوبہ بنائیں تو اس حقیقت کو بھی ضرور سامنے رکھیں کہ مطلوبہ نتیجہ کو حاصل کرنے کے لئے ہم کو جدوجہد کے پُرمشقت دور سے گزرنا ہوگا۔ موجودہ دنیا کو اس کے بنانے والے نے اسی ڈھنگ پر بنایا ہے۔ اور اس سے مطابقت کرکے ہی ہم کوئی مفید نتیجہ برآمد کر سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ ہم کو "آندھی" کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور اس کے بغیر ہی ہمارے سروں پر ٹھنڈا بادل سایہ کرے تو ایسے نتیجہ کو پانے کے لئے ہمیں دوسری کائنات بنانی پڑے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر حالات میں ناکامی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی فوراً کامیابی چاہتا ہے۔ "مختصر راستہ" کا لفظ سڑکوں اور پگڈنڈیوں کی دنیا کے لئے صحیح ہے مگر زندگی کی جدوجہد میں "مختصر راستہ" کی قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ سورت میں ہیرے کی ایک دکان ہے جو دوسری منزل پر ہے۔ ایک نوجوان اس دکان میں داخل ہوا۔ اس نے ایک ہیرا چرا لیا اور اس کو لے کر باہر نکل جانا چاہا۔ مگر دکان کے آدمیوں کو شبہ ہو گیا۔ انھوں نے فوراً سیڑھی کا دروازہ بند کر دیا اور نوجوان سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ نوجوان نے دیکھا کہ سیڑھی کے راستہ سے بھاگنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ وہ تیزی سے قریب کی کھڑکی میں داخل ہوا اور وہاں سے نیچے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ بظاہر اس نے بھاگ نکلنے کے لئے چھلانگ لگائی تھی۔ مگر دوسری منزل سے جب وہ سڑک پر گرا تو اس کو اتنی سخت چوٹ آئی کہ وہ وہیں سڑک پر مر گیا (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ جنوری ۱۹۸۰) ——— "سیڑھی" کا راستہ اگر کسی کو بند نظر آئے تو وہ "کھڑکی" ——— سے چھلانگ لگا کر سڑک پر نہیں پہنچ سکتا۔ ایسی چھلانگ اس کو جہاں پہنچائے گی وہ قبر ہے نہ کہ سڑک ——— بظاہر یہ ایک احمق نوجوان کا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر بہت سے عقل مند لوگ بھی ٹھیک اسی طریقہ کو اپنی زندگی میں دہراتے ہیں اور بالآخر اسی انجام سے دوچار ہوتے ہیں جس سے مذکورہ نوجوان دوچار ہوا۔

اندر اور باہر کا فرق

اپالو۔ ۸ کے تین خلائی مسافر، ۲۷ دسمبر ۱۹۶۸ کو بحرالکاہل میں اترے تھے۔ زمین سے چاند تک کا سفر کرنے میں ان امریکی خلابازوں کو چھ دن تین گھنٹے لگے اور انھوں نے تقریباً پانچ لاکھ ۷۴ ہزار میل کا سفر طے کیا۔ ان کے سفر کا سب سے زیادہ نازک لمحہ وہ تھا جب کہ ان کا چھ ٹن وزنی جہاز ساٹھ میل کے فاصلہ سے چاند کا چکر لگا کر دوبارہ زمین کے قریب واپس پہنچا۔

امریکی راکٹ جب زمین کی بیرونی فضا میں داخل ہوا تو زمین کی کشش کی وجہ سے اس کی رفتار غیر معمولی طور پر بڑھ کر ۳۹ ہزار کیلومیٹر فی گھنٹہ ہو گئی۔ چاند کے مقابلہ میں اس کو سات گنا زیادہ قوت کشش کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔ اس غیر معمولی رفتار کی وجہ سے خلائی جہاز انتہائی خوفناک قسم کی گرمی سے دوچار ہوا۔ کرۂ فضا میں داخل ہوتے ہی خلائی جہاز ہوا کی رگڑ سے گرم ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ وہ آگ کے انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس وقت خلائی جہاز کے بیرونی حصہ کی تپش تین ہزار تین سو سنٹی گریڈ (۶ ہزار ڈگری فارن ہائٹ) تھی، جب کہ صرف سو ڈگری کی حرارت پر پانی ابلنے لگتا ہے۔

تین ہزار تین سو ڈگری سنٹی گریڈ کی حرارت میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھر اس غیر معمولی تپش میں تینوں خلائی مسافر کس طرح زندہ سلامت رہ کر واپس آ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس خلائی جہاز کے اندر وہ بند تھے، وہ خاص طور پر اس ڈھنگ سے بنایا گیا تھا کہ وہ باہر کی شدت کو اندر نہ پہنچنے دے۔ چنانچہ سخت ترین گرمی کے باوجود اس کے اندر کا درجہ حرارت ۲۱ ڈگری سنٹی گریڈ سے آگے نہیں بڑھا۔ باہر کا درجۂ حرارت تین ہزار تین سو اور اندر کا درجۂ حرارت صرف ۲۱۔

خلائی سفر کا یہ واقعہ اپنے اندر بڑا سبق رکھتا ہے۔ انسانی زندگی میں بھی بار بار ایسے سخت مرحلے آتے ہیں جب بیرونی ماحول انتہائی طور پر آپ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اس وقت حالات کی شدت سے بچنے کی صرف ایک سبیل ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنے اندرونی جذبات کو دبائیں اور اپنے احساسات پر قابو رکھتے ہوئے اس کو معتدل حالت پر قائم رکھیں۔ اگر ایسا ہو کہ آپ کے "اندر" بھی شدت کا وہی حال ہو جائے جو آپ کے "باہر" ہے تو آپ اپنے کو تباہ کر لیں گے۔ اس کے برعکس اگر اندر کی شدت باہر سے غیر متاثر رہ کر اعتدال کی حالت پر قائم رہے تو آپ باہر کی "آگ" سے محفوظ رہیں گے اور بالآخر سلامتی کے ساتھ کامیابی کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ آپ کے باہر اگر آپ کے خلاف نفرت اور بغض پایا جاتا ہو تو آپ اس نفرت اور بغض کو اپنے اندر داخل نہ کریں۔ بلکہ اپنے کو قابو میں رکھ کر اپنے اندر محبت اور درگزر کے جذبات کی پرورش کریں۔ باہر کی دنیا آپ کے ساتھ برائی کا معاملہ کرے تو آپ بھلائی کی صورت میں اس کا جواب دیں۔ یہی طریقہ زندگی اور کامیابی کا طریقہ ہے۔ اگر آپ بھی ویسے ہی ہو گئے جیسا ماحول تھا تو یقیناً آپ مقابلہ کی اس دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اپنی کمیوں کو جانئے

وہ بڑھاپے کی منزل میں تھا۔ مگر اس نے شادی نہیں کی تھی، اس لئے کہ اس کو ایک آئیڈیل رفیقۂ حیات کی تلاش تھی۔ لوگوں نے پوچھا: کیا آپ کو زندگی بھر کوئی ایسی خاتون نہیں ملی جو آئیڈیل رفیقۂ حیات بن سکتی ہو۔ اس نے جواب دیا: ایک خاتون ایسی ملی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ وہ بھی اپنے لئے ایک آئیڈیل شوہر تلاش کر رہی تھی ۔۔ اور بدقسمتی سے میں اس کے معیار پر پورا نہ اتر سکا۔

لوگ عام طور پر دوسروں کی کمیوں کو جاننے کے ماہر ہوتے ہیں اس لئے ان کا کسی سے نباہ نہیں ہوتا۔ اگر آدمی اپنی کمیوں کو جان لے تو اس کو معلوم ہو کہ وہ بھی اسی بشری مقام پر ہے جہاں وہ دوسرے کو کھڑا ہوا پاتا ہے۔ اپنی کمیوں کا احساس آدمی کے اندر تواضع اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ صرف دوسروں کی کمیوں کو جانتا ہو تو اس کے اندر گھمنڈ پیدا ہوگا اور کسی سے نباہ کرنا اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی ایک آدمی میں ساری خصوصیات جمع نہیں ہوتیں۔ کسی میں کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور کسی میں کوئی خصوصیت۔ پھر جس شخص میں کوئی ایک خصوصیت ہوتی ہے اس کے اندر اسی نسبت سے کچھ اور خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جو گویا اس خصوصیت کا ضمنی نتیجہ ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص اگر بہادر ہے تو اسی نسبت سے اس کے اندر شدت ہوگی۔ ایک شخص شریف ہے تو اسی نسبت سے اس کے اندر نرمی ہوگی۔ ایک شخص حساس ہے تو اسی نسبت سے اس کے اندر غصہ ہوگا۔ ایک شخص ذہین ہے تو اسی نسبت سے اس کے اندر تنقیدی مادہ ہوگا۔ ایک شخص عملی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے تو اسی نسبت سے اس کے اندر فکری استعداد کم ہوگی۔ وغیرہ

ایسی حالت میں قابل عمل بات صرف ایک ہے۔ ہم جس شخص کے "روشن پہلو" سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں اس کے "تاریک پہلو" کو نظر انداز کریں۔ یہی واحد تدبیر ہے جس سے ہم کسی کی صلاحیتوں کو اپنے لئے کار آمد بنا سکتے ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات ہوں یا مالک اور ملازم کے تعلقات یا دکان دار اور شرکت دار کے تعلقات ہر جگہ اسی اصول کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم کو "پھول" لینا ہے تو ہم کو "کانٹے" کو بھی برداشت کرنا ہوگا۔ جس کے اندر کانٹے کی برداشت نہ ہو اس کے لئے اس دنیا میں پھول کا مالک بننا بھی مقدر نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تنہا آدمی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑا کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مطلوبہ کام کی پشت پر کئی آدمیوں کی صلاحیتیں ہوں۔ اسی ضرورت نے مشترک سرمایہ کی کمپنیوں کا تصور پیدا کیا ہے۔ لیکن کئی آدمیوں کا مل کر کسی مقصد کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے افراد میں صبر اور وسعت ظرف کا مادہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کو برداشت کریں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے سے نہ الجھیں۔ وہ ناخوش گوار باتوں کو یاد رکھنے کے بجائے ناخوش گوار باتوں کو بھلانے کی کوشش کریں۔ معیار پسندی بہت اچھی چیز ہے مگر جب معیار کا حصول ممکن نہ ہو تو حقیقت پسندی سب سے بہتر طریق عمل ہوتا ہے۔

بامقصد زندگی

ایکسپریس ٹرین پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف بھاگی چلی جارہی ہے۔ راستہ میں دونوں طرف سرسبز کھیتوں اور ڈبڈبائے ہوئے نالوں اور ندیوں کا مسلسل منظر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مگر تیز دوڑتی ہوئی ٹرین کو ان خوش نما مناظر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پستی اور بلندی، خشکی اور پانی اس کی رفتار میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتے۔ راستہ میں چھوٹے چھوٹے اسٹیشن آتے ہیں مگر وہ ان کو چھوڑتی ہوئی اس طرح بھاگی چلی جاتی ہے گویا اسے کہیں ٹھہرنا نہیں ہے۔

بامقصد زندگی کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ جس آدمی نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنا رکھا ہو، اس کی ساری توجہ اپنے مقصد پر لگ جاتی ہے، اِدھر اُدھر کے مسائل میں وہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔

بامقصد زندگی گزارنے والا آدمی ایک ایسے مسافر کی طرح ہوتا ہے جو اپنا ایک ایک لمحہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں لگا دینا چاہتا ہے۔ دنیا کے خوش نما مناظر ایسے مسافر کو لبھانے کے لئے سامنے آتے ہیں، مگر وہ ان سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ سائے اور اقامت گاہیں اس کو ٹھہرنے اور آرام کرنے کی ترغیب دیتی ہیں مگر وہ ان کو چھوڑتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ دوسری دوسری چیزوں کے تقاضے اس کا راستہ روکتے ہیں مگر وہ ہر ایک سے دامن بچاتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز اس سے ٹکراتے ہیں مگر اس کے باوجود اس کے عزم اور اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔

بامقصد آدمی کی زندگی ایک بھٹکے ہوئے آدمی کی مانند نہیں ہوتی جو سمت سفر متعین نہ ہونے کی وجہ سے کبھی ایک طرف چلنے لگتا ہے اور کبھی دوسری طرف۔ بلکہ اس کے ذہن میں راستہ اور منزل کا واضح شعور ہوتا ہے اس کے سامنے ایک متعین نشانہ ہوتا ہے۔ ایسا آدمی کیسے کہیں رک سکتا ہے۔ کیسے وہ دوسری چیزوں میں الجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کو پسند کر سکتا ہے۔ اس کو تو ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ایک متعین رخ پر بڑھنا ہے اور بڑھتے رہنا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد کو پالے، یہاں تک کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے سامنے ایک سوچا ہوا نشانہ ہو۔ جس کی صداقت پر اس کا ذہن مطمئن ہو۔ جس کے سلسلے میں اس کا ضمیر پوری طرح اس کا ساتھ دے رہا ہو، جو اس کی رگ و پے میں خون کی طرح اترا ہوا ہو۔ یہی مقصدی نشانہ کسی انسان کو جانوروں سے الگ کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ اور جس آدمی کے اندر مقصدیت آجائے اس کی زندگی لازماً ایک اور زندگی بن جائے گی۔ وہ چھوٹی چھوٹی غیر متعلق باتوں میں الجھنے کے بجائے اپنی منزل پر نظر رکھے گا۔ وہ یک سوئی کے ساتھ اپنے مقررہ نشانہ پر چلتا رہے گا یہاں تک کہ منزل پر پہنچ جائے گا۔

خود جاننا پڑتا ہے

پچاس سال پہلے دیاسلائی اور لائٹر کا رواج نہیں تھا۔ دیہات کے لوگ ایک دوسرے کے گھروں سے آگ مانگ کر اپنا چولھا گرم کیا کرتے تھے۔ اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک خاتون اپنے پڑوسی کے گھر گئیں اور پوچھا کہ کیا آگ ہے۔ پڑوسی خاتون بولیں "ہاں بہن، طاق پر رکھی ہے" یہ خاتون بڑھاپے کی وجہ سے بہت کم سنتی تھیں۔ اس بنا پر ان کے لئے اس غیر متعلق جواب کا عذر تھا۔ مگر بہت سے لوگ جن کے آنکھ اور کان پوری طرح درست ہوتے ہیں وہ بھی اکثر اس سے زیادہ مختلف ثابت نہیں ہوتے۔

جنرل جے این چودھری نے جنوری ۱۹۷۱ میں "قومی تحفظات کے مسائل" پر لکچر دیتے ہوئے کہا تھا کہ دفاع میں خبر رسانی (انٹلی جنس) کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ واقعہ سے پہلے صحیح علم ضروری ہے تاکہ دشمن کی چال کو ذمہ دار لوگ اچھی طرح سمجھیں اور جو فیصلہ کریں خوب سمجھ کر کریں۔ انٹلی جنس کی سروس کا بہتر نہ ہونا بہت خطرناک ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے انٹلی جنس کی ناکردگی کی ایک دلچسپ مثال دی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۱ میں جب ہندوستان نے گوا میں فوجی کارروائی کی تو اس کے دوران جنوبی کمان سے وائرلیس پر پوچھا گیا کہ کیا پرتگالیوں کے پاس آرمرڈ کار اور ٹینک ہیں۔ وہاں سے جواب آیا —— "ٹینک تو ٹھیک ہیں، مگر ان میں صرف پندرہ ہزار گیلن پانی کی گنجائش ہے"۔ سوال جنگی ٹینک کے بارے میں تھا اور جواب پانی کے ٹینک کے بارے میں ملا۔

کوئی اجتماعی کام اسی وقت صحیح طور پر انجام پاتا ہے جب کہ اس سے متعلق تمام لوگ اپنے حصہ کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دے رہے ہوں۔ اجتماعی کام ہمیشہ مشترک ذمہ داری پر ہوتا ہے۔ اگر ہر ایک اپنی انفرادی ذمہ داری کو ٹھیک ٹھیک ادا کر رہا ہو تو گاڑی کامیابی کے ساتھ چلتی رہے گی۔ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنے حصہ کا کام کرنے میں کوتاہی کی تو دہیں گاڑی ٹھپ ہو جائے گی کیونکہ کوئی شخص دوسرے کے حصہ کا کام نہیں کر سکتا۔

نیز یہ کہ ہر بات بتائی نہیں جا سکتی۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو متعلقہ شخص کو خود جاننا پڑتا ہے۔ ہر شخص کو اتنا ذمہ دار اور باشعور ہونا چاہئے کہ وہ بتائے بغیر یہ جان لے کہ کسی معاملہ میں اس کو کس قسم کا حصہ ادا کرنا ہے یا کسی وقت خاص میں اجتماعیت اس سے کسی چیز کا تقاضا کر رہی ہے۔ گویا ایک فوجی افسر جب اپنے ساتھی سے "ٹینک" کے بارے میں پوچھے تو ساتھی کو وضاحت کے بغیر یہ جاننا چاہئے کہ پوچھنے والا جنگی ٹینک کے بارے میں پوچھ رہا ہے نہ کہ پانی کے ٹینک کے بارے میں۔

پہلے مطالعہ کیجئے

مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵-۱۸۸۷) میرے چچازاد بھائی تھے۔ غیر معمولی ذہین ہونے کے علاوہ انھوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں مکمل قدرت رکھتے تھے۔ ان کی قدرت کلام کی صرف ایک مثال یہاں نقل کروں گا۔ ۱۹۵۰ کے لگ بھگ زمانہ کی بات ہے میرے ساتھیوں کو کسی جلسہ میں اسلامی کتابوں کا اسٹال لگانا تھا اور اس موقع پر وہاں لٹکانے کے لئے ایک انگریزی پوسٹر کی ضرورت تھی۔ اس پوسٹر کا اردو مضمون یہ تھا: اسلامی تحریک کا انقلاب انگیز لٹریچر پڑھئے اور نئی دنیا کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیجئے

یہ مضمون مختلف انگریزی اساتذہ کو ترجمہ کے لئے دیا گیا۔ مگر کسی کے ترجمہ میں اردو فقرہ کا زور نہ آسکا۔ آخر میں نے مولانا اقبال احمد سہیل سے کہا کہ آپ اس کا ترجمہ کر دیں۔ انھوں نے جو ترجمہ کیا وہ فوراً پسند کر لیا گیا اور اس کا پوسٹر بنا دیا گیا۔ ان کے ترجمہ کے الفاظ یہ تھے:

Go through the revolutionizing literature of the Islamic movement and play your part in building of a new world

تاہم مولانا موصوف کی تمام بہترین صلاحیتیں شاعری اور وکالت کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ ایک بار میں نے مولانا سے کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں شاعری میں کہتے ہیں۔ یہ نثر کا زمانہ ہے۔ اگر آپ نثر میں کوئی کتاب تیار کر دیں تو زیادہ بہتر ہو۔ انھوں نے جواب دیا تم صحیح کہتے ہو، مگر نثر میں کوئی جان دار چیز لکھنے کے لئے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مطالعہ کے بغیر اگر میں نثر میں کتاب لکھوں تو ایک پارۂ ادب تو ضرور تیار ہو جائے گا، مگر کوئی ایسی چیز نہیں بن سکتی جس کی علمی قدر وقیمت ہو۔

مولانا اقبال احمد سہیل نے مطالعہ کی کمی کا احساس کرتے ہوئے نثر میں لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر موجودہ زمانہ میں بے شمار لوگ مطالعہ کی کمی کے باوجود پورے جوش وخروش کے ساتھ کتابوں کے مصنف بننے کی کوشش میں مشغول ہیں۔ انھیں خبر نہیں کہ علم کے بغیر جو چیز لکھی جائے وہ صرف اپنی بے علمی کا اشتہار ہوتا ہے اور اگر آدمی کے پاس علم ہو لیکن مطالعہ نہ ہو تب بھی کتاب لکھنا کچھ کارآمد نہیں۔ کیونکہ ایسا آدمی صرف ایک "پارۂ ادب" تیار کرتا ہے نہ کہ حقیقۃً علمی قدر وقیمت رکھنے والی کوئی چیز۔

مولانا سید سلیمان ندوی (۱۹۵۲-۱۸۸۴) کہا کرتے تھے کہ اتنا پڑھو اتنا پڑھو کہ ابلنے لگے، اس کے بعد لکھو۔ یہی بات ہر ایک کے لئے صحیح ہے۔ جو پڑھے بغیر لکھے گا وہ نثر کی زبان میں شاعری کرے گا یا تحریر کے اسلوب میں خطابت۔ اور دونوں ہی علم کی بارگاہ میں بالکل بے قیمت ہیں

سادگی کی اہمیت

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یادیں (Lord Mountbatten Remembers) کے نام سے بی بی سی نے ایک ڈکومنٹری فلم پیش کی ہے۔ اس میں بہت سے دل چسپ واقعات ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بتایا کہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کی شادی جب پرنس فلپ سے ہوئی تو گاندھی جی نے ملکہ الزبتھ کو اس موقع پر ایک تحفہ بھیجا تھا۔ یہ ایک میز پوش تھا جو گاندھی جی کے اپنے ہاتھ سے کاتے ہوئے سوت سے تیار کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بھدی چٹائی کی مانند تھا۔ تاہم ملکہ برطانیہ نے اس کو قبول کر لیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہتے ہیں کہ کچھ سال بعد انھوں نے برٹش میوزیم میں گاندھی جی کی یادگاری اشیار کی نمائش کی تو تلاش کے باوجود ان کو مذکورہ چٹائی نہ مل سکی۔ انھوں نے سوچا کہ شاید حفاظت کے خیال سے اس کو ٹاور آف لندن میں بھیج دیا گیا ہو۔ مگر وہاں بھی اس کا سراغ نہ مل سکا۔ آخر اس کا ذکر ملکہ الزبتھ سے ہوا۔ ملکہ نے اپنا ایک خاص ڈراز کھول کر وہ چٹائی نکالی اور اس کو دیتے ہوئے کہا: آپ نے مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ میں نے تو اس کو اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیا تھا تاکہ کسی کا ہاتھ اس کو لگنے نہ پائے (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ نومبر ۱۹۸۰)

Oh, why didn't you ask me, I let nobody
else touch that. I keep that myself.

ملکہ برطانیہ نے کھدر کی ایک بھدی چٹائی کو محفوظ رکھنے کا اتنا اہتمام کیوں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے "بھدے پن" میں ان کو تقدس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ لندن گئے۔ وہ اپنے لمبے کرتے، اونچے پائجامہ اور گول ٹوپی میں بظاہر وہاں عجیب سے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اس کے باوجود انگریز ان کا بہت ادب کرتے تھے۔ ایک بار ان لوگوں نے کسی پارک میں نماز پڑھی۔ وہ نماز پڑھ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک انگریز آیا اور ان کی پیٹھ پر اپنے دونوں ہاتھ پھیر کر اپنے ہاتھوں کو چوم لیا۔ ایک شخص نے پوچھا: تم ان لوگوں کا اتنا احترام کیوں کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا: یہ لوگ اپنے اس حلیہ میں ہم کو عیسیٰ اور موسیٰ کی طرح دکھائی دیتے ہیں:

They are just like Jesus and Moses

فیشن اور ٹیپ ٹاپ میں اگر شان کا پہلو ہے تو سادگی میں اس سے بھی زیادہ بڑا ایک پہلو ہے اور وہ تقدس ہے۔ سادگی اگر روحانیت کے ساتھ ہو تو وہ دیکھنے والوں کے لئے مقدس چیز بن جاتی ہے اور لوگوں کے حق میں انتہائی اہتمام سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ فیشن اور میک اپ کے متعلق ہر آدمی جانتا ہے کہ یہ بازار سے خریدی ہوئی چیزیں ہیں اس لئے ان کو دیکھ کر کسی کے اوپر غیر معمولی تاثر قائم نہیں ہوتا۔ مگر سادگی کے انداز میں تقدس کا جو پہلو ہے اس کی وجہ سے سادگی کو دیکھ کر فوراً احترام کا جذبہ ابھرتا ہے، جو یقیناً پہلے جذبہ سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالاں کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو۔ اور کہے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتاروں گا۔ اور کاش تم اس وقت دیکھو جب کہ یہ ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ لاؤ اپنی جانیں نکالو۔ آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا اس سبب سے کہ تم اللہ پر جھوٹی باتیں کہتے تھے۔ اور تم اللہ کی نشانیوں سے تکبر کرتے تھے۔ اور تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آ گئے جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ اسباب ہم نے تم کو دیا تھا سب تم پیچھے چھوڑ آئے۔ اور ہم تمھارے ساتھ ان سفارش والوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمھارا کام بنانے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ تمھارا رشتہ ٹوٹ گیا اور تم سے جاتے رہے وہ دعوے جو تم کرتے تھے ۹۳ - ۹۴

اللہ جب اپنے کسی بندے کو اپنی پکار بلند کرنے کے لئے کھڑا کرتا ہے تو اسی کے ساتھ اس کو خصوصی توفیق بھی عطا کرتا ہے۔ اس کے کردار میں خوف آخرت کی جھلک ہوتی ہے۔ اس کی باتوں میں خدائی استدلال کی طاقت نظر آتی ہے بے پناہ مخالفتوں کے باوجود وہ اپنے پیغام رسانی کے عمل کو اعلیٰ ترین شکل میں جاری رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی زمین پر خدا کی نشانی ہوتا ہے۔ مگر جن کی نگاہیں دنیوی عظمت کی چیزوں میں گم ہوں وہ آخرت کے داعی کی عظمت کو سمجھ نہیں پاتے۔ حتیٰ کہ ان کے مادی پیمانہ میں ان کی اپنی ذات برتر اور اللہ کے داعی کی ذات کم تر دکھائی دیتی ہے۔ یہ چیز ان کو تکبر میں مبتلا کر دیتی ہے اور جو لوگ تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں ان سے کوئی بھی نامعقول رویہ مستبعد نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ وہ بھی ویسا ہی کلام تخلیق کر سکتے ہیں جیسا کلام خدا کی طرف سے کسی بندہ پر اترتا ہے ——— وہ خدا کو طلسماتی نشانیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے وہ بشری نشانیوں میں ظاہر ہونے والے خدا کو پہچان نہیں پاتے۔

یہ تکبر جو کسی آدمی کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ اس دنیوی حیثیت اور مادی سامان کی بنا پر ہوتا ہے جو اس کو دنیا میں ملا ہوا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ اسے حاصل ہے وہ محض آزمائش کے لئے اور متعین مدت تک کے لئے ہے۔ موت کا وقت آتے ہی اچانک یہ تمام چیزیں چھن جائیں گی۔ اس کے بعد آدمی اسی طرح محض ایک تنہا وجود ہوگا جس طرح وہ ابتدائی پیدائش کے وقت ایک تنہا وجود تھا۔ موت کے فوراً بعد ہر آدمی اپنی زندگی کے اس مرحلہ میں پہنچ جاتا ہے جہاں نہ اس کی دولت ہوگی اور نہ اس کی حیثیت، جہاں نہ اس کے ساتھی ہوں گے اور نہ اس کے سفارشی۔ وہ ہوگا اور اس کا خدا ہوگا۔ دنیا میں اس کو جن چیزوں پر ناز تھا ان میں سے کوئی چیز بھی اس دن اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے کے لئے موجود نہ ہوگی۔

دنیا میں ہر آدمی الفاظ کے طلسم میں جیتا ہے۔ ہر آدمی اپنے حسب حال ایسے الفاظ تلاش کر لیتا ہے جس میں اس کا وجود بالکل برحق دکھائی دے، اس کا راستہ سیدھا منزل کی طرف جاتا ہوا نظر آئے۔ مگر آخرت کا انقلاب جب حقیقتوں کے پردے پھاڑ دے گا تو لوگوں کے یہ الفاظ اس قدر بے معنی ہو جائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

بے شک اللہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور وہی بے جان کو جان دار سے نکالنے والا ہے۔ وہی تمہارا اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جارہے ہو۔ وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات کو سکون کا وقت بنایا اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔ یہ ٹھہرایا ہوا ہے بڑے غلبہ والے کا، بڑے علم والے کا۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تاکہ تم ان کے ذریعہ سے خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ پاؤ۔ بے شک ہم نے دلائل کھول کر بیان کردئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں ۹۷ - ۹۵

انسان کو جب ایک موٹر کار یا اور کوئی چیز بنانا ہوتا ہے تو وہ اس کے ہر جزء کو الگ الگ بناتا ہے۔ اور پھر اس کے اجزاء کو جوڑ کر مطلوبہ چیز تیار کرتا ہے، مگر خدا جب ایک درخت اگاتا ہے یا ایک انسان پیدا کرتا ہے تو اس کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ وہ کسی چیز کو اس کے پورے مجموعہ کے ساتھ بیک وقت برآمد کردیتا ہے۔ خدائی کارخانہ میں پورا کا پورا درخت یا پودا کا پورا انسان ایک ہی بیج یا ایک ہی بوند سے بتدریج نکل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ انتہائی انوکھی تکنیک ہے جس پر کسی بھی انسان کو قابو نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں انسان سے برتر ایک ہستی موجود ہے جس کا منصوبہ تمام منصوبوں سے بلند ہے۔

سورج کی جسامت زمین سے بارہ لاکھ گنا زیادہ ہے۔ اور زمین چاند سے چوگنا زیادہ بڑی ہے۔ یہ سب اجرام مسلسل حرکت میں ہیں۔ چاند زمین سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل دور رہ کر زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے اور زمین سورج سے تقریباً ساڑھے نو کروڑ میل کے فاصلے پر رہتے ہوئے سورج کے گرد دو طریقہ سے گھوم رہی ہے، ایک اپنے محور پر اور دوسرے سورج کے مدار پر۔ اسی طرح ستاروں کی گردش کا معاملہ ہے جو دہشت ناک حد تک بعید فاصلوں پر حد درجہ باقاعدگی کے ساتھ متحرک ہیں۔ اسی کائناتی تنظیم سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سے اوقات کا نقشہ مقرر ہوتا ہے۔ اسی سے خشکی اور تری میں انسان کے لئے اپنی زندگی کی ترتیب قائم کرنا ممکن ہوتا ہے۔ یہ اتنا بڑا انتظام اتنی صحت کے ساتھ چل رہا ہے کہ ہزاروں سال میں بھی اس کے اندر کوئی فرق نہیں آتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ایک ایسی ہستی ہے جس کی طاقتیں لامحدود حد تک زیادہ ہیں۔

خدا کی یہ نشانیاں بہت بڑے پیمانہ پر بتا رہی ہیں کہ اس کارخانہ کا بنانے والا بہت بڑے علم والا ہے۔ کوئی بے علم ہستی اتنا بڑا ڈھانچہ قائم نہیں کرسکتی۔ وہ بہت غلبہ والا ہے، اس کے بغیر اتنے بڑے کارخانہ کا اس طرح چلنا ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس کی منصوبہ بندی انتہائی حد تک کامل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو اتنی بڑی کائنات میں اس قدر معنویت اور ہم آہنگی کا وجود ناممکن ہو جائے۔

خدا کی دنیا خدا کے دلائل سے بھری ہوئی ہے۔ مگر دلیل ایک نظری معقولیت کا نام ہے نہ کہ کسی ہتوڑے کا۔ اس لئے دلیل کو ماننا کسی کے لئے صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ وہ فی الواقع سنجیدہ ہو، وہ شعوری طور پر اس کے لئے تیار ہو کہ وہ دلیل کو مانے گا خواہ وہ اس کی موافقت میں جارہی ہو یا اس کے خلاف۔

اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے، پھر ہر ایک کے لئے ایک ٹھکانہ ہے اور ہر ایک کے لئے اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ ہم نے دلائل کھول کر بیان کردئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے نکالی اگنے والی ہر چیز۔ پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخ نکالی جس سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کر دیتے ہیں۔ اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے گچھے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے اور زیتون کے اور انار کے، آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے۔ اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے۔ بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان کی طلب رکھتے ہیں ۹۸-۹۹

انسانی کارخانے اس پر قادر نہیں کہ وہ ایک ایسی مشین بنا دیں کہ اس کے بطن سے اسی قسم کی بے شمار مشینیں خود بخود نکلتی چلی جائیں۔ ہمارے کارخانوں کو ہر مشین الگ الگ بنانی پڑتی ہے۔ مگر خدا کے کارخانہ میں یہ واقعہ ہر روز ہو رہا ہے۔ درخت کا ایک بیج بو دیا جاتا ہے۔ پھر اس بیج سے بے شمار درخت نکلتے چلے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت سے شروع ہو کر کھرب ہا کھرب انسان پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ جس خدا نے کائنات کو پیدا کیا ہے اس کی قدرت بے حد وسیع ہے۔ وہ اس نادر تخلیق پر قادر ہے کہ ایک ابتدائی چیز وجود میں لائے اور پھر اس کے اندر سے بے حساب گنا زیادہ بڑی بڑی چیزیں مسلسل نکلتی چلی جائیں۔ اسی طرح خدا موجودہ دنیا سے ایک زیادہ شان دار اور زیادہ معیاری دنیا نکال سکتا ہے۔ آخرت کا عقیدہ کوئی دور کا عقیدہ نہیں بلکہ جس امکان کو ہم ہر روز دیکھ رہے ہیں اسی امکان کو مستقبل کے ایک واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے۔

مٹی بظاہر ایک مردہ اور جامد چیز ہے۔ پھر اس کے اوپر بارش ہوتی ہے۔ پانی پاتے ہی مٹی کے اندر سے ایک نئی سرسبز دنیا نکل آتی ہے۔ اس کے اندر سے طرح طرح کی فصلیں اور قسم قسم کے پھل دار درخت وجود میں آجاتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی موجودہ دنیا کے بعد آنے والی دنیا کی ایک تمثیل ہے۔ مٹی پر پانی پڑنے سے زمین کے اوپر رنگ اور خوشبو اور ذائقہ کا ایک سرسبز و شاداب چمن کھل اٹھنا اس امکان کو بتاتا ہے جو دنیا کے خالق نے یہاں رکھ دیا ہے۔ آج کی دنیا میں انسان جو نیک عمل کرتا ہے وہ اسی قسم کا ایک امکان ہے۔ جب خدا کی رحمتوں کی بارش ہوگی تو یہ امکان ہرا بھرا ہو کر آخرت کی لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں تبدیل ہو جائے گا۔

انسان اولاً ماں کے بطن کے سپرد ہوتا ہے پھر موجودہ دنیا میں آتا ہے۔ قبر بھی گویا اسی قسم کا ایک "بطن" ہے۔ آدمی قبر کے سپرد کیا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ اگلی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تاکہ اپنے عمل کے مطابق جنت یا جہنم میں داخل کر دیا جائے ـــــ انسان سے غیب کی جس دنیا کو ماننے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اس کی جھلکیاں اور اس کے دلائل موجودہ محسوس کائنات میں پوری طرح موجود ہیں۔ مگر مانتا وہی ہے جو پہلے سے ماننے کے لئے تیار ہو۔ "ایمان" کی راہ میں آدمی جب آدھا سفر طے کر چکا ہوتا ہے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایمان کی دعوت اس کے ذہن کا جزء بنے اور وہ اس کو قبول کرے۔ جو شخص ایمان کے الٹے رخ پر سفر کر رہا ہو اس کو ایمان کی دعوت کبھی نفع نہیں پہنچا سکتی۔

اور انھوں نے جنات کو اللہ کا شریک قرار دیا۔ حالاں کہ اسی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تراشیں۔ پاک اور برتر ہے وہ ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ یہ ہے اللہ تمھارا رب۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی ہر چیز کا خالق ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو۔ اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں۔ مگر وہ نگاہوں کو پالیتا ہے ۔ وہ بڑا باریک بیں اور بڑا باخبر ہے۔ اب تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آچکی ہیں۔ پس جو بینائی سے کام لے گا وہ اپنے ہی لئے، اور جو اندھا بنے گا وہ خود نقصان اٹھائے گا۔ اور میں تمھارے اوپر کوئی نگراں نہیں ہوں ۱۰۴—۱۰۰

قدیم ترین زمانہ سے انسان کی یہ کمزوری رہی ہے کہ جس چیز میں بھی کوئی امتیاز یا کوئی پراسراریت دیکھتا ہے اس کو وہ خدا کا شریک سمجھ لیتا ہے۔ اور اس سے مدد لینے یا اس کی آفتوں سے بچنے کے لئے اس کو پوجنے لگتا ہے۔ اسی ذہن کے تحت بہت سے لوگوں نے فرشتے اور کواکب اور جنات کو پوجنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ ان چیزوں کے خدا نہ ہونے کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان کے اندر "خلق" کی صفت نہیں۔ انھوں نے نہ اپنے آپ کو پیدا کیا اور نہ وہ کسی دوسری چیز کو پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ ان کو خود کسی دوسری ہستی نے تخلیق کیا ہے۔ پھر جو خالق ہے وہ خدا ہوگا یا جو مخلوق ہے وہ خدا بن جائے گا۔

ایک درخت کو کمال درجہ موزونیت کے ساتھ وہ تمام چیزیں پہنچتی ہیں جو اس کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ اسی طرح کائنات کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ جب یہ حقیقت ہے کہ ان چیزوں کو جو کچھ ملتا ہے کسی دینے والے کے دئے سے ملتا ہے تو یقیناً دینے والا ہر جزء وکل سے باخبر ہوگا۔ اگر وہ ان سے باخبر نہ ہو تو ہر چیز کی اس کی عین ضرورت کے مطابق کارسازی کس طرح کرے۔ اب جو خدا اتنی کامل صفات کا مالک ہو وہ آخر کس ضرورت کے لئے کسی کو اپنی خدائی میں شریک کرے گا۔

انسان خدا کو محسوس صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جب وہ اس کو محسوس صورت میں نظر نہیں آتا تو وہ دوسری محسوس چیزوں کو خدا فرض کرکے اپنی ظاہر پرستی کی تسکین کر لیتا ہے۔ مگر یہ خدا کی ہستی کا بہت کمتر اندازہ ہے آخر جو خدا ایسا عظیم ہو کہ اتنی بڑی کائنات پیدا کرے اور انتہائی نظم کے ساتھ اس کو مسلسل چلاتا رہے، وہ اتنا معمولی کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک کمزور مخلوق اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے ہاتھوں سے چھوئے۔ البتہ انسان دل کی راہ سے خدا کو پاتا ہے اور یقین کی آنکھ سے اس کو دیکھتا ہے۔ جو شخص بصیرت کی آنکھ سے دیکھ کر ماننے پر راضی ہو وہی خدا کو پائے گا۔ جو بصارت سے دیکھنے پر اصرار کرے وہ خدا کو پانے سے اسی طرح محروم رہے گا جس طرح وہ شخص پھول کی خوشبو کو جاننے سے محروم رہتا ہے جو اس کو کیمیائی معیاروں پر پرکھ کر جاننا چاہے۔

اور اس طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ کہیں کہ تم نے پڑھ دیا اور تاکہ ہم اچھی طرح کھول دیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔ تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ اور ہم نے تم کو ان کے اوپر نگراں نہیں بنایا ہے اور نہ تم ان پر مختار ہو۔ اور اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوش نما بنا دیا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت اللہ انھیں بتا دے گا جو وہ کرتے تھے ۱۰۵—۱۰۸

ایک شخص وہ ہے جس کے اندر طلب کی نفسیات ہو، جو سچائی کی تلاش میں رہتا ہو۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو دولت یا اقتدار کا کوئی حصہ پا کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ پائے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کے اندر کوئی کمی نہیں ہے جو کوئی شخص آکر پوری کرے۔ حق کی دعوت جب اٹھتی ہے تو اس کو قبول کرنے والے زیادہ تر پہلی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو دوسری قسم کے لوگ ہیں وہ اس کو کوئی قابل لحاظ چیز نہیں سمجھتے۔ وہ کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کرتے۔ اس لئے اس کی اہمیت بھی ان پر واضح نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں حق کی دعوت کا مقصد دو ہوتا ہے۔ جو سچے طالب ہیں ان کی طلب کا جواب فراہم کرنا۔ اور جو لوگ طالب نہیں ہیں ان پر حجت قائم کرنا۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے دعوت کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے ماننے والے بن جائیں۔ اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے یہ کہ وہ کہہ اٹھیں کہ "تم نے بتا دیا، تم نے بات ہم تک پہنچا دی"

جو لوگ دعوت کا انکار کرتے ہیں وہ اپنے انکار کو برحق ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کی باتیں نکالتے ہیں۔ ایسے موقع پر داعی کے دل میں یہ خیال آنے لگتا ہے کہ وہ دعوت کے انداز میں ایسی تبدیلی کر دے جس سے وہ مدعو کے لئے قابل قبول بن جائے۔ مگر اس قسم کا انحراف درست نہیں۔ داعی کو ہمیشہ اسی اسلوب پر قائم رہنا چاہئے جو براہ راست خدا کی طرف سے تلقین کیا گیا ہے۔ کیونکہ اصل مقصد انسان کو خدا سے جوڑنا ہے نہ کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو اپنے حلقہ میں شامل کرنا۔ دوسری طرف یہ بات بھی غلط ہے کہ مدعو کے رویہ سے مشتعل ہو کر ایسی باتیں کی جائیں کہ اس کی گمراہی جاہلانہ بدکلامی تک جا پہنچے۔

آدمی جن خاص روایات میں پیدا ہوتا ہے اور جن افکار سے وہ مانوس ہو جاتا ہے، ان کے حق میں اس کے اندر ایک طرح کی عصبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے مطابق اس کا ایک فکری ڈھانچہ بن جاتا ہے جس کے تحت وہ سوچتا ہے۔ یہی فکری ڈھانچہ حق کو قبول کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جب تک آدمی اس فکری ڈھانچہ کو نہ توڑے اس کے ذہن میں وہ دروازہ نہیں کھلتا جس کے ذریعہ حق کی آواز اس کے اندر داخل ہو۔

اور یہ لوگ اللہ کی قسم بڑے زور سے کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آجائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا خبر کہ اگر نشانیاں آجائیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے جیسا کہ یہ لوگ اس کے اوپر پہلی بار ایمان نہیں لائے۔ اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیں گے۔ اور اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور ہم ساری چیزیں ان کے سامنے اکٹھا کر دیتے تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہ تھے اِلّا یہ کہ اللہ چاہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں ۱۱۱ — ۱۰۹

حق ایک شخص کے سامنے دلائل کے ساتھ آتا ہے اور وہ اس کا انکار کر دیتا ہے تو اس کی وجہ ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ بات کو اس کے صحیح رخ سے دیکھنے کے بجائے الٹے رخ سے دیکھنا۔ کوئی بات خواہ کتنی ہی مدلل ہو، آدمی اگر اس کو ماننا نہ چاہے تو وہ اس کو رد کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ پالے گا۔ مثلاً داعی کے دلائل کو دلائل کی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے وہ یہ بحث چھیڑ دے گا کہ تمھارے سوا جو دوسرے بزرگ ہیں کیا وہ سب حق سے محروم تھے۔ اور اسی طرح دوسری باتیں۔

جس آدمی کے اندر اس قسم کا مزاج ہو اس کا راہ راست پر آنا انتہائی مشکل ہے۔ وہ ہر بات کو غلط رخ دے کر اس کے انکار کا ایک بہانہ تلاش کر سکتا ہے۔ نظری دلائل کو رد کرنے کے لئے اگر اس کو یہ الفاظ مل رہے تھے کہ یہ اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے تو حسی مشاہدہ کو رد کرنے کے لئے وہ یہ الفاظ پالے گا کہ یہ نظر کا دھوکا ہے، اس کی حقیقت ایک فرضی طلسم کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو مزاج نظری دلیل کو ماننے میں رکاوٹ بنا تھا وہی مزاج حسی دلیل کو ماننے میں بھی رکاوٹ بن جائے گا۔ آدمی اب بھی اسی طرح محروم رہے گا جیسے وہ پہلے محروم تھا۔

اس قسم کے لوگ اپنی نفسیات کے اعتبار سے سرکش واقع ہوتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے کو اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک داعی جب ان کے سامنے حق کا پیغام لے آتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ماحول میں اجنبی ہوتا ہے، وہ وقت کی عظمتوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنا اپنی حیثیت کو نیچے گرانے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس لئے برتری کی نفسیات رکھنے والے لوگ اس کو قبول نہیں کر پاتے۔ وہ طرح طرح کی توجیہات پیش کر کے اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

دانائی یہ ہے کہ آدمی خدا کے نقشہ کو مانے اور اس کے مطابق اپنے ذہن کو چلانے کے لئے تیار ہو۔ اس کے برعکس نادانی یہ ہے کہ آدمی خدا کے نقشہ کے بجائے خود ساختہ معیار قائم کرے اور کہے کہ جو چیز مجھ کو اس معیار پر ملے گی میں اس کو مانوں گا اور جو چیز اس معیار پر نہیں ملے گی اس کو نہیں مانوں گا۔ ایسے آدمی کے لئے اس دنیا میں صرف بھٹکنا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں آدمی خدا کے مقرر کئے ہوئے طریقوں کی پیروی کر کے منزل تک پہنچ سکتا ہے نہ کہ اس کے مقررہ طریقہ کو چھوڑ کر۔

اور اسی طرح ہم نے شریر آدمیوں اور شریر جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا۔ وہ ایک دوسرے کو پُرفریب باتیں سکھاتے ہیں دھوکا دینے کے لئے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرسکتے۔ پس تم انھیں چھوڑ دو کہ وہ جھوٹ باندھتے رہیں۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کرلیں ۱۱۳ — ۱۱۲

ابن جریر نے حضرت ابوذر سے نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شریک ہوا۔ یہ ایک لمبی مجلس تھی۔ آپ نے فرمایا اے ابوذر، کیا تم نے نماز پڑھ لی۔ میں نے کہا نہیں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا: اٹھو اور دو رکعت نماز پڑھو۔ وہ نماز پڑھ کر دوبارہ مجلس میں آکر بیٹھے تو آپ نے فرمایا: اے ابوذر کیا تم نے جن وانس کے شیطانوں کے مقابلہ میں اللہ سے پناہ مانگی۔ میں نے کہا نہیں اے خدا کے رسول، کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں، وہ شیاطینِ جن سے بھی زیادہ برے ہیں (نعم ھم شر من شیاطین الجن، تفسیر ابن کثیر)

یہاں شیاطین انس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دعوتِ حق کو بے اعتبار ثابت کرنے کے لئے قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر عزت و مقبولیت کا مقام حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب حق کی دعوت اپنی بے آمیز شکل میں اٹھتی ہے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کو برہنہ کر رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے سیدھا راستہ تو یہ تھا کہ وہ حق کی وضاحت کے بعد اس کو مان لیں مگر حق کے مقابلہ میں اپنا مقام ان کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اپنی حیثیت کو بچانے کے لئے وہ خود داعی اور اس کی دعوت کو مشتبہ ثابت کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ خوش نما الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ داعی اور اس کی دعوت میں ایسے شوشے نکالتے ہیں جو اگرچہ بذاتِ خود بے حقیقت ہوتے ہیں مگر بہت سے لوگ اس سے متاثر ہوکر اس کے بارے میں شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔

موجودہ دنیا میں جو امتحانی حالات پیدا کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں صحیح بات کہنے والے کو بھی الفاظ مل جاتے ہیں اور غلط بات کہنے والے کو بھی۔ حق کا داعی اگر حق کو دلائل کی زبان میں بیان کرسکتا ہے تو اسی کے ساتھ باطل پرستوں کو بھی یہ موقع حاصل ہے کہ وہ حق کے خلاف کچھ ایسے خوش نما الفاظ بول سکیں جو لوگوں کو دلیل معلوم ہوں اور وہ اس سے متاثر ہوکر حق کا ساتھ دینا چھوڑ دیں۔ یہ صورت حال امتحان کی غرض سے ہے اس لئے وہ لازماً قیامت تک باقی رہے گی۔ اس دنیا میں بہر حال آدمی کو اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ سچے دلائل اور بے بنیاد باتوں کے درمیان فرق کرے اور بے بنیاد باتوں کو رد کرکے سچے دلائل کو قبول کرے۔

شیاطینِ انس اپنی ذہانت سے حق کے خلاف جو پُرفریب شوشے نکالتے ہیں وہ انھیں لوگوں کو متاثر کرتے ہیں جو آخرت کے فکر سے خالی ہوں۔ آخرت کا اندیشہ آدمی کو انتہائی سنجیدہ بنا دیتا ہے اور جو شخص سنجیدہ ہو اس سے باتوں کی حقیقت کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ مگر جو لوگ آخرت کے اندیشہ سے خالی ہوں وہ حق کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتے، اسی لئے وہ شوشہ اور دلیل کا فرق بھی سمجھ نہیں پاتے۔

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح کتاب اتاری ہے۔ اور جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے واقعیت کے ساتھ۔ پس تم نہ ہو شک کرنے والوں میں۔ اور تمہارے رب کی بات پوری سچی ہے اور انصاف کی، کوئی بدلنے والا نہیں اس کی بات کو اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اور اگر تم لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں ہیں تو وہ تم کو خدا کے راستہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے ان کو جو ان کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور خوب جانتا ہے ان کو جو راہ پائے ہوئے ہیں

۱۱۴ — ۱۱۷

قرآن میں ذبیحہ کے احکام اترے اور یہ کہا گیا کہ مردہ جانور نہ کھاؤ، ذبح کیا ہوا کھاؤ تو کچھ لوگوں نے کہا: مسلمانوں کا مذہب بھی عجیب ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کا مارا ہوا جانور حلال سمجھتے ہیں اور جس کو اللہ نے مارا ہو اس کو حرام بتاتے ہیں۔ اس جملہ میں لفظی تک بندی کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے۔ مگر بہت سے لوگ اس کو سن کر دھوکے میں آگئے اور اسلام کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہے۔ ہر زمانہ میں ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو باتوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے سمجھتے ہوں۔ بیشتر لوگ الفاظ کے گورکھ دھندے میں گم رہتے ہیں۔ وہ خیالی باتوں کو حقیقی سمجھ لیتے ہیں، صرف اس لئے کہ ان کو خوبصورت الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

مگر یہ دنیا ایسی دنیا ہے جہاں تمام بنیادی حقیقتوں کے بارے میں خدا کے واضح بیانات آچکے ہیں۔ اس لئے یہاں کسی کے لئے اس قسم کی بے راہی میں پڑنا قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ خدا کا کلام ایک کھلی ہوئی کسوٹی ہے جس پر جانچ کر ہر آدمی معلوم کر سکتا ہے کہ اس کی بات محض ایک لفظی شعبدہ ہے یا کوئی واقعی حقیقت ہے۔ خدا نے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام ضروری امور کی بابت سچا بیان دے دیا ہے۔ اس نے انسانی تعلقات کے تمام پہلوؤں کے بارے میں کامل انصاف کی راہ بتا دی ہے۔ آدمی اگر فی الواقع سنجیدہ ہو تو اس کے لئے یہ جاننا کچھ بھی مشکل نہیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ اب اس کے بعد شبہ میں وہی پڑے گا جس کا حال یہ ہو کہ اس کی سوچ خدا کے کلام کے سوا دوسری چیزوں کے زیر اثر کام کرتی ہو۔ جو شخص اپنی سوچ کو خدائی حقیقتوں کے موافق بنائے اس کے لئے یہاں فکری بے راہ روی کا کوئی امکان نہیں۔

اس خدائی وضاحت کے بعد بھی اگر آدمی بھٹکتا ہے تو خدا کو اس کا حال اچھی طرح معلوم ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے اپنی بڑائی قائم رکھنے کی خاطر اپنے سے باہر ظاہر ہونے والی سچائی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کون ہے جس کے تعصب نے اس کو اس قابل نہ رکھا کہ وہ بات کو سمجھ سکے۔ کس نے سستی نمائش میں اپنی رغبت کی وجہ سے سچائی کی آواز پر دھیان نہیں دیا۔ کون ہے جو حسد کی نفسیات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے حق سے ناآشنا رہا۔

شکایت کے باوجود

کعبہ کی دربانی (حجابہ) جاہلیت کے زمانہ میں بھی نہایت عزت کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ یہ دربانی قدیم ترین زمانہ سے ایک خاص خاندان میں چلی آرہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس خاندان کے ایک فرد عثمان بن طلحہ کعبہ کے دربان تھے۔ انھیں کے پاس کعبہ کی کنجیاں رہتی تھیں۔

بخاری نے روایت کیا ہے کہ ہجرت سے پہلے ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ کعبہ کے اندر داخل ہو کر عبادت کریں۔ آپ نے عثمان بن طلحہ سے کنجی مانگی تاکہ اس کا دروازہ کھول سکیں۔ مگر عثمان بن طلحہ نے انکار کیا اور آپ کو برا بھلا کہا۔ آپ نے فرمایا: اے عثمان، کسی دن تم دیکھو گے کہ یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی۔ مجھے اختیار ہوگا کہ میں جس کو چاہوں اسے دوں۔ یہ سن کر عثمان بن طلحہ نے کہا:

لقد ھلکت قریش یومئذ و ذلت — وہ دن قریش کی تباہی اور رسوائی کا دن ہوگا

آپ نے فرمایا: نہیں، اس دن وہ آباد اور باعزت ہوں گے۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ مکہ فتح ہوا اور تمام اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آگیا۔ آپ مکہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بیت اللہ گئے۔ آپ نے کعبہ کا سات بار طواف کیا۔ اس کے بعد آپ نے عثمان بن طلحہ کو بلوایا۔ ایک روایت کے مطابق وہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی زمانہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ آپ نے ان سے کنجی لی اور دروازہ کھول کر کعبہ کے اندر داخل ہوئے۔ آپ کچھ دیر اس کے اندر رہے اور وہاں جو بت تھا اس کو اپنے ہاتھ سے توڑ دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے باہر نکلے تو آپ کے ہاتھ میں اس کی کنجی تھی اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے: ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا (اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں اہل امانت کے سپرد کر دو) اس وقت آپ کے چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علی کھڑے ہو گئے اور کہا: یا رسول اللہ اجمع لنا الحجابۃ مع السقایۃ صلی اللہ علیک۔ یعنی اللہ کی رحمت آپ پر ہو، ہم بنو ہاشم کو پہلے سے زائرین کعبہ کو پانی پلانے کی خدمت حاصل ہے۔ اب کعبہ کی کلید برداری بھی ہمیں کو دے دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا: عثمان بن طلحہ کہاں ہیں۔ ان کو بلایا گیا۔ آپ نے کعبہ کی کنجی ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

ھاک مفتاحک یا عثمان، الیوم یوم بر و وفاء۔ — اے عثمان، اپنی کنجی لو۔ آج وفا اور سلوک کا دن ہے۔

خذوھا خالدۃ تالدۃ، لا ینزعھا منکم — اس کو لو۔ یہ تمھارے خاندان میں ہمیشہ موروثی طور

الاظالم (زاد المعاد، جلد اول) پر رہے گی۔ ظالم کے سوا کوئی بھی تم سے اس کو نہیں چھینے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق کی ادائگی اور امانتوں کی واپسی کے معاملہ میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ پابند ہونا چاہئے کہ صاحب حق کی طرف سے تلخی کا مظاہرہ ہو تب بھی جس کا جو حق ہے اس کو اس کا حق پورا پورا ادا کیا جائے۔ ادائگی حقوق سے کسی حال میں بھی تجاوز نہ کیا جائے خواہ وہ اپنی طبیعت کے کتنا ہی خلاف ہو۔

دنیا پرست لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب ان کو کسی قسم کا اقتدار ملتا ہے تو سب سے پہلے وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے سابق مخالفین کو سزا دیں اور ان کو ان کے منصب سے ہٹا کر اپنے عقیدت مندوں کو تمام مناصب پر بٹھا دیں۔ ہر صاحب اقتدار موافق اور مخالف کی اصطلاحوں میں سوچتا ہے۔ موافقین کو اٹھانا اور مخالفین کو کچلنا اس کی پالیسی کا سب سے اہم جز ہوتا ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں اقتدار حاصل ہوا تو آپ نے اس کے بالکل برعکس معاملہ کیا۔ آپ نے معاملات کو "موافق" اور "مخالف" کے اعتبار سے نہیں دیکھا بلکہ حق پسندی اور امانت داری کے لحاظ سے دیکھا۔ اور تمام شکایتی باتوں کو نظر انداز کر کے ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو رحمت اور عدل کا تقاضا تھا۔

جب کسی ملک میں کوئی نیا انقلاب آتا ہے اور اقتدار بدلتا ہے تو قدیم نظام کے تحت رائج شدہ بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن کے متعلق فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے۔ نئے حکمراں اگر یہ کریں کہ ایک طرف سے تمام پرانی چیزوں کو بدلنا شروع کر دیں تو پھر غیر ضروری مسائل ابھر کر دوبارہ وہی مشکلات پیدا کر دیں گے جو انقلاب سے پہلے تھیں۔ انقلاب کے اصل مقاصد دھرے رہ جائیں گے اور نئے نئے مسائل میں ساری قوت صرف ہونے لگے گی جو کبھی حل نہ ہوں گے۔ وہ سماجی رواجات جو صدیوں میں بنیں ان کی جڑیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ ان کو چند دن میں بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر جن کے ہاتھ میں اقتدار آتا ہے وہ اکثر اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ ہر چیز کو بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شوق انقلاب میں وہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں میں الجھا لیتے ہیں جو بالآخر ان کو بھی کھا جائیں اور ان کے انقلاب کو بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں نئے حکمراں کو اصولی مسئلہ اور رواجی مسئلہ میں فرق کرنا چاہئے۔ جو مسائل خالص اصولی نوعیت کے ہیں ان میں قطعاً مصالحت نہ کی جائے۔ مگر رواجی نوعیت کے مسائل میں صرف نظر کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے میں ایک دن کی تاخیر بھی نہیں کی مگر کعبہ کی کلید برداری کے معاملہ میں جو رواج پہلے سے چلا آرہا تھا اسی کو برقرار رکھا۔

ہر چیز میں سبق ہے

خواجہ حسن نظامی (۱۹۵۵ - ۱۸۷۸) کا ایک مضمون ہے "مچھر کی کہانی" خواجہ صاحب نے مچھر سے شکایت کی کہ تم اتنا کیوں پریشان کر رہے ہو۔ ہم کو سونے کیوں نہیں دیتے۔ مچھر نے جواب دیا: "سونے اور ہمیشہ سونے کا موقع ابھی نہیں آیا ہے۔ جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا۔ ابھی تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا وقت ہے"۔ —— اگر نصیحت لینے کا ذہن ہو تو مچھر کی بھنبھناہٹ میں بھی آدمی کو زندگی کا پیغام مل جاتا ہے۔ اور اگر نصیحت لینے کا ذہن نہ ہو تو بم کے دھماکے اور ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ بھی جمود کو توڑنے کے لئے ناکافی ہیں۔ ایسے لوگوں کو قیامت کا طوفان ہی بیدار کر سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ قیامت کے طوفان سے بیدار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہوگا نہ کہ عمل کرنے کا۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ جنتی وہ ہے جو اللہ کے پاس قلب سلیم (شعراء ۸۹) لے کر آئے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ دے دیتا ہے (من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ آدمی کا ذہن کھلا ہوا ہو۔ وہ حق کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسے آدمی کے سامنے جب کوئی سچائی یا کوئی سبق کی بات آتی ہے تو اس کو سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگتی۔ وہ اس کو فوراً پالیتا ہے اور اپنی زندگی میں اس کو شامل کر لیتا ہے۔

دنیا میں ہر طرف اللہ کی نشانیاں بکھری ہوئی ہیں، کہیں جمادات خاموش زبان میں کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہیں "مچھر" اپنی زبان میں کوئی پیغام دیتا ہے۔ کہیں انسانوں کے درمیان کوئی واقعہ ہوتا ہے اور اس میں ایک چھپا ہوا سبق موجود ہوتا ہے۔ کبھی کوئی اللہ کا بندہ کھلی ہوئی نصیحت کی زبان میں کسی امر حق کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان تمام مواقع پر وہی شخص سچائی کو پائے گا جس نے اپنا سینہ سچائی کے لئے کھلا رکھا ہو۔ اگر آدمی کے اندر سبق لینے اور بات کو پکڑنے کا مزاج نہ ہو تو کوئی بھی چیز اسے فائدہ نہیں دے سکتی۔ کھلے ذہن کا آدمی "مچھر" سے بھی سبق لے سکتا ہے۔ اور جس نے اپنے ذہن کی کھڑکیاں بند کر لی ہوں اس کے لئے خدا کی کتاب اور رسول کا کلام بھی ہدایت کو پانے کے لئے ناکافی ہے —— سب سے بڑی چیز سبق لینے کا مزاج ہے۔ جس شخص کے اندر یہ مزاج پیدا ہو جائے اس کے لئے خدا کی ساری دنیا ایک زندہ کتاب بن جائے گی۔ اور جو اس مزاج سے محروم ہو وہ ایک قسم کا جانور ہے جو سب کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد بھی نہیں جانتا کہ کیا دیکھا اور کیا سنا۔

جنتُ المُعلیٰ

مکہ جس زمین پر آباد ہے وہ ایک طرف نیچی اور دوسری طرف اونچی ہے۔ نچلے علاقہ کو مسفلہ اور اونچے علاقہ کو معلیٰ کہتے ہیں۔ اونچائی والے علاقہ میں ایک قدیم قبرستان ہے۔ اس کا نام جنت المعلیٰ ہے۔ یہ مکہ سے منیٰ کے رخ پر واقع ہے۔ اس قبرستان میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی قبر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ ابراہیم اور آپ کی والدہ آمنہ بنت وہب کی قبر ہے۔ آپ کے چچا ابو طالب اور آپ کے دادا عبد المطلب کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر جیسا صحابی اور ابو جعفر منصور جیسا حکمراں بھی یہیں مدفون ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے لوگوں کے مزارات ہیں جو ان شخصیتوں کی یاد دلاتے ہیں جو کبھی ہماری طرح زمین پر چلتے پھرتے تھے۔

زندہ آدمی کی علامت گھر ہوتے ہیں اور مردہ آدمی کی علامت قبرستان۔ قبرستان ہم کو یاد دلاتے ہیں کہ یہاں کچھ زندہ آدمی تھے جو اپنی عمر کی مدت پوری کرکے زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہوگئے۔ پھر وہ قبرستان جس کے باسیوں کا حال نام بنام معلوم ہو، اس کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایسے قبرستان تاریخ کا جزء ہوتے ہیں۔ وہ تاریخ کے زندہ صفحات ہوتے ہیں جن میں اگلی نسلیں اپنی پچھلی نسلوں کے احوال پڑھتی ہیں اور زندگی کے تسلسل کو یاد کرکے اپنے حال کو اپنے ماضی سے مربوط کرتی ہیں۔ قبرستان گویا ایک بیتا ہوا تجربہ ہے جو آج کے لوگوں کو کل کے لوگوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستان سناتا ہے۔ کوئی حاجی یا مکہ کی زیارت کرنے والا جب جنت المعلیٰ کے سامنے پہنچتا ہے تو یہ مقام اس کو یاد دلاتا ہے کہ زندگی کے جس راستہ پر وہ چل رہا ہے یہ وہی معلوم اور متعین راستہ ہے جس پر اس سے پہلے بہت سے لوگ چلے تھے۔ یہ ایک ایسے قافلہ کے گزرنے کے نشانات ہیں جو تاریخ میں اپنی واقعیت ثابت کرچکا ہے نہ کہ ایسا قافلہ جس کے نشانات ماضی کے دھندلے افسانوں میں گم ہو چکے ہوں۔

عرب میں قبوں اور پختہ تعمیرات والے قبرستان نہیں ہوتے۔ وہاں کی قبریں گویا ہموار میدان میں کچھ ابھرے ہوئے نشانات ہوتے ہیں، تقریباً ویسے ہی جیسے ہمارے یہاں کے کسی عام اور غیر پختہ قبرستان میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنت المعلیٰ عرب کا ایسا ہی ایک قبرستان ہے۔ جنت المعلیٰ ایک ایسا قبرستان ہے جو انسانی اضافوں سے پاک ہے۔ یہاں فطرت کا سادہ ماحول ہے نہ کہ انسان کا بنایا ہوا مصنوعی ماحول۔

ایک شخص جب جنت المعلیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کا ذہن تاریخ کے ان معلوم انسانوں کی طرف چلا جاتا ہے جو ہم سے پہلے عرب کی خاک میں پیدا ہوئے اور چلتے اور بولتے ہوئے بالآخر یہاں کی مٹی میں خاموش ہوکر لیٹ گئے۔

۱۔ جنت المعلیٰ میں خاموش ہوجانے والی روحوں میں سے ایک عبد المطلب (۵۷۹ - ۴۹۷ م) ہیں۔ عبد المطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا تھے۔ انھیں نے آپ کا نام "محمد" تجویز کیا جو اس وقت عرب میں ایک نیا نام تھا۔ وہ آٹھ سال کی عمر تک آپ کے کفیل رہے۔ وہ بنو ہاشم کے سردار تھے اور نہایت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ عبد المطلب کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ ابرہہ (شاہ حبش کی طرف سے صنعار کا حاکم) ہاتھیوں کی فوج لے کر

مکہ پر حملہ آور ہوا۔ ابرہہ نے مکہ کے باہر ٹپا ڈالا۔ اس نے عبد المطلب کے دو سو اونٹ پکڑ والئے۔ عبد المطلب اس سلسلہ میں ابرہہ سے ملنے گئے۔ ابرہہ ان کی پُروقار شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور ان کو اپنے پاس عزت کے ساتھ بٹھایا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے دو سو اونٹوں کے لئے آیا ہوں جو آپ کے آدمیوں نے پکڑ لئے ہیں: ابرہہ نے کہا: تم اپنے اونٹوں کے لئے مجھ سے سفارش کرنے آئے ہو اور اس محترم گھر (کعبہ) کے لئے کچھ نہیں کہتے جس کے اوپر تمھاری قومی عزت قائم ہے اور جس کو ڈھانے کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔ عبد المطلب نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: میں اونٹ کا مالک ہوں۔ کعبہ کا مالک خدا ہے، وہ اس کی حفاظت کرے گا (انا رب الابل وان للبيت ربا سیمنعہ) چنانچہ خدا نے ابرہہ کے عظیم لشکر کو تباہ کر دیا اور وہ کعبہ پر حملہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

عبد المطلب کا نام اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ کعبہ وہ مقدس گھر ہے جس کا پاسبان خود خدا ہے۔

۲۔ اسی طرح جنت المعلیٰ میں ابوطالب دفن ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ عام روایت کے مطابق وہ اگرچہ آپ پر ایمان نہیں لائے مگر انھوں نے اپنے بس بھر آپ کی پوری مدد کی۔ وہ آپ کے دشمنوں کے مقابلہ میں آپ کی چٹان بن گئے۔ انھوں نے اپنے آبائی دین کو نہ چھوڑا۔ مگر انسانی حیثیت سے آخر وقت تک وہ آپ کا ساتھ دیتے رہے۔ حتیٰ کہ جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بائیکاٹ کیا اور آپ کو مع اپنے خاندان کے ایک خشک پہاڑ کے درہ (شعب ابی طالب) میں محصور ہونا پڑا، اس وقت بھی ابوطالب آپ کے ساتھ رہے۔ اگرچہ یہ تین سال کی مدت اتنی سخت تھی کہ وہ بیمار پڑ گئے اور بالآخر بعثت کے دسویں سال (۶۲۰ء) ان کا انتقال ہو گیا۔ ابوطالب نے آپ کے مشن سے اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی اپنے بھتیجے کے وہ سارے حقوق مکمل طور پر ادا کئے جو خاندان کے بڑے ہونے کی حیثیت سے ان پر آتے تھے۔

۳۔ آمنہ بنت وہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ تھیں۔ آپ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ آپ کے والد عبد اللہ (۵۴۵ - ۵۷۰ء) کا انتقال ہو گیا۔ عبد اللہ کا ننہال مدینہ (یثرب) میں تھا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھ سال تھی کہ آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں تاکہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کر سکیں۔ ایک مہینہ سے کچھ زیادہ قیام کر کے مکہ واپس آرہی تھیں کہ راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ آمنہ کی عمر اس وقت تقریب ۲۵ سال تھی۔ اس سفر میں آپ کی باندی ام ایمن حبشیہ آپ کے ساتھ تھیں۔ ام ایمن نے کچھ لوگوں کی مدد سے موجودہ جنت المعلیٰ میں ان کو دفن کیا اور آپ کے چھ سالہ بچہ کو ساتھ لاکر ان کے دادا عبد المطلب کے حوالے کر دیا۔ آمنہ نے تاریخ کے سب سے بڑے انسان کو پیدا کیا، اگرچہ وہ اس کی عظمت کو دیکھنے کے لئے زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکیں۔

۴۔ حضرت خدیجہ بنت خُویلد مکہ کی ایک نہایت شریف اور مالدار خاتون تھیں۔ ان کے والد خُویلد بن اسد ایک اچھے تاجر تھے۔ وہ اپنی لڑکی کے لئے کافی سرمایہ چھوڑ کر مرے۔ پھر خدیجہ کی شادی مکہ کے دو تاجروں سے ہوئی۔

اولاً ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے، اور ان کے مرنے کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی سے۔ یہ دونوں کچھ کچھ عرصہ کے بعد انتقال کر گئے اور حضرت خدیجہ کو دونوں کی دولت وراثت میں ملی۔ اس طرح حضرت خدیجہ بیوہ ہونے کے باوجود مکہ کی سب سے زیادہ مال دار خاتون بن گئیں۔ قریش کے شرفاء اور دولت مند لوگ ان سے نکاح کی خواہش کرنے لگے۔ اسی درمیان میں ایک تجارتی تعلق کے ذیل میں ان کا تعارف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ آپ دنیوی دولت سے خالی تھے مگر حضرت خدیجہ آپ کے کردار اور آپ کی شرافت سے متاثر ہوئیں اور خود ہی آپ سے نکاح کا پیغام بھجوایا۔ چنانچہ دونوں کا نکاح ہوگیا۔ نکاح کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال تھی۔ جنت المعلیٰ میں حضرت خدیجہ کی قبر ہر آنے جانے والے کو یاد دلاتی ہے کہ تم کو دولت کے مقابلہ میں کردار کو اہمیت دینا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری ملی تو وہ فوراً آپ پر ایمان لائیں۔ اس مشن میں آپ کو سخت ترین مصیبتیں پیش آئیں۔ حضرت خدیجہ کی ساری دولت اس مشن کی راہ میں خرچ ہوگئی مگر انھوں نے کبھی اُف نہ کیا۔ ہر سختی جو آپ پر پڑی اس کو سہنے میں وہ برابر کی شریک رہیں۔ وہ آپ کی صرف بیوی نہ تھیں بلکہ پورے معنوں میں آپ کی زندگی کی ساتھی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہ رض بتاتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر کسی مقام پر تھے کہ حضرت جبریل آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ خدیجہ آپ کے لئے کھانا لئے ہوئے آرہی ہیں۔ جب وہ آپ کے پاس آئیں تو ان کے رب کی طرف سے اور پھر میری طرف سے ان کو سلام کہئے اور ان کو جنت کے ایک محل کی بشارت دے دیجئے جو موتیوں کا بنا ہوا ہوگا۔ اس محل میں نہ کوئی شور ہوگا اور نہ کوئی تکلیف (بخاری و مسلم) حضرت خدیجہ کا انتقال نبوت کے دسویں سال (۶۲۰ء) میں ہوا۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار فرمایا: خدیجہ مجھ پر ایمان لائیں جب کہ لوگوں نے میرا انکار کر دیا۔ انھوں نے میری تصدیق کی جب کہ لوگوں نے مجھ کو جھٹلایا۔ انھوں نے اپنے مال میں مجھ کو شریک کیا جب کہ لوگوں نے مجھ کو مال سے روکا۔ حضرت خدیجہ کی قبر تاریخ کی انتہائی معیاری خاتون کی یاد دلاتی ہے، ایسی خاتون جو اپنے رفیق زندگی کے لئے کبھی مسئلہ نہیں بنی۔ جس نے تکلیف کے دنوں میں بھی اپنے رفیق زندگی کا اسی طرح ساتھ دیا جس طرح آرام کے دنوں میں۔

۵۔ جنت المعلیٰ کے باسیوں میں حضرت عبداللہ بن زبیر بھی ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ اپنے والد کے بعد ایمان لائے۔ رسول اللہ کے زمانہ میں ان کا شمار نوعمر صحابہ میں ہوتا تھا۔ خدا ترس ہونے کے ساتھ وہ ایک بہادر اور مدبر انسان تھے۔ وہب بن کیسان کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن زبیر رض نے مجھ کو نصیحت نامہ بھیجا اور اس میں لکھا: خدا سے ڈرنے والا وہ ہے جس نے بلاؤں پر صبر کیا اور اللہ کے فیصلہ پر راضی رہا اور نعمتوں کا شکر ادا کیا اور قرآن کے حکم کے آگے جھک گیا (من صبر علی البلاء ورضی بالقضاء وشکر النعماء وذل لحکم القرآن)

خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب رض کے بعد خلافت کا بار سنبھالنے کے لئے پورے عالم اسلام میں جو چند شخصیتیں موزوں ترین تھیں ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن زبیر تھے۔ وہ بہادری اور دانش مندی اور تقویٰ

میں کمال درجہ رکھتے تھے۔ حجاز اور عراق کے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ تاہم وہ عبدالملک بن مروان کے عامل حجاج بن یوسف سے جنگ کرتے ہوئے ۷۳ھ میں شہید ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کی قبر ایک ایسے بلند انسان کی یاد دلاتی ہے جو حق کے آگے پوری طرح جھکا ہوا تھا مگر وہ ظلم اور بے انصافی کے آگے جھکنا نہیں جانتا تھا۔

۶۔ ابوجعفر منصور (۱۵۸ - ۱۰۱ھ) عباسی خلفاء میں ایک نہایت قابل اور مدبر خلیفہ تھا۔ یہی خلیفہ ہے جس نے عراق کے شہر بغداد کی بنیاد رکھی اور اس کو اتنی ترقی دی کہ اپنے وقت میں وہ علم اور سیاست دونوں اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اس کے زمانہ میں عجمی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کثرت سے عربی زبان میں ہوئے۔ سنسکرت کی کتاب کا مشہور عربی ترجمہ کلیلہ و دمنہ بھی اسی کے زمانہ میں ہوا۔ تمام حکمرانوں کی طرح اگرچہ اس نے بھی اپنے سیاسی حریفوں پر مظالم کئے اور ان کو قتل کرایا۔ تاہم پرامن رعایا کے لئے وہ ایک بہترین حکمراں کی حیثیت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوجعفر منصور موٹا کپڑا پہنتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس کے کرتے میں پیوند دکھائی دیتے تھے۔ اسی بنا پر جعفر بن محمد صادق نے اس کے بارے میں کہا تھا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے منصور کو بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی ذات کے لئے فقر میں مبتلا کر دیا ہے۔

ابوجعفر منصور ذی قعدہ ۱۵۸ھ میں بغداد سے مکہ کے لئے حج کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ مگر وہ مکہ کے قریب پہنچا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا اور وہیں حالت سفر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے بعد اس کو قریبی قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن کر دیا گیا۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ زینب، رُقیہ، ام کلثوم، فاطمہؓ۔ یہ چاروں صاحبزادیاں حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں۔ ان میں سے ابتدائی تین صاحبزادیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں انتقال کر گئیں۔ حضرت فاطمہ نے آپ کی وفات کے چھ ماہ بعد تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لڑکوں کی تعداد تین تھی۔ تینوں لڑکے بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ ان میں سے قاسم اور عبداللہ حضرت خدیجہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور مکہ کے ابتدائی زمانہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تیسرے صاحبزادہ ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں ۱۰ھ میں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں دفن کئے گئے۔ ابراہیم بہت تندرست اور ہونہار تھے وہ شکل و صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ ملتے جلتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گود میں اٹھا لیا اور کہا: اے ابراہیم، اللہ کے فیصلہ کے مقابلہ میں ہم تمہارے کچھ کام نہیں آسکتے (یا ابراهیم لا نغنی عنک من اللہ شیئا)

نوٹ: یہ تقریر ۳ نومبر ۱۹۸۰ء کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

اللہ کو بہت یاد کرو

حافظ حامد حسن علوی (۱۹۵۹ ۔ ۱۸۷۲) اعظم گڑھ کے ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کے خلیفہ مولانا سعید احمد صاحب مرحوم نے ایک بار حافظ صاحب قبلہ سے پوچھا کہ قرآن میں آتا ہے کہ اللہ کا ذکر کثیر کرو (احزاب ۴۱) اس کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے پوچھا کہ ذکر کثیر (بہت یاد) کا اطلاق کتنے عدد پر ہوتا ہے تو لوگوں نے مختلف اعداد بتائے۔ کسی نے کہا ۲۵ ہزار بار اللہ کا نام لینا ذکر کثیر ہے، کسی نے کہا ۵۰ ہزار بار ذکر کرنا ذکر کثیر ہے۔ مگر ۲۵ ہزار یا ۵۰ ہزار تو گنتی کی حد نہیں ہیں۔ ان سے آگے بھی گنتیاں ہیں۔ اس قسم کے کسی محدود عددی نصاب کو ذکر کثیر کیسے کہا جا سکتا ہے۔ خدا لامحدود ہے، اس لئے اس کا ذکر کثیر بھی ایسی گنتی پر ختم ہونا چاہئے جو گنتی کی آخری حد ہو۔

حافظ حامد حسن علوی نے جواب دیا: ذکر کے معنی ہیں عدم نسیان۔ نہ بھولنے کی حالت۔ مثلاً ایک شخص کو حکومت کا افسر یہ حکم سنا دے کہ اتوار کے دن تم کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ تو اس خبر کو سننے کے بعد اگرچہ وہ آدمی روزمرہ کے معمولات میں مشغول نظر آئے گا۔ وہ کھائے پیئے گا، بیوی بچوں کے ساتھ رہے گا۔ مگر اس کا ذہن ہر لمحہ پھانسی کے ذکر (یاد) میں مشغول رہے گا۔ وہ کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہو پائے گا۔ بس اس مثال سے ذکر کی حقیقت سمجھ سکتے ہو۔

ذکر حقیقۃً ایک مستقل یاد کا نام ہے نہ کہ کوئی عددی نصاب پورا کرنے کا۔ جب آدمی اللہ کو پا لیتا ہے تو وہ اس کی روح میں سما جاتا ہے، وہ اس کے خون میں تیرنے لگتا ہے۔ ہر موقع پر اس کو خدا کا خیال آتا رہتا ہے۔ زندگی کا ہر واقعہ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ اسی کا نام ذکر ہے۔ یہ یاد کبھی سینہ کی کسک بن کر اس کو تڑپا دیتی ہے۔ کبھی اس کے دل کو پگھلا کر آنسوؤں کی صورت میں بہہ پڑتی ہے۔ کبھی خوف یا محبت کے کلمہ کی صورت میں اس کی زبان پر آجاتی ہے۔ کبھی شکر یا دعا بن کر اس کی زبان سے ٹپک پڑتی ہے۔

ذکر کسی قسم کے رٹے ہوئے الفاظ کو دہرانا نہیں ہے، ذکر دل کی ایک حالت کا نام ہے۔ دل کے کے اندر اٹھنے والی یہ موجیں کبھی الفاظ کی صورت میں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں، یہ الفاظ ذکر و دعا کے معروف الفاظ بھی ہو سکتے ہیں اور غیر معروف الفاظ بھی، وہ عربی میں بھی ہو سکتے ہیں اور آدمی کی اپنی مادری زبان میں بھی۔ مگر ذکر یقینی طور پر کسی قسم کے تکرار الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ اس قلبی حالت کا نام ہے جس کے نتیجہ میں خدا کو یاد کرنے والے الفاظ زبان سے نکل پڑتے ہیں۔ الفاظ کی تکرار کو ذکر کہنا ایسا ہی ہے جیسے ریکارڈ کی آواز کو ایک زندہ انسان کا کلام کہا جائے۔

بندوں کے ساتھ جو کروگے وہی خدا تمھارے ساتھ کرے گا

عمرو بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت معاویہ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: جو حاکم ضرورت مندوں اور کمزور لوگوں کے لئے اپنا دروازہ بند کرے گا تو اللہ اس کی حاجت اور اس کی ضرورت اور اس کی مسکینی کے وقت اس کے لئے آسمان کے دروازے بند کردے گا (ما من امام یُغلق بابہ دون ذوی الحاجۃ والخَلّۃ والمسکنۃ الا اغلق اللہ ابواب السماء دون خلتہ وحاجتہ ومسکنتہ، ترمذی)

برائی کا جواب بھلائی سے دینا

قال عمر: ما عاقبتَ من عصی اللہ فیکَ بمثل ان تطیع اللہ فیہ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۲۶۴)

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص تمھارے معاملہ میں اللہ کی نافرمانی کرے، اس کا سب سے اچھا بدلہ یہ ہے کہ تم اس کے معاملہ میں اللہ کی فرماں برداری کرو

لوگوں کے شر سے بچنے کے لئے صبر کرو

حضرت احنف بن قیس تابعی فرماتے ہیں: جو شخص ایک کڑوی بات پر صبر نہیں کرے گا اس کو بہت سی کڑوی باتیں سننی پڑیں گی۔ بہت بار میں غصہ کو اس لئے پی گیا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس سے بھی زیادہ سخت چیز کا اندیشہ تھا (من لم یصبر علی کلمۃ سمع کلمات ورب غیظ تجرعتہ مخافۃ ما ھو اشد منہ)

کسی کے خلاف زیادتی ہوجائے تو اس کی تلافی کے لئے اس کے حق میں دعا کیجئے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اللّٰھم انی اتخذ عندک عھدا لن تخلفہ۔ انما انا بشر فای المومنین آذیتہ او شتمتہ او جلدتہ او لعنتہ فاجعلھا صلاۃ وزکاۃ وقربۃ تقربہ بھا یوم القیامۃ (صحیفہ ابن منبہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! میں تجھ سے ایک عہد لیتا ہوں تو اس کے خلاف نہ ہونے دے۔ میں صرف ایک بشر ہوں، پس میں نے جس مسلمان کو تکلیف دی ہو یا اس کو گالی دی ہو یا اس کو مارا ہو یا اس پر لعنت کی ہو تو تو اس کو اس شخص کے حق میں رحمت اور پاکیزگی بنادے اور اس کو قربت بنادے جس کے ذریعہ وہ قیامت کے دن تیرا قرب حاصل کرے۔

جو دوسرے کا برا چاہے وہ اپنا نقصان کرتا ہے

قال ابو العیناء قلت لاحمد بن ابی دواد ان قوما تظاھروا علیّ۔ قال: ید اللہ فوق ایدیھم (فتح) قلت انھم عدد وانا واحد۔ قال: کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ (بقرہ) قلت ان للقوم مکرا۔ قال: ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ (فاطر)

ابو العیناء کہتے ہیں۔ میں نے احمد بن ابی دواد سے کہا کہ کچھ لوگوں نے میرے اوپر چڑھائی کی ہے۔ انھوں نے کہا اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔ میں نے کہا وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں اور میں اکیلا ہوں۔ انھوں نے کہا کتنے چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے گروہ پر غالب آئے ہیں۔ میں نے کہا ان لوگوں نے تدبیریں کر رکھی ہیں۔ انھوں نے کہا بری تدبیر کا

وہاں تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے (قرآن)

ناحق میں کسی کا ساتھ دینا گناہ ہے

واسلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ عصبیت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ تم ظلم میں اپنے لوگوں کی حمایت کرو (ان تعین قومک علی الظلم، ابوداؤد)

ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا خواہ وہ کمزور ہو یا طاقت ور

معاویہ بن ابی سفیان نے ضرار صدائی سے کہا کہ اے ضرار، مجھ سے علی کی صفت بیان کرو (یاضرار صف علیا) اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کہا اس کے چند جملے یہ تھے: وہ ہمارے اندر ایک شخص کی مانند تھے۔ کوئی طاقت ور اپنے باطل میں ان سے امید نہ کرسکتا تھا اور کوئی کمزور ان سے عدل پانے میں مایوس نہ ہوسکتا تھا (کان فینا کاحدنا لا یطمع القوی فی باطلہ ولا ییأس الضعیف من عدلہ)

جو معافی طلب کرے اس کی معافی قبول کرو

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَنْ اَتَاہُ اَخُوْہُ مُتَنَصِّلاً فَلْیَقْبَلْ ذٰلِکَ مُحِقًّا کَانَ اَوْ مُبْطِلاً فَاِنْ لَمْ یَفْعَلْ لَمْ یَرِدْ عَلَیَّ الْحَوْضَ (ترغیب وترہیب بحوالہ حاکم)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس آدمی کے پاس اس کا مسلمان بھائی صفائی کرنے کے لئے آئے تو اس کو چاہئے کہ اس کا عذر قبول کرے خواہ وہ صحیح کہہ رہا ہو یا غلط۔ اگر وہ عذر قبول نہ کرے گا تو وہ حوض کوثر پر مجھ تک نہیں پہنچے گا۔

قرآن میں غیبت کی تین قسمیں

قال الحسن الغیبۃ ثلاثۃ اوجہ کلھا فی کتاب اللہ تعالیٰ: الغیبۃ والافک والبھتان۔ فاما الغیبۃ فھو ان تقول فی اخیک ماھو فیہ۔ واما الافک فان تقول فیہ مابلغک۔ واما البھتان فان تقول فیہ مالیس فیہ

حسن بصری نے کہا، غیبت کی تین صورتیں ہیں۔ غیبت، افک اور بہتان۔ غیبت یہ ہے کہ اپنے بھائی کے بارے میں وہ بات کہو جو اس کے اندر موجود ہے۔ افک یہ ہے کہ اس کے بارے میں وہ بات کہو جو تم کو پہنچے۔ بہتان یہ ہے کہ اس کے بارے میں وہ بات کہو جو اس کے اندر نہیں ہے۔

مومن کا سلوک دوسروں کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہا:

قد ترک نفسہ من ثلاث: المراء والاکبار وما لا یعنیہ۔ وترک الناس من ثلاث: کان لا یذم احدا ولا یعیبہ ولا یطلب عورتہ ولا یتکلم الا فیما رجا ثوابہ (الشمائل للترمذی)

تین چیزوں سے آپ نے اپنے آپ کو بچا رکھا تھا۔ جھگڑا، گھمنڈ اور لایعنی کام۔ اور لوگوں کو بھی تین چیزوں سے محفوظ رکھا تھا۔ آپ کسی کی برائی نہ کرتے، کسی کو عیب نہ لگاتے۔ آپ کسی کی کمزوریوں کے پیچھے نہ پڑتے۔ آپ صرف اس معاملہ

میں گفتگو کرتے جس سے کسی ثواب کی امید ہوتی۔

کم بولنا اور کسی کے خلاف دل میں شکایت نہ ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا۔ لوگ ان کے پاس آئے تو دیکھا کہ ان کا چہرہ چمک رہا ہے لوگوں نے سبب پوچھا تو انھوں نے کہا: میرے پاس اپنے اعمال میں سب سے زیادہ قابل اعتماد میری دو عادتیں ہیں۔ ایک یہ کہ میں بے فائدہ بات نہیں کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ میرا دل مسلمانوں کے معاملہ میں بالکل صاف تھا (کنت لا اتکلم فیما لا یعنینی و کان قلبی سلیماً للمسلمین، جامع العلوم والحکم ۹۹)

برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کرنا

عن عُبادۃَ بنِ الصامتِ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا اَدُلُّکُمْ علی ما یَرفَعُ اللہُ بہ الدَّرَجاتِ۔ قالوا نعم یا رسول اللہ قال تَحلُمُ علیٰ مَن جَہِلَ علیکَ وتعفوا عمن ظَلَمَکَ وتعطی من حَرمکَ وتصلُ من قَطَعَکَ۔ (ترغیب وترہیب بحوالہ بزار وطبرانی)

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تم کو وہ کام نہ بتاؤں جس سے اللہ درجات کو بلند کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا: جو تمھارے ساتھ جہالت کرے اس کے ساتھ تم بردباری کرو۔ جو تمھارے اوپر ظلم کرے اس کو تم معاف کردو۔ جو تم کو نہ دے تم اس کو دو۔ جو تمھارے ساتھ قطع رحم کرے تم اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔

غصہ پی جانے سے ایمان بڑھتا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے حالاں کہ وہ اس کو نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو اللہ اس کے دل کو ایمان اور سکون سے بھر دیتا ہے (من کظم غضبا وھو یقدر علی انفاذہ ملأ اللہ قلبہ امنا وایمانا)

عبادت، اتحاد، خیر خواہی

صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تین عمل سے راضی ہوتا ہے۔ وہ اس پر راضی ہوتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور اللہ کی رسی کو خوب پکڑ لو اور متفرق نہ ہو۔ اور جو تمھارے معاملات کا ذمہ دار ہو اس کے ساتھ خیر خواہی کرو۔ مسند احمد میں جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے خیف میں خطبہ دیتے ہوئے کہا: تین چیزیں ہیں جن کے بارے میں مومن کا قلب کبھی خیانت نہیں کرتا۔ خالص اللہ کے لئے عمل۔ امراء کے ساتھ خیر خواہی اور مسلمانوں کی جماعت کو پکڑے رہنا (اخلاص العمل للہ ومنا صحۃ ولاۃ الامر ولزوم جماعۃ المسلمین)

گمان کی بات پر نہ جاؤ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گمان کی تحقیق نہ کرو (اذا ظننتم فلا تحققوا۔ احکام القرآن للجصاص)

جس کی بات ہو خود اس سے تحقیق کئے بغیر نہ ماننا

ابو العالیہ تابعی (متوفی ۹۳ھ) کہتے ہیں: ہم بصرہ میں لوگوں سے سنتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ایسا کہا ہے۔ مگر ہم اس طرح سننے پر راضی نہ ہوتے تھے بلکہ ہم سوار ہو کر مدینہ جاتے اور وہاں صحابی کی اپنی زبان سے حدیث کو سنتے (کنا نسمع الروایۃ عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن بالبصرۃ۔ فما نرضی حتی نرکب الی المدینۃ فنسمعھا من افواھھم، الکفایہ فی علم الروایہ، خطیب بغدادی صفحہ ۴۰۳)

عمومی فساد ہمیشہ انفرادی شرارت سے پیدا ہوتا ہے

واذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرنٰھا تدمیرا (اسراء ۱۶)

اور جب ہم کسی بستی کو غارت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سرکش لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ پھر وہ شرارت کرتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

اس آیت کی تشریح میں حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا: یعنی ان کے اوپر ہم ان کے شریر لوگوں کو مسلط کر دیتے ہیں۔ پھر وہ نافرمانی کرتے ہیں۔ جب وہ ایسا کر لیتے ہیں تو اللہ ان کو عذاب بھیج کر ہلاک کر دیتا ہے (سلطنا اشرارھا فعصوا فیھا فاذا فعلوا ذلک اھلکھم اللہ بالعذاب، تفسیر ابن کثیر)

اجازت نہ ملے تو برا مانے بغیر واپس آجانا

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایزید علی ثلاث تسلیمات فان اذن لہ والا انصرف (رواہ البزار عن انس بن مالک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے یہاں جاتے تو تین بار سلام کرتے۔ اگر اجازت مل جاتی تو ملتے ورنہ واپس ہو جاتے۔

اپنی ذات سے زیادہ ماں باپ کا خیال کرنا

حضرت ابو ہریرہ کو اپنے ماں کے حقوق ادا کرنے کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔ مدنی زندگی کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں اپنے گھر سے نکلا اور مسجد پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اور بھی کئی لوگ ہیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت تم کو کیا چیز یہاں لے آئی ہے۔ میں نے کہا بھوک۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم ہم بھی صرف بھوک کی وجہ سے اس وقت یہاں آئے ہیں۔ پھر ہم سب لوگ اٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ آپ نے پوچھا کہ اس وقت تم لوگ کیسے یہاں آئے۔ ہم نے بتایا۔ آپ نے ایک برتن منگوایا جس میں کھجوریں تھیں۔ آپ نے ہم میں سے ہر شخص کو دو کھجوریں دیں اور کہا کہ ان دو کھجوروں کو کھاؤ اور اس کے بعد پانی پیو۔ وہ تمھارے آج کے لئے کافی ہو جائیں گی۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک کھجور کھائی اور دوسری کھجور چھپا کر رکھ لی۔ آپ نے فرمایا: اے ابو ہریرہ تم نے کیوں ایک کھجور رکھ لی۔ میں نے کہا کہ اپنی ماں کے لیے۔ آپ نے فرمایا: اس کو کھاؤ، تمھاری ماں کے لئے ہم اور دو کھجوریں دے دیں گے۔

مسلمان کی ہر مصیبت اپنی لائی ہوئی ہوتی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز رات کو باہر نکلے۔ آپ انصار کی ایک بستی بنو معاویہ کی مسجد میں داخل ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد غیر معمولی طور پر لمبی دعا فرمائی۔ حضرت خباب کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے خدا کے رسول، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آج کی رات آپ نے ایسی نماز پڑھی جیسی نماز اس سے پہلے میں نے آپ کو پڑھتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں وہ رغبت اور خوف کی نماز تھی۔ میں نے اللہ عزوجل سے تین چیزیں مانگیں۔ اللہ نے مجھ کو دو چیزیں دے دیں اور ایک سے انکار فرمایا۔ میں نے اپنے رب سے مانگا کہ ہم کو اس طرح ہلاک نہ کرے جس طرح پچھلی امتوں کو ہلاک کیا تھا۔ اللہ نے اس کو قبول فرمایا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہمارے اوپر ہمارے علاوہ کسی دشمن کو غالب نہ کرے۔ اللہ نے اس کو قبول فرمایا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ایسا نہ کرے کہ ہم کو گروہوں میں تقسیم کر دے (اور ایک کو دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھائے) اللہ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ سألت ربی عز وجل ثلاث خصال فاعطانی اثنتین ومنعنی واحدۃ۔ سألت ربی ان لا یھلکنا بما اھلک بہ الامم فاعطانیھا۔ وسألت ربی ان لا یظھر علینا عدوا من غیرنا فاعطانیھا وسألت ربی ان لا یلبسنا شیعا رفیذیق بعضھم بأس بعض) فمنعنیھا، رواہ الترمذی)

سخت بات پر مشتعل نہ ہونا

خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک روز لوگوں کے سامنے کہا کہ تم میں سے جو شخص میرے اندر ٹیڑھ دیکھے تو وہ اس کو سیدھا کر دے۔ یہ سن کر ایک آدمی اٹھا اور کہا: خدا کی قسم اگر ہم تمہارے اندر ٹیڑھ دیکھیں گے تو اس کو ہم اپنی تلوار سے سیدھا کر دیں گے۔ حضرت عمر رض نے فرمایا: اس خدا کا شکر ہے جس نے امت محمدؐ میں ایسے لوگ بنائے جو عمر کی ٹیڑھ کو تلوار سے سیدھا کر دیں (خاطب عمر بن الخطاب اصحابہ ذات یوم فقال: من رأى منکم فیّ اعوجاجا فلیقومہ، فنھض رجل وقال: واللہ لو وجدنا فیك اعوجاجا لقومناہ بسیوفنا۔ فقال عمر: الحمد للہ الذی جعل فی امۃ محمد من یقوم اعوجاج عمر بالسیف)

اجتماعی زندگی ہر حال میں ضروری ہے

عن ابی الدرداء قال سمعتُ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقولُ مامن ثلثۃٍ فی قریۃٍ ولا بدوٍ لا تُقامُ فیھمُ الصلوٰۃُ الا استحوذ علیھم الشیطانُ فعلیکمُ بالجماعۃِ فانّما یاکل الذئبُ من الغنم القاصیۃَ وان ذئبَ الانسانِ الشیطانُ اذا خلا بہ اکلہ (ترغیب وترہیب)

حضرت ابو الدرداء رض کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: جس بستی یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور وہاں باجماعت نماز نہ ہوتی ہو تو ان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ اس لئے جماعت کو ضروری سمجھو۔ بھیڑیا اکیلی بکری کو کھا جاتا ہے اور آدمیوں کا بھیڑیا شیطان ہے۔

اختلاف کو تعلقات کے بگاڑ تک نہ لے جانا

امام طبری نے روایت کیا ہے کہ ایک بار حضرت خالد بن ولید اور حضرت سعد بن وقاص میں کسی ذاتی معاملہ میں اختلاف ہو گیا۔ اس کے بعد کسی شخص نے حضرت سعد کے سامنے حضرت خالد کا ذکر برے الفاظ میں کرنا چاہا۔ حضرت سعد نے فوراً اس آدمی کو روک دیا اور کہا: اس کو چھوڑ دو، میرے اور خالد کے درمیان جو اختلاف ہے وہ میرے اور ان کے دینی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا (مه، فان ما بیننا لم یبلغ دیننا، مجمع الزوائد)

متحد رہنا اور اقدام میں پہل نہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو، ہجرت کے دسویں سال نجران (یمن) بھیجا۔ انھوں نے وہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ خالد بن ولیدؓ واپس ہوئے تو ان کے ساتھ بنو حارث بن کعب کے لوگ مسلمان ہو کر مدینہ آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: جاہلیت کی جنگوں میں تم کس طرح ہمیشہ غالب رہتے تھے۔ انھوں نے کہا: ہم کسی پر غلبہ حاصل نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا ہاں، مگر جو تم سے جنگ کرتا تھا، تم اس کے اوپر غالب رہتے تھے۔ انھوں نے کہا: اے خدا کے رسول جو ہم سے جنگ کرتا تھا ہم اس پر غالب رہتے تھے۔ ہم متحد رہتے تھے کبھی متفرق نہیں ہوتے تھے۔ اور کسی کے اوپر ظلم سے آغاز نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا (کنا نغلب من قاتلنا یا رسول اللہ، انا کنا نجتمع ولا نفترق ولا نبدأ احدا بظلم، قال صدقتم، ابن ہشام، جزء ثانی، ۱۳۴)

بغض آدمی کے دین کو کھا جاتا ہے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بغض مونڈنے والی چیز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا وہ بال کو مونڈتا ہے بلکہ وہ دین کو مونڈ دیتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے تم جنت میں نہیں داخل ہو سکتے جب تک مومن نہ بنو اور مومن نہیں بن سکتے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔ (البغضاء هی الحالقة، لا اقول تحلق الشعر ولکن تحلق الدین۔ والذی نفس محمد بیده لا تدخلوا الجنة حتیٰ تؤمنوا، ولا تؤمنوا حتیٰ تحابوا، جامع بیان العلم، جزء ثانی، صفحہ ۱۵۰)

بحث و جدال نیکی کو مٹا دیتا ہے

عوام بن حوشب نے کہا: لوگو دین میں جھگڑا کرنے سے بچو کیونکہ دین میں جھگڑا کرنے سے آدمی کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں (عن العوام بن حوشب قال ایاکم والخصومات فی الدین فانها تحبط الاعمال، ابن عبد البر جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۹۳)

آپس کا اختلاف نہ ہو تو دشمن کا کوئی خطرہ نہیں

عن عوف ابن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لن یجمع اللہ علیٰ هذه الامة سیفین سیفاً منها وسیفاً من عدوها (ابوداؤد)

عوف بن مالک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس امت پر کبھی دو تلواروں کو جمع نہیں کرے گا۔ اس کی اپنی تلوار اور اس کے دشمن کی تلوار

حساب سے پہلے حساب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا میں اپنا حساب کرلو، اس سے پہلے کہ آخرت میں تمھارا حساب لیا جائے (حاسِبوا انفسکم قبلَ ان تُحاسَبوا) مرنے کے بعد تمام لوگ آخرت میں خدا کی عدالت میں کھڑے کئے جانے والے ہیں، خدا کی عدالت عالم الغیب کی عدالت ہے۔ وہاں کوئی شخص اپنی کسی بات کو چھپا نہ سکے گا۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ خدا کے یہاں جس کی جانچ ہوگئی وہ ہلاک ہونے سے بچ نہیں سکتا (من نوقش فقد هلك) عقلمند وہ ہے جو آخرت میں خدا کی عدالت میں کھڑا ہونے سے پہلے دنیا میں اپنے کو اپنی ضمیر کی عدالت کے سامنے کھڑا کرلے اور حساب کتاب پیش آنے سے پہلے اپنے کو درست کرلے جو شخص اپنا حساب کئے بغیر مرجائے گا، اس کا حساب خدا کرے گا۔ اور جس کا حساب خدا کرے اس کو کون بچا سکتا ہے۔

آدمی کو پیدائشی طور پر ضمیر دیا گیا ہے جو اس کو ہر بری بات پر ٹوکتا ہے۔ آدمی کے پاس خدا اور رسول کی ہدایتیں پہنچتی ہیں جن سے وہ صحیح اور غلط میں تمیز کرسکتا ہے۔ اسی ضمیر اور اسی علم کی روشنی میں اپنے کو جانچنے کا نام اپنا حساب آپ کرنا ہے۔

آپ کے ساتھ کوئی شخص غلط سلوک کرے، کسی سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو فوراً آپ کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ آپ اس کو ذلیل اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کی نظر میں اس سے زیادہ برا اور کوئی شخص نہیں ہوتا۔

مومن وہ ہے جس کے اندر یہی شدت احساس خود اپنی غلطیوں کے بارہ میں پیدا ہو جائے۔ اس سے کوئی غلطی ہو تو فوراً وہ جان لے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اپنی غلطیوں کو جاننے کے لئے وہ اتنا ہی حساس ہو جائے جتنا کوئی شخص دوسرے کی غلطیوں کو جاننے کے لئے ہوتا ہے۔ غلطی سرزد ہوتے ہی وہ تڑپ اٹھے کہ مجھ سے ایسا فعل ہوگیا جو مجھ کو خدا سے دور کردینے والا ہے۔ جو مجھ کو آخرت میں بے قیمت بنا دینے والا ہے۔ اس کا یہ احساس اتنا شدید ہو کہ اپنا وجود اس کو اپنی نظر میں حقیر معلوم ہونے لگے۔ اپنے احتساب کے لئے وہ اس سے زیادہ بے رحم ہو جائے جتنا کوئی شخص اپنے دشمن کے احتساب کے لئے ہوتا ہے۔

ایسے ہی لوگ اللہ والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیا تاکہ ان کے لئے اللہ کے یہاں جنت ہو۔ جو لوگ دنیا میں اس قسم کی متقیانہ زندگی کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی دنیا میں جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ ان کا رب ان سے ملاقات کے عظیم دن کہے گا کہ آج تمھارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ ان کے لئے جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جائیں گے اور خدا کی طرف سے پکارنے والا پکارے گا: ابدی باغوں میں بنے ہوئے یہ جنتی مکانات آج تمھاری وراثت میں دے دیئے گئے۔ جس دروازہ سے چاہو اس میں داخل ہو جاؤ۔ آج کے بعد نہ تمھارے لئے کوئی غم ہے اور نہ تکلیف۔

خدا کے دوست

من ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله تعالیٰ قال: من عادیٰ لی ولیا فقد آذنته بالحرب وما تقرب الیّ عبدی بشیءٍ احبّ الیّ مما افترضته علیه ولا یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتیٰ احبّه فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یُبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها ولئن سألنی لاعطینّه ولئن استعاذنی لاعیذنّه (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کرے تو میں اس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیتا ہوں۔ میری سب سے زیادہ محبوب چیز جس سے میرا بندہ میری قربت حاصل کرتا ہے وہ ہے جو میں نے اس کے اوپر فرض کی ہے۔ اور میرا بندہ نفل اعمال کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پھر جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور اس کو دیتا ہوں اگر وہ میری پناہ چاہے تو میں ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں بندوں کے اوپر فرض کی ہیں۔ مثلاً پانچ وقت کی نماز۔ سال میں مقرر شرح سے زکاۃ، جائز حدود میں کمائی وغیرہ۔ مگر آدمی کا تعلق جب اللہ سے بڑھتا ہے تو اس کا عمل فرض کے دائرہ میں محدود نہیں رہتا۔ اللہ کی طرف بڑھی ہوئی توجہ اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ حد سے آگے بڑھ کر عمل کرے۔ وہ پانچ وقتوں کے علاوہ اوقات میں بھی اللہ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ وہ مقررہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ وہ اللہ کے کام میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ جائز حدود میں کمائی کرنے کا موقع بھی اس کے لئے باقی نہیں رہتا۔ کوئی آدمی جب اپنے کو اللہ میں اس طرح شامل کرتا ہے تو اس کے بعد اس کا پورا وجود اللہ میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ شعور کی اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا شعور اللہ کے شعور سے الگ نہیں رہتا۔ معاملات کا تجزیہ کرنا، معاملات کے بارے میں رائے قائم کرنا، معاملات میں تدبیر اختیار کرنا، غرض اس کا ہر عمل سنت الٰہی کے مطابق ہو جاتا ہے۔

اللہ کا جو بندہ اپنے آپ کو اس طرح اللہ میں شامل کرلے وہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے۔ اللہ اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو دوست کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ایسا بندۂ خدا خواہ بظاہر کمزور ہو مگر اس کی پشت پر خدا کھڑا ہوتا ہے۔ اس سے لڑنا خدا سے لڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ وہ اپنے فہم اور ذوق کے اعتبار سے ایسا بن جاتا ہے کہ خدا سے وہی چیز مانگے جو اس سے مانگنے کی ہے۔ اس لئے جب وہ مانگتا ہے تو خدا ضرور اس کی مانگ کو پورا کرتا ہے۔ وہ اس سے اسی چیز کی پناہ چاہتا ہے جس کی پناہ کے لئے خدا سے درخواست کرنا چاہیے۔ اس لئے جب وہ خدا سے پناہ مانگتا ہے تو خدا ضرور اس کو اپنی پناہ عطا کرتا ہے۔

قناعت

مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۳-۱۹۳۰) ایک مخلص عالم تھے۔ ابتداءً وہ علی گڑھ اور حیدر آباد کی یونیورسٹیوں میں استاد رہے۔ آخر عمر میں وہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڑھ) میں مقیم ہوگئے اور قرآن اور تعلیم دین کی خدمت کرتے ہوئے عمر گزار دی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی وفات کے بعد جو مضمون لکھا اس کا ایک ٹکڑا یہ تھا:

سادہ کھاتے، سادہ پہنتے، دنیا سے بہ قدر ضرورت لیتے کھانا کھا رہے ہیں، دسترخوان پر صرف دال اور روٹی ہے دال میں نمک کم ہے بلا کسی ناخوشی کے اوپر سے نمک ملایا اور چہرہ تک سے ناگواری نہ ظاہر ہونے دی۔ دوسرے دن پھر وہی کھانا آج نمک بہت زائد ہوگیا ہے اسی انداز سے اٹھے اور آج پانی ملا کر پھر اس ناخوش گوار کو خوش گوار بنا لیا شریک طالب علم کچھ جھنجلائے، کچھ دنگ رہ گئے منو سب نے بتایا فرمایا بھائی بات کچھ نہیں ایک چٹنی تیار رکھو بغیر پیسہ کوڑی کے خرچ سے تیار ہوجاتی ہے۔ جس کھانے میں ملالوگے۔ مزہ دار ہوجائے گا۔ چٹنی کا نام ہے قناعت!

قناعت محض ایک درویشانہ عادت نہیں، وہ زندگی کی ایک زبردست حقیقت ہے۔ قناعت دراصل اس پختہ مزاجی کا نام ہے کہ آدمی ان حالات کے ساتھ موافقت کرکے رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔ موجودہ دنیا میں اس مزاج کی ضرورت ایک عام آدمی کو بھی ہوتی ہے اور ایک بادشاہ کو بھی۔ عام آدمی کو اگر یہ نعمت حاصل ہوجائے تو وہ اپنے بے مزہ سالن کو ہنسی خوشی کھا کر اپنے کام میں لگ جائے گا، نہ کہ وہ اس پر غصہ ہو کر اپنے وقت اور اپنی طاقت کو خواہ مخواہ برباد کرے۔ اسی طرح اگر "بادشاہ" کو یہ نعمت مل جائے تو وہ عوام کے جمہوری رجحانات سے موافقت کرکے اپنی بادشاہت کو دیر تک باقی رکھ سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ عوامی تقاضوں سے لڑنے لگے اور بالآخر اپنے تخت و تاج کو کھو دے۔ قناعت اکثر نفسیاتی امراض کا علاج ہے۔

امریکہ کے ایک شخص نے اندیشے (Fears) کے بارے میں معلومات جمع کیں بہت سے لوگوں سے مل کر اس نے پوچھا کہ آپ کو کس قسم کے اندیشے لاحق ہوئے اور ان کا انجام کیا رہا۔ تحقیق کے بعد اس نے پایا کہ بیشتر اندیشے ایسے تھے جو صرف اندیشے ثابت ہوئے، وہ کبھی واقعہ نہیں بنے۔ حالاں کہ ان لوگوں نے اپنے ان امکانی اندیشوں کے غم میں اپنی صحتیں برباد کرلیں اور دوسرے بہت سے نقصانات کرڈالے۔

"اندیشہ" ہر آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہر آدمی اپنے حالات کے اعتبار سے طرح طرح کے اندیشوں میں

اس قسم کے پیشگی اندیشوں سے نجات مل جائے گی۔ جب آدمی کا حال یہ ہو کہ اس کو جو مل جائے اسی پر وہ راضی رہے تو اندیشوں کی بنیاد پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ قناعت کا ہر شخص کو یہ پیغام ہے —— دنیوی نقصان کا غم نہ کرو۔ اگر وہ ہو چکا ہے تو وہ ایک ہونے والی بات تھی جو ہوئی۔ اور اگر وہ صرف ایک اندیشہ ہے تو بہت سے اندیشے ایسے ہیں کہ آدمی ان کے لئے اپنے آپ کو پریشان کرتا ہے حالاں کہ وہ کبھی واقع نہیں ہوتے۔

قناعت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو دنیا کے مسائل میں غیر ضروری طور پر الجھنے سے بچاتی ہے اور اس طرح اس کو موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی قوت کو زیادہ سے زیادہ آخرت کے کاموں میں لگا سکے۔ آخرت کے مسافر کے لئے قناعت اتنی ہی ضروری ہے جتنا دنیا کے مسافر کے لئے حرص۔ جس آدمی کے اندر حرص نہ ہو وہ متاع دنیا کا مالک نہیں بن سکتا۔ اسی طرح جس کے اندر قناعت نہ ہو وہ متاع آخرت کو پانے سے محروم رہے گا۔

قناعت کی اسی اہمیت کی بنا پر دین میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ جس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور اللہ نے اس کو جو کچھ دیا اس پر اس نے قناعت کیا (قد افلح من اسلم و رُزِقَ کفافاً وقنّعہ اللہ بما آتاہ، اخرجہ مسلم والترمذی)

انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں اور دنیا کی چیزیں محدود۔ آدمی دنیا کی چیزیں خواہ کتنی ہی زیادہ حاصل کر لے وہ اس کی تسکین کے لئے ہمیشہ ناکافی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ پانے والا بھی اس دنیا میں اتنا ہی پریشان رہتا ہے جتنا کم پانے والا۔ اس لئے اس دنیا میں اگر کوئی چیز آدمی کی تسکین کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ قناعت ہے۔ کیونکہ قناعت تو ہر حد پر مطمئن ہو جاتی ہے جب کہ حرص کسی حد پر مطمئن نہیں ہوتی۔

قناعت دراصل حقیقت پسندی کا دوسرا نام ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں مختلف وجوہ سے ہماری مرضی کے خلاف واقعات پیش آتے ہیں۔ کہیں دوسرے کو زیادہ مل جاتا ہے اور ہم کو کم۔ کہیں خود اپنی حاصل شدہ چیز کو پوری طرح استعمال کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ پاتے ہیں وہ اس سے بہت کم ہوتا ہے جو ہم اپنے اندازہ کے مطابق اپنے لئے چاہتے تھے۔ کہیں کوئی ناگہانی حادثہ پیش آکر ہمارے بنے بنائے معاملہ کو بگاڑ دیتا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ نقصان کے بعد نقصان کے غم سے اپنے کو بچایا جائے۔ اور قناعت آدمی کی زندگی میں یہی اہم خدمت انجام دیتی ہے۔ قناعت آدمی کو بے صبری سے بچاتی ہے۔ وہ تلخ یادوں کو بھلاتی ہے۔ وہ زندگی کی ناخوش گواریوں کو خوش گوار بنا دیتی ہے۔

ارتقاء سائنس نہیں

ارتقاء (Evolution) کا نظریہ ایک حیاتیاتی سائنس سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ زمین پر جو مختلف قسم کے جاندار پھیلے ہوئے ہیں وہ کس طرح وجود میں آئے اور کس طرح اپنے آپ بڑھتے بڑھتے موجودہ حالت تک پہنچ گئے۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ ایک خودکار طبیعی عمل کے تحت ہوا ہے نہ کہ کسی خالق کے ارادہ کے تحت۔ ارتقاء کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا یہ نظریہ ایک سائنسی حقیقت (Scientific Fact) ہے۔ یعنی وہ اسی طرح قطعی دلائل سے ثابت ہو گیا ہے جس طرح طبیعی سائنس کی دوسری حقیقتیں ثابت ہوئی ہیں۔ مگر دلائل کے "انبار" کا جائزہ لینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض ایک دعویٰ ہے جس کے حق میں کوئی واقعی دلیل موجود نہیں۔

سائنس "جو ہے" پر بحث کرتی ہے اور نظریۂ ارتقاء "جو ہوا" پر۔ سائنس حال کا علم ہے اور ارتقاء گزرے ہوئے ماضی کا علم۔ یہی فرق ارتقاء کو سائنس سے جدا کر دیتا ہے۔ سائنس اپنے محدود موضوع کی بنا پر اس پوزیشن میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے دعوے کا عملی مشاہدہ کرا سکے۔ سائنس میں جب کسی چیز کو ثابت شدہ مانا جاتا ہے تو اس کا بنیادی عنصر یہ ہوتا ہے کہ اس کو دہرایا جا سکتا ہے اور اس کے نتائج کا ہر وقت مشاہدہ کیا جا سکتا ہے:

The key element o:' scientific proof is that you can repeat something and observe the results

ارتقاء کے حامی ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ نہ اپنے مفروضہ کو دہرا سکتے ہیں اور نہ اس کا مشاہدہ کرا سکتے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ کہنا محض مغالطہ ہے کہ ارتقاء ایک سائنسی حقیقت ہے۔

ارتقاء کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں جتنی بھی زندہ چیزیں ہیں سب کی سب ایک ہی زندہ چیز سے نکلی ہیں اور یہ ابتدائی زندہ چیز خود ایک غیر زندہ مادہ سے نکلی تھی:

Evolution is the idea that all the living forms in the world have arisen from a single source which itself came from an inorganic form
G. Kerkut, Implications of Evolutions, P. 157

اس طرح ارتقاء کا اصول دو مفروضوں پر قائم ہے۔ اول یہ کہ زندگی (Life) بے زندگی (Nonlife) سے پیدا ہوئی۔ دوسرے یہ کہ پہلی بار زندگی پیدا ہو کر بڑھتی اور پھیلتی رہی، یہاں تک کہ اسی سے زندگی کی وہ تمام قسمیں وجود میں آگئیں جن کو آج ہم زمین پر دیکھتے ہیں۔ مگر ان دونوں مفروضوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کو آج دہرایا جا سکتا ہو۔ نہ بے زندگی سے زندگی کا نکلنا کہیں دکھایا جا سکتا ہے اور نہ ایک نوع سے بہت سی نوعوں کا وجود میں آنا۔ اس لئے یہ تمام تر ایک ذہنی قیاس ہے نہ کہ کوئی مشاہداتی واقعہ، جیسا کہ سائنسی مسلمات کے معاملہ

میں ہوتا ہے۔

ارتقا بجائے خود کوئی مشاہداتی چیز نہیں۔ وہ صرف ایک نتیجہ (Conclusion) ہے جس کو ایک آدمی کچھ واقعات کو دیکھ کر اخذ کرتا ہے۔ مگر ارتقا کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں جو دوسرے متبادل مفروضات کو رد کرتی ہو۔ مثلاً زمین کی کھدائی سے زندہ اجسام کے پتھریلے ڈھانچے (Fossils) برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ڈھانچے نیچے اوپر کی تہوں میں ہیں، اس طرح ان سے زمین پر حیوانات کے بسنے کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ زمین پر تمام حیوانات بیک وقت موجود نہ تھے بلکہ ایک کے بعد ایک آباد ہوئے۔ پہلے ادنیٰ حیوانات اور اس کے بعد دھیرے دھیرے اعلیٰ حیوانات یہاں تک کہ آخر میں انسان آباد ہوا۔ اس سے ارتقا کے حامی یہ نظریہ اخذ کرتے ہیں کہ پچھلی حیاتیاتی قسموں سے اگلی حیاتیاتی قسمیں بطریق تناسل برآمد ہوتی رہیں اور انھیں میں سے ایک نوع ترقی ترقی کرتے کرتے انسان بن گئی۔

یہ ترتیب تخلیقی تاریخ کے طور پر صحیح ہو سکتی ہے۔ تاہم اس کا کوئی براہ راست ثبوت نہیں ہے کہ ایک نوع سے دوسری نوع توالد و تناسل کے ذریعہ وجود میں آئی۔ اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ آبادکاری میں زمانی فرق ہے نہ کہ ایک کے پیٹ سے دوسرے کا نکلنا۔ یہاں یکساں قوت کے ساتھ یہ دوسرا نظریہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ ہر نوع الگ الگ زمانی ترتیب کے ساتھ وجود میں آئی۔ یعنی پہلے ایک نوع، پھر دوسری نوع، پھر تیسری نوع، مثلاً یہ ممکن ہے کہ واحد الخلیہ جاندار پہلے پیدا کئے گئے ہوں۔ اور پھر ترتیب وار دوسرے جانوروں کی تخلیق عمل میں آئی ہو۔ اس ضمن میں کم از کم ایک معلوم واقعہ ایسا ہے جو اس نظریہ کی تائید کرتا ہے۔ اور وہ ہے مادی دور کے بعد پہلے ذی حیات کی پیدائش۔

زمین پر آج مختلف قسم کے جان داروں کا ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ کبھی کوئی پہلا جان دار تھا۔ آج کے جانداروں کی موجودگی ہی پہلے جان دار کا وجود ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح خصوصی تخلیق (Special Creation) کا نظریہ، کم از کم پہلے جان دار کی حد تک، اپنے آپ ثابت ہے۔ اس کے لئے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ اب جب تک واقعاتی طور پر یہ ثابت نہ ہو جائے کہ بے جان مادہ سے اپنے آپ ایک زندہ جسم وجود میں آتا ہے اس وقت تک ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ پہلا ذی حیات مستقلاً پیدا ہوا۔ وہ نہ کسی دوسرے ذی حیات سے وجود میں آیا اور نہ اب تک کے کسی ثبوت کے مطابق بے جان مادہ سے۔ اس لئے ہمارے واسطے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پہلے ذی حیات کو خصوصی طور پر پیدا شدہ مانیں اور پہلے ذی حیات کے بارے میں خصوصی تخلیق ماننے کے بعد ہمارے پاس کوئی بنیاد نہیں رہتی کہ ہم کیوں دوسرے انواع حیات کے بارے میں خصوصی تخلیق کو نہ مانیں۔ اگر پہلا جان دار خصوصی طور پر پیدا ہو سکتا ہے تو بعد کے جان دار کیوں خصوصی طور پر پیدا نہیں ہو سکتے۔

اسلامی نقطۂ نظر

اس معاملہ میں جہاں تک اسلامی نظریہ کا تعلق ہے، قرآن و حدیث میں ایسے اشارے موجود ہیں جن سے ظاہر

ہوتا ہے کہ زندگی اور کائنات کی تخلیق بیک وقت نہیں ہوئی بلکہ مختلف ادوار میں ہوئی ۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے زمین و آسمان اور اس کی چیزوں کو چھ دن ، بالفاظ دیگر چھ ادوار میں پیدا کیا (فرقان ۵۹) ان چھ ادوار کی تقسیم قرآن کے تتبع سے اس طرح کی جا سکتی ہے :

۱۔ ابتدائی منجمد مادہ کی تخلیق (انبیار ۳۰)
۲۔ زمین و آسمان یعنی غیر ذی روح اشیار کی تخلیق (انبیار ۳۰)
۳۔ زمین کو پھاڑ کر پانی نکالنا (نازعات ۳۱)
۴۔ مختلف قسم کی سبزی اور ہریالی اگانا (نازعات ۳۱)
۵۔ مختلف قسم کے حیوانات پیدا کرنا (نحل ۵)
۶۔ انسان پیدا کرنا (آل عمران ۵۹)

بعض احادیث سے بھی اس تخلیقی ترتیب کی تائید ہوتی ہے ۔ مثلاً صحیح مسلم کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے :

ان اللہ تعالیٰ خلق الشجر فی یوم کذا من الایام الستة ثم خلق الحیوانات (۲۱۲)

اللہ نے تخلیق کے چھ دنوں میں سے ایک دن درخت پیدا کیا۔ اس کے بعد اس نے حیوانات کو پیدا کیا۔

ارتقار کے سلسلہ میں اب تک جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہونے کے باوجود نفس نظریۂ ارتقار کو ثابت کرنے میں ناکام ہیں۔ اب تک کوئی حقیقی ثبوت اس بات کا نہیں مل سکا کہ بے جان مادہ سے کسی قسم کے طبیعی حالات کے اندر جاندار جسم از خود بن کر تیار ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ توالد و تناسل کے درمیان مخصوص طبیعی اسباب کے تحت ایک قسم کے جانور کے پیٹ سے دوسری قسم کے جانور ارتقائی طور پر نکل آتے ہیں۔ یہ چیزیں اب تک محض مفروضات ہیں۔ تاہم مختلف علمی میدان میں اس بات کے شواہد ملے ہیں جن سے اخذ ہوتا ہے کہ زندگی کے مختلف انواع کی آبادکاری زمین پر ایک ہی وقت میں نہیں ہوئی بلکہ مختلف اوقات یا ادوار میں ہوئی ہے۔ قرآن میں پہلے جزر کے حق میں کوئی تصدیقی چیز موجود نہیں ہے ۔ اس لئے عقل اور نقل دونوں پہلو سے وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ البتہ ارتقار کے دوسرے جزر (تخلیق میں زمانی ترتیب) کے متعلق قرآن و حدیث میں ایسے اشارات موجود ہیں جو اس کی تائید کرتے ہیں۔

قرآن و حدیث کے مذکورہ اشارات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے وہ اب تک کے معلوم شدہ حقائق کے پوری طرح مطابق ہے اب تک جو حقائق انسان کے علم میں آئے ہیں وہ صرف یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ مختلف انواع حیات (اور اسی طرح مختلف قسم کی مادی اشیار بھی) بیک وقت وجود میں نہیں آئیں بلکہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ ایک کے بعد ایک وجود میں آئیں۔ یہ تخلیق میں زمانی فرق کی بات ہے اور یہ بات قرآن و حدیث کے اشارات کے مطابق ہے۔ اس کے آگے جب نظریۂ ارتقار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ پہلا جاندار بے جان مادہ سے خود بخود نکل آیا اور اسی طرح مختلف انواع حیات ایک دوسرے کے پیٹ سے اپنے آپ نکلتی رہیں (مثلاً کیڑے کے پیٹ سے مچھلی، مچھلی کے پیٹ سے چڑیا، بکری کے پیٹ سے گھوڑا) تو یہ ارتقار کا محض ایک دعویٰ بن جاتا ہے جس کو اب تک کسی دلیل سے ثابت نہ کیا جا سکا۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہوجاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپیے یا ماہانہ ساڑھے سات روپیے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں :

۱ - الإسلام يتحدى	۲۶۳	صفحات	قیمت ۲۰	روپے
۲ - الدين فی مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	" ۱۰	روپے
۳ - حكمة الدين	۸۷	صفحات	" ۸	روپے
۴ - الإسلام والعصر الحديث	۷۷	صفحات	" ۸	روپے
۵ - مسئوليات الدعوة	۳۹	صفحات	" ۲	روپے
۶ - نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶	صفحات	" ۲	روپے
۷ - إمكانات جديدة للدعوة	۳۴	صفحات	" ۲	روپے
۸ - الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲	صفحات	" ۲	روپے
۹ - المسلمون بين الماضى والحال والمستقبل	۷۲	صفحات	" ۵	روپے
۱۰ - نحو بعث إسلامى	۳۲	صفحات	" ۵۰	پیسے

تعارفِ اسلام

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۴۸ قیمت -/۳ روپے

محمد تحسین خلف پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

January 1981
Issue No. 50

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے
براہ کرم اپنا زر تعاون روانہ فرمائیں

الرسالہ

فروری ۱۹۸۱

شمارہ ۵۱

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

اعلان

ملک کے اندر یا ملک کے باہر ایسا واقعہ سامنے آئے جو قومی جذبات کو ابھارنے والا ہو تو ایسے موقع پر مسلمان کروروں روپے پیش کر دیتے ہیں۔ مگر اس قسم کی ہنگامی قربانیاں خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کی جائیں ان سے ملت کو زندگی نہیں مل سکتی۔ ملت کو زندہ کرنے کا راز خاموش تعمیری عمل میں ہے نہ کہ پرشور قربانیوں میں۔

ماہنامہ الرسالہ ملت کی ذہنی تعمیر کے لئے اسی قسم کی ایک خاموش جدو جہد ہے۔ مگر غیر معمولی مہنگائی کی وجہ سے الرسالہ کا کام سراسر خسارہ میں ہو رہا ہے۔ ایجنسی کا کمیشن اور پوسٹیج وغیرہ کے اخراجات وضع کرنے کے بعد عملاً ادارہ کو جو رقم ملتی ہے وہ اس سے بہت کم ہوتی ہے جو اس کے ضروری اخراجات کو پورا کر سکے۔

تاہم عمومی افادیت کے پیش نظر ابھی تک ہم نے الرسالہ کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا ہے۔ مخلصین اور ہمدردوں سے درخواست ہے کہ وہ اس خسارہ کو پورا کرنے کے لئے تعاون فرمائیں تاکہ تعمیر ملت کی یہ مہم مؤثر طور پر جاری رکھی جا سکے۔ اس مد میں چھوٹی رقمیں بھی دی جا سکتی ہیں اور بڑی رقمیں بھی۔

ظالم کے لئے کامیابی نہیں

نظام الملک طوسی سلطنت سلجوقیہ کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے دو سلجوقی حکمراں، الپ ارسلاں اور ملک شاہ کے زمانہ میں نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کا نظام سنبھالا۔ وہ حکومت کے معاملات میں اتنا زیادہ دخیل تھا کہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کا کام تخت پر بیٹھنا رہ گیا تھا یا شکار کھیلنا۔ سلجوقی حکومت کے حریفوں نے نظام الملک کو قتل کرادیا۔ ایک شخص نے صوفی کے بھیس میں ۱۰۹۲ء میں اس پر حملہ کرکے اسے ختم کردیا۔ نظام الملک کے مرتے ہی سلجوقی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

نظام الملک طوسی کی لیاقت کو عام طور پر مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ پی۔ کے ہٹی نے اپنی کتاب "ہسٹری آف دی عربس" میں نظام الملک کی بابت لکھا ہے کہ اسلام کی سیاسی تاریخ میں وہ ایک درخشندہ نام کی حیثیت رکھتا ہے:

One of the ornaments of the political history of Islam (P. 477)

نظام الملک طوسی کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ اس کے مختلف کارناموں میں سے مشہور مدرسہ نظامیہ کا قیام (۱۰۶۵ - ۶۷ء) بھی ہے۔ وہ اسی مدرسے سے اپنے لئے انتظامیہ اور عدلیہ کے لئے تربیت یافتہ افراد حاصل کرتا تھا۔ نظام الملک نے طریق حکومت پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا فارسی نام سیاست نامہ ہے۔ اس کتاب میں اس نے لکھا ہے: الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم (حکومت کفر کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے مگر وہ ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتی)

یہ اصول بادشاہ کے لئے بھی صحیح ہے اور ایک عام آدمی کے لئے بھی۔ ہر آدمی کا اپنا ایک دائرۂ عمل ہوتا ہے۔ بادشاہ کا دائرہ بڑا ہوتا ہے اور عام آدمی کا چھوٹا۔ جو آدمی کامیابی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دائرہ میں ظلم کرنے سے بچے۔ اگر اس نے دوسروں پر ظلم کرنے سے اپنے کو نہ بچایا تو یقینی طور پر وہ قدرت کی پکڑ میں آجائے گا۔ خدا کی سنت ہے کہ آدمی کے دوسرے جرموں کی سزا تو اس کو آخرت میں دی جاتی ہے مگر جو شخص ظلم کرے اور ناحق دوسروں کو ستائے اس کی سزا اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ ظلم کرنے والا خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا، خواہ جلد پکڑا جائے یا دیر میں۔

ظلم ایک ایسی برائی ہے جس کا خمیازہ اولاد تک کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ظلم کرنے والا خواہ کوئی حکمراں ہو یا غیر حکمراں، اگر وہ اپنے ظلم پر قائم رہتا ہے تو لازماً ایسا ہوگا کہ اس کے ظلم کا انجام اس کے خاندان تک پہنچے گا۔ آدمی اپنے بچوں کی خاطر ظلم کرتا ہے حالاں کہ بچوں کے حق میں اس سے زیادہ بری وراثت اور کوئی نہیں۔

دنیا ٹائپ رائٹر نہیں

ایک شخص میز پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے کھلا ہوا ٹائپ رائٹر ہے۔ اس کے ذہن میں کچھ خیالات آئے۔ اس نے ٹائپ رائٹر میں کاغذ لگایا اور اپنے ذہن کے مطابق تختۂ حروف (کی بورڈ) پر انگلیاں مارنی شروع کیں۔ اچانک اس کا ذہنی خیال واقعہ بننے لگا۔ سامنے کے کاغذ پر مطلوبہ الفاظ چھپ چھپ کر ابھرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس کے تمام جملے کاغذ پر ٹائپ ہو کر سامنے آ گئے۔ چند جملے یہ تھے:

میں حق پر ہوں ، میرے سوا جو لوگ ہیں سب باطل پر ہیں
میرا کوئی قصور نہیں ، ہر معاملہ میں قصور صرف دوسروں کا ہے
میں سب سے بڑا ہوں ، دوسرے تمام لوگ میرے مقابلہ میں چھوٹے ہیں
میں خدا کا محبوب ہوں ، دنیا بھی میری ہے اور آخرت بھی میری

آدمی خوش تھا کہ اس نے جو کچھ چاہا وہ کاغذ پر موجود ہو گیا۔ مگر آدمی کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ جس دنیا میں تھا وہ کوئی ٹائپ رائٹر نہیں تھی۔ ٹائپ رائٹر کے ایک کاغذ پر جس طرح اس نے اپنے خیال کو واقعہ بنا لیا اسی طرح وہ حقیقت کی دنیا میں اپنے خیال کو واقعہ نہیں بنا سکتا تھا۔ کاغذ پر اپنی پسند کے الفاظ چھاپنے کے لئے تو صرف کی بورڈ پر انگلیاں مارنا کافی تھا۔ مگر حقیقت کی دنیا میں کسی خیال کو واقعہ بنانے کے لئے ایک لمبی اور سوچی سمجھی جدوجہد کی ضرورت ہے نہ کہ ٹائپسٹ کی طرح محض انگلیوں کو متحرک کرنے کی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ٹائپ رائٹر کا آدمی عمل کی دنیا میں اس وقت بھی مکمل طور پر محروم تھا جب کہ الفاظ کی دنیا میں بظاہر وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا۔

یہ بات خواہ ہمارے لئے کتنی ہی ناگوار ہو، مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ دنیا ہمارے لئے کوئی ٹائپ رائٹر نہیں اور ہم اس کے کوئی ٹائپسٹ نہیں کہ محض "انگلیوں" کی حرکت سے ہم جو چاہیں دنیا کی سطح پر نقش کرتے چلے جائیں۔ یہ سنگین حقیقتوں کی دنیا ہے اور حقیقتوں سے موافقت کر کے ہی یہاں ہم اپنے لئے کچھ پا سکتے ہیں۔ آدمی کے پاس زبان اور قلم ہے۔ وہ جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ مگر آدمی کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی زبان و قلم صرف الفاظ کی لکیریں بناتے ہیں نہ کہ زندگی کی حقیقتیں۔ الفاظ کاغذ پر نشان بن کر رہ جاتے ہیں۔ آواز ہوا میں غیر مرئی لہروں کی صورت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر آدمی کے پاس جو چیز باقی رہتی ہے وہ صرف ایک جھوٹا انتظار ہے۔ اور حقائق کی اس دنیا میں کسی کا جھوٹا انتظار کبھی پورا نہیں ہوتا۔

ایک کے بجائے دو

ولیم دوم (۱۹۴۱ - ۱۸۵۹) جرمنی کا بادشاہ تھا۔ اپنے باپ شہنشاہ فریڈرک کے بعد ۱۸۸۸ میں تخت پر بیٹھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے جرمنی کو فوجی اعتبار سے ترقی دینے میں کافی دلچسپی لی۔ مگر اس کا فوجی استحکام اس کی شہنشاہیت کو بچانے میں کامیاب نہ ہوا۔ ملکی حالات کے تحت اس کو تخت چھوڑنا پڑا۔ نومبر ۱۹۱۸ میں وہ حکومت چھوڑ کر ہالینڈ چلا گیا اور وہاں خاموشی کے ساتھ زندگی گزار کر مر گیا۔ اس کی جلاوطنی کی موت گویا اس بات کا ایک واقعاتی ثبوت تھی کہ فوجی قوت کے مقابلہ میں حالات کی قوت زیادہ اہم ہے

جنگ عظیم اول سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے۔ جرمنی کا مذکورہ بادشاہ ولیم دوم سوئزرلینڈ گیا ہوا تھا وہ وہاں کی منظم فوج کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے مزاحیہ انداز میں سوئزرلینڈ کے ایک فوجی سے پوچھا: اگر جرمنی کی فوج جس کی تعداد تمہاری فوج سے دگنی ہو، تمہارے ملک پر حملہ کر دے تو تم اس وقت کیا کرو گے۔ اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

سر، ہم کو بس ایک کے بجائے دو فائر کرنے پڑیں گے

اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں اصل اہمیت تعداد کی نہیں بلکہ محنت اور کارکردگی کی ہے۔ آپ کا حریف اگر تعداد میں زیادہ ہو تو آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی محنت اور کارکردگی میں اضافہ کر کے کم تعداد کے باوجود زیادہ تعداد پر غالب آسکتے ہیں۔

دنیا میں اپنی جگہ بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس آسامی کے لئے بی اے کی قابلیت کی شرط ہو اور بی اے والوں نے درخواستیں دے رکھی ہوں، وہاں آپ بھی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچ جائیں اور جب آپ کو نہ لیا جائے تو شکایت کریں کہ کیوں آپ کے مقابلہ میں دوسرے امیدوار کو ترجیح دی گئی، جب کہ دونوں یکساں طور پر گریجویٹ تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جہاں لوگ بی اے کی ڈگریاں پیش کر رہے ہوں وہاں آپ ماسٹر ڈگری لے کر پہنچیں، جہاں لوگ مطابق شرائط قابلیت کی بنیاد پر اپنا حق مانگ رہے ہوں وہاں آپ برتر از شرائط قابلیت دکھا کر اپنا حق تسلیم کرائیں۔

یہی دوسرا طریقہ زندگی کا اصلی طریقہ ہے۔ تمام بڑی بڑی ترقیاں اور کامیابیاں انھیں لوگوں کے لئے مقدر ہیں جو برتر قابلیت لے کر زندگی کے میدان میں داخل ہوں۔ جن لوگوں کے پاس صرف کمتر لیاقت یا برابر کی لیاقت کا سرمایہ ہو ان کے لئے صرف ایک ہی انجام مقدر ہے ـــــ مقابلہ کی اس دنیا میں دوسروں سے پچھڑ جانا اور اس کے بعد بے فائدہ احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرتے رہنا۔

امکان کبھی ختم نہیں ہوتا

مغرب کی طرف پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے اوپر سورج ڈوب رہا تھا۔ آفتابی گولے کا آدھا حصہ پہاڑ کی چوٹی کے نیچے جا چکا تھا اور آدھا حصہ اوپر دکھائی دیتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورا سورج ابھری ہوئی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوب گیا۔

اب چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔ سورج دھیرے دھیرے اپنا اجالا سمیٹتا جا رہا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ماحول گہری تاریکی میں ڈوب جائے گا۔ مگر عین اس وقت جب کہ یہ عمل ہو رہا تھا، آسمان پر دوسری طرف ایک اور روشنی ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ یہ بارھویں کا چاند تھا جو سورج کے چھپنے کے بعد اس کی مخالف سمت سے چمکنے لگا۔ اور کچھ دیر کے بعد پوری طرح روشن ہو گیا۔ سورج کی روشنی کے جانے پر زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک نئی روشنی نے ماحول پر قبضہ کر لیا۔

"یہ قدرت کا اشارہ ہے" میں نے اپنے دل میں سوچا "کہ ایک امکان جب ختم ہوتا ہے تو اسی وقت دوسرے امکان کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سورج غروب ہوا تو دنیا نے چاند سے اپنی بزم روشن کر لی۔

اسی طرح افراد اور قوموں کے لئے بھی ابھرنے کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ زمانہ اگر ایک بار کسی کو گرا دے تو خدا کی اس دنیا میں اس کے لئے مایوس ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ وہ نئے مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ اپنے ابھرنے کا سامان کر سکتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی دانش مندی کا ثبوت دے اور مسلسل جد و جہد سے کبھی نہ اکتائے۔

یہ دنیا خدا نے عجیب امکانات کے ساتھ بنائی ہے۔ یہاں مادہ فنا ہوتا ہے تو وہ توانائی بن جاتا ہے۔ تاریکی آتی ہے تو اس کے بطن سے ایک نئی روشنی برآمد ہو جاتی ہے۔ ایک مکان گرتا ہے تو وہ دوسرے مکان کی تعمیر کے لئے زمین خالی کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کے واقعات کا ہے۔ یہاں ہر ناکامی کے اندر سے ایک نئی کامیابی کا امکان ابھر آتا ہے۔ دو قوموں کے مقابلہ میں ایک قوم آگے بڑھ جائے اور دوسری قوم پیچھے رہ جائے تو بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد ایک اور عمل شروع ہوتا ہے۔ بڑھی ہوئی قوم کے اندر عیش پرستی اور سہولت پسندی آ جاتی ہے۔ دوسری طرف پچھڑی ہوئی قوم میں محنت اور جد و جہد کا نیا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اس دنیا میں کسی کے لئے پست ہمت یا مایوس ہونے کا سوال نہیں۔ حالات خواہ بظاہر کتنے ہی ناموافق دکھائی دیتے ہوں، اس کے آس پاس آدمی کے لئے ایک نئی کامیابی کا امکان موجود ہوگا۔ آدمی کو چاہئے کہ اس نئے امکان کو جانے اور اس کو استعمال کر کے اپنی کھوئی بازی کو دوبارہ جیت لے۔

سنبھل کر چلئے

چھوٹے جانوروں کو ندی پار کرنا ہو تو وہ پانی میں تیزی سے چل کر نکل جاتے ہیں۔ مگر ہاتھی جب کسی ندی کو پار کرتا ہے تو وہ تیزی سے چلنے کے بجائے ہر قدم پر رک رک کر چلتا ہے، وہ ہر قدم نہایت احتیاط سے رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹے جانوروں کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ پانی کے نیچے کی مٹی نرم ہو یا سخت، ان کا ہلکا پھلکا جسم بآسانی اس سے گزر جاتا ہے۔ مگر ہاتھی غیر معمولی طور پر بڑا جانور ہے۔ بھاری جسم کی وجہ سے اس کے لئے یہ خطرہ ہے کہ نیچے کی مٹی اگر نرم ہو اور اس کا پاؤں اس میں دھنس جائے تو اس کے لئے اس سے نکلنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہاتھی جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ نیچے کی سطح مضبوط ہے وہ قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ ہر بار جب وہ قدم رکھتا ہے تو اس پر اپنا پورا بوجھ نہیں ڈالتا۔ وہ ہلکا قدم رکھ کر پہلے اس کی نرمی اور سختی کو آزماتا ہے۔ اور جب اندازہ کر لیتا ہے کہ زمین سخت ہے اسی وقت اس پر اپنا پورا بوجھ رکھ کر آگے بڑھتا ہے۔

یہ طریقہ ہاتھی کو کس نے سکھایا۔ جواب یہ ہے کہ خدا نے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھی کے اس طریق عمل کو خدائی تصدیق حاصل ہے۔ گویا زندگی کے لئے خدا کا بتایا ہوا سبق یہ ہے کہ جب راستہ میں کسی خطرہ کا اندیشہ ہو تو اس طرح نہ چلا جائے جس طرح بے خطر راستہ پر چلا جاتا ہے بلکہ ہر قدم سنبھل سنبھل کر رکھا جائے، "زمین" کی قوت کا اندازہ کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے۔

انسان کو خدا نے ہاتھی سے زیادہ عقل دی ہے۔ جہاں بارود کے ذخیرے ہوں وہاں آدمی دیا سلائی نہیں جلاتا۔ جس ٹرین میں پٹرول کے ڈبے لگے ہوئے ہوں، اس کا ڈرائیور بے احتیاطی کے ساتھ اس کی شنٹنگ نہیں کرتا۔ مگر اسی اصول کو اکثر لوگ سماجی زندگی میں بھول جاتے ہیں۔ ہر سماج میں طرح طرح کے انسان ہوتے ہیں اور وہ طرح طرح کے حالات پیدا کئے رہتے ہیں۔ سماج میں کہیں "دلدل" ہوتا ہے اور کہیں "پٹرول"۔ کہیں "کانٹا" ہوتا ہے اور کہیں "گڑھا"۔ عقل مند وہ ہے جو اس قسم کے سماجی مواقع سے بچ کر نکل جائے نہ کہ اس سے الجھ کر اپنے راستہ کو کھوٹا کرے۔

جس آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو وہ راستہ کی ناخوش گواریوں سے کبھی نہیں الجھے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان سے الجھنا اپنے آپ کو اپنے مقصد سے دور کر لینا ہے۔ بامقصد آدمی کی توجہ آگے کی طرف ہوتی ہے نہ کہ دائیں بائیں کی طرف۔ وہ مستقل نتائج پر نظر رکھتا ہے نہ کہ وقتی کارروائیوں پر۔ وہ خدا کی نسبت سے چیزوں کو دیکھتا ہے نہ کہ انسان کی نسبت سے۔

کامیابی کا سادہ اصول

ایک صاحب نے تالے کی مارکٹ میں دکان کھولی۔ وہ روزانہ دیکھتے تھے کہ بے شمار آدمی سڑک پر آرہے ہیں اور جارہے ہیں۔ مگر ان کی اکثریت ان کی دکان کو دیکھتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ ایک روز ان کے ساتھ ایک واقعہ گزرا جس نے ان کو دکان داری کا راز بتا دیا۔ وہ کپڑا خریدنے کے لئے کپڑے کی مارکٹ میں گئے۔ وہاں مسلسل بہت سی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک دکان سے گزر رہے تھے مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس دکان میں داخل ہوں۔ اتنے میں ایک دکان دار نے ان کو اپنی دکان کے سامنے دیکھ کر کہا: "آیئے جناب اندر آکر دیکھئے" یہ سن کر وہ دکان کے اندر داخل ہو گئے۔

اپنے اس تجربہ سے ان کی سمجھ میں آیا کہ مارکٹ میں جو گاہک آتے ہیں ان کی اکثریت یا تو نئی ہوتی ہے یا کسی خاص دکان سے بندھی ہوئی نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ دکانوں کی لائن سے گزرتے ہیں تو ایک قسم کے تذبذب کا شکار رہتے ہیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس دکان میں داخل ہوں۔ ایسے وقت میں ایک شخص ہمدردانہ انداز میں اگر ان سے کہے کہ اندر تشریف لایئے تو گویا کہ اس نے ان کے تذبذب کو ختم کیا۔ اس نے ان کو فیصلہ کرنے میں مدد دی۔ ایسا آدمی بیشتر حالات میں چلنے والے آدمی کو اپنی دکان کے اندر بلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ بیشتر لوگوں کے ذہن میں پہلے سے کوئی طے شدہ چیز موجود نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس راز کو جان لیں تو معمولی دانش مندی سے بہت سے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں۔

اس اصول کو انھوں نے اپنی دکان میں استعمال کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی دکان کے بیرونی حصہ میں بیٹھ جاتے اور ہر آنے جانے والے کے چہرے کو پڑھتے۔ یہاں تک کہ ان کی نظر اتنی پکی ہو گئی کہ وہ کسی آدمی کو دیکھ کر فوراً پہچان لیتے کہ یہ تالے کا گاہک ہے یا کسی اور مقصد سے سڑک پر چل رہا ہے۔ جس کے متعلق وہ اندازہ کرتے کہ وہ تالے کی لائن کی چیز خریدنا چاہتا ہے، اس کو فوراً اپنی آواز سے متوجہ کرتے اور اس کو اپنی دکان کے اندر بلاتے۔ اس طرح ان کی دکان داری اچانک کافی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ وہ بازار میں سب سے زیادہ فروخت کرنے والے دکان دار بن گئے۔

ترقی کا راز ہمیشہ سادہ اصولوں میں ہوتا ہے۔ مگر انسان اکثر ترقی کو ایسی چیز سمجھ لیتا ہے جو کسی بہت بڑی چیز کے ذریعہ حاصل ہوتی ہو۔ آپ چند میٹھے بول سے، اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے، اپنے محدود وسائل کو استعمال کرنے سے اور ایک کام کو مسلسل پکڑے رہنے سے کامیابی کے اعلیٰ مقامات تک پہنچ سکتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کوئی چیز نہیں جو بہت بڑی ہو اور ایک عام آدمی اس کو حاصل نہ کر سکتا ہو۔

ایک کے بعد دوسرا

مسافر اسٹیشن پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کی ٹرین جا چکی ہے۔ اس کی گھڑی صحیح نہ تھی اس لئے وہ دس منٹ لیٹ ہو گیا۔ اتنی دیر میں ٹرین آکر چلی گئی۔ "بابو جی، فکر نہ کیجئے" قلی نے کہا "دو گھنٹے بعد ایک اور گاڑی آرہی ہے، اس سے آپ چلے جائیں۔ اتنی دیر پلیٹ فارم پر آرام کر لیجئے"۔ مسافر نے قلی کا مشورہ مان لیا اور دو گھنٹہ انتظار کے بعد اگلی ٹرین پر سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہر مسافر جانتا ہے کہ ایک ٹرین چھوٹ جائے تو جلد ہی بعد دوسری ٹرین مل جاتی ہے جس سے وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ یہ پلیٹ فارم کا سبق ہے۔ مگر اکثر لوگ اس معلوم سبق کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ زندگی کی دوڑ میں ایک موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ پہلی بار ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد وہ مایوس ہو جاتے ہیں یا احتجاج و فریاد کے مشغلہ میں لگ جاتے ہیں۔ حالاں کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے لئے نیا منصوبہ بنائیں، وہ "اگلی ٹرین" سے چل کر اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔

ایک شخص جس سے آپ کی مخالفت ہو گئی ہو اور ٹکراؤ کا طریقہ جس کو "درست" کرنے میں ناکام ثابت ہوا ہو، آپ اس کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیجئے۔ اس کو نرمی کے طریقہ سے متاثر کرنے کی کوشش کیجئے۔ عین ممکن ہے کہ پرانے طریقے نے جس کو آپ کا دشمن بنا رکھا تھا، نئے طریقہ کے بعد وہ آپ کا ایک کارآمد دوست ثابت ہو۔ آپ کہیں ملازم ہیں اور وہاں آپ کی ملازمت ختم کر دی جاتی ہے۔ آپ اس کے پیچھے نہ پڑئے بلکہ دوسرے کسی میدان میں اپنے لئے ذریعہ معاش تلاش کرنے کی کوشش کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ نیا کام آپ کے لئے پہلے سے زیادہ نفع بخش ثابت ہو۔ کوئی آپ کا حق نہیں دیتا۔ اس سے آپ کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ سالوں گزر جاتے ہیں اور آپ اپنے حقوق کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ آپ اس کا خیال چھوڑ دیجئے اور اپنی محنت پر بھروسہ کیجئے۔ بہت ممکن ہے کہ اپنی محنت کو کام میں لاکر آپ خود وہ چیز حاصل کر لیں جس کو آپ دوسروں سے مانگ کر پانا چاہتے تھے۔

زندگی کے بیشتر مسائل تنگ نظری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آدمی اپنے ذہن میں وسعت پیدا کرے تو اس کو معلوم ہو کہ یہاں سفر کے لئے ایک سے زیادہ "گاڑیاں" موجود ہیں — جو چیز وہ مقابلہ آرائی کے ذریعہ حاصل نہ کر سکا اس کو وہ باہمی جوڑ کے ذریعہ حاصل کر سکتا تھا۔ جہاں حقوق طلبی کا طریقہ مقصد تک پہنچانے میں ناکام رہا وہاں وہ محنت کا طریقہ اختیار کر کے اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ جن لوگوں کی باتوں پر مشتعل ہو کر وہ ان پر قابو نہ پا سکا، وہ ان کی باتوں پر صبر کر کے انھیں جیت سکتا تھا۔

اسلام
پندرھویں صدی میں

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ناشر:
مکتبہ الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

سال اشاعت ۱۹۸۱
قیمت دو روپے

طابع:
جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز دہلی

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی صدی ہجری میں اسلام کا مقابلہ شرک سے پیش آیا تھا، چودھویں صدی ہجری میں اسلام کا مقابلہ الحاد سے پیش آیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے مرحلہ میں صرف چوتھائی صدی کی کوششوں سے نظام شرک کی جڑ اکھڑ گئی۔ اس کے بعد ایسا انقلاب آیا جس کے اثرات تقریباً ایک ہزار سال تک پوری قوت کے ساتھ باقی رہے۔ اس کے برعکس دوسرے مرحلہ میں بے پناہ کوشش کرنے کے بعد بھی نتیجہ بالکل صفر رہا۔ دور الحاد میں جد وجہد اور قربانی کی غیر معمولی مقدار پیش کرنے کے باوجود وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو دور شرک میں اس کو حاصل ہوئی تھی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا اسلام اب ایک ختم شدہ طاقت (Spent Force) ہے۔ کیا موجودہ دور میں اسلام اپنی وہ فکری اہمیت کھو چکا ہے جو قدیم دور میں اس کو حاصل تھی۔ اس سوال کا جواب یقینی طور پر نفی میں ہے۔ اسلام قیامت تک کا دین ہے اور اسلام کے لئے کائنات کے مالک نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ غالب رہے (الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ) اس لئے اسلام نہ اپنی نظریاتی معنویت کو کبھی کھو سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس کو سربلند کرنے کی مطلوبہ جد وجہد کی جائے اس کے باوجود اس کو سربلندی حاصل نہ ہو۔

اصل یہ ہے کہ یہ امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا نے مختلف قسم کے لوگوں کو یکساں طور پر اپنا کام کرنے کا موقع دیا ہے۔ یہاں خود خدا کی مقررہ سنت کے مطابق یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن بنتا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو گرا کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے (بعضکم لبعض عدو) اس لئے موجودہ دنیا میں کسی کی کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول میں کام کرنے والی دوسری قوتوں کو سمجھے، ان کے مخالفانہ منصوبوں کو ناکام بنا کر اپنے لئے راستہ نکالے۔ اس دنیا میں کبھی کسی کو خالی میدان نہیں مل سکتا جس میں وہ بے روک ٹوک مارچ کرتا ہوا چلا جائے۔

مخالف قوتوں کو ناکام بنا کر غالب آنے کی صراط مستقیم (فتح) خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر بتا دی ہے اور رسول کی سنت میں اس کا کامل عملی نمونہ موجود ہے۔ جس طرح زراعت کے بارے میں قوانین قدرت کی پابندی کر کے فصل اگائی جاتی ہے اسی طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ اس صراط مستقیم کی پیروی کر کے تمام مخالف سازشوں کو ناکام بنا دیا جائے اور اسلام کو غلبہ کا وہ مقام دلا دیا جائے جو ازل سے اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

اس صراط مستقیم کا خلاصہ یہ ہے کہ تحریک کو خالص مثبت بنیادوں پر اٹھایا جائے۔ مخالفین کے ہر قسم کے اشتعال کے باوجود اہل اسلام کا سکینہ (تحمل) برہم نہ ہو۔ ان کی خدا پرستی اس بات کی یقینی ضمانت بن جائے کہ وہ کسی حال میں حمیت جاہلیہ کا جواب حمیت جاہلیہ سے نہ دیں گے بلکہ ہمیشہ تقوی کی روش پر قائم رہیں گے (فتح ۲۶)

موجودہ زمانہ میں اسلام کی سربلندی کی جد وجہد کے کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خدا کی مقرر کردہ صراط مستقیم پر نہیں چلایا گیا بلکہ خود ساختہ راہوں پر چلایا گیا۔ اور خدا کی دنیا میں خدا ہی کی صراط مستقیم پر چل کر کامیابی ممکن ہے۔ کسی اور راہ پر دوڑنے والا یہاں کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

ایک واقعہ دو انجام

تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان سیاسی طاقت، تمدنی ترقی اور علوم و فنون میں دنیا کی تمام قوموں سے بڑھے ہوئے تھے۔ یورپ نے طے کیا کہ اس کو عربی پڑھنی ہے اور مسلمانوں کے علوم سیکھنے ہیں۔ یہی فیصلہ تھا، جو سولھویں صدی کے اس عظیم واقعہ کا سبب بنا جس کو دنیا یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Rennaissance) کے نام سے جانتی ہے۔ مسلمانوں کے علوم سیکھ کر اور ان میں اضافہ کرکے بالآخر یورپ اتنا طاقت ور ہو گیا کہ نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ ساری دنیا پر چھا گیا۔

اس واقعہ کے چار سو برس بعد یہی صورت حال برعکس شکل میں مسلمانوں کے سامنے تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ یورپ سیاست و تمدن اور علوم و فنون میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ ان کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم کو حاصل کریں۔ مگر یہاں نتیجہ برعکس نکلا۔ یورپی طرز کی تعلیم نے ہم کو یورپ کا ذہنی غلام بنا دیا۔ ہم اپنے علیحدہ قومی وجود کو بھول کر یورپ کے رنگ میں رنگ گئے۔

ایک ہی نوعیت کے دو واقعات میں انجام کا یہ فرق کیوں ہے۔ اس کا جواب ذہنیت کے اس فرق میں ہے جو دونوں جگہ پایا جاتا ہے۔ یورپ نے ہمارے علوم کو اس جذبہ کے تحت سیکھا تھا کہ وہ ہمارے ہتھیاروں سے ہم کو شکست دے سکے۔ اس کے برعکس ہم یورپی علوم کی طرف اس لئے بڑھے کہ ہم اس کے نقال بن کر اس کی نظروں میں باعزت ہو جائیں۔ اور جہاں ذہنیت میں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں انجام میں فرق پایا جانا لازمی ہے۔

مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک دنیا میں وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو آج روس یا امریکہ کو حاصل ہے۔ اس وقت جب کہ یورپ پر ابھی قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، عرب مسلمان ایک شان دار تہذیب کو وجود میں لا چکے تھے۔ اور اپنی تحقیقات اور یونانی اور دوسرے علوم کے ترجموں کی مدد سے سائنس اور فلسفہ میں دنیا کی امامت کر رہے تھے، اس وقت مسلمان ساری دنیا میں علم اور تہذیب کے تنہا مالک تھے۔ عربی زبان دنیا کی واحد علمی زبان تھی اور ساری دنیا کے لوگ علوم و فنون کے اکتساب کے لئے مسلم مرکزوں (دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ) کا اسی طرح سفر کرتے تھے جیسے آج لوگ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جاتے ہیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں جب کہ مسلمانوں کی طاقت عروج پر تھی اور وہ عرب سے بڑھتے بڑھتے فرانس تک پہنچ گئے تھے اس وقت یورپ نے مسلمانوں کے خلاف اپنی شدید ترین جنگ چھیڑ دی اور گیارھویں صدی کے آخر (۱۰۹۶) سے لے کر تیرھویں صدی کے آخر تک دو سو برس پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف خوفناک جنگ لڑتا رہا۔ یہ جنگ جو صلیبی لڑائیوں (Crusades) کے نام سے مشہور ہے، بالآخر یورپ کی مکمل ناکامی پر ختم ہوئی۔

مگر یورپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اس کے اندر ایک نیا رجحان ابھرا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان اہل یورپ کو تجربہ ہو گیا تھا کہ مسلمان علم اور سائنس میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب مصری فوج نے منجنیقوں

کے ذریعہ فرانسیسی لشکر پر آگ کے بان پھینکنا شروع کئے۔ یہ بان جب منجنیقوں سے نکل کر دشمن کی طرف بڑھتے تو ایسا نظر آتا جیسے بڑے بڑے آتشیں اژدہے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔ فرانسیسی، جن کے پاس اس وقت پرانے وقتی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ان کے لئے یہ بان ایسے ہی بھیانک تھے جیسے آج کسی پس ماندہ اور بے سروسامان ملک پر جدید ترین راکٹوں کے ذریعہ حملہ کر دیا جائے۔ اسی طرح مسلمان تہذیب و تمدن کے تمام پہلوؤں میں نمایاں طور پر اہل یورپ سے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے ناکام تجربہ کے بعد یورپ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لئے اب اس کو دوسرے قسم کی جنگ چھیڑنی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہنر اور ان کے علوم کو سیکھ کر انھیں کے ہتھیاروں سے انھیں شکست دی جائے۔

اب ایک طرف یورپ کے مذہبی طبقہ نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کا نعرہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کو سیکھا جائے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے عقائد کو اس طرح بگاڑ کر پیش کیا جائے کہ مسلمان اپنے دین سے متنفر ہو جائیں اور عیسائیت قبول کر لیں تاکہ وہ قوم جس کو فوجی میدان میں شکست نہیں دی جا سکی ہے، اس کو عددی حیثیت سے کمزور کر کے مغلوب کیا جا سکے۔ عیسائی مشنری تحریک پہلی بار صلیبی جنگوں کے زمانے میں شروع ہوئی۔ پہلا شخص جس نے ۱۱۵۴ء میں ماؤنٹ کارمل پر مشنری نظام قائم کیا وہ ایک صلیبی ہی تھا۔ بعد کو فرانسس کن (۱۲۱۹) نے اس کی پیروی کی۔ یہ مشنری تحریک آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور تبلیغی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کوششیں اس حد تک کامیاب ہوئی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط قسم کی باتوں سے بھر گیا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کا فلسفہ و سائنس اور ان کے علوم و فنون سیکھنے کی تحریک زور شور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یورپ کی درس گاہوں میں عربی زبان پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ مسلمانوں کی تصنیفات کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں کئے جانے لگے۔ یورپ کے طلبہ مسلم شہروں میں تحصیل علم کے لئے جانا شروع ہوئے۔

جنگ کی یہ نئی تکنیک اختیار کرنے کی وجہ سے یورپ کو اندرونی طور پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت یورپ کے قدامت پسند حلقوں میں عربی زبان کی توسیع کی حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں ناراضگی پائی جاتی تھی جس کی وجہ خاص طور پر یہ اندیشہ تھا کہ عربی سیکھنے سے عیسائیوں کے درمیان اسلامی خیالات پھیلنا شروع ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر فرانسسکن راہب راجر بیکن (۱۲۱۴ - ۹۴) جو اپنے وقت کا مشہور انگلستانی عالم تھا، اس نے جب عربی زبان کی اہمیت پر زور دیا تو آکسفورڈ کے علماء چلا اٹھے "بیکن مسلمان (Saracen) ہو گیا"

مگر اس طرح کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کی زبان اور ان کے علوم سیکھنے کا رجحان بڑھتا رہا۔ مسلم محققین کے حاصل کو لے کر یورپ نے اپنی کوشش سے اس میں اضافے کئے اور اتنی ترقی کی کہ تاریخ میں پہلی بار قوت کا معیار بدل دیا اور بالآخر مسلمانوں کو ہر میدان میں شکست دے کر علم و عمل کی پوری دنیا کا مالک بن گیا۔ جدید مورخین نے تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا اہم ترین محرک وہ علوم تھے جو مسلمانوں کی معرفت یورپ تک پہنچے

(ویسٹرن سویلزیشن، اڈورڈ میکنال برنز)

اس کے پانچ سو برس بعد تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے یورپ کی ترقی اور عروج سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپ کے علوم و فنون کو سیکھیں۔ مگر یہاں اس رجحان کا محرک اس سے بالکل مختلف تھا جو یورپ کی تاریخ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ سر سید احمد خاں (۹۸ – ۱۸۱۷) جو پروفیسر گب کے الفاظ میں اسلام میں پہلی جدت پسند تنظیم (Modernist Organization) کے بانی تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۵ میں علی گڑھ کالج قائم کیا اور اس پر اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ میں وہ یونیورسٹی ہو گیا، وہ یورپی طرز کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا مقصد اس تعلیم سے کیا تھا اس کی ترجمانی ان کے رفیق خاص مولانا حالی نے ان الفاظ میں کی ہے: حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں

سر سید نے جب انگلستان سے واپس آکر دسمبر ۱۸۷۰ میں تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا تو انھوں نے پہلے پرچہ کے شروع ہی میں لکھا:

> "اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں"

سر سید جب ترقی کا تصور کرتے تو ان کے ذہن میں "زرق برق وردیاں پہنے کرنل اور میجر بنے ہوئے مسلمان نوجوان" ہوتے تھے۔ ان کا منتہائے مقصود ایسی تعلیم تھی جو مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں تک پہنچا سکے۔ سر سید کی تہذیب کو مہدی افادی نے بجا طور پر "اینگلو محمڈن کلچر" کا نام دیا ہے۔

کمال اتاترک (۱۹۳۸–۱۸۸۱) جو اس گروہ کا دوسرا نمایاں ترین نام ہے، وہ اس معاملہ میں سر سید سے بھی آگے تھے۔ ترکی میں مغربی تعلیم و تہذیب کی اشاعت سے کمال اتاترک کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ اس عنوان سے ہوتا ہے جو اس مہم کو دیا گیا۔ کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک یہ "غرب دوغرو" تھا، جس کے معنی ترکی زبان میں ——— "سمت مغرب میں سفر" کے ہیں۔ سمت مغرب میں سفر کا یہ کام اس درجہ اہم تھا کہ صرف رومن رسم الخط جاری کرنے اور ترکی باشندوں کو ہیٹ پہنانے کے لئے ہزاروں آدمی اس طرح ہلاک کر دیئے گئے گویا وہ ریاست سے بغاوت کے مجرم ہوں۔

اسی تقلیدی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ان مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کے زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز ہے، اس کو مسلمانوں کے اندر پیدا کرنے کی انھوں نے زیادہ کوشش نہیں کی۔ سر سید نے تو صراحۃً مسلمانوں کے لئے "ٹکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت کی اور اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم" کو سب سے مقدم قرار دیا۔ یہی اس زمانہ میں تعلیم جدید کے حامیوں کا عام نقطۂ نظر تھا۔

حضرات نے ساری توجہ صرف اس پر دی کہ ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مغربی تمدن اور یورپی ادب میں کمال حاصل کئے ہوئے ہو۔ کمال آتاترک کا نام نہاد انقلاب اور روس کے اشتراکی انقلاب میں صرف چند سال کا فرق ہے، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ روس آج خلائی دور میں داخل ہو چکا ہے اور ترکی ابھی تک زمین پر بھی مستحکم مقام حاصل نہ کر سکا۔

یورپ جس ذہن کے تحت ہمارے علوم کی طرف بڑھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں سے ان کے علوم اور ان کے ہنر کو لے کر اس کے ذریعہ سے انھیں شکست دی جائے۔ ان چیزوں کو اس نے وقت کی طاقت سمجھا اور اس کو اپنے دشمن کے مقابلہ میں استعمال کیا۔ چنانچہ اپنی اس مہم کو یورپ نے "تقلیدِ مشرق" یا "تقلیدِ مسلم" کا نام نہیں دیا بلکہ اس کو روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کہا، جس کا مطلب یہ تھا کہ صلیبی لڑائیوں کی ہاری ہوئی بازی کو نئی تکنیک سے کامیاب بنایا جائے۔ اور جب اس کوشش سے وہ اپنے کو ایک نئے انقلاب تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کو انھوں نے یہ حیثیت دی گویا انھوں نے خود اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کی ہے۔ چنانچہ یورپ میں اس نئے انقلاب کا تاریخی نام نشاۃ ثانیہ (Rennaissance) رکھا گیا ہے۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ——— نیا جنم (Rebirth) گویا یہ کوئی غیر سے حاصل کی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ یورپ کی اپنی ہی متاع ہے جو اس نے دوبارہ پائی ہے۔ یورپ نے لیتے وقت اگرچہ ان علوم کو مسلمانوں سے لیا تھا، مگر اس نے حال کی کڑی کو حذف کر کے اس کا رشتہ ماضی سے ملایا اور اس کو مغرب کے ایک ملک — یونان — کی چیز قرار دے کر اس کو نشاۃ ثانیہ کہا۔ اس کے برعکس ہم نے ایسا نہیں کیا، حالاں کہ یورپ جو چیز ہمیں دے رہا تھا وہ اضافہ شدہ حالت میں وہی سرمایہ تھا جو یورپ کو ہم نے عطا کیا تھا۔ مسلمان مغربی علوم کی طرف خالص تقلیدی ذہن کے ساتھ بڑھے ان کا یہ عمل سرسید کے یہاں "پیروئ مغرب" اور آتاترک کے یہاں "غرب دو غرد" کے ہم معنی تھا۔ ذہنیت کے اس فرق کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ یورپ ہمارے علوم کو سیکھ کر ہمیں شکست دے اور اس کے برعکس ہم مغرب کے علوم کو سیکھ کر صرف مغرب کے بھونڈے نقال بن کر رہ جائیں۔

مصطفیٰ کمال کی تحریک کا آخری نشانہ یہ تھا کہ ترک قوم ہیٹ اور پتلون پہننے لگے۔ اور سرسید کا منتہائے نظر یہ تھا کہ مسلم نوجوان مغربی ادبیات میں کمال حاصل کرلیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے ذہن کے تحت مغرب کی طرف بڑھنے کا وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا جو عملاً برآمد ہوا۔

یہ تاریخ جہاں ایک طرف ہماری غلطی کو بتاتی ہے وہیں اس کے اندر اس کا بھی نشان ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ہمیں وہی کرنا چاہیے جو مغربی قوموں نے ہمارے ساتھ کیا۔ مغربی علوم کو اس لئے سیکھنا تاکہ اس کے ذریعہ مغربی تہذیب کو شکست دے کر اسلام کو غالب کیا جائے۔ اگر ہمارے اندر یہ ذہن پیدا ہو جائے تو وہی نتیجہ برعکس شکل میں ظاہر ہوگا جو مغربی قوموں کے لئے ہمارے مقابلہ میں ظاہر ہوا تھا۔

اسلام اور سائنس

ایک بار میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جنھوں نے سائنس میں ڈگری لی تھی اور اسی کے ساتھ انھوں نے مذہب اور تاریخ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ وہ خدا اور مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ بات چیت کے دوران انھوں نے کہا: اسلام کو اگر تاریخ سے نکال لیا جائے تو انسانی تاریخ میں کیا کمی رہ جائے گی۔ میں نے کہا: وہی کمی جو اسلام سے پہلے انسانی تاریخ میں تھی۔

زمین پر انسان ہزارہا سال سے آباد ہے۔ مگر معلوم تاریخ کے مطابق اسلام سے پہلے کسی بھی دور میں انسان کی رسائی اس شعبۂ فن تک نہ ہو سکی جس کو آج سائنس کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ بہت سادہ ہے۔ اسلام سے پہلے ہر دور میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ تھا۔ یہی شرک عالم فطرت پر تحقیق کرنے میں مانع تھا۔ کیونکہ شرک کے عقیدہ کے تحت فطرت کے مظاہر پوجنے کی چیز بنے ہوئے تھے، جب کہ سائنس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان مظاہر کو تحقیق و تسخیر کی چیز سمجھا جائے۔ مشرک انسان چاند کو دیوتا سمجھتا تھا، اس لئے اس کا ذہن اس رخ پر چل ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ چاند پر اپنے قدم رکھے۔ وہ سیلاب کو خدا کا جبر سمجھتا تھا، اس لئے اس کے لئے یہ سوچنا ممکن نہ تھا کہ سیلاب کو قابو میں لاکر اس سے بجلی پیدا کرے۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا۔ بالفاظ دیگر، اس ذہن کو فروغ دیا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں مخلوق ہیں۔ اس طرح اسلام نے عالم فطرت کی تحقیق کا راستہ کھولا۔ اور بالآخر وہ تمام ترقیاں وجود میں آئیں جو قدرت پر فتح کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم سائنسی پس ماندگی شرک کا بالواسطہ نتیجہ تھی اور جدید سائنسی ترقی توحید کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام اس لئے نہیں آیا کہ وہ دنیا کو سائنس دے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام نہ آتا تو سائنسی ترقیوں کا دروازہ انسان کے اوپر بند رہتا، جیسا کہ اس سے پہلے وہ انسان کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔ سائنسی تحقیق اور ترقی کے سلسلے میں توحید کی اس اہمیت کو آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵ - ۱۸۸۹) نے کھلے لفظوں میں تسلیم کیا ہے (ظہور اسلام، صفحہ ۱۴۹)

سائنس اسلامی انقلاب سے پیدا ہوئی

توحید کی بنیاد پر جو فکری انقلاب آیا اس کے بہت سے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ انسان عالم فطرت کو اس نظر سے دیکھنے لگا کہ وہ بے بس مخلوق ہے اور انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کو جانے اور اس کو اپنے کام میں لائے۔ اس ذہن کا آغاز اموی دور (۷۵۰ - ۶۶۱ ء) میں دمشق میں ہوا۔ قدیم یونانی حکماء کے یہاں کیمیا چاندی سے سونا بنانے کے خبط کا نام تھا۔ خالد بن یزید بن معاویہ غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے کیمیا کو ایک طبیعی سائنس کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ عباسی خلافت کے زمانہ میں اس شعبہ علم نے بغداد میں مزید فروغ پایا اور اسپین اور سسلی تک پھیلتا چلا گیا۔ اس زمانہ میں مسلمان علمی اور تمدنی ترقی میں دنیا کی تمام قوموں سے آگے بڑھ

ہے تھے۔ تاریخ کے اس دور کو یورپ کے مورخین تاریک دور (Dark Ages) کہتے ہیں۔ مگر وہ صرف یورپ لئے تاریک تھا نہ کہ مسلم دنیا کے لئے۔ ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار "ڈارک ایجز" کے عنوان کے ت لکھتا ہے:

The term 'dark ages' cannot be applied to the splendid Arab culture which spread over north Africa and into Spain. (P. 30)

ریک دور کی اصطلاح شاندار عرب کلچر پر چسپاں نہیں ہوتی جو اس زمانہ میں شمالی افریقہ اور اسپین میں پھیلا ہوا تھا۔

شرک کس طرح سائنسی تحقیق میں رکاوٹ تھا، اس کی وضاحت کے لئے یہاں ہم ایک مثال نقل کریں گے۔

قدیم یونان میں زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک تھا رسٹارکس کا نظریہ جس میں زمین کو سورج کے گرد گھومتا ہوا فرض کیا گیا تھا۔ دوسرا ٹالمی کا نظریہ جس کے طابق سورج زمین کے گرد گھوم رہا تھا۔ پہلے نظریہ کے مطابق زمین بظاہر گول تھی اور دوسرے نظریہ میں چپٹی۔ سطنطین (۲۷۲ - ۳۳۷) کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد جب مسیحیوں کو یورپ میں غلبہ ہوا تو انھوں نے ٹالمی ے نظریہ کی سرپرستی کی اور دوسرے نظریہ کو بزور دبا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت نے حضرت مسیح کو خدا فرض کر لیا تھا ں عقیدہ کے مطابق زمین کو یہ تقدس حاصل تھا کہ وہ خداوند کی جنم بھومی ہے۔ اور جو کرہ خداوند کی جنم بھومی ہو ہ کسی دوسرے کرہ کا تابع (Satellite) کس طرح ہو سکتا تھا۔ زمین کو اس طرح مقدس سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے رسے میں تحقیقی کام آگے نہ بڑھ سکا۔ مشرکانہ مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کی مزید تفصیلی مثالیں ڈریپر ۱۸۸۲-۱۸۱۱) کی کتاب مذہب اور سائنس کا تصادم (Conflict between Science and Religion) ں دیکھی جا سکتی ہیں۔

عباسی خلیفہ المامون (۷۸۶-۸۳۳) کے زمانہ میں بیت الحکمت قائم ہوا اور حکومت کے خصوصی تعاون ے تحت دونوں قسم کے ترجمے عربی زبان میں کئے گئے۔ مسلمانوں نے جب اعتقادی پیچیدگی سے آزاد ہو کر دونوں ظریات کو جانچا تو ان کو پہلا نظریہ حقیقت سے قریب تر نظر آیا۔ خلیفہ المامون جو خود بھی بہت بڑا عالم تھا، اس نے س مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس نے ہیئت و جغرافیہ کے عالموں کو حکم دیا کہ وہ زمین کو گول فرض کرتے ہوئے اس کا یط (Circumference) معلوم کریں اور اس کے لئے کسی کھلے میدان میں ایک زمینی درجہ (Terrestrial Degree) ی لمبائی کی پیمائش کریں اور اس کے بعد اس سے زمین کی پوری گولائی کا اندازہ کریں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے پاس الات حساب کے نام سے صرف زاویہ ناپنے کا سادہ آلہ (Quadrant) اصطرلاب، دھوپ گھڑی اور معمولی گلوب تھے۔ اس قسم کی چند چیزوں کے ذریعہ انھوں نے اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

اس مقصد کے لئے سنجار (Palmyra) کا وسیع ہموار میدان منتخب کیا گیا۔ ایک مقام پر قطب شمالی کی بلندی کے ساتھ زاویہ قائم کر کے شمال کی جانب جریب سے ناپنا شروع کیا۔ ۵۶ ⅔ میل شمال کی جانب جانے سے قطب شمالی کی بلندی کے زاویہ میں ایک درجہ کی لمبائی بڑھ گئی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جب ایک درجہ کی مسافت سطح زمین پر

۵۶ ۱/۲ میل ہے تو زمین کا کل محیط (Circumference) ۲۰ ہزار میل سے زیادہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہر نقطہ پر تمام زاویوں کا مجموعہ ۳۶۰ درجہ ہوتا ہے۔ اور ۳۶۰ کو ۵۶ ۱/۲ میں ضرب دینے سے ۲۰۴۰۱ میل کا فاصلہ برآمد ہوتا ہے۔ دوبارہ یہی تجربہ دریائے فرات کے شمال میں صحرائے کوفہ میں کیا گیا اور دوبارہ وہی نتیجہ نکلا ——— یہ پیمائش حیرت انگیز طور پر قریب بہ صحت تھی۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں صحیح ترین پیمائش کے مطابق زمین کا محیط خط استوا پر ۲۵ ہزار میل ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی سائنسی ترقی کی تفصیلات پروفیسر فلپ ہٹی (۱۸۸۶ — کی کتاب تاریخ عرب (History of the Arabs). میں دیکھی جا سکتی ہے (۳۷۵)

سائنس کی مسلم دنیا سے علیحدگی

علم کے مختلف میدانوں میں یہ ترقیاں جاری تھیں کہ باہمی اختلافات کے نتیجہ میں عرب خلافت کا نظام ٹوٹ گیا اور اسلام کا جھنڈا عثمانی ترکوں (۱۵۱۷ — ۱۹۲۲) نے سنبھالا۔ اس طرح سولھویں صدی عیسوی میں اسلام کی سیاسی نمائندگی کا مرکز عرب سے نکل کر ترکی کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہاں سے تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا جس نے واقعات کے رخ کو بالکل دوسری طرف موڑ دیا۔

تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ایک شخص جو کسی پہلو سے مفید خدمت انجام دیتا ہے، وہی کسی دوسرے پہلو سے بہت بڑی مصیبت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کی ہے۔ اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے خلفاء راشدین کی فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبد العزیز) کا اضافہ کیا۔ مورخ اسی خلیفہ کے تذکرہ میں اس ہیبت ناک غلطی کو بھی لکھتا ہے کہ اس نے اپنے زمانہ کے انتہائی اہم فوجی سردار کو ختم کرا دیا۔ جس کا نقصان یہ ہوا کہ ایشیا اور افریقہ میں اسلام کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی اچانک ٹھپ ہو کر رہ گئی۔

یہی صورت عثمانی ترکوں کے ساتھ پیش آئی۔ ترکوں نے عین اس وقت اسلام کا جھنڈا سنبھال لیا جب کمزور ہاتھوں میں پہنچ کر اس کے گرنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کئی سو سال تک یورپ کی مسیحی طاقتوں کے مقابلہ میں اسلام کی دیوار بنے رہے۔ اس اعتبار سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہی ترک ہیں جو اس حادثہ کا باعث بنے کہ مسلم دنیا میں ہونے والی سائنسی تحقیقات رک جائیں اور ان کا مرکز یورپ کی طرف چلا جائے۔

ترک انتہائی بہادر اور حوصلہ مند تھے۔ مگر ان کی کمزوری یہ تھی کہ وہ جاہل تھے۔ علمی تحقیق کے کام کی اہمیت نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے بلکہ وہ اس کو اپنے لئے ایک سیاسی خطرہ خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علم بڑھنے سے رعایا میں ان کے حق میں وفاداری کم ہو جائے گی اور ان کو قابو میں رکھنا نسبتاً زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علمی کام کے ساتھ سخت غیر رواداری کا ثبوت دیا۔ جب مسلم سیاست کا مرکز بدلا تو وہ لوگ جو بغداد اور دوسرے مراکز میں سائنس کی تحقیق کا کام کر رہے تھے، وہ منتقل ہو کر ترک دار السلطنت آستانہ میں جمع ہو گئے۔ عباسی خلفاء ان لوگوں کی بے حد قدردانی کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے اوپر درہم و دینار کی بارش کر رکھی تھی۔ مگر ترک ان کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگے۔ انھوں نے ان کی اس قدر حوصلہ شکنی کی کہ ترک حکومت میں ان کو

مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ چنانچہ یہ لوگ ترکی چھوڑ کر اٹلی اور فرانس جانا شروع ہو گئے۔ سائنسی تحقیق کا کام مسلم دنیا سے نکل کر مغربی دنیا میں منتقل ہو گیا۔ ترکوں نے علم اور اہل علم کی جس طرح حوصلہ شکنی کی اس کی دردناک تفصیل مذکر دعلی شامی کی کتاب تاریخ الحضارۃ العربیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مغربی دنیا میں ان سائنس دانوں کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ صلیبی جنگوں (۱۰۹۵-۱۲۷۱) میں مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپی قوموں کو شکست اس لئے ہوئی تھی کہ مسلمان علم وفن میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان جنگوں میں ابتداءً رومی فوجوں نے یونانی آگ (Greek Fire) استعمال کی جس سے مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ "یونانی آگ" ایک قسم کی پچکاری تھی جس میں آتش گیر کیمیائی مرکب بھر کر دشمن کی طرف پھینکا جاتا تھا۔ مسلم سائنس دانوں نے اس کے مقابلہ میں ایک اور چیز ایجاد کی۔ اس میں روغن نفط (معدنی تیل) استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مار زیادہ دور تک تھی اور اس کا نقصان بھی یونانی آگ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔

یورپ کے مسیحی قدرتی طور پر مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی علمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے بیتاب تھے۔ اب جو مسلم دنیا کے اہل علم ان کے یہاں پہنچے تو انھوں نے ان کے ساتھ زبردست تعاون کیا۔ یورپ میں علمی تحقیق کا وہ کام دگنی شدت کے ساتھ ہونے لگا جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک، تقریباً تین سو سالہ عمل کے نتیجہ میں یورپ میں وہ انقلاب آیا جس کو سائنسی اور صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے۔ مغرب کی سائنسی ترقی میں مسلمانوں کے حصہ کے بارے میں مزید تفصیل بریفالٹ کی کتاب تعمیر انسانیت (Making of Humanity) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سولھویں صدی تک مسلمان علم کے میدان میں استادی کے مقام پر تھے۔ مگر اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ نے جو ترقیاں کیں اس نے مسلمانوں کو شاگردی کے مقام پر پہنچا دیا۔ مسلمان خود اپنی لائی ہوئی انقلابی دنیا میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے۔ تاہم اب بھی یہ موقع تھا کہ وہ یورپ کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھیں اور وہ واقعہ دوبارہ نئی شکل میں ظہور میں آئے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مسلمانوں کے علوم کو بنیاد بنا کر یورپ ان سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اب مسلمان یورپ کے علوم کو لے کر مزید آگے کی ترقیاں حاصل کر سکتے تھے۔ مگر یہاں دو خاص وجہیں راستہ میں حائل ہو گئیں۔ ایک تاریخی امکان واقعہ بننے سے رہ گیا۔

سائنس کے معاملہ میں موجودہ مسلمانوں کی غفلت

۱۔ صدیوں تک سائنسی علوم سے دور رہنے کے بعد یورپ کے ذریعہ جب سائنس مسلمانوں کی طرف آئی تو وہ صرف ایک علم کے طور پر نہیں آئی۔ بلکہ وہ ملک گیری اور استعمار کے جلو میں آئی۔ مسلمانوں کے پاس یہ سائنس لے کر وہ لوگ آ رہے تھے جنھوں نے مسلمانوں سے ان کی عظمت اور ان کے اقتدار کو چھینا تھا۔ ان کی تہذیب اور ان کے مذہبی شعائر پر حملے کئے تھے۔ اس موقع پر مسلمان اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ مغربی سائنس کو مغربی سیاست سے الگ کر کے دیکھیں۔ انھوں نے دونوں کو ایک سمجھا۔ وہ جس طرح مغربی قوموں کے دشمن بنے، اسی طرح

وہ مغربی علوم کے بھی دشمن بن گئے۔ جب کہ دوسری قومیں مغرب سے ان کے علوم سیکھ رہی تھیں، مسلمان ان کو دشمن کی چیز سمجھ کر ان سے دور بھاگ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے کم از کم سو سال علم میں پیچھے ہو گئے، قوموں کے اوپر علمی امام بننے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۲۔ مزید نقصان یہ ہوا کہ طویل غفلت کے بعد مسلمانوں میں جو لوگ علم کے مبلغ بن کر اٹھے وہ اس کام کے پوری طرح اہل نہ تھے۔ انھوں نے ایک صحیح کام کو غلط طریقہ سے انجام دینے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ان کو وہ قبولیت حاصل نہ ہو سکی جو باعتبار حقیقت انھیں حاصل ہونی چاہئے تھی۔

مثال کے طور پر علم جدید کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے انھوں نے یہ کیا کہ قرآن و حدیث میں جہاں جہاں "علم" کا لفظ آیا ہے اس کو انھوں نے ان سیکولر علوم کا مصداق بتایا جو آج یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ ایک صحیح بات کے لئے غلط دلیل پیش کرنا تھا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن و حدیث میں جس علم کی فضیلت بیان ہوئی ہے اس سے مراد علم دین ہے نہ کہ سیکولر یا سائنسی علوم۔ ان علوم کو حاصل کرنا یقیناً مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ مگر ان علوم کی اہمیت آیت قوت سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ آیت علم سے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اس قوت کو حاصل کرو جس سے تمھارے حریف کے اوپر تمھاری دھاک قائم ہو۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم نے یہی مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے سائنسی علوم کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ سائنسی علوم میں دستگاہ حاصل کئے بغیر مسلمان آج کی دنیا میں قوت مرہبہ (انفال ۶۰) کے مالک نہیں بن سکتے، اس لئے اس قرآنی حکم کی تعمیل میں موجود حالات کے لحاظ سے یہ بات بھی شامل ہو گی کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اور ان کو اسلام اور مسلمانوں کی تقویت کا ذریعہ بنائیں۔

موجودہ زمانہ کے تعلیمی مصلحین کی اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کا دینی طبقہ ان کا سخت مخالف ہو گیا۔ طلب العلم فریضة علی کل مسلم (حدیث) جیسی نصوص کا مطلب دینی طبقہ کے نزدیک متفقہ طور پر یہ تھا کہ اس سے مراد کتاب و سنت کا علم حاصل کرنا ہے۔ جب تعلیمی مصلحین نے اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو موجودہ زمانہ کے "دنیاوی" علوم پر چسپاں کیا تو دینی طبقہ کو یہ بات سراسر اسلام کی تحریف نظر آئی۔ وہ اس کا دشمن بن کر کھڑا ہو گیا۔ تعلیمی مصلحین بلاشبہ غلطی پر تھے۔ مگر دینی نمائندوں سے بھی یہ غلطی ہوئی کہ وہ مقصد اور استدلال دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انھیں نظر آتا کہ تعلیمی مصلحین جن علوم کی اہمیت کو آیت علم سے غلط طور ثابت کر رہے ہیں وہ آیت قوت سے بالکل درست طور پر ثابت ہو رہی ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں اصل کام استدلال کی تصحیح ہے نہ کہ خود مقصد کو باطل قرار دینا۔

اسلام میں سائنس کی اہمیت

اسلام میں سائنس کی اہمیت کے متعدد وجوہ ہیں۔ یہاں چند چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ سائنس، سادہ طور پر، عالم حقائق کے مطالعہ کا نام ہے۔ قرآن میں یہی صفت اہل ایمان کی بتائی گئی۔

ں زمین و آسمان کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں (یتفکرون فی خلق السماوات والارض، آل عمران ۱۹۱) اس اعتبار
، ایک سائنس داں وہی کام کرتا ہے جو ایک مومن کرتا ہے۔ تاہم دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ سائنس داں کا عمل
رف تحقیق کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا عمل عبرت کے لئے۔ سائنس داں کے پیش نظر علم برائے علم ہوتا ہے اور مومن
پیش نظر علم برائے مقصد۔ سائنس داں اضافۂ علم پر مطمئن ہوتا ہے اور مومن اضافۂ ایمان پر۔

ذہن کا یہ فرق دونوں کے طرز مطالعہ میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنسداں
ںیار کی ماہیت کو چھوڑ کر صرف اشیار کے خواص کے مطالعہ تک اپنے کو محدود رکھتا ہے۔ وہ اشیار کی کارکردگی کو
ن کی معنویت سے جدا کر دیتا ہے۔ سائنس داں کو ایسا اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ صرف اپنی عقل کی رہنمائی میں
ائنات کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور انسان کی عقل قطعیت کے ساتھ صرف قابل تجربہ چیزوں کو دیکھ پاتی ہے، اس لئے اس کے
لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ کائنات کے قابل تجربہ پہلوؤں تک اپنے مطالعہ کو محدود رکھے۔ مگر مومن اپنی
عقل کے ساتھ نبوت کی رہنمائی کو تسلیم کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ خواص اشیار سے گزر کر حقائق اشیار تک
پنے مطالعہ کو لے جاتا ہے۔ وہ "مخلوق" کو اس کے "خالق" کے ساتھ شامل کرکے دیکھتا ہے۔ یہ فرق مومن کے
شاہدۂ کائنات میں زبردست معنویت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کو ساری کائنات صفات خداوندی کا ظہور نظر
آنے لگتی ہے۔ کائنات کو پاتے ہی وہ اس خدا کو بھی پالیتا ہے جس پر وہ پیغمبر کے واسطہ سے ایمان لایا ہے۔

۲۔ قرآن میں کائناتی واقعات کو قرآنی پیغام کے حق میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ گویا قرآن میں جو
بات نظری طور پر کہی گئی ہے، کائنات اس کے حق میں واقعاتی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے پوری سائنس قرآن کا
علم کلام ہے۔ کیونکہ سائنس کسی سائنس داں کے خود ساختہ علم کا نام نہیں بلکہ وہ خدا کی کائنات میں کام کرنے
والے قوانین کی تلاش کا نام ہے۔ ان قوانین کا جو حصہ بھی سائنس دریافت کرتی ہے وہ خدا کی کارفرمائیوں کی
ایک جھلک ہوتی ہے، وہ خدا کی آیتوں میں سے ایک آیت (نشانی) کا انسانی علم میں آنا ہوتا ہے۔ سائنس داں
کے لئے سائنس علم برائے علم ہے یا زیادہ سے زیادہ علم برائے تعمیر دنیا۔ مگر مومن کے لئے سائنس ایک علمی ہتھیار
ہے جس سے وہ دعوت حق کی جد و جہد میں کام لیتا ہے، جس سے وہ اپنی بات کو مدلل کرکے لوگوں کے سامنے پیش
کرتا ہے۔

۳۔ سائنس کا تیسرا پہلو، اسلامی نقطۂ نظر سے، وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ یعنی وہ
موجودہ زمانہ میں قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے اسلام اور مسلمانوں کو سربلند کرنے کے لئے ضروری ہے کہ
سائنس کی قوت کو پوری طرح فراہم کیا جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ مسلمان سائنس کی تحقیق و تحصیل
میں آگے بڑھیں، حتیٰ کہ وہ اس میں امامت کا درجہ حاصل کر لیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں ساری مسلم دنیا میں سیاسی آزادی کی تحریکیں
اٹھیں۔ ان تحریکوں کے مسلم قائدین کا یہ خیال تھا کہ بیرونی سیاسی قبضہ سے آزاد ہونے کا نام غلبہ ہے۔ وہ سیاسی آزادی کو

اسلام کی سربلندی کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ مگر آج جب کہ بے شمار قربانیوں کے بعد تمام مسلم ممالک آزاد ہو چکے ہیں، اُنھا بھی وہ ان غیر مسلم قوموں کے محکوم ہیں جو سائنس اور ٹکنالوجی میں ان سے بڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی سیاسی آزادی ان کو آج کی دنیا میں برتری کا مقام نہ دے سکی۔ کیونکہ وقت بتانے والی گھڑی سے لے کر جنگ لڑنے والے سامان تک ہر چیز کے لئے وہ انھیں قوموں کے محتاج ہیں، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر چیز کا تعلق سائنس اور ٹکنالوجی سے ہو گیا ہے۔ اس لئے جو قوم ان چیزوں میں پیچھے ہو وہ مقابلہ کی اس دنیا میں آگے کی صف میں جگہ نہیں پا سکتی۔

آخری بات

نئی دہلی میں جنتر منتر روڈ سے گزرنے والا ایک عجیب وغریب طرز کی عمارت دیکھتا ہے جس کا نام "جنتر منتر" ہے۔ اسی کے اوپر سڑک کا نام جنتر منتر روڈ رکھا گیا ہے۔ جنتر منتر دراصل پرانے زمانہ کی رصدگاہ ہے جس کو اٹھارویں صدی کے نصف اول میں جے پور کے راجہ جے سنگھ نے بنوایا تھا۔ جے سنگھ کو علم فلکیات کا بہت شوق تھا۔ ہندوستان کے اس راجپوت راجہ نے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے صرف جے پور میں ہی ایک بڑی رصدگاہ نہیں بنوائی بلکہ دہلی، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصدگاہیں تعمیر کرائیں۔ دہلی کا جنتر منتر آج بھی راجہ کے اس شوق کی یاد دلاتا ہے۔

ان رصدگاہوں کے ذریعہ اس دور کے علمائے فلکیات چاند اور ستاروں کی رفتار معلوم کرتے تھے۔ ان رصدگاہوں کے ذریعہ موسم کا پتہ چلایا جاتا تھا۔ وہ اس کی مدد سے ستاروں اور زمین کا فاصلہ ناپتے تھے۔ رات کو چاند کی روشنی اور دن کو سورج کی روشنی کی مدد سے وقت کا اندازہ کرتے تھے۔ عمارت کی کھڑکیاں، دریچے اور دیواروں کے سوراخ خود بخود سال کا پورا کیلنڈر ترتیب دے دیتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں ساری دنیا کا علمی اور تعمیری کام مسلمانوں کی علمی اور تعمیری ترقیوں کی نقل ہوتا تھا۔ چنانچہ مہاراجہ جے سنگھ کی یہ رصدگاہ بھی عباسی رصدگاہوں کی نقل تھی۔ وہ ٹھیک اس انداز سے بنائی گئی تھی جیسی خلیفہ مامون رشید نے ایک ہزار سال پہلے بغداد میں بنوائی تھی۔

قدیم دور میں علم کی امامت مسلمانوں کو حاصل تھی۔ چنانچہ ساری دنیا میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جاتی تھی۔ مگر بعد کے زمانہ میں ان کی غفلت سے امامت کا یہ مقام مغربی قوموں نے حاصل کر لیا۔ تین سو سال پہلے جب ایک شخص فلکیات کے مطالعہ کے لئے "رصدگاہ" بنانا چاہتا تو وہ بغداد کے نمونہ کی نقل کرتا تھا۔ مگر آج جب کسی ملک میں رصدگاہ تعمیر کی جاتی ہے تو اس کا نقشہ اور سامان مغرب کے ماہرین سے حاصل کیا جاتا ہے ——— یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کی عزت وسربلندی کا سفر ختم ہوا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے وہ دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔

نوٹ: علی گڑھ کے آل انڈیا سیمینار بعنوان اسلام اور سائنس (۱۱-۱۲ نومبر ۱۹۸۰) میں پڑھنے کے لئے لکھا گیا۔

اسلام پندرھویں صدی ہجری میں

جب بارش کا موسم آتا ہے اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ کالے بادل فضا میں منڈلانا شروع کرتے ہیں تو خدا کا فرشتہ خاموش زبان میں یہ اعلان کرتا ہے کہ کون ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا سارے کائناتی نظام کو اس کی موافقت میں جمع کردے اور اس کے بعد اس کے بیج کو سات سو گنا زیادہ فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج دین کا بھی ہے۔ خدا نے آج سارے اسباب دین کی موافقت پر جمع کردئے ہیں۔ سیکڑوں برس کی گردش کے بعد زمانہ نے فیصلہ کی جو بنیاد فراہم کی ہے وہ عین ہمارے حق میں ہے۔

اب ان امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ خدا کے بندے اٹھیں جو صرف خدا کے لئے اپنے آپ کو اس مشن میں دے دیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس مشن کے حوالے کریں گے ان کے لئے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کے عمل کا سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ انعام آخرت میں لوٹائے گا اور اسی کے ساتھ اگر اس نے چاہا تو موجودہ دنیا میں بھی۔

اسلامی تاریخ دو بڑے مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب اس کے تیسرے مرحلہ کا آغاز ہونا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو اس تیسرے مرحلہ کو شروع کرنے کی سعادت حاصل ہوگی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آج اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔ آج اس سے بڑا کوئی میدان عمل نہیں جس میں قوت والے اپنی قوت لگائیں اور اس سے بڑی کوئی مد نہیں جس میں پیسہ والے اپنا پیسہ خرچ کریں۔

اسلام کیا ہے

اسلام ایک لفظ میں توحید کا نام ہے۔ جس طرح درخت اصلاً ایک بیج کا نام ہوتا ہے اسی طرح اسلام کی اصل حقیقت توحید ہے اور بقیہ تمام چیزیں اسی توحید کے مظاہر اور تقاضے۔ توحید بظاہر یہ ہے کہ خدا کئی نہیں ہیں بلکہ خدا ایک ہے۔ مگر یہ توحید کوئی خشک گنتی کا عقیدہ نہیں ہے جو کچھ مقرر الفاظ دہرا کر آدمی کو حاصل ہو جائے۔ یہ اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر خدا کا اثبات ہے، یہ خدا کے مقابلہ میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہے۔ خدا قادر مطلق ہے اور بندہ عاجز مطلق۔ کوئی بندہ جب خدا کے ساتھ اپنی اس نسبت کو پالیتا ہے تو اسی کا نام توحید ہے۔

توحید یا ایک اللہ پر ایمان ایک شعوری فیصلہ ہے۔ یہ حق کا انکار کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے حق کو مان لینا ہے۔ اس اعتبار سے ایمان حقیقت واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اور حقیقت واقعہ کا شعوری اعتراف بلاشبہ اس دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔

یہی توحید دنیا کی تمام چیزوں کا دین ہے۔ زمین اور سورج انتہائی کامل صورت میں خدا کی تابعداری

کر رہے ہیں۔ شہد کی مکھی کمال درجہ پابندی کے ساتھ خدا کی مقرر کی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔ مگر ان میں سے کسی کی محکومی شعوری محکومی نہیں۔ وہ خود اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ ساری کائنات میں یہ صرف انسان ہے جو ارادہ اور شعور کے ساتھ اپنے کو محکوم بناتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کامل طور پر خدا کی فرماں برداری کر رہی ہے۔ مگر انسان کی فرماں برداری اختیاری ہے اور دوسری چیزوں کی فرماں برداری بے اختیاری۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کو سجدہ کر رہی ہیں۔ مگر ایک انسان جب سجدہ کرتے ہوئے زمین پر اپنا سر رکھتا ہے تو یہ تمام عالم کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری چیزیں مجبورانہ سجدہ کر رہی ہیں مگر انسان شعور اور ارادہ کے تحت اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیتا ہے۔

انسان کے ذریعہ اس کائنات میں شعوری اور اختیاری محکومی کا واقعہ وجود میں آتا ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے جو اس کائنات میں شعور قدرت کے مقابلہ میں شعور عجز کی دوسری انتہا بنتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحہ پر "عدد" کے مقابلہ میں "صفر" کا ہندسہ تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلہ میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک شخص کا موحد بننا اس آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے جس کا انعام کوئی سب سے بڑی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ اسی سب سے بڑی چیز کا نام جنت ہے۔ جنت کسی کے عمل کی قیمت نہیں۔ جنت کسی بندے کے لئے خدا کی یہ بخشش ہے کہ اس کے بندے نے اپنے رب کو وہ چیز پیش کر دی جو کائنات میں کسی نے پیش نہ کی تھی۔ اس لئے خدا نے بھی اس کو وہ چیز دے دی جو اس نے کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا تھا۔

جنت کیا ہے

جنت ایک انتہائی حیرت انگیز دنیا ہے جو خدا نے اپنے خاص بندوں کے لئے بنائی ہے۔ وہاں خدا کی صفاتِ کمال اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جنت کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہاں نہ حزن ہوگا اور نہ خوف۔ یہ ناقابلِ قیاس حد تک انوکھی صفت ہے۔ کیوں کہ دنیا میں ہم جانتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا دولت مند یا حکمراں اس پر قادر نہیں کہ وہ غموں اور اندیشوں سے خالی زندگی اپنے لئے حاصل کرلے۔ جنت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہاں ہر طرف "سلام سلام" کا چرچا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسے بلند انسانوں کی آبادی ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہوں گے۔ ان کے دلوں میں دوسروں کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ جنت کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہاں آدمی جو غذا کھائے گا اور جو مشروبات پئے گا وہ بول و براز کی شکل میں نہیں خارج ہوگا بلکہ ایک خوشبو دار ہوا نکلے گی اور اس کے ذریعہ تمام کثافت خارج ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسا لطیف مقام ہے جہاں غلاظت بھی بشکل خوشبو خارج

ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی جب کہ وہاں آدمی کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اتنی لذیذ جگہ ہے کہ آدمی ایک رات کی نیند کے بقدر بھی اس سے جدا ہونا پسند نہ کرے گا حالاں کہ وہ اس کے اندر کھرب ہا کھرب سال سے بھی زیادہ مدت تک رہے گا۔ کیسا عجیب ہوگا جنت کا پڑوس اور کیسی عجیب ہوگی جنت کی زندگی۔ پھر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جنت وہ مقام ہے جہاں آدمی اپنے خدا کو دیکھ سکے گا۔ وہ خدا جو ہر قسم کی ناقابل قیاس خوبیوں کا مالک ہے۔ وہ خدا جس نے عدم سے وجود کو پیدا کیا۔ وہ خدا جو آسمان کی عظمتوں کا خالق ہے۔ وہ خدا جس نے سورج کو چمکایا۔ وہ خدا جو درختوں کی سرسبزی اور پھولوں کی مہک میں ظاہر ہوا۔ ایسا خدا کیسا عظیم اور کیسا حسین ہوگا اس کا تصور اتی قیاس بھی کسی کے لئے ممکن نہیں۔ جس جنت میں ایسا نفیس ماحول ہو، جہاں کائنات کے رب کا دیدار حاصل ہوتا ہو اس کی لذتوں اور راحتوں کو کون بیان کر سکتا ہے

مومنانہ زندگی

ایسی قیمتی جنت کسی کو سستے داموں نہیں مل سکتی۔ یہ تو اسی خوش نصیب روح کا حصہ ہے جو حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بندہ ہونے کا ثبوت دے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی عام دنیا دارانہ زندگی کے ساتھ کچھ اسلامی عملیات کا جوڑ لگائے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی آدمی کی پوری زندگی بن جائے۔ اسلام ہاتھ کی چھنگلیا نہیں بلکہ وہ آدمی کا پورا ہاتھ ہے۔ جو شخص اسلام کو اپنی زندگی میں غیر موثر ضمیمہ بنا کر رکھے اس نے اسلام کی توہین کی۔ اسی طرح مومن ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آدمی "خدائی فوجدار" بن کر کھڑا ہو جائے اور حکمرانوں کے خلاف اپوزیشن کا پارٹ ادا کرنے کو اسلام کا کمال سمجھنے لگے۔ اس قسم کی چیزیں اسلام نہیں، وہ خود ساختہ سیاست کو اسلام کا نام دینا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ اگر دین کی کم قدری کے مجرم ہیں تو دوسری قسم کے لوگ دین کی تحریف کے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں آدمی کو خدا کی ناراضگی کا مستحق بناتی ہیں نہ کہ خدا کے انعام کا۔

مومن وہ ہے جس کے سینہ میں اسلام ایک نفسیاتی طوفان بن کر داخل ہوا ہو۔ جو خدا کو اتنا قریب پائے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جائیں۔ جس کی تنہائیاں خدا کے فرشتوں سے آباد رہتی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کی زبان میں خدا کی لگام دے رکھی ہو۔ اور جس کے ہاتھوں اور پیروں میں خدا کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کو حشر کی آمد سے پہلے حشر کے میدان میں کھڑا کر دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر مرنے کے بعد گزرنے والا ہے وہ مومن پر جیتے جی اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ دوسرے لوگ جن باتوں کو اس وقت پائیں گے جب کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا، مومن ان باتوں کو اس وقت پا لیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ

میں چھپا ہوا ہے۔ مومن پر قیامت سے پہلے قیامت گزر جاتی ہے جب کہ دوسروں پر قیامت اس وقت گزرے گی جب کہ وہ عملاً آچکی ہوگی۔

اسلامی دعوت

آگ کا انگارہ جب خارج کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے تو اسی کو ہم آنچ کہتے ہیں۔ برف کا تودہ جب اپنے ماحول کو اپنی حقیقت سے متعارف کرتا ہے تو اسی کو ٹھنڈک کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ مومن کا بھی ہے۔ زمین پر کسی مومن کا وجود میں آنا خود ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اسلامی دعوت ضرور وجود میں آئے گی۔ کسی نفس انسانی میں جب وہ خدائی بھونچال آتا ہے جس کو اسلام کہا گیا ہے تو اس کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے باہر کی دنیا اس سے باخبر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی اسلامی دعوت کا آغاز ہے۔

اسلامی دعوت فرد انسانی میں انقلاب لانے کی دعوت ہے نہ کہ کسی قسم کے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ میں اکھیڑ پچھاڑ کرنے کی۔ اسلامی انقلاب اصلاً ایک نفسیاتی انقلاب ہے اور نفسیاتی انقلاب کسی نفس ہی کے اندر وقوع میں آسکتا ہے۔ نفس کا وجود صرف ایک فرد میں ہوتا ہے اس لئے اسلام کی گھٹنا بھی ایک فرد ہی میں گھٹتی ہے۔ قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کا اپنا کوئی نفسیاتی وجود نہیں۔ اس لئے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے خالی فضا میں تیر مارنا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے قومی حالات یا کسی جغرافیہ کے تمدنی احوال لوگوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے درمیان ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے اندر ان کے قومی یا سیاسی حالات کے نتیجہ میں کوئی حرکت اٹھ کھڑی ہو تو اس کا نام اسلامی تحریک نہیں ہو جائے گا۔ اگر مسلمان اپنے قومی دشمن سے تصادم کو جہاد کہیں یا اپنی قومی تعمیر کو اسلامی نظام کی اصطلاحوں میں بیان کریں تو یہ اسلام نہیں بلکہ غیر اسلام کو اسلام کا نام دینا ہے جو آدمی کو صرف سزا کا مستحق بناتا ہے نہ یہ کہ اس کی بنا پر آدمی کو کوئی اسلامی انعام دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی اسلامی تحریکیں عظیم الشان پیمانہ پر اٹھیں مگر عملاً وہ اس طرح بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں جیسے خدا کے نزدیک ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کے سب قومی ہنگامے ہیں اور کسی قوم کے قومی ہنگاموں کا نام اسلام نہیں۔ اسلامی دعوت کی تحریک ایک لفظ میں جنت کی طرف بلانے کی تحریک ہے۔ جنت خدا کی لطیف و نفیس دنیا ہے جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو اخلاق خداوندی کی سطح پر جیئے ہوں، جنھوں نے دنیوی تعلقات میں کمال انسانیت کا ثبوت دیا ہو جو خدا کی ابدی دنیا سے اثر لے کر متحرک ہوئے ہوں نہ کہ سیاسی اور معاشی حالات کے اثر سے۔ آج کی دنیا میں اسی کا چناؤ ہو رہا ہے۔ جو لوگ اپنی نفسیات اور کردار کے اعتبار سے جنتی ماحول میں بسانے کے قابل

ٹھہریں گے ان کو چھانٹ کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ تمام لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم کر کے دور پھینک دئے جائیں گے تاکہ ابدی طور پر تاریکیوں کے غار میں بھٹکتے رہیں۔

انسان کے سوا بقیہ دنیا بے حد حسین ہے۔ ہرے بھرے درختوں اور نرم و نازک پھولوں کو دیکھئے، زمین و آسمان کے قدرتی مناظر کا معائنہ کیجئے۔ ان کی بے پناہ کشش آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے گی کہ ان سے نظر ہٹانے کا جی نہ چاہے گا۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسانی دنیا ظلم اور گندگی کا کوڑا خانہ بنی ہوئی ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی سطح پر خدا کی مرضی براہ راست اپنی پوری شکل میں نافذ ہے، یہ دنیا ویسی ہی ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ اس کے برعکس انسان کو خدا نے آزادی دے دی ہے۔ اسی آزادی کے غلط استعمال نے انسانی دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام خوبیوں کا مالک صرف خدا ہے۔ خدا جہاں اپنے اختیار کو روک لے وہیں سے جہنم شروع ہو جاتی ہے اور خدا جب اپنے اختیار کو نافذ کر دے تو اسی کا نام جنت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا کہ انسان کو آزادی دے دی کہ وہ خدا کی حسین دنیا کو اپنی باغیانہ کاروائیوں سے عذاب خانہ بنا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ قیمتی انسان چنے نہیں جا سکتے تھے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ خدا کی وسیع دنیا اپنی ان گنت چیزوں کے ساتھ مکمل طور پر خدا کی اطاعت گزار ہے۔ حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک کوئی چیز بھی نہیں جو خدا کی مرضی سے ادنیٰ انحراف کرتی ہو۔ تاہم یہ تمام چیزیں اس لئے محکوم ہیں کہ وہ بے اختیار ہیں۔ فرماں برداری کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے لئے ممکن نہیں۔ اب خدا کو ایسی باشعور اور حقیقت پسند مخلوق درکار تھی جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائے۔ جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنا لے۔ یہی وہ انتہائی نادر ہستیاں ہیں جن کو چھانٹنے کے لئے خدا کا یہ عظیم کارخانہ آباد کیا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک انسانی ذہن کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی رہی ہے وہ انسان کی دنیا میں خرابی کا مسئلہ (Problem of Evil) ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں ساری انسانی تاریخ ظلم اور برائی کا رجسٹر معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنی آزادی کا انتہائی ظالمانہ استعمال کرتا ہے۔ مگر اتنی بڑی برائی کو خدا نے صرف اس لئے گوارا کیا کہ اس کے بغیر اس اعلیٰ نوع کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا تھا جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ اختیار اور آزادی کے ماحول ہی میں وہ انسان چنے جا سکتے ہیں جن کے متعلق خدا کے نگراں فرشتے یہ گواہی دیں کہ یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے مکمل اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو خدا کی خاطر بے اختیار کر لیا تھا۔ دنیا کی بے پناہ برائیاں دراصل ایک بے پناہ بھلائی کی قیمت ہیں۔ یہ بھلائی کہ انسانوں کے جنگل

سے وہ سعید روحیں چھان کر نکالی جائیں جو پورے شعور اور مکمل ارادہ کے ساتھ اپنے کو خدا کا محکوم بنالیں۔ جو محض حقیقت پسندی کی بنا پر خدا کی محکومی اختیار کریں نہ کہ مجبوری کی بنا پر۔

یہ وہ انوکھی ہستیاں ہیں جن کو یہ موقع تھا کہ وہ حق کو جھٹلا دیں مگر انھوں نے حق کو نہیں جھٹلایا۔ جن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی انا کا جھنڈا اونچا کریں۔ مگر وہ اپنے کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خدا کو صدر نشین بنانے پر راضی ہو گئے۔ جن کو پوری طرح یہ آزادی ملی ہوئی تھی کہ وہ اپنی قیادت اور اپنے مفادات کا گنبد کھڑا کریں مگر انھوں نے ہر "اپنے" کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیا اور صرف حق کا گنبد کھڑا کر کے انھوں نے خوشی حاصل کی۔ اس قسم کی نادر روحیں اس کے بغیر چنی نہیں جا سکتی تھیں کہ ان کو مکمل آزادی کے ماحول میں رکھا جائے اور آزادی کا حقیقی ماحول قائم کرنے کی ہر قیمت برداشت کی جائے ـــ اسلامی دعوت کا مقصد ایسی ہی روحوں کو تلاش کرنا ہے

اسلامی انقلاب

دنیا میں سیاسی اور تمدنی انقلاب اسلامی دعوت کا براہ راست نشانہ نہیں۔ تاہم وہ اس کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ کسی معاشرہ میں جب قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی جمع ہو جائے جو اللہ کے لئے جینا اور اللہ کے لئے مرنا چاہتے ہوں تو قدرتی طور پر وقت کی سیاست اور تمدن پر انھیں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی سیاست یا اسلامی نظام نام ہے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کا جو اللہ کے آگے اپنے کو بے نفس کر چکے ہوں۔ جنھوں نے اپنی "میں" کو خدا کے عظیم تر "میں" میں گم کر دیا ہو۔ جن کے جذبات و احساسات آخرت سے اتنا زیادہ متعلق ہو جائیں کہ دنیا میں ان کا کوئی حوصلہ باقی نہ رہے جو دوسرے کے دل کے درد کو اپنے سینہ میں محسوس کرتے ہوں۔ ایسے ہی افراد اسلامی نظام قائم کرتے ہیں اور ایسے افراد اسی وقت بنتے ہیں جب کہ ہر قسم کے دنیوی مقصد سے بلند ہو کر خالص آخرت کے لئے تحریک چلائی جائے۔ اس کے برعکس اگر نعروں اور جلسوں کے زور پر کوئی انقلاب برپا کیا جائے تو وہ انقلاب نہیں ایک ہڑبونگ ہو گا جہاں اسلام کے نعرے تو بہت ہوں گے مگر اسلام کے عمل کا کہیں وجود نہ ہو گا۔ ایسے لوگ حق کے تقاضوں کا نام لیں گے مگر عملاً اپنے گروہ کے تقاضوں کے سوا کوئی چیز ان کے سامنے نہ ہو گی۔ وہ انقلاب اسلامی کے ہنگامے برپا کریں گے مگر حقیقۃً ان کا مدعا یہ ہو گا کہ دوسروں کو تخت سے ہٹا کر خود اس پر قابض ہو جائیں۔ وہ انسانیت اور اخلاق کے نام پر جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچائیں گے مگر اس کا مقصود صرف یہ ہو گا کہ ایک خوبصورت عنوان پر اپنی قیادت کی شان قائم کریں۔ اسلامی انقلاب کی واحد لازمی شرط "بے میں" انسانوں کی فراہمی ہے اور موجودہ طرز کی تحریکوں سے سب سے کم جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ سیاسی اور قومی انداز کی یہ تحریکیں تو "میں" کی غذا ہیں نہ کہ "میں" کی نفسیات کو ختم کرنے والی ـــ خارجی انقلاب کو نشانہ بنانے والی تحریک افراد کے اندر کردار نہیں پیدا کر سکتی۔ کردار ہمیشہ ذاتی محرک سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ خارجی محرک سے

ی دوسرے کے لئے نہیں کماتا، اسی طرح کوئی آدمی بیرونی محرک کے لئے باکردار بھی نہیں بنتا۔ جو لوگ "منظام" کے نام پر
ے باکردار بننے کی اپیلیں کرتے ہیں وہ صرف اپنی سطحیت کا ثبوت دیتے ہیں اور دوسرے کے بارہ میں کمتر اندازہ کا۔

پیغمبر کا کام

اسلام کا مشن ایک ہی مشن ہے۔ اور وہ ہے توحید کا پیغام لوگوں تک پہنچانا۔ ایک ایک شخص کو
۔بنانے کی کوشش کرنا۔ یہی قدیم ترین زمانہ سے تمام نبیوں کا مشن تھا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ
سے پہلے تمام زمانوں میں توحید کی دعوت جان کی قربانی کی قیمت پر دینی ہوتی تھی۔ توحید کا پیغام لے کر
دالے آگ کے الاؤ میں ڈال دئے جاتے اور آروں سے چیر دئے جاتے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ
ہ قدیم زمانہ میں شرک کو فکری غلبہ کا مقام حاصل تھا۔ حتیٰ کہ سیاست کی بنیاد بھی شرک پر قائم تھی۔ قدیم
کے بادشاہ لوگوں کو یہ باور کرا کے ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ ان کے
خدا حلول کر آیا ہے۔ اس لئے جب توحید کا داعی یہ آواز بلند کرتا کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی اس کا
ب نہیں، تو قدیم زمانہ کے بادشاہوں کو یہ آواز براہ راست ان کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والی نظر آتی تھی۔
ں انھیں اپنی مشرکانہ سیاست کی تردید دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سیاسی مفاد کی بنا پر توحید کے داعیوں
شمن بن جاتے اور بے رحمی کے ساتھ ان کو کچل دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس صورت حال کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ قرآن میں پیغمبر آخر الزماں
ٓپ کے ساتھیوں کو سکھایا گیا کہ تم اس طرح دعا کرو: رَبَّنا وَلا تحمل علینا اِصْراً کما حَمَلْتَہ عَلَی الَّذِیْنَ
بْلِنَا (خدایا ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے کے لوگوں پر ڈالا تھا)۔ یہ دعا کے انداز میں
خدائی فیصلہ کا اظہار تھا کہ خدا انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لانے والا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتدار
شتہ شرک سے ٹوٹ جائے گا۔ اب حکومت ایک خالص سیاسی معاملہ ہوگا نہ کہ اعتقادی معاملہ۔ یہی وہ
ئی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لئے قرآن میں حکم دیا گیا: وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ
(انفال ۳۹) یعنی مشرکوں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ کی حالت باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے۔

فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ فَتَنَ فلاناً عن رأیہ کے معنی ہیں رائے سے پھیر دینا۔ قرآن میں آیا ہے:
ی کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے جن
اندیشہ تھا کہ فرعون ان کو ستائے گا (یونس ۸۳) اس آیت میں ان یفتنہم کا لفظ ہے جو ستانے اور عذاب
بنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ گویا فتنہ کے معنی تقریباً وہی ہیں جس کو انگریزی زبان میں Persecution
ہ ہیں۔ یعنی کوئی رائے یا عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فتنہ تھا جس کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ شرک کا فتنہ تھا۔ چنانچہ مفسرین نے ان آیات میں فتنہ کی تفسیر "شرک" سے کی ہے۔ تاہم یہاں فتنہ سے مراد مطلق شرک نہیں بلکہ شرک جارح ہے۔ کیونکہ شرک جب جارح ہو تبھی وہ روکنے والا بنتا ہے۔ حتیٰ لاتکون فتنۃ کا مطلب ہے حتی لا یُفتَنَ رجلٌ عن دینہ۔ یعنی شرکِ جارح سے لڑکر اسے ختم کر دو تاکہ دین شرک بے زور اور مغلوب ہو کر رہ جائے اور غالب دین کی حیثیت سے صرف دینِ توحید دنیا میں باقی رہے۔

شرک اپنی ابتدائی صورت میں محض ایک عقیدہ ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں اس نے "فتنہ" کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں انسانی فکر پر شرک کا غلبہ تھا۔ زندگی کے ہر معاملہ کو شرک کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ سیاست و حکومت کی بنیاد بھی شرک کے اوپر قائم تھی۔ لوگ سورج اور چاند جیسی چیزوں کو دیوتا سمجھتے تھے اور شاہی خاندان اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کی اولاد بتا کر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس بنا پر جب توحید کا داعی یہ کہتا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو قدیم بادشاہوں کو یہ نظریہ ان کے حق حکمرانی کی تردید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ اس کو اپنا حریف سمجھ کر اس کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ عرب میں اور اطرافِ عرب میں توحید کی بنیاد پر جو اسلامی انقلاب آیا اس نے شرک کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹا دیا۔ اب شرک کی حیثیت ایک ذاتی عقیدہ کی ہو گئی نہ کہ ایک ایسے عوامی نظریہ کی جس کے اوپر سماجی زندگی کا پورا نظام قائم ہو۔ نتیجۃً شرک کا رشتہ اقتدار سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اب شرک کی بنیاد پر کسی کے لئے حق حکمرانی کا دعویٰ کرنے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔

معلوم انسانی تاریخ میں یہ تبدیلی بالکل پہلی بار آئی۔ اس کے ہمہ گیر اثرات میں سے دو چیزیں یہاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ جب یہ معلوم ہوا کہ خدا صرف ایک ہے اور بقیہ تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر مظاہر فطرت کے تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ وہ چیزیں جو اب تک انسان کے لئے پرستش کا عنوان بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس کو اپنی خادم نظر آنے لگیں (خلق لکم ما فی الارض جمیعا، بقرہ ۲۹) اب آدمی نے چاہا کہ وہ ان چیزوں کو جانے اور ان کو استعمال کرے۔ انسانی ذہن کی یہی وہ تبدیلی ہے جس نے تاریخ میں توہماتی دور کو ختم کر کے سائنس کے دور کو شروع کیا۔ اسی کے ساتھ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت کا دور کم از کم نظریاتی طور پر ختم ہو گیا اور عوامی حکمرانی کے دور کا آغاز ہوا۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ تمام انسان یکساں ہیں، کسی انسان کے اندر کوئی خدائی صفت نہیں تو اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر خدائی حق حکمرانی کے لئے زمین باقی نہیں رہی۔

ان دونوں انقلابات کا آغاز مدینہ سے ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمشق، بغداد، اسپین اور سسلی ہوتا ہوا

قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ اس مدت میں قدیم حالات کے اثر سے اس فکری تحریک کو بار بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس کا سفر جاری رہا۔ مخالف طاقتوں کی کوئی بھی کوشش اس میں کامیاب نہ ہو سکی کہ وہ مظاہر فطرت کے تقدس کے دور کو دوبارہ اس کی سابقہ عظمت کے ساتھ واپس لا سکے۔ اور نہ کسی حکمراں کے لئے کبھی یہ ممکن ہوا کہ وہ اس طرح مقدس بادشاہ ہونے کا مقام حاصل کرے جیسا کہ عراق کے نمرود اور مصر کے فرعون کو قدیم زمانہ میں حاصل تھا۔

مسلم دنیا سے مغربی دنیا کی طرف

ابتداءً تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمل مسلم دنیا میں ہوتا رہا۔ مگر سولھویں صدی عیسوی میں ایک نیا انقلاب آیا۔ مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کی وجہ سے ایک طرف بغداد کی عباسی خلافت ٹوٹ گئی اور دوسری طرف اسی باہمی اختلاف کے نتیجہ میں اسپین کا مسلم اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلم دنیا میں کوئی ادارہ ان لوگوں کی سرپرستی کرنے والا نہ رہا جو علمی وفکری تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ علماء اور مفکرین کی بڑی تعداد دھیرے دھیرے اٹلی اور اور فرانس کی طرف منتقل ہو گئی۔ مخصوص اسباب کی بنا پر یورپ میں ان لوگوں کو بہت پذیرائی ملی۔ انقلابی عمل جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا، وہ یورپ کی دنیا میں ہونے لگا۔ تاہم یورپ پہنچ کر اس کے اندر ایک تبدیلی آگئی۔ مسلم دنیا میں یہ کام اسلام کے زیر اثر ہو رہا تھا۔ یورپ کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی، اس نے اس کو اسلام سے جدا کر کے خالص علمی حیثیت سے فروغ دینا شروع کیا۔ اگرچہ مسلم علوم اور عربی زبان کی اس منتقلی کا اثر یورپ کے مسیحی عقائد پر بھی پڑا۔ حتیٰ کہ مارٹن لوتھر (۱۵۴۶ - ۱۴۸۳) براہ راست طور پر یورپ کے اوپر اسلامی اثرات کی پیداوار تھا۔ تاہم علمی وفکری تحریک کا ارتقار یورپ میں آزاد سیکولر شعبہ کے طور پر ہوا نہ کہ مذہب کے ایک ذیلی شعبہ کے طور پر۔ جدید مغرب کا سائنسی اور جمہوری انقلاب تمام تر اسلامی انقلاب کی دین ہے۔ البتہ مغرب نے اس کو مذہب سے جدا کر کے سیکولر شکل دے دی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید مغربی انقلاب، اسلامی انقلاب کی ایک دنیوی صورت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایٹم بم آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی فوجی صورت ہے اور قومی ملکیت مارکسی نظریہ کی معاشی صورت۔

جدید انقلاب کی اسلامی اہمیت

جدید مغربی انقلاب، اپنی عمومی حیثیت میں، خود اسلام کا پیدا کردہ تھا۔ اس کے نتائج اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھے۔ اس انقلاب نے دنیوی اعتبار سے اس دعا کی تکمیل کر دی تھی جس کو خدا نے ان الفاظ میں ہمیں تلقین کیا تھا: اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا (بقرہ) اس انقلاب کے نتیجہ میں زندگی کے نظام میں ہمارے موافق جو تبدیلیاں ہوئیں وہ خاص طور پر یہ تھیں:

۱۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر حکومت کرتے تھے کہ وہ سورج دیوتا یا چاند دیوتا کی اولاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں توحید کی دعوت فوراً سیاسی اقتدار کی حریف بن جاتی تھی اور مشرک بادشاہوں کے ظلم کا نشانہ بنتی تھی۔ شرک کی تردید کو وہ اپنے حق حکمرانی کی تردید کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے طور پر یورپ میں جو جمہوری انقلاب آیا ہے اس نے اس نزاکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔ کیونکہ آج کا حکمراں عوامی رائے سے حکمرانی کا حق حاصل کرتا ہے نہ کہ خدا کے ساتھ اپنا مفروضہ الوہی رشتہ جوڑ کر۔ اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان کھول دیا کہ توحید کی تبلیغ اس اندیشہ کے بغیر کی جائے کہ پہلے ہی مرحلہ میں غیر ضروری طور پر اس کا ٹکراؤ سیاسی ادارہ سے ہو جائے اور وہ اس کو کچل کر رکھ دے، جیسا کہ اسلام سے پہلے ساری تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔

۲۔ قدیم زمانہ میں مظاہر فطرت (سورج، چاند، دریا وغیرہ) کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ توحید کی بنیاد پر ہونے والے اسلامی انقلاب اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے مغرب کے سائنسی انقلاب کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کے واقعات خدائی مظاہر کے بجائے عام مادی مظاہر سمجھے جانے لگے۔ جو چیز پہلے پوجنے کی چیز سمجھی جاتی تھی وہ اب تحقیق و تجسس کی چیز بن گئی۔ اس کے نتیجہ میں جدید سائنسی اور تکنیکی انقلاب پیدا ہوا جس نے بے شمار نئی طاقتیں انسان کے قبضہ میں دے دیں۔ اس انقلاب کے ذریعہ تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں اور جدید ذرائع ابلاغ (پریس، ریڈیو وغیرہ) تک انسان کی دسترس ہوئی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہو گیا کہ کسی عقیدہ کی تبلیغ عالمی اور بین اقوامی سطح پر کی جاسکے۔ خدا کے دین کی دعوت مقامی دعوت کے مرحلہ سے گزر کر عالمی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔

۳۔ اسی انقلاب کے ذریعہ کائنات کے وہ چھپے ہوئے حقائق سامنے آئے جو توحید اور اس سے متعلق نظریات کے حق میں اعلیٰ علمی دلائل فراہم کر رہے ہیں۔ جنھوں نے قرآن کے کائناتی اشاروں کو کھول کر ہر ایک کے لئے انھیں قابل فہم بنا دیا ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار وہ دور آیا جب کہ کائناتی نشانیاں معجزہ کا بدل بن جائیں۔ دینی حقیقتوں کو مشاہداتی دلائل کی سطح پر ثابت کیا جاسکے۔

۴۔ پھر اسی انقلاب کے ذریعہ تاریخ میں پہلی بار معاملات پر غور و فکر کا سائنسی، بالفاظ دیگر، واقعاتی نقطۂ نظر پیدا ہوا۔ کائنات کا علم صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب کہ انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں اس پر غور کیا جائے۔ اس لئے اس کے اثر سے علمی دنیا میں یہی عام ذہن بن گیا۔ اب واقعات کو واقعات کی رو سے دیکھا جانے لگا نہ کہ خوش عقیدگی یا توہمات کے اعتبار سے۔ اب یہ فضا پیدا ہوئی کہ مذاہب کی خالص علمی اور تاریخی تحقیق کی جائے۔ اسی انداز مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں علمی سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اسلام کے سوا جتنے

مذاہب ہیں سب کے سب غیر تاریخی (اور اس بنا پر ناقابل اعتبار) ہیں۔ مذاہب کے درمیان جس مذہب کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل ہے وہ صرف اسلام ہے (ملاحظہ ہو دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس)

مغرب کا غلبہ مسلم دنیا پر

مسلم دنیا نے صلیبی جنگوں (۱۲۷۱ـــ ۱۰۹۵) میں مسیحی یورپ پر فتح پائی تھی۔ مگر اس فتح کے بعد ہی برعکس عمل بھی شروع ہو گیا۔ مسیحی یورپ نے محسوس کیا کہ اس کی شکست کا سبب علمی اور فکری میدان میں مسلم دنیا سے اس کا پیچھے ہونا تھا۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ نے تیزی سے مسلمانوں کے علوم اور عربی زبان کو سیکھنا شروع کر دیا۔ بعد کی صدیوں میں جب مسلم دنیا کے اہل علم یورپ کے ملکوں میں منتقل ہوئے تو وہاں یہ عمل اور تیزی سے جاری ہو گیا۔ بالآخر مغرب کی ترقی اس نوبت کو پہنچی کہ وہ علم و عمل کے تمام شعبوں میں مسلم قوموں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس نے مسلم ممالک میں داخل ہونا شروع کیا اور انیسویں صدی تک یہ حال ہوا کہ تقریباً تمام مسلم دنیا پر مغربی قوموں کا تسلط قائم ہو گیا۔

یہی سیاسی حادثہ اس بات کا سبب بن گیا کہ مذکورہ قیمتی امکانات اسلامی دعوت کے حق میں استعمال نہ ہو سکیں۔ صلیبی جنگوں میں ہاری ہوئی قوموں کو دوبارہ مسلم علاقوں میں گھستے ہوئے دیکھ کر لوگ بھڑ اٹھے۔ ساری مسلم دنیا میں مغرب کے خلاف سیاسی زور آزمائی شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگ سیاسی مقابلہ آرائی ہی کو عین اسلام ثابت کرنے لگے تاکہ لوگ جب اجنبی حکمرانوں سے لڑ کر فارغ ہوں تو خود اپنے ملکی حکمرانوں کے خلاف مقدس سیاسی جہاد چھیڑ دیں۔ اس فضا میں کسی کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ جدید دنیا نے کچھ نئے امکانات کھولے ہیں اور وہ اسلام کے حق میں کامیابی کے ساتھ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جدید مواقع انتظار کرتے رہے کہ ہم ان کو استعمال کر کے اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پھیلا دیں اور نتیجۃً خدا کی نصرت کے مستحق ہوں۔ مگر ہماری سیاسی نفسیات نے ہم کو اُدھر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ دی۔

سیاسی انقلاب کی نوعیت

سیاسی انقلاب کی اہمیت اسلام میں کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سیاسی انقلاب دراصل اس کا نام ہے کہ اہل حق کو اہلِ باطل پر غلبہ حاصل ہو جائے (صف) قرآن کی صراحت کے مطابق یہ غلبہ خدا کی توفیق اور نصرت سے حاصل ہوتا ہے (وما النصر الا من عند اللہ) اور خدا کی نصرت کا استحقاق حاصل کرنے کی واحد لازمی شرط دعوت ہے۔ اہل حق جب دعوت کے عمل کو اس کی تمام صالح شرائط کے ساتھ شروع کریں اور اس کو کرتے ہوئے اتمام حجت کے قریب پہنچا دیں تو اس وقت اس دعوتی عمل کی تکمیل کے نتیجہ میں ایک طرف اہل حق انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اہل باطل سزا کے مستحق۔ اس وقت خدائی منصوبہ کے تحت حالات میں تبدیلی

شروع ہوجاتی ہے۔ اہلِ حق خدائی طاقت سے مسلح ہو کر اہلِ باطل پر غالب آتے ہیں۔ دعوت حق اور اتمام حجت کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں سے کبھی کسی مسلم گروہ کو غیر مسلم طاقتوں پر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ خدا کی سنت ہے اور خدا کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (انعام ۱۳۱)

غیر مسلم اقوام کے لئے غلبہ کا فیصلہ خدا کے عام قانونِ امتحان کے تحت ہوتا ہے (یونس ۱۴) مگر اہلِ ایمان کے لئے غلبہ کا فیصلہ قانون اتمام حجت کے تحت ہوتا ہے۔ اگر ہم غیر مسلم گروہ پر دعوتی عمل کو انجام نہ دیں تو ہم کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہئے کہ غیر مسلم گروہ پر ہمیں غلبہ عطا کیا جائے گا۔ دعوتی عمل ہی تو غیر مسلم گروہ پر غلبہ کی قیمت ہے۔ پھر جب قیمت ادا نہ کی گئی ہو تو متاع مطلوب آخر کس طرح حاصل ہوگی۔

مسلم دنیا میں سیاسی ردعمل

چودھویں صدی ہجری کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ انیسویں صدی عیسوی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے چودھویں صدی ہجری اسلامی تاریخ کی اہم ترین صدی تھی۔ کیوں کہ یہ اس وقت آئی جب کہ اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہونے والا عمل اپنی آخری تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ گیا تھا۔ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جس عالمی ہدایت کا دروازہ کھولا تھا، اس کو بروئے کار لانے کے حالات اور ضروری وسائل اپنی کامل صورت میں مہیا ہو کر ہمارے سامنے آچکے تھے۔ مگر تاریخ کا غالباً یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ یہ دروازہ عین اس وقت خود مسلمانوں کے ہاتھوں بند ہو گیا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں کھولا تھا۔

جدید انقلاب نے یورپ کو جو طاقتیں دی تھیں ان کو اس نے اسی طرح اپنے قومی عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جس طرح کوئی بھی قوم ان حالات میں کرتی ہے۔ مغربی قوموں کی دسترس جیسے ہی جدید طاقتوں پر ہوئی ان کے یہاں وہ چیز وجود میں آئی جس کو مغربی استعمار کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے جغرافیہ سے نکل کر خشکی اور تری میں اپنے جھنڈے گاڑے۔ قوموں کے درمیان اپنی تہذیب پھیلائی۔ جن لوگوں نے ان کے راستہ میں رکاوٹ ڈالی ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ مغربی قوموں کے ان عزائم کا براہ راست شکار ہونے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے باہر اکثر آباد دنیا مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیز جس کو ہم نے اسلامی انقلاب کا سیکولر نتیجہ کہا ہے، اس کا تعارف مسلمانوں سے اپنے پہلے ہی مرحلہ میں اس حیثیت سے ہوا گویا کہ وہ ایک دشمن طاقت ہے جو مسلمانوں کو ان کی تمام عظمتوں سے محروم کر کے ان کو ایک مغلوب اور پسماندہ قوم بنا دینا چاہتی ہے۔ مغربی انقلاب کا افادی پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، وہ اس کو اپنے سیاسی اور اقتصادی حریف کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔

چودھویں صدی ہجری اسلام کی پوری تاریخ میں پہلی صدی تھی جب کہ یہ امکان پیدا ہوا تھا کہ اسلام

کی دعوت توحید کو یُسر (آسانی) کے حالات میں انجام دیا جائے جب کہ اس سے پہلے صرف عُسر (سختی) کے حالات ہی میں اس کو انجام دینا ممکن ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی پہلی بار ہوا کہ خود انسان کے اپنے مسلّمات کے مطابق اسلام کا دیگر ادیان کے مقابلہ میں واحد معتبر دین ہونا ثابت کیا جائے اور اس کو اعلیٰ ترین علمی شواہد سے اس طرح مدلّل کر دیا جائے کہ کسی کے لئے انکار کی جرأت باقی نہ رہے۔ نیز اس صدی میں پہلی بار تیز رفتار سواریاں اور تبلیغ کے جدید ذرائع انسان کے قبضہ میں آئے جن سے کام لے کر اسلام کے پیغام کو بین اقوامی سطح پر پھیلایا جاسکتا تھا۔ مگر جو قومیں ان خدائی برکتوں کو ہماری طرف لارہی تھیں وہ اتفاقی حالات کے نتیجہ میں ہماری سیاسی حریف بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا مغرب کے بارے میں مخالفانہ نفسیات کا شکار ہوگئی، مغرب کی طرف سے آنے والے انقلاب کا افادی پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ حالاں کہ خدا نے مسلمانوں کے لئے ایسا امکان کھولا تھا کہ وہ خود مغرب کے پیدا کردہ حالات کو اپنے دعوتی مقاصد میں استعمال کر کے مغرب کو نظریاتی طور پر فتح کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں نے بروقت اس دانش مندی کا ثبوت دیا ہوتا تو چودھویں صدی ہجری میں وہ واقعہ دوبارہ نئے انداز سے پیش آتا جو آٹھویں صدی ہجری میں تاتاری فاتحین کے خادمانِ اسلام بن جانے کی صورت میں پیش آچکا ہے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

چودھویں صدی ہجری میں ساری مسلم دنیا میں بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں۔ مگر ضمنی فرق کے باوجود یہ تمام تحریکیں ردعمل کی تحریکیں تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں مثبت تحریکیں۔ جدید مسلم قیادت "مغرب" کے نام سے جس چیز سے واقف ہوئی وہ صرف یہ تھا کہ یہ ایک حملہ آور قوم ہے جو ہمارے لئے سیاسی چیلنج بن کر اٹھی ہے، وہ اس بات سے بے خبر رہے کہ مغرب دراصل کچھ جدید قوتوں کی دریافت کا نام ہے اور یہ قوتیں اسلام کے لئے عین مفید ہیں بلکہ بالواسطہ طور پر خود اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلم تحریکیں نئے امکانات سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، وہ جدید قوموں کے مقابلہ میں صرف ایک منفی رول ادا کر کے رہ گئیں۔

اس صورت حال کا مزید نقصان یہ ہوا کہ دوسری قوموں سے ہمارا صحیح اسلامی رشتہ قائم نہ ہوسکا۔ مسلمان کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مذکورہ منفی نفسیات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے ان قوموں کو مدعو نہ سمجھا، ان کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ اسلامی تحریکیں پیغام آخرت کی تحریکیں نہ رہیں بلکہ پیغام سیاست کی تحریکیں بن گئیں۔ ان تحریکوں نے انداز کے فرق کے ساتھ، جدید دنیا کو جس "اسلام" سے واقف کرایا وہ محض ایک قسم کا قومی اسلام تھا نہ کہ خدا کا وہ دین جو انسانوں کو آخرت کی ابدی کامیابی کا راستہ دکھانے کے لئے آیا ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق حریف اور مدمقابل کا تعلق بن کر رہ گیا۔

یہ مسلم تحریکیں اپنی جس معذوری کی وجہ سے "مغرب بحیثیت استعمار" اور "مغرب بحیثیت جدید قوت" کو الگ الگ کر کے نہ دیکھ سکیں، اسی معذوری کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ انھوں نے جدید قوموں کے خلاف اپنی مہم میں نہ تو نئی قوتیں فراہم کیں اور نہ نئے حالات کی رعایت کی۔ حد درجہ نادانی کے ساتھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جان و مال کی قربانیاں دی جاتی رہیں جب کہ ان قربانیوں کے لئے قطعی طور پر مقدر تھا کہ اسباب کی اس دنیا میں وہ بالکل رائگاں ہو کر رہ جائیں۔ اس طویل غیر حقیقت پسندانہ سیاست کی اب یہ نفسیاتی قیمت مسلمانوں کو دینی پڑ رہی ہے کہ پوری کی پوری مسلم دنیا ایک قسم کے فرضی جنونِ عظمت (Paranoia) کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور اب کوئی حقیقت پسندانہ بات اسے اپیل ہی نہیں کرتی۔

فخر نہیں ذمہ داری

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے یکم اکتوبر ۱۹۸۰ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی۔ ان کی ڈیڑھ گھنٹہ کی یہ تقریر ان کے اپنے الفاظ میں دنیا بھر کے ۹۰ کروڑ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے تھی۔ ان کی لکھی ہوئی تقریر کا ایک پیراگراف یہ تھا:

> **As they enter the 15th Century Hijra, the Islamic peoples, who have rediscovered their pride in their religion, their great culture and their unique social and economic institutions, are confident that the advent of this century would mark the beginning of a new epoch, when their high ideals of peace, justice, equality of man, and their unique understanding of the universe, would once again enable them to make a worthy contribution to the betterment of mankind.**

اب کہ اسلامی قومیں پندرھویں صدی ہجری میں داخل ہو رہی ہیں، انھوں نے اپنے مذہب، اپنے عظیم کلچر اور اپنے بے مثل سماجی اور معاشی اداروں میں اپنے فخر کو دوبارہ دریافت کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ اس صدی کا آغاز ایک نئے عہد کی ابتدا ثابت ہوگا جب کہ امن، انصاف، انسانی برابری اور کائنات کے بارے میں ان کا بے مثل شعور ان کو دوبارہ اس قابل بنائے گا کہ وہ انسانیت کی بھلائی میں قابل قدر حصہ ادا کر سکیں۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے یہ بات موجودہ مسلمانوں کی تعریف کے طور پر کہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی میں مسلمانوں کا وہ المیہ بھی چھپا ہوا ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ان کی تمام اسلامی کوششوں کو بے قیمت بنا دیا ہے۔ آج ساری مسلم دنیا میں اسلام کے نام پر زبردست سرگرمیاں جاری ہیں مگر یہ ساری دھوم فخر (Pride) کے طور پر ہے نہ کہ ذمہ داری کے طور پر۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سرگرمی فخر کے احساس کی بنیاد پر اٹھتی ہے (حدید ۲۰) اور اخروی سرگرمی عبدیت کے احساس کی بنیاد پر (ذاریات ۵۶) فخر سے انانیت اور مطالبہ کا جذبہ ابھرتا ہے اور عبدیت سے عجز اور ذمہ داری کا۔ اسلامی تحریک وہ ہے جو جہنم سے ڈرانے کے لئے اٹھے۔ مگر موجودہ زمانہ کی

اسلامی تحریکیں دنیا میں بڑائی حاصل کرنے کے جذبہ سے اٹھی ہیں۔ قومی سربلندی کے احساس نے ان کو کھڑا کیا ہے۔ آج کے مسلمانوں کے لئے اسلام ایک نازکی چیز ہے نہ کہ حقیقۃً آخرت کی صراط مستقیم۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ تحریکیں مسلمانوں کی قومی تحریکیں ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تحریکیں مسلمانوں کے یہاں آج جس مذہب کی دھوم ہے وہ قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب۔ کیونکہ قومی مذہب سے ہمیشہ فخر کی نفسیات ابھرتی ہے اور خدائی مذہب سے ذمہ داری کی نفسیات۔

حقیقی اسلام آدمی کے اندر عجز اور تواضع پیدا کرتا ہے اور جہاں عجز اور تواضع ہو وہاں گویا ساری بھلائیاں جمع ہو گئیں۔ کیونکہ ہر خرابی کی جڑ کبر اور ہر اچھائی کی جڑ عجز ہے۔ ایسے افراد میں ان کے اسلام کے لازمی نتیجہ کے طور پر خدا کا خوف، آخرت کی طلب، باہمی اتحاد، ایک دوسرے کی خیر خواہی، شکایتوں سے درگزر کرنا، تعمیری کاموں کی طرف توجہ اور حقوق کے مقابلہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اور جس سماج میں ایسی نفسیات والے انسان قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں وہ اپنے آپ دنیا میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس قومی اسلام آدمی کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتا ہے اور جہاں فخر و ناز کے جذبات ہوں وہاں گویا تمام برائیاں جمع ہو گئیں۔ ایسے افراد کے اندر انانیت، آخرت سے بے خوفی، اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کا احتساب اور پھر ان کیفیات کے نتیجہ میں اختلاف اور باہمی ٹکراؤ عام ہو جاتا ہے۔ وہ خاموش تعمیری کام کے مقابلہ میں نمائشی کاموں کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ وہ پیچھے چلنے کے بجائے ہمیشہ آگے چلنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے معمولی کام کو بڑے بڑے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تاکہ اپنے برتری کے جذبہ کو تسکین دے سکیں۔ اسلام ایسے لوگوں کے درمیان کرنے سے زیادہ کہنے کی چیز ہوتا ہے ۔ اور جہاں ایسا اسلام ہو وہاں لوگوں کے اوپر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے نہ کہ خدا کی رحمت و نصرت۔

یہودیوں کی صیہونی تحریک قدیم اسرائیلی عظمت کو واپس لانے کی تحریک ہے۔ ہندوؤں کی آر ایس ایس تنظیم اپنے شاندار ماضی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اٹھی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی ایک پُر فخر دنیوی تاریخ ہے اور موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکیں کسی نہ کسی اعتبار سے اسی پر فخر ماضی کو واپس لانے کے جذبہ سے ابھری ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہودیوں اور ہندوؤں کی تحریکیں مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود حقیقی معنوں میں مذہبی تحریکیں نہیں ہیں، وہ یقینی طور پر صرف قومی تحریکیں ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی اسی قسم کے جذبات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں بھی محض اس لئے اسلامی تحریکیں نہیں بن جائیں گی کہ وہ اپنے مقصد کو اسلامی الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ خدا کسی کے عمل کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے نہ کہ ظاہر کے اعتبار سے۔ جو تحریک قومی نفسیات کے ساتھ اٹھے وہ خدا کی نظر میں قومی تحریک ہی رہے گی، اس کا قرآن و حدیث کے الفاظ استعمال کرنا کسی بھی طرح اس کو اسلامی

تحریک کا مقام نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس پر خدا کے وہ وعدے پورے ہوسکتے جو صرف حقیقی اسلامی تحریک کے لئے مقدر ہیں۔

کرنے کا کام

اسلام چونکہ آخری دین ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کے اعتبار سے قیامت تک باقی رہے۔ اسی لئے دین کا تحفظ بھی ایک ضروری اور مطلوب کام ہے۔ موجودہ زمانہ کی بعض تحریکوں نے اس اعتبار سے یقیناً مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اسلام کے فکری اور عملی نقشہ کی محافظ ثابت ہوئی ہیں۔ بعض ادارے قرآن اور حدیث اور اسلامی مسائل کے علم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعض جماعتیں اسلامی عبادات کے ڈھانچہ کو ایک نسل سے دوسری تک پہنچانے کا کام کر رہی ہیں۔ کچھ اور ادارے قرآن و حدیث کا متن صحت و صفائی کے ساتھ چھاپ کر ہر جگہ پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام کام بجائے خود مفید ہیں مگر بہر حال وہ تحفظ دین کے کام ہیں نہ کہ دعوتِ دین کے۔ جہاں تک اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے زندہ کرنے کا سوال ہے وہ موجودہ زمانہ میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس کا شعور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ایسے کاموں کو اسلامی دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں جن کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

پندرھویں صدی، ہجری میں کسی حقیقی اسلامی کام کے آغاز کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو ختم کریں جس نے ساری دنیا میں اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ مسلمان ہر ملک میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف شور و شر برپا کرنے میں مشغول ہیں۔ کہیں ان کی یہ تحریک غیر مسلم اقتدار کے خلاف برپا ہے اور کہیں مسلم اقتدار کے خلاف۔ کہیں وہ مسلح جد وجہد کے روپ میں ہے اور کہیں زبانی اور قلمی احتجاج کے روپ میں۔ کہیں وہ ایک اسلامی سیاسی فلسفہ کے زیر سایہ کام کر رہی ہے اور کہیں فلسفہ اور نظریہ کے بغیر متحرک ہے۔ کہیں اس نے ملی عنوان اختیار کر رکھا ہے اور کہیں نظامی عنوان۔ تاہم سارے فرق و اختلاف کے باوجود نتیجہ سب کا ایک ہے ——— جدید امکانات کو دعوت توحید اور انذار آخرت کے لئے استعمال نہ کرنا اور اپنی قوتوں کو بے فائدہ طور پر مفروضہ حریفوں کے خلاف محاذ آرائی میں ضائع کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بالکل الٹی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ خدا نے دعوتِ حق کی راہ سے سیاسی رکاوٹ کو دور کر کے انھیں موقع دیا تھا کہ وہ آزادانہ حالات میں خدا کے تمام بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی اس اسکیم سے باخبر کر دیں جس کے تحت اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک ایک شخص کا حساب لینے والا ہے ۔ مگر انھوں نے دوبارہ نئے نئے عنوان سے اپنے خلاف سیاسی رکاوٹیں کھڑی کر لیں۔ خود ساختہ سیاسی جہاد میں ہر ایک مشغول ہے۔ مگر دعوتی جہاد میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

قرآن میں ہے کہ اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے (حج ۴۰) ہر دور میں خدا اپنے دین کے حق میں کچھ امکانات کھولتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہوں جو خدا کے اشارہ کو سمجھیں اور خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کر دیں۔ صحابہ کرام وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ میں خدائی منصوبہ کو سمجھا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

بارش کا آنا خدا کے ایک منصوبہ کا خاموش اعلان ہے۔ یہ کہ آدمی اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اپنے کائناتی انتظام کو اس کے موافق کر کے اس کے بیج کو ایک پوری فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ کسان اس خدائی اشارہ کو فوراً سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس خدائی منصوبہ میں پوری طرح شامل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں اس کو واپس ملتا ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں، ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے حق میں کچھ نئے مواقع کھولے تھے۔ یہ مواقع کہ اقتدار کا حریف بنے بغیر توحید اور آخرت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ جو کام پہلے معجزاتی سطح پر انجام دینا پڑتا تھا، اس کو عام طبیعیاتی استدلال کی سطح پر انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے تعصب کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا اس کو مذہبی رواداری کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے "حیوانی رفتار" سے کیا جاتا تھا اس کو "مشینی رفتار" کے ساتھ انجام دیا جائے۔

یہ موجودہ زمانہ میں خدا کا منصوبہ تھا۔ خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دئے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کر کے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں۔ مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے نئے نئے عنوانات کے تحت وہی سیاسی جھگڑے دوبارہ چھیڑ دئے جن کو خدا نے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ختم کیا تھا۔ انھوں نے اسلامی دعوت کو سیاسی اور قومی دعوت بنا کر دوبارہ اسلام کو اقتدار کا حریف بنا دیا اور کہا کہ یہی عین خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو قوموں کے ساتھ ہر جگہ بالکل بے فائدہ قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہو گئی اور سارے نئے امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہ گئے۔

کام کی ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت مسلمانوں نے کھو دی۔ یہاں تک کہ شیطان نے بیدار ہو کر قدیم شرک کی جگہ جدید شرک (کمیونزم) کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ اب کم از کم کمیونزم کے زیر تسلط علاقوں میں دوبارہ کام کرنے کی وہی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے شرک کے زیر تسلط علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ تاہم غیر کمیونسٹ دنیا میں اب بھی کام کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور یہاں پندرھویں صدی ہجری میں اس صالح جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں نہ کیا جا سکا۔

——— نوٹ: یہ مقالہ اسلامی سمینار (بھوپال) میں ۱۸ جنوری ۱۹۸۱ کو پڑھا گیا۔

بربادی بھی ترقی کا زینہ ہے

ایک انگریز عالم مسٹر آئن نیش (Ian Nish) جاپان گئے۔ انھوں نے وہاں گیارہ سال رہ کر جاپانی زبان سیکھی اور گہرائی کے ساتھ جاپانی قوم کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے مطالعہ اور تحقیق کے نتائج ۲۸۴ صفحات کی ایک کتاب میں شائع کیا ہے جس کا نام ہے جاپان کی کہانی (The Story of Japan) مصنف لکھتے ہیں:

جاپانی قوم کی زندگی کو جس چیز نے سب سے زیادہ گہرائی کے ساتھ متاثر کیا وہ سیاست نہیں تھی بلکہ کانٹو کا عظیم زلزلہ تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۲۳ کو زلزلہ کے زبردست جھٹکوں نے مشرقی جاپان کو تہس نہس کر دیا جو کہ جاپان کا سب سے زیادہ آباد علاقہ تھا۔ دوسرا انسانی ساخت کا زلزلہ ۱۹۴۵ میں جاپان کی شکست تھی۔ جب کہ دو ایٹم بموں نے جاپان کے دو انتہائی بڑے شہروں کو ملبہ کا ڈھیر بنا دیا ——— "زلزلہ" سے اگر تعمیر نو کا ذہن پیدا ہو تو زلزلہ ایک نئی ترقی کا زینہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس زلزلہ اگر صرف محرومی اور جھنجھلاہٹ کا احساس پیدا کرے تو اس کے بطن سے سیاسی چیخ پکار وجود میں آتا ہے جو نتیجہ کے اعتبار سے اتنا بے معنی ہے کہ اس سے زیادہ بے معنی کوئی چیز نہیں۔

کسی انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم چیز عمل کا جذبہ ہے۔ آدمی کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہو جائے تو اس کے اندر کی تمام سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ زیادہ بہتر طور پر سوچتا ہے۔ زیادہ کامیاب منصوبہ بناتا ہے اور زیادہ محنت کے ساتھ اپنے کام کی تکمیل میں لگ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جس آدمی کے اندر عمل کا جذبہ نہ ابھرے وہ اس طرح سست پڑا رہتا ہے جیسے کوئی مشین غیر متحرک حالت میں خاموش پڑی ہوئی ہو۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ اطمینان اور آسودگی کے حالات عام طور پر آدمی کی قوتوں کو سلاتے ہیں، وہ اس کے اندر بیداری پیدا نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جب آدمی کی زندگی مشکلوں اور رکاوٹوں سے دوچار ہو تو اس کے اندر چھپی ہوئی قوتوں کو جھٹکا لگتا ہے۔ اس کی صلاحیتیں اس طرح جاگ اٹھتی ہیں جیسے کوئی آدمی بے خبر سو رہا ہو اور اس کے اوپر ایک پتھر گر پڑے۔

تاہم یہ فائدہ کسی کو اپنے آپ نہیں مل جاتا۔ ہر معاملہ میں ایک ابتدائی حصہ آدمی کو خود ادا کرنا پڑتا ہے۔ جب بھی آدمی کی زندگی میں کوئی "بربادی" کا واقعہ پیش آئے تو وہ اس کو دو امکانات کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ یا تو اس سے یہ سبق لے کہ اس کو از سر نو متحرک ہو کر اپنی نئی تعمیر کرنی ہے۔ یا اس سے مایوسی اور شکایت کی غذا لے کر سرد آہیں بھرتا رہے۔ ابتدائی مرحلہ میں آدمی دونوں میں سے جس رجحان کو اپناتا ہے اسی رخ پر اس کی بقیہ زندگی چل پڑتی ہے۔ اسی کے مطابق اس کی اندرونی صلاحیتیں اپنا عمل کرنے لگتی ہیں۔ جب بھی آدمی کی زندگی میں کوئی حادثہ پیش آئے تو اس کو حادثہ کو دیکھنے کے بجائے اپنے آپ کو دیکھنا چاہئے۔ مستقبل کے کسی بھی نتیجہ کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ آدمی حالات کے مقابلہ میں کس قسم کے رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ تعمیر نو کا جذبہ پیدا ہو تو یہ مثبت رد عمل ہے جو لازماً کامیابی تک پہنچاتا ہے اور اگر احتجاج اور شکایت کا ذہن ابھرے تو یہ منفی رد عمل ہے جس کا آخری انجام مزید بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

مادہ کو بدلنا آسان، انسان کو بدلنا مشکل

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں جو تباہی آئی، اس نے مختلف ملکوں کے مدبرین کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ کوئی ایسی عالمی تنظیم ہو جو بین اقوامی امن قائم کرنے کی ضامن ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ میں جمعیت اقوام بنائی گئی جس کا صدر دفتر جنیوا میں تھا۔ مگر ۲۰ سال کے بعد جب وہ دوسری جنگ عظیم کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئی تو اس جنگ کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہو گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد بین اقوامی امن کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک اور وسیع تر تنظیم کا منصوبہ بنایا گیا۔ جون ۱۹۴۵ میں ادھر اتحادی طاقتیں جرمنی اور جاپان کو شکست دے رہی تھیں، ادھر سان فرانسسکو میں ۵۰ قوموں کے نمائندے اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر رہے تھے۔ یہ اقوام متحدہ بالآخر تمام دنیا کی قوموں کی انتہائی نمائندہ عالمی انجمن بن گئی۔

اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق قوموں نے یہ عہد کیا کہ "آنے والی نسلوں کو جنگ کے عذاب سے بچائیں اور بین اقوامی امن و سلامتی کے لئے مسلسل جد و جہد کریں" مگر نیویارک میں اٹھارہ ایکڑ کے رقبہ میں قائم شدہ اقوام متحدہ بھی اپنے اصل مقصد میں اسی طرح ناکام ہے جس طرح اس سے پہلے جمعیۃ اقوام ناکام رہی تھی، وہ نہ دنیا میں امن قائم کر سکی اور نہ اسباب جنگ کو روکنے میں اسے کوئی کامیابی حاصل ہوئی۔

اقوام متحدہ کے زمین دوز گیرج میں بیک وقت تین ہزار موٹر گاڑیاں کھڑی ہو سکتی ہیں مگر وسیع زمین پر تین سو قوموں کو پر امن طور پر رہنے کے لئے اقوام متحدہ آمادہ نہیں کر سکتا۔ اس کے صدر دفتر میں سورج کی چمک اور حرارت کو اعتدال پر رکھنے کے لئے ایسے آلات لگائے گئے ہیں کہ مختلف ملکوں کے لوگ اپنی قوت برداشت کے مطابق اپنے کمرہ کی حرارت بارہ درجہ کے اندر جب چاہیں تبدیل کر لیں۔ مگر زمین پر طاقت ور قوم اور کمزور قوم کے درمیان متوازن تعلقات قائم کرنے میں اس کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے سکریٹریٹ کی عمارت میں بجلی کے ایسے آلات لگے ہوئے ہیں جو ایک مرکزی کمرہ سے کاغذات اور ڈاک کا سامان ۳۸ منزلہ عمارت کے بقیہ حصوں میں آناً فاناً پہنچا دیں۔ مگر اقوام متحدہ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ طاقت اور دولت کی تقسیم اس طرح کرے کہ جس کا جو حق ہے وہ اس کو منصفانہ طور پر پہنچ جائے۔ اس کی جنرل اسمبلی میں تقریروں کے سننے کے لئے ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ ایک ہی تقریر کو مختلف ملکوں کے نمائندے اپنے کانوں پر مطلوبہ آلۂ سماعت لگا کر بیک وقت انگریزی، فرانسیسی، اسپینی روسی، چینی اور عربی زبانوں میں سن سکیں۔ مگر مظلوم کی آواز سننے کے لئے ظالم کے کان بہرے ہیں اور اقوام متحدہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔

مذکورہ انتظامات کرنے کے لئے صرف "مادہ" کو بدلنے کی ضرورت تھی، اور اقوام متحدہ نے اس کا انتظام کرلیا۔ مگر امن و انصاف کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے "انسان" کو بدلنے کی ضرورت ہے، اور اس کا نسخہ کسی اقوام متحدہ کے پاس نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقوام متحدہ اب محض فولاد اور شیشے کی اس سر بفلک عمارت کا نام رہ گیا ہے جو نیویارک میں قائم ہے، جس میں مختلف قسم کی عالمی محفلوں کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ جس کا کام صرف کاغذی کارروائی کرنا اور رپوٹیں چھاپنا ہے۔ اقوام متحدہ کے اس طرح بے جان ہونے کی وجہ وہ قوم پرستانہ نظریہ ہے جو آج ساری دنیا پر سب سے زیادہ چھایا ہوا ہے۔ اقوام متحدہ آج کی دنیا کو کوئی عالمی نظریہ نہیں دیتا۔ وہ قوم پرستی کے محدود نظریہ کی کوئی اصلاح نہیں کرتا۔ وہ اس کو جوں کا توں باقی رکھ کر محض اوپر سے ایک اجتماعی نظم قائم کردینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی اوپری کارروائی سے عالمی انسانی اجتماعیت قائم نہیں ہوسکتی۔

سو سال پہلے ایک ملک کا آدمی کسی بھی دوسرے ملک میں جاکر آباد ہوسکتا تھا مگر آج ایک ملک کا شہری دوسرے ملک کے لئے مجرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ کیا چیز ہے جس نے دو ملکوں کے درمیان اجنبیت کی یہ دیوار کھڑی کردی ہے۔ یہ دراصل قوم پرستی کا جذبہ ہے جس میں آج تمام قومیں مبتلا ہیں۔ ہر قوم دوسری قوم کی دشمن ہورہی ہے اور ہر ملک دوسرے ملک کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر اپنے سیاسی اغراض کے لئے مشرق سے مغرب تک دورے کررہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ آج اس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہے کہ ایک ملک کا باشندہ کسی اجنبی ملک میں پایا جائے یا ایک قوم کا فرد کسی معاملہ میں باہر کی کسی قوم کا طرف دار ہو۔ اقوام متحدہ اس مزاج کی کوئی اصلاح نہیں کرتا۔ وہ قومی چہار دیواریوں کو باقی رکھ کر صرف اتنا انتظام کردینا کافی سمجھتا ہے کہ مختلف قوموں کے کچھ نمائندے ہوائی جہاز سے اڑکر نیویارک میں جمع ہوجائیں اور نشستند و گفتند و برخاستند کا مظاہرہ کرکے اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جائیں۔ مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب تک قوموں کی تشکیل ان نظریات پر ہورہی ہے جو انھیں خود غرضی کی تعلیم دیتے ہیں۔ جو ان کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتے ہیں کہ وہ اقتدار مطلق کی حامل ہیں اور ان کے اوپر کوئی دوسری طاقت ایسی نہیں ہے جو ان سے پوچھ گچھ کرسکتی ہو، اور جب تک ان پر قوم پرستی کا یہ نشہ سوار رہتا ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جو دوسری قوموں سے الگ ہے، اس وقت تک صحیح معنوں میں کوئی بین اقوامی تنظیم کسی طرح وجود میں نہیں آسکتی

افراد کے درمیان امن قائم کرنے کا معاملہ ہو یا قوموں کے درمیان، دونوں ہی کا راز اللہ کے آگے اپنے آپ کو جھکا دینا ہے۔ جو شخص اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کو تسلیم کرکے خدا کے آگے جھک جائے وہی اپنے شر سے دوسروں کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ خواہ وہ ایک فرد ہو یا کوئی قوم۔

گراوٹ کا آخری درجہ

قرآن میں یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے ان کی بدعملی کی سزا میں ان کو مسخ کر دیا —— "کہو کیا میں ان لوگوں کے بارے میں بتاؤں جن کا انجام خدا کے یہاں فاسقوں کے انجام سے بھی زیادہ برا ہے۔ وہ جس پر خدا نے لعنت کی اور جس پر اس کا غضب ہوا۔ اور جن میں سے بندر اور سور بنا دئے گئے (مائدہ ۶۰)

بندر اور سور بنانے سے مراد بندر اور سور کی شکل کا بنانا نہیں ہے بلکہ بندر صفت اور سور صفت بنانا ہے (قال مجاهد: مسخت قلوبهم ولم يمسخوا قردة، تفسیر ابن کثیر، جلد اول صفحہ ۷۳) جب آدمی خدا کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتا اور خدا کی تعلیمات سے نصیحت نہیں پکڑتا تو دھیرے دھیرے وہ انسان کے درجہ سے گر کر حیوان کے درجہ پر آجاتا ہے۔ اب اس کی سوچ حق اور ناحق کے اعتبار سے کام نہیں کرتی بلکہ طبعی تقاضوں اور حیوانی خواہشات پر چلنے لگتی ہے۔ یہی وہ حالت ہے جس کو حیوان بن جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سور کی صفت کیا ہے۔ ستھری چیزوں کو چھوڑ کر گندی چیزوں کو اپنی خوراک بناتا۔ سور صفت انسان وہ ہے جس کو صالح فکر اپیل نہ کرے۔ البتہ فاسد فکر سامنے آئے تو اس کی طرف تیزی سے دوڑ پڑے۔ جائز عمل میں اس کو لذت نہ ملے۔ البتہ ناجائز اعمال میں وہ خوب ذوق شوق کے ساتھ حصہ لیتا ہو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے —— "ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت کی راہ دیکھیں تو اس کو نہ اپنائیں اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اس کو اپنا لیں (اعراف ۱۴۶)

جو لوگ بگاڑ کے اس درجہ کو پہنچ جائیں ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ان کے سامنے قرآن و سنت کا طریقہ پیش کیا جائے تو وہ ان کے ذہن کا جز نہیں بنتا البتہ دنیادار لیڈروں کے طریقے انھیں تیزی سے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دینی سیاست اختیار کرنا ان کو مشکل معلوم ہوتا ہے البتہ لادینی سیاست کے لئے وہ خوب جوش و خروش دکھاتے ہیں۔ خاموش تعمیری پروگرام میں انھیں دلچسپی نہیں ہوتی البتہ اکھیڑ پچھاڑ کے پروگرام میں حصہ لینے کے لئے وہ فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی اصلاح کا پیغام انھیں متاثر نہیں کرتا البتہ دوسروں کے خلاف شور و غل کرنا ہو تو ان کی بھیڑ کی بھیڑ اس کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔ صبر کا طریق کار انھیں بزدلی معلوم ہوتا ہے اور مشتعل ہو کر لڑ جانے کو وہ بہادری سمجھتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا ان کے نزدیک بے عزتی کے ہم معنی ہوتا ہے اور یک طرفہ طور پر دوسرے کو الزام دینا انھیں کمال دکھائی دیتا ہے۔ محبت کا انداز اختیار کرنا ان کو بے فائدہ نظر آتا ہے اور نفرت کے طریقے پر چلنا ہو تو اس کی طرف وہ اتنی تیزی سے لپکتے ہیں گویا اسی میں سارے مسائل کا حل چھپا ہوا ہے۔ اصولی نقطۂ نظر ان کے سامنے لایا جائے تو وہ ان کو بے کار دکھائی دے گا البتہ قومی طرز کی باتیں کی جائیں تو وہ ان کو اس طرح لیں گے جیسے ان کو لذیذ ذہنی غذا ہاتھ آگئی ہے۔ ان کو ایسے واقعات سے دل چسپی نہیں ہوتی جس میں تعمیری سبق ہو۔ البتہ ایسی کہانیوں کو سننے کے وہ بہت مشتاق رہتے ہیں جو ان کی تخریب پسندی کی غذا بن سکتی ہو۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

از مولانا وحید الدین خاں

۱۔	الاسلام				۰ــــ ۱۵
۲۔	مذہب اور جدید چیلنج	..	"	..	۰ــــ ۱۵
۳۔	ظہور اسلام	..	"	..	۰ــــ ۱۵
۴۔	دین کیا ہے	..	"	..	۰ــــ ۲
۵۔	قرآن کا مطلوب انسان	..	"	..	۰ــــ ۵
۶۔	تجدید دین	..	"	..	۰ــــ ۳
۷۔	اسلام دین فطرت	..	"	..	۰ــــ ۳
۸۔	تعمیر ملت	..	"	..	۰ــــ ۲
۹۔	تاریخ کا سبق	..	"	..	۰ــــ ۳
۱۰۔	مذہب اور سائنس	..	"	..	۰ــــ ۵
۱۱۔	عقلیات اسلام	..	"	..	۰ــــ ۳
۱۲۔	فسادات کا مسئلہ	..	"	..	ــــ ۲
۱۳۔	انسان اپنے کو پہچان	..	"	..	۰ــــ ۱
۱۴۔	تعارف اسلام	..	"	..	۰ــــ ۲
۱۵۔	اسلام پندرھویں صدی میں	..	"	..	۰ــــ ۲
۱۶۔	راہیں بند نہیں	..	"	..	۰ــــ ۳
۱۷۔	دینی تعلیم	..	"	..	۰ــــ ۳
۱۸۔	ایمانی طاقت	..	"	..	(زیر طبع)
۱۹۔	اتحاد ملت	..	"	..	
۲۰۔	سبق آموز واقعات	..	"	..	
۲۱۔	اسلامی تاریخ سے	..	"	..	
۲۲۔	قال اللہ	..	"	..	
۲۳۔	قال الرسول	..	"	..	
۲۴۔	اسلامی زندگی	..	"	..	
۲۵۔	قرآنیات	..	"	..	

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں :

۱- الاسلام یتحدی	۲۶۳	صفحات	قیمت ۲۰	روپے
۲- الدین فی مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	" ۱۰	روپے
۳- حکمة الدین	۸۷	صفحات	" ۸	روپے
۴- الاسلام والعصر الحدیث	۷۷	صفحات	" ۸	روپے
۵- مسئولیات الدعوة	۳۹	صفحات	" ۲	روپے
۶- نحو تدوین جدید للعلوم الاسلامیة	۲۶	صفحات	" ۲	روپے
۷- امکانات جدیدة للدعوة	۳۴	صفحات	" ۲	روپے
۸- الشریعة الاسلامیة وتحدیات العصر	۳۲	صفحات	" ۲	روپے
۹- المسلمون بین الماضی والحال والمستقبل	۷۲	صفحات	" ۵	روپے
۱۰- نحو بعث اسلامی	۳۲	صفحات	" ۵۰	پیسے

تعارفِ اسلام

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۴۸ قیمت -/۳ روپے

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟

اپنی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزاء کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ (۱۴) جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اس مرکب سے آپ کے نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔



سنکارا

ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک

ہمدرد

HD-5849 RU

REGD. R. N. NO. 28822/76 Issue No. 51

AL-RISALA MONTHLY

AMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

کوئی بھی چیز سورج کو جلد طلوع نہیں کرسکتی
مگر ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ ——————
وہ اپنی زندگی کی صبح کو جلد پیدا کرلے

شمارہ ۵۲ زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے قیمت فی پرچہ
مارچ ۱۹۸۱ خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے دو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

الرسالہ

مارچ ۱۹۸۱
شمارہ ۵۲

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجتماع

الرسالہ کا مشن آخرت کا مشن ہے۔ پچھلے پانچ سال سے یہ کام خاموشی کے ساتھ انجام دیا جارہا ہے۔ اب اس سلسلے میں ایک سہ روزہ اجتماع منعقد کرنا طے کیا گیا ہے۔ یہ کوئی عام اجتماع نہیں ہوگا بلکہ محدود اجتماع ہوگا اور خالص دینی اور تربیتی مقصد سے کیا جائے گا۔
امید ہے کہ یہ اجتماع بھوپال میں تخمیناً مئی ۱۹۸۱ کے تیسرے ہفتہ میں ہوگا۔
تفصیلات انشاء اللہ اگلے ماہ الرسالہ میں شائع کردی جائیں گی

ادارہ الرسالہ

رات کے بعد دن

كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۝ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۝ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ۝ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝

مدثر ۳۸-۳۲

قسم ہے چاند کی اور رات کی جب وہ جانے لگے اور صبح کی قسم جب وہ روشن ہو جائے۔ وہ دوزخ بڑی بھاری چیز ہے جو انسان کے لئے بڑا ڈراوا ہے، تم میں سے ہر اس آدمی کے لئے جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔ ہر آدمی اپنے کئے میں پھنسا ہوا ہے

زمین پر ہر روز ایسا ہوتا ہے کہ یہاں رات آتی ہے اور زمین گہری تاریکی میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کے بعد دن نکلتا ہے اور ہر چیز دوبارہ سورج کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ واقعہ آخرت کے معاملہ کی تمثیل ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی کی اصل حقیقت چھپی ہوئی ہے، آخرت میں ہر آدمی کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ آج ہماری زندگی "رات" کے دور سے گزر رہی ہے، موت کے بعد ہم "دن" کے دور میں پہنچ جائیں گے۔

آج آدمی ایک قسم کے پردہ میں ہے۔ وہ دلیل پر قائم نہ ہونے کے باوجود خوش نما الفاظ بول کر لوگوں کو اپنے بارے میں غلط فہمی میں ڈالے ہوئے ہے۔ کسی کی دنیوی شہرت و مقبولیت اس کی مجرمانہ حیثیت کے لئے پردہ بن گئی ہے۔ کسی کے دولت و اقتدار نے اس کو موقع دیا ہے کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے مفلس ہونے کے باوجود مادی رونقوں میں اپنے معنوی افلاس کو ڈھانک سکے۔ کوئی اندر سے بے دین ہے مگر کچھ رسمی اعمال کا اہتمام کرکے ظاہر کر رہا ہے کہ وہ خدا پرست اور دیندار ہے۔ لوگ ظلم اور بے انصافی میں جی رہے ہیں مگر اپنی نمائشی تدبیروں سے وہ عوام کو اس دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں کہ وہ عین حق و انصاف پر قائم ہیں۔

مگر جب آخرت کا سورج طلوع ہوگا تو وہ تاریکی کے ان تمام پردوں کو پھاڑ دے گا۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں دکھائی دینے لگے گا۔ اس وقت صاف نظر آئے گا کہ کون شخص اندر سے جانور تھا اور بظاہر انسانی صورت میں چل رہا تھا۔ کون شخص ناحق پر تھا اگرچہ وہ خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو حق پرست ثابت کئے ہوئے تھا۔ کون شخص اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش میں مبتلا تھا اگرچہ زبان سے وہ اللہ کا نام لیتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔

اس کے مقابلہ میں کچھ اور لوگ ہوں گے جن کی حقیقت آخرت کے دن لوگوں کے سامنے آئے گی۔ وہ دیکھیں گے کہ ایک شخص جس کو انھوں نے اس کے معمولی حالات کی بنا پر غیر اہم سمجھ لیا تھا وہ اپنے اندر اہمیت کا پہاڑ لئے ہوئے تھا۔ ایک شخص جس کو دنیا کی پررونق محلسوں میں کہیں عزت کی جگہ نہیں ملتی تھی وہ فرشتوں کی زیادہ باعزت مجالس میں اپنے صبح و شام کے اوقات گزار رہا تھا۔ ایک شخص جس کو وقت کے بڑوں نے اپنے نزدیک رد کر دیا تھا وہی وہ شخص تھا جس کو خدا کی طرف سے مقبولیت کی سند ملی ہوئی تھی۔ ایک شخص جس کو دنیا کے لوگ بے دین قرار دے کر حقارت کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے اس کا نام خدا کے یہاں دین داروں کی فہرست میں سب سے اوپر لکھا ہوا تھا۔

دوسرے درجہ پر

آئن سرویوچ تورجنیف (۸۳ — ۱۸۱۸) روس کا مشہور ناول نگار ہے۔ اس کے ایک دوست نے ایک بار اس کو لکھا: "میرے نزدیک اپنے آپ کو ہمیشہ دوم درجہ میں رکھنے پر رضامند کر لینے ہی میں زندگی کی ساری اہمیت پوشیدہ ہے" یہ بات صد فی صد درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام اجتماعی اور قومی برائیاں اسی لئے پیدا ہوتی ہیں لوگ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ دوم درجہ پر رکھنے کے لئے راضی نہیں ہوتے۔ ہر ایک اپنے آپ کو اول درجہ پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جہاں ہر شخص اور ہر قوم اپنے کو اول درجہ پر رکھنا چاہے وہاں لازماً یہی ہوگا کہ باہمی ٹکراؤ ہو، کوئی دوسرے کا خیر خواہ نہ رہے۔

انسانیت کے اکثر فلسفے اسی بنیادی فکر کے گرد گھومتے ہیں۔ سماجی مفکرین کی کوششوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کے سامنے کچھ ایسے اعلیٰ معیار رکھ دئے جائیں جن کو آدمی ہر حال میں اپنے سے بالاتر سمجھے، وہ اپنی ذات کو مرکز بنانے کے بجائے ان معیاری قدروں کو اپنے فکر و توجہ کا مرکز بنائے۔ مگر عملاً کوئی فلسفی اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کو بھی انھوں نے اس حیثیت سے دریافت کیا کہ وہ انسان کی توجہات کا مرکز اول بنے (مثلاً محبت، خیر) وہ خود انسان کی اپنی تخلیق تھی۔ انسانی ذہن کے باہر ان کا کوئی ذاتی وجود نہ تھا۔ پھر اپنے تخلیق کئے معبود کے بارے میں کوئی شخص سنجیدہ ہوتا تو کیوں ہوتا۔

اس مسئلہ کا واحد حل خدا کا عقیدہ ہے۔ خدا ایک حقیقی وجود ہے۔ وہ ہمارا خالق اور مالک ہے — وہ بھی ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے سارے عالم کو اپنے قبضہ میں لئے ہوئے ہے۔ تمام چیزیں مکمل طور پر اس کی محتاج وہ کسی کا محتاج نہیں۔ ایسے خدا کو ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کائنات میں آدمی اپنے آپ کو "دوسرے درجہ" پر رکھ رہا ہے۔ وہ خدا کو ہر اعتبار سے اول حیثیت دے کر خود ہر اعتبار سے دوسری حیثیت پر راضی ہوگیا ہے۔ جس کے اندر یہ خیال پوری طرح بیٹھ جائے، جو اپنے سارے دل و دماغ کے ساتھ خدا کے مقابلہ میں اپنے کو دوسرے کی حیثیت دینے پر راضی ہو جائے۔ وہ عین وہی انسان بن جاتا ہے جس کو تمام دنیا کے مفکرین تلاش کر رہے ہیں وہ اس کو کہیں نہیں پاتے۔

انسان کی نفسیات ایک بسیط شے ہے۔ نفسیات میں تقسیم ممکن نہیں۔ اگر کسی کی نفسیات حقیقی معنوں میں یہ کہ اس کائنات میں وہ خدا کے مقابلہ میں "دوسرے درجہ" پر ہے تو انسانوں کے مقابلہ میں بھی اس کے اندر یہی مزاج اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کہ اس کائنات میں وہ دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے "اول درجہ" کا احساس چھین لے گا۔ اس کی انانیت بے نفسی میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس کی سرکشی تواضع کی صورت اختیار کرے گی ڈھٹائی اعتراف کے روپ میں ڈھل جائے گی۔ اور یہی وہ اوصاف ہیں جو بہتر سماج بناتے ہیں۔ جہاں لوگوں میں یہ مزاج آجائے وہاں نہ انفرادی جھگڑوں کا کوئی وجود ہوگا اور نہ قومی جھگڑوں کا۔

ٹوٹا ہوا پتھر

لال قلعہ کی سیر کرنے والا جب اس کی بلند و بالا عمارتوں سے گزر کر اس کے "میوزیم" میں پہنچتا ہے تو وہاں جو چیزیں اسے دیکھنے کو ملتی ہیں ان میں سے ایک وہ ٹوٹا ہوا پتھر ہے جو وسیع ہال کے ایک کونے میں رکھا ہوا ہے۔

اس پتھر پر قدیم زمانہ کے کسی "خاص محل" کا قطعہ تاریخ کندہ ہے جو مغل بادشاہ نے ۱۶۴۲ء میں بنوایا تھا۔ مگر یہ خاص محل آج کہیں موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ پتھر دہلی کے پرانے قلعہ میں پڑا ہوا پایا گیا تھا۔ وہاں سے اٹھا کر اس کو لال قلعہ کے میوزیم میں دوسری تاریخی چیزوں کے ساتھ رکھ دیا گیا۔

اس ٹوٹے ہوئے پتھر پر جو فارسی قطعہ عمدہ کتابت کے ساتھ درج ہے اس کا ایک مصرعہ یہ ہے:

ہمیشہ باد بزیر سپہر بوقلموں

یعنی "خاص محل" تعمیر کرانے والے بادشاہ کی سلطنت آسمان کے نیچے ہمیشہ قائم رہے۔ مگر آج نہ خاص محل ہے اور نہ اس کا بنانے والا بادشاہ۔ اور نہ اس شاعر کا کہیں وجود ہے جس نے بادشاہ اور اس کے محل میں دائمی عظمت کا نشان دیکھا تھا۔ صرف ایک ٹوٹا ہوا پتھر اس بات کی یادگار کے طور پر باقی ہے کہ تین سو برس پہلے اس ملک میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تھا کہ بادشاہ نے اپنی عظمت و اقتدار کے نشان کے طور پر ایک محل بنایا اور وقت کے فن کار نے منظوم الفاظ میں اس کی تصدیق کی۔ اور پھر اس لفظی تصدیق کو پتھر کی تختی پر کندہ کر دیا گیا۔

جب بھی کسی کو زمین پر اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کا اقتدار ہمیشہ باقی رہے گا۔ وہ وقتی واقعہ کو مستقل واقعہ سمجھ لیتا ہے۔ مگر زمانہ نے کبھی کسی حکمراں کے اس خیال کی تائید نہیں کی۔ مگر عجیب بات ہے کہ اگلا حکمراں جو پچھلے حکمراں کے محل کے "ٹوٹے ہوئے پتھر" کو میوزیم میں رکھتا ہے وہ دوبارہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کا اقتدار ہمیشہ زمین پر باقی رہے گا۔

دنیا کا سب سے زیادہ عام واقعہ یہ ہے کہ آدمی پر موت آتی ہے۔ وہ عروج و زوال کے قانون کا شکار ہوتا ہے۔ مگر آدمی اس سب سے زیادہ عام بات سے سب سے کم نصیحت لیتا ہے۔ شاید اس سے زیادہ انوکھی بات اس زمین پر اور کوئی نہیں۔

ہر زندگی جو آج شاندار اور کامیاب دکھائی دیتی ہے وہ کل ایک "ٹوٹا ہوا پتھر" بن جاتی ہے۔ ہر پھول مرجھاتا ہے اور ہر مکان کھنڈر بن جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی اس سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ ٹوٹے ہوئے پتھروں کے ہجوم میں وہ اپنے بارے میں یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس کا پتھر کبھی نہیں ٹوٹے گا۔

بے فائدہ باتیں

مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳ - ۱۸۶۳) کو ایک شخص نے خط لکھا اور یہ دریافت کیا کہ فلاں شرعی مسئلہ کی حکمت کیا ہے۔ مولانا تھانوی نے جواب میں لکھا: حکمت کا سوال کرنے میں کیا حکمت ہے۔ تم خدا کے فعل کی حکمت ہم سے پوچھتے ہو، ہم خود تمہارے فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا یہ عجیب مزاج ہوتا ہے کہ وہ غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں۔ انھیں اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنا احتساب کریں، اپنی ذمہ داریوں پر دھیان دیں۔ البتہ خارجی مسائل میں موشگافیاں نکالنے اور ان کی حکمتیں معلوم کرنے کا انھیں بہت شوق ہوتا ہے۔ یہ ذہن قطعاً غیر اسلامی ہے۔ جن لوگوں کا ذہنی ڈھانچہ اس قسم کا بن جائے وہ کبھی حق کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کمانے اور گھر بنانے کا معاملہ ہو تو ہر آدمی اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ ہر آدمی کو سب سے زیادہ فکر یہ ہوتی ہے کہ اس کی کمائی اچھی ہو جائے اور اس کا مکان اچھا بن جائے۔ مگر دین اور آخرت کا معاملہ ہو تو ہر آدمی ایسے مسائل پر بحث کرنا پسند کرتا ہے جس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہ ہو۔

ایک بزرگ جنھوں نے ایک بڑے ادارہ میں ۳۰ سال فتویٰ نویسی میں گزارے تھے، انھوں نے کہا کہ اس پوری مدت میں ہمارے پاس جو استفتار آتے رہے وہ زیادہ تر دوسروں کے بارے میں تھے۔ اپنے بارے میں بہت کم ہم سے کسی نے سوال کیا۔ فلاں کی جائداد میں میرا کتنا حصہ بنتا ہے۔ فلاں شخص جو ایسا اور ایسا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز، وغیرہ۔ اس قسم کے سوالات تو بہت آتے رہے مگر کسی نے ہم سے یہ نہ پوچھا کہ اس کی اپنی شرعی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ وہ اپنے صاحب معاملہ کے حقوق کس طرح ادا کرے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کے درمیان کس طرح رہے۔ وہ اختلاف اور شکایت کے موقع پر لوگوں سے کس قسم کا سلوک کرے۔ فلاں شخص جس کو وہ ستا رہا ہے اس کو ستانا اس کے لئے جائز ہے یا ناجائز۔ فلاں آدمی جس کا اس نے پیسہ دبا رکھا ہے وہ اس کو دبانا چاہئے یا نہیں دبانا چاہئے۔ فلاں شخص جس کو وہ بے عزت کر رہا ہے وہ اس کے لئے درست ہے یا نہیں۔

آدمی دوسروں میں گم رہتا ہے حالاں کہ اس کو اپنے آپ میں گم ہونا چاہئے۔ وہ خارجی مسائل میں جیتا ہے حالاں کہ اس کو اپنے اندرونی مسائل میں جینا چاہئے۔ وہ دوسروں کے دین وایمان کو ناپتا ہے حالاں کہ اس کو وہ پیمانہ حاصل کرنا چاہئے جس میں وہ اپنے دین وایمان کو ناپ سکے ——— باہر دوڑتے والے بدجانور کی خبر ہر ایک کو ہے مگر اپنے دماغ میں بغض اور انتقام کے جو بدجانور بسیرا لئے ہوئے ہیں اس کی خبر کسی کو نہیں۔ عبادت گاہ کے باہر کا تماشا ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے مگر عبادت گاہ کے اندر ہونے والا تماشا کسی کو نظر نہیں آتا۔

برداشت کا اصول

ایک ہندوستانی کہاوت ہے ــــــــ "اگر کوئی کتا تمھیں کاٹے تو کیا تم بھی کتے کو کاٹو گے" اس چھوٹے سے جملہ میں زندگی کی بڑی گہری حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں انسان کے ساتھ "کتے" بھی ہیں۔ اس لئے یہاں یہ واقعہ بھی ضرور پیش آئے گا کہ کبھی کوئی کتا انسان کو کاٹ لے۔ مگر اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ آدمی خود بھی کتے کو کاٹنے لگے۔ کیونکہ یہ نہ صرف مسئلہ کو بڑھانا ہے بلکہ اپنے آپ کو کتے کی سطح پر لے جانا ہے۔ اس لئے بہترین بات یہ ہے کہ جب کسی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آئے کہ اس کو ایک کتا کاٹ کھائے تو وہ اس کو نظرانداز کر کے آگے بڑھ جائے۔ اپنے زخم کا علاج کر کے اپنی زندگی کے سفر کو جاری رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام دانش مند لوگوں نے غصہ، دشمنی اور انتقام جیسی چیزوں کو برا کہا ہے اور اس کے بجائے معاف کرنے اور بھلا دینے کو زندگی کی ترقی کا راز بتایا ہے۔ یہاں چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔

بدلہ لینے سے انسان اپنے دشمن جیسا ہو جاتا ہے اور بدلہ نہ لینے سے اس سے بہت زیادہ بہتر	بیکن
اپنے دشمن کے لئے اپنی بھٹی کو اتنا گرم نہ کر کہ وہ تجھ کو ہی جلا ڈالے	شیکسپیئر
دشمن کو معاف کر دینا دشمن سے انتقام لینے کا سب سے بہتر طریقہ ہے	مانس ہنس
ہم خود اپنا برا کئے بغیر دوسروں کا برا نہیں کر سکتے	ولیس جہس
برداشت کرنا زندگی کا ایک اصول ہے نہ کہ کمزوری	مہاتما گاندھی
جب دو آدمی آپس میں جھگڑیں تو سمجھو کہ دونوں غلطی پر ہیں	ڈچ کہاوت
کسی سے دشمنی کرنا اپنے ارتقا میں روک لگانا ہے	ونوبا بھاوے
دشمن کا لوہا بھلے ہی گرم ہو جائے مگر ہتھوڑا تو ٹھنڈا رہ کر ہی کام دے سکتا ہے	سردار پٹیل
نفسانی خواہشات کا جنون تھوڑی دیر رہتا ہے مگر اس کا پچھتاوا بہت دیر تک	شیلر
جس نے کسی دشمن کو معاف نہیں کیا وہ زندگی کی ایک عظیم خوشی سے محروم رہا	لیومیٹر
جہاں غصہ ہے سمجھو کہ وہاں تباہی بھی ضرور ہوگی	گوسوامی تلسی داس
اچھے مزاج کی بہترین علامت ہے برے مزاج کو برداشت کر لینا	ایمرسن

ان اقوال میں سے ایک ایک قول زندگی کی گہری حقیقت کو بیان کر رہا ہے۔ پہلی بات یہ کہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی باتوں پر دشمن کو معاف کرنا کمزوری نہیں بلکہ بہادری ہے۔ یہ ایک مثبت عمل ہے۔ جو شخص ہیجانی واقعات پیش آنے کے باوجود لوگوں کو معاف کر دے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا آدمی ہے۔ اور اپنے آپ پر قابو رکھنے سے بڑی کوئی بہادری نہیں۔

پھر یہ کہ انتقام نہ لینا خود بہت بڑا انتقام ہے، جب کسی کی طرف سے برائی پیش آنے کے باوجود آدمی اس کے

خلاف کوئی بری کارروائی نہیں کرتا تو اس کا یہ عمل بے شمار پہلوؤں سے اس کے لئے مفید بنتا ہے۔ اس کو برتر کردار پیش کرنے کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مسئلہ کو لمبا کرنے کے بجائے وہ وہیں کا وہیں اسے ختم کر دیتا ہے۔ وہ اپنے وقت اور قوت کو منفی کارروائیوں سے بچا کر اپنی ترقی اور استحکام میں لگاتا ہے، دوسری طرف ایسا کر کے وہ اپنے مخالف کو اس کے اپنے ضمیر کے سامنے رسوا کر دیتا ہے۔ وہ اس کی دشمنانہ نفسیات کو دباتا ہے اور اس کے اندر چھپی ہوئی انسانیت کو ابھرنے کا موقع دیتا ہے۔ آپ کے ہر "دشمن" انسان کے اندر آپ کا ایک "دوست" انسان بھی چھپا ہوا ہے۔ اور دشمن کو معاف کرنا دراصل اس بات کی کوشش کرنا ہے کہ اس کے اندر چھپا ہوا آپ کا دوست انسان برآمد ہو جائے۔

ایک آدمی آپ کے ساتھ برائی کرے اور آپ بھی اس کے ساتھ برائی کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اور وہ دونوں برابر ہو گئے۔ آپ اس سے اچھے جب ہوتے جب کہ آپ برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے۔ جب آپ نے بھی وہی کیا جو دوسرے نے آپ کے ساتھ کیا تھا تو آپ میں اور دوسرے میں فرق کیا رہا۔

زبان پر قابو

ٹامس فلر (۱۶۶۱—۱۶۰۸) ایک انگریز مصنف گزرا ہے۔ اس کا قول ہے "پرندے اپنے پاؤں کے باعث جال میں پھنستے ہیں اور انسان اپنی زبان کے باعث"۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سماجی زندگی میں اکثر مصیبتوں کی وجہ آدمی کی زبان ہوتی ہے۔ زبان کی بے احتیاطی گھر کے اندر اور گھر کے باہر آدمی کے لئے بے شمار مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ آدمی اگر زبان کو قابو میں رکھے یا کم از کم ایسا کرے کہ نازک مواقع پر چپ رہے تو یقینی طور پر وہ بہت سی ناخوش گوار چیزوں سے بچ سکتا ہے۔ تمام مصلحین اور مفکرین نے زبان کے محتاط استعمال پر زور دیا ہے۔ یہاں اس سلسلے میں چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

بری بات پر تم بھلی بات کے ذریعہ زیادہ آسانی کے ساتھ فتح پا سکتے ہو	گوتم بدھ
تلوار کے وار کی نسبت زبان کا وار زیادہ گہرا ہوتا ہے	ہندی کہاوت
خدا سے ڈرنے والے کی زبان گونگی ہو جاتی ہے	فضیل بن عیاض
زبان ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے خوش گوار باتیں کریں نہ کہ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچائیں	گوتم بدھ
بیوقوف آدمی کا دل منھ میں ہوتا ہے اور عقل مند آدمی کی زبان دل میں	شیکسپیئر
خالی دماغ اور قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان ایک دوسرے کے قریبی دوست ہیں	اوڈن
پیروں کی لغزش کے بعد سنبھلا جا سکتا ہے مگر زبان کی لغزش کے بعد سنبھلنا ممکن نہیں	فرینکلن
جاہل کی زبان اس کی مالک ہوتی ہے اور عقل مند کی زبان اس کی خادم	عربی کہاوت
دشمن بھی اچھی بات کہے تو اس کو قبول کرنے میں تامل نہ کرو	سوامی شبدانند
جو شخص ناپسندیدہ بات کہے گا وہ ناپسندیدہ بات سنے گا	عربی کہاوت

بات کو دیر تک سوچو پھر اس کو منھ سے نکالو، تم کبھی شرمندہ نہ ہوگے — افلاطون

اگر آدمی کے پاس اچھے بول ہوں تو وہ اچھی صورت نہ ہونے کے باوجود لوگوں کو اچھا معلوم ہوگا — سویٹ نارڈین

بولنے کی طاقت جو انسان کو حاصل ہے وہ بڑی انوکھی طاقت ہے۔ ساری معلوم کائنات میں کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں۔ دو گونگے آدمی اگر باہم ملیں تو ان کا ملنا کس قدر بے معنی ہوتا ہے اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہے جس نے کبھی دو گونگوں کو ملتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر جب دو بولنے والے آدمی ملتے ہیں تو ان کا ملنا صد درجہ بامعنی بن جاتا ہے۔ اس وقت زبان ہی وہ چیز ہوتی ہے جس سے دونوں اپنے آپ کو ایک دوسرے سے قریب کرتے ہیں۔ دو ملنے والے جب سنجیدگی اور مٹھاس کے ساتھ باتیں کریں تو اس سے زیادہ حسین منظر اس زمین پر کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جب دو آدمی تلخ کلامی پر اتر آئیں تو وہ اتنا زیادہ برا منظر ہوتا ہے کہ خود بولنے والے اگر اپنی اس وقت کی تصویر دیکھ لیں تو اپنی اس حرکت پر نفرت کرنے لگیں۔

نادان آدمی خیال کرتا ہے کہ بھلی بات بولنے پر لوگ اس کو کمزور سمجھیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی بری بات سن کر اپنے کو تھامتا ہے اور اس کے جواب میں اپنی زبان سے بھلی بات نکالتا ہے تو وہ اپنی غیر معمولی طاقت کا ثبوت دیتا ہے، وہ اپنے اس پُر اعتماد مظاہرہ سے اپنے دشمن کو مرعوب کر لیتا ہے۔ ایسے ہر واقعہ کے بعد دشمن کا دل مجبور ہوتا ہے کہ اپنے کو چھوٹا اور اپنے حریف کو بڑا سمجھے۔ بھلی بات دشمن کے مقابلہ میں ایک قیمتی ہتھیار ہے، ایسا ہتھیار جو آدمی کے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اگر چہ بہت کم لوگ ہیں جو اس ہتھیار کو جانیں اور اس کو استعمال کریں۔

جو شخص مخالف کی بری بات سے برا اثر نہیں لیتا وہ اپنے اس مزاج سے ایک بہت بڑا اثاثہ اپنے لئے حاصل کرتا ہے، یہ کہ وہ مخالف کی بات کو بھی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سن سکے اور اگر اس کے اندر کوئی صداقت ہے تو اس کو پالے — تاریخ کی اکثر نادانیاں صرف اس بات کا نتیجہ تھیں کہ آدمی نے اپنے مخالف کی بات کو کھلے ذہن سے نہیں سنا۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو بری بات سے اثر نہ لینا بجائے خود حکمت کا ایک خزانہ ہے۔ اور آدمی کی بہترین عقلمندی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مفت کے خزانے سے محروم نہ کرے۔

وقت کی اہمیت

نپولین (۱۸۲۱ - ۱۷۶۹) دنیا کا ایک مشہور ترین فاتح ہے۔ اس نے بے شمار جنگی کامیابیاں حاصل کیں۔ قدرتی آفت کے سوا کوئی اس کو زیر نہ کر سکا۔ نپولین نے اپنی کامیابیوں کا راز ان الفاظ میں بیان کیا۔ "میں اپنے حریفوں کے اوپر اس لئے غالب آتا ہوں کہ وہ لمحات جن کو لوگ کچھ نہیں سمجھتے، میں ان کی اہمیت کو پالیتا ہوں اور ان کو فوراً استعمال کرتا ہوں" یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے بڑے مواقع اکثر چھوٹے لمحات میں آتے ہیں۔ ان لمحات کو جاننا اور ان کے مطابق فوری اقدام کرنا ہی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ ان نازک لمحات میں معمولی کوشش سے وہ کام ہو جاتا ہے جو بعد کو بڑی کوششوں سے بھی نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں یہاں چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں

میں نے وقت کو برباد کیا تھا، اب وقت مجھے برباد کر رہا ہے — شیکسپیئر

ایک موقع تمہارا دروازہ صرف ایک بار کھٹکھٹاتا ہے — کہاوت

انسان کے لئے زندگی میں کامیابی کا راز ہر آنے والے موقع کے لئے تیار رہنا ہے — ڈزرائیلی

وقت کی ٹرین اس کے لئے تیزی سے بھاگ رہی ہے جو کنارے کھڑا ہوا اس کا تماشا دیکھ رہا ہو مگر وقت کی ٹرین اس کے لئے ٹھہر جاتی ہے جو برابر کی پٹری پر خود بھی اسی کی رفتار سے دوڑنا شروع کر دے — آئن سٹائن

وقت ایسی نعمت ہے جس کا دوسرا کوئی بدل نہیں — بابا فرید

جس کام کو تم آج کر سکتے ہو اسے کبھی کل پر نہ ٹالو کیونکہ کل کبھی نہیں آتا۔ — چیسٹر فیلڈ

تم ہر چیز کو قیمت دے کر خرید سکتے ہو مگر وقت ہی ایک ایسا سودا ہے جس کی کوئی قیمت نہیں — خان خاناں

اگر تم کو زندگی عزیز ہے تو وقت کو ضائع نہ کرو۔ کیونکہ زندگی وقت ہی کے لمحات کا دوسرا نام ہے۔ — فرینکلن

کسی کام کو شروع کرنے کا ابھی اسی وقت سے بہتر کوئی وقت نہیں — انگریزی کہاوت

چھوٹے موقع کا صحیح استعمال اس کو بڑا بنا دیتا ہے اور بڑے موقع کا غلط استعمال اس کو چھوٹا کر دیتا ہے — سویٹ مارڈین

نہ ہر لغزش واپس لی جا سکتی ہے اور نہ ہر موقع دوبارہ ہاتھ آتا ہے — عربی کہاوت

دمی کے پاس سب سے بڑی دولت وقت اور موقع ہے، وہ وقت نہیں جو کل ملنے والا ہے بلکہ وہ وقت جو ابھی ملا ہوا ہے۔ جو شخص وقت کے انتظار میں ہے وہ تیز بھاگتی ہوئی گاڑی کے پیچھے سست رفتاری سے دوڑ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ س کو کبھی نہیں پکڑ سکے گا۔ جس چیز کو کامیابی کہا جاتا ہے وہ حقیقۃً اس کا نام ہے کہ آپ وقت کو استعمال کر لیں اور ناکامی ہے کہ آپ وقت کو صحیح طور پر استعمال نہ کر سکیں۔ وقت ہر ایک کے لئے یکساں طور پر آتا ہے مگر وقت کو پانے والا صرف رہ ہے جس نے وقت سے فائدہ اٹھایا ہو۔

وقت کی مثال برف کی مانند ہے۔ دو آدمی برف کی ایک ایک سل اپنے گھر میں لاتے ہیں۔ بظاہر دونوں کا معاملہ یکساں ہے۔ مگر برف کا مالک صرف وہ ہے جو برف کو فوراً کام میں لائے۔ جو برف کو کام میں نہ لا سکے وہ برف کو پانے کے باوجود برف کا مالک نہیں۔ کیونکہ بہت جلد وہ دیکھے گا کہ برف پگھل کر ختم ہو چکا ہے اور اب اس کے پاس برف کے نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔

وقت کبھی ہمارے پیچھے نہیں دوڑے گا۔ بلکہ خود ہمیں وقت کے پیچھے دوڑنا ہو گا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے وقت ہی کے درمیان کرنا ہے۔ وقت کو کھو کر ہم کوئی اور موقع نہیں پا سکتے جہاں ہم وہ کر سکیں جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے مقصد کے لئے بھرپور حرکت میں آنے کا وقت وہی ہے جو ابھی فوری طور پر آپ کو حاصل ہے۔ اگر آپ نے ابھی وقت کو نہیں پکڑا تو وہ آپ سے اتنی دور جا چکا ہو گا کہ آپ کبھی اس کو پکڑ نہ سکیں گے۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۔ ۴ دسمبر ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

فرشتہ کا ٹیلیفون

وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ زندگی بہت مصروف تھی۔ دولت کی بارش اور پیشہ کی سرگرمیوں میں دین کا کوئی خانہ نہ تھا۔ اس کو یہ موقع ہی نہ تھا کہ وہ دینی کتابیں پڑھے یا دینی موضوعات پر کچھ سوچ سکے۔ اس کے پاس آنے والے سب وہی ہوتے تھے جو اس کے پیشہ کے تقاضوں کے اعتبار سے اس سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ البتہ ایک شخص کبھی کبھی اس کے یہاں آتا تھا اور دین کے بارے میں اس سے بات کرتا تھا۔ مگر یہ گفتگو ہمیشہ ناتمام ختم ہو جاتی تھی۔ آنے والے آدمی کو تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوتا کہ ڈاکٹر اس قسم کی گفتگو کو غیر اہم سمجھ کر اس سے بے توجہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ آدمی خود ہی اپنی گفتگو کو ختم کر کے تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا اور اس کے بعد چلا جاتا۔

ایک روز ڈاکٹر اپنے گھر کے کمرہ میں اکیلا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ "ہلو" کے تبادلہ کے بعد دوسری طرف سے آواز سنائی دی "میں جبریل بول رہا ہوں۔ خدا تم کو بلانا چاہتا ہے ۔ ۔ ۔" آواز عجیب بھیانک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی غیر انسانی مخلوق انسانی زبان میں بول رہی ہے۔ ڈاکٹر پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ اور رسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیسی آواز تھی جو ٹیلیفون پر سنائی دی کہ "میں جبریل بول رہا ہوں۔ خدا تم کو بلانا چاہتا ہے" سنی ہوئی آواز اس کو لفظ لفظ یاد تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور اس کے جواب میں اس کو کیا کرنا چاہئے۔ اس نے اپنے تمام دوستوں کو ٹیلی فون کر ڈالا اور ہر ایک سے پوچھتا رہا۔ مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس نے ڈاکٹر کو اس قسم کا ٹیلی فون کیا ہے۔

ڈاکٹر کئی روز تک اسی سوچ میں پڑا رہا۔ ٹیلی فون پر سنی ہوئی بھیانک آواز کسی طرح اس کی یاد سے نہیں نکلتی تھی۔ آخر ایک روز مذکورہ آدمی آیا۔ ڈاکٹر نے اس سے اپنے واقعہ کا ذکر کیا۔ آدمی ایک منٹ خاموش رہا اور اس کے بعد بولا: یہ تمہارے نام فرشتہ کا پیغام تھا۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو حج پر جانا چاہئے۔ ڈاکٹر کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے فوراً تیاری شروع کر دی۔ اور پہلا موقع آتے ہی حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر کا حج اس کی زندگی کا بڑا تاریخی واقعہ تھا۔ حج کے دوران اس پر عجیب کیفیت طاری رہی۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ رب کعبہ کے مخصوص بلاوے پر دیار حرم میں حاضر ہوا ہے۔ واپس آنے کے بعد چہرہ پر داڑھی اور پنج وقتہ نمازوں کے اہتمام نے بتایا کہ ڈاکٹر اب نیا انسان بن چکا ہے۔

ڈاکٹر کی زندگی میں یہ انقلاب اس لئے آیا کہ "جبریل" کی آواز سن کر اس نے سمجھا کہ براہ راست آسمان سے اس کو پکارا جا رہا ہے۔ جب کہ مذکورہ شخص کی تبلیغ اس کو محض ایک انسان کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ تاہم اگر آدمی کی فطرت بیدار ہو جائے تو اس کو "ٹیلی فون" پر جبریل کی آواز سننے کی ضرورت نہیں۔ اس کو نظر آئے گا کہ ستاروں سے لے کر درختوں تک ہر چیز خاموش زبان میں وہی پیغام دے رہی ہے جس کو ڈاکٹر نے "جبریل" کی طرف سے ٹیلی فون کی زبان میں سنا۔

خدا کی رحمت

بارش کے موسم میں بارش نہ ہو تو کسان پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ بارش ہی کے اوپر کھیتی کا دار و مدار ۔ بارش سے کھیتوں میں فصل اگتی ہے۔ سال بھر کی روزی حاصل ہوتی ہے۔ بارش نہ ہو تو کسانوں کے کھیت ان ہو جائیں، ہم کو اپنی خوراک کے لئے غلّہ نہ ملے۔ اسی طرح ایک اور بارش ہے۔ یہ اللہ کا وہ فیضان ہے جس سے عمل کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ جس سے ہمارے ایمان کی زمین پر اسلامی کردار کی کھیتیاں اگتی ہیں۔ اللہ کی توفیق ے تو ہمارے ایمان کی زمین سوکھی پڑی رہ جائے اور اس سے نیک اعمال کی وہ فصل نہ اگے جس سے کسی کے اوپر جنت دروازے کھلتے ہیں۔ توفیق کی اہمیت اسلامی کردار پیدا کرنے کے لئے ویسی ہی ہے جیسے بارش کی اہمیت کھیتوں ں فصل اگانے کے لئے۔

جب بادلوں والی بارش رکتی ہے تو کسان بے حد پریشان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عمل کی توفیق والی بارش ی رکتی ہے۔ اور مسلمان کو اس وقت بے چین ہو جانا چاہئے جب وہ دیکھے کہ اس کے اوپر توفیق الٰہی کی بارش رک گئی ہے۔ ں کے اندر وہ جذبات نہیں امنڈ رہے ہیں جو اللہ کے پسندیدہ اعمال کا محرک بنتے ہیں۔

جب آپ کو ایک اچھی نماز پڑھنے کی سعادت ملتی ہے تو درحقیقت وہ رحمت الٰہی کی بارش کی ایک بوند ہوتی ہے ذ آپ کے اوپر ٹپکتی ہے۔ جب آپ کو خالص اللہ کی خاطر روزہ رکھنا اور حج کرنا نصیب ہوتا ہے، جب آپ خدا کی راہ یں خرچ کرنے کی خوشی حاصل کرتے ہیں تو یہ سب بھی اللہ کی اسی بارش کے چھینٹے ہوتے ہیں جو آپ کو اللہ کی توفیق سے پہنچتے ہیں۔ اسی طرح جب اللہ کی یاد سے آپ کا دل بھر جاتا ہے۔ جب آپ کی آنکھیں اللہ کی راہ میں رونے کی توفیق پاتی ہیں۔ جب آپ کی زندگی میں درد کے وہ لمحات آتے ہیں جو آپ کو اللہ کے خوف و محبت سے تڑپا دینے والے ہوں تو یہ سب بھی اسی ان دیکھی بارش کا فیضان ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے آپ کے اوپر برستا ہے۔ جب آپ اپنے بھائی کی کوئی خدمت کرتے ہیں۔ جب دوسرے کے دکھ سے آپ کو دکھ اور دوسرے کے سکھ سے آپ کو سکھ پہنچتا ہے۔ جب آپ دل کی سچائی کے ساتھ ان کاموں میں سے کوئی کام کرتے ہیں جن کو بندوں کے حقوق کی ادائگی کا نام دیا گیا ہے تو یہ سب اسی خدائی بارش کے چھینٹے ہوتے ہیں جو آپ کے اوپر اس کی رحمت خاص سے برستے ہیں۔

ہم سب مسلمان ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ مگر یاد رکھئے مسلمان ہونا یا مسلمان گھر میں پیدا ہونا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ کو ایمان و اسلام کی زمین حاصل ہے۔ مگر ہر کسان جانتا ہے کہ صرف زمین کا مالک ہونا کافی

نہیں۔ بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس زمین کو پانی کی سہولتیں حاصل ہوں۔ صحرا میں ہر طرف زمین ہی زمین ہوتی ہے مگر وہ کھیتی کے لئے بے کار ہے۔ وہاں ہری بھری فصل کے بجائے ہر وقت ریت اڑتی رہتی ہے۔ کیوں۔ اس لئے کہ وہاں پانی کا ایک قطرہ نہیں، ایک کسان صرف اس بات کو کافی نہیں سمجھتا کہ اس کے پاس کھیت موجود ہے۔ خواہ یہ کھیت ہزاروں ایکڑ سے بھی زیادہ کیوں نہ ہو۔ کھیت سے فصل اگانے کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی بارش اسے پہنچے۔ جب کھیت بارش سے سیراب ہوتا ہے اسی وقت وہ لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت اختیار کرتا ہے۔

اسی طرح ہمارے لئے صرف یہ بات کافی نہیں کہ ہم ایمان و اسلام کے مالک ہیں۔ اس کے ساتھ لازمی طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری اسلامی زمین پر خدا کی توفیق کی بارش بھی ہو رہی ہو۔

ہمارے دل میں اللہ سے خوف و محبت کی وہ بوندیں ٹپکیں جو آدمی کے اندر ربانی ہل چل پیدا کرتی ہیں اور اس کو نیک کام کرنے پر ابھارتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ خدا کی اس بارش میں اس کو حصہ مل رہا ہے یا نہیں۔ اس کے اوپر رحمتوں کا وہ فیضان برس رہا ہے یا نہیں جس سے خدا کے پسندیدہ اعمال کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس روحانی بارش کی بوندیں آپ کے اوپر ٹپک رہی ہوں تو خدا کا شکر ادا کیجئے۔ کیوں کہ یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو اس دنیا میں کسی کو ملتی ہے۔ اور اگر اس بارش کے چھینٹے آپ کی ہستی کو نم نہ کر رہے ہوں تو آپ کو اس سے زیادہ بے چین ہو جانا چاہئے جتنا کوئی کسان اس وقت بے چین ہوتا ہے جب کہ بادل اس کی زمین پر بارش برسانے سے رک گئے ہوں۔ کیوں کہ بادلوں والی بارش کسی کو صرف ایک سال کے غلّہ سے محروم کرتی ہے۔ جب کہ توفیق عمل کی بارش کا رکنا آدمی کو اس سخت ترین اندیشہ میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ آخرت کی ابدی زندگی میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائے۔

کوئی آدمی نماز روزہ اور اس طرح کے دوسرے اعمال کر رہا ہے۔ مگر ان کی حیثیت اس کے لئے ایسی ہے جیسے کچھ بے روح رسم ہو جس کو وقت وقت پر ادا کر لیا جاتا ہے، تب بھی اس کو مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہی عمل اسلامی عمل ہے جس کے ساتھ آدمی کے دل کی دھڑکنیں شامل ہو جائیں، جس کے اندر اس کی روح کی بیتابیاں گھل مل گئی ہوں۔ جو عمل آدمی کی زندگی کا محض ایک خشک ضمیمہ ہے وہ محض ایک بے فائدہ رسم ہے جس کی کوئی قیمت نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔

ہم میں سے ہر شخص کو اس اعتبار سے اپنا جائزہ لینا چاہئے۔ اگر بارش برسانے والے بادل رک جائیں تو ہم استسقا کی نماز پڑھتے ہیں۔ لوگ پانی حاصل کرنے کے دوسرے طریقوں کی طرف دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ اسی

طرح توفیق عمل کی بارش رکنے پر آپ کو چوکنا ہو جانا چاہئے۔ آپ کو خدا سے دعا اور التجا کرنا چاہئے کہ وہ آپ کو اپنی مدد سے محروم نہ کرے۔

اگر آپ کو زندہ عبادت کی توفیق نہ مل رہی ہو۔ اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا شوق آپ سے رخصت ہو گیا ہو۔ اگر دوسروں کا بھلا دیکھ کر آپ خوش نہ ہوتے ہوں۔ اگر اپنے بھائیوں کی خدمت کرنے کا جذبہ آپ کے اندر نہ ابھرتا ہو۔ اگر آپ اپنے فائدہ کے پیچھے دوسرے کا نقصان بھول جاتے ہوں۔ اگر اپنے صاحب معاملہ کے ساتھ انصاف کرنا آپ کو گوارا نہ ہوتا ہو۔ کسی سے شکایت پیدا ہونے کے بعد اگر آپ اس کو معاف کرنے پر راضی نہ ہوتے ہوں۔ اگر اس طرح کی باتیں ہوں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے ایمان کی زمین سوکھی پڑی ہوئی ہے۔ آپ کے اوپر اللہ اپنی توفیق کی بارش نہیں برسا رہا ہے۔ خدا کی رحمتوں کے چھینٹے سے محرومی نے آپ کے اسلام کے پودے کو خشک کر دیا ہے۔

اسی طرح آپ کو اس وقت بھی بے چین ہو جانا چاہئے جب کہ آپ اپنا یہ حال پائیں کہ آپ کے لئے انھیں دینی کاموں میں رغبت ہو جن میں آپ کی دنیا کھنڈت نہیں ہوتی۔ جس میں آپ کے مفادات پوری طرح محفوظ رہتے ہیں۔ جس میں سستی قیمتوں پر جنت کے دروازے کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس میں کچھ کئے بغیر کرنے کا تمغہ مل جاتا ہے۔ جس میں الفاظ بول کر عمل کا کریڈٹ حاصل ہوتا ہے۔ اس قسم کے "دین" کی طرف لپکنا اور نفس کو دبانے اور جذبات کی قربانی دینے والے دین سے بے پروا ہونا دین داری کی حالت نہیں بلکہ غفلت کی حالت ہے۔

اگر آپ کا یہ حال ہو کہ آپ انھیں دینی کاموں کی طرف دوڑتے ہوں جن میں دنیوی نفع ملنے والا ہو۔ جن میں شہرت اور عزت کی چاشنی ہو۔ جن میں آپ کی عوامی تصویر میں اضافہ ہوتا ہو۔ جن میں آپ اپنے کو نمایاں کرنے کے مواقع پا رہے ہوں۔ جن میں عمل کی قیمت دنیوی صورت میں وصول ہوتی ہو۔ جن میں دینی کام کی قیمت لیڈری اور پیشوائی کی صورت میں مل رہی ہو۔ آپ دنیوی پہلو رکھنے والے دینی کام میں تو خوب تیزی دکھائیں اور جس دینی کام میں کوئی دنیوی چاشنی نہ ہو اس سے بے رغبت رہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کی توفیق میں حصہ پانے سے محروم ہیں۔ کیونکہ دولت اور عزت والے دین کی طرف دوڑنا دین کے نام پر اپنے نفس کی طرف دوڑنا ہے نہ کہ حقیقۃً خدا کے دین کی طرف دوڑنا۔

ایسی تمام حالتوں میں آپ کے لئے مطمئن ہونے کا موقع نہیں۔ آپ کو بے تاب ہو کر خدا کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ آپ کو خدا کی بارش رحمت کو اپنی طرف مائل کرنا چاہئے۔ قبل اس کے کہ آپ کا سوکھا ہوا پودا خدا کے باغ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۲ جولائی ۱۹۶۸ کو اعظم گڑھ کے ایک اجتماع میں کی گئی

خدائی اہتمام

یہود کو خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ تورات کی حفاظت کریں (بما استحفظوا من کتب اللہ، المائدہ) اس کے برعکس قرآن کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: ہم نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں (وانا لہ لحفظون، الحجر) اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی آسمانی کتابوں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری ان کی قوموں پر ڈالی گئی تھی، جب کہ قرآن کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔ پچھلی آسمانی کتابیں بھی اسی طرح خدا کی کتاب تھیں جس طرح قرآن خدا کی کتاب ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کے حامل ان کتابوں کی حفاظت کے بارے میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہ کر سکے۔ یہ کتابیں اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہیں۔ مگر قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے خود لی تھی اس لئے قرآن خدا کی خصوصی مدد سے مکمل طور پر محفوظ رہا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان سے خدا کے فرشتے اتریں گے اور وہ قرآن کو اپنے سایہ میں لئے رہیں گے۔ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں اخروی حقیقتوں کو غیب میں رکھا گیا ہے۔ اس لئے یہاں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ فرشتے سامنے آکر قرآن کی حفاظت کرنے لگیں۔ موجودہ دنیا میں اس قسم کا کام ہمیشہ معمول کے حالات میں کیا جاتا ہے نہ کہ غیر معمولی حالات میں۔ یہاں قرآن کی حفاظت کا کام تاریخی اسباب اور چلتے پھرتے انسانوں کے ذریعہ لیا جائے گا تاکہ غیب کا پردہ باقی رہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ خدا نے اپنے وعدہ کو پوری تاریخ میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر انجام دیا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے مختلف قوموں سے مدد لی ہے۔ نیز اس کام میں مسلمانوں کو بھی استعمال کیا گیا ہے اور غیر مسلموں کو بھی۔

پچھلے انبیاء کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کو بہت کم ایسے ساتھی ملے جو ان کے بعد ان کی کتاب کی حفاظت کی مضبوط ضمانت بن سکتے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ نمایاں طور پر دوسرے انبیاء سے مختلف ہے۔ وفات سے تقریباً ڈھائی ماہ پہلے آپ نے حج کیا جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر عرفات کے میدان میں ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان موجود تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر وقت تک آپ کے اوپر ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کی کل تعداد کم از کم پانچ لاکھ ہو چکی ہوگی۔ یہ تعداد قدیم انسانی آبادی کے لحاظ سے بہت غیر معمولی ہے۔ آپ کے بعد یہ تعداد بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ملک کے ملک مسلمان ہوتے چلے گئے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کی پشت پر اتنا بڑا انسانی گروہ اکٹھا کر دیا گیا جو اس سے پہلے کسی آسمانی کتاب کی حفاظت کے لئے اکٹھا نہیں ہوا تھا۔

اس کے بعد دوسرا مددگار واقعہ یہ ظہور میں آیا کہ عرب میں اور عرب کے باہر مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ

شروع ہوا۔ یہ سلسلہ یہاں تک پھیلا کہ قدیم آباد دنیا کے بیشتر حصہ پر مسلمان قابض ہو گئے اور انھوں نے دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے مضبوط سلطنت قائم کی۔ یہ سلطنت کسی طاقت سے مغلوب ہوئے بغیر مسلسل قائم رہی اور قرآن کی حفاظت کرتی رہی۔ یہ سلسلہ ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ زمانہ پریس کے دور میں پہنچ گیا اور قرآن کے ضائع ہونے کا امکان سرے سے ختم ہو گیا۔

پریس کے دور میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کسی کتاب کا ایک نسخہ لکھا جائے اور اس کو چھاپ کر ایک ہی قسم کے کروروں نسخے تیار کر لئے جائیں۔ مگر پہلے ایسا ممکن نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں کتاب کا ہر نسخہ الگ الگ ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے اکثر ایک نسخہ اور دوسرے نسخہ میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جاتا تھا۔ چنانچہ قدیم کتابوں میں سے جو کتاب بھی آج دنیا میں پائی جاتی ہے اس کے مختلف قلمی نسخوں میں سے کوئی بھی دو نسخہ ایسا نہیں جو فرق سے خالی ہو۔ یہ صرف قرآن ہے جس کے لاکھوں نسخے قدیم زمانہ میں ہاتھ سے لکھ کر تیار کئے گئے۔ ان کی ایک بڑی تعداد آج بھی میوزیم اور کتب خانوں میں موجود ہے۔ مگر ایک قلمی نسخہ اور دوسرے قلمی نسخہ میں کوئی ادنیٰ فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ خدا کی خصوصی مدد تھی جس نے قرآن کے بارے میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ مستعد اور حساس بنا دیا

اسی کے ساتھ خدا نے یہ انتظام کیا کہ قرآن کے حفظ (رٹ کر اس کے متن کو یاد کرنے) کا نادر طریقہ شروع ہوا جو اس سے پہلے معلوم تاریخ میں کبھی کسی کتاب کے لئے نہیں کیا گیا تھا۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے دل میں یہ جذبہ ابھر آیا کہ وہ قرآن کے متن کو شروع سے آخر تک یاد کریں اور یاد رکھیں۔ اس طرح کے افراد تاریخ کے ہر دور میں ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ قرآن کے زمانہ سے شروع ہو کر آج تک جاری ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق دنیا میں کوئی بھی دوسری کتاب نہیں ہے جس کے ماننے والوں نے اس طرح اس کو یاد کرنے کا اہتمام کیا ہو جس طرح قرآن کے ماننے والے ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔ قرآن کو یاد کرنے کے رواج نے اس کی حفاظت کے اس انوکھے انتظام کو ممکن بنا دیا جس کو ایک فرانسیسی مستشرق نے دہرا جانچ (Double Checking) کا طریقہ کہا ہے۔ یعنی ایک لکھے ہوئے نسخہ کو دوسرے لکھے ہوئے نسخہ سے ملانا اور اسی کے ساتھ حافظہ کی مدد سے اس کی صحت کو جانچتے رہنا۔

ڈیڑھ ہزار برس کی اسلامی تاریخ میں یہ جو کچھ ہوا خدا کی طرف سے ہوا۔ امتحانی حالات کو باقی رکھنے کے لئے اگرچہ اس کو اسباب کے پردہ میں انجام دیا گیا ہے۔ تاہم جب قیامت آئے گی اور تمام حقیقتیں برہنہ کر دی جائیں گی اس وقت لوگ دیکھیں گے کہ عرب کے اسلامی انقلاب سے لے کر دور پریس کے نئے حفاظتی طریقوں تک سارے کام خدا خود اپنے فرشتوں کی معرفت کرا رہا تھا اگرچہ ظاہری طور پر وہ کچھ ہاتھوں کو اس کا ذریعہ بنا تا رہا۔

قرآن کے بارے میں خدا کے اس خصوصی انتظام کا ایک اور اہم پہلو ہے جس کا تعلق مخصوص طور پر مسلمانوں

ے ہے۔ قرآن کے الفاظ کی حفاظت جو مسلمانوں کے ہاتھوں ہو رہی ہے یہی دراصل وہ چیز نہیں ہے جو قرآن
ے سلسلے میں اللہ کو ہم سے مطلوب ہو۔ یہ کام تو خود خدا کے براہ راست اہتمام میں ہو رہا ہے، پھر ہمارا اس میں
ہا کمال۔ جو لوگ اس حفاظتی کام میں مشغول ہیں وہ اپنے اخلاص کے بقدر اپنا معاوضہ پائیں گے۔ مگر یہی امت
سلمہ کی اصل ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ کام خواہ کتنے ہی اخلاص کے ساتھ اور کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے،
س سے ہماری اصل ذمہ داری ساقط نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلی قوموں کا امتحان حفاظت متن میں تھا، امت مسلمہ کا امتحان حفاظتِ معانی میں
ہے۔ پچھلے زمانوں میں جو لوگ کتابِ خداوندی کے حامل بنائے گئے ان کی آزمائش معانی کی حفاظت کے ساتھ
یکساں طور پر متن کی حفاظت میں بھی تھی۔ مگر مسلمانوں کی آزمائش سب سے بڑھ کر معانی کی حفاظت میں ہے۔
مسلمانوں کو قرآن کے سلسلے میں جس چیز کا ثبوت دینا ہے وہ یہ کہ وہ قرآن کی تشریح و تعبیر میں فرق نہ کریں۔ قرآن میں
بس چیز کو جس درجہ میں رکھا گیا ہے اس کو اسی درجہ میں رکھیں۔ وہ قرآن کے منشا میں کوئی تفسیری تبدیلی نہ
ریں۔ قرآن کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے وہ اسی اصل بات کو پیش کریں جو خود قرآن میں عربی زبان میں
تاری گئی ہے نہ کہ اپنی خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ ایک نیا دین بنائیں اور اس کو قرآن کے نام پر لوگوں کے
سامنے پیش کرنے لگیں۔

مسلمانوں کا قرآن کا حامل بننے میں ناکام ہونا یہ ہے کہ وہ قرآن کو برکت اور ثواب کی کتاب بنا دیں اور
پنے دین کی گاڑی عملاً دوسری دوسری بنیادوں پر چلانے لگیں۔ کوئی مسائل کے نام پر سرگرمی دکھانے لگے اور کوئی
فضائل کے نام پر۔ کوئی بزرگوں کے ملفوظات اور کہانیوں کو دین کی بنیاد بنائے اور کوئی جلسوں اور تقریروں کی
دھوم مچانے کو۔ کوئی قرآن کو اپنی سیاسی تحریک کا ضمیمہ بنائے اور کوئی اپنے قومی ہنگاموں کا۔ قرآن کے نام پر یہ
نام سرگرمیاں قرآن کے معانی میں تحریف کا درجہ رکھتی ہیں۔ مسلمان اگر قرآن کے معانی کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کر رہے
ہوں تو وہ صرف اس بنا پر خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے کہ قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور تکرار میں انھوں نے کمی نہیں کی تھی۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ کتاب الٰہی کی حامل دوسری قوموں کو جو سزا متن کتاب کی تبدیلی پر دی گئی
وہ سزا مسلمانوں کو معانی کتاب کی تبدیلی پر ملے گی۔ مسلمانوں کا اصل امتحان جہاں ہو رہا ہے وہ یہی ہے۔ اگر وہ کتاب اللہ
کے معانی کو اپنی خود ساختہ تعبیرات سے بدل ڈالیں تو وہ صرف اس لئے خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے کہ انھوں نے
کتاب کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ کیونکہ امتحان آدمی کے اپنے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کو
جہاں اختیار حاصل ہے وہ قرآن کے معانی میں تبدیلی ہے نہ کہ قرآن کے متن میں تبدیلی۔ متن قرآن میں تبدیلی سے
تو خدا نے تمام قوموں کو عاجز کر رکھا ہے، پھر وہاں کسی کا امتحان کس طرح ہوگا۔

سچا راستہ

خدا تک پہنچنے کی صراط مستقیم

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

اشاعت اول ۱۹۸۱ قیمت ایک روپیہ

آغاز کلام

سورج اپنے روشن چہرہ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور انسان کے اوپر اس طرح چمکتا ہے جیسے وہ کوئی پیغام سنانا چاہتا ہو۔ مگر وہ کچھ کہنے سے پہلے ڈوب جاتا ہے۔ درخت اپنی ہری بھری شاخیں نکالتے ہیں، دریا اپنی موجوں کے ساتھ رواں ہوتا ہے۔ یہ سب بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر انسان ان کے پاس سے گزر جاتا ہے، بغیر اس کے کہ ان کا کوئی بول اس کے کان میں پڑا ہو۔ آسمان کی بلندیاں، زمین کے مناظر سب ایک بہت بڑے "اجتماع" کے شرکاء معلوم ہوتے ہیں۔ مگران میں سے ہر ایک خاموش کھڑا ہوا ہے۔ وہ انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔

کائنات کیا گونگے شاہکاروں کا ایک عظیم عجائب خانہ ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خدا کا ایک پیغام ہے اور اس کو وہ ابدی زبان میں نشر کر رہا ہے۔ مگر انسان دوسری آوازوں میں اتنا کھویا ہوا ہے کہ اس کو کائنات کا خاموش کلام سنائی نہیں دیتا۔

پیغمبر اسی بے الفاظ خدائی کلام کو الفاظ دیتا ہے۔ وہ خاموش پیغام کو ہمارے لئے سننے کے قابل بناتا ہے۔ پیغمبر بتاتا ہے کہ خدا کا وہ دین کون سا ہے جو اس کو انسان سے بھی مطلوب ہے اور بقیہ کائنات سے بھی۔

پیغمبر کے لائے ہوئے اس دین کی بنیاد قرآن پر ہے جو خدا کی طرف سے عربی زبان میں اتارا گیا ہے۔ پھر اس کتاب کی مزید وضاحت سنت سے ہوتی ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کی صورت میں کتابوں کے وسیع ذخیرہ میں مرتب ہو کر موجود ہے۔ جو شخص سنجیدگی کے ساتھ اس کو جاننا چاہتا ہو اس کو چاہئے کہ ان کتابوں کو پڑھے۔ کیونکہ یہی وہ کتابیں ہیں جو دین خداوندی کو سمجھنے کے لئے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو لوگ ان کتابوں کے پورے ذخیرے کے مطالعہ کا وقت نہ رکھتے ہوں ان کے لئے کم سے کم مختصر نصاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

قرآن مجید

سیرۃ نبوی از حافظ ابن کثیر

مشکوٰۃ المصابیح

حیاۃ الصحابہ از مولانا محمد یوسف کاندھلوی

یہ سب معروف و مشہور کتابیں ہیں اور ہر جگہ بآسانی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ یہ کتابیں اصلاً عربی زبان میں ہیں۔ تاہم ان کے ترجمے مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ پڑھنے والا اپنی سہولت کے مطابق ان کو اپنی مطلوبہ زبان میں حاصل کر کے پڑھ سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب اسی دین خداوندی کے عمومی اور ابتدائی تعارف کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اگر وہ پڑھنے والے کے اندر یہ شوق پیدا کر دے کہ وہ اس دین کا مزید تفصیلی مطالعہ کر کے حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے تو یہی اس کی کامیابی کے لئے کافی ہے۔

وحید الدین ۲۷ دسمبر ۱۹۸۰

انسان کی تلاش

انسان ایک کامل دنیا چاہتا ہے، مگر وہ ایک ناقص دنیا میں رہنے کے لئے مجبور ہے۔ ہماری خوشیاں بے حد عارضی ہیں۔ ہماری ہر کامیابی اپنے ساتھ ناکامی کا انجام لئے ہوئے ہے۔ ہم اپنی امیدوں کی "صبح" کو بھرپور دیکھ بھی نہیں پاتے کہ اس پر "شام" آجاتی ہے۔ ہماری زندگی کے درخت پر شادابی اور بہار کے چند سال بھی نہیں گزرتے کہ حادثہ اور بڑھاپا اور موت اس کو اس طرح ختم کر دیتے ہیں جیسے کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

پھول کس قدر حسین ہوتے ہیں، مگر پھول صرف اس لئے کھلتے ہیں کہ وہ مرجھا جائیں۔ سورج کی روشنی کتنی لطیف ہے، مگر سورج کی روشنی کے لئے مقدر ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے چمکے اور اس کے بعد رات کا تاریک پردہ اسے چھپالے۔ ایک زندہ انسان کیسا معجزاتی وجود ہے، مگر کوئی انسان اپنے آپ کو موت اور حادثات سے نہیں بچا سکتا۔ یہی موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ یہ دنیا ناقابل قیاس حد تک نفیس اور بامعنی ہے۔ مگر یہاں کی ہر خوبی زائل ہونے والی ہے، یہاں کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نقص کا پہلو ہے جو کسی طرح اس سے جدا نہیں ہوتا۔ جو خدا اپنی ذات میں کامل ہو وہ ایک ایسی کائنات کو پیدا کرنے پر اکتفا نہیں کر سکتا جو اپنی ذات میں ناقص ہو۔ کامل کا غیر کامل پر ٹھہر جانا ممکن نہیں۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ موجودہ دنیا آخری نہیں۔ ضرور ہے کہ اس کے بعد ایک اور دنیا آئے جو موجودہ دنیا کی کمیوں کی تلافی کرنے والی ہو۔

موجودہ دنیا کے متعلق یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ فانی ہے۔ وہ تقریباً ۲۰ ہزار ملین سال پہلے ایک وقت خاص میں وجود میں آئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کا خالق ازلی وجود رکھنے والا ہے۔ ایک ازلی خالق ہی ایک غیر ازلی مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے۔ خدا اگر ہمیشہ سے نہ ہو تو وہ کائنات کبھی موجود نہیں ہو سکتی جو ہمیشہ سے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فانی کائنات کو ماننے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ ہم ایک غیر فانی خالق کو مانیں۔ "فانی" کائنات کا موجود ہونا ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں ایک "غیر فانی" خالق موجود ہے۔ خالق اگر غیر ابدی ہوتا تو وہ سرے سے موجود ہی نہ ہوتا، اور جب خالق موجود نہ ہوتا تو مخلوقات کے وجود میں آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ دنیا "۲۵ نومبر" کو پیدا ہوئی تو اس کا لازمی مطلب یہ ہوتا ہے کہ ۲۵ نومبر سے

پہلے بھی کوئی موجود تھا جس نے اس کو پیدا کیا۔ اگر کہا جائے کہ پیدا کرنے والا بھی کسی پچھلے "۲۵ نومبر" کو پیدا ہوا تھا تو یہ بات بالکل بے معنی ہوگی۔ پیدا کرنے والا اگر پچھلے کسی ۲۵ نومبر کو پیدا ہونے والا ہو تو وہ بھی پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق ہمیشہ سے تھا، اسی لئے اس نے غیر ہمیشہ کو پیدا کیا، اگر وہ ہمیشہ سے نہ ہوتا تو وہ سرے سے موجود نہ ہوتا پھر غیر ہمیشہ کا وجود کہاں سے آتا۔

خدا ازلی ہے اور اسی لئے خدا ایک کامل ہستی ہے۔ کیونکہ ازلیت کمال کا سب سے بڑا وصف ہے۔ جو ازلی ہو وہ لازماً کامل بھی ہوگا۔ ازلیت اور کمال دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔

موجودہ دنیا خدا کی صفات کا ایک ظہور ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں کمی اور محدودیت کا ہونا بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا خدا کی صفات کا کامل ظہور نہیں۔ کامل اور ابدی خدا کی صفات کا کامل ظہور وہی ہے جو خود بھی کامل اور ابدی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری دنیا کو ابھی ایک اور دنیا کا انتظار ہے، خدا کی صفات کا ظہور اپنی تکمیل کے لئے ابھی ایک اور ظہور کا تقاضا کرتا ہے۔

جنت خدا کی وہ دنیا ہے جہاں اس کی صفات اپنے پورے کمال کے ساتھ ظاہر ہوں گی۔ جنت ان تمام کمیوں سے پاک ہوگی جن کا ہم آج کی دنیا میں تجربہ کرتے ہیں۔ جنت خدا کی اس قدرتِ کاملہ کا مظہر ہے کہ وہ حسن میں ابدیت کی شان پیدا کرسکتا ہے، وہ لذت کو لامحدود بنانے کا اختیار رکھتا ہے۔ وہ ایسی دنیا کی تخلیق کرسکتا ہے جہاں اتھاہ سکون ہو اور جس کا چین کبھی ختم نہ ہوسکے۔

ہر آدمی ایک ان دیکھے سکون کی تلاش میں ہے۔ ہر آدمی ایک ایسی مکمل دنیا کا طالب ہے جس کو وہ ابھی تک پا نہ سکا۔ یہ طلب موجودہ کائنات میں اجنبی نہیں۔ جو کائنات ایک ازلی خدا کی شہادت دے رہی ہو وہاں ازلی خوبیوں کی ایک دنیا کا ظہور اتنا ہی ممکن ہے جتنا خود موجودہ غیر ازلی دنیا کا ظہور۔ کیونکہ جس کائنات کا خالق اپنی ذات میں ازلی ہو وہ اپنی صفات کے غیر ازلی ظہور پر اکتفا نہیں کرسکتا۔ جس خدا نے نیست سے ہست کو پیدا کیا وہ یقیناً ہست میں ابدیت کی شان بھی پیدا کرسکتا ہے، اور یقیناً دوسرا کارنامہ پہلے کارنامہ سے کچھ مشکل نہیں۔

ازلیت ایک خاص الخاص خدائی صفت ہے، اس صفت میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ ازلیت

اعلیٰ ترین کمال ہے جو صرف ایک خدا کے لئے سزاوار ہے۔ وہ جنت جو خدا کی صفتِ ازلیت کا ظہور ہو وہ ا
عجیب و غریب چیز ہوگی جس کا آج کوئی انسان تصور نہیں کر سکتا۔ وہ حسن جس کے لئے کبھی مرجھانا نہ ہو، و
لذت جو کبھی ختم ہونے والی نہ ہو، وہ عیش جس کا تسلسل ابدی طور پر باقی رہے، امیدوں اور تمناؤں کی وہ دنیا
جس کے کمالات پر کبھی کوئی زوال نہ آئے، ایسی جنتی دنیا اتنی حیرت ناک حد تک لذیذ ہوگی کہ آدمی نیند کے بعد
بھی اس سے انقطاع نہ چاہے گا خواہ اس پر اربوں اور کھربوں سال کیوں نہ گزر جائیں۔

انسان ہمیشہ ایک ایسی زندگی کی تلاش میں رہتا ہے جس میں اس کو ابدی آرام حاصل ہو۔ یہ تلاش
صحیح بھی ہے اور انسانی فطرت کے مطابق بھی۔ مگر ہمارے خوابوں کی یہ زندگی ہمیں موجودہ دنیا میں نہیں مل سکتی
موجودہ دنیا میں ابدی خوشیوں کا نظام بننا ممکن نہیں۔ یہاں وہ اسباب موجود ہی نہیں جو ابدی خوشیوں اور
راحتوں کی دنیا کو ظہور میں لانے کے لئے ضروری ہیں۔

پیغمبر نے بتایا کہ موجودہ دنیا کو خدا نے امتحان کی جگہ بنایا ہے نہ کہ انعام پانے کی جگہ۔ یہاں صرف
وہ اسباب جمع کئے گئے ہیں جو آدمی کے امتحان کے لئے ضروری ہیں۔ خوشیوں اور راحتوں کی ابدی زندگی حاصل
کرنے کے لئے جو اسباب درکار ہیں وہ دوسری دنیا میں فراہم ہوں گے جو موجودہ دنیا کے بعد ہمارے سامنے
آنے والی ہے۔ ہمارے اور اس اگلی دنیا کے درمیان موت کا فاصلہ ہے۔ موت آدمی کے امتحان کی تکمیل کا
وقت ہے اور اسی کے ساتھ آگے کی ابدی دنیا میں داخل ہونے کا بھی۔

جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کو اس کے خوابوں کی زندگی ملے، اس کو موجودہ دنیا میں اپنی "جنت"
بنانے کی بے فائدہ کوشش میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے بجائے اس کو یہ کوشش کرنا چاہئے
کہ وہ آج کی دنیا میں ہونے والے امتحان میں پورا اترے۔ وہ دنیا میں خدا کا بندہ بن کر زندگی گزارے۔ وہ پیغمبر
کی پیروی کو اپنا طریقہ بنائے۔ وہ اپنی آزادی کو خدا کے احکام کی پابندی میں دے دے۔

جو لوگ آج کے امتحان میں پورے اتریں گے وہ اگلی زندگی میں اپنے خوابوں کی دنیا کو پائیں گے۔ جو لوگ
امتحان میں ناکام رہیں گے وہ زندگی کے اگلے مرحلے میں اس حال میں پہنچیں گے کہ ابدی بربادی کے سوا اور کوئی
چیز نہ ہوگی جو وہاں ان کا استقبال کرے۔

سچائی کیا ہے

ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک سیدھی لکیر صرف ایک ہوتی ہے۔ اسی طرح بندے کو خدا تک پہنچانے والا سیدھا راستہ بھی کوئی ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے۔ اسی راستہ کا نام سچائی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ سچائی کیا ہے اور اس کو کس طرح دریافت کیا جائے۔

ہماری خوش قسمتی سے سچائی جس طرح ایک ہے اسی طرح وہ میدان میں بھی تنہا ہے۔ یہاں کئی چیزیں نہیں ہیں جن کے درمیان انتخاب کا سوال ہو۔ یہاں تو ایک ہی چیز ہے اور ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس ایک کو مان لیں۔ یہ واحد سچائی محمد رسول اللہ کی تعلیمات ہیں۔ اگر آدمی سچائی کی تلاش میں فی الواقع سنجیدہ ہو تو وہ پائے گا کہ خدا نے اس کو انتخاب کی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ خدا نے ہم کو ایک ایسی دنیا میں رکھا ہے جہاں انتخاب حق اور ناحق کے درمیان ہے نہ کہ حق اور حق کے درمیان۔ (یونس ۳۲)

فلسفہ سچائی کی تلاش میں کم از کم پانچ ہزار سال سے سرگرداں ہے۔ مگر اس کی لمبی تلاش نے اس کو صرف اس مقام پر پہنچایا ہے کہ وہ خود اقرار کر رہا ہے کہ وہ آخری سچائی تک نہیں پہنچ سکا اور نہ کبھی پہنچ سکتا۔ فلسفہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عقلی غور و فکر کے ذریعہ سچائی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر عقل اپنی معلومات کے دائرہ میں غور کرتی ہے۔ اور سچائی کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے بارے میں کوئی واقعی رائے قائم کرنے کے لئے پوری کائنات کا علم درکار ہے۔ کوئی فلسفی کبھی کائناتی معلومات تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے وہ سچائی کے بارے میں کوئی قطعی رائے بھی قائم نہیں کر سکتا۔

سائنس نے اس معاملہ میں اپنے کو میدان میں کھڑا ہی نہیں کیا ہے۔ سائنس اپنی کھوج ان امور میں جاری کرتی ہے جہاں قابل اعادہ تجربات کے ذریعہ نتائج تک پہنچنا ممکن ہو۔ سائنس پھول کی کیمسٹری کو موضوع بحث بناتی ہے مگر وہ پھول کی مہک کو اپنی بحث سے خارج قرار دیتی ہے۔ کیونکہ پھول کے کیمیائی اجزا تولے اور ناپے جا سکتے ہیں مگر پھول کی مہک کو تولنے اور ناپنے کا کوئی ذریعہ سائنس کے پاس نہیں۔ اس طرح سائنس نے اپنے دائرہ بحث کو خود ہی محدود کر لیا ہے۔ چنانچہ سائنس نے پیشگی یہ اقرار کر لیا ہے کہ وہ عالم حقائق کے صرف جزئی پہلو سے بحث کرتی ہے، وہ کلی حقائق کے بارے میں کوئی بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں۔

روحانی شخصیات کا دعویٰ ہے یا کم از کم ان کے ماننے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ سچائی سے باخبر ہیں اور سچائی کے بارے میں قطعی معلومات دے سکتے ہیں۔ مگر اس عقیدہ کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں۔ روحانی شخصیات اپنے دعوے کے مطابق جس ذریعہ سے سچائی تک پہنچتی ہیں وہ روحانی ریاضتیں ہیں۔ مگر نام نہاد روحانی ریاضتیں حقیقۃً جسمانی ریاضتیں ہیں اور جسمانی ریاضتوں کے ذریعہ روحانی دریافت بجائے خود ایک بے اصل بات ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی بھی روحانی شخصیت، اپنی ذات میں، ان محدودیتوں سے خالی نہیں ہے جن محدودیتوں کا شکار اس کے جیسے دوسرے تمام انسان ہیں۔ دوسرے انسان اپنی جن محدودیتوں کی وجہ سے سچائی تک نہیں پہنچ سکتے وہی محدودیتیں خود ان روحانی شخصیتوں کی راہ میں بھی حائل ہیں۔ کسی بھی قسم کی ریاضت آدمی کو اس کی فطری محدودیتوں سے بالا نہیں کر سکتی، اس لئے کسی بھی قسم کی ریاضت اس کو مطلق سچائی تک نہیں پہنچا سکتی۔

اس کے بعد میدان میں صرف پیغمبر رہ جاتے ہیں۔ پیغمبر وہ انسان ہے جو یہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو چنا ہے اور اس پر سچائی کا علم اتارا ہے تاکہ وہ اس کو دوسرے تمام لوگوں تک پہنچا دے۔ اپنی نوعیت کی حد تک یہی ایک دعویٰ ہے جو اس معاملہ میں قابل اعتبار ہے۔ کیونکہ سچائی کا حقیقی علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا ہے جو ازلی و ابدی ہے اور تمام حقیقتوں سے براہ راست واقف ہے۔ خدا کا خدا ہونا ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ حقیقت کا کلی علم رکھتا ہو۔ اس لئے جو شخص یہ کہے کہ اس کو براہ راست خدا کی طرف سے سچائی کا علم پہنچا ہے اس کا دعویٰ یقیناً اس قابل ہے کہ اس معاملہ میں اس کا لحاظ کیا جائے۔

یہاں ایک سوال ہے۔ پیغمبر ہماری دنیا میں کوئی ایک نہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ ان کی کتابیں بھی کئی ہیں۔ پھر کس پیغمبر کو مانا جائے۔ تاہم آدمی اگر سچائی کی تلاش میں سنجیدہ ہو تو اس سوال کا جواب معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نے ماضی میں بہت سے لوگوں کو پیغمبری کے لئے چنا۔ مگر ایک کے سوا تمام پیغمبر اعتقادی پیغمبر ہیں نہ کہ تاریخی پیغمبر۔ ماضی کے کسی واقعہ کو ماننے کا واحد معیار انسان کے پاس یہ ہے کہ اس کو تاریخی اعتباریت حاصل ہو۔ مگر یہ پیغمبر اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ جو لوگ پیغمبر ہونے کے مدعی ہوئے ہیں ان میں صرف ایک ہی پیغمبر ہیں جن کو پورے معنوں میں تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل ہے۔ اور وہ پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کے بارے میں ہر بات تاریخی طور پر معلوم اور مسلّم ہے۔ موجودہ زمانہ کی کسی شخصیت کے بارے میں ہم جتنا جانتے ہیں اس سے بھی زیادہ ہم پیغمبر عربی کے بارے میں جانتے ہیں۔ آپ کے سوا دوسرے

تمام پیغمبر روایات کے اندھیرے میں گم ہیں۔ ان کے بارے میں مکمل تاریخی معلومات حاصل نہیں۔ اور نہ ان کی چھوڑی ہوئی کتاب آج اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے۔ یہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی زندگی تاریخی طور پر پوری طرح معلوم ہے۔ اور وہ کتاب بھی ادنیٰ تبدیلی کے بغیر کامل صورت میں موجود ہے جس کو آپ نے یہ کہہ کر لوگوں کے حوالے کیا تھا کہ یہ میرے پاس خدا کی طرف سے آئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خالص علمی و عقلی اعتبار سے دیکھا جائے تو "سچائی کیا ہے" کے سوال کا جواب نہ صرف نظری طور پر ایک ہے بلکہ عملی طور پر بھی میدان میں صرف ایک ہی جواب موجود ہے۔ یہاں دوسرا کوئی جواب حقیقی طور پر موجود ہی نہیں۔ ہمیں بہت سے جوابات میں سے ایک جواب کو چننا نہیں ہے بلکہ ایک ہی موجود جواب کو اختیار کرنا ہے

یہ سچائی خدا کی بات ہے اور خدا کی بات ہمیشہ ایک رہتی ہے۔ جس طرح دنیا کی دوسری چیزوں کے لئے خدا کا حکم ہمیشہ سے ایک ہے، اسی طرح انسان کے لئے بھی خدا کا حکم ایک ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا۔ زمین و آسمان کا قانون اربوں سال گزرنے پر بھی نہیں بدلتا۔ درخت اور پانی کے اصول جو ایک جغرافیہ میں ہوتے ہیں وہی دوسرے جغرافیہ میں ہوتے ہیں، یہی حال انسان کے بارے میں خدا کے حکم کا بھی ہے۔ انسان کے بارے میں خدا کا جو حکم ہے وہ وہی آج بھی ہے جو ہزاروں سال پہلے تھا۔ وہ ایک ملک کے انسانوں کے لئے بھی وہی ہے جو دوسرے ملک کے انسانوں کے لئے۔

زندگی کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً سواریاں، مکانات وغیرہ۔ مگر سچائی کا تعلق اس قسم کی چیزوں سے نہیں۔ سچائی کا تعلق اُس "انسان" سے ہے جو ہمیشہ ایک حالت میں رہتا ہے۔ سچائی کا تعلق اِس سے ہے کہ آدمی کس کو اپنا خالق و مالک سمجھے۔ وہ کس کے آگے جھکے اور کس کی عبادت کرے۔ وہ کس سے ڈرے اور کس سے محبت کرے۔ وہ اپنی کامیابی اور ناکامی کو کس معیار سے جانچے۔ اس کی زندگی کا مقصد اور اس کے جذبات کا مرکز کیا ہو۔ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے وہ کن قواعد کے تحت ان سے معاملہ کرے۔ سچائی کا تعلق زندگی کے انھیں امور سے ہے، اور یہ امور وہ ہیں جن کا کوئی تعلق زمانہ یا جغرافیہ سے نہیں۔ وہ ہر مقام پر اور ہر زمانہ میں یکساں طور پر ہر ایک سے مطلوب ہوتے ہیں۔ خدا ایک ہے اور ابدی ہے۔ ٹھیک اسی طرح سچائی بھی ایک ہے اور اسی کے ساتھ ابدی بھی۔

خطرہ کا الارم

زندگی کی حقیقت کیا ہے، عام آدمی اس قسم کے سوالات میں پڑنا پسند نہیں کرتا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یہاں عزت اور آرام کے ساتھ اپنی عمر پوری کرلو۔ اس کے بعد نہ تم ہوگے اور نہ تمھارا کوئی مسئلہ۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو اس سوال کے بارے میں سوچتے ہیں۔ مگر ان کا سوچنا فلسفیانہ انداز کا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ساری کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ سامنے کی دنیا کی کوئی نظریاتی توجیہہ حاصل کرلیں۔ اس قسم کی فلسفیانہ توجیہات، تعداد میں مختلف ہونے کے باوجود، صرف توجیہات ہیں۔ وہ آدمی کے لئے کوئی ذاتی مسئلہ پیدا نہیں کرتیں۔ ایک روح عالم اپنی تکمیل کے لئے پورے کارخانہ کو چلا رہی ہے یا تمام چیزیں کسی بالاتر وجود کے اجزا ہیں، اس قسم کی نظریاتی بحثوں سے ایک آدمی کا ذاتی تعلق کیا ہے۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے پاس اس سوال کا کوئی نہ کوئی مذہبی جواب ہے۔ مگر ان میں بھی آدمی کے لئے کوئی سنگینی کا پہلو نہیں۔ ان میں سے کسی کے نزدیک خدا کا بیٹا تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن چکا ہے۔ کسی کے نزدیک زندگی ہمارے شعور سے بالاتر ایک جبری چکر ہے۔ آدمی ایک جبری نظام کے تحت اپنے آپ باربار پیدا ہوتا ہے اور باربار مرتا ہے۔ کوئی بتاتا ہے کہ آدمی کی جو کچھ جزا و سزا ہے اسی دنیا کی زندگی میں ہے، وغیرہ۔

زندگی کے مسئلہ کے بارے میں اس قسم کے جتنے بھی جوابات ہیں وہ باہم ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ مگر اس حیثیت سے سب ایک ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو ایک ایک آدمی کے لئے ذاتی طور پر کوئی سنگین مسئلہ پیدا کرتا ہو۔ یہ جوابات یا تو جو کچھ ہو رہا ہے اس کی محض توجیہات ہیں یا ہمارے لئے صرف ایک قسم کی روحانی تسکین فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ وہ اس نوعیت کی کوئی چیز نہیں ہیں جس کو کسی بڑے خطرہ کا الارم کہا جائے۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ان تمام جوابات سے سراسر مختلف ہے۔ دوسرے جوابات میں سے کوئی جواب بھی آدمی کے لئے ذاتی سوال نہیں بنتا، وہ آدمی کے لئے کوئی نازک مسئلہ کھڑا نہیں کرتا۔ مگر پیغمبر اسلام کا جواب ایک ایک آدمی کو ایسے خطرناک کنارے پر کھڑا کر رہا ہے جس کے بعد اس کا اگلا قدم یا تو تباہی

کے خوفناک گڑھے میں پڑنے والا ہے یا کامیابی کی ابدی دنیا میں۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی آپ کے بارے میں انتہائی سنجیدہ ہو۔ وہ اندھیرے میں چلنے والے اس مسافر سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو جائے جس کی ٹارچ اچانک اس کو متنبہ کرے کہ اس کے سامنے عین اگلے قدم پر کالا سانپ رینگ رہا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیغام دیا وہ ساری دنیا کے لئے بہت بڑی چیتاونی ہے۔ آپ نے بتایا کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور وسیع تر دنیا آنے والی ہے جس کا نام آخرت ہے۔ وہاں ہر آدمی کا حساب لیا جائے گا اور ہر آدمی کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی عذاب ہوگا یا ابدی ثواب۔ موجودہ دنیا میں جو چیزیں آدمی کا سہارا بنی ہوئی ہیں ان میں سے کوئی چیز وہاں کسی کے کام نہیں آئے گی۔ وہاں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی قسم کی سفارش چلے گی (بقرہ ۲۵۴)

آپ کی یہ چیتاونی آپ کے وجود کو ہر شخص کا ذاتی سوال بنا دیتی ہے۔ اس کے مطابق ہر آدمی ایک انتہائی نازک انجام کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ وہ یا تو آپ کی خبر پر یقین کر کے آپ کی ہدایت کے مطابق ابدی جنت میں جانے کی تیاری کرے یا آپ کی خبر کو نظر انداز کر دے اور بے پروائی کی زندگی گزار کر ابدی جہنم کا خطرہ مول لے۔

یہاں دو چیزیں ہیں جو اس مسئلہ کو مزید سنجیدہ بنا رہی ہیں۔ آپ کے سوا دوسرے لوگ جو اس معاملہ میں کوئی بات کہہ رہے ہیں ان کا استناد حد درجہ مشتبہ ہے۔ وہ لوگ جو کمانے اور مرجانے کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کے پاس اپنے خیال کے لئے سرے سے کوئی دلیل نہیں۔ ان کا فکری ڈھانچہ کسی دلیل کے بغیر محض سطحی جذبات پر قائم ہے۔ فلسفیانہ انداز میں بات کرنے والے لوگوں کے پاس بھی دلیل کے نام سے صرف قیاسات ہیں۔ ان کو نہ اپنی رائے پر خود یقین حاصل ہے نہ وہ کوئی ایسی بات پیش کرتے جس کے اوپر دوسرا شخص یقین کر سکے۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو پیغمبروں اور مذہبی کتابوں کے حوالے سے بول رہے ہیں۔ یہ اصولی طور پر اپنے پیچھے ایک قابل اعتماد بنیاد رکھتے ہیں۔ مگر وہ جن کتابوں اور پیغمبروں کا حوالہ دیتے ہیں ان کا تعلق ماضی کے بہت پہلے گزرے ہوئے زمانہ سے ہے۔ ان کتابوں اور شخصیتوں کے بارے میں آج ہمارے پاس مستند معلومات موجود نہیں۔ اس لئے اصولی طور پر قابل اعتماد ذریعہ سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ

بجائے خود قابل اعتماد نہیں۔ ماضی کی کسی چیز کی صداقت کو جانچنے کا معیار تاریخ ہے اور ان تعلیمات کو تاریخ کی تصدیق حاصل نہیں۔

مگر پیغمبر اسلام کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ ایک طرف یہ کہ کسی شخص کے پیغمبر خدا ہونے کا جو بھی معیار مقرر کیا جائے، اس پر آپ کامل طور پر پورے اترتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں وہ تمام عناصر بتمام و کمال موجود ہیں جو خدا کے ایک پیغمبر میں ہونے چاہئیں۔ آپ کی پیغمبری ایک ایسا ثابت شدہ واقعہ ہے جس سے انکار کسی حال میں ممکن نہیں۔

دوسرے یہ کہ آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات اتنی صحت کے ساتھ آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں کہ ان کی تاریخی اعتباریت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کا دیا ہوا قرآن آج بھی اسی طرح لفظ بلفظ موجود ہے جس طرح آپ نے اس کو دیا تھا۔ آپ کا قول و عمل اس طرح صحت کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے جیسے کہ آج بھی آپ ہمارے سامنے بول رہے ہوں اور چل پھر رہے ہوں۔ بغیر کسی ادنیٰ شبہ کے آدمی آج بھی یہ معلوم کرسکتا ہے کہ آپ نے کیا کہا اور کیا کیا۔

پیغمبر کی چیتاونی کے مطابق ہم ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہیں جس کو ہم بدل نہیں سکتے۔ ہم مجبور ہیں کہ اس کا سامنا کریں۔ موت یا خودکشی سے بھی ہم معدوم نہیں ہوتے بلکہ صرف دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ کامیابی یا ناکامی کا ایک نقشہ خالق نے ابدی طور پر بنا دیا ہے۔ کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس خدائی نقشہ کو بدل دے یا اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ کرلے۔ ہم کو صرف یہ اختیار ہے کہ جنت یا جہنم میں سے کسی ایک کو چن لیں۔ ہم کو یہ اختیار نہیں کہ دونوں سے الگ ہو کر اپنے لئے کسی تیسرے انجام کی تخلیق کریں۔

رصدگاہ اگر بھونچال کی خبر دے تو یہ ایک ایسے آنے والے حادثہ کی خبر ہوتی ہے جس میں فیصلہ کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے، دوچار ہونے والے کو اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ آدمی یا تو اس سے بھاگ کر اپنے کو بچائے یا اس میں پڑ کر اپنے کو برباد کرلے۔ اسی طرح قیامت بھی ایک ایسا بھونچال ہے جس میں آدمی یا تو پیغمبر کی بتائی ہوئی تدبیر اختیار کرکے اپنے کو بچائے گا یا اس کو نظرانداز کرکے اپنے کو ابدی ہلاکت میں مبتلا کرے گا۔

پیغمبر خدا کی تعلیمات

خدا کا دین ایک دین ہے۔ تمام پیغمبروں کے ذریعہ ایک ہی دین ہمیشہ بھیجا جاتا رہا ہے۔ مگر انسان نے اپنی غفلت کی وجہ سے یا تو اس کو ضائع کر دیا یا اس کو بدل ڈالا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اسی خدائی دین کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ اور اس کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر کے ہمیشہ کے لئے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا گیا۔ اب تمام انسانوں کے لئے قیامت تک یہی مستند دین ہے۔ خدا کی قربت اور آخرت کی نجات حاصل کرنے کا اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

آپ نے بتایا کہ خدا ایک ہے۔ اس کا کسی بھی اعتبار سے کوئی شریک نہیں۔ اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اسی کو ہر قسم کی طاقتیں حاصل ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ صرف اسی کے آگے جھکے اور اسی کی عبادت کرے۔ اسی سے مانگے اور اسی سے امیدیں قائم کرے۔ خدا اگرچہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا مگر وہ انسان سے اتنا قریب ہے کہ جب بھی آدمی اس کو پکارتا ہے وہ اس کی پکار کو سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ خدا کے نزدیک کسی انسان کا یہ سب سے بڑا گناہ ہے کہ وہ کسی اعتبار سے کسی کو خدا کا شریک یا اس کے برابر ٹھہرائے۔

کوئی انسان یا غیر انسان ایسا نہیں جس کو خدا اور بندوں کے درمیان وسیلہ یا واسطہ کا مقام حاصل ہو۔ انسان جب بھی خدا کو یاد کرتا ہے، وہ براہ راست خدا سے مربوط ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنے خالق و مالک سے جڑنے کے لئے کسی درمیانی وسیلہ کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح آخرت میں بھی کوئی خدا کی عدالت میں کسی کا سفارشی نہیں بن سکتا۔ خدا اپنے ہر بندے کا فیصلہ خود اپنے علم کے مطابق کرے گا۔ کوئی نہیں جو اس کے فیصلہ پر اثر انداز ہو سکے۔ خدا اپنا فیصلہ کرنے میں کسی کا پابند نہیں۔ خدا کے تمام فیصلے حکمت اور انصاف کی بنیاد پر ہوتے ہیں نہ کہ سفارش یا تقرب کی بنیاد پر۔

خدا کی عبادت کوئی علیحدہ ضمیمہ نہیں ہے۔ یہ پوری زندگی کے ساتھ خدا کے آگے جھک جانا ہے۔ خدا کی عبادت کرنے والا وہی ہے جو خدا کا عابد اس طرح بنے کہ خدا ہی اس کا سب کچھ ہو جائے۔ وہ اسی کی پرستش کرے، اسی سے ڈرے، اسی کو چاہے، اسی سے امید باندھے، وہ اس کو اپنی تمام توجہات اور سرگرمیوں کا مرکز بنائے۔ خدا کی عبادت خدا کے سامنے کامل حوالگی کا نام ہے نہ کہ محض کسی رسم کی وقتی بجا آوری کا۔

بندوں کے درمیان رہتے ہوئے آدمی کو ہر وقت یہ یاد رکھنا چاہئے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور اپنے علم کے مطابق اس سے اس کی کارگزاری کا حساب لے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ آدمی ظلم، جھوٹ، بغض، گھمنڈ حسد، خود غرضی، بدمعاملگی، لوٹ کھسوٹ، دھاندلی، اور اس قسم کی دوسری اخلاقی برائیوں سے اپنے کو بچائے تاکہ خدا کی میزان میں وہ مجرم نہ ٹھہرے۔ اللہ سے ڈرنے والا بندوں کے معاملہ میں نڈر ہو کر نہیں رہ سکتا۔ جو لوگ بندوں کے ساتھ برا سلوک کریں گے ان کو خدا سے اپنے لئے اچھے سلوک کی امید نہ رکھنی چاہئے۔ خدا کے اچھے سلوک کا مستحق صرف وہ ہے جو خدا کے یہاں اس طرح پہنچے کہ اس نے خدا کے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہو۔

آپ نے بتایا کہ خدا کی زمین پر خدا کے بندوں کے لئے زندگی گزارنے کا صرف ایک ہی جائز طریقہ ہے۔ یہ کہ آدمی پوری زندگی اور تمام معاملات میں خدا کا فرماں بردار بن کر رہے۔ اس فرماں برداری کے آداب اور اصول قرآن میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کا عملی نمونہ موجود ہے۔ اب تمام انسانوں کے لئے خدا کی پسندیدہ زندگی صرف یہ ہے کہ وہ قرآن سے اپنے لئے ہدایت حاصل کرے اور پیغمبر کے نمونہ کو دیکھتے ہوئے اس کے مطابق زندگی گزارے

آپ نے جو دین پیش کیا ہے وہ آدمی کی پوری زندگی کے لئے ایک واضح نقشہ دیتا ہے اور ہر آدمی کو اسی نقشہ پر چلنا ہے۔ اس نقشہ کا ایک مختصر علامتی نظام پانچ خاص ارکان کی صورت میں مقرر کیا گیا ہے۔ یہ پانچ ارکان پوری اسلامی زندگی کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

اول کلمہ شہادت (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کا اقرار ہے۔ یہ کلمہ گویا وہ اعلان ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی ایک دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں داخل ہو گیا۔ وہ غیر اسلام کو چھوڑ کر اسلام کی صف میں آگیا۔ دوسری چیز نماز ہے۔ یعنی پیغمبر کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق روزانہ پانچ وقت خدا کی عبادت کرنا۔ تیسری چیز روزہ ہے۔ یعنی ہر سال رمضان میں پورے ایک مہینہ تک صبر و برداشت کا وہ عمل کرنا جس کو روزہ کہا جاتا ہے۔ چوتھی چیز زکوٰۃ ہے۔ یعنی آدمی اپنے مال میں سے مقرر طریقہ کے مطابق ہر سال خدا کا حق نکالے اور اس کو خدا کی مقرر کی ہوئی مدوں میں خرچ کرے۔ پانچویں چیز حج ہے۔ یعنی استطاعت کی صورت میں عمر میں کم از کم ایک بار بیت اللہ کا حج کرنا۔ آدمی جب یہ پانچ شرطیں پوری کرتا ہے تو وہ پیغمبر کی قائم کی ہوئی اسلامی برادری میں شامل ہو جاتا ہے۔

زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک زندگی وہ ہے جو آخرت کی بنیاد پر بنتی ہے۔ دوسری زندگی وہ ہے جو دنیا کی بنیاد پر بنتی ہے۔ آخرت کی بنیاد پر بننے والی زندگی میں رہنمائی کا مقام پیغمبر کو حاصل رہتا ہے۔ آدمی پیغمبر کے بتانے کے مطابق اپنا عقیدہ بناتا ہے اور اسی کے بتانے کے مطابق اپنی زندگی کو چلاتا ہے۔ اس کے برعکس جو زندگی دنیا کی بنیاد پر بنتی ہے اس میں آدمی اپنا رہنما آپ ہوتا ہے اور اپنی عقل یا نفس کے مطابق اپنے فکر و عمل کا ڈھانچہ بناتا ہے۔ پہلا اگر خدا کا پرستار ہوتا ہے تو دوسرا خود اپنا۔

پیغمبر کی رہنمائی میں جو زندگی بنتی ہے اس کے اجزاء ہوتے ہیں ——— خدا پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، قیامت اور زندگی بعد موت پر ایمان، جنت دوزخ پر ایمان، اللہ کے مالک اور حاکم ہونے پر ایمان۔ اس ایمانیات کے تحت جو انسان بنتا ہے وہ ایسا انسان ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیاں آخرت رخی بن جاتی ہیں۔ اس کی عبادت، اس کی قربانیاں، اس کا جینا اور اس کا مرنا سب اللہ اور رسول کے لئے ہو جاتا ہے۔

جو زندگی خود اپنی رہنمائی میں بنے وہ ایک آزاد اور بے قید زندگی ہوتی ہے، اس میں آدمی کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ اپنے خیالات کے مطابق دل پسند کا عقیدہ بنا لیتا ہے۔ اس کے صبح و شام خود اپنی عقل یا نفس کی رہنمائی میں بسر ہوتے ہیں۔ اس کی سرگرمیاں تمام تر دنیا کے فائدوں کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ ویسا بنتا ہے جیسا وہ خود بننا چاہتا ہے نہ کہ ویسا جو خدا اور رسول چاہتے ہیں کہ وہ بنے۔

جو لوگ کسی پچھلے پیغمبر کے نام پر کسی دین کو پکڑے ہوئے ہیں، ان کی مذہبیت یا خدا پرستی اس وقت تک معتبر نہیں جب تک وہ پیغمبر اسلام پر ایمان نہ لائیں۔ پیغمبر اسلام پر ایمان لانا گویا خود اپنے دین ہی کو زیادہ صحیح اور کامل صورت میں اختیار کرنا ہے۔ جو لوگ آپ کے اوپر ایمان نہ لائیں وہ اپنے اس عمل سے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ پیغمبر کے نام پر اپنی قومی روایات اور گروہی تعصبات کو اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔ جو لوگ قومی مذہب کے پرستار ہوں وہ آپ کے لائے ہوئے خدائی مذہب کو نہ پائیں گے۔ وہ اپنے تعصباتی پردہ کی وجہ سے اس سچائی کو نہ دیکھ سکیں گے جو خدا نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعہ ان کے لئے کھولی ہے۔ البتہ جو لوگ فی الواقع خدا اور پیغمبر کے ماننے والے ہوں ان کو پیغمبر اسلام کا دین خود اپنی ہی چیز معلوم ہوگا۔ وہ اس کو اس طرح لیں گے جس طرح کوئی اپنی کھوئی چیز کو دوڑ کر لے لیتا ہے۔

موت کی طرف

موت ہر ایک پر آتی ہے۔ کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔ تاہم موتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جب کہ آدمی اللہ کو اپنا مقصود بنائے ہوئے ہو۔ وہ اللہ کے لئے بولتا ہو اور اللہ کے لئے چپ ہوتا ہو۔ اس کی توجہ تمام تر آخرت کی طرف لگی ہوئی ہو۔ ایسے آدمی کے لئے موت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف سفر کر رہا تھا اور موت کے فرشتہ نے اس کے سفر کو مختصر کرکے اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جس نے اپنے مالک کو بھلا رکھا ہے۔ اس کا رکنا اور اس کا چلنا اللہ کے لئے نہیں ہوتا۔ وہ اپنے رب کو چھوڑ کر کسی اور طرف بھاگ رہا ہے۔ ایسے شخص کے لئے موت کا دن اس کی گرفتاری کا دن ہے۔ اس کی مثال اس باغی کی سی ہے جو چند دن سرکشی دکھلائے اور اس کے بعد اس کو پکڑ کر عدالت میں حاضر کر دیا جائے

بظاہر ایک ہی موت ہے جو دونوں آدمیوں پر آتی ہے۔ مگر دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا پھول اور آگ میں۔ ایک کے لئے موت رب العالمین کا مہمان بننا ہے اور دوسرے کے لئے موت رب العالمین کے قید خانہ میں ڈالا جانا۔ ایک کے لئے موت جنت کے باغوں میں داخلہ کا دروازہ ہے اور دوسرے کے لئے موت وہ دن ہے جب کہ اس کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ اپنی سرکشی کے جرم میں وہاں وہ ابدی طور پر جلتا رہے۔

مومن اور غیر مومن کی تعریف یہ ہے کہ مومن وہ ہے جس کی نگاہیں موت کے مسائل کی طرف لگی ہوئی ہوں، جو موت کے بعد آنے والی دنیا میں عزت حاصل کرنے کو اپنی تمام توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہو۔ اس کے برعکس غیر مومن وہ ہے جو زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہو، جو موجودہ دنیا میں عزت اور کامیابی حاصل کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہو۔ آج کے حالات میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب وہی ہے جو موجودہ دنیا میں اپنی جڑیں مضبوط کئے ہوئے ہو۔ مگر موت اس فریب کو مکمل طور پر پھاڑ دے گی۔ اس کے بعد اچانک یہ معلوم ہوگا کہ وہی شخص مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوا تھا جس کو دنیا والوں نے بے بنیاد سمجھ لیا تھا اور وہ تمام لوگ بالکل بے حقیقت تھے جو موت سے پہلے کے حالات میں بظاہر عزت اور ترقی کی بلندیوں پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ موت ہر چیز کو باطل کر دے گی اور اس کے بعد وہی چیز بچے گی جس کی عالم آخرت میں کوئی قیمت ہو —— سچائی کی پکار پر دھیان نہ دینا ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے صرف موت سے پہلے کی دنیا ہوتی ہے۔ آدمی اگر موت کے بعد کی دنیا کو دیکھ لے تو آج ہی وہ اس خدا کے آگے جھک جائے جس کے آگے اسے کل جھکنا ہے، اگرچہ کل کا جھکنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

آخری بات

ایک گھنٹہ گھر کسی چوراہے پر تعمیر کر دیا جائے تو ہر شخص اس میں وقت دیکھتا ہے اور اپنی گھڑیاں اس سے ملا لیتا ہے۔ کسی کو یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ جن کاریگروں اور انجینیروں نے اس کو نصب کیا ہے وہ مسلمان تھے یا غیر مسلمان۔ اپنی قوم کے تھے یا دوسری قوم کے۔ یا یہ کہ جو گھڑی اس میں لگائی گئی ہے وہ کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ اپنے ملک کی یا دوسرے کسی ملک کی۔ صرف اس بات کا یقین کہ اس سے صحیح وقت معلوم کیا جا سکتا ہے، ہر شخص کو اس کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ خدا کا دین بھی تمام انسانوں کی رہنمائی کے لئے اسی قسم کا ایک گھنٹہ گھر ہے۔ مگر یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس سے اپنے لئے رہنمائی حاصل کریں۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ لوگ وقت جاننے کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔ مگر خدا کی بات جاننے کے بارے میں سنجیدہ نہیں۔ خدا کے دین کا تعلق اگلی زندگی کے معاملہ سے ہے اور گھڑی کا تعلق آج کی زندگی کے معاملہ سے۔ لوگوں نے جس چیز کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے اس کے بارے میں گھڑی کی اہمیت انھیں معلوم ہے۔ مگر اگلی زندگی میں کامیابی کو انھوں نے اپنا مقصد ہی نہیں بنایا۔ پھر اس میں رہنمائی دینے والی چیز کی اہمیت کا احساس انھیں کیوں کر ہو۔

پھر خدا پرستی کا تقاضا صرف یہ نہیں ہے کہ اس کو مان لیا جائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ اپنے کو شامل کیا جائے۔ خدا پرستی اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک اندرونی حالت کا نام ہے مگر اسی کے ساتھ اس کی ایک ظاہری صورت بھی ہے۔ خدا کو پانا کسی آدمی کے لئے سخت تاثر کا سب سے بڑا واقعہ ہے اور شدت تاثر کبھی چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص پر خدا کی سچائی منکشف ہو تو وہ ضرور ظاہر ہو کر رہے گی۔ ایسا آدمی بے اختیار چاہے گا کہ اس کا پورا ماحول اس بات کا گواہ بن جائے کہ اس نے خدا کی پکار پر لبیک کہا اور مفاد اور مصلحت کے بتوں کو توڑ کر اس کا ساتھ دیا۔ اگر کوئی شخص قلبی ایمان کا مدعی ہو مگر وہ اعلان و اظہار سے گریز کرتا ہو تو یہ یقینی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مصلحتوں کا شکار ہے۔ اور جو لوگ خدا کے مقابلہ میں مصلحت کو ترجیح دیں وہ کبھی خدا کو نہیں پاتے۔ مصلحت اور تعصب خدا پرستی کی ضد ہیں۔ مصلحت اور تعصب کے ساتھ خدا پرستی کا ایک روح میں جمع ہونا ممکن نہیں۔

بس کھاؤ اس جانور میں سے جس پر اللہ کا نام لیا جائے، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔ اور کیا وجہ ہے کہ تم اس جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، حالانکہ خدا نے تفصیل سے بیان کردی ہیں وہ چیزیں جن کو اس نے تم پر حرام کیا ہے۔ سوا اس کے کہ اس کے لئے تم مجبور ہو جاؤ۔ اور یقیناً بہت سے لوگ اپنی خواہشات کی بنا پر گم راہ کرتے ہیں بغیر کسی علم کے۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے حد سے نکل جانے والوں کو۔ اور تم گناہ کے ظاہر کو بھی چھوڑ دو اور اس کے باطن کو بھی۔ جو لوگ گناہ کما رہے ہیں ان کو جلد بدلہ مل جائے گا اس کا جو وہ کر رہے تھے۔ اور تم اس جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ یقیناً یہ بے حکمی ہے اور شیاطین القا کر رہے ہیں اپنے ساتھیوں کو تاکہ وہ تم سے جھگڑیں۔ اور اگر تم ان کا کہا مانو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے ۱۲۱ — ۱۱۸

دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب ہمارے لئے "مال غیر" ہے۔ کیونکہ سب کا سب خدا کا ہے۔ اس کو اپنے لئے جائز کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس کو خدا کے بتائے ہوئے طریقے سے حاصل کیا جائے اور اس کو خدا کے بتائے ہوئے طریقہ سے استعمال کیا جائے۔ یہی معاملہ جانوروں کا بھی ہے۔

جانور ہمارے لئے قیمتی خوراک ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کو خوراک بنانے کا حق ہم کو کیسے ملا۔ جانور کو خدا بناتا ہے اور وہی اس کو پرورش کرکے تیار کرتا ہے۔ پھر ہمارے لئے کیسے جائز ہوا کہ ہم اس کو اپنی خوراک بنائیں۔ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اسی سوال کا جواب ہے۔ اللہ کا نام لینا کوئی لفظی رسم نہیں۔ یہ در اصل جانور کے اوپر خدا کی مالکانہ حیثیت کو تسلیم کرنا اور اس کے عطیہ پر خدا کا شکر ادا کرنا ہے۔ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اسی اعتراف و تشکر کی ایک علامت ہے اور یہی اعتراف و تشکر وہ "قیمت" ہے جس کو ادا کرنے سے مالک کے نزدیک اس کا ایک جانور ہمارے لئے حلال ہو جاتا ہے۔ تاہم جس کو اتفاقی مجبوری پیش آجائے اس کو اس پابندی سے آزاد کر دیا گیا ہے۔

جب آدمی حرام و حلال اور جائز و ناجائز میں خدا کا حکم چھوڑتا ہے تو اس کے بعد توہمات اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ لوگ توہماتی خیالات کی بنا پر اشیاء کے بارے میں طرح طرح کی رائیں قائم کر لیتے ہیں۔ ان توہمات کے پیچھے کچھ خود ساختہ فلسفے ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد پر ان کے کچھ ظواہر قائم ہو تے ہیں۔ جو لوگ اللہ کے فرماں بردار بننا چاہیں ان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان توہمات کو فکری اور عملی دونوں اعتبار سے مکمل طور پر چھوڑ دیں۔

کھانے پینے اور دوسرے امور میں ہر قوم کا ایک رواجی دین بن جاتا ہے۔ اس رواجی دین کے بارے میں لوگوں کے جذبات بہت شدید ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے حق میں اسلاف اور بزرگوں کی تصدیقات شامل رہتی ہیں۔ اس سے ہٹنا بزرگوں کے دین سے ہٹنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اس لئے جب حق کی دعوت اس رواجی دین سے ٹکراتی ہے تو حق کی دعوت کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ وقت کے بڑے ایسی خوش کن باتیں نکالتے ہیں جن سے وہ اپنے عوام کو مطمئن کر سکیں کہ تمہارا رواجی دین صحیح ہے اور یہ "نیا دین" بالکل باطل ہے۔ مگر اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ قیامت میں جب وہ حقیقتوں کو کھولے گا تو ہر آدمی دیکھ لے گا کہ وہ حقیقت کی زمین پر کھڑا تھا یا توہمات کی زمین پر۔

کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، اس سے نکلنے والا نہیں۔ اس طرح کافروں کی نظر میں ان کے اعمال خوش نما بنا دئے گئے ہیں۔ اور اس طرح ہر بستی میں ہم نے گنہگاروں کے سردار رکھ دئے ہیں کہ وہ وہاں حیلے کریں۔ حالاں کہ وہ جو حیلہ کرتے ہیں اپنے ہی خلاف کرتے ہیں مگر وہ اس کو نہیں سمجھتے۔ اور جب ان کے پاس کوئی نشان آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک ہم کو بھی وہی نہ دیا جائے جو خدا کے پیغمبروں کو دیا گیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کس کو بخشے۔ جو لوگ مجرم ہیں ضرور ان کو اللہ کے یہاں ذلت نصیب ہوگی اور سخت عذاب بھی، اس وجہ سے کہ وہ مکر کرتے تھے ۱۲۲-۲۴

اللہ کی نظر میں وہ شخص زندہ ہے جس کے سامنے ہدایت کی روشنی آئی اور اس نے اس کو اپنے راستہ کی روشنی بنالیا۔ اس کے مقابلہ میں مردہ وہ ہے جو ہدایت کی روشنی سے محروم ہو کر باطل کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہو۔

مردہ آدمی اوہام و تعصبات کے جال میں اتنا پھنسا ہوا ہوتا ہے کہ سیدھے اور سچے حقائق اس کے ذہن کی گرفت میں نہیں آتے۔ وہ اشیاء کی ماہیت سے اتنا بے خبر ہوتا ہے کہ لفظی بحث اور حقیقی کلام میں فرق نہیں کر پاتا۔ وہ اپنی بڑائی کے تصور میں اتنا ڈوبا ہوا ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کی طرف سے آئی ہوئی سچائی کا اعتراف کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن پر رواجی خیالات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ ان سے ہٹ کر کسی اور معیار پر وہ چیزوں کو جانچ نہیں پاتا۔ اپنی ان کمزوریوں کی بنا پر وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہتا ہے، بظاہر زندہ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک مردہ انسان بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس جو شخص ہدایت کے لئے اپنا سینہ کھول دیتا ہے وہ ہر قسم کی نفسیاتی گرہوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ سچائی کو پہچاننے میں اسے ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ الفاظ کے پردے کبھی اس کے لئے حقیقت کا چہرہ دیکھنے میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ ذوق اور عادت کے مسائل اس کی زندگی میں کبھی یہ مقام حاصل نہیں کرتے کہ اس کے اور حق کے درمیان حائل ہو جائیں۔ سچائی اس کے لئے ایک ایسی روشن حقیقت بن جاتی ہے جس کو دیکھنے میں اس کی نظر کبھی نہ چوکے اور جس کو پانے کے لئے وہ کبھی سست ثابت نہ ہو۔ وہ خود بھی حق کی روشنی میں چلتا ہے اور دوسروں کو بھی اس میں چلانے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ لوگ جو خود ساختہ چیزوں کو خدا کا مذہب بتا کر عوام کا مرجع بنے ہوئے ہوتے ہیں وہ ہر ایسی آواز کے دشمن بن جاتے ہیں جو لوگوں کو سچے دین کی طرف پکارے۔ ایسی ہر آواز ان کو اپنے خلاف بے اعتمادی کی تحریک دکھائی دیتی ہے۔ یہ وقت کے بڑے لوگ حق کی دعوت میں ایسے شوشے نکالتے ہیں جس سے وہ عوام کو اس سے متاثر ہونے سے روک سکیں۔ وہ حق کے دلائل کو غلط رخ دے کر عوام کو شبہات میں مبتلا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بے بنیاد باتوں کے ذریعہ داعی کی ذات کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کی کوششیں صرف ان کے جرم کو بڑھاتی ہیں، وہ داعی اور دعوت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں ——— حق پرست وہ ہے جو حق کو اس وقت دیکھ لے جب کہ اس کے ساتھ دنیوی عظمتیں شامل نہ ہوئی ہوں۔ دنیوی عظمت والے حق کو ماننا در اصل دنیوی عظمتوں کو ماننا ہے نہ کہ خدا کی طرف سے آئے ہوئے حق کو۔

اللہ جس کو چاہتا ہے کہ ہدایت دے تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے تو اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے، جیسے اس کو آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہو۔ اس طرح اللہ گندگی ڈال دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔ اور یہ تمھارے رب کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے واضح کر دی ہیں نشانیاں غور کرنے والوں کے لئے۔ انھیں کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے رب کے پاس۔ اور وہ ان کا مددگار ہے اس عمل کے سبب سے جو وہ کرتے رہے ۱۲۵ ـ ۲۷

حق اپنی ذات میں اتنا واضح ہے کہ اس کا سمجھنا کبھی کسی آدمی کے لئے مشکل نہ ہو۔ پھر بھی ہر زمانہ میں بے شمار لوگ حق کی وضاحت کے باوجود حق کو قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ ان کے اندر کی وہ رکاوٹیں ہیں جو وہ اپنی نفسیات میں پیدا کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو مقدس ہستیوں سے اتنا زیادہ وابستہ کر لیتا ہے کہ ان کو چھوڑتے ہوئے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل برباد ہو جائے گا۔ کسی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنی مصلحتوں کا نظام ٹوٹنے کا اندیشہ اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتا ہے کہ اس کے لئے حق کی طرف اقدام کرنا ممکن نہیں رہتا۔ کسی کو نظر آتا ہے کہ حق کو ماننا اپنی بڑائی کے مینار کو اپنے ہاتھ سے ڈھا دینا ہے۔ کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ ماحول کے رواج کے خلاف ایک بات کو اگر میں نے مان لیا تو میں سارے ماحول میں اجنبی بن کر رہ جاؤں گا۔ اس طرح کے خیالات آدمی کے اوپر اتنا مسلط ہو جاتے ہیں کہ حق کو ماننا اس کو ایک بے حد مشکل بلندی پر چڑھائی کے ہم معنی نظر آنے لگتا ہے جس کو دیکھ کر ہی آدمی کا دل تنگ ہونے لگتا ہو۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا نہیں ہوتے، جو حق کو ہر دوسری چیز سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے سے سچے متلاشی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے جب حق ان کے سامنے آتا ہے تو بلا تاخیر وہ اس کو پہچان لیتے ہیں اور تمام عذرات اور اندیشوں کو نظر انداز کر کے اس کو قبول کر لیتے ہیں۔

خدا اپنے حق کو نشانیوں (اشاراتی حقائق) کی صورت میں لوگوں کے سامنے لاتا ہے۔ اب جو لوگ اپنے دلوں میں کمزوریاں لئے ہوئے ہیں وہ ان اشارات کی خود ساختہ تاویل کر کے اپنے لئے اس کو نہ ماننے کا جواز بنا لیتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے سینے کھلے ہوتے ہیں وہ اشارات کو ان کی اصل گہرائیوں کے ساتھ پا لیتے ہیں اور ان کو اپنے ذہن کی غذا بنا لیتے ہیں۔ ان کی زندگی فی الفور اس سیدھے راستہ پر چل پڑتی ہے جو خدا کی براہ راست رہنمائی میں طے ہوتا ہے اور بالآخر آدمی کو ابدی کامیابی کے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

خدا کے یہاں جو کچھ قیمت ہے وہ عمل کی ہے نہ کہ کسی اور چیز کی۔ جو شخص عملی طور پر خدا کی فرماں برداری اختیار کرے گا وہی اس قابل ٹھیرے گا کہ خدا اس کی دست گیری کرے اور اس کو اپنے سلامتی کے گھر تک پہنچا دے۔ یہ سلامتی کا گھر خدا کی جنت ہے جہاں آدمی ہر قسم کے دکھ اور آفت سے محفوظ رہ کر ابدی سکون کی زندگی گزارے گا۔ خدا کی یہ مدد افراد کو ان کے عمل کے مطابق موت کے بعد آنے والی زندگی میں ملے گی۔ لیکن اگر افراد کی قابل لحاظ تعداد دنیا میں خدا کی فرماں بردار بن جائے تو ایسی جماعت کو دنیا میں بھی اس کا ایک حصہ دے دیا جاتا ہے۔

اور جس دن اللہ ان سب کو جمع کرے گا، اے جنوں کے گروہ تم نے بہت سے لے لئے انسانوں میں سے۔ اور انسانوں میں سے ان کے ساتھی کہیں گے اے ہمارے رب، ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا اور ہم پہنچ گئے اپنے اس وعدہ کو جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا۔ خدا کہے گا اب تمھارا ٹھکانا آگ ہے، ہمیشہ اس میں رہو گے مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک تمھارا رب حکمت والا علم والا ہے۔ اور اسی طرح ہم ساتھ ملا دیں گے گنہ گاروں کو ایک دوسرے سے، بہ سبب ان اعمال کے جو وہ کرتے تھے۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمھارے پاس تمھیں میں سے پیغمبر نہیں آئے جو تم کو میری آیتیں سناتے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے۔ وہ کہیں گے ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا۔ اور وہ اپنے خلاف خود گواہی دیں گے کہ بے شک ہم منکر تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ تمھارا رب بستیوں کو ان کے ظلم پر اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں کہ وہاں کے لوگ بے خبر ہوں ۱۲۸-۱۳۱

کسی کے گمراہ کرنے سے جب کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو یہ یک طرفہ معاملہ نہیں ہوتا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا مقصد پورا کر رہے ہیں۔ شیطان جب آدمی کو سبز باغ دکھا کر اپنی طرف لے جاتا ہے تو وہ اپنے اس چیلنج کو صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے جو اس نے آغاز تخلیق میں خدا کو دیا تھا کہ میں تیری مخلوق کے بڑے حصہ کو اپنا ہم نوا بنا لوں گا (بنی اسرائیل ۶۱) دوسری طرف جو لوگ اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کرتے ہیں ان کے سامنے بھی واضح مفادات ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ جنوں کے نام پر اپنے سحر کے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں یا اپنی شاعری اور کہانت کا رشتہ کسی جنی استاد سے جوڑ کر عوام کے اوپر اپنی برتری قائم کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام تحریکیں جو شیطانی ترغیبات کے تحت اٹھتی ہیں، ان کا ساتھ دینے والے بھی اسی لئے ان کا ساتھ دیتے ہیں کہ ان کو امید ہوتی ہے کہ اس طرح عوام کے اوپر آسانی کے ساتھ وہ اپنی قیادت قائم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ خدائی پکار کے مقابلہ میں شیطانی نعرے ہمیشہ عوام کی بھیڑ کے لئے زیادہ پرکشش ثابت ہوئے ہیں۔

قیامت میں جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا تو یہ بات کھل جائے گی کہ جو لوگ بے راہ ہوئے یا جنھوں نے دوسروں کو بے راہ کیا انھوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ حق کو نظر انداز کرنا تھا نہ کہ حق سے بے خبر رہنا۔ وہ دنیوی تماشوں سے اوپر نہ اٹھ سکے، وہ وقتی فائدوں کو قربان نہ کر سکے۔ ورنہ خدا نے اپنے خاص بندوں کے ذریعہ جو ہدایت کھولی تھی وہ اتنی واضح تھی کہ کوئی شخص حقیقت حال سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر ان کی دنیا پرستی ان کی آنکھوں کا پردہ بن گئی۔ جاننے کے باوجود انھوں نے نہ جانا۔ سننے کے باوجود انھوں نے نہ سنا۔

آخرت میں وہ مصنوعی سہارے ان سے چھن جائیں گے جن کے بل پر وہ حقیقت سے بے پروا بنے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کو نظر آ جائے گا کہ کس طرح ایسا ہوا کہ حق ان کے سامنے آیا مگر انھوں نے جھوٹے الفاظ بول کر اس کو رد کر دیا۔ کس طرح ان کی غلطی ان پر واضح کی گئی مگر خوبصورت تاویل کر کے انھوں نے سمجھا کہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

اور ہر شخص کا درجہ ہے اس کے عمل کے لحاظ سے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں۔ اور تمہارا رب بے نیاز، رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو اٹھالے اور تمہارے بعد جس کو چاہے تمہاری جگہ لے آئے، جس طرح اس نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ آکر رہے گی اور تم خدا کو عاجز نہیں کرسکتے۔ کہو، اے لوگو تم عمل کرتے رہو اپنی جگہ پر، میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ تم جلد ہی جان لوگے کہ انجام کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ یقیناً ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے ۱۳۲ - ۳۵

دنیا کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اور دوسرے شخص کے مرتبہ میں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق ٹھیک اس تناسب سے ہوتا ہے جو ایک آدمی اور دوسرے آدمی کی جدوجہد میں پایا جاتا ہے۔ کسی آدمی کی دانش مندی، اس کی محنت، مصلحتوں کے ساتھ اس کی رعایت جس درجہ کی ہوتی ہے اسی درجہ کی کامیابی اس کو یہاں حاصل ہوتی ہے۔ ایسا ہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ آخرت میں درجات اور مقامات کی تقسیم ٹھیک اسی تناسب سے ہوگی جس تناسب سے کسی آدمی نے دنیا میں اس کے لئے عمل کیا ہے۔ آخرت کے لئے بھی آدمی کو اسی طرح وقت اور مال خرچ کرنا ہے جس طرح وہ دنیا کے لئے اپنے وقت اور مال کو خرچ کرتا ہے۔ آخرت کے معاملہ میں بھی اس کو اسی طرح ہوشیاری دکھانی ہے جس طرح وہ دنیا کے معاملہ میں ہوشیاری دکھاتا ہے۔ آخرت کی باتوں میں بھی اس کو مصلحتوں اور نزاکتوں کی اسی طرح رعایت کرنا ہے جس طرح وہ دنیا کی باتوں میں مصلحتوں اور نزاکتوں کی رعایت کرتا ہے۔ جس خدا کے ہاتھ میں آخرت کا فیصلہ ہے وہ ایک ایک شخص کے احوال سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا کہ وہ ہر ایک کو وہی دے جو اس کے استحقاق کے بقدر اس کو ملنا چاہئے۔

خدا نے امتحان اور عمل کی یہ جو دنیا بنائی ہے اس کے ذریعہ اس نے انسان کے لئے ایک قیمتی امکان کھولا ہے۔ وہ چند دن کی زندگی میں اچھے عمل کا ثبوت دے کر ابدی زندگی میں اس کا انعام پا سکتا ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے سے خدا کا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ موجودہ لوگ اگر اس کے تخلیقی منصوبہ کو قبول نہ کریں تو خدا کو اس کی پروا نہیں۔ وہ ان کی جگہ دوسروں کو اٹھا سکتا ہے جو اس کے تخلیقی منصوبہ کو مانیں اور اپنے آپ کو اس کے ساتھ شامل کریں۔ حتیٰ کہ وہ ریگستان کے ذروں اور درخت کے پتوں کو اپنے وفادار بندوں کی حیثیت سے کھڑا کر سکتا ہے۔

ایک ایسی دنیا جو سراسر حق اور انصاف پر قائم ہو وہاں ظالموں اور سرکشوں کو چھوٹ ملنا خود ہی بتا رہا ہے کہ یہ چھوٹ کوئی انعام نہیں ہے بلکہ ان کو ان کے آخری انجام تک پہنچانے کے لئے ہے۔ جو شخص حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور اس کے باوجود بظاہر اس کا کچھ نہیں بگڑتا اس کو اس صورت حال پر خوش نہیں ہونا چاہئے۔ یہ حالت سراسر وقتی ہے۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ آدمی سے وہ سب کچھ چھین لیا جائے جس کے بل پر وہ سرکشی کر رہا ہے اور اس کو ہمیشہ کے لئے ایک ایسی بربادی میں ڈال دیا جائے جہاں سے کبھی اسے نکلنا نہ ہو، جہاں نہ دوبارہ عمل کا موقع ہو اور نہ اپنے عمل کے انجام سے اپنے کو بچانے کا۔

اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کئے اس میں سے انھوں نے خدا کا کچھ حصہ مقرر کیا ہے۔ پس وہ کہتے ہیں کہ یہ حصہ اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ حصہ ہمارے شریکوں کا ہے۔ پھر جو حصہ ان کے شریکوں کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو حصہ اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اور اس طرح بہت سے مشرکوں کی نظر میں ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوش نما بنا دیا ہے تاکہ ان کو برباد کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس ان کو چھوڑ دو کہ اپنی افترا میں لگے رہیں ۱۳۶ ـ ۳۷

مشرکین میں یہ رواج تھا کہ وہ فصل اور مویشی میں سے اللہ کا اور بتوں کا حصہ نکالتے۔ اگر وہ دیکھتے کہ خدا کے حصہ کا جانور یا غلہ اچھا ہے تو اس کو بدل کر بتوں کی طرف کر دیتے۔ مگر بتوں کا اچھا ہوتا تو اس کو خدا کی طرف نہ کرتے۔ پیداوار کی تقسیم کے وقت بتوں کے نام کا کچھ حصہ اتفاقاً اللہ کے حصہ میں مل جاتا تو اس کو الگ کر کے بتوں کی طرف لوٹا دیتے۔ اور اللہ کے نام کا کچھ حصہ بتوں کی طرف چلا جاتا تو اس کو نہ لوٹاتے۔ اسی طرح اگر کبھی نذر و نیاز کا غلہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو خدا کا حصہ لے لیتے مگر بتوں کے حصہ کو نہ چھوتے۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل ہو جائے۔ کہنے کے لئے وہ خدا کو مانتے تھے مگر ان کا اصل یقین اپنے بتوں کے اوپر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی محسوس بتوں کو اسی لئے گھڑتا ہے کہ اس کو غیر محسوس خدا پر پورا بھروسہ نہیں ہوتا۔

یہی حال ہر اس شخص کا ہوتا ہے جو زبان سے تو اللہ کو مانتا ہو مگر اس کا دل اللہ کے سوا کہیں اور اٹکا ہوا ہو۔ جو لوگ کسی زندہ یا مردہ ہستی کو اپنی عقیدتوں کا مرکز بنا لیں ان کا حال بھی یہی ہوتا ہے کہ جو وقت ان کے یہاں خدا کی یاد کا ہے اس میں تو وہ اپنے "شریک" کی یاد کو شامل کر لیتے ہیں۔ مگر جو وقت ان کے نزدیک اپنے شریک کی یاد کا ہے اس میں خدا کا تذکرہ انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ شیفتگی اور وارفتگی کا جو حصہ خدا کے لئے ہونا چاہئے اس کا کوئی جزء وہ بآسانی اپنے شریکوں کو دے دیں گے۔ مگر اپنے شریک کے لئے وہ جس شیفتگی اور وارفتگی کو ضروری سمجھتے ہیں اس کا کوئی حصہ کبھی خدا کو نہیں پہنچے گا۔ جو مجلس خدا کی عظمت و کبریائی بیان کرنے کے لئے منعقد کی جائے اس میں ان کے شریکوں کی عظمت و کبریائی کا بیان تو کسی نہ کسی طرح داخل ہو جائے گا۔ مگر جو مجلس اپنے شریکوں کی عظمت و کبریائی کا چرچا کرنے کے لئے ہو وہاں خدا کی عظمت و کبریائی کا کوئی گزر نہ ہوگا۔

ان شریکوں کی اہمیت کبھی ذہن پر اتنا زیادہ غالب آتی ہے کہ آدمی اپنی اولاد تک کو اس کے لئے نثار کر دیتا ہے۔ اپنی اولاد کو خدا کے لئے پیش کرتا ہو تو وہ پیش نہیں کرے گا مگر اپنے شریکوں کی خدمت میں انھیں دینا ہو تو وہ خوشی اس کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی تمام چیزیں خدا کے دین کے نام پر کی جاتی ہیں مگر حقیقۃً وہ افترا ہیں۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے جس کو خدا نے کبھی تعلیم نہیں کیا

اور کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیتی ممنوع ہے، انھیں کوئی نہیں کھا سکتا سوا اس کے جس کو ہم چاہیں، اپنے گمان کے مطابق۔ اور فلاں چوپائے ہیں کہ ان کی پیٹھ حرام کردی گئی ہے اور کچھ چوپائے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یہ سب انھوں نے اللہ پر افترا کیا ہے۔ اللہ جلد ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو فلاں قسم کے جانوروں کے پیٹ میں ہے وہ ہمارے مردوں کے لئے خاص ہے اور وہ ہماری عورتوں کے لئے حرام ہے۔ اگر وہ مُردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ اللہ جلد ان کو اس کہنے کی سزا دے گا۔ بے شک اللہ حکمت والا علم والا ہے۔ وہ لوگ گھاٹے میں پڑ گئے جنھوں نے اپنی اولاد کو قتل کیا نادانی سے بغیر کسی علم کے۔ اور انھوں نے اس رزق کو حرام کرلیا جو اللہ نے ان کو دیا تھا، اللہ پر بہتان باندھتے ہوئے۔ وہ گمراہ ہوگئے اور ہدایت پانے والے نہ بنے ۱۳۸-۱۴۰

قدیم عرب کے لوگ اپنے مذہب کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی طرف منسوب کرتے تھے۔ مگر عملاً ان کے یہاں جو مذہب تھا وہ ایک خود ساختہ مذہب تھا جو ان کے پیشواؤں نے گھڑ کر ان کے درمیان رائج کر دیا تھا۔ پیداوار اور چوپایوں کی جو نذریں خدا یا اس کے شریکوں کے نام پر پیش ہوتیں ان کے لئے ان کے یہاں بہت سی کڑی پابندیاں تھیں۔ مثلاً بحیرہ یا سائبہ (جانوروں) کو اگر ذبح کیا اور اس کے پیٹ سے زندہ بچہ نکلا تو اس کا گوشت صرف مرد کھائیں، عورتیں نہ کھائیں۔ اور اگر بچہ مردہ حالت میں ہو تو اس کو مرد عورت دونوں کھا سکتے ہیں۔ اسی طرح بعض جانوروں کی پیٹھ پر سوار ہونا یا ان کے اوپر بوجھ لادنا ان کے نزدیک حرام تھا۔ بعض جانوروں کی نسبت ان کا عقیدہ تھا کہ ان پر سوار ہوتے وقت یا ان کو ذبح کرتے وقت یا ان کا دودھ نکالتے وقت خدا کا نام نہیں لینا چاہئے۔

ایسے لوگ دین کے اصل تقاضے (اللہ سے تعلق اور آخرت کی فکر) سے انتہائی حد تک دور ہوتے ہیں۔ وہ روزانہ اللہ کے حدود کو توڑتے رہتے ہیں۔ البتہ کچھ غیر متعلق ظاہری چیزوں میں تشدد کی حد تک قواعد وضوابط کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ شیطان کی نہایت گہری چال ہے۔ وہ لوگوں کو اصل دین سے دور کرکے کچھ دوسری چیزوں کو دین کے نام پر ان کے درمیان جاری کر دیتا ہے اور ان میں شدت کی نفسیات پیدا کرکے آدمی کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ کمال احتیاط کی حد تک خدا کے دین پر قائم ہے۔ عبادت کے ظواہر میں تشدد بھی اسی خاص نفسیات کی پیداوار ہے۔ آدمی خشوع اور تضرع سے خالی ہوتا ہے اور بعض ظاہری آداب کا شدید التزام کرکے سمجھتا ہے کہ اس نے کمال ادائگی کی حد تک عبادت کا فعل انجام دے دیا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کی گمراہی اس سے واضح ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے قتل اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو درست سمجھ لیا۔ وہ خدا کے پاکیزہ رزق سے لوگوں کو محروم کر دیتے ہیں۔ وہ معمولی مسائل پر لڑتے ہیں اور ان بڑی چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کی اہمیت کو عقل عام کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے باغ پیدا کئے، کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور کچھ نہیں چڑھائے جاتے۔ اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ اس کے کھانے کی چیزیں مختلف ہوتی ہیں اور زیتون اور انار باہم ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ وہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو اس کے کاٹنے کے دن۔ اور اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس نے مویشیوں میں بوجھ اٹھانے والے پیدا کئے اور زمین سے لگے ہوئے بھی۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمھیں دی ہیں۔ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے ۱۴۱ — ۱۴۲

خدا نے انسان کے لئے طرح طرح کی غذائیں پیدا کی ہیں۔ کچھ چیزیں وہ ہیں جو زمین میں پھیلتی ہیں۔ مثلاً خربوزے، سبزیاں وغیرہ۔ کچھ چیزیں وہ ہیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ مثلاً انگور وغیرہ۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اپنے تنہ پر کھڑی رہتی ہیں۔ مثلاً کھجور، آم وغیرہ۔ اسی طرح آدمی کی ضرورت کے لئے مختلف قسم کے چھوٹے بڑے جانور پیدا کئے۔ مثلاً اونٹ گھوڑے اور بھیڑ بکریاں۔

آدمی ایک علیحدہ مخلوق ہے اور بقیہ چیزیں علیحدہ مخلوق۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ پیدا ہوئے ہیں۔ مگر انسان دیکھتا ہے کہ دونوں میں زبردست ہم آہنگی ہے۔ آدمی کے جسم کو اگر غذائیت درکار ہے تو اس کے باہر ہرے بھرے درختوں میں حیرت انگیز قسم کے غذائی پیکٹ لٹک رہے ہیں۔ اگر اس کی زبان میں مزہ کا احساس پایا جاتا ہے تو پھلوں کے اندر اس کی تسکین کا اعلیٰ سامان موجود ہے۔ اگر اس کی آنکھوں میں حسن نظر کا ذوق ہے تو قدرت کا پورا کارخانہ حسن اور دل کشی کا مرقع بنا ہوا ہے۔ اگر اس کو سواری اور بار برداری کے ذرائع درکار ہیں تو یہاں ایسے جانور موجود ہیں جو اس کے لئے نقل وحمل کا ذریعہ بھی بنیں اور اسی کے ساتھ اس کے لئے قیمتی غذا بھی فراہم کریں۔ اس طرح کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ توحید کا اعلان بن گئی ہے۔ کیونکہ کائنات کے مختلف مظاہر میں یہ وحدت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کا خالق و مالک ایک ہو۔

آدمی جب دیکھتا ہے کہ اتنا عظیم کائناتی اہتمام اس کے کسی ذاتی استحقاق کے بغیر ہو رہا ہے تو اس یک طرفہ انعام پر اس کا دل شکر کے جذبہ سے بھر جاتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ سارا معاملہ آدمی کے لئے تقویٰ کی غذا بن جاتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ ہر عنایت (Privilege) کے ساتھ ذمہ داری (Responsibility) ہو۔ یہ چیز آدمی کو جزا وسزا کی یاد دلاتی ہے اور اس کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ دنیا میں اس احساس کے ساتھ رہے کہ ایک دن اس کو خدا کے سامنے حساب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ یہ احساسات اگر حقیقی طور پر آدمی کے اندر جاگ اٹھیں تو لازمی طور پر اس کے اندر دو باتیں پیدا ہوں گی۔ ایک یہ کہ اس کو جو کچھ ملے گا اس میں وہ اپنے مالک کا حق بھی سمجھے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ صرف واقعی ضرورت کے بقدر خرچ کرے گا نہ کہ فضول اور بے موقع خرچ کرنے لگے۔ مگر شیطان یہ کرتا ہے کہ اصل رخ سے آدمی کا ذہن موڑ کر اس کو دوسری غیر متعلق باتوں میں الجھا دیتا ہے۔

اللہ نے آٹھ جوڑے پیدا کیے۔ دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ پوچھو کہ دونوں نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ۔ یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں۔ مجھے دلیل کے ساتھ بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پوچھو کہ دونوں نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ۔ یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا تھا۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے تاکہ وہ لوگوں کو بہکا دے بغیر علم کے۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔ کہو، مجھ پر جو وحی آئی ہے اس میں تو میں کوئی چیز نہیں پاتا جو حرام ہو کسی کھانے والے پر سوا اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے۔ یا ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ لیکن جو شخص بھوک سے بے اختیار ہو جائے، نہ نافرمانی کرے اور نہ زیادتی کرے، تو تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے ۱۴۳-۴۵

عربوں میں گوشت اور دودھ وغیرہ کے لئے جو جانور پالے جاتے تھے ان میں سے چار زیادہ معروف تھے۔ بھیڑ بکری اور اونٹ گائے۔ ان کے بارے میں انھوں نے طرح طرح کے تحریمی قاعدے بنائے تھے۔ مگر ان تحریمی قاعدوں کے پیچھے اپنے مشرکانہ رواجوں کے سوا کوئی دلیل ان کے پاس نہ تھی۔ بھیڑ اور بکری اور اونٹ اور گائے، خواہ نر ہوں یا مادہ، عقلی طور پر کوئی سبب حرمت ان کے اندر موجود نہیں ہے، ان کا تمام کا تمام گوشت انسان کی بہترین غذا ہے۔ ان میں کوئی ایسی ناپاک عادت بھی نہیں جو ان کے بارے میں انسانی طبیعت میں کراہت پیدا کرتی ہو۔ آسمان سے اترے ہوئے علم میں بھی ان کی حرمت کا ذکر نہیں۔

پھر کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ان حیوانات کے بارے میں لوگوں کے اندر طرح طرح کے تحریمی قاعدے بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ شیطانی ترغیبات ہیں۔ انسان کے اندر فطری طور پر خدا کا شعور اور حرام وحلال کا احساس موجود ہے۔ آدمی اپنے اندرونی تقاضے کے تحت کسی ہستی کو اپنا خدا بنانا چاہتا ہے اور چیزوں میں جائز ناجائز کا فرق کرنا چاہتا ہے۔ شیطان اس حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسان کو اگر سادہ حالات میں عمل کرنے کا موقع ملا تو وہ فطرت کے صحیح راستہ کو پکڑ لے گا۔ اس لئے وہ فطرتِ انسانی کو کند کرنے کے لئے طرح طرح کے غلط رواج قائم کرتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر کچھ فرضی خدا گھڑتا ہے۔ وہ حرام وحلال کے نام پر کچھ بے بنیاد محرمات وضع کرتا ہے۔ اس طرح شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی انھیں فرضی چیزوں میں الجھ کر رہ جائے اور اصلی سچائی تک نہ پہنچے۔ وہ سیدھے راستہ سے بھٹک چکا ہو۔ مگر بظاہر اپنے کو چلتا ہوا دیکھ کر یہ سمجھے کہ میں "راستہ" پر ہوں۔ حالاں کہ وہ ایک ٹیڑھی لکیر ہو نہ کہ سیدھا سچا راستہ۔

جو لوگ اس طرح شیطانی بہکاوے کا شکار ہوں وہ خدا کی نظر میں ظالم ہیں۔ ان کو خدا نے سمجھ دی تھی جس سے وہ حق و باطل میں تمیز کر سکتے تھے۔ مگر ان کے تعصبات ان کے لئے پردہ بن گئے۔ سمجھ کی صلاحیت رکھنے کے باوجود سمجھنے سے دور رہے۔

اور یہود پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے تھے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی سوا اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے لگی ہو یا کسی ہڈی سے ملی ہوئی ہو۔ یہ سزا دی تھی ہم نے ان کو ان کی سرکشی پر اور یقیناً ہم سچے ہیں۔ پس اگر وہ تم کو جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمھارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے۔ اور اس کا عذاب مجرم لوگوں سے ٹل نہیں سکتا

۱۴۶ — ۱۴۷

شریعت خداوندی میں ۱۴۹ محرمات ہمیشہ وہی رہے ہیں جو اوپر کی آیت میں بیان ہوئے۔ یعنی مردار، بہایا ہوا خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ اس کے سوا اگر کچھ چیزیں حرام ہیں تو وہ انھیں کی تشریح و تفصیل ہیں

مگر اسی کے ساتھ اللہ کی ایک سنتِ تحریم اور ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی حامل کتاب قوم اطاعت کے بجائے سرکشی کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو اس کی سرکشی کی سزا کے طور پر اس کو نئی نئی مشکلات میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس پر ایسی چیزیں حرام کر دی جاتی ہیں جو اصلاً شریعت خداوندی میں حرام نہ تھیں۔

اس حرمت کی شکل کیا ہوتی ہے۔ اس کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے اندر ایسے پیشوا اٹھتے ہیں جو دین کی حقیقت سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ وہ صرف ظاہری دین داری سے واقف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جو اہتمام دین کی معنوی حقیقتوں میں کرنا چاہیے وہی اہتمام وہ ظاہری آداب و قواعد میں کرنے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ظواہر دین میں غیر ضروری موشگافیاں وجود میں آتی ہیں۔ ایسے لوگ دین کے خود ساختہ ظاہری معیار وضع کرتے ہیں۔ وہ غلو اور تشدد کر کے سادہ حکم کو پیچیدہ اور جائز چیز کو ناجائز بنا دیتے ہیں۔

مثلاً یہود کے اندر جب سرکشی آئی تو ان کے درمیان ایسے علماء اٹھے جنھوں نے اپنی موشگافیوں سے یہ قاعدہ بنایا کہ کسی چوپایہ کے حلال ہونے کے لیے دو شرطیں بیک وقت ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے پاؤں چرے ہوئے ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ جگالی کرتا ہو۔ ان میں سے کوئی ایک شرط بھی اگر نہ پائی جائے تو وہ جانور حرام سمجھا جائے گا۔ اس خود ساختہ شرط کی وجہ سے اونٹ، سافان اور خرگوش جیسی چیزیں بھی خواہ مخواہ حرام قرار پا گئیں۔ اسی طرح "ناخن" کی تشریح میں غلو کر کے انھوں نے غیر ضروری طور پر شتر مرغ، قاز اور بط وغیرہ کو اپنے لیے حرام کر لیا۔ اس قسم کی غیر فطری بندشوں نے ان کے لیے وہاں تنگی پیدا کر دی جہاں خدا نے ان کے لیے فراخی رکھی تھی۔

حق کو نہ ماننے کے بعد آدمی فوراً خدا کی پکڑ میں نہیں آتا۔ وہ بدستور اپنے کو آزاد اور بھرپور پاتا ہے۔ ۲۱ بنا پر اکثر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ حق کو نہ ماننے سے اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ محض خدا کی رحمت کی سمائی سے بچا ہوا ہے۔ خدا آدمی کی سرکشی کے باوجود اس کو آخری حد تک موقع دیتا ہے۔ بالآخر جب وہ اپنی روش کو نہیں بدلتا تو اچانک خدا کا عذاب اس کو اپنی پکڑ میں لے لیتا ہے۔ کبھی دنیا میں اور کبھی دنیا اور آخرت دونوں میں۔

جنھوں نے شرک کیا وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کر لیتے۔ اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے قبل ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ کہو کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جس کو تم ہمارے سامنے پیش کرو۔ تم تو صرف گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل سے کام لیتے ہو۔ کہو کہ پوری حجت تو اللہ کی ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ کہو کہ اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس پر گواہی دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام ٹھیرایا ہے۔ اگر وہ جھوٹی گواہی دے بھی دیں تو تم ان کے ساتھ گواہی نہ دینا، اور تم ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں ۱۴۸ — ۱۵۰

حق کی بے آمیز دعوت ہمیشہ اپنے ماحول میں اجنبی دعوت ہوتی ہے۔ ایک طرف مروجہ دین ہوتا ہے جس کو تمام اجتماعی اداروں میں غلبہ کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ صدیوں کی روایات اس کو باوزن بنانے کے لئے اس کی پشت پر موجود ہوتی ہیں۔ دوسری طرف حق کی دعوت ہوتی ہے جو ان تمام اضافی خصوصیات سے خالی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جس دین کو اتنا درجہ اور اتنی مقبولیت حاصل ہو وہ دین خدا کی پسند کے مطابق نہ ہوگا۔ لوگ فرض کر لیتے ہیں کہ مروجہ دین کا اتنا پھیلاؤ اسی لئے ممکن ہو سکا کہ خدا کی مرضی اس کے شامل حال تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کو یہ پھیلاؤ کبھی حاصل نہ ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ جس دین کو خدا کی دنیا میں ہر طرف بلند مقام حاصل ہو وہ خدا کا پسندیدہ دین ہوگا یا وہ دین جس کو خدا کی دنیا میں کہیں کوئی مقام حاصل نہیں۔

مگر حق و باطل کا فیصلہ حقیقی دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ اس قسم کے قیاسات پر۔ خدا نے اس دنیا کو امتحان گاہ بنایا ہے۔ یہاں آدمی کو یہ موقع ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے اختیار کرے اور جس چیز کو چاہے اختیار نہ کرے۔ یہ معاملہ تمام تر آدمی کے اپنے اوپر منحصر ہے۔ ایسی حالت میں کسی چیز کا رواج عام اس کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کوئی چیز برحق ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ دلائل کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ رواجی عمل کی بنیاد پر۔

دنیا کو اللہ نے امتحان گاہ بنایا۔ انسان پر اپنی مرضی جبراً مسلط کرنے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا کہ انسان کو صحیح اور غلط کا علم دیا اور یہ معاملہ انسان کے اوپر چھوڑ دیا کہ وہ صحیح کو لیتا ہے یا غلط کو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں دلیل (حجت) خدا کی نمائندہ ہے۔ آدمی جب ایک سچی دلیل کے آگے جھکتا ہے تو وہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ اور جب وہ ایک سچی دلیل کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ خدا کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔

جب آدمی دلیل کے آگے نہیں جھکتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہش سے اوپر اٹھ نہیں پاتا۔ وہ باطل کو حق کہنے کے لئے کمر بستہ ہو جاتا ہے تاکہ اپنے عمل کو جائز ثابت کر سکے۔ اس کی ڈھٹائی اس کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ خدا کی نشانیوں کو نظرانداز کر دے۔ وہ اس بات سے بے پروا ہو جاتا ہے کہ خدا اس کو بالآخر پکڑنے والا ہے۔ وہ دوسری دوسری چیزوں کو وہ اہمیت دے دیتا ہے جو اہمیت صرف خدا کو دینا چاہیے۔

کہو، آؤ میں سناؤں وہ چیزیں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کام کے پاس نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو نہ مارو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو ۱۵۱

خدائی پابندی کے نام پر لوگ طرح طرح کی رسمی اور ظاہری پابندیاں بنا لیتے ہیں اور ان کا خصوصی اہتمام کرکے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے خدائی پابندیوں کا حق ادا کر دیا۔ مگر خدا انسان سے جن پابندیوں کا اہتمام چاہتا ہے وہ حقیقی پابندیاں ہیں نہ کہ کسی قسم کے رسمی مظاہر۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کو اپنا خدا بنائے۔ اس کے سوا کسی کی بڑائی کا غلبہ اس کے ذہن پر نہ ہو۔ اس کے سوا کسی کو وہ قابل بھروسہ نہ سمجھتا ہو۔ اس کے سوا کسی سے وہ امیدیں قائم نہ کرے۔ اس کے سوا کسی سے وہ نہ ڈرے اور نہ اس کے سوا کسی کی شدید محبت میں مبتلا ہو۔

والدین اکثر حالات میں کمزور اور محتاج ہوتے ہیں اور اولاد طاقت ور۔ ان سے حسن سلوک کا محرک مفاد نہیں ہوتا بلکہ صرف حق شناسی ہوتا ہے۔ اس طرح والدین کے حقوق ادا کرنے کا معاملہ آدمی کے لئے اس بات کا سب سے پہلا امتحان بن جاتا ہے کہ اس نے خدا کے دین کو قول کی سطح پر اختیار کیا ہے یا عمل کی سطح پر۔ اگر وہ والدین کی کمزوری کے بجائے ان کے حق کو اہمیت دے، اگر اپنے دوستوں اور اپنے بیوی بچوں کی محبت اس کو والدین سے دور نہ کرے تو گویا اس نے اس بات کا پہلا ثبوت دے دیا کہ اس کا اخلاق اصول پسندی اور حق شناسی کے تابع ہوگا نہ کہ مفاد اور مصلحت کے تابع۔

انسان اپنے حرص اور ظلم کی وجہ سے خدا کے پیدا کئے ہوئے رزق کو تمام بندوں تک منصفانہ طور پر پہنچنے نہیں دیتا۔ اور جب اس کی وجہ سے قلت کے مصنوعی مسائل پیدا ہوتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ کھانے والوں کو قتل کر دو یا پیدا ہونے والوں کو پیدا نہ ہونے دو۔ اس قسم کی باتیں خدا کے نظام رزق پر بہتان کے ہم معنی ہیں

بہت سی برائیاں ایسی ہیں جو اپنی حیثیت میں اتنی فحش ہوتی ہیں کہ ان کی برائی کو جاننے کے لئے کسی بڑے علم ضرورت نہیں ہوتی۔ انسانی فطرت اور اس کا ضمیر ہی یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ یہ کام انسان کے کرنے کے قابل نہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص کسی فحاشی یا بے حیائی کے کام میں مبتلا ہو وہ گویا ثابت کر رہا ہے کہ وہ اس ابتدائی درجۂ انسانیت سے بھی محروم ہے جہاں سے کسی انسان کے انسان ہونے کا آغاز ہوتا ہے

ہر انسان کی جان محترم ہے۔ کسی انسان کو ہلاک کرنا کسی کے لئے جائز نہیں جب تک خالق کے قانون کے مطابق وہ کوئی ایسا جرم نہ کرے جس میں اس کی جان لینا مخصوص شرائط کے ساتھ مباح ہو گیا ہو ـــــــ یہ باتیں اتنی واضح ہیں کہ عقل سے کام لینے والا ان کی صداقت کو جاننے سے محروم نہیں رہ سکتا۔

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

ماہنامہ الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

۱۔ مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۲۔ وقفہ اشاعت ماہانہ

۳۔ نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۴۔ نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

۵۔ نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

۶۔ نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں

یکم مارچ ۱۹۸۱ء

ملی تعمیر کا کام

سب سے پہلے

ملت کے افراد میں

شعور پیدا کرنے کا کام ہے

اس کی

بہترین صورت یہ ہے کہ

الرسالہ کو

ایک ایک بستی اور

ایک ایک گھر میں

پہنچایا جائے۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

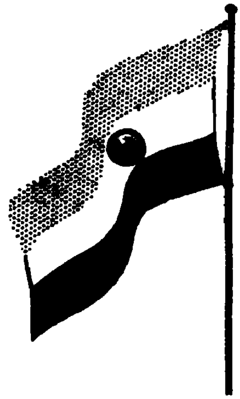
ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپیے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

۱۔	الاسلام	از مولانا وحید الدین خاں	۱۵ — ۰۰
۲۔	مذہب اور جدید چیلنج	″	۱۵ — ۰۰
۳۔	ظہور اسلام	″	۱۵ — ۰۰
۴۔	دین کیا ہے	″	۲ — ۰۰
۵۔	قرآن کا مطلوب انسان	″	۵ — ۰۰
۶۔	تجدید دین	″	۳ — ۰۰
۷۔	اسلام دین فطرت	″	۳ — ۰۰
۸۔	تعمیر ملت	″	۳ — ۰۰
۹۔	تاریخ کا سبق	″	۳ — ۰۰
۱۰۔	مذہب اور سائنس	″	۵ — ۰۰
۱۱۔	عقلیات اسلام	″	۳ — ۰۰
۱۲۔	فسادات کا مسئلہ	″	۲ — ۰۰
۱۳۔	انسان اپنے کو پہچان	″	۱ — ۰۰
۱۴۔	تعارف اسلام	″	۲ — ۵۰
۱۵۔	اسلام پندرھویں صدی میں	″	۲ — ۰۰
۱۶۔	راہیں بند نہیں	″	۳ — ۰۰
۱۷۔	دینی تعلیم	″	۳ — ۰۰
۱۸۔	ایمانی طاقت	″	(زیر طبع)
۱۹۔	اتحاد ملت	″	
۲۰۔	سبق آموز واقعات	″	
۲۱۔	اسلامی تاریخ سے	″	
۲۲۔	قال اللہ	″	
۲۳۔	قال الرسول	″	
۲۴۔	زلزلۂ قیامت	″	۴ — ۰۰
۲۵۔	سچا راستہ	″	۱ — ۰۰



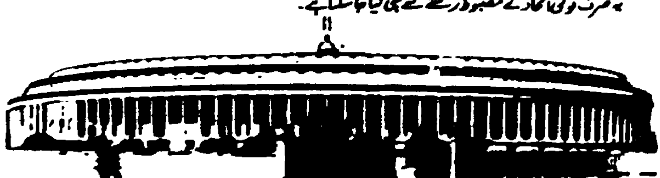
یوم جمہوریہ پر دلی مبارکباد

26 جنوری 1950ء کو بھارت کے لوگوں نے ایک خود مختار سوشلسٹ سیکولر جمہوری ریپبلک کی بنیاد رکھی تھی۔
گزشتہ 31 برسوں میں ہم نے بہت سے کارنامے سر انجام دیئے ہیں۔

- ہم نے جمہوریت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہے۔
- مدت سے چلی آرہی خوراک کی کمی پر قابو پایا ہے۔
- ہم سرکردہ زیادہ صنعت یافتہ ملکوں میں گنے جاتے ہیں۔
- ہم سائنس اور ٹکنالوجی میں صف اوّل کے ملکوں میں شامل ہو گئے ہیں۔
- ہم نے تین بیرونی حملوں کا منہ موڑا ہے۔ اور
- بین الاقوامی اجتماعوں میں ہماری آواز معنی رکھتی ہے۔

مگر سب کے لئے سماجی انصاف اور عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کی خاطر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

یہ صرف قومی اتحاد کے مضبوط رشتے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔



ترقی اور تحفظ کی خاطر قومی یکجہتی کو پکا کیجئے اور سیکولر جماعتوں کو مضبوط بنائیے۔

dav.p 80/324

EGD. R. N. NO. 28822/76 ISSUE NO. 52

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

الرسالہ

اپریل ۱۹۸۱
شمارہ ۵۳

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

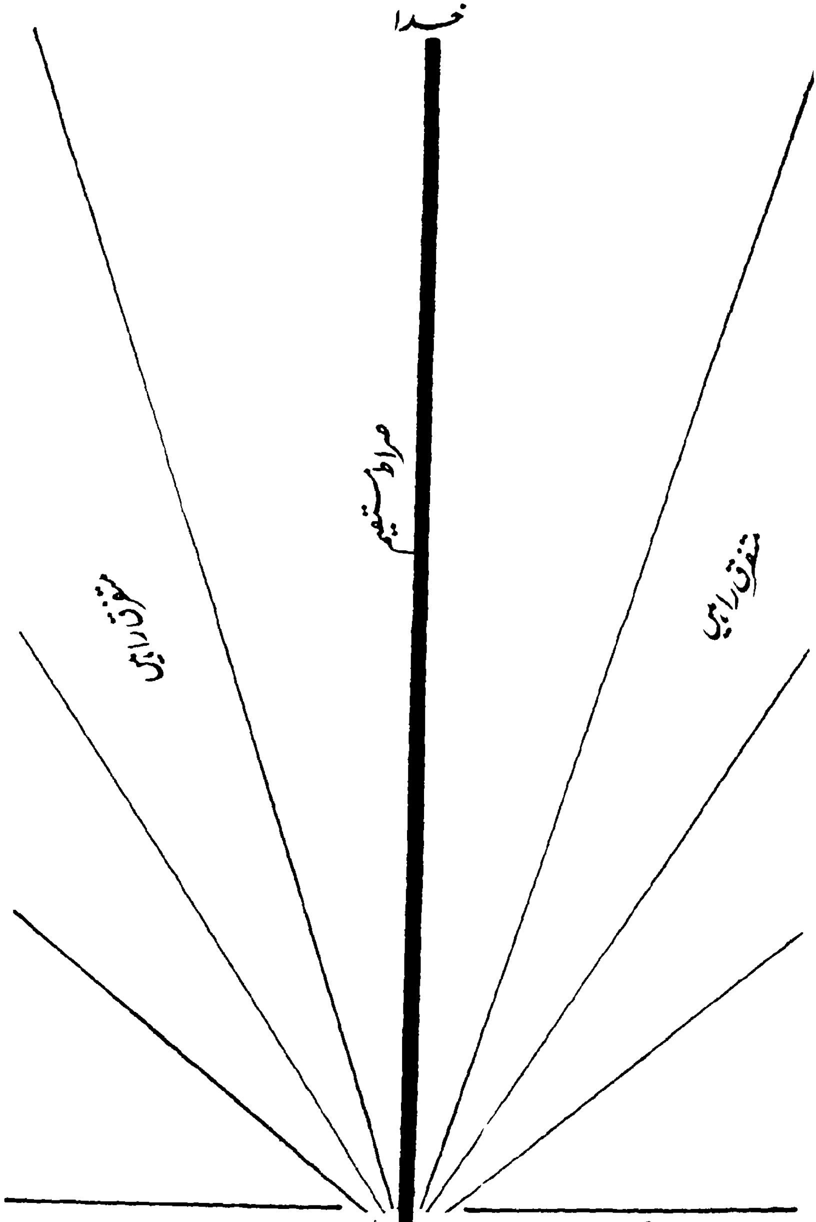
اعلان

مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کئی کتابیں لکھ کر تیار ہیں مگر سرمایہ کی کمی کی وجہ سے چھپنے کے لئے رکی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تجویز یہ ہے کہ کچھ لوگ بطور قرض سرمایہ فراہم کر دیں۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔

جو لوگ قرض کی اس اسکیم میں حصہ لیں گے ان کے اطمینان کے لئے عرض ہے کہ جب بھی وہ اپنی رقم واپس لینا چاہیں گے انشاء اللہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ان کی رقم انھیں واپس کر دی جائے گی۔

—— مکتبہ الرسالہ

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں



اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (بے شک میرا رب ہے سیدھی راہ پر) یعنی جو سیدھی راہ چلے وہ اس سے ملے (شاہ عبدالقادر)

رخ سے بے رخ ہونا

ہر کام کے کرنے کا ایک صحیح رخ ہوتا ہے اور ایک غلط رخ۔ آدمی صحیح رخ پر چل کر منزل پر پہنچتا ہے اور غلط رخ پر چل کر ادھر اُدھر بھٹک جاتا ہے۔ مثلاً تجارت میں کامیابی کا راز محنت اور دیانت داری ہے۔ اب تاجر کے لئے عمل کا صحیح رخ یہ ہوگا کہ وہ محنت اور دیانت کا ثبوت دے کر تجارتی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تاجر کا صحیح تجارتی رخ پر چلنا ہے۔ اور جو شخص صحیح رخ پر چلے وہ ضرور ایک نہ ایک دن کامیاب ہوگا۔ اس کے برعکس اگر وہ یہ کرے کہ بازار کے دوسرے تاجروں کی بربادی پر اپنی تجارتی ترقی کی بنیاد رکھنا چاہے۔ یا بینکوں میں ڈاکہ ڈال کر آناً فاناً کروڑ پتی بننے کا خواب دیکھے۔ یا تجارت کے نام پر جلسہ جلوس اور احتجاج اور مطالبہ کی مہم چلائے اور سمجھے کہ اس طرح وہ اپنی تجارتی منزل پر پہنچ جائے گا تو یہ سب اس کے لئے غلط رخ پر بھٹکنے کی صورتیں ہوں گی۔ ایسا تاجر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام صورتیں کسی تاجر کے لئے رخ سے بے رخ ہونے کی صورتیں ہیں اور جو شخص رخ سے بے رخ ہو جائے اس کے لئے اس دنیا میں کوئی کامیابی نہیں۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین کی بھی ایک صراط مستقیم ہے اور ایک اس میں بھٹکنے کے راستے ہیں۔ صراط مستقیم پر چلنے کو قرآن میں اقامت دین کہا گیا ہے اور ادھر اُدھر کے راستوں میں بھٹکنے کو تفرق فی الدین (شوریٰ)

دین کی صراط مستقیم پر قائم ہونا یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کو اپنا سب کچھ بنائے، اسی سے سب سے زیادہ ڈرے اور اسی سے سب سے زیادہ محبت کرے۔ اس کو سب سے زیادہ فکر آخرت کی ہو۔ وہ ہر معاملہ کو آخرت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہو کہ وہ جہنم کے عذاب سے بچ جائے اور اس کی سب سے بڑی طلب یہ ہو کہ خدا اس کو جنت میں داخل کرے۔ وہ دنیا میں ذمہ دارانہ زندگی گزارے۔ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس کا رویہ احتیاط اور تقویٰ کا رویہ ہو نہ کہ آزادی اور بے قیدی کا۔ یہ دین کا سیدھا راستہ ہے۔ جو اس پر چلے گا وہ لازماً خدا کو پائے گا اور اس کی رحمت و نصرت میں حصہ دار بنایا جائے گا۔

اس کے برعکس دین میں متفرق ہونا یہ ہے کہ دین کا کوئی لفظ بول کر ایک غیر متعلق قسم کی دھوم مچائی جائے۔ مثلاً توحید کا نام لے کر اس قسم کی بحثیں شروع کر دی جائیں کہ خدا جسمانی وجود ہے کہ روحانی وجود۔ وہ صرف عادل ہے یا ظلم پر بھی قادر ہے۔ وغیرہ۔ یا عبادت کا نام لے کر فضائل عبادت کی طلسماتی کہانیاں سنائی جانے لگیں یا مسائل عبادت میں فنی موشگافیاں کر کے نئی نئی لامتناہی بحثوں کا آغاز کر دیا جائے۔ کوئی اسلام کے نظام عدل کو قائم کرنے کے نام پر ظالم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے اکھیڑ پچھاڑ شروع کر دے۔ کوئی یہ نظریہ بنائے کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ اور مکمل نظام سیاسی اقتدار کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سب سے پہلا کام حکومت پر قبضہ کرنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ سارے دین کو سیاست بازی کے رخ پر چلا دے۔ اس قسم کی تمام صورتیں دین کی صراط مستقیم سے بھٹکنے کی صورتیں ہیں۔ وہ قرآن کے الفاظ میں تفرق فی الدین ہے نہ کہ اقامت دین (شوریٰ ۱۳)

سچائی کا زور

ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے جس نے لوگوں کے سامنے بآواز بلند قرآن پڑھا وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک روز جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم قریش نے ابھی تک اس قرآن کو بلند آواز سے نہیں سنا۔ کیا کوئی ہے جو قریش کے لوگوں کو قرآن سنائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا، میں سناؤں گا۔ عبداللہ بن مسعود دبلے اور کمزور جسم کے تھے۔ مکہ میں ان کا کوئی قبیلہ بھی نہ تھا جو ان کی حمایت کرے۔ وہ اس وقت لوگوں کی بکریاں چراتے تھے اور "ابن ام عبد" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے کہا کہ تمھارے بارے میں ہمیں ڈر ہے۔ اس کام کے لئے ہم ایسا آدمی چاہتے ہیں جس کا مکہ میں قبیلہ ہو اور قریش جب اس پر حملہ کریں تو اس کا قبیلہ قریش کو روکے۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: مجھے جانے دو، کیونکہ اللہ میری مدد کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود روانہ ہوئے اور اس مقام پر پہنچے جہاں قریش کے لوگ جمع تھے۔ وہ ان کے پاس کھڑے ہوگئے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور اس کے بعد بلند آواز سے سورہ رحمٰن پڑھنا شروع کیا۔ وہ پڑھتے رہے یہاں تک کہ قریش نے آپس میں پوچھنا شروع کیا کہ یہ "ابن ام عبد کیا پڑھ رہا ہے" کسی نے کہا کہ یہ اس کلام کا کوئی حصہ ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اترا ہے۔ یہ سن کر وہ اٹھے اور عبداللہ بن مسعود کے منھ پر مارنا شروع کیا۔ تاہم وہ برابر پڑھتے رہے۔ اس کے بعد جب عبداللہ بن مسعود اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آئے تو ان کے چہرے پر مار کا نشان ظاہر ہو چکا تھا۔ لوگوں نے دیکھ کر کہا: تمھارے بارے میں ہم کو اسی کا اندیشہ تھا۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: خدا کے دشمن آج مجھ کو جتنا کمزور معلوم ہوئے اتنا کمزور مجھے کبھی معلوم نہیں ہوئے تھے اور اگر تم چاہو تو کل پھر میں اسی طرح جاکر ان کو قرآن سناؤں گا (ما اعداء اللہ اھون علیّ منھم الآن ولئن شئتم لاغادینّھم بمثلھا غداً) سیرۃ ابن ہشام، جزء اول، صفحہ ۳۳۷)

ایک کمزور اور بے سہارا آدمی کے اندر یہ قوت کہاں سے آئی کہ وہ کسی مادی تحفظ کے بغیر دشمنوں کے مجمع میں گھس گیا اور ان کو بلند آواز سے وہ کلام سنانے لگا جس کا سننا ان کو سب سے زیادہ ناگوار تھا۔ اس قوت کا راز سچائی پر یقین ہے۔ عبداللہ بن مسعود کو کامل یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں اور قریش باطل پر۔ قریش نے جب عبداللہ بن مسعود کو مارنا شروع کیا تو ان کا یقین اور بڑھ گیا۔ کیوں کہ ان کے دل نے کہا کہ قریش کے پاس دلیل کی زبان میں ان کے جواب کے لئے کچھ نہیں ہے۔ ان کی جارحیت صرف اس بات کا ثبوت

تھی کہ دلیل کے میدان میں وہ اپنے کو باطل بے بس پا رہے ہیں، عبداللہ بن مسعود سچائی کے زور سے زور آور تھے، اور یقیناً سچائی کا زور سب سے بڑا زور ہوتا ہے۔

دنیا کی رزم گاہ میں بہادر بننے کا راز یہ نہیں ہے کہ آدمی پر مشکلات نہ گزریں۔ مشکلات تو اس دنیا میں ہر ایک کے لئے آتی ہیں۔ بہادری کا اصل راز یہ ہے کہ آدمی کے پاس کوئی ایسا یقین ہو جو اپنے مقصد کے مقابلہ میں مشکلات کو اس کے لئے حقیر بنادے۔ دکھوں کی اس دنیا میں مشکلات کو وہی شخص جھیلتا ہے جس کو مشکلات سے بڑی کوئی چیز مل گئی ہو۔

مومن کو یہ چیز کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک ایسا حق ہوتا ہے جس کی عظمت اور صداقت پر اسے ادنیٰ شبہ نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس راہ میں ہر قربانی آخرت میں اس کی کامیابیوں میں اضافہ کرنے کے ہم معنی ہوگی۔ یہ یقین اس کے لئے حق کے اعلان کو ایک ایسی لذت بنادیتا ہے جس کا سرور کبھی ختم نہ ہو۔ مخالفین کی جارحیت صرف اس کے اس یقین میں اضافہ کرتی ہے کہ وہ سراسر حق پر ہے اور اس کے مخالفین سراسر باطل پر۔ جارحیت در اصل سچائی کے میدان میں اپنی شکست کا اعلان ہے۔ مخالفین کی جارحیت ایمان واسلام کے داعی کے لئے اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کے مخالفین دلیل کے میدان میں اپنی بازی ہار چکے ہیں۔ کیوں کہ جس کے پاس دلیل کی طاقت ہو وہ کبھی جارحیت کی طاقت استعمال نہیں کرتا۔

سچائی ایک اعلیٰ ترین ذہنی یافت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی کی طاقت کا خزانہ آدمی کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری تمام طاقتیں خارجی طاقتیں ہیں، ان کا خزانہ آدمی کے اپنے وجود کے باہر ہوتا ہے۔ دوسری طاقتوں کا ذخیرہ محدود ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی وقت ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چیزیں نازک حالات میں خود اپنے بچاؤ کی فکر میں لگ جاتی ہیں، اس بنا پر وہ نازک مواقع پر آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر سچائی کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ سچائی وہ اتھاہ طاقت ہے جس کا ذخیرہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ سچائی جب ایک بار کسی کو مل جائے تو وہ اس کی جان کے ساتھ ساتھ باقی رہتی ہے، وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔ سچائی کی طاقت آخر وقت تک آدمی کا سہارا بنی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ بظاہر اس کے ساتھ کوئی طاقت موجود نہیں ہوتی۔

مومن کو جو سچائی ملتی ہے وہ خود خدا ہوتا ہے۔ مومن خدا کو سب سے بڑی حقیقت کے طور پر پالیتا ہے۔ پھر جو سب سے بڑی ہستی کو پالے وہ اس کے بعد کسی چھوٹی چیز سے کیوں ڈرے گا۔ اس کے بعد کوئی چیز پانے کے لئے باقی ہی نہیں رہتی۔

حقیقت کی تلاش

گلیلیو (۱۶۴۲ ـ ۱۵۶۴) اپنی سادہ دوربین سے چاند کا صرف سامنے کا رخ دیکھ سکتا تھا۔ آج کا
نسان خلائی جہاز میں لگے ہوئے دوربینی کیمروں کی مدد سے چاند کا پچھلا رخ بھی پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ یہ ایک
سادہ سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کل اور آج میں علمی اعتبار سے کتنا زیادہ فرق ہو چکا ہے۔

مگر ان جدید معلومات تک پہنچنے کی قیمت بہت مہنگی ہے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۰ کو نیو میکسیکو میں دنیا کی سب سے
ی دوربین نصب کی گئی۔ اس کی قیمت ۸،۷ ملین ڈالر تھی۔ امریکا کا ایک خلائی جہاز (وائیجر) جو دسمبر ۱۹۸۰ میں زحل
پہنچا اس کی لاگت ۳۴ ملین ڈالر تھی۔ یورپ میں پارٹیکل فزکس کی بین اقوامی لیبورٹری (Cern) ۱۹۸۱ میں مکمل
دی ہے، اس کا مقصد اینٹی میٹر کو توڑ کر میٹر میں تبدیل کرنا ہے، اس لیبورٹری کی لاگت ۱۲۰ ملین ڈالر ہے۔ یہ ادارہ
ب اور زیادہ بڑی تحقیقی مشین تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے جس کی لاگت ۵۰۰ ملین ڈالر ہو گی۔ پروٹان کی تحقیق کے
لئے امریکہ میں ایک مشین بنائی گئی ہے جس کی لاگت ۵،۲ ملین ڈالر ہے، وغیرہ

پارٹیکل فزکس (ذراتی طبیعیات) میں لوگوں کی بڑھتی ہوئی دل چسپی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ
۱۹۲ میں ہونے والی فزکس کانفرنس میں ۳۲ سائنس داں شریک ہوئے تھے جب کہ ۱۹۸۰ میں ہونے والی فزکس کانفرنس
ں شریک ہونے والے سائنس دانوں کی تعداد ۸۰۰ تھی۔ امریکن فزیکل سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ۱۹۲۰ میں ۱۳۰۰ تھی،
۱۹۸ میں اس سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ۳۰۰۰۰ تک پہنچ چکی ہے۔

ان جدید تحقیقاتی کوششوں کا تعلق فلکیات (اسٹرانومی) اور پارٹیکل فزکس (ذراتی طبیعیات) سے ہے۔ ان
علوم میں تحقیقات کے نتائج بہت دیر میں نکلتے ہیں۔ تقریباً ۵۰ سال بعد یا اس سے بھی زیادہ۔ اگر اس کا لحاظ
کیا جائے کہ ان تحقیقات میں لگی ہوئی رقم (جس پر کوئی سود نہیں ملتا) کی قیمت ہر سال کم ہوتی رہتی ہے تو پچاس سال بعد
یک سو ڈالر کی قیمت صرف ایک ڈالر کے بقدر رہ جائے گی۔ بظاہر ایک بے فائدہ مد میں اتنی کثیر رقم خرچ کرنے کی وجہ
سے بہت سے لوگ ایسے منصوبوں پر اعتراض کر رہے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے امریکی پروفیسر راجر پنروز
(Roger Penrose) نے کہا ہے:

> Do economists not share with us the thrill that accompanies each new piece of understanding? Do they not care to know where we have come from, how we are constituted, or why we are here? Do they not have a drive to understand, quite independent of economic gain? Do they not appreciate the beauty in ideas? — A civilisation that stopped inquiring about the universe might stop inquiring about other things as well. A lot else might then die besides particle physics.
>
> SUNDAY Weekly (Calcutta) November 30, 1980

کیا اقتصادیات کے ماہرین اس وجد انگیز مسرت میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہیں جو علم کے ہر نئے اضافہ سے حاصل

ہوتی ہے۔ کیا ان کو یہ جاننے کا شوق نہیں ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، ہماری پیدائش کیسے ہوئی ہے یا یہ کہ اس زمین پر ہم کیوں ہیں۔ کیا اقتصادی فائدہ سے ہٹ کر ان باتوں کو جاننے کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ کیا وہ نظریات میں حسن کی قیمت کو نہیں سمجھتے۔ کوئی تہذیب جو کائنات کے بارے میں تحقیق سے رک جائے وہ دوسری چیزوں کے بارے میں تحقیق کو بھی روک دے گی۔ اس کے بعد پارٹیکل فزکس کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں بھی موت کا شکار ہو کر رہ جائیں گی۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی حقیقت جاننے کا مسئلہ کس قدر ضروری ہے۔ وہ انسان جو خدا کی بنیاد پر کائنات کی تشریح نہیں کرنا چاہتا وہ بھی انتہائی بے تاب ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز پائے جس کی بنیاد پر وہ اپنی اور کائنات کی تشریح کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظر آنے والی کائنات اور اس کے اندر انسان جیسی ایک مخلوق کا موجود ہونا اس قدر حیران کن ہے کہ انسان اس کی ماہیت کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کوئی بھی دوسری چیز اس کو اس سوال سے بے نیاز کرنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ بڑی بڑی مادی ترقیاں بھی۔

انسان دیکھتا ہے کہ وہ ایک لامحدود کائنات میں ہے۔ اس کائنات میں تقریباً ایک کھرب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں میں لگ بھگ ایک کھرب بہت بڑے بڑے ستارے ہیں۔ اور ہر ستارہ دوسرے ستارے سے اتنا زیادہ فاصلہ پر ہے جیسے بحرالکاہل کے لق و دق سمندر میں چند کشتیاں ایک دوسرے سے بہت دور دور تیر رہی ہوں۔ عظیم کائنات میں پھیلے ہوئے ستاروں کی یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر ہر ستارہ کا کوئی یک لفظی نام رکھا جائے اور کوئی ان ناموں کو بولنا شروع کرے تو صرف تمام ناموں کو دہرانے کے لئے ۔۔ ۳ کھرب سال کی مدت درکار ہوگی (ریلین ٹرتھ جنوری ۱۹۸۱)

اس ناقابل قیاس حد تک عظیم کائنات میں انسان سب سے زیادہ حقیر مخلوق ہے۔ وہ کائناتی نقشہ میں ان چھوٹے جزیروں سے بھی کم ہے جو بہت چھوٹے ہونے کی وجہ سے عام طور پر دنیا کے نقشوں میں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ انسان اپنے تمام چھوٹے پن کے باوجود کائنات کے فاصلوں کو ناپ رہا ہے۔ وہ طبیعیاتی ذروں سے لے کر کہکشانی نظاموں تک کی تحقیق کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسا ذہن رکھتا ہے جو ماضی اور مستقبل کا تصور کر سکے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے۔ اور بالآخر اس عجیب و غریب ڈرامے کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ یہ سوالات ہر سوچنے والے انسان کے اوپر منڈلا رہے ہیں۔ وہ ان کی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ مگر انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ان سوالات کا جواب دوربینی مشاہدات اور لیبوریٹری کے تجربات میں ڈھونڈ رہا ہے۔ حالاں کہ ان سوالات کا جواب پیغمبر کے الہام کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

جس کائنات میں اتنی زیادہ دنیائیں ہوں کہ صرف ان کا نام لینے کے لئے تین سو کھرب سال سے زیادہ مدت درکار ہو، اس کی حقیقت کو وہ انسان کیوں کر دریافت کر سکتا ہے جو پچاس سال یا سو سال زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق ہی اس راز کو کھول سکتا ہے اور اسی نے پیغمبر کے ذریعہ اس کو کھولا ہے۔

ختم نبوت

پیغمبر عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول تھے۔ آپ کے بعد اب کوئی رسول نہیں آئے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

اللہ کی طرف سے جتنے رسول آئے سب ایک ہی دین لے کر آئے۔ ان کے بولنے کی زبانیں الگ الگ تھیں مگر دین سب کا ایک تھا۔ مگر پچھلے نبیوں کی تعلیمات کو ان کے ماننے والے ان کی اصلی حالت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار پیغمبر آتے رہے تاکہ خدا کے دین کو از سرنو تازہ اور زندہ کر دیں۔ مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا انقلاب آیا جس نے دین کو اس کی اصلی حالت میں محفوظ کر دیا۔ اس لئے اب نیا پیغمبر آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا کا دین اس طرح قائم ہوگیا جو آپ کے بعد ہر دور میں پیغمبر کا بدل بن سکے۔ خدا کی کتاب ویسی ہی ویسی محفوظ ہے جیسی کہ وہ آسمان سے اتری تھی۔ حتیٰ کہ اب پریس کے دور میں چھپ کر وہ دنیا بھر میں ہر آدمی تک پہنچ گئی۔ رسول کی زندگی ایک کامل نمونہ کی حیثیت سے مستند کتابی مجموعوں میں مرتب ہوگئی۔ رسول کے بعد ایک ایسی مستقل امت وجود میں آگئی جو نسل در نسل قرآن و سنت کے علم کو لوگوں تک پہنچاتی رہے اور اسی کے ساتھ دین کے طریقوں (مثلاً نماز کیسے پڑھی جائے) کو اس طرح عملی طور پر بتاتی رہے کہ کسی کو اس کی تعمیل میں دشواری نہ رہے۔ ہر دور کا انسان دین کو ٹھیک اسی طرح پاتا رہے جس طرح رسول کے زمانہ کے انسانوں کو وہ رسول کے ذریعہ ملا تھا۔

جب دین محفوظ ہوگیا اور لوگوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے اس کا تسلسل قائم ہوگیا تو اب نیا نبی آنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کے ذریعہ وہ کام ہوتا رہے گا جو پہلے رسول کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ پہلے یہ کام براہ راست رسولوں کے ذریعہ ہوتا تھا، اب وہ رسول کی امت کے ذریعہ ہوگا۔

قیامت

ہر روز رات کے بعد دن آتا ہے۔ جو چیزیں رات کے وقت اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں وہ دن کے اجالے میں ایک ایک کرکے سامنے آجاتی ہیں۔ اسی طرح موجودہ دنیا کے بعد آخرت کی دنیا آئے گی۔ اس وقت تمام حقیقتیں دن کی روشنی کی طرح کھل جائیں گی۔ آج آدمی اپنی برائی کو مصنوعی اعمال میں چھپالیتا ہے۔ کسی کو خوبصورت الفاظ مل گئے ہیں جو اس کی باطل پرستی کو حق پرستی کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ کسی کے لئے اس کی ظاہری رونقیں اس کی باطنی گندگی کا پردہ بن گئی ہے۔ ہر آدمی کی حقیقت "رات" کی تاریکی میں ڈھکی ہوئی ہے۔ مگر قیامت اس طرح کے تمام پردوں کو پھاڑ دے گی، وہ دن کی روشنی کی طرح ہر چیز کو اس کی اصلی حالت میں دکھادے گی۔

وہ وقت بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ اس دن ہر آدمی وہاں کھڑا ہوا دکھائی دے گا جہاں وہ حقیقۃً تھا نہ کہ اس مصنوعی مقام پر جہاں وہ آج اپنے کو کھڑا کئے ہوئے ہے۔

کتنے لوگ جو آج اقتدار کے مالک بنے ہوئے ہیں اس دن ان کے پاس عجز اور بےچارگی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم شخصیت کا درجہ پائے ہوئے ہیں اس دن وہ کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہوچکے ہوں گے جیسے کہ ان کے پاس الفاظ ہی نہیں۔

جب موت آئے گی

اگر آپ اپنی دونوں آنکھیں بند کرلیں تو ساری دنیا آپ کے لئے تاریک ہوجائے گی۔ سورج کی روشنی اور آسمان کی بلندی سے لے کر درختوں کی سرسبزیاں اور شہروں کی رونقیں تک سب اندھیرے میں چھپ جائیں گی۔ ساری چیزیں موجود ہوتے ہوئے بھی آپ کے لئے غیر موجود بن جائیں گی۔

ایسی ہی کچھ مثال آخرت کی ہے۔ آخرت ایک مکمل حقیقت ہے۔ بلکہ آخرت سب سے بڑی حقیقت ہے۔ مگر وہ ہم کو نظر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ ہمارے لئے غیب میں ہے۔ اس کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں۔ موت کا دن وہ دن ہے جب کہ غیب کا پردہ ہماری آنکھوں سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ موت کے فوراً بعد آدمی آخرت کی دنیا کو اسی طرح دیکھنے لگتا ہے جس طرح آج ایک بند آنکھ والا آنکھ کھولنے کے بعد موجودہ دنیا کو دیکھتا ہے۔

ایک شخص کی آنکھ پر پٹی باندھ کر اس کو زندہ شیر کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔ وہ بالکل بے خبر ہو کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ اسی حالت میں اچانک اس کی آنکھ کھول دی جائے۔ اس وقت زندہ اور کھلے ہوئے شیر کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا جو حال ہوگا اس سے کہیں زیادہ بدحواسی آدمی کے اوپر اس وقت طاری ہوگی جب کہ وہ موت کے بعد اچانک آخرت کو دیکھے گا۔

وہ شخص جو دنیا میں اپنے آپ کو بہت سے سہاروں کے درمیان پاتا تھا، اچانک دیکھے گا کہ وہ بالکل بے سہارا ہو چکا ہے۔ اس کے وہ دوست اس سے چھوٹ چکے ہوں گے جن کے درمیان وہ تفریح کرتا تھا۔ اس کے وہ بیوی بچے اس کے لئے غیر بن چکے ہوں گے جن کو وہ اپنا سمجھ کر اپنا سب کچھ ان کے اوپر قربان کر رہا تھا۔ اس کے وہ مادی اسباب جن پر وہ اعتماد کئے ہوئے تھا، مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ وہ باتیں جن کو وہ بے وزن سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا وہ لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت بن کر اس کے سامنے کھڑی ہوں گی۔

دوسری دنیا

خدا کی موجودہ دنیا مدرجہ مکمل دنیا ہے مگر اس کا نظام امتحان کے مقصد کے تحت بنایا گیا ہے، خدا کے منصوبہ کے تحت مستقل اور معیاری دنیا وہ ہے جو جزا و سزا کے تقاضوں کو پورا کرے۔ موجودہ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد خدا موجودہ دنیا کو توڑ دے گا اور دوسری زیادہ کامل دنیا بنائے گا جہاں برے لوگ اور اچھے لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہر ایک اپنے عمل کا ٹھیک ٹھیک بدلہ پا سکے۔

موجودہ دنیا میں ایک عجیب و غریب تضاد نظر آتا ہے۔ یہاں چڑیاں خدا کی حمد کے نغمے گاتی ہیں مگر انسان انسان کا قصیدہ پڑھتا ہے۔ یہاں ستارے اور سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر اپنا سفر کرتے ہیں مگر انسان جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جس میں اس کا دوسروں سے ٹکراؤ ہو۔ یہاں کوئی درخت دوسرے درخت کی کاٹ نہیں کرتا۔ مگر اسی دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کی تخریب کے منصوبے بناتا ہے یہاں لمبا کھڑا ہوا درخت اپنا سایہ زمین پر بچھا کر اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے مگر انسان کو اگر کوئی بلندی حاصل ہو جائے تو وہ فوراً اکڑنے لگتا ہے۔

انسان کا یہ رویہ خدا کی اس پسند کے سراسر خلاف ہے جو اس نے اپنی پوری کائنات میں نافذ کر رکھا ہے۔ قیامت اسی لئے آئے گی کہ وہ اس تضاد کو ختم کر دے۔ وہ خدا کے سوا ہر بڑائی کی نفی کر دے، وہ خدا کی مرضی کے سوا ہر مرضی کو باطل ثابت کر دے۔

امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد خدا موجودہ دنیا کو توڑ کر ایک اور دنیا بنائے گا۔ وہاں اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دئے جائیں گے۔ اس کے بعد اچھے لوگ جنت میں ہوں گے اور برے لوگ جہنم میں۔

اچھی زندگی

متوکل علی اللہ (۲۰۷ - ۲۴۷ھ) ایک عباسی خلیفہ تھا۔ فتح بن خاقان کہتے ہیں کہ ایک روز میں خلیفہ متوکل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ سرنیچا کیے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا: امیرالمومنین، آپ فکر مند معلوم ہوتے ہیں۔ حالاں کہ آپ وہ شخص ہیں جس کو روئے زمین پر سب سے زیادہ آسائش کے سامان حاصل ہیں۔ خلیفہ متوکل نے میری بات سن کر اپنا سر اٹھایا اور کہا:

اے فتح، مجھ سے زیادہ اچھی زندگی اس شخص کی ہے جس کے پاس ایک کشادہ مکان ہو، نیک بیوی ہو، بقدر ضرورت روزی کا انتظام ہو، نہ ہم اس کو جانتے ہوں کہ اس کو تکلیف دیں اور نہ وہ ہمارا محتاج ہو کہ ہم اس کو رسوا کریں (تاریخ الخلفاء، صفحہ ۲۴۱)

"اچھی زندگی" اس کا نام نہیں کہ آدمی کے پاس زندگی کے ساز و سامان کی کثرت ہو۔ اچھی زندگی کا راز قناعت ہے۔ قناعت کی دولت اسے ملتی ہے جو بقدر ضرورت چیزوں پر راضی ہو جائے اور شہرت و عزت سے بے نیاز ہو کر جینا جانتا ہو۔

کسی کو بقدر ضرورت روزی حاصل ہو تو اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ بقدر ضرورت روزی پر مطمئن نہ ہونا صرف حرص کی بنا پر ہوتا ہے اور حریص آدمی کے لئے کبھی اطمینان نہیں۔ کیونکہ بقدر ضرورت کی تو حد ہے مگر حرص کی کوئی حد نہیں۔

بیوی اس لئے ہے کہ وہ زندگی کی رفیق بنے اور آدمی کے لئے گھریلو سکون کا ذریعہ ہو۔ مگر یہ فائدہ صرف نیک اور صالح بیوی سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری تمام خصوصیات جو آدمی ایک عورت میں تلاش کرتا ہے وہ زوال پذیر بھی ہیں اور نئے نئے مسائل پیدا کرنے والی بھی۔

کسی کے پاس کشادہ مکان ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو خود اپنی ایک دنیا حاصل ہے جہاں وہ اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنا کر اس کے اندر رہ سکتا ہے۔ دانش مند آدمی کے لئے کشادہ مکان گویا طوفان نوح کے درمیان ایک کشتی نوح ہے۔

گم نامی آدمی کے لئے سب سے بڑی عافیت ہے۔ کیوں کہ جو شخص نام حاصل کرے اس کو حاسدین کے حسد سے بچنا ممکن نہیں۔ اسی طرح جس شخص کو خدا نے دوسروں کی محتاجی سے بچایا ہو اس سے بڑا خوش قسمت اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ عین اس مقام پر آدمی کو ذلیل کر دیتے ہیں جہاں وہ حاجت مند بن کر ان کے سامنے آیا ہو۔

ٹاپ کی جگہ خالی ہے

کچھ مسلم نوجوان بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ہر ایک ماحول کی شکایت کر رہا تھا
داخلے نہیں ہوتے، ملازمت نہیں ملتی۔ کام نہیں ملتا وغیرہ۔ ایک زیادہ عمر کا تجربہ کار آدمی بھی مجلس میں بیٹھا ہوا
تھا۔ وہ خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں اس نے کہا: آپ لوگوں کی شکایتیں بالکل بے جا ہیں۔
آپ وہاں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں جہاں جگہیں بھری ہوئی ہیں۔ اور جہاں جگہ خالی ہے وہاں پہنچنے کی کوشش نہیں
کرتے۔ آپ لوگ اونچی لیاقت پیدا کیجئے۔ پھر آپ کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ عام جگہیں اگرچہ بھری
ہوئی ہیں۔ مگر ٹاپ کی جگہ ہر طرف خالی ہے۔

امتیاز کامیابی کا راز ہے۔ آپ طالب علم ہوں یا تاجر، آپ وکیل ہوں یا ڈاکٹر، آپ خواہ جس میدان
میں بھی ہوں، اپنے اندر امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کیجئے اور یقیناً آپ کامیاب رہیں گے۔ اگر آپ چوہا پکڑنے
کا اچھا پنجرہ ہی بنانا جانتے ہوں تو لوگ خود آکر آپ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیں گے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے
کہ جس قسم کے "پنجرے" بازار میں بھرے ہوئے ہیں اسی قسم کا ایک اور "پنجرہ" بنا کر بازار میں بیٹھ جاتے ہیں اور
پھر شکایت کرتے ہیں کہ ہمارا پنجرہ فروخت نہیں ہوتا۔ اگر آپ محنت کریں اور اپنے دماغ کو استعمال کر کے امتیاز
پنجرہ بنائیں تو یقیناً لوگ اس کو خریدنے کے لئے ٹوٹ پڑیں گے۔

ہر ماحول میں ہمیشہ تعصب اور تنگ نظری موجود ہوتی ہے۔ یہ بالکل فطری ہے۔ مگر تعصب اور تنگ
نظری کے عمل کی ایک حد ہے۔ اگر آپ اس حد کو پار کر جائیں تو تعصب اور تنگ نظری ہو کر بھی آپ کو کوئی نقصان
نہیں پہنچے گا۔ آپ کے نمبر ۴۰ فی صد ہیں اور آپ کے حریف کے ۶۰ فی صد، تو عین ممکن ہے کہ تعصب آپ
کی راہ میں حائل ہو جائے اور آپ کو نہ لیا جائے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ حریف کے نمبر ۴۰ فی صد ہیں اور آپ کے نمبر ۸۰
فی صد تو تعصب اور تنگ نظری کی تمام دیواریں گر جائیں گی اور یقینی طور پر آپ اپنے حریف کے مقابلہ میں
کامیاب رہیں گے۔

معمولی جگہیں بھری ہوئی ہیں مگر ٹاپ کی جگہ خالی ہے۔ پھر آپ کیوں نہ اس خالی جگہ پر پہنچنے کی کوشش
کریں جو اب بھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ اگر آپ دوسروں سے زیادہ محنت کریں۔ اگر آپ عام معیار سے اونچا
معیار پیش کریں۔ اگر آپ زیادہ بڑھی ہوئی صلاحیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو آپ کے
بے جگہ یا بے روزگار ہونے کا کوئی سوال نہیں ہر جگہ آپ کی جگہ ہے، کیونکہ وہ اب تک کسی آنے والے
انتظار میں خالی پڑی ہوئی ہے۔

صراط مستقیم

انسان کے لئے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ صرف ایک ہے اور وہ خدا کی طرف رخ کرنا ہے۔ یعنی اپنی تمام توجہات اور سرگرمیوں کو خدا کی طرف موڑ دینا۔ خدا کو اپنا سب کچھ بنا کر اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا، یہی صراط مستقیم ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ راستہ منزل سے بھٹکا ہوا راستہ ہے جس میں خدا کی طرف رخ نہ پایا جاتا ہو۔

اپنے نفس کی مانگیں پوری کرنے میں لگا رہنا۔ کسی زندہ یا مردہ شخص کی بڑائی میں گم رہنا، مثبت مقصد کے بجائے منفی چیزوں کی طرف دوڑنا۔ حسد اور بغض اور انتقام اور انانیت کے جذبات کے تحت عمل کرنا۔ قوم یا وطن یا جماعت کو سب سے اونچا مقام دے کر اس کے لئے اپنے کو وقف کر دینا۔ یہ سب ٹیڑھی راہیں ہیں جو اصل راستہ کے دائیں بائیں سے نکلتی ہیں۔ وہ اصل منزل کے اِدھر اُدھر سے گزر جاتی ہیں اور اپنے مسافر کو منزل تک نہیں پہنچاتیں۔

جب بھی ایسا ہو کہ آدمی کے دل میں خدا کے سوا کسی اور کی یاد سما جائے، وہ خدا کے سوا کسی اور کو پکارے اور خدا کے سوا کسی اور کو اپنے جذبات کا مرکز بنالے، اس کی سرگرمیوں کا رخ خدا کے سوا کسی اور چیز کی طرف ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹک گیا، اس نے اپنے "نقطہ" سے خدا کے "نقطہ" کی طرف سفر نہیں کیا۔

ریل گاڑی کی ایک پٹری ہوتی ہے۔ گاڑی اگر پٹری پر چلے تو وہ کامیابی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر اس کے پہیے پٹری کے دائیں بائیں اتر جائیں تو اس کا راستہ کھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ ایسا ہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان اگر سیدھا اپنے خدا کی طرف سفر کرے تو اس کا سفر صحیح طور پہ جاری رہتا ہے اور بالآخر اس کو منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر اس کے سفر کا رخ خدا کی طرف نہ رہے تو وہ بھٹک جاتا ہے اور بربادی کے سوا کسی انجام تک نہیں پہنچتا۔

تعمیر کی فتح

صبح کو وہ سو کر اٹھا تو کمرہ میں چڑیا کا انڈا ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ یہ گوریا کا انڈا تھا جس نے چھت کی لکڑی میں ایک گوشہ پا کر وہاں اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس گھونسلے کی وجہ سے کمرہ میں ہر وقت چڑیوں کا شور رہتا۔ تنکے گرتے رہتے۔ آدمی نے فرش پر ٹوٹا ہوا انڈا دیکھا تو اس نے گھونسلا اجاڑ کر پھینک دیا۔

اگلے دن پھر وہی "چوں چوں" کا شور تھا۔ چڑیاں دوبارہ چھت کی لکڑی میں تنکے جمع کر رہی تھیں۔ شاید اجڑے ہوئے گھونسلے کو دوبارہ بنا بنایا دیکھنے کے جذبہ نے ان کے اندر عمل کا شوق بڑھا دیا تھا۔ دوسرا گھونسلا انھوں نے اس سے کم مدت میں بنا لیا جتنی مدت میں انھوں نے پہلا گھونسلا بنایا تھا۔ چڑیوں کی اس جسارت پر اس کو غصہ آیا اور اس نے دوبارہ ان کا گھونسلا اجاڑ کر پھینک دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے چڑیوں کے اوپر آخری طور پر فتح پالی ہے۔ مگر اگلے دن پھر گھونسلے کا مسئلہ اس کے سر پر موجود تھا۔ چڑیوں نے جب دیکھا کہ ان کا بنا بنایا گھونسلا اجاڑ دیا گیا ہے اور انڈے توڑے جا چکے ہیں تو انھوں نے رونے میں یا فریاد کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ انھوں نے ایسا بھی نہیں کیا کہ باہر جا کر دوسری ہم جنس چڑیوں کو ڈھونڈیں اور ان کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر گھر پر حملہ کریں۔ اس کے برعکس وہ خاموشی سے باہر نکل گئیں اور ایک ایک تنکا لا کر دوبارہ گھونسلا بنانا شروع کر دیا۔

اب یہی روزانہ کا قصہ ہو گیا۔ چڑیاں روزانہ گھونسلا بنانا شروع کرتیں اور آدمی روزانہ اس کو اجاڑ دیتا۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران میں کتنی ہی بار چڑیوں کی محنت ضائع ہوئی۔ ان کے چنے ہوئے تنکے بیکار ہو گئے۔ مگر چڑیاں ان چیزوں سے بے پروا ہو کر اپنا کام کئے جا رہی تھیں۔ آدمی کی نفرت کا جواب چڑیوں کے پاس صرف خاموش عمل تھا۔ آدمی کی تخریب کا مقابلہ ہر بار وہ نئی تعمیر سے کرتی تھیں۔ چڑیوں کا دشمن طاقت ور تھا مگر طاقت ور دشمن کا توڑ انھوں نے اپنے لگاتار عمل میں ڈھونڈھ لیا تھا۔

آخر نفرت پر خاموش عمل غالب آیا۔ چڑیوں کی مسلسل تعمیر نے آدمی کی مسلسل تخریب پر فتح پائی۔ ایک مہینہ کے ناکام مقابلہ کے بعد آدمی تھک چکا تھا۔ اس نے چڑیوں کا گھونسلا اجاڑنا چھوڑ دیا۔ اب گوریا نے اپنے گھونسلے کو مکمل کر کے پھر اس میں انڈے دے دئے ہیں۔ وہ ان کو سینے میں مشغول ہے تاکہ وہ اپنی اگلی نسل پیدا کرے اور پھر اپنا کام کر کے اڑ جائے۔ جب یہ چڑیاں اپنے گھونسلے میں جمع ہوتی ہیں تو ان کا "چوں چوں" کا شور اب بھی کمرہ میں گونجتا ہے۔ مگر اب آدمی کو یہ شور برا نہیں لگتا۔ کیونکہ "چوں چوں" کی آواز میں اس کو یہ قیمتی پیغام سنائی دیتا ہے ——— اپنے دشمن سے نفرت نہ کرو۔ ہر حال میں اپنی تعمیری جدوجہد میں لگے رہو۔ تم کامیاب ہو گے۔

اللہ کی عبادت

عبادت اپنے ظاہر کے اعتبار سے کچھ خاص آداب بجالانے کا نام ہے اور حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ کسی چیز کو اپنے جذباتِ شوق اور جذباتِ احتیاج کا مرکز بنا لیا جائے۔ اس اعتبار سے ہر آدمی کسی نہ کسی کی عبادت کر رہا ہے۔ ہر آدمی کی کوئی سب سے بڑی چاہت ہوتی ہے جس کو پانے کے لئے وہ اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے۔ ہر آدمی کہیں اپنے کو محتاج محسوس کرتا ہے اور اس محتاجی کی تلافی کے لئے وہ کسی نہ کسی کی مدد پر بھروسہ کئے ہوئے ہوتا ہے۔ جب آدمی صرف اللہ کی طرف لپکے اور صرف اللہ پر بھروسہ کرے تو یہی اللہ کی عبادت کرنا ہے اور جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو اپنے ان جذبات کا مرکز بنائے تو وہ اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کر رہا ہے۔

جو شخص اللہ کی عبادت کرے وہ صرف اللہ کو پکارنے لگتا ہے۔ اسی پکار کے ایک روزمرہ طریقہ کا نام نماز ہے۔ وہ اپنے رب میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ضرورتیں بھی اس سے کم ہو جاتی ہیں، اسی کی ایک متعین صورت کا نام روزہ ہے۔ اس کا شوق اس کو اکساتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف دوڑے، اسی کے ایک تاریخی عمل کا نام حج ہے۔ اس کا سابقہ جب انسانوں سے پڑتا ہے تو لوگوں کے ساتھ بھی وہ اسی عنایت کا سلوک کرنے لگتا ہے جس عنایت کو وہ اپنے لئے اپنے رب سے مانگ رہا ہے، اسی کے ایک مقررہ نظام کا نام زکوٰۃ ہے۔

جو شخص اللہ کا عابد ہو، اس کی پوری زندگی اندر سے باہر تک عبادت بن جاتی ہے۔ وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور اللہ اس کا۔ وہ جھکتا ہے تو اللہ کے لئے جھکتا ہے۔ اس کو اندیشہ ہوتا ہے تو صرف اللہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے دل میں محبت کے جذبات امنڈتے ہیں تو صرف اللہ کے لئے امنڈتے ہیں۔ وہ زندگی کے معاملات میں لحاظ کرتا ہے تو صرف اللہ کا لحاظ کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیتا ہے۔

موقع صرف ایک بار

کالج کے ایک پرانے استاد کے ایک جملہ نے مجھے بہت متاثر کیا ——— "زندگی صرف ایک بار ملتی ہے" انھوں نے کہا۔ وہ اپنی زندگی پر تبصرہ کر رہے تھے "میں بی ایس سی کر کے ملازمت میں لگ گیا تھا۔ ایم ایس سی نہیں کیا۔ اب کتنے اچھے اچھے چانس میرے سامنے آتے ہیں۔ مگر میں ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ صرف اس لئے کہ میرے پاس ماسٹر ڈگری نہیں۔ اگر آپ کے پاس اعلیٰ طاقت نہیں ہے تو آپ اعلیٰ مواقع سے فائدہ اٹھانے سے بھی محروم رہیں گے۔"

یہ تبصرہ ہمارے سماج کے تقریباً ۹۹ فی صد لوگوں پر صادق آتا ہے۔ ابتدائی عمر انسان کے لئے تیاری کی عمر ہے۔ مگر بیشتر افراد اس عمر کو پوری طرح استعمال میں نہیں لاتے۔ وہ اپنے بہترین وقت کو سستے مشاغل میں ضائع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور کام کرنے کا وقت آجاتا ہے۔ اب وہ مجبور ہوتے ہیں کہ کمتر تیاری کے ساتھ عملی زندگی کے میدان میں داخل ہو جائیں۔ وہ چاہنے کے باوجود زیادہ ترقی نہیں کر پاتے۔ ان کو ساری عمر اس طرح گزارنی ہوتی ہے کہ اس دنیا میں ان کی صلاحیتوں کے لئے جو آخری امکان مقدر تھا، اس سے بہت کم امکان تک وہ پہنچ پاتے ہیں۔ وہ محرومی اور ناکامی کے احساس کے تحت زندگی گزارتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مرجاتے ہیں۔

اگر آپ کمتر تیاری کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوئے ہیں تو اس دنیا میں آپ اپنا بھرپور حصہ نہیں پاسکتے، اور جو ایک بار محروم رہا وہ گویا ہمیشہ کے لئے محروم رہا۔ کیونکہ ——— زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، بار بار نہیں ملتی۔

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ مگر پتھر اس شخص کے لئے نرم ہو جاتا ہے جس نے اس کو توڑنے کا اوزار فراہم کر لیا ہو۔ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو ہر جگہ آپ اپنا حق وصول کر کے رہیں گے۔ اور اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی مفروضہ حق تلفی کے خلاف فریاد و احتجاج کرتے رہیں۔

ماحول سے امید نہ رکھئے بلکہ اپنی محنت اور لیاقت پر بھروسہ کیجئے، آپ کو کبھی ماحول سے شکایت نہ ہوگی۔ ماحول کی شکایت دراصل ماحول سے زیادہ خود اپنی نالائقی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ مطلوبہ تیاری نہیں کی تھی جو ماحول سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے ضروری ہے۔

پتھر کا سبق

راجستھان کا ایک طالب علم ہائی اسکول میں فیل ہوگیا۔ دوسرے سال اس نے پھر امتحان دیا۔ مگر وہ دوبارہ فیل ہوگیا۔ اس کے بعد جب اس کا تیسرے سال کا نتیجہ آیا اور اس نے دیکھا کہ وہ اب بھی فیل ہے تو اس کو سخت دھکا لگا۔ وہ اتنا بیزار ہوا کہ گھر سے بھاگ نکلا۔

چلتے چلتے وہ ایک گاؤں کے کنارے پہنچا۔ اس کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک کنواں ہے جس پر کچھ عورتیں اور بچے پانی بھر رہے ہیں۔ وہ کنویں کے پاس پہنچا تاکہ اپنی پیاس بجھا سکے۔ مگر وہاں اس نے ایک منظر دیکھا۔ منظر بظاہر چھوٹا سا تھا مگر وہ اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنی پیاس بھول گیا۔ اس کو اچانک محسوس ہوا کہ اس نے پانی سے زیادہ بڑی ایک چیز پالی ہے۔

اس نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ جو پانی بھرنے کے لئے کنویں پر آتے ہیں، عام طور پر ان کے ساتھ دو عدد مٹی کے گھڑے ہوتے ہیں۔ ایک گھڑے کو وہ کنویں کے قریب ایک پتھر پر رکھ دیتے ہیں اور دوسرے گھڑے کو کنویں میں ڈال کر پانی نکالتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ جس پتھر پر گھڑا رکھا جاتا ہے وہ گھڑا رکھتے رکھتے گھس گیا ہے۔

"گھڑا مٹی کی چیز ہے" اس نے سوچا "مگر جب وہ بار بار بہت دنوں تک ایک جگہ رکھا گیا تو اس کی رگڑ سے پتھر گھس گیا۔ استقلال کے ذریعہ مٹی نے پتھر کے اوپر فتح حاصل کر لی۔ مسلسل عمل نے کمزور کو طاقت ور کے اوپر غالب کر دیا۔ پھر اگر میں برابر محنت کروں تو کیا میں امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیا کوشش کے اضافہ سے میں اپنی کمی پر قابو نہیں پا سکتا۔"

یہ سوچ کر بھاگتے ہوئے طالب علم کے قدم رک گئے۔ وہ لوٹ کر اپنے گھر واپس آگیا اور دوبارہ تعلیم میں اپنی محنت شروع کر دی۔ اگلے سال وہ چوتھی بار ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھا۔ اس بار نتیجہ حیرت انگیز طور پر مختلف تھا۔ اس کے پرچے اتنے اچھے ہوئے کہ وہ اول درجہ میں پاس ہوگیا۔ تین بار ناکام ہونے والے نے چوتھی کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پتھر کا یہ سبق نوجوان کی زندگی کے لئے اتنا اہم ثابت ہوا کہ اس کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ جو طالب علم ہائی اسکول میں مسلسل ناکام ہو کر بھاگا تھا وہ اس کے بعد مسلسل فرسٹ آنے لگا۔ یہاں تک کہ ایم اے میں اس نے ٹاپ کیا۔ اس کے بعد وہ ایک اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونی ملک میں گیا۔ اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آج وہ ایک ہندستانی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیمی عہدے پر فائز ہے

یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں جو صرف ایک گاؤں میں پیش آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ ایسے "پتھر" موجود ہیں جو آدمی کو زندگی کا سبق دے رہے ہیں جو ناکامیوں میں سے کامیاب بن کر نکلنے کا اشارہ دیتے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر نصیحت لینے کا مزاج ہو تو وہ اپنے قریب ہی ایسا ایک "پتھر" پالے گا جو خاموش زبان میں اس کو وہی پیغام دے رہا ہو جو مذکورہ نوجوان کو اپنے پتھر سے ملا تھا۔

اعتراف

بھوپال کے قریب ایک گاؤں کا واقعہ ہے۔ لوگ عام طور پر جاہل اور نماز وغیرہ سے بے تعلق تھے۔ ایک عالم اس گاؤں میں جانے لگے۔ انھوں نے لوگوں کو غیرت دلائی اور ان کو جوڑ کر نماز پر آمادہ کیا اور وہاں جمعہ بھی قائم کیا۔ اب وہاں پنج وقتہ نماز اور جمعہ ہونے لگا۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ شاہ محمد یعقوب مجددی (۱۳۳۹ - ۱۲۰۳ھ) کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کل تک یہاں ٹھہریں اور کل آپ ہی یہاں جمعہ پڑھائیں۔ حضرت شاہ صاحب کی نظر مسئلہ پر گئی۔ انھوں نے کہا کہ ایسے چھوٹے گاؤں میں مسئلہ کی رو سے جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ یہ کہہ کر وہ شہر واپس آگئے تاکہ یہاں جمعہ کی نماز ادا کر سکیں۔

اس کے بعد مذکورہ عالم کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں نماز کا نظام ٹوٹ گیا ہے۔ لوگوں نے اپنے گاؤں میں نماز جمعہ کی ادائگی چھوڑ دی اور کسی بڑے مقام پر بھی جمعہ پڑھنے کے لئے نہیں گئے۔ لوگوں نے شکایت کی کہ آپ نے یہاں جمعہ قائم کر دیا اور حضرت پیر صاحب آئے تھے تو انھوں نے بتایا کہ اس گاؤں میں جمعہ کی نماز جائز ہی نہیں۔ چنانچہ ہم نے جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

مذکورہ عالم یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور فوراً روانہ ہو کر حضرت شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔ انھوں نے حضرت شاہ صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے گاؤں والوں سے یہ کہا ہے کہ یہاں جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے کہا ہاں میں نے کہا ہے۔ اور مسئلہ تو یہی ہے۔ مذکورہ عالم نے کہا کہ حضرت آپ درست فرماتے ہیں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگ نماز چھوڑے ہوئے تھے۔ ان کو کہہ سن کر نماز کی طرف متوجہ کیا ہے۔ شرائط جمعہ کے مسائل اپنی جگہ صحیح ہیں۔ مگر ابھی ان لوگوں میں اتنی رغبت نہیں کہ وہ جمعہ کی خاطر سفر کر کے باہر جائیں اور مرکزی مقام پر جمعہ کی نماز ادا کریں۔ ان کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے میں نے وہاں جمعہ کی نماز شروع کرادی تھی تاکہ کسی طرح وہ عادی ہو جائیں۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی نے یہ سنا تو فرمایا کہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس کے بعد اگلے جمعہ کو وہ دوبارہ گاؤں میں گئے اور لوگوں سے کہا کہ مذکورہ عالم کا جمعہ قائم کرنا بالکل صحیح تھا۔ دراصل یہ کہ میں نے متن دیکھا تھا، حاشیہ نہیں دیکھا۔ حاشیہ میں وہ مسئلہ موجود ہے جو مولوی صاحب نے تم لوگوں کو بتایا۔ اب تم لوگ پہلے کی طرح یہاں نماز جمعہ ادا کرو" اس کے بعد خود وہاں کے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔ اور پھر شہر واپس آئے۔

مجھے آخرت تک جانا ہے

مولانا اشرف علی تھانوی ایک بار ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ان کو اعظم گڑھ جانا تھا۔ ایک ریلوے گارڈ جوان کا معتقد تھا اسٹیشن پر ان سے ملنے کے لئے آیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی بھی آگیا۔ اس نے گنّے کا ایک گٹھا تحفہ کے طور پر مولانا کو پیش کیا۔ مولانا نے قبول کر لیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ ان گنوں کا وزن کرا کے ان کو بک کر والو۔ گارڈ نے کہا: بک کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس ٹرین سے جو گارڈ جا رہا ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ خیال رکھے گا۔ مولانا نے کہا کہ تمہارا گارڈ تو اسی ٹرین تک ساتھ رہے گا اور مجھے آگے جانا ہے۔ گارڈ نے سمجھا کہ مولانا کو آگے کسی اسٹیشن پر یہ ٹرین بدل کر دوسری ٹرین پکڑنا ہے۔ اس نے کہا: کوئی ہرج نہیں۔ میں گارڈ کو بتا دیتا ہوں وہ آگے والے گارڈ سے بھی کہہ دے گا اور آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ مولانا نے کہا: مجھے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ گارڈ نے حیرت سے پوچھا: آخر آپ کہاں تک جائیں گے۔ ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اعظم گڑھ جا رہے ہیں۔ مولانا نے کسی قدر خاموشی کے بعد کہا: مجھے آخرت تک جانا ہے، وہاں تک کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا"

یہ معاملہ محض ریل کے سفر کا نہیں بلکہ تمام معاملات کا ہے۔ آدمی کا ہر معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ دنیا میں کوئی "گارڈ" وقتی طور پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ مگر آخرت کی منزل پر پہنچ کر کوئی گارڈ ساتھ دینے والا نہیں۔ جس کا ذہن یہ ہو کہ مجھے آخرت تک جانا ہے وہ ہر اس چیز کو بے قیمت سمجھے گا جو آخرت میں بے قیمت ہو جانے والی ہو، خواہ آج وہ کتنی ہی قیمتی نظر آئے۔ اسی طرح وہ ہر اس چیز کو وزن دینے پر مجبور رہتا ہے جو آخرت میں باوزن ثابت ہونے والی ہو، خواہ آج کی دنیا میں بظاہر وہ کتنی ہی بے وزن دکھائی دے۔

آدمی حق کا انکار کرنے کے لئے آج خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے۔ مگر آخرت میں اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔ آدمی طاقت کے بل پر بے انصافی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ مظلوم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر آخرت میں وہ دیکھے گا کہ اس کی طاقت پیچھے کی دنیا میں رہ گئی ہے، آخرت میں وہ اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہے۔ آدمی کے ساز و سامان اس کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اپنے گھمنڈ کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر آخرت میں وہ پائے گا کہ اس کے وہ ساز و سامان اس سے بہت دور ہو چکے ہیں جن کے اوپر وہ گھمنڈ کیا کرتا تھا۔

مومن اور غیر مومن کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ غیر مومن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اس کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور مومن اس نفسیات کے ساتھ جیتا ہے کہ اس کو آخرت تک جانا ہے۔ نفسیات کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں اتنا زیادہ عملی فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اسے طاقت ہو۔ اور جب بولو تو انصاف کی بات بولو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کا اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ یہی میری سیدھی شاہراہ ہے۔ پس اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے جدا کردیں گی۔ یہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچتے رہو ۱۵۲-۵۳

یتیم کسی سماج کا سب سے کمزور فرد ہوتا ہے۔ وہ تمام اضافی اسباب اس کی ذات میں حذف ہوجاتے ہیں جو عام طور پر کسی کے ساتھ اچھے سلوک کا محرک بنتے ہیں۔ "یتیم" کے ساتھ ذمہ داری کا معاملہ وہی شخص کرسکتا ہے جو خالص اصولی بنیاد پر باکردار بنا ہو نہ کہ فائدہ اور مصلحت کی بنیاد پر۔ یتیم کسی سماج میں حسن سلوک کی آخری علامت ہوتا ہے۔ جو شخص یتیم کے ساتھ خیر خواہانہ سلوک کرے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بدرجہ اولیٰ خیر خواہانہ سلوک کرے گا۔

کائنات کی ہر چیز دوسری چیز سے اس طرح وابستہ ہے کہ ہر چیز دوسرے کو وہی دیتی ہے جو اس کو دینا چاہئے اور دوسرے سے وہی چیز لیتی ہے جو اس کو لینا چاہئے۔ یہی اصول انسان کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ جب وہ دوسرے انسان کے لئے ناپے تو ٹھیک ناپے اور جب تولے تو ٹھیک تولے۔ ایسا نہ کرے کہ اپنے لئے ایک پیمانہ استعمال کرے اور غیر کے لئے دوسرا پیمانہ۔

زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی کو کسی کے خلاف اظہار رائے کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر خدا کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی وہی بات کہے جو انصاف کے معیار پر پوری اترنے والی ہو۔ کوئی اپنا ہو یا غیر ہو۔ اس سے دوستی کے تعلقات ہوں یا دشمنی کے تعلقات، ایسا شخص ہو جس سے کوئی فائدہ وابستہ ہے یا ایسا شخص ہو جس سے کوئی فائدہ وابستہ نہیں، ان تمام چیزوں کی پروا کئے بغیر آدمی وہی کہے جو فی الواقع درست اور حق ہے۔

ہر آدمی فطرت کے عہد میں بندھا ہوا ہے۔ کوئی عہد لکھا ہوا ہوتا ہے اور کوئی عہد وہ ہوتا ہے جو لفظوں میں لکھا ہوا نہیں ہوتا مگر آدمی کا ایمان، اس کی انسانیت اور اس کی شرافت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس موقع پر ایسا کیا جائے۔ دونوں قسم کے عہدوں کو پورا کرنا ہر مومن ومسلم کا فریضہ ہے —— یہ تمام باتیں انتہائی واضح ہیں۔ آسمانی وحی اور آدمی کی عقل ان کے برحق ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ مگر ان سے وہی شخص نصیحت پکڑے گا جو خود بھی نصیحت پکڑنا چاہتا ہو۔

یہ احکام (۱۵۱-۵۲) شریعت الٰہی کے بنیادی احکام ہیں۔ ان پر ان کے سیدھے مفہوم کے اعتبار سے عمل کرنا خدا کی سیدھی شاہراہ پر چلنا ہے۔ اور اگر تاویل اور موشگافیوں کے ذریعہ ان میں شاخیں نکالی جائیں اور سارا زور ان شاخوں پر دیا جانے لگے تو یہ ادھر ادھر کے متفرق راستوں میں بھٹکنا ہے جو کبھی آدمی کو خدا تک نہیں پہنچاتا۔

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی نیک کام کرنے والوں پر اپنی نعمت پوری کرنے کے لئے اور ہر بات کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں۔ اور اسی طرح ہم نے یہ کتاب اتاری ہے، ایک برکت والی کتاب ۔ پس اس پر چلو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ اس لئے کہ تم یہ نہ کہنے لگو کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی اور ہم ان کو پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے بہتر راہ پر چلنے والے ہوتے۔ پس آچکی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت۔ تو اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ جو لوگ ہماری نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں ہم ان کو ان کے اعراض کی پاداش میں بہت برا عذاب دیں گے۔ یہ لوگ کیا اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمہارا رب آئے یا تمہارے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو۔ جس دن تمہارے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی آپہنچے گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لاچکا ہو یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی ہو۔ کہو تم راہ دیکھو، ہم بھی راہ دیکھ رہے ہیں ۱۵۸ — ۱۵۵

خدا کی طرف سے جو کتاب آتی ہے اس میں اگرچہ بہت سی تفصیلات ہوتی ہیں مگر بالآخر اس کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے یہ کہ آدمی اپنے رب کی ملاقات پر یقین کرے۔ یعنی دنیا میں وہ اس طرح زندگی گزارے کہ وہ اپنے ہر عمل کے لئے اپنے آپ کو خدا کے یہاں جواب دہ سمجھتا ہو۔ اس کی زندگی ایک ذمہ دارانہ زندگی ہو نہ کہ آزاد اور بے قید زندگی۔ یہی پچھلی کتابوں کا مقصد تھا اور یہی قرآن کا مدعا بھی ہے۔

خدا نے بقیہ دنیا کو براہ راست اپنے جبری حکم کے تحت اپنا پابند بنا رکھا ہے۔ مگر انسان کو اس نے پورا اختیار دے دیا ہے۔ اس نے انسان کی ہدایت کا یہ طریقہ رکھا ہے کہ رسول اور کتاب کے ذریعہ دلائل کی زبان میں وہ لوگوں کو حق اور باطل سے باخبر کرتا ہے۔ دنیا میں خدا کی مرضی لوگوں کے سامنے دلیل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں دلیل کو ماننا خدا کو ماننا ہے اور دلیل کو جھٹلانا خدا کو جھٹلانا۔

قیامت کا دھماکہ ہونے کے بعد تمام چھپی ہوئی حقیقتیں لوگوں کے سامنے آجائیں گی۔ اس وقت ہر آدمی خدا اور اس کی باتوں کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ مگر اس وقت کے ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔ ماننا وہی ماننا ہے جو حالتِ غیب میں ماننا ہو۔ ایمان دراصل یہ ہے کہ دیکھنے کے بعد آدمی جو کچھ ماننے پر مجبور ہوگا اس کو وہ دیکھے بغیر مان لے۔ جو شخص دیکھ کر مانے اس نے گویا مانا ہی نہیں۔

جو لوگ آج اختیار کی حالت میں اپنے کو خدا کا پابند بنالیں ان کے لئے خدا کے یہاں جنت ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ قیامت کے آنے کے بعد خدا کے آگے جھکیں گے ان کا جھکنا صرف ان کے جرم کو مزید ثابت کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے، خود اپنے اعتراف کے مطابق، ایک ماننے والی بات کو نہ مانا، انھوں نے ایک کئے جانے والے کام کو نہ کیا۔

جنھوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور گروہ گروہ بن گئے تم کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر وہی ان کو بتادے گا جو وہ کرتے تھے۔ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے۔ اور جو شخص برائی لے کر آئے گا تو اس کو بس اس کے برابر بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۱۶۰-۱۵۹

دین یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کے سوا کسی کو اپنی زندگی میں برتر مقام نہ دے۔ وہ حق شناسی کی بنیاد پر تعلقات قائم کرے نہ کہ مفاد کی بنیاد پر، جس کی پہلی علامت والدین ہیں۔ وہ رزق کو خدا کا عطیہ سمجھے اور خدائی نظام میں مداخلت نہ کرے، اس معاملہ میں آدمی کی گمراہی اس کو قتل اولاد اور تحدید نسل کی حماقت تک لے جاتی ہے۔ وہ فحش اور بے حیائی کے کاموں سے بچے تاکہ برائی کے بارے میں اس کے دل کی حساسیت زندہ رہے۔ وہ کم زور کا استحصال نہ کرے جس کا قریبی امتحان آدمی کے لئے یتیم کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ حقوق کی ادائگی اور لین دین میں ترازو کی طرح بالکل ٹھیک رہے۔ وہ اپنی زبان کا استعمال ہمیشہ حق کے مطابق کرے۔ وہ اس احساس کے ساتھ زندگی گزارے کہ ہر حال میں وہ عہد خداوندی میں بندھا ہوا ہے، وہ کسی بھی وقت خدائی عہد کی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہے۔ یہی کسی آدمی کے لئے خدا کی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کا سیدھا راستہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دائیں اور بائیں بھٹکے بغیر اس سیدھے راستہ پر ہمیشہ قائم رہے۔

اوپر جو دس احکام (۱۵۳-۱۵۱) بیان ہوئے وہ سب سادہ فطری احکام ہیں۔ ہر آدمی کی عقل ان کے سچے ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ اگر صرف ان چیزوں پر زور دیا جائے تو کبھی اختلاف اور فرقہ بندی نہ ہو۔ مگر جب قوموں پر زوال آتا ہے تو ان میں ایسے رہنما پیدا ہوتے ہیں جو ان سادہ احکام میں طرح طرح کی غیر فطری شقیں نکالتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو دینی اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

توحید میں اگر یہ بحث چھیڑی جائے کہ خدا جسم رکھتا ہے یا وہ بغیر جسم ہے۔ یتیم کے معاملہ میں موشگافیاں کی جائیں کہ یتیم ہونے کی شرائط کیا ہیں۔ یا یہ نکتہ نکالا جائے کہ ان خدائی احکام پر اس وقت تک عمل نہیں ہوسکتا جب تک حکومت پر قبضہ نہ ہو۔ اس لئے سب سے پہلا کام "غیر اسلامی" حکومت کو بدلنا ہے ـــــــ اس قسم کی بحثیں اگر شروع کر دی جائیں تو ان کی کوئی حد نہ ہوگی۔ اور ان پر عمومی اتفاق حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے بعد مختلف فکری حلقے بنیں گے۔ الگ الگ فرقے اور جماعتیں قائم ہوں گی۔ باہمی اتفاق باہمی افتراق کی صورت اختیار کرے گا۔

اس سادہ اور فطری دین پر اپنی ساری توجہ لگانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ مگر اس کے لئے آدمی کو نفس سے لڑنا پڑتا ہے۔ ماحول کی ناسازگاری کے باوجود صبر اور قربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اس پر جمے رہنا ہوتا ہے۔ یہ ایک بڑا پُرمشقت عمل ہے اس لئے اس کا بدلہ بھی خدا کے یہاں کئی گن بڑھا کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ برائی کرتے ہیں، جو خدا کی دنیا میں خدا کے مقرر راستہ کے سوا دوسرے راستوں پر چلتے ہیں وہ اگرچہ بہت بڑا جرم کرتے ہیں۔ تاہم خدا ان کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کرتا۔ وہ ان کو اتنی ہی سزا دیتا ہے جتنا انھوں نے جرم کیا ہے۔

کہو میرے رب نے مجھ کو سیدھا راستہ بتادیا ہے۔ دین صحیح ابراہیم کی ملت کی طرف جو یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ کہو میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو رب ہے سارے جہان کا۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلے فرماں بردار ہوں۔ کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں جب کہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور جو شخص بھی کوئی کمائی کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹنا ہے۔ پس وہ تمھیں بتادے گا وہ چیز جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تم میں سے ایک کا رتبہ دوسرے پر بلند کیا۔ تاکہ وہ آزمائے تم کو اپنے دئے ہوئے میں۔ تمھارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے ۱۶۱ - ۶۵

قرآن کی صورت میں خدا نے اپنا وہ بے آمیز دین نازل کردیا ہے جو اس نے حضرت ابراہیم اور دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا۔ اب جو شخص خدا کی رحمت و نصرت میں حصہ دار بننا چاہتا ہو وہ اس دین کو پکڑلے، وہ اپنی عبادت کو خدا کے لئے خاص کردے۔ وہ خدا سے قربانی کی سطح پر تعلق قائم کرے۔ وہ جیے تو خدا کے لئے جیے اور اس کو موت آئے تو اس حال میں آئے کہ وہ ہمہ تن خدا کا بندہ بنا ہوا ہو۔ عظیم کائنات اپنے تمام اجزاء کے ساتھ اطاعت خداوندی کے اسی دین پر قائم ہے۔ پھر انسان اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ کیسے اختیار کرسکتا ہے۔ خدا کی اطاعت کی دنیا میں خدا کی سرکشی کا طریقہ اختیار کرنا کسی کے لئے کامیابی کا سبب کس طرح بن سکتا ہے۔ یہ معاملہ ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے۔ کوئی نہ کسی کے انعام میں شریک ہوسکتا اور نہ کوئی کسی کی سزا میں۔ آدمی کو چاہئے کہ اس معاملہ میں وہ اسی طرح سنجیدہ ہو جس طرح دنیا میں کوئی مسئلہ کسی کا ذاتی مسئلہ ہو تو وہ اس میں آخری حد تک سنجیدہ ہوجاتا ہے۔

دنیا کا نظام یہ ہے کہ یہاں ایک شخص جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آتا ہے۔ ایک قوم پیچھے ہٹادی جاتی ہے اور دوسری قوم اس کے بجائے زمین کے ذرائع و وسائل پر قبضہ کرلیتی ہے۔ یہ واقعہ بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہاں کسی کا اقتدار دائمی نہیں۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو زمین پر موقع ملتا ہے تو وہ گزرے ہوئے لوگوں کے انجام کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے ظلم اور سرکشی کو جائز ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل گھڑلیتا ہے۔ مگر جب خدا حقیقتوں کو برہنہ کرے گا تو آدمی دیکھے گا کہ اس کی ان باتوں کی کوئی قیمت نہ تھی جن کو وہ اپنے موقف کے جواز کے لئے مضبوط دلیل سمجھے ہوئے تھا۔

دنیا میں آدمی کی سرکشی کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں کو اپنے حق میں خدا کا انعام سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ صرف بطور آزمائش ہے نہ کہ بطور انعام۔ دنیا کی چیزوں کو آدمی اگر انعام سمجھے تو اس کے اندر فخر پیدا ہوگا اور اگر وہ ان کو آزمائش سمجھے تو اس کے اندر عجز پیدا ہوگا۔ فخر کی نفسیات ڈھٹائی پیدا کرتی ہے اور عجز کی نفسیات اطاعت۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف لام میم صاد۔ یہ کتاب ہے جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے۔ پس تمھارا دل اس کے باعث تنگ نہ ہو تاکہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈراؤ، اور وہ ایمان والوں کے لئے یاددہانی ہے۔ جو اترا ہے تمھاری جانب تمھارے رب کی طرف سے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ تم بہت کم نصیحت مانتے ہو۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب رات کو آپہنچا یا دوپہر کو جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ پھر جب ہمارا عذاب ان پر آیا تو وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے کہ واقعی ہم ظالم تھے۔ پس ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان لوگوں سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے، اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے۔ پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کردیں گے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غائب نہ تھے۔ اس دن وزن دار صرف حق ہو گا۔ پس جن کی تولیں بھاری ہوں گی وہی لوگ کامیاب ٹھہریں گے اور جن کی تولیں ہلکی ہوں گی وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، کیونکہ وہ ہماری نشانیوں کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے ۱-۹

خدا کی کتاب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک نصیحت ہے۔ مگر وہ عملاً صرف ان تھوڑے سے لوگوں کے لئے نصیحت بنتی ہے جو اپنی فطری صلاحیت کو زندہ کئے ہوئے ہوں۔ بقیہ لوگوں کے لئے وہ صرف اس برے انجام سے ڈرانے کے ہم معنی ہو کر رہ جاتی ہے جس کی طرف وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے بڑھ رہے ہیں۔ داعی یہ دیکھ کر تڑپتا ہے کہ جو چیز مجھے کامل صداقت کے روپ میں دکھائی دے رہی ہے اس کو بیشتر لوگ باطل سمجھ کر ٹھکرا رہے ہیں۔ جو چیز میری نظر میں پہاڑ سے بھی زیادہ اہم ہے اس کے ساتھ لوگ ایسا بے پروائی کا سلوک کر رہے ہیں جیسے اس کی کچھ حقیقت ہی نہ ہو، جیسے وہ بالکل بے اصل ہو۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کے لئے موقع ہے کہ اگر وہ کسی بات کو نہ ماننا چاہے تو وہ اس کو نہ مانے، حتیٰ کہ وہ اس کو رد کرنے کے لئے خوبصورت الفاظ بھی پالے۔ مگر یہ صورت حال بالکل عارضی ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اچانک کھل جائے گا کہ داعی کی بات لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ ثابت شدہ تھی۔ یہ صرف مخالفین کا تعصب اور ان کی انانیت تھی جس نے انھیں دلیل کو دلیل کی صورت میں دیکھنے نہ دیا۔ اس وقت کھل جائے گا کہ داعی حق کی باتوں کی رد میں جو دلیلیں وہ پیش کرتے تھے وہ محض دھاندلی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی استدلال۔

دنیا میں جو چیزیں کسی کو باوزن بناتی ہیں وہ یہ کہ اس کے گرد مادی رونقیں جمع ہوں۔ وہ الفاظ کے دریا بہانے کا فن جانتا ہو۔ اس کے ساتھ عوام کی بھیڑ اکھٹا ہو گئی ہو۔ چونکہ حق کے داعی کے ساتھ عام طور پر یہ اسباب جمع نہیں ہوتے اس لئے دنیا کے لوگوں کی نظر میں اس کی بات بے وزن اور اس کے مخالفوں کی بات وزن دار بن جاتی ہے۔ مگر قیامت جب مصنوعی پردوں کو پھاڑے گی تو صورت حال بالکل برعکس ہو جائے گی۔ اب سارا وزن حق کی طرف ہو گا اور ناحق بالکل بے دلیل اور بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

اور ہم نے تم کو زمین میں جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے اس میں زندگی کا سامان فراہم کیا، مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔ اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس انھوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ خدا نے کہا کہ تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے۔ پس نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لئے تو مجھے مہلت دے جب کہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لئے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے، اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے کہا کہ نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا ۱۰—۱۸

خدا نے انسان کو اس دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس لئے دیا ہے کہ اس کا نفسیاتی جواب وہ شکر کی صورت میں پیش کرے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جس کو آدمی اپنے رب کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان اس کے اندر دوسرے دوسرے جذبات ابھار کر اس کو شکر کی نفسیات سے دور کر دیتا ہے۔

آدم اور ابلیس کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور گمراہی کا معرکہ کہاں برپا ہے۔ یہ معرکہ ان مواقع پر برپا ہے جہاں آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جاگتی ہیں۔ امتحان کی اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص دولت و عزت میں دوسرے سے زیادہ حصہ پا لیتا ہے۔ کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاملہ پڑتا ہے کہ ایک شخص کے لئے دوسرے کو اس کا جائز حق دینا اپنے کو نیچے گرانے کے ہم معنی نظر آتا ہے۔ کبھی کسی شخص کی زبان سے خدا ایک سچائی کا اعلان کراتا ہے اور وہ ان لوگوں کو اپنے سے برتر دکھائی دینے لگتا ہے جو اس سچائی تک پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔ ایسے مواقع پر شیطان آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جگا دیتا ہے۔ "میں بہتر ہوں" کے جذبے سے مغلوب ہو کر وہ اپنے بھائی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہی خدا کی نظر میں شیطان کے راستہ پر چلنا ہے۔ جس شخص نے ایسے مواقع پر حسد اور گھمنڈ کا طریقہ اختیار کیا اس نے اپنے کو جہنمی انجام کا مستحق بنا لیا جو شیطان کے لئے مقدر ہے اور جس نے ایسے مواقع پر شیطان کے پیدا کئے ہوئے جذبات کو اپنے اندر کچل ڈالا اس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ اس قابل ہے کہ اس کو جنت کے باغوں میں بسایا جائے۔

جو کچھ کسی کو ملتا ہے خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے کسی کی فضیلت کا اعتراف در اصل خدا کی تقسیم کے برحق ہونے کا اعتراف ہے اور اس کی فضیلت کو نہ ماننا خدا کی تقسیم کو نہ ماننا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کسی حق کی بنا پر دوسرے کے آگے جھکتا ہے تو وہ کسی آدمی کے آگے نہیں جھکتا بلکہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ کیونکہ ایسا وہ خدا کے حکم کی بنا پر کر رہا ہے نہ کہ اس آدمی کے ذاتی فضل کی بنا پر۔

اور اے آدم، تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو اور کھاؤ جہاں سے چاہو۔ مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے دونوں کو بہکایا تاکہ وہ کھول دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ تمھارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لئے روکا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتہ نہ بن جاؤ یا تم کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے۔ اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں ۱۹-۲۱

جنت اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ آدم اور ان کی بیوی کے لئے کھلی ہوئی تھی۔ اس میں طرح طرح کی چیزیں تھیں اور خدا کی طرف سے ان کو آزادی تھی کہ ان کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ بے شمار جائز چیزوں کے درمیان صرف ایک چیز کے استعمال سے روک دیا گیا تھا۔ شیطان نے اسی ممنوعہ مقام سے ان پر حملہ کیا۔ اس نے وسوسہ اندازیوں کے ذریعہ سکھایا کہ جس چیز سے تمھیں روکا گیا ہے وہی جنت کی اہم ترین چیز ہے۔ اسی میں تقدس اور ابدیت کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔ آدم اور ان کی بیوی ابلیس کی مسلسل تلقین سے متاثر ہو گئے۔ اور بالآخر ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا۔ مگر جب انھوں نے ایسا کیا تو نتیجہ ان کی توقعات کے بالکل برعکس نکلا۔ ان کی اس خلاف ورزی نے خدا کا لباس حفاظت ان کے جسم سے اتار دیا۔ وہ اس دنیا میں بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے جہاں اس سے پہلے ان کو ہر طرح کی سہولت اور حفاظت حاصل تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا وہ خاص حربہ کیا ہے جس سے وہ انسان کو بہکا کر خدا کی رحمت و نصرت سے دور کر دیتا ہے۔ وہ ہے ——— حلال رزق کے پھیلے ہوئے میدان کو آدمی کی نظر میں کمتر کر کے دکھانا اور جو چند چیزیں حرام ہیں ان کو خوبصورت طور پر پیش کر کے یقین دلانا کہ تمام بڑے بڑے فائدوں اور مصلحتوں کا راز بس انھیں چند چیزوں میں چھپا ہوا ہے۔

شیطان اپنا یہ کام ہر ایک کے ساتھ اس کے اپنے ذوق اور حالات کے اعتبار سے کرتا ہے۔ کسی کو تمام قیمتی غذاؤں سے بے رغبت کر کے یہ سکھاتا ہے کہ شاندار تندرستی حاصل کرنا چاہتے ہو تو شراب پیو۔ کہیں لاکھوں بے روزگار مرد کام کرنے کے لئے موجود ہوں گے مگر وہ ترغیب دے گا کہ اگر ترقی کی منزل تک جلد پہنچنا چاہتے ہو تو عورتوں کو گھر سے باہر لا کر انھیں مختلف تمدنی شعبوں میں سرگرم کر دو۔ کسی کے پاس اپنے مخالف کو زیر کرنے کا یہ قابل عمل طریقہ موجود ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مستحکم بنائے مگر شیطان اس کے کان میں ڈالے گا کہ تمھارے لئے اپنے مخالف کو شکست دینے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ اس کے خلاف تخریبی کارروائیاں شروع کر دو۔ کسی کے لئے "اپنی تعمیر آپ" کے میدان میں کام کرنے کے لئے بے شمار مواقع کھلے ہوئے ہوں گے مگر وہ سکھائے گا کہ دوسروں کے خلاف احتجاج اور مطالبہ کا طوفان برپا کرنا اپنے کو کامیابی کی طرف لے جانے کا سب سے زیادہ قریبی راستہ ہے۔ کسی کے سامنے حکومت وقت سے تصادم کئے بغیر بے شمار دینی کام کرنے کے لئے موجود ہوں گے مگر وہ اس کو اس غلط فہمی میں ڈالے گا کہ غیر اسلامی حکمرانوں کو اگر کسی نہ کسی طرح پھانسی پر چڑھا دیا جائے یا ان کو گولی مار کر ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد آناً فاناً اسلام کا مکمل نظام سارے ملک میں قائم ہو جائے گا، وغیرہ۔

پس مائل کرلیا ان کو فریب سے ۔ پھر جب دونوں نے درخت کا پھل چکھا تو ان کی شرمگاہیں ان پر کھل گئیں۔ اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو پکارا کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے ۔ انھوں نے کہا، اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ۔ خدا نے کہا، اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، اور تمھارے لئے زمین میں ایک خاص مدت تک ٹھہرنا اور نفع اٹھانا ہے ۔ خدا نے کہا، اسی میں تم جیو گے اور اسی میں تم مروگے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے ۲۵ – ۲۲

آدم اور شیطان دونوں ایک دوسرے کے دشمن کی حیثیت سے زمین پر بھیجے گئے ہیں۔ اب قیامت تک دونوں کے درمیان یہی جنگ جاری ہے ۔ شیطان کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے راستہ پر لائے اور جس طرح وہ خود خدا کی رحمت سے محروم ہوا ہے انسان کو بھی خدا کی رحمت سے محروم کردے ۔ اس کے مقابلہ میں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ شیطان کے منصوبہ کو ناکام بنادے ۔ وہ شیطان کی پکار کو نظر انداز کرکے خدا کی پکار کی طرف دوڑے ۔

آدم اور شیطان کی یہ جنگ عملاً انسانوں میں دو گروہ بن جانے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ۔ کچھ لوگ شیطان کی ترغیبات کا شکار ہو کر اس کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ اور کچھ لوگ خدا کی آواز پر لبیک کہہ کر یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ شیطان کے تمام ساتھی اس کو بے عزت کرنے اور ناکام بنانے کے لئے ہر قسم کی تدبیریں کرنا شروع کردیں ۔ ہر دور میں یہ دیکھا گیا ہے کہ سچے حق پرست جو ہمیشہ کم تعداد میں ہوتے ہیں، لوگوں کی سخت ترین عداوتوں کا شکار رہتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہی شیطان کی دشمنانہ کارروائیاں ہیں ۔ وہ لوگوں کو سچے حق پرست آدمی کے خلاف بھڑکا دیتا ہے ۔ وہ مختلف طریقہ سے لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت کی آگ بھرتا ہے ۔ چنانچہ وہ شیطان کا آلۂ کار بن کر ایسے آدمی کو ستانا شروع کر دیتے ہیں ۔

شیطان کا اصل جرم عدم اعتراف تھا ۔ شیطان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر آدمی کے اندر یہی عدم اعتراف کا مزاج پیدا کر دے ۔ وہ چھوٹے کو بھڑکاتا ہے کہ وہ اپنے بڑے کا لحاظ نہ کرے ۔ معاملات کے دوران جب ایک شخص کے ذمہ دوسرے کا کوئی حق آتا ہے تو وہ اس کو سکھاتا ہے کہ وہ حق دار کا حق ادا نہ کرے ۔ کوئی خدا کا بندہ سچائی کا پیغام لے کر اٹھتا ہے تو لوگوں کے دل میں طرح طرح کے شبہات ڈال کر انھیں آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس کی بات نہ مانیں ۔ دو فریقوں کے درمیان نزاع ہو اور ایک فریق اپنے حالات کے اعتبار سے کچھ دینے پر راضی ہو جائے تو شیطان فریق ثانی کے ذہن میں یہ ڈالتا ہے کہ اس کی پیش کش کو قبول نہ کرو، اور اتنا زیادہ کا مطالبہ کرو جو وہ نہ دے سکتا ہو ۔ تاکہ جنگ و فساد مستقل طور پر جاری رہے ۔

اس طرح شیطان کے بہکاووں سے ہر جگہ لوگوں کے درمیان دشمنیاں جاری رہتی ہیں ۔ انسانوں میں دو گروہ بن جاتے ہیں اور ان میں ایسا ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا ۔

انسان ذمہ دار وجود ہے

دوستوو سکی (۱۸۸۱—۱۸۲۱) مشہور روسی ناول نگار ہے۔ اس کا ایک کامیاب ناول "جرم وسزا" ہے۔ اس ناول کا ہیرو ایک بدمزاج، کریہہ المنظر اور لاولد بوڑھی عورت کو اس لئے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی بے کار دولت کو اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنا سکے۔ جب یہ واقعہ ہوتا ہے تو ناول کے تمام کردار اور خود ناول کا قاری اس کو مجرم قرار دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بڑھیا کی دولت اس کے قاتل کے لئے اتنی ہی مفید تھی جتنا کسی شیر کے لئے ہرن کا گوشت ہوتا ہے۔ مگر شیر ہرن کو مار کر اس کا خون پی جائے تو کسی کو یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی اور نہ اس کے لئے کوئی تعزیری قانون بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ مگر اسی قسم کا فعل ایک انسان کرتا ہے تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی ہے اور چاہتی ہے کہ قاتل کو اس کے فعل کی پوری سزا دی جائے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار وجود ہے۔ اس کے ہر فعل کو صحیح اور غلط کی ترازو پر تولا جاتا ہے۔ جب کہ جانور اپنے اندر اس قسم کا کوئی اخلاقی شعور نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں صرف مفید اور غیر مفید کی تقسیم ہے نہ کہ صحیح اور غیر صحیح کی۔ انسان ایک اخلاقی حیوان ہے جب کہ حیوان صرف حیوان۔

انسان اور حیوان کا یہ فرق بتاتا ہے کہ انسان اور حیوان کا معاملہ یکساں نہیں۔ حیوان کو اس کے اعمال کے لئے کسی اخلاقی عدالت میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ جب حیوان کو اعمال کے اخلاقی پہلوؤں کا شعور ہی نہیں تو اس کو اخلاق کی عدالت میں مجرم کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ انسان کے اندر معاملات کے بارہ میں اچھے اور برے کا احساس ہونا ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان اپنے اعمال کے لئے اخلاق کے سامنے جواب دہ ہے۔ جس فعل پر آدمی کا اپنا اندرونی ضمیر اس کو مجرم ٹھہرا رہا ہو اس کے لئے باہر کی عدالت میں مجرم ٹھہرانا عین فطری ہے۔

تاہم موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کوئی ایسی عدالت نہیں جو آدمی کا اخلاقی احتساب کر سکے۔ یہاں آدمی اپنی مجرمانہ کارروائی کو خوبصورت الفاظ میں چھپا سکتا ہے وہ قانونی نکتے نکال کر اپنے کو عدالت کی گرفت سے بچا لیتا ہے۔ وہ زور و قوت کے ذریعہ اپنے خلاف تمام زبانوں کو بند کر دیتا ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان کا اخلاقی احتساب کرنے والی عدالت دنیا کے موجودہ حالات میں قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے ایک اور دنیا درکار ہے جہاں وہ تمام مواقع کامل صورت میں جمع ہوں جو اس پیچیدہ کام کے لئے ضروری ہیں۔

جب دین مشتبہ ہو جائے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ شیاطین نے مشرکوں کی نگاہ میں اس بات کو مزین کر دیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں۔ اس طرح شیاطین ان کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور ان کے دین کو ان کے اوپر مشتبہ کر رہے ہیں (وکذٰلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم، انعام ۱۳۸)

عرب کے مشرک قبائل میں یہ رواج تھا کہ وہ مختلف نام سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے۔ مثلاً کچھ لوگ سسر بننے کو اپنے لئے شرم کی چیز سمجھتے اور اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے۔ کچھ لوگ افلاس کا شکار ہوتے اور اس اندیشہ کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کر دیتے کہ کیسے کھلائیں گے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ منت مانتے کہ اگر اتنے بیٹے ہو جائیں یا فلاں مراد پوری ہو جائے تو ایک بیٹا فلاں بت کے نام پر ذبح کر دیں گے وغیرہ۔ یہ سراسر ظلم اور گمراہی کا فعل تھا۔ مگر وہ اس کو بڑی عبادت اور قربت کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔

قتل اولاد کی یہ رسم پہلے یہود کے یہاں بھی پائی جاتی تھی۔ پھر وہ عرب قبائل میں رائج ہوئی۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ تمام تر مذہبی تھی۔ دونوں حضرت ابراہیم کو اپنا سب سے بڑا بزرگ مانتے تھے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شیطان نے ان کو یہ رسم سنتِ ابراہیم کے طور پر سکھائی۔ انھوں نے حضرت اسماعیل کی قربانی کے واقعہ کی غلط تعبیر کر کے یہ سمجھا کہ اولاد کو قتل کرنا کوئی بڑا مقدس عمل ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کو خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے انجام دیا۔ اس کے نتیجہ میں آپ کے اوپر خدا کے غیر معمولی انعامات ہوئے، وہ بھول گئے کہ حضرت ابراہیم کا فعل براہ راست خدا کے خصوصی حکم کے تحت تھا۔ نیز آنجناب کو بھی وہ صرف خواب میں تمثیلی طور پر دکھایا گیا۔ عملاً اللہ نے ان سے جو چیز قبول کی وہ جانور کا ذبیحہ تھا۔ اور اولاد کا "ذبح" آپ کے لئے یہ قرار پایا کہ اپنے بیٹے کو کعبہ (خدا کے دین کی خدمت) کے لئے وقف کر دیں۔

حضرت ابراہیم کے واقعہ میں اصل نمونہ یہ تھا کہ اپنے بیٹے کو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ بلکہ اس کو خدا کے دین کی خدمت میں لگاؤ۔ یہ آخرت کی طلب میں دنیا کی طلب کو قربان کرنا تھا۔ یہ اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر کے بجائے دین کی تعمیر سے خوشی حاصل کرنے کا پیغام تھا۔ مگر شیطان نے سنت ابراہیمی کے نام پر لوگوں کو ایک لامعنی رسم میں الجھا دیا۔ لوگ خدا کا نام لیتے ہوئے شیطان کے راستہ پر چل پڑے۔ یہی دین کو لوگوں کے اوپر مشتبہ کرنا ہے۔

یہ شیطان کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے کہ وہ اصل دین کے بارے میں لوگوں کے اندر اشتباہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک دینی چیز کو لے کر اس کی غلط تصویر لوگوں کے ذہن میں بٹھاتا ہے۔ وہ لوگوں کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ دین کے نام پر بے دینی کا فعل شروع کر دیں۔ وہ حقیقتہً دین سے دور ہوں مگر ایک بیہودہ عمل کر کے یہ سمجھیں

کہ وہ عین دین خداوندی کی تکمیل کر رہے ہیں۔

عرب کے مشرکین نے حضرت ابراہیم کے ایک واقعہ سے غلط طور پر ذبح اولاد کی رسم نکالی۔ یہود نے حضرت سلیمان کی زندگی کے ایک پہلو کو جادو اور عملیات کا کاروبار کرنے کے حق میں استعمال کیا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کی غیر شادی شدہ زندگی سے ترک نکاح کا مقدس طریقہ اخذ کر لیا۔ یہ سب سراسر گم راہی کے فعل ہیں۔ وہ بظاہر نبی کے ایک فعل سے مشابہ ہونے کے باوجود نبی کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔ تاہم جن لوگوں نے ان کو اختیار کیا وہ لوگوں کو یہی باور کراتے رہے کہ وہ پیغمبر کے اسوہ پر عمل کر رہے ہیں۔

اس طرح شیطان لوگوں کو ایک دینی عمل کے نام پر کسی لایعنی کام میں الجھا دیتا ہے۔ وہ دین کے معاملہ میں لوگوں کو مشتبہ کر کے ان کو دین سے دور کر دیتا ہے۔ وہ ایک بے دینی کے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ عین دینی کام کر رہے ہیں۔

یہ معاملہ صرف پچھلی قوموں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ امت مسلمہ کے افراد بھی مختلف طریقوں سے اس بے راہی میں پڑ سکتے ہیں۔ وہ پیغمبر اسلام کی زندگی یا آپ کی تعلیمات کے کسی پہلو کی غلط تعبیر کر کے دین میں ایسی بدعت داخل کر سکتے ہیں جس پر بظاہر دین کا لیبل لگا ہوا ہو مگر اس کا دین خداوندی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ اپنی خواہشات پر چلیں اور اس کو دین کی اصطلاحوں میں بیان کریں۔ وہ دنیا پرستانہ سیاست چلائیں اور اس کو آخرت کا راستہ قرار دیں۔ وہ اپنے قومی جذبات کے تحت اٹھیں اور یہ ظاہر کریں کہ وہ عین اسلام کی خاطر ایسا کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کو عام طور پر بہت جلد مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے دین کو اس سطح پر اتار لاتے ہیں جہاں لوگ عملاً جی رہے ہیں۔ وہ لوگوں کی خواہش پرستی کے لئے دینی جواز فراہم کر دیتے ہیں۔ لوگ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ اپنی جگہ سے کھسکے بغیر وہ دین کو اس کی کامل صورت میں پا گئے ہیں۔ دین کو کچھ دئے بغیر انھوں نے اس کا سب کچھ حاصل کر لیا ہے۔

دین کی ایک حقیقت ہے اور اس کے کچھ خارجی مظاہر۔ مظاہر کو اگر حقیقت کی روشنی میں سمجھا جائے تو ہر چیز اپنے صحیح مقام پر رہتی ہے۔ اس کے برعکس اگر حقیقت کو مظاہر کی روشنی میں دیکھا جانے لگے تو عجیب عجیب تعبیرات ظہور میں آتی ہیں۔ اب خدا کا پیغمبر کسی کو اشتراکی لیڈر دکھائی دینے لگتا ہے۔ قرآن کسی کے لئے دنیوی معاملات کی کنجی بن جاتا ہے۔ کوئی جماعت کی نماز کو فوجی ٹریننگ سمجھ لیتا ہے۔ کسی کو پورا دین سیاست کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس طرح ہر آدمی دین کی الگ الگ تصویر بنا لیتا ہے جو اس کے اپنے ذہن کے پوری طرح مطابق ہوتی ہے مگر اصل حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

آپ کا حصہ آپ کو مل کر رہے گا

عبد اللہ بن مسعود رضؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَإِنَّ الرُّوحَ الْأَمِينَ نَفَثَ فِي رُوعِي أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا أَلَا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ تَطْلُبُوهُ بِمَعَاصِي اللَّهِ فَإِنَّهُ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا بِطَاعَتِهِ

(مشکوٰۃ، باب التوکل والصبر)

اے لوگو! جنت سے قریب کرنے والی جتنی چیزیں ہیں اور دوزخ سے دور کرنے والی جتنی چیزیں ہیں ان سب کا میں تمھیں حکم دے چکا ہوں۔ اسی طرح دوزخ سے قریب کرنے والی جتنی چیزیں ہیں اور جنت سے دور کرنے والی جتنی چیزیں ہیں ان سب سے تمھیں منع کر چکا ہوں۔ اور جبریل امین نے میرے دل میں یہ خیال ڈالا ہے کہ کوئی شخص ہرگز مر نہیں سکتا جب تک وہ اپنے حصے کا رزق نہ پالے۔ تو آگاہ، تم لوگ خدا سے ڈرو اور تلاش رزق میں جمیل طریقوں سے کام لو اور اگر رزق آنے میں کچھ دیر لگے تو اس کی وجہ سے تم معصیت کی راہ سے اس کو حاصل کرنے کی طرف مائل نہ ہو جاؤ کیونکہ خدا کے پاس جو کچھ ہے اس کو اس کی اطاعت ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

صحیح زندگی چھوڑ کر غلط زندگی اختیار کرنے کا محرک اکثر حالات میں یہی ہوتا ہے کہ آدمی دنیا میں اپنے لئے زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکے۔ اس لئے فرمایا کہ دنیا میں جو کچھ تم حاصل کرتے ہو وہ محض تمھاری اپنی کوششوں کا حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ دراصل تمھارا وہ حصہ ہوتا ہے جو پہلے سے تمھارے لئے مقدر ہو چکا ہے، اس لئے حصول معاش کی جدوجہد میں دوسرے فرائض کو نہ بھولو اور اس کے لئے اتنا بدحواس نہ ہو جاؤ کہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کو توڑنے لگو۔ یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھو کہ دنیا کے لئے آدمی کی بے قراری یا حرام ذریعوں سے حاصل کرنے کی کوشش اس کو مزید کچھ نہیں دے سکتی۔ وہ صرف اس کی بدبختی میں اضافہ کرے گی۔

حصول معاش کی جدوجہد میں ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ ہماری کوششیں ہمارے لئے استحقاق پیدا کرتی ہیں نہ کہ وہی بذات خود نتیجہ پیدا کرنے والی ہیں۔

اس معاملہ کو تعلیمی امتحان کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کی امتحان میں داخلہ کی درخواست کو قبول کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ امتحان ہال میں اس کو ایک نشست دی جائے گی۔ اور اسی کے ساتھ اس کے لئے وہ تمام سامان فراہم کئے جائیں گے جو امتحان دینے کے لئے ضروری ہیں۔ اس مثال سے موجودہ دنیا میں زندگی کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے اور ہمارا یہاں پیدا ہونا گویا اپنے آپ کو امتحان میں شامل کرنا ہے۔

خلق قرآن

قدیم عیسائی متکلمین نے اپنی فلسفیانہ موشگافیوں کے تحت یہ مسئلہ پیدا کیا تھا کہ خدا کا کلام ذات خداوندی کا حصہ ہے یا عام مخلوقات کی طرح وہ ذات خداوندی سے الگ ہے۔ انھوں نے اس کو ذات خداوندی کا حصہ قرار دیا۔ نئے عہدنامہ میں یوحنا کی انجیل کا پہلا فقرہ یہ ہے ——— "ابتدا میں کلام تھا۔ اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی"

دوسری صدی ہجری میں جو معتزلی علماء پیدا ہوئے وہ قدیم فلسفیانہ طرز فکر سے متاثر تھے اور عقائد میں موشگافیاں کرکے نئے نئے مسائل پیدا کرنے کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ عیسائی متکلمین کی پیروی میں انھوں نے اسلام میں بھی اسی قسم کی بحثیں شروع کیں۔ اسی ذیل میں انھوں نے وہ عقیدہ نکالا جو خلق قرآن کے نام سے مشہور ہے۔ خلق قرآن کا مطلب ان کے نزدیک یہ تھا کہ جس طرح سورج، چاند وغیرہ سب خدا کی مخلوقات ہیں ٹھیک اسی طرح قرآن بھی خدا کی ایک مخلوق ہے۔ خدا نے سارے عالم کو کن فیکون کے ذریعہ پیدا کیا ہے اسی طرح اس نے قرآن کو بھی کن فیکون کے ذریعہ پیدا کیا ہے۔ اس مسئلہ میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ اس کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا۔ ان کے نزدیک جو شخص قرآن کو مخلوق (پیدا کیا ہوا) کہے وہ مومن تھا اور جو اس کو مخلوق نہ کہے وہ کافر۔ امام احمد بن حنبل اور محدثین کی ایک جماعت نے اس معاملہ میں معتزلہ کے بالکل برعکس مسلک اختیار کیا۔ انھوں نے معتزلہ کے نقطۂ نظر کی شدت کے ساتھ تردید کی اور کہا کہ قرآن غیر مخلوق ہے۔ یعنی وہ کسی وقت خاص میں پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ جس طرح خدا کی ذات ہمیشہ سے ہے اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ سے ہے۔

خلق قرآن کا مسئلہ باعتبار حقیقت کفر و اسلام کا مسئلہ نہ تھا۔ یہ محض ایک تفنن یا بے فائدہ قسم کی موشگافی تھی۔ چنانچہ امام بخاری (۲۵۶ - ۱۹۴ھ) اس معاملہ میں خاموشی کو پسند کرتے تھے۔ امام بخاری جب نیشاپور پہنچے تو کچھ لوگوں نے الفاظ قرآن کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ امام صاحب نے ٹال دیا۔ پھر پوچھا گیا تو پھر ٹال دیا۔ مگر بار بار کے سوال پر ان کو اس موضوع پر بولنا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ امام بخاری نے اس سوال کے جواب میں فرمایا:

القرآن کلام اللہ غیر مخلوق۔ الفاظنا من افعالنا و افعالنا مخلوقۃ۔ والامتحان عنہ بدعۃ	قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے۔ الفاظ ہمارے افعال میں سے ہیں اور ہمارے افعال مخلوق ہیں۔ اس مسئلہ میں کسی کی آزمائش کرنا بدعت ہے۔

امام بخاری کے اس قول کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کلام الہٰی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ مگر اس کو پڑھتے وقت ہم اپنی زبان سے جو الفاظ نکالتے ہیں وہ ہمارا اپنا فعل ہوتا ہے۔ اس طرح انھوں نے متلو اور تلاوت کے درمیان فرق کیا۔ متلو فعل الہٰی تھا اس لئے قدیم تھا۔ اور تلاوت انسانی فعل تھا اس لئے وہ حادث تھا (کتاب الاسماء والصفات)

تاہم بہت سے دوسرے محدثین خصوصاً امام احمد بن حنبل نے اس معاملہ میں بہت شدید رویہ اختیار کیا۔ معتزلہ کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے۔ یعنی خدا کی ذات کی طرح قدیم نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص وقت میں خدا نے اس کو خلق کیا ہے جس طرح سورج چاند کو ایک خاص وقت میں خلق کیا ہے۔ امام حنبل اور دوسرے علماء قرآن کو غیر مخلوق (اللہ کی ذات کی طرح قدیم) کہتے تھے۔ ان کے پیروؤں نے ان کے بعد مزید غلو کیا۔ چنانچہ حنابلہ کا یہ مسلک نقل کیا گیا ہے کہ وہ قرآن مجید کی روشنائی اور اس کے اوراق کو بھی قدیم مانتے تھے۔ اس مسلک کے بعض لوگوں نے یہاں تک کہا کہ جس قلم سے قرآن مجید لکھا گیا وہ بھی قدیم ہے۔ بعد کے دور میں جب حکمراں طبقہ حنابلہ پر مہربان ہوگیا اور حکومت پر ان کا اثر قائم ہوگیا تو امام بخاری کو امام حنبل سے مختلف مسلک رکھنے کی بنا پر قید و بند کی تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

مسئلہ کی فنی نوعیت سے قطع نظر، امام حنبل وغیرہ نے جب اس معاملہ میں معتزلہ کے مسلک سے علیحدہ مسلک پر اصرار کیا تو خلیفہ مامون الرشید (۲۱۸ — ۱۷۰ھ) کو اپنا ایک سیاسی مقصد حاصل کرنے کا قیمتی موقع ہاتھ آگیا کیونکہ وہ محدثین کو حکومت سے الگ راستہ بنانے پر سزا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ محدثین کی رائے کے برعکس معتزلہ کی رائے کا پرجوش مبلغ بن گیا۔ ۲۱۸ھ میں مامون الرشید نے مختلف شہروں میں اپنے حاکموں کے نام فرمان جاری کیا کہ علماء و محدثین کو جمع کرکے ان سے خلق قرآن کے عقیدہ کا اقرار کرایا جائے اور جو اقرار نہ کرے اس کو سخت سزا دی جائے۔

خلیفہ مامون ابھی اپنے مشن کو پورا نہیں کر پایا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اس نے انتقال کے وقت اپنے جانشین کو وصیت کی کہ وہ محدثین کے سامنے خلق قرآن کا مسئلہ پیش کرے اور ان میں سے جو لوگ اس کی تصدیق نہ کریں ان کو سخت سزا دے۔ مامون کے بعد معتصم باللہ خلیفہ ہوا۔ اس نے اپنے پیش رو کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا۔ مختلف علماء کو اس عقیدہ سے انکار کی بنا پر سخت سزائیں دی گئیں۔ ان سزاؤں کا سب سے زیادہ نشانہ امام احمد بن حنبل (۲۴۱ — ۱۶۴ھ) بنے جو اس وقت اس رائے کی مخالفت کرنے والوں کی علامت بن گئے تھے۔ امام صاحب کو رقہ سے بغداد لایا گیا۔ پہلے خلق قرآن کے مبلغ علماء سے مناظرہ ہوا۔ جب مناظرہ کے ذریعہ وہ ان کو قائل نہ کر سکے تو ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد کوڑے مارے جانے لگے اور بھاری بیڑیاں پہنادی گئیں۔ محمد بن اسماعیل بخاری کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ امام احمد بن حنبل کو اتنے کوڑے مارے گئے کہ اگر اتنے کوڑے ہاتھی کو مارے جاتے تو ہاتھی بھی چیخ اٹھتا۔

خلق قرآن کا مسئلہ بظاہر اتنا بے معنی ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ معتزلہ نے اس عقیدہ کیوں گھڑا اور وقت کے حکمرانوں نے اس پر یقین کیسے کرلیا۔ مگر اس وقت کے معتزلی علماء نے اس بے معنی عقیدہ کے حق میں بھی قرآن سے دلیل فراہم کرلی تھی۔ قاضی احمد بن دواد معتزلی نے اس کی دلیل یہ پیش کی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: انا جعلناہ قرآنا عربیا (ہم نے بنایا ہے اس کو عربی قرآن) اس نے کہا کہ جعل کے معنی خلق یعنی

کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے جعل الظلمات والنور (خدا نے بنائی تاریکی اور روشنی) اس سے ثابت ہوا کہ قرآن "مجعول" ہے، بالفاظ دیگر وہ مخلوق ہے جس طرح روشنی اور تاریکی مخلوق ہیں۔

اس دلیل کی کمزوری اتنی چھپی ہوئی نہ تھی کہ اس کو وہ لوگ سمجھ نہ سکیں جو اپنے وقت میں دنیا کی سب سے بڑی حکومت چلا رہے تھے۔ اصل یہ ہے کہ تین عباسی خلفاء ــــ مامون، معتصم اور واثق ــــ نے امام حنبل اور دوسرے علماء پر جو مظالم کئے اس کی وجہ تمام تر سیاسی تھی۔ اس طرح وہ اپنے مفروضہ سیاسی حریفوں کو مذہب کے نام پر سزائیں دے رہے تھے۔

حدیث کی جمع و تدوین کے کام کا آغاز حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ ــ ۶۲ھ) نے اپنے زمانۂ خلافت میں کیا۔ مگر آپ کی خلافت کی مدت صرف ڈھائی سال رہی اس لئے آپ اس کام کی تکمیل نہ فرما سکے اور اس دنیا سے چلے گئے۔ آپ کے بعد خلافت کا ادارہ دنیادار بادشاہوں کے قبضہ میں آگیا۔

دوسری صدی ہجری میں محدثین نے حدیث کی تدوین کا کام شروع کیا تو انھوں نے انتہائی دیانت داری کے ساتھ ہر قسم کی روایتیں جمع کرنی شروع کیں اور اس کا مطلق لحاظ نہ کیا کہ کون سی روایت کس کے موافق پڑتی ہے اور کس کے خلاف۔ قدرتی طور پر وقت کے مسلم سلاطین کو یہ بات ناگوار تھی۔ کیونکہ حدیث کے دفتر میں بہت سی ایسی روایتیں بھی محفوظ ہو رہی تھیں جن کی زد ان کی عیش پرستی اور ان کی ظالمانہ سیاست پر پڑتی تھی۔ اس بنا پر حدیث کو وہ اپنے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ سمجھنے لگے۔ انھوں نے چاہا کہ حدیث کی جمع و تدوین کا کام ان کی سرپرستی میں ہو تاکہ اس کو اپنی مصلحتوں کے مطابق ڈھالا جاسکے۔ مگر محدثین نے اس مقدس کام میں کسی بھی قسم کے شاہی اثر و نفوذ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ تھی اصل بات جس کی وجہ سے وقت کے حکمراں محدثین کرام سے خوش نہ تھے۔ مگر محدثین کو اس نام پر سزا دینا ممکن نہ تھا کہ وہ حدیث کی جمع و تدوین کے کام میں شاہی مصلحتوں کی رعایت نہیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی ایسے سبب کی تلاش میں تھے جس کو بہانہ بنا کر محدثین کو ان کی "باغیانہ روش" کی سزا دی جاسکے۔ خلق قرآن کے مسئلہ نے یہ موقع دے دیا۔ معتزلی علماء نے جب یہ عقیدہ نکالا کہ قرآن مخلوق ہے تو اکثر محدثین نے آگے بڑھ کر اس کو غلط قرار دے دیا۔ وقت کے خلیفہ نے فوراً اس موقع کو استعمال کیا۔ اس نے اس عقیدہ کو اسلامی حکومت کا سرکاری عقیدہ قرار دے کر محدثین پر اس سے منحرف ہونے کا الزام عاید کر دیا۔ اس طرح ان کو اعتقادی مجرم ٹھہرا کر انھیں کوڑے مارے جانے لگے۔

مسئلہ خلق قرآن پر محدثین کو دی جانے والی سزا در اصل ایک سیاسی سزا تھی جو دین کے نام پر دی گئی۔ اس معاملہ کو موجودہ زمانہ کے ان مسلم حکمرانوں کی مثال سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دین کے نام پر کوڑے اور قتل کی سزائیں دے رہے ہیں۔ سیاسی جرم کی دینی سزا ہر زمانہ میں رائج رہی ہے۔ البتہ حالات کے اعتبار سے ہر زمانہ میں اس کے عنوان مختلف ہو جاتے ہیں۔

حوصلہ مندی

اصمعی دوسری صدی ہجری کا مشہور لغوی عالم ہے۔ اس کو عربی الفاظ کا لغت جمع کرتے ہوئے دَمْدَمَ کے معنی کی تلاش ہوئی۔ یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے (فدمدم علیہم ربہم بذنبہم فسواھا) اصمعی یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس لفظ کا خاص مفہوم کیا ہے اور عرب اس کو کس موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ کسی بدو کو پکڑتا اور اس سے پوچھتا کہ تم لوگ دَمْدَمَ کا لفظ کس موقع پر بولتے ہو۔ مگر وہ جو کچھ بتاتا وہ اصمعی کو خود بھی معلوم تھا۔ اصمعی کو تو اصل میں یہ جاننا تھا کہ وہ کون سا موقع ہے جب کہ ایک عرب بے ساختہ طور پر یہ لفظ بول پڑتا ہے۔ اور یہ بات پوچھ کر جانی نہیں جا سکتی۔ وہ تو صرف اس طرح جانی جا سکتی ہے کہ فطری حالات میں ایسا کوئی لمحہ آئے جب کہ ایک عرب یہ لفظ بولے اور وہاں وہ سننے کے لئے موجود ہو۔

اس مقصد کے لئے اصمعی ایک خانہ بدوش عرب خاندان کے ساتھ لگ گیا۔ وہ خاندان جہاں جاتا اسی کے ساتھ اصمعی بھی اس کے ساتھ ہوتا اور ہر وقت اس انتظار میں رہتا کہ کب وہ موقع آئے جب کہ عرب بدو بے ساختہ طور پر یہ لفظ بول پڑے۔ وہ یہاں وہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسی میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے اور بدو کی زبان سے دَمْدَمَ کا لفظ اس کو سننے کو نہ ملا۔ آخر ایک روز ایسا ہوا کہ بدو نے ایک مقام پر اپنا خیمہ گاڑ رکھا تھا۔ خیمہ کے اندر سالن کی ہانڈی آگ پر چڑھی ہوئی تھی، بدو مرد خیمہ کے اندر تھا اور اس کی عورت خیمہ کے باہر کوئی کام کر رہی تھی پکتے پکتے ہانڈی نقطۂ جوش پر آئی اور اس میں ابال آگیا۔ عرب بدو نے یہ دیکھ کر اپنی بیوی کو خبردار کرنے کے لئے باوازبلند کہا: دَمْدَمَتْ (ہانڈی ابل گئی) اصمعی نے یہ سنا تو چلاتے ہوئے خیمہ سے نکل پڑا:

واللہ وجدتُ واللہ وجدتُ (خدا کی قسم میں پاگیا خدا کی قسم میں پاگیا)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون سا شوق اور حوصلہ مندی تھی جس کی وجہ سے دور اول کے مسلمانوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے۔ یہ تھا فائدہ اور شہرت کی چاشنی کے بغیر صرف مقصد کی خاطر محنتیں کرنا۔ موجودہ زمانہ میں بھی بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں مگر وہ سب بے نتیجہ ہوتی جارہی ہیں۔ کیونکہ آج کا آدمی صرف وہاں سرگرم ہوتا ہے جہاں ذاتی فائدہ یا ذاتی شہرت و مقبولیت کی چاشنی ہو۔ صرف مقصد کی خاطر متحرک ہونا کوئی نہیں جانتا۔

جس قوم کے افراد میں اس قسم کا شوق اور حوصلہ ہو وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ ابتدائی دور میں مسلمانوں کے اندر یہی بلند حوصلگی تھی جس کی وجہ سے مسلمان اُس زمانہ میں دنیا کے سب سے طاقت ور گروہ بن گئے۔ موجودہ زمانہ میں سطحیت اور خود پسندی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کوئی اس قسم کی "بے فائدہ" محنت میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور بلاشبہ یہی اخلاقی زوال موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

عام انسان کو یا خوف متحرک کرتا ہے یا خود غرضی۔ مگر ایسے لوگ کوئی تاریخ نہیں بناتے۔ تاریخ صرف وہ لوگ بناتے ہیں جو حوصلہ اور مقصد کی خاطر متحرک ہونا جانتے ہوں۔

معیار کی تبدیلی

ہجرت کے دوسرے سال بدر کے مقام پر مسلمانوں میں اور قریش میں جنگ ہوئی۔ قریش کی سرداری ابوجہل کو حاصل تھی۔ جنگ سے ایک دن پہلے اس نے خدا سے اپنی فتح کی دعا کی تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: خدایا، دونوں فریقوں میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا کاٹنے والا ہو تو کل کے دن اس کو ہلاک کردے (اللھم اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ)

ابوجہل کو خدا سے یہ کہنا تھا کہ وہ قریش کو مسلمانوں کے اوپر فتح دے۔ اس کی یہ بات اسی وقت باوزن ہوسکتی تھی جب کہ وہ یہ بھی دکھا سکے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کا گروہ حق پر ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے قطع رحم کو فیصلہ کی بنیاد بنایا۔ کیونکہ اسلام کی دعوت نے قریش کے خاندانوں میں باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا تھا۔ اس معیار پر جانچنے کی صورت میں یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس کا اپنا گروہ حق پر ہے اور مسلمانوں کا گروہ باطل پر۔ روس کے سابق وزیر اعظم نکیتا خروشچوف نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے خدا کے وجود سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ معیار قائم کیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو چاند پر سے نظر آنا چاہئے۔ جب روس کے راکٹ نے اپنے چاند کے سفر کی رپورٹ میں خدا کا کوئی نشان نہیں بتایا تو خروشچوف نے اعلان کر دیا: خدا کا کوئی وجود نہیں، کیونکہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا مگر اس کو کہیں خدا نظر نہیں آیا۔

یہی غلطی مختلف شکلوں میں خود اسلام میں پیدا ہوسکتی ہے۔ کون اسلام پر ہے اور کون اسلام پر نہیں ہے۔ اس کا ایک خدائی معیار ہے۔ لیکن اگر آپ اس معیار کو بدل دیں تو آپ کے لئے سارا معاملہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ آپ اپنے ذاتی معیار کی بنا پر دین کو بے دینی سمجھ لیں گے اور بے دینی کو دین۔

اگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ دعوت دین کی بنیاد اکابر کے ملفوظات ہیں تو آپ کو وہ دعوت دینی دعوت نظر نہ آئے گی جس کی بنیاد قرآن وسنت پر رکھی گئی ہو۔ اگر آپ یہ معیار قائم کرلیں کہ دین وہ ہے جو بزرگوں سے عقیدت پیدا کرے تو آپ کو وہ دین دین معلوم نہ ہوگا جو خدا سے عقیدت پیدا کرنے والا ہو۔ اگر آپ کا ذہن یہ ہو کہ کامل دین وہ ہے جو سیاسی انقلاب کا علم بردار ہو تو آپ کو وہ دین ناقص دین دکھائی دے گا جو فرد کے اندر نفسیاتی انقلاب پر زور دیتا ہو۔ اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ جہاد اور عزیمت کے مقام پر وہ ہے جو حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے اکھیڑ پچھاڑ کی مہم چلائے تو آپ کو وہ شخص جہاد اور عزیمت کے مقام سے گرا ہوا نظر آئے گا جو یہ کہے کہ حکمرانوں سے تصادم نہ کرتے ہوئے غیر سیاسی دائرہ میں کام کرو۔ اگر آپ یہ معیار بنالیں کہ جو شخص فروعی مسائل اور فنی موشگافیوں میں کمال رکھتا ہو وہی ماہر دینیات ہے تو آپ کو وہ شخص علم دینیات کا ماہر نظر نہ آئے گا جو خوف خدا اور فکر آخرت کی باریکیوں کو بیان کرتا ہو۔ اگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم احیاء ملت کی مہم ہے تو آپ ملت کے اندر خود تعمیری کی تحریک کو احیائے ملت کی تحریک سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

ایک سچی بات

شیخ حمید الدین ابو حاکم قریشی (۵۷۰ ـ ۷۳۷ھ) ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو کیچ اور مکران کے علاقہ پر حکومت کر رہا تھا۔ اپنے والد سلطان بہاء الدین کے انتقال کے بعد وہ تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۲۱ سال تک شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔

"ذکر کرام" میں ان کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ شیخ حمید الدین کے ساتھ ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا اور "سلطان" کے بجائے ان کو "شیخ" بنا دیا۔

شیخ حمید الدین اپنی حکومت کے زمانہ میں دوپہر کو اپنے ایک باغ میں قیلولہ کیا کرتے تھے۔ اس باغ میں ان کا ایک محل تھا۔ اس محل کی نگرانی نونیت نامی ایک خادمہ کے سپرد تھی۔ اس خادمہ کے ذمہ یہ کام تھا کہ ہر روز وقت پر بستر بچھا دے تاکہ شیخ حمید الدین آکر اس پر آرام کر سکیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز شیخ کے آنے سے پہلے خادمہ نے بستر بچھایا تو اس کو بستر بہت اچھا لگا۔ وہ اس پر کچھ دیر کے لئے لیٹ گئی۔ ابھی وہ بستر سے اٹھی نہیں تھی کہ اس کو نیند آگئی۔ شیخ حمید الدین جب معمول کے مطابق آرام کرنے کے لئے محل پہنچے تو دیکھا کہ خادمہ نونیت بستر پر پڑی سو رہی ہے۔ سلطان کے بستر پر خادمہ کو سویا ہوا دیکھ کر انھیں غصہ آگیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ اس گستاخی پر خادمہ کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور خادمہ کو کوڑے مارے جانے لگے۔ مگر شیخ حمید الدین کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ خادمہ آہ و واویلا نہیں کر رہی ہے، بلکہ ہر کوڑے پر ہنس پڑتی ہے۔ انھوں نے سزا کو رکوا کر خادمہ کو بلایا اور اس سے خلاف معمول ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ خادمہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

> مجھے خیال آیا کہ جب اس نرم بستر پر ایک بے اختیارانہ نیند کی یہ سزا ہے تو ان لوگوں کا انجام کیا ہوگا جو روزانہ اس نرم بستر پر آرام کرتے ہیں۔

خادمہ کے اس جواب کا شیخ حمید الدین پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ وہ دنیا اور اس کی لذتوں سے بے رغبت ہو گئے۔ یہاں تک کہ درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ سلطنت چھوڑ کر شیخ حمید الدین لاہور آئے۔ یہاں حضرت سید احمد توختہ (جو ان کے نانا بھی ہوتے تھے) کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر طریقہ شطاریہ میں بیعت کی اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد ان کی خلافت حاصل کی۔ شیخ حمید الدین نے ۱۶۷ سال کی عمر پائی۔ آخر عمر میں وہ اُچ اور سکھر کے درمیانی علاقہ میں تبلیغ و ارشاد کا کام کرتے رہے۔ اس علاقہ میں بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے (تذکرہ صوفیاء پنجاب از اعجاز الحق قدوسی)

آدمی کی فطرت زندہ ہو تو ایک جملہ اس کو تڑپانے کے لئے کافی ہے۔ اور اگر فطرت مردہ ہو جائے تو ہزاروں تقریریں بھی اس کو حرکت میں لانے کے لئے ناکام ثابت ہوتی ہیں۔

اصل عبادت اللہ کے آگے عاجزی کرنا ہے

عبداللہ بن جدعان زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں بڑا فیاض اور مہمان نواز آدمی تھا۔ وہ رشتہ میں حضرت عائشہ کا چچازاد بھائی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مر گیا۔ حضرت عائشہ نے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے خدا کے رسول، عبداللہ بن جدعان لوگوں کی بہت خدمت کرتا تھا اور لوگوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔ کیا قیامت کے دن ابن جدعان کا یہ عمل اس کو نفع دے گا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ کیوں کہ اس نے کبھی یہ نہ کہا کہ رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین (میرے رب، بدلہ کے دن میری خطاؤں کو معاف کر دے، مسلم)

خدا کو بندے کی عاجزانہ پکار پسند ہے

بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے اور وہ اس کو محبوب ہوتا ہے تو وہ فرماتا ہے: اے جبریل، میرے بندے کی حاجت پوری کرنے میں جلدی نہ کر۔ مجھے محبوب ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں (جاء فی الآثار ان العبد اذا دعا ربہ وھو یحبہ قال: یا جبریل لا تعجل بقضاء حاجۃ عبدی فانی احب ان اسمع صوتہ۔ ابن رجب حنبلی، جامع العلوم والحکم، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، قاہرہ ۱۹۶۲، صفحہ ۲۴۳)

محتاط زندگی کیسی ہوتی ہے

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: جس معاملہ میں ہدایت ظاہر ہو اس کی پیروی کرو۔ جس معاملہ کا نقصان ظاہر ہو اس سے بچو۔ جو معاملہ مشتبہ نظر آئے اس کو اللہ کے حوالے کر دو (امر استبان رشدہ فاتبعہ وامر استبان ضرہ فاجتنبہ وامر اشکل امرہ علیک فردہ الی اللہ)

اچھائی کا ذکر کرنا اور برائی کو چھپانا

ابو ہرون کہتے ہیں کہ میں ابو حازم کے پاس گیا اور ان سے کہا: اللہ آپ پر رحم کرے، دونوں آنکھوں کا شکر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: جب تم اپنی آنکھوں سے اچھائی دیکھو تو اس کا تذکرہ کرو، اور جب تم اپنی آنکھوں سے برائی دیکھو تو اس کو چھپاؤ۔ پھر میں نے پوچھا کہ دونوں کانوں کا شکر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: —— جب تم اپنے کانوں سے اچھائی سنو تو اس کو یاد کر لو اور جب تم اپنے کانوں سے برائی سنو تو اس کو بھلا دو (قال ابو ھرون، دخلت علی ابی حازم فقلت لہ: یرحمک اللہ ماشکر العینین۔ قال اذا رأیت بھما خیرا ذکرتہ واذا رأیت بھما شرا سترتہ۔ قلت فما شکر الاذنین۔ قال اذا سمعت بھما خیراً حفظتہ واذا سمعت بھما شرا انسیتہ)

تین باتیں جو ہر چیز کی جامع ہیں

عن امّ انس رضی اللہ عنہا انّہا قالت یا رسولَ اللہِ اَوصنی۔ قال: اُھجُری المعاصیَ فَانہا افضلُ الھجرۃ۔ وحافظی علی الفرائض فانہا

ام انس رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ انھوں نے کہا اے خدا کے رسول مجھے وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: گناہوں کو چھوڑ دو، یہ سب سے بڑی ہجرت ہے۔ فرائض کی نگہداشت

افضلُ الجہادِ و اکثری من ذکر اللّٰہ فانک لا تاتِیَنّ اللّٰہَ بشیءٍ احبَّ الیہِ من کثرۃِ ذکرِ اللّٰہ (ترغیب وترہیب بحوالہ طبرانی)

کرو، یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔ اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔ کیونکہ تم اللہ کے پاس اس کی سب سے محبوب چیز جو لے جاسکتے ہو وہ اس کی یاد ہے۔

علم وہی ہے جو اللہ سے ڈر پیدا کرے

جبیر بن نفیر نے عوف بن مالک اشجعی کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے اصحاب بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ علم اٹھا لیا جائے گا۔ انصار میں سے ایک شخص نے کہا جس کا نام زیاد بن لبید تھا۔ اے خدا کے رسول کیا ہم سے علم اٹھا لیا جائے گا۔ حالانکہ ہمارے درمیان خدا کی کتاب ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو اس کی تعلیم دے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم کو مدینہ کا سب سے زیادہ سمجھ دار آدمی جانتا تھا۔ کیا تم یہود کی گمراہی کو نہیں دیکھتے۔ حالاں کہ ان کے درمیان خدا کی کتاب موجود ہے۔ اس کے بعد جبیر بن نفیر کی ملاقات شداد بن اوس سے ہوئی۔ انھوں نے ان کو یہ حدیث سنائی۔ شداد بن اوس نے کہا۔ جانتے ہو علم کا اٹھ جانا کیا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ شداد نے کہا: اس کے برتن کا چلا جانا۔ (یہ ذہاب اوعیتہ) اس کے بعد شداد نے کہا:

ھل تدری ای العلم یرفع قال قلت لا ادری قال الخشوع حتی لا یری خاشعا (ابن عبد البر جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول، صفحہ ۱۵۳)

کیا تم جانتے ہو کون سا علم اٹھا لیا جائے گا۔ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا: خشوع اٹھا لیا جائے گا۔ یہاں تک کہ تم کوئی خاشع نہ دیکھو گے۔

بے راہ ہو جانے کا خطرہ ہر ایک کے لئے ہے

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم تعمل ھذہ الامۃ برھۃ بکتاب اللّٰہ، ثم تعمل برھۃ بسنۃ رسول اللّٰہ، ثم تعمل بعد ذلک بالرای، فاذا عملوا بالرای ضلوا (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۱۳۴)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ امت ایک عرصہ تک کتاب اللہ پر عمل کرے گی۔ پھر ایک عرصہ تک اللہ کے رسول کی سنت پر عمل کرے گی۔ اس کے بعد وہ رائے پر عمل کرے گی۔ اور جب وہ رائے پر عمل کرے گی تو وہ گمراہ ہو جائے گی۔

بزرگ پرستی دھیرے دھیرے بت پرستی بن جاتی ہے

سورہ نوح میں قدیم زمانہ کے کئی بتوں کا ذکر ہے ——— ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر۔ اس سلسلے میں مفسر ابن جریر طبری نے محمد بن قیس کے واسطہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ بتوں کے یہ نام دراصل ان قوموں کے بزرگوں کے نام پر ہیں۔ یہ اللہ کے نیک بندے تھے جو حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیانی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بہت سے معتقدین تھے جو ان کی پیروی کرتے تھے، جب ان صالحین کا انتقال ہو گیا تو ان کے معتقدین نے کہا: اگر ہم ان کی صورت بنالیں تو اس سے ہمارے شوق عبادت میں اضافہ ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے ان صالحین

کی مورتیں بنائیں۔ اس کے بعد جب دوسری نسل آئی تو اس کو شیطان نے مزید سکھایا کہ ان کے آباؤ اجداد ان مورتوں کے پاس جو عبادت کرتے تھے وہ خود انھیں بزرگوں کی عبادت ہوتی تھی جن کی یہ مورتیں ہیں اور یہی بزرگ ہیں جو بارش برساتے ہیں اور سارے کام بناتے ہیں۔ اس طرح ان میں باقاعدہ بت پرستی شروع ہوگئی (ابن کثیر، تفسیر سورہ نوح)

خدا کے قانون میں کسی کے لئے رعایت نہیں

سورہ مائدہ میں بنی اسرائیل کے تذکرہ کے تحت ارشاد ہوا ہے کہ ان میں سے جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں، وہ ظالم ہیں، وہ فاسق ہیں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ سورہ مائدہ کی یہ یہ تینوں آیتیں بنی اسرائیل کے حق میں اتری ہیں، وہ ہمارے اوپر چسپاں نہیں ہوتیں۔ یعنی یہودیوں میں سے جو شخص خدا کے اتارے ہوئے حکم سے انحراف کرے وہ کافر اور ظالم اور فاسق ہے نہ کہ ہم۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بنی اسرائیل تمھارے کتنے اچھے بھائی ہیں کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لئے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمھارے لئے۔ ہرگز نہیں خدا کی قسم تم انھیں کے طریقہ پر قدم بقدم چلو گے (نعم الاخوة لکم بنو اسرائیل ان کانت لھم کل مُرّة ولکم کل حلوة کلا واللہ لتسلکن طریقھم قدر الشراک)

جب جنت والے جنت میں جانے سے روک دیئے جائیں گے

امام بخاری نے اپنی کتاب الادب المفرد (باب المعانقہ) میں نقل کیا ہے۔ عبد اللہ بن محمد بن عقیل کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: مجھے ایک صحابی کے بارے میں یہ بات پہنچی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے۔ میں نے ایک اونٹ خریدا اور اس پر کجاوہ باندھا اور اس کے بعد اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ میں ایک مہینہ تک سفر کرتا رہا۔ اس کے بعد میں شام پہنچا اور وہاں عبد اللہ بن اُنیسؓ کے گھر پر حاضر ہوا۔ میں نے دربان سے کہا: صاحب خانہ سے کہو کہ جابر دروازہ پر ہے۔ انھوں نے کہا کیا عبد اللہ کے لڑکے جابر۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر عبد اللہ بن اُنیس نکلے اور مجھ کو گلے سے لگایا۔ میں نے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے۔ مجھے ڈر ہوا کہ میں مر جاؤں قبل اس کے کہ میں اس کو سنوں۔ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: قیامت کے دن لوگ اس حال میں جمع ہوں گے کہ ننگے، غیر مختون اور بے سروسامان ہوں گے۔ اللہ ان کو آواز دے گا جس کو دور والے بھی اسی طرح سنیں گے جس طرح قریب والے سنیں گے۔ اللہ فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں، میں انصاف کرنے والا ہوں۔ کوئی جنت والا جنت میں داخل نہیں ہو سکتا اگر اس نے کسی دوزخ والے پر ظلم کیا ہو جس کا وہ بدلہ چاہتا ہو۔ اور کوئی دوزخ والا دوزخ میں داخل نہیں ہو سکتا اگر اس نے کسی دوزخ والے پر ظلم کیا ہو اور وہ اس کا بدلہ چاہتا ہو۔ میں نے پوچھا ایسا کیوں کر ہوگا جب کہ ہم کو اللہ ننگے اور بے سروسامان اٹھائے گا۔ جواب دیا: بالحسنات والسیئات۔ یعنی بھلائیوں اور برائیوں کے ذریعہ بدلا ادا کیا جائے گا۔

برائی کو روکو

ما من قوم یعمل فیھم بالمعاصی ثم یقدرون علی ان یغیروا فلم یغیروا الا یوشک ان یعمھم اللہ تعالیٰ بعقاب (ابوداؤد، ترمذی)

کسی بھی قوم میں اگر گناہ کئے جائیں اور قدرت رکھنے کے باوجود لوگ گنہ گاروں کو نہ روکیں تو قریب ہے کہ خدا ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقاباً منہ ثم تدعونہ فلا یستجیب لکم (ترمذی)

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور ہے کہ تم لوگ نیکی کا حکم دو اور برائی سے رو۔ ورنہ جلد ہی خدا تم سب پر عذاب بھیج دے گا۔ پھر تم خدا کو پکارو گے مگر وہ تم کو کوئی جواب نہ دے گا۔

حدیث میں اس قسم کی جو ہدایتیں نقل ہوئی ہیں وہ اصلاً سماجی ہدایتیں ہیں نہ کہ سیاسی ہدایتیں۔ یعنی ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی حکمراں کو "ظالم" قرار دے کر اس کے خلاف شور وغل کرو اور انصاف قائم کرنے کے نام پر اس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلاؤ۔ اس قسم کی اسلامی سیاست محض موجودہ زمانہ کی سیاسی پارٹیوں کی نقل ہے۔ اس کا مذکورہ اسلامی ہدایات سے کوئی تعلق نہیں۔ ان ہدایات کا مخاطب معاشرہ کا ہر فرد ہے نہ کہ کوئی سیاسی نظام۔

کسی معاشرہ میں ہمیشہ تھوڑے آدمی ہوتے ہیں جو شرارت کرتے ہیں۔ اب اگر معاشرہ ایک زندہ معاشرہ ہو تو جب لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو ستا رہا ہے۔ ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کو تکلیف دے رہا ہے۔ ایک صاحب معاملہ دوسرے صاحب معاملہ کے حقوق ادا نہیں کرتا تو ایسے معاشرہ میں مظلوم کو خود اپنے آس پاس ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اس کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں۔ وہ ظالم کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی شرارتوں سے باز آئے۔ ایسے سماج میں برائیاں پیدا ہوتی ہیں مگر وہ وہیں کی وہیں دبا دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ اپنے سامنے ظلم و زیادتی کے واقعات دیکھیں مگر غیر جانب دار بن کر رہ جائیں تو دھیرے دھیرے ان خرابیوں سے ایسے فتنے ابھرتے ہیں جو پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

ماحول کا دباؤ سب سے بڑا دباؤ ہے۔ حتیٰ کہ حکومت اور عدالت سے بھی زیادہ۔ اگر آس پاس کا ماحول ظالم کو روکے اور مظلوم کی حمایت میں کھڑا ہو جائے تو کبھی برائیاں پھیل نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس جب ماحول برائی کو دیکھنے کے باوجود خاموش رہے تو بیک وقت دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف ظالم کی حوصلہ افزائی اور دوسری طرف مظلوم کے اندر انتقام اور بے اعتمادی۔ یہ دونوں چیزیں وقت کے ساتھ بڑھتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے کہ برائیاں بڑھ کر خود ان لوگوں کو جھلس دیتی ہیں جو اپنے کو مامون سمجھ کر ان کے معاملہ میں غیر جانب دار بن گئے تھے۔

اللہ اس کا محافظ ہے جو اللہ کا کام کرے

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات کو میرے حجرہ میں تھے اور جاگ رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ آپ نے فرمایا: کاش میرے اصحاب میں سے کوئی صالح آدمی رات کو میرا پہرہ دیتا۔ اتنے میں باہر سے ہتھیار کی آواز آئی۔ آپ نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے، آواز آئی "میں سعد بن مالک ہوں" آپ نے پوچھا: کیا چیز تم کو یہاں لے آئی۔ انھوں نے جواب دیا: اے خدا کے رسول میں اس لئے آیا تاکہ آپ کے اوپر پہرہ دوں۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز سنی۔ ایک اور روایت میں وہ کہتی ہیں کہ مدینہ آنے کے بعد رات کے وقت آپ پر پہرہ دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ آیت اتری (واللہ یعصمک من الناس (مائدہ ۶۷) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبہ سے اپنا سر نکالا اور فرمایا: اے لوگو واپس جاؤ کیونکہ اللہ نے ہم کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے (یا ایہا الناس انصرفوا فقد عصمنا اللہ عز وجل، تفسیر ابن کثیر، جلد اول، صفحہ ۵۳۴)

حکمت اللہ کا سب سے بڑا عطیہ ہے

ابن وہب کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا: حکمت اور علم ایک نور ہے جس سے اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ یہ بہت سے مسائل جاننے کا نام نہیں ہے (الحکمۃ والعلم نور یہدی بہ اللہ من یشاء ولیس بکثرۃ المسائل، جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول ۱۸)

علم کے بغیر عمل کبھی بگاڑ کا باعث ہوتا ہے

حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا: جو شخص علم کے بغیر عمل کرے گا وہ اصلاح سے زیادہ فساد پیدا کرے گا (من عمل فی غیر علم کان ما یفسد اکثر مما یصلح، جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول، صفحہ ۲۷)

برے سلوک پر اچھے انجام کی فال لینا

ایرانیوں سے جنگ کے زمانہ میں مسلمانوں کا ایک سفارتی وفد شاہ یزدگرد کے دربار میں گیا۔ یزدگرد نے ان سے حقارت آمیز باتیں کیں۔ اس نے کہا۔ میں نہیں جانتا کہ زمین پر کوئی قوم تم سے زیادہ بدبخت اور تعداد میں کم اور آپس میں لڑنے والی رہی ہو۔ ہم تم لوگوں کو آس پاس کے دیہاتوں کے سپرد کر دیں گے۔ وہی تمھارے لئے ہماری طرف سے کافی ہوں گے۔" مسلمانوں کی طرف سے مغیرہ بن شعبہ نے کہا: تم نے ہماری جس زبوں حالی کا ذکر کیا، وہ بالکل درست ہے۔ ہمارا مکان صرف زمین کی سطح تھی۔ ہم وہی کپڑے پہنتے تھے جو ہم اونٹوں اور بکریوں کے بالوں سے بناتے تھے۔ ہمارا دین یہ تھا کہ ہمارا بعض بعض کو قتل کر دیتا تھا اور ایک دوسرے سے بغض اور عداوت رکھتا تھا۔ ہم میں سے کوئی اپنی زندہ بیٹی کو اس اندیشہ سے دفن کر دیتا تھا کہ وہ اس کے کھانے میں سے کھائے گی۔ پھر اللہ نے ہماری طرف ایک شخص کو بھیجا جس کو ہم اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہم میں سب سے بہتر تھا۔ اس نے ہمارے سامنے ایک دعوت پیش کی۔ ابتداءً ہم میں سے صرف ایک شخص (ابوبکر رض) نے اس کا ساتھ دیا۔ ہم اس کی باتوں کو جھٹلاتے رہے۔

مگر اس نے جو کچھ کہا وہ ہو کر رہا (فلم یقل شیئاً الاکان) پھر اللہ نے ہمارے دلوں میں اس کی تصدیق ڈالی۔ ہم اس کے پیرو بن گئے۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم میں سے جو مارا جائے وہ جنت میں جائے گا اور جو باقی رہے گا اس کو مخالفین کے مقابلہ میں اللہ کی مدد حاصل ہوگی۔

یزدگرد نے خفا ہو کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ایک ٹوکرا مٹی لاؤ اور ان میں جو سب سے زیادہ شریف ہو اس کے سر پر رکھ کر ان کو بھگا دو یہاں تک کہ وہ مدائن کی سرزمین سے باہر نکل جائیں۔ انھوں نے یہ مٹی عاصم بن عمرو کے سر پر رکھ دی۔ وہ اس کو لے کر ایرانی دربار سے نکلے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اپنے سردار سعد بن ابی وقاص تک پہنچ گئے۔ سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا:

البشر وافقد واللہ اعطانا اللہ مقالید ملکھم (تفاءلوا بذلک اخذھم بلادھم) البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۴۱	خوش ہو جاؤ۔ خدا کی قسم اللہ نے ان کے ملک کی کنجیاں ہم کو دے دیں۔

حق کی مخالفت کرنے والوں کے دل میں مرعوبیت ڈال دی جاتی ہے

جنگ یرموک کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ جرجہ نام کا ایرانی سردار اپنے لشکر سے باہر آیا اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ خالد بن ولید رضی بھی نکلے اور جرجہ کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ دونوں کے گھوڑوں کی گردنیں مل گئیں۔ جرجہ نے کہا اے خالد! مجھے بتاؤ اور بالکل سچ بولو۔ کیونکہ آزاد آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ کیا اللہ نے تمھارے پیغمبر پر آسمان سے کوئی تلوار اتاری ہے اور وہ تلوار انھوں نے تم کو دے دی ہے۔ اب تم جس کے اوپر بھی حملہ کرتے ہو اس کو شکست دے دیتے ہو۔ خالد رضی نے کہا نہیں۔ جرجہ نے کہا پھر تم کو سیف اللہ کیوں کہا جاتا ہے۔ خالد رضی نے کہا: اللہ نے ہمارے درمیان اپنا پیغمبر بھیجا۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے اس کو مانا، کچھ نے جھٹلایا۔ میں جھٹلانے والوں میں تھا۔ پھر اللہ نے ہمارے دلوں اور پیشانیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہم کو ہدایت دی اور ہم نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی:

فقال لی انت سیف من سیوف اللہ سلّہ اللہ علی المشرکین ودعا لی بالنصر فسمیت سیف اللہ بذلک (البدایہ والنہایہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بابت فرمایا کہ تم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہو جس کو اللہ نے مشرکین کے اوپر نکالا ہے اور آپ نے میرے لئے نصرت کی دعا فرمائی۔ اس وقت سے میرا نام سیف اللہ پڑ گیا۔

بندوں کی مدد کرنے والا کبھی خدا کی مدد سے محروم نہیں ہوتا

۶۱۰ء کی ایک شب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تھے۔ خدا کا فرشتہ آیا اور کہا کہ "پڑھ"۔ آپ نے جواب دیا ما انا بقاری (میں پڑھا نہیں ہوں) آپ فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے مجھ کو پکڑا اور دبایا۔ یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا "پڑھ" میں نے پھر کہا کہ میں پڑھا نہیں ہوں، اس نے مجھے پکڑا اور دوبارہ اس طرح دبوچا کہ اس کا دبوچنا میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا۔ پھر اس۔

مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ "پڑھ" میں نے کہا کہ میں پڑھا نہیں ہوں۔ اس نے تیسری بار یہی عمل کیا اور کہا:

اِقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ و ربك الاکرم

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو پیدا کیا جمے ہوئے خون سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے۔

یہ قرآن کی پہلی آیت تھی جو آپ پر اتری۔ اس کے بعد آپ اپنی بیوی خدیجہ بنت خویلد کے پاس مکہ آئے۔ اس وقت آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ آپ نے کہا زملونی زملونی (مجھے کمل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ) گھر والوں نے آپ کو اڑھا کر لٹا دیا۔ جب آپ کی دہشت کم ہوئی تو آپ نے اپنی سن رسیدہ بیوی خدیجہ سے پوری کیفیت بیان کی اور کہا کہ یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ خدیجہ نے کہا:

کلا واللہ ما یخزیك اللہ ابدا۔ انك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق

ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ بے سہارا لوگوں کو کمانے کے قابل بناتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہیں

ایمان آدمی کے اندر فراست پیدا کرتا ہے

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مکہ سے مدینہ کے لئے ہجرت کی تو ان کے ساتھ عیاش بن ابی ربیعہ بھی تھے۔ یہ لوگ مدینہ پہنچ کر بنی عمرو بن عوف کے یہاں ٹھہرے۔ ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام اس کے بعد عیاش کی کھوج میں نکلے۔ وہ دونوں ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں تھے۔ وہ دونوں مدینہ پہنچے اور عیاش سے ملے اور ان سے باتیں کیں۔ انھوں نے عیاش سے کہا: تمھاری ماں نے قسم کھائی ہے کہ اس کے سر کو کنگھی نہ چھوئے گی اور نہ وہ دھوپ سے سایہ میں آئے گی جب تک تم کو دیکھ نہ لے۔" یہ باتیں سن کر عیاش کو اپنی ماں پر رحم آگیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: یہ لوگ تم کو تمھارے دین سے پھیر دینا چاہتے ہیں اس لئے تم ان سے بچ کر رہو:

فواللہ لو قد آذیٰ امك القمل لامتشطت ولو قد اشتد علیها حر مكة لاستظلت

خدا کی قسم جب تمھاری ماں کو جوں کاٹے گی تو ضرور وہ کنگھی کرے گی اور جب اس کو مکہ کی گرمی ستائے گی تو ضرور وہ سایہ میں جائے گی۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۳)

عیاش نے کہا میں چاہتا ہوں کہ ماں کو اس کی قسم سے بری کر دوں اور وہاں میرا مال ہے اس کو بھی لے لوں۔ پھر واپس آجاؤں گا۔ چنانچہ وہ مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں ان کے رشتہ داروں نے ان کو رسی میں باندھ دیا اور طرح طرح سے تکلیف دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر اپنے آبائی دین میں واپس چلے گئے۔

خدا کی رحمت وہی پاتا ہے جو خود بھی رحمت کرے

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: جو انسانوں پر رحم نہ کرے، اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا (من لا یرحم الناس لا یرحمہ اللہ)

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

۱۔	الاسلام	از مولانا وحیدالدین خاں	۱۵—۰
۲۔	مذہب اور جدید چیلنج	″	۱۵—۰
۳۔	ظہور اسلام	″	۱۵—۰
۴۔	دین کیا ہے	″	۲—۰
۵۔	قرآن کا مطلوب انسان	″	۵—۰
۶۔	تجدید دین	″	۳—۰
۷۔	اسلام دین فطرت	″	۳—۰
۸۔	تعمیر ملت	″	۳—۰
۹۔	تاریخ کا سبق	″	۳—۰
۱۰۔	مذہب اور سائنس	″	۵—۰
۱۱۔	عقلیات اسلام	″	۳—۰
۱۲۔	فسادات کا مسئلہ	″	۲—۰
۱۳۔	انسان اپنے کو پہچان	″	۱—۰
۱۴۔	تعارف اسلام	″	۲—۵۰
۱۵۔	اسلام پندرھویں صدی میں	″	۲—۰
۱۶۔	راہیں بند نہیں	″	۳—۰
۱۷۔	دینی تعلیم	″	۳—۰
۱۸۔	ایمانی طاقت	″	(زیر طبع)
۱۹۔	اتحاد ملت	″	
۲۰۔	سبق آموز واقعات	″	
۲۱۔	اسلامی تاریخ سے	″	
۲۲۔	قال اللہ	″	
۲۳۔	اسلامی دعوت	″	۳—۰۰
۲۴۔	زلزلۂ قیامت	″	۴—۰۰
۲۵۔	سچا راستہ	″	۱—۰۰

مالک تحسین خالد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپواکر دفتر رسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

APRIL 1981
ISSUE NO. 53

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

خوش فہم آدمی اکثر ایک ایسے سفر کے اختتام کا انتظار کرنے لگتا ہے جس کا ابھی تک اس نے آغاز بھی نہیں کیا ہے ——————

شمارہ ۵۴
مئی ۱۹۸۱
زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے
[illegible] ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے [illegible]
قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

مئی ۱۹۸۱

شمارہ ۵۴

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعلان

ادارہ الرسالہ کی طرف سے جس اجتماع کا اعلان اس سے پہلے کیا گیا تھا، اس کی تاریخیں ملتوی ہوگئی ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیلات کے لئے آئندہ اعلان کا انتظار فرمائیں۔

لوگ ہم سے پروگرام پوچھتے ہیں۔ فی الحال ہمارا پروگرام صرف یہ ہے کہ الرسالہ کی آواز کو عام کیا جائے جس کی بہترین صورت ایجنسی ہے۔ جو لوگ الرسالہ کے مشن سے متفق ہوں ان سے ہماری گزارش ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لے کر اس کو اپنے ماحول میں زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔ یہی اس وقت ہمارا پروگرام ہے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

خدا کی عینک سے

اگر آپ صاف شیشہ کی عینک لگائیں تو ہر چیز آپ کو اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دے گی۔ لیکن اگر آپ کی آنکھ پر رنگین شیشہ والی عینک ہو تو ہر چیز کا رنگ مصنوعی ہو جائے گا۔ اب ہر چیز آپ کو اس رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دے گی جو کہ آپ کی عینک کا رنگ ہے۔

یہی حال انسانی ذہن کا ہے۔ ہر آدمی جب دوسرے کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو اپنے ذہن کی "عینک" سے دیکھتا ہے۔ اگر اس کی عینک کا شیشہ صاف ہے تو ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دے گی۔ اور اگر اس کی عینک کا شیشہ رنگین ہو تو کوئی چیز خواہ حقیقت میں کیسی ہی ہو، اس کے اپنے دیکھنے میں ویسی ہی دکھائی دے گی جیسا کہ اس کی اپنی عینک کا رنگ ہے۔

آدمی کا ذہن یا تو خدائی ذہن ہوتا ہے یا ذاتی ذہن۔ وہ دوسروں کو یا تو خدا کی عینک سے دیکھتا ہے، یا اپنی ذاتی پسند کی عینک سے۔ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ خدا کی عینک سے دیکھنے والا دوسروں کو حقیقت واقعہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے نہ کہ اپنی متاثر نگاہ سے۔ وہ ہر آدمی کو ویسا ہی دیکھتا ہے جیسا کہ وہ فی الواقع ہے۔ کیونکہ خدا کے دیکھنے کا طریقہ یہی ہے۔ مگر دوسرے آدمی کا طریقہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ ہر آدمی کو اپنے مفاد اور اپنی عصبیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جس آدمی سے اس کی دوستی ہے وہ اس کو اچھی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور جس سے اس کا بگاڑ ہے وہ بری صورت میں۔ جو آدمی اس کے اپنے حلقہ کا ہے وہ اگر اس کو "سفید" نظر آئے تو دوسرے حلقہ کا آدمی اس کو "کالا" نظر آتا ہے۔

مومن وہ ہے جو ہر آدمی کو خدا کی نگاہ سے دیکھے نہ کہ اپنی ذاتی نگاہ سے۔

جو شخص چیزوں کو خدا کی نظر سے دیکھنے لگے وہ ایک بے پناہ انسان بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک سے وہی معاملہ کرتا ہے جو باعتبار واقعہ اسے کرنا چاہئے۔ وہ دنیا کے لحاظ سے ایک حقیقت پسند انسان بن جاتا ہے اور آخرت کے لحاظ سے ایک صالح انسان۔

قبر نہیں دروازہ

"حافظ جی کے لڑکے کا انتقال ہوگیا ہے۔ جنازہ کی نماز تیار ہے۔ میں آپ کو بلانے کے لئے آیا ہوں"۔ یہ سنتے ہی میں نے کتاب بند کی اور وضو کر کے ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

قبرستان پہنچا تو وہاں میرے سوا تھوڑے سے آدمی اور کھڑے تھے۔ گنا تو چھوٹے بڑے سترہ آدمی تھے جن میں میت کے گھر کے افراد بھی شامل تھے۔ مجھے ایک مہینہ پہلے کی بات یاد آئی جب کہ سیٹھ فضل علی کے ایک رشتہ دار کا جنازہ اسی قبرستان میں آیا تھا اور قبرستان کے خصوصی حصہ میں دفن ہوا تھا۔ اس دن آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ شمار کرنا مشکل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بستی کی تمام مسلم آبادی نکل آئی ہے۔

میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد محلہ کے امام صاحب نماز جنازہ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ میں نے بھی صف میں شامل ہو کر نیت باندھ لی مگر امام صاحب نے اتنی تیزی سے نماز پڑھائی کہ میں کوئی دعا بھی پوری نہ پڑھ سکا۔ بس جلدی جلدی چار بار اللہ اکبر کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے سلام پھیر دیا۔ لوگ اپنے جوتے پہن کر اطمینان کے ساتھ اس طرح کھڑے ہوگئے گویا "نماز جنازہ" کے نام سے جو کام انھیں کرنا تھا اس کو انھوں نے پوری طرح انجام دے دیا ہے۔

قبر قریب ہی تھی۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی کھودی جارہی ہے۔ لوگ دو دو چار چار کر کے ادھر اُدھر کھڑے ہوگئے۔ کوئی فرقہ وارانہ مظالم کی داستان سنانے لگا۔ کسی نے موسم کی سختی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کوئی بازار بھاؤ کے متعلق اپنی معلومات پیش کرنے لگا۔ غرض ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔

میں قبر کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ میرے ذہن میں وہ آیتیں اور حدیثیں گھوم رہی تھیں جن میں قیامت، حشر، جنت، دوزخ وغیرہ کے حالات بتائے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قبر ایک کھلا ہوا دروازہ ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر میں دوسری دنیا کے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرا دل بے قرار ہوگیا۔ میری زبان سے نکلا "زندگی کا اصل مسئلہ وہ نہیں ہے جس میں لوگ الجھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ وہ ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ اس وقت کس واقعہ کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک شخص کی عارضی دنیا سے حقیقی دنیا کی طرف روانگی کی تقریب ہے۔ یہ قبر جو ہمارے سامنے کھودی جارہی ہے، یہ قبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک دروازہ ہے جو ایک شخص کو دوسری دنیا میں داخل کرنے کے لئے کھولا گیا ہے۔ جانے والا ابھی اس دروازہ میں داخل ہو کر اُس پار چلا جائے گا۔

جب بھی کوئی شخص مرتا ہے تو یہ ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ اس وقت گویا تھوڑی دیر کے لئے اس دنیا کا دروازہ کھولا جاتا ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو اس کھلے ہوئے دروازہ سے دوسری دنیا کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے جہاں ہم میں سے ہر شخص کو ایک روز جانا ہے۔ مگر آج کی دنیا کے مناظر نے لوگوں کی نگاہوں کو اس قدر الجھا رکھا ہے کہ عین دروازہ پر کھڑے ہو کر بھی انھیں اس پار کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ وہ حقیقت کے انتہائی قریب پہنچ کر بھی حقیقت سے بے خبر رہ جاتے ہیں۔

خدا سے تعلق

بشیر بدر ایک شاعر تھے۔ بھوپال کی ایک مجلس میں انھوں نے اپنی غزل سنائی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

گفتگو ان سے روز ہوتی ہے   مدتوں سامنا نہیں ہوتا

اس مجلس میں ایک چھوٹا بچہ بھی تھا۔ اس نے یہ شعر سن کر کہا: "بشیر صاحب کیا ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی ہے"۔ بشیر بدر نے بچہ کا یہ تبصرہ سنا تو بولے: میاں صاحب زادے، تم نے تو میرے شعر کی کمر توڑ دی۔

بچہ کے گھر پر ٹیلی فون تھا۔ وہ روزانہ دیکھتا تھا کہ اس کے باپ بھائی کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس سے ٹیلی فون پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ ایک غیر موجود انسان سے ٹیلی فون پر گفتگو اس کے لئے ایک جانی پہچانی چیز تھی۔ مگر وہ ابھی عمر کے اس مرحلہ میں نہیں پہنچا تھا کہ یاد اور تصور کے ذریعہ ہونے والی گفتگو کو جانے۔ ٹیلی فون کے تاروں پر قائم ہونے والے ربط کا اسے تجربہ تھا۔ مگر یاد کے تاروں پر قائم ہونے والا ربط اس کے لئے ابھی تک لامعلوم چیز بنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے معلوم تجربہ پر قیاس کرتے ہوئے سمجھ لیا کہ سامنا نہ ہوتے ہوئے اگر گفت گو ہوتی ہے تو یقیناً وہ ٹیلی فون پر ہوتی ہوگی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین خدا سے اَن دیکھے روحانی تاروں پر مربوط ہونے کا نام ہے۔ دین نام ہے خدا سے ایسے تعلق کا جس میں بندے اور خدا کے درمیان سرگوشیاں جاری ہو جائیں۔ جب بندہ یادوں کی دنیا میں خدا کو پانے لگے۔ جب بندے کا یہ حال ہو جائے گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ جب بندہ خدا سے مانگے اور اس کو اس سے ملے۔ مگر جو لوگ صرف "ٹیلی فون" کی سطح پر ملاقات کو جانتے ہوں وہ اس غیر ٹیلی فونی ربط کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس قسم کی باتیں ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں جو خود ان تجربات سے نہ گزرے ہوں۔ جن کی فہم ابھی اس طفلانہ سطح پر ہو جب کہ آدمی صرف ظاہری تاروں پر قائم ہونے والے ربط کو جانتا ہے، وہ باطنی تاروں پر قائم ہونے والے ربط سے آشنا نہیں ہوتا۔

ایسے لوگ اپنے مزاج کے مطابق کسی نہ کسی ظاہری چیز میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا سے ربط قائم کرنے کے لئے کسی زندہ یا مردہ بزرگ کا وسیلہ ضروری ہے۔ کچھ لوگ کسی محسوس قبر کو تعلق باللہ کا ذریعہ سمجھ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ نوافل اور تسبیحات کی کثرت میں خدا کی قربت کا راز ڈھونڈتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک جلسے اور جلوس کی دھوم میں خدا ملتا ہے۔ کچھ لوگ "خدا دشمنوں" کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کی تحریک کو قربت خداوندی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

اس قسم کے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ دل گدازی کی سطح پر خدا سے مربوط ہونے کی تڑپ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ وہ بس کسی نہ کسی دکھائی دینے والے "تار" کو پکڑ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ وہ خدا سے ربط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

بیہقی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قریش کے سردار ایک روز مکہ میں جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے اندر سے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرو جو سحر اور کہانت اور شاعری کا بہترین جاننے والا ہو اور اس کو محمدؐ کے پاس بھیجو۔ اس شخص نے ہماری جماعت میں تفریق ڈال دی ہے۔ ہمارے معاملہ کو منتشر کر دیا ہے اور ہمارے دین کو عیب لگایا ہے۔ وہ محمدؐ سے جا کر بات کرے اور دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ اس کام کے لئے ہم عتبہ بن ربیعہ سے بہتر کسی شخص کو نہیں جانتے۔

اس کے بعد عتبہ بن ربیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا اے محمدؐ، تم بہتر ہو یا تمھارے باپ عبداللہ بہتر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، عتبہ نے دوبارہ کہا، تم بہتر ہو یا تمھارے دادا عبدالمطلب بہتر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی چپ رہے۔ عتبہ نے کہا، اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ یہ لوگ تم سے بہتر تھے تو انھوں نے انھیں معبودوں کی پرستش کی ہے جن کو تم عیب لگاتے ہو۔ اور اگر تمھارا خیال یہ ہو کہ تم ان سے بہتر ہو تو تم اپنی بات کہو تاکہ ہم سنیں۔ عتبہ جب اپنی بات سے فارغ ہو چکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر سورہ حم سجدہ کی ابتدائی تیرہ آیتیں پڑھیں۔

یہاں تک کہ آپ پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہنچے کہ ——— پس اگر وہ اعراض کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے صاعقہ (کڑکے) سے ڈراتا ہوں جیسا کڑکا عاد اور ثمود پر نازل ہوا (۱۳) عتبہ نے اس کو سن کر کہا: بس، کیا اس کے سوا کچھ اور تمھارے پاس نہیں۔ آپ نے کہا نہیں۔ عتبہ قریش کے پاس واپس آیا۔ اس کے بعد عتبہ اور قریش کے درمیان گفتگو کی جو روداد نقل ہوئی ہے اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

مافهمتُ شيئا مما قال غير انه انذركم صاعقة مثل صاعقة عاد وثمود۔ قالوا ويلك يكلمك الرجل بالعربية لاتدري ماقال۔ قال لا والله مافهمت شيئا مما قال غير ذكر الصاعقة	انھوں نے جو کہا میں اس کو کچھ نہیں سمجھا، سوا اس کے کہ انھوں نے تم کو عاد و ثمود جیسے کڑکے سے ڈرایا۔ قریش نے کہا، تمھارا برا ہو، آدمی تم سے عربی زبان میں کلام کرتا ہے اور تم سمجھے نہیں کہ اس نے کیا کہا۔ عتبہ نے کہا۔ خدا کی قسم میں کڑکے کے ذکر کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا۔

قرآن کی اکتالیسویں سورہ کی یہ آیتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ بن ربیعہ کو سنائیں ان کو پڑھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ عتبہ کی سمجھ میں کیوں نہ آسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآنی الفاظ کے عربی مفہوم کو تو وہ جانتا تھا مگر ان کے اندر چھپے ہوئے معانی سے وہ ناآشنا تھا۔

ان آیتوں میں آخرت کی اہمیت کا ذکر ہے جب کہ عتبہ صرف دنیا کی اہمیت سے باخبر تھا۔ ان میں خدا کی بڑائی کا چرچا ہے جب کہ عتبہ صرف انسانوں کی بڑائی سے آشنا تھا۔ ان میں کائنات کو خدائی نشانی کی حیثیت

سے پیش کیا گیا ہے جب کہ عتبہ کائنات کو صرف ایک مادی نشانی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ عتبہ کے جیننگ سطح وہ نہ تھی جو قرآن کی سطح ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن کے ان قیمتی الفاظ میں چھپی ہوئی معنویت کو سمجھنے سے عاجز رہا۔

حقیقت اتنی لطیف چیز ہے کہ وہ لفظوں کی پکڑ میں نہیں آتی۔ الفاظ محدود ہوتے ہیں اور حقیقت غیر محدود۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ حقیقت کو لفظوں میں ڈھالا جا سکے۔ آپ کسی کے کان میں الفاظ داخل کر سکتے ہیں مگر کسی کے کان میں معانی کو داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جو آدمی ٹیلی وژن کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو اس کو محض "ٹیلی وژن" کا لفظ بول کر آپ ٹیلی وژن سے باخبر نہیں کر سکتے۔ کوئی بات ہمیشہ لفظوں کے ذریعہ کہی جاتی ہے مگر الفاظ اصل بات کی علامت ہیں نہ کہ اصل بات کا بدل۔ وہ کون سا لفظ ہے جس میں آپ پھول کی خوشبو بھر سکیں۔ وہ کون سا لفظ ہے جس میں آپ سورج کی گرمی داخل کر سکیں۔ وہ کون سا لفظ ہے جو کہکشاں کی وسعتوں کی نمائندگی کر سکے۔

جو شخص پھول اور سورج اور کہکشاں سے واقف ہو اسی کے لئے پھول اور سورج اور کہکشاں کے الفاظ کوئی معنی رکھتے ہیں۔ مگر جو شخص پھول اور سورج اور کہکشاں کے بارے میں کوئی ذاتی واقفیت نہ رکھتا ہو اس کو محض یہ الفاظ بول کر آپ قدرت کے ان حیرت ناک واقعات سے متعارف نہیں کر سکتے جن کو پھول اور سورج اور کہکشاں کہا جاتا ہے۔ آپ پھول کا لفظ بول کر کسی کو اس کی خوشبو نہیں سنگھا سکتے۔ آپ سورج کا لفظ بول کر کسی کو اس کی روشنی اور حرارت کا تجربہ نہیں کرا سکتے۔ آپ کہکشاں کا لفظ بول کر کسی کو کہکشاں کی وسعتوں کا مشاہدہ نہیں کرا سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو جانے اسی کو بتایا جا سکتا ہے۔ جو نہ جانے اس کو کوئی بات بتانا ممکن نہیں۔ جہاں لوگ صرف الفاظ کی زبان سمجھتے ہوں وہاں معانی کی زبان میں کوئی نغمہ کس کے لئے چھیڑا جائے۔ جہاں لوگ صرف ظاہری حقیقتوں کو جانتے ہوں وہاں چھپے ہوئے حقائق سے پردہ کس کے لئے اٹھایا جائے۔ جہاں لوگ صرف اپنی ذات کی سطح پر جیتے ہوں وہاں اپنی ذات سے بلند سطح کی باتوں کا اظہار کس کے لئے کیا جائے۔ جہاں لوگ صرف شور وغل کو کام سمجھتے ہوں وہاں خاموش منصوبہ کا راز کھولا جائے تو کون ہوگا جو اس کو سنے اور کون ہوگا جو اس کو سمجھے۔ جب لوگوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو کیسے لوگوں کو بتایا جائے کہ یہاں ایک روشن سورج چمک رہا ہے۔ جب لوگوں نے اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا رکھے ہوں تو کیسے ان کو باخبر کیا جائے کہ یہاں ہرے بھرے درخت حمد الٰہی کے نغمے سنا رہے ہیں —— خدا منتظر ہے کہ کوئی اس کا نغمہ چھیڑے، کوئی اس کی حمد کا ترانہ سنائے۔ مگر انسانوں کے بھرے ہوئے سمندر میں کوئی نہیں جو خدا کا نغمہ گائے، جو آخرت کی بانسری بجائے۔ جو فرشتوں کے چھیڑے ہوئے تاروں سے ہم آواز ہو کر حقیقتِ اعلیٰ کے گیت گائے۔

ہر معاملہ میں احتیاط

غیر مومن ایک بے حس انسان ہوتا ہے اور مومن ایک حساس انسان ۔ مومن کی حساسیت صرف خدا یا اس کی مقدس چیزوں ہی میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ خدا کی تمام مخلوقات کے معاملہ میں ظاہر ہوتی ہے۔

مومن کا سابقہ جب کسی انسان سے پیش آتا ہے، خواہ وہ کمزور ہو یا طاقت ور، تو وہ ایک محتاط قلب کے ساتھ اس کے وہ تمام حقوق ادا کرتا ہے جو خدا نے ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے اوپر مقرر کئے ہیں ۔ وہ جب کسی جانور کو اپنے استعمال میں لاتا ہے تو اس وقت بھی وہ مہربانی کے تمام آداب کا لحاظ رکھتا ہے، حتیٰ کہ موذی جانوروں کو مارنا پڑے تو اس وقت بھی وہ ان کو بے رحمی کے ساتھ تکلیف دے دے کر مارنا اپنے لئے جائز نہیں سمجھتا۔ اس کی حساسیت اس میں بھی رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ کسی درخت کو خواہ مخواہ کاٹے اور کسی پھول کو بے ضرورت مسلے۔ پانی سے کام لیتے ہوئے بھی وہ اس کا خیال رکھتا ہے کہ بے فائدہ پانی نہ بہائے اور غیر ضروری طور پر خدا کی نعمت کو خرچ نہ کرے ۔

ایمان آدمی کے اندر جو احتیاط اور حساسیت پیدا کرتا ہے وہ اس کا عمومی مزاج بن جاتی ہے اور اس کی تمام کارروائیوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے ۔ اس کا بولنا، اس کا چلنا پھرنا، اس کا معاملہ کرنا، حتیٰ کہ بے جان اور بے زبان چیزوں کو کام میں لانا، سب کچھ اس کے اس عام مزاج کے ماتحت ہو جاتے ہیں ۔ جذباتی مواقع پر بھی وہ احتیاط کے پہلو کو نہیں بھولتا، قابو یافتہ ہونے کے باوجود کسی کو اس سے بے رحمی اور بے حسی کا تجربہ نہیں ہوتا۔

مومن آدمی وہ ہے جس کو یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور وہ اس سے اس کے تمام کھلے اور چھپے کا حساب لے گا۔ ایسا آدمی عین اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک محتاط آدمی بن جاتا ہے۔

جانوروں سے پیچھے

جنگلی ہرنوں کو اگر آپ جنگل میں دیکھیں تو وہ ہمیشہ غول کی صورت میں دکھائی دیں گے۔ ہرن، دوسرے اکثر جانوروں کی طرح، کبھی اکیلا نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ اپنی جماعت کے ساتھ رہتا ہے۔ ہرن کی زندگی کا مقصد اگرچہ غذا اور پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر جنگل کی دنیا میں ہر وقت چھوٹے جانوروں کو بڑے جانوروں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ہر جانور کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ اس سے بڑا جانور اس کو اپنا شکار نہ بنالے۔ اس لئے جنگل کے جانور الگ الگ نہیں رہتے۔ بلکہ غول کی صورت میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ساتھ چلتے ہیں۔ ساتھ بیٹھتے ہیں۔ ساتھ مل کر اپنے سب کام کرتے ہیں۔ ایسا وہ اس لئے کرتے ہیں کہ کوئی خطرہ پیش آئے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرسکیں۔ وہ نازک موقع پر دشمن کے مقابلہ میں اکیلے نہ رہیں۔ وحشی جانور اپنی ساری وحشت کے باوجود اپنے تحفظ کی خاطر اکٹھا ہو جاتے ہیں۔

جنگل کا ایک جانور جانتا ہے کہ تنہا رہنا گویا اپنے آپ کو اس کے لئے چھوڑ دینا ہے کہ دشمن جب بھی چاہے اس کو اپنا شکار بنالے۔ اس کے برعکس نظم اور اتحاد دشمن کے خلاف مضبوط دیوار ہیں۔ قدرت نے ہر جانور کو یہ سبق فطری طور پر سکھا دیا ہے۔ وہ اس سبق کو پوری طرح اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ وہ جنگل کی غیر محفوظ دنیا میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔

انسان بھی اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جس بات کو جانور صرف جبلّی طور پر جانتے ہیں وہ انسان کو عقلی اور شعوری طور پر معلوم ہے۔ مگر بہت کم مثالیں ملیں گی جب کہ انسان نے اس واقفیت کو عملی طور پر پوری طرح استعمال کیا ہو۔ وہ اکثر اس معاملہ میں ناکام ثابت ہوتا ہے۔ انسان، انسان ہونے کے باوجود جنگل کے وحشی جانوروں سے پیچھے ہے۔

انسان کیوں متحد نہیں رہ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد ہر شخص سے ایک قربانی مانگتا ہے۔ یہ قربانی کہ فرد اپنی انفرادیت کو اجتماع کے حوالے کردے۔ آدمی اپنی ذات کو اہمیت دینے کے بجائے پورے مجموعہ کو اہمیت دینے لگے۔ یہ انا کی قربانی ہے اور انا کی قربانی کسی آدمی کے لئے سب سے مشکل قربانی ہے۔ آدمی جان کو قربان کرسکتا ہے مگر وہ اپنی انا کو دوسرے کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ انسان کی یہی کمزوری ہے جو ہمیشہ اتحاد و اجتماعیت کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ جانور اس معنی میں اپنی کوئی انا نہیں رکھتے۔ کوئی چیز ان کے لئے عزت کا سوال نہیں بنتی، یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں۔ اتحاد کا راز بے انا ہونا ہے۔ جہاں اتحاد نہ ہو سمجھ لیجئے کہ وہاں بے انا انسانوں کا وجود نہیں۔

سب کچھ خدا کی طرف سے

سلسلہ میں مسلمان فوجیں ابو عبیدہؓ کی قیادت میں شام کو فتح کرتے ہوئے فلسطین تک پہنچ گئیں۔ عیسائی بیت المقدس میں قلعہ بند ہو گئے اور مسلم فوجوں نے اس کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ اس وقت عیسائیوں کی طرف سے صلح کی پیش کش ہوئی جس میں ایک خاص شرط یہ تھی کہ خلیفہ (عمر فاروقؓ) خود آکر عہد نامہ کی تکمیل کریں۔ حضرت ابو عبیدہ نے عیسائیوں کی اس پیش کش سے خلیفہ دوم کو مطلع کیا۔ آپ نے اصحاب سے مشورہ کیا اور بالآخر مدینہ سے نکل کر فلسطین کے لئے روانہ ہوئے۔

حضرت عمر فاروق کے ساتھ ایک اونٹ تھا اور ایک خادم۔ جب آپ مدینہ کے باہر پہنچے تو آپ نے خادم سے کہا۔ ہم دو ہیں اور سواری ایک ہے۔ اگر میں سواری پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمہارے اوپر ظلم کروں گا۔ اور اگر تم سواری پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کرو گے۔ اگر ہم دونوں اکٹھے سوار ہو جائیں تو ہم جانور کی پیٹھ توڑ ڈالیں گے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم راستہ کی تین باریاں مقرر کر لیں۔ چنانچہ سارا سفر اس طرح طے ہوا کہ ایک بار عمر فاروق بیٹھتے اور خادم اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتا۔ پھر خادم بیٹھتا اور عمر فاروق رضؓ اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتے۔ اس کے بعد کچھ دور تک اونٹ خالی چلتا اور دونوں اس کے ساتھ پیدل چل رہے ہوتے۔ اس طرح سارا سفر طے ہوتا رہا۔

حاکم نے روایت کیا ہے کہ اس سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ جب آپ اسلامی لشکر سے ملے تو ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ ایک تہ بند باندھے ہوئے ہیں اور کسی قسم کا کوئی سامان آپ کے پاس نہیں ہے۔ حضرت ابو عبیدہ (فوج کے افسر اعلیٰ) نے کہا کہ اے امیر المومنین آپ کو عیسائیوں کے فوجی افسروں اور ان کے مذہبی عہدیداروں سے ملنا ہے اور آپ اس حال میں ہیں۔ عمر فاروق نے کہا: اے ابو عبیدہ، کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا۔ ہم دنیا میں سب سے پست قوم تھے پھر اللہ نے اسلام کے ذریعہ ہم کو عزت دی۔ جب بھی ہم اس کے سوا کسی اور چیز کے ذریعہ عزت چاہیں گے تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا (انا کنا اذل قوم فاعزنا اللہ بالاسلام فمهما نطلب العز بغیر ما اعزنا اللہ بہ اذلنا اللہ)

عزت اور ذلت کو اللہ کی طرف سے سمجھنا ایک ایسا عقیدہ ہے جو آدمی کو بغیر کسی ہتھیار کے ہتھیار والا بنا دیتا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ایک ایسی خود اعتمادی سکھاتا ہے جو کسی خارجی سہارے کے بغیر اپنی اندرونی طاقت کے اوپر قائم ہوتی ہے اس کا خزانہ آدمی کے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر اور جس طاقت کی بنیاد اندرونی جذبہ پر ہو اس کو کوئی چھیننے والا کبھی چھین نہیں سکتا۔

وعظ کون کرے

ایک بزرگ نے فرمایا: وعظ وہ شخص کرے جس کو وعظ کا کم سے کم اتنا تقاضا ہو جتنا ایک شخص کو رفع حاجت کا ہوتا ہے۔ وعظ کا مطلب ریکارڈ بجانا نہیں ہے اور نہ یہ مقصد ہے کہ ایک شاندار تقریر کر کے لوگوں سے یہ داد لی جائے کہ خوب بولے۔ وعظ کا مطلب اپنے اندرون کو انڈیلنا ہے، ایک پائی ہوئی حقیقت کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ایک چھپی ہوئی بات کو لوگوں پر کھولنے کے لئے زندہ گواہ بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اس قسم کا وعظ محض کچھ الفاظ بولنا نہیں بلکہ ایک مشکل ترین عمل کرنا ہے۔ کوئی شخص حقیقی معنوں میں یہ عمل اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ وہ اپنی بات کو کہنے کے لئے اتنا مضطرب ہو چکا ہو کہ وہ محسوس کرے کہ اس کو ہر قیمت پر اپنی بات لوگوں تک پہنچانی ہے، خواہ اس کے لئے لوگ اس سے ناراض ہو جائیں اور خواہ اس کی راہ میں اس کو اپنا سب کچھ کھو دینا پڑے۔

یہی معاملہ تحریر کا بھی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اتنا زیادہ مطالعہ کرے کہ معلومات اس کے ذہن سے ابلنے لگیں۔ متعلقہ موضوع پر جو ذخیرہ تیار ہو چکا ہے اس کو چھاننے کے بعد وہ محسوس کرے کہ اب بھی کچھ لکھنے کے لئے باقی ہے۔ اس کا حال یہ ہو جائے کہ اس کی معلومات تھامے نہ تھمیں اور اس کی بے تابی روکے نہ رکے۔ جب یہ نوبت آجائے اس وقت آدمی کو لکھنے کے لئے اٹھنا چاہئے۔ اس کے بغیر جو لوگ لکھیں وہ صرف سفید کاغذ کو سیاہ کرنے کا کام کریں گے اور اس کے بغیر جو لوگ بولیں وہ صرف فضائی شور وغل میں اضافہ کا باعث ہونگے اس طرح کا لکھنا اور بولنا نہ سننے والوں کو کوئی فائدہ دیتا ہے اور نہ سنانے والوں کو۔

واعظ کا وعظ کوئی کھیل تماشا نہیں، وہ بندوں کے سامنے خدا کی نمائندگی ہے۔ اس کام کو کرنے کا حق صرف اس شخص کو ہے جو اپنی ہستی کو خدا میں گم کر دے۔ جو لوگ اس کے بغیر واعظ بنیں وہ حقیقۃً مجرم ہیں نہ کہ واعظ۔

البرٹ آئن سٹائن (۱۹۵۵ — ۱۸۷۹) نے زمان ومکان کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نے اس کو غیر معمولی شہرت دی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آئن سٹائن کی سائنسی قیمت حقیقتہً اس سے کم تھی جتنی اس کو شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی ایک توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ آئن سٹائن کی تحقیقات کا تعلق کائنات کی ابدی حقیقتوں سے تھا اور جو آدمی کائنات کی ابدی حقیقتوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے وہ لوگوں کی نظر میں خصوصی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ ایک مبصر نے لکھا ہے:

> Whoever finds that which enables us to obtain a deeper glimpse into the eternal secrets of nature has been given great grace. That was the grace of Albert Einstein's unique greatness — to try to find such thoughts
>
> The Hindustan Times, March 15, 1981

جو شخص کوئی ایسی دریافت کرتا ہے جو ہم کو اس قابل بنائے کہ ہم فطرت کے رازوں کی کوئی گہری جھلک دیکھ سکیں اس کو بہت زیادہ عزت دی جاتی ہے۔ البرٹ آئن سٹائن کو جو خصوصی عزت ملی وہ اسی لئے تھی کہ اس نے اس قسم کے افکار تک پہنچنے کی کوشش کی۔

کائنات کی ابدی حقیقتوں کو جاننے کی خواہش انسان کی فطرت میں اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے کو اس سے الگ نہیں کر سکتا۔ قدیم ترین زمانہ سے انسان فطرت کے ابدی رازوں کی کھوج میں رہا ہے۔ مگر ابھی تک وہ ان کو پا نہ سکا۔ انسان اگر اپنی ذاتی کوششوں سے اس حقیقت تک نہیں پہنچا تو وہ اس کے لئے معذور تھا۔ اس کی محدودیت اس کی راہ میں فیصلہ کن طور پر حائل تھی۔ تاہم سوال یہ ہے کہ قدیم ترین زمانہ سے پیغمبر اس راز سے پردہ ہٹاتے رہے ہیں۔ پھر تلاش کے باوجود انسان نے کیوں پیغمبروں کے جواب کو نہیں مانا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کا جواب اپنے ساتھ جزا و سزا اور جنت وجہنم کا تصور لاتا ہے۔ وہ انسان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی آزاد زندگی کو ختم کردے اور زمین پر ایک قسم کی پابند زندگی گزارے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی تلاش کے پیغمبرانہ جواب کو ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔ وہ برابر اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ فطرت کے رازوں کا کوئی ایسا حل دریافت کرے جو اس کی تلاش کا جواب تو ہو مگر وہ اس کی زندگی پر کوئی پابندی نہ لگائے، وہ اس کو مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا کرنے والا نہ ہو۔ بے شمار لوگ نام نہاد روحانی شخصیتوں کے جواب کو مان لیتے ہیں مگر وہ پیغمبروں کے جواب کو ماننے پر راضی نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ روحانی شخصیتوں کے جواب میں صرف روحانی آنند ہے، اس میں روحانی کھٹک کا کوئی خانہ نہیں۔ جب کہ پیغمبروں کا جواب آدمی سے اس کی آزادی چھین لیتا ہے، وہ زندگی بھر کے لئے آدمی کو آخرت کے اندیشے میں مبتلا کر دیتا ہے۔

کامیابی کا راز حقیقت سے مطابقت میں ہے نہ کہ حقیقت سے فرار میں۔ اگر اصل حقیقت وہی ہو جس کی طرف پیغمبروں نے رہنمائی کی ہے تو اس کے سوا کسی اور حقیقت کی تلاش میں لگنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ جو چیز فی الواقع موجود نہ ہو اس کو کوئی شخص کہاں سے برآمد کر سکتا ہے۔

دلیل کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا ہے

قرآن کی دوسری سورہ میں ارشاد ہوا ہے کہ پتھروں میں بعض ایسے پتھر ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں (وانّ منہا لما یھبط من خشیۃ اللہ، بقرہ ۷۴) اس آیت میں ہبوط سے مراد پہاڑ کے اوپر سے پتھر کا لڑھک کر گرنا (Landslide) ہے۔ پہاڑوں کے اوپر سے پتھروں کا گرنا دراصل ایک تمثیل ہے کہ انسان کو کس طرح خدا کے آگے گر پڑنا چاہئے۔ پتھر کا ہبوط انسان کے ہبوط کو ممثل کرتا ہے۔ اس صورت حال کی ایک مثال حضرت عمر فاروق کا واقعہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہ شدید طور پر متاثر ہوئے۔ حضرت عمر کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ آپ کی وفات ہوگئی ہے۔ وہ مسجد نبوی میں تلوار لے کر کھڑے ہوگئے اور کہنا شروع کیا کہ کچھ منافقین یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے۔ خدا کی قسم رسول اللہ کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے رب کے پاس گئے ہیں جیسے حضرت موسیٰ اپنے رب کے پاس گئے تھے۔ وہ اپنی قوم سے چالیس دن تک غائب رہے یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے کہ موسیٰ کی وفات ہوگئی۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح واپس آئیں گے جس طرح حضرت موسیٰ واپس آئے۔ پھر آپ ان لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹیں گے جو یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر آئے اور کہا کہ اے عمر چپ رہو۔ مگر وہ چپ ہونے پر راضی نہ ہوئے۔ جب حضرت ابوبکر نے دیکھا کہ حضرت عمر چپ نہیں ہو رہے ہیں تو لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر شروع کردی۔ اس تقریر میں حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اے لوگو سنو، جو شخص محمد کی پوجا کرتا تھا تو محمد کا انتقال ہوگیا۔ اور جو شخص اللہ کو پوجتا تھا تو اللہ زندہ ہے، اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے بلند آواز سے قرآن کی یہ آیت پڑھی: محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اور اللہ شکر کرنے والوں کو ثواب دے گا (آل عمران ۱۴۴)

اس آیت کو سننے کے بعد حضرت عمر فاروق کا جو حال ہوا وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

فواللہ ما ھو الّا ان سمعتُ ابابکر تلاھا
فعقرتُ حتی وقعتُ الی الارض ما تحملنی
رجلای وعرفتُ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خدا کی قسم جب ابوبکر نے یہ آیت پڑھی تو اس کو سن کر میں
دہشت زدہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ میں زمین پر گر پڑا،
میرے دونوں پاؤں میرا بوجھ نہ اٹھا سکے اور میں نے

قدمات (سیرۃ ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۳۳۵) جان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے

خدا کی دلیل آتے ہی عمر فاروق کا گر پڑنا عین ویسا ہی تھا جیسے پتھر بلندی سے گر پڑتا ہے۔ پتھر کا ہبوط خشیت کی تمثیل ہے اور عمر فاروق کا ہبوط خشیت کی تعمیل۔ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ جب اس کی کوئی بات سامنے آجائے تو آدمی ڈھٹائی نہ کرے بلکہ وہ خدا کے خوف سے اس کے آگے گر پڑے، وہ گر پڑنے کی حد تک اس کو مان لے۔ اس گر پڑنے کو خدا نے ہبوط حجری کی صورت میں ممثل کر دیا۔ اس نے پتھر کی صورت میں انسان کو دکھا دیا کہ جب کوئی خدائی معاملہ سامنے آجائے تو کس طرح اختیار کے باوجود وہ بے اختیار مخلوق کی طرح خدا کے آگے ڈھ پڑے۔ عمر فاروقؓ کے سامنے جب اس قسم کا لمحہ آیا تو وہ اللہ کے حکم کے آگے بالکل بے اختیار ہو کر گر پڑے۔ ہبوط حجری اور ہبوط عمری دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ایک جگہ یہ حقیقت بے اختیاری کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہے اور دوسری جگہ اختیار اور آزادی کے ساتھ۔ عمر فاروق کا یہ عمل اتنا کامل تھا کہ وہ خدا کی مقرر کردہ تمثیلی میزان سے ناپنے میں عین اس کے مطابق اترتا ہے۔

حضرت عمر کے سامنے اس وقت جو چیز آئی وہ بس قرآن کی ایک آیت تھی۔ یعنی بولے ہوئے چند الفاظ۔ وہ اس مجموعۂ الفاظ کو ماننے سے انکار کر سکتے تھے۔ اگر وہ اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کی خاطر اسے ٹھکرا دیتے تو قدیم عرب میں بہت سے لوگ آپ کا ساتھ دینے والے مل جاتے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے قول کی خوبصورت تاویل بھی کر سکتے تھے۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ میں وفات رسول کا منکر نہ تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ خلافت کا مسئلہ حل ہو جانے تک آپ کی وفات کو راز میں رکھا جائے۔ خلافت کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد اس کا اعلان کیا جائے۔ مگر انھوں نے نہ تو اس کا انکار کیا اور نہ تاویل کے ذریعہ اپنی ساکھ کو بحال رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے وہ دلیل کی صورت میں ظاہر ہونے والے خدا کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے کہ خدا خود عیاناً ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا کی عظمتوں میں جی رہے ہوں۔ دوسرے وہ جو کسی غیر خدائی عظمت میں سانس لیتے ہوں، خواہ یہ غیر خدا ان کی اپنی ذات ہو یا کوئی اور۔ پہلی چیز کا نام توحید اور دوسری چیز کا نام شرک ہے۔ جنت صرف ان خوش قسمت افراد کے لئے ہے جو خدا کی بڑائی میں جیتے ہوں، جن کی روح نے خدا کی عظمت میں اپنی غذا پائی ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ دوسری دوسری عظمتوں کو اپنی روح کی خوراک بنائے ہوئے ہوں وہی وہ لوگ ہیں جو جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ جنت خدا کا پڑوس ہے اور خدا کا پڑوس انھیں لوگوں کو مل سکتا ہے جو خدا میں جئے ہوں۔ جو لوگ دوسری دوسری چیزوں میں جئیں وہ خدا کے پڑوس میں کیونکر بسائے جا سکتے ہیں۔

خدا کے جتنے نبی آئے وہ سب عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ ان کے پاس جو مزید چیز تھی

وہ صرف بینہ (دلیل) تھی۔ اسی دلیل کے ماننے یا نہ ماننے پر قوموں کے لئے انعام یا سزا کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل دنیا کی زندگی میں خدا کا نمائندہ ہے۔ خدا کا پانے والا وہ ہے جو دلیل کے روپ میں خدا کو پالے۔ جو شخص دلیل کے روپ میں ظاہر ہونے والے خدا کو نہ پائے وہ خدا کے نزدیک اندھا ہے۔ اس کے لئے خدا کی رحمتوں کی دنیا میں کوئی حصہ نہیں۔

خدا کو دلیل کے روپ میں پانا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حق کی وضاحت جب دلیل کی زبان میں ہو جائے تو اس کے وزن کو محسوس کرنے میں آدمی کے لئے کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے۔ دلیل کا فیصلہ خواہ اپنی رائے کی موافقت میں جارہا ہو یا اس کے برعکس ہو۔ دلیل سے ثابت ہونے والی بات اپنی مصلحتوں کے مطابق ہو یا اس کے خلاف ہو۔ دلیل سے جو بات نکل رہی ہو اس میں اپنے فائدے باقی رہتے ہوں یا مجروح ہوتے ہوں، ہر حال میں آدمی دلیل کے وزن کو پوری طرح محسوس کرے۔ کوئی بھی نفسیاتی پیچیدگی یا دنیوی مفاد اس کے اوپر ایسا غالب نہ آئے کہ وہ دلیل کو دلیل کی صورت میں نہ دیکھ سکے۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دلیل کے وزن کو محسوس نہیں کر پاتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کے سوا کہیں اور اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اگر وہ ہر قسم کی غیر خدائی عظمتوں سے بلند ہو تو دلیل کے وزن کو پانا اس کے لئے کبھی مشکل نہ ہوگا۔

موجودہ دنیا میں خدا دلیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور آخرت میں خدا خود اپنی ذات کمال کے ساتھ عیاناً لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ قیامت میں ہر آدمی خدا کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ مگر مومن اور موحد وہ ہے جو دلیل کی صورت میں ظاہر ہونے والے خدا کے سامنے آج اسی طرح ڈھ پڑے جس طرح غیر مومن اور غیر موحد کل قیامت کے دن خدا کے سامنے ڈھ پڑے گا جب کہ وہ فرشتوں کے جلو میں عیاناً انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

خدا کی بات کے سامنے جھک جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی خدا کے معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔ ایک بچہ انگارہ کو ہاتھ میں اٹھا سکتا ہے۔ مگر ایک باہوش آدمی کبھی آگ کے انگارہ کو ہاتھ میں نہ لے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انگارہ کے مقابلہ میں اس کا ہاتھ کمزور ہے۔ اس کا یہ یقین اس کو انگارہ کے بارے میں آخری حد تک سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ انگارہ کے معاملہ کو وہ کبھی غیر سنجیدہ انداز میں نہیں لیتا۔ اسی طرح جس شخص کو خدا کی معرفت حاصل ہو۔ جو خدا کے عظمت و کمال کو پا گیا ہو وہ خدا کا معاملہ آتے ہی فوراً سنجیدہ ہو جائے گا۔ خدا کی طاقت انگارہ کی طاقت سے بے حساب گنا زیادہ ہے۔ پھر انگارہ کا علم جب آدمی کو پوری طرح سنجیدہ بنا دیتا ہے تو خدا کا علم اس کو کیوں سنجیدہ نہیں بنائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی بات آجانے کے باوجود جو شخص سنجیدہ نہ ہو وہ صرف اس کا ثبوت دے رہا ہے کہ خدا کے زبانی اقرار کے باوجود اس کو خدا پر یقین نہیں۔

نظر انداز کرو

"میں تمھاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا" کہنے والے نے کہا
"اپنی آنکھیں بند کر لو، میری صورت تمھیں دکھائی نہیں دے گی"
"میں تمھاری آواز سننا نہیں چاہتا" کہنے والے نے دوبارہ کہا
"اپنے کان بند کر لو، میری آواز تمھیں سنائی نہیں دے گی"

ڈرامہ کے دو کرداروں کا یہ سادہ مکالمہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت بیان کر رہا ہے۔ یہ حقیقت کہ جس مسئلہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے آدمی دوسروں کے پیچھے دوڑتا ہے، اس کو وہ اپنے آپ پر عمل کر کے زیادہ بہتر طور پر حل کر سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب آدمی کو کسی دوسرے شخص سے کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو وہ فوراً اس شخص کے خلاف کارروائی شروع کر دیتا ہے اور پھر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ نہ صرف پہلا مسئلہ بدستور باقی رہتا ہے بلکہ بے شمار نئے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہر مسئلہ کا زیادہ آسان اور یقینی حل یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کو اس سے ہٹا لے، اس سے الجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے آپ کو زیادہ مفید کاموں میں مصروف رکھے۔

کسی مفکر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "دوسروں کے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنے پیچھے پڑو، کیونکہ اپنے آپ کو پکڑ کر تم زیادہ بہتر طور پر دوسرے کو پکڑ سکتے ہو" اکثر لوگ زندگی کے اس راز کو نہیں جانتے۔ وہ اپنی طاقت اور اپنے وقت کا بڑا حصہ اپنے مفروضہ مخالفین کو سبق سکھانے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس طاقت اور وقت کو اپنی تعمیر میں لگائیں تو اپنے کو مضبوط اور کامیاب بنا کر وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے مخالفین کو سبق دے سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسرے شخص کی برائی کو نظر انداز کرنا ہمیشہ اس سے مقابلہ کرنے کا زیادہ کامیاب طریقہ ہوتا ہے۔ آپ کی بڑھی ہوئی طاقت آپ کے مخالف کو مرعوب کر کے بٹھا دیتی ہے۔ وہ آپ کے خلاف مزید کارروائی کرنے کا حوصلہ کھو دیتا ہے۔ اس کے برعکس جب آپ برائی کرنے والے سے اپنے کو الجھا دیں تو یہ ہمیشہ تھوڑے نقصان کو بچانے کی خاطر بڑے نقصان کو برداشت کرنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اس طرح آپ اپنے وقت اور قوت کو بھی ضائع کرتے ہیں اور دوسرے کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندر چھپی ہوئی مزید برائیوں کے ساتھ آپ کے اوپر پل پڑے۔

سماج کی ملی جلی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم کو کسی کی بات سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کسی کا کوئی کام ہمارے لئے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر تکلیف ہونا فطری ہے۔ مگر ایسے مواقع پر صبر سے کام لینے ہی میں ہر قسم کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اگر ہم برداشت نہ کریں اور بھڑ کر دوسرے سے لڑنے لگیں تو اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارے بھڑنے سے دوسرا شخص بھی بھڑتا ہے اور بات بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دوسرے کو برباد کرنے کی کوشش میں ہم خود اپنے آپ کو برباد کر لیتے ہیں۔

ایک شخص ایک مکان کی اوپر کی منزل پر رہتا تھا۔ نیچے خالی جگہ تھی جہاں لڑکے کبھی کبھی آ کر کھیلتے اور شور

مچاتے۔ اوپر والے کو لڑکوں کا شور پسند نہ تھا۔ اس نے منع کیا مگر لڑکے نہ مانے تاآخر ایک دن غصہ میں آکر اس نے یہ کیا کہ لڑکوں کے اوپر چھت سے گندا پانی گرا دیا۔ لڑکے اس میں بھیگ گئے۔ اب لڑکوں کے غصہ کی باری تھی انھوں نے آپے سے باہر ہو کر چھت کی طرف اینٹ کے ٹکڑے پھینکنے شروع کئے جو نیچے پڑے ہوئے تھے۔ ایک ٹکڑا آکر واش بیسن پر گرا جو اوپر والے کے مکان میں باہر کی جانب لگا ہوا تھا۔ چینی کا واش بیسن فوراً ٹوٹ گیا۔ لڑکے تو چند منٹ کے بعد بھاگ گئے مگر اس کا ٹوٹا ہوا قیمتی واش بیسن اس واقعہ کی افسوس ناک یادگار بن کر باقی رہ گیا۔ آدمی نے اگر لڑکوں کے شور کی طرف سے اپنے "کان" بند کر لئے ہوتے تو وہ شور سے بھی بچ جاتا اور واش بیسن کے نقصان سے بھی۔

کھونا بھی پانا ہے

"حادثات آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں" کسی مفکر کا یہ قول لوئی بریل (۱۸۵۲ — ۱۸۰۹) کی زندگی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ لوئی بریل ایک بڑھئی کا لڑکا تھا۔ ابھی وہ تین سال کا تھا کہ باپ کی دکان میں ایک حادثہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا۔ یہی فرانسیسی اندھا ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار اندھوں کے لئے پڑھنے لکھنے کا وہ علامتی طریقہ ایجاد کیا جس کو اسی کے نام پر بریل کا طریقہ (Braille System) کہا جاتا ہے۔ لوئی بریل کے لئے بظاہر دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ مگر اس کے شوق اور محنت نے تاریکی میں بھی ایک نئی روشنی کا راز دریافت کر لیا۔

اسی قسم کا واقعہ ہیلن کیلر (۱۹۶۸ — ۱۸۸۹) کا ہے۔ یہ امریکی خاتون ابھی صرف ڈیڑھ سال کی تھی کہ ایک مہلک بخار میں وہ اندھی اور بہری ہو گئی۔ چونکہ وہ نہ دیکھ سکتی اور نہ سن سکتی تھی اس لئے وہ بولنا بھی نہ سیکھ سکی۔ آنکھ اور کان دونوں سے محرومی نے اس کو بالکل بے بسی کی حالت میں ڈال دیا تھا۔ بظاہر اب ہیلن کیلر کے لئے ایک ہی انجام مقدر تھا۔ وہ کسی معذور خانہ میں کس مپرسی کی زندگی گزارتے ہوئے مر جائے۔ ہیلن کیلر نے آنکھ اور کان کھو دئے تھے مگر اس نے ہمت نہیں کھوئی تھی۔ اس نے طے کیا کہ وہ آنکھ نہ ہوتے ہوئے دیکھے گی اور کان نہ ہوتے ہوئے سنے گی۔ وہ ان خوش قسمت لوگوں کی مانند بنے گی جن کو قدرت کی طرف سے آنکھ اور کان حاصل ہوتے ہیں۔

جب آدمی عزم کرے تو راہیں بھی کھلنے لگتی ہیں۔ ہیلن کیلر کو اپنی مدد کے لئے ایک لائق ٹیچر مس سولیون مل گئی۔ ہیلن کیلر نے انگلی سے چھو کر پڑھنے والے حروف سیکھے۔ یہاں تک کہ اس کو پڑھنا آگیا۔ بہری ہونے کے باوجود اس نے اپنی محنت سے بولنا سیکھ لیا۔ اس نے یہ کیا کہ اس کی استانی جب بولتی تو وہ اس کے حلق پر اور اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حلق اور ہونٹ پر الفاظ کی حرکاتی شکل کو محسوس کرتی اور ان حرکتوں کو انگلی سے سمجھ کر اپنی زبان سے ان کی نقل کرتی۔ اس انوکھے قسم کی تعلیمی کوشش میں برسہا برس لگ گئے۔ مگر بالآخر اس کی کوشش کامیاب ہوئی۔ اس نے انگلیوں کی مدد سے الفاظ کی حرکتوں کو پہچانا اور ان کو اسی طرح دہرا دہرا کر بولنا سیکھ لیا۔ اب وہ باقاعدہ پڑھنے اور بولنے لگی۔ اس نے اپنی تعلیم میں اپنی انگلیوں کو آنکھ اور کان کا بدل بنا لیا۔ انگلیوں کی مدد سے اس نے پڑھنا سیکھا اور انگلیوں ہی کی مدد سے بولنا بھی۔

مس سولیون سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہیلن کیلر نے برکن کے اندھوں کے کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۰۴ میں گریجویٹ ہو کر نکلی۔ اب اس نے لکھنا بھی سیکھ لیا۔ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ دیکھنے اور سننے کی فطری استعداد سے محرومی کے باوجود اس نے تین زبانیں سیکھ لیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور اسپینی۔ اس نے دنیا بھر کا سفر کر کے اندھوں کی تعلیم پر لکچر دئے۔ اس کو ہارورڈ، گلاسگو، برلن اور دہلی کی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دیں۔ اس کے علاوہ اس کو اور بہت سے عالمی اعزازات ملے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی بڑا کارنامہ اکثر وہی لوگ انجام دیتے ہیں جو کسی بڑے حادثہ سے دو چار ہوئے ہوں۔ کسی کے ساتھ جب کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ اس کے اندر کی کے احساس کو بے پناہ حد تک جگا دیتا ہے۔ وہ اس چیز کو پانے کے لئے دوسروں سے زیادہ بے تاب ہو جاتا ہے جس کو وہ کسی وجہ سے دوسروں سے بہت کم پائے ہوئے ہے۔ اس کی یہ بیتابی اس کے اندر سوئی ہوئی بہت سی نئی نئی صلاحیتوں کو ابھار دیتی ہے۔ دوسرے لوگ جس چیز کو صرف جزئی محنت سے لینا چاہتے ہیں اس کو وہ اپنی ساری شخصیت لگا کر حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ تڑپ اس کے اندر ایک نیا انسان جگا دیتی ہے۔ "آنکھ" سے محروم ہونے والا اپنے "ہاتھ" سے پڑھنے کا راستہ نکال لیتا ہے۔ پیروں کو کھونے والا اپنی عقل کے ذریعہ اپنے سفر کی تدبیر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک اعتبار سے گھاٹا اٹھانے والا دوسرے اعتبار سے نفع حاصل کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

حادثات بظاہر امکانات کا خاتمہ ہیں۔ مگر وہ ایک نئے آغاز کا سبب بن سکتے ہیں۔ وہ آدمی کے اندر نیا ارادہ ابھارتے ہیں۔ اس کی چھپی ہوئی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ "پائے ہوئے" آدمیوں کے مقابلہ میں "کھوئے ہوئے" آدمیوں نے زیادہ بڑے کارنامے انجام دئے ہیں۔

ذمہ داری اپنی

ایک مفکر نے ایک مرتبہ بہت عمدہ بات کہی۔ اس نے کہا "آدمی ہر آن اپنے آپ کو ریڈیئیٹ (Radiate) کرتا رہتا ہے" مطلب یہ ہے کہ آدمی جو عمل کرتا ہے اس کے ذریعہ سے وہ ماحول کے اندر اپنا تعارف پھیلاتا رہتا ہے۔ جس طرح ریڈیم کا ایک ٹکڑا اپنے گرد و پیش اپنی شعاعیں بکھیرتا ہے اسی طرح انسان اپنے ہر رویہ سے دوسروں کو بتاتا رہتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

ایک دکان دار کا قصہ ہے۔ اس نے اپنے یہاں حساب لکھنے کے لئے ایک منیب رکھا۔ پہلے دن کام کرنے کے بعد منیب نے دکان دار کے یہاں غسل کیا اور اس کے بعد نل کو بند نہیں کیا، اس کو کھلا چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ اگلے دن منیب آیا تو دکان دار نے اس کو مہینہ بھر کی پوری تنخواہ پیشگی دیتے ہوئے کہا "اب آپ کل سے میرے یہاں آنے کی زحمت نہ کیجئے گا"

"کیوں" منیب نے حیرت کے ساتھ پوچھا "ابھی تو آپ نے صرف نل کو کھلا چھوڑا ہے" دکان دار نے کہا "اسی طرح اگر کسی دن آپ نے میرے کاروبار میں کوئی دراز کھلا چھوڑ دیا تو میری ساری دولت اس کے راستہ بہہ

جائے گی اور میں دیوالیہ ہو کر رہ جاؤں گا " ممکن ہے کہ دکان دار کے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے منیب نے اس کو دل ہی دل میں برا بھلا کہا ہو۔ اس کی نظر میں دکان دار بہت غلط آدمی ہو جس نے ذرا سی بات کو اتنا بڑھایا کہ اس کی ملازمت ختم کر دی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ میں اصل غلطی منیب کی ہے نہ کہ دکان دار کی۔ منیب کی لیاقت کو کوئی دکان دار صرف بہی کھاتہ کے صفحات میں نہیں دیکھے گا بلکہ اس کے ہر چھوٹے بڑے عمل کو دیکھ کر اس کے بارے میں رائے قائم کرے گا۔

اگر ماحول آپ کے ساتھ غلط رویہ اختیار کرے تو ہرگز ماحول کی شکایت نہ کیجئے۔ کیونکہ ماحول تو صرف آپ کے عمل کا ردعمل پیش کرتا ہے۔ ماحول آپ کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے وہ خود آپ کے اس تعارف کا نتیجہ ہے جو آپ نے ماحول کے اندر کرایا تھا گر آپ ماحول کے اندر اپنا اچھا تعارف کرائیں تو ناممکن ہے کہ ماحول آپ سے اچھا سلوک نہ کرے۔ اگر ماحول کا سلوک آپ کی امیدوں کے خلاف ہو تو صرف اپنے کو قصوروار ٹھہرایئے۔ کیونکہ ماحول آپ کے ساتھ اس کے سوا اور کچھ نہیں کرتا کہ وہ خود آپ کے عمل کے مثنیٰ کو آپ کی طرف لوٹاتا ہے۔ جو آپ نے ماحول کو دیا ہے وہی وہ آپ کو دے دیتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جس طرح بے شمار چھوٹے چھوٹے نقطے اور لکیریں مل کر ایک تصویر بناتے ہیں، اسی طرح آپ کا ہر لمحہ کا عمل دیکھنے والوں کے ذہن میں آپ کا نقش ترتیب دیتا رہتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ماحول کی نظر میں آپ کی ایک تصویر نہ بنے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ کے ساتھ ماحول کا معاملہ اس کے سوا کسی بنیاد پر ہو جو آپ نے اپنے روزانہ کے عمل سے اسے دیا ہے۔ آدمی ہر وقت اپنی ایک تاریخ بنا رہا ہے۔ کسی کی تاریخ اچھی ہے اور کسی کی بری۔ کسی کی تاریخ کتابوں میں لکھی جاتی ہے اور کسی کی صرف مقامی داستان ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر آدمی اپنے حلقہ میں ٹھیک ویسا ہی جانا جاتا ہے جیسا کہ اس نے اپنی تاریخ کے مطابق اپنے آپ کو بنایا ہے۔

آدمی ہر آن اپنے آپ کو ریڈیئیٹ کرتا رہتا ہے ——— اس قول کو یاد رکھئے، اور پھر آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہ ہوگی، کیونکہ آپ خود بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیں گے۔ اور اگر کسی کو شکایت کا موقع دیں گے تو پہلے سے اس کے لئے تیار رہیں گے کہ اس کی طرف سے آپ کو قابل شکایت بات برداشت کرنا ہے۔

آئینہ وہی دکھاتا ہے جو آپ فی الواقع ہیں۔ آئینہ میں کسی کے چہرہ پر دھبہ دکھائی دے تو وہ آئینہ سے نہیں لڑتا بلکہ خود اپنے دھبہ کو صاف کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دھبہ چہرہ پر ہے نہ کہ آئینہ پر۔ اسی طرح ماحول سے اگر آپ کو کوئی شکایت پیدا ہو تو ماحول پر غصہ نہ کیجئے۔ ماحول تو عین وہی چیز پیش کر رہا ہے جو آپ نے اپنے بارے میں ماحول کو بتایا ہے۔ ایسے ہر موقع پر اپنے آپ پر نظر ثانی کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اپنے آپ کو درست کرتے ہی ماحول کے آئینہ میں بھی آپ کی تصویر درست ہو گئی ہے۔

یہ تقریر ۲۱-۲۳ اپریل ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے بدن کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت بھی۔ اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ غور کریں۔ اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا، اس نے ان کے لباس اتروائے تاکہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کردے۔ وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے ۲۷-۲۶

دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ اس کی ظاہری چیزیں اس کی باطنی حقیقتوں کی علامت ہیں۔ ظاہری چیزوں پر غور کرکے آدمی چھپی ہوئی حقیقتوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی قسم کی ایک چیز لباس ہے۔

خدا نے انسان کو لباس دیا جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے حسن و وقار کو بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آدمی کے روحانی وجود کے لئے بھی اسی طرح ایک لباس ضروری ہے، یہ لباس تقویٰ ہے۔ تقویٰ آدمی کا معنوی لباس ہے۔ جو ایک طرف اس کو شیطان کے حملوں سے بچاتا ہے اور دوسری طرف اس کے باطن کو سنوار کر اس کو جنت کی لطیف و نفیس دنیا میں بسانے کے قابل بناتا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس کیا ہے۔ یہ ہے —— اللہ کا خوف، حق کا اعتراف، اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک معیار رکھنا، اپنے کو بندہ سمجھنا، تواضع کو اپنا شعار بنانا، دنیا میں گم ہونے کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ رہنا۔ آدمی جب ان چیزوں کو اپنائے تو وہ اپنے اندرونی وجود کو ملبوس کرتا ہے اور اگر وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو وہ اپنے اندرون کو ننگا کر لیتا ہے۔ ظاہری جسم کو کپڑے کا بنا ہوا لباس ڈھانکتا ہے اور باطنی جسم کو تقویٰ کا لباس۔

آدمی کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کو بہکاتا ہے۔ وہ خدا کے ممنوعہ درخت کو ہر قسم کے خیر کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ وہ ایسے معصوم راستوں سے اس کی طرف آتا ہے کہ آدمی کا گمان بھی نہیں جاتا کہ ادھر سے اس کی طرف گمراہی آرہی ہوگی۔ شیطان آدمی کے تمام نازک مقامات کو جانتا ہے اور انھیں نازک مقامات سے وہ اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ کبھی ایک بے حقیقت نظریہ کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کبھی ایک جزئی حقیقت کو کلی حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے لاتا ہے۔ کبھی معمولی چیزوں میں فوائد کا خزانہ بتا کر سارے لوگوں کو اس کی طرف دوڑا دیتا ہے۔ کبھی ایک بے فائدہ حرکت میں ترقی کا راز بتاتا ہے۔ کبھی ایک تخریبی عمل کو تعمیر کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

شیطان کن لوگوں کو بہکانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں پر کامیاب ہوتا ہے جو امتحان کے مواقع پر ایمان کا ثبوت نہیں دے پاتے۔ جو خدا کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے۔ جو دلائل کی زبان میں بات کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ جنھیں اپنے ذاتی رجحانات کے مقابلہ میں حق کے تقاضے کو ترجیح دینا گوارا نہیں ہوتا۔ جن کو ایسی سچائی سچائی نظر نہیں آتی جس میں ان کے فائدوں اور مصلحتوں کی رعایت شامل نہ ہو۔ جنھیں وہ حق پسند نہیں آتا جو ان کی ذات کو نیچا کرکے خود ان کے مقابلہ میں اونچا ہونا چاہتا ہو۔

اور جب وہ کوئی فحش (کھلی برائی) کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے ہوئے پایا ہے اور خدا نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔ کہو، اللہ کبھی برے کام کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے ذمہ وہ بات لگاتے ہو جس کا تمھیں کوئی علم نہیں۔ کہو کہ میرے رب نے قسط کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر نماز کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھو۔ اور اسی کو پکارو اسی کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ جس طرح اس نے تم کو پہلے پیدا کیا اسی طرح تم دوسری بار بھی پیدا ہوگے۔ ایک گروہ کو اس نے راہ دکھادی اور ایک گروہ ہے کہ اس پر گمراہی ثابت ہوچکی۔ انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنایا اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں ۳۰ — ۲۸

قدیم عرب میں لوگ ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے اور اس کی حمایت میں یہ کہتے کہ خدا کی عبادت دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو کر فطری حالت میں کرنا چاہئے۔ حالاں کہ برہنگی ایسی کھلی ہوئی برائی ہے جس کا برا ہونا عقل عام سے معلوم ہو سکتا ہے اسی طرح آدمی یہ عقیدہ قائم کرلیتا ہے کہ بے عملی اور سرکشی کے باوجود سفارشوں کی بنیاد پر خدا اس کو انعامات سے نوازے گا حالاں کہ وہ اپنے سرکش غلاموں کے معاملہ میں محض کسی کے کہنے سے ایسا نہیں کر سکتا۔ معمولی معمولی ناقابل فہم اعمال جن سے دنیا میں ایک گھر بھی نہیں بن سکتا ان سے یہ امید کرلیتا ہے کہ وہ آخرت میں اس کے لئے عالی شان محل تعمیر کر دیں گے الفاظ کا شور وغل جس سے دنیا میں ایک درخت بھی نہیں اگتا ان کے متعلق یہ خوش گمانی قائم کرلیتا ہے کہ وہ آخرت میں اس کے لئے جنت کے باغ اگا رہے ہیں۔

قسط سے مراد وہ منصفانہ روش ہے جو ہر ناپ میں پوری اترے، وہ عین وہی ہو جو کہ ہونا چاہئے۔ عبادت انسان کی ایک فطری خواہش ہے۔ وہ کسی کو سب سے اونچا مان کر اس کے آگے اپنے کو ڈال دینا چاہتا ہے۔ اس معاملہ میں قسط یہ ہوگا کہ آدمی صرف خدا کا عبادت گزار بنے جو اس کا خالق اور رب ہے۔ انسان کسی کو یہ مقام دینا چاہتا ہے کہ وہ اس کے لئے اعتماد کی بنیاد ہو۔ اس معاملہ میں قسط یہ ہوگا کہ آدمی خدا کو اپنی زندگی میں اعتماد کی بنیاد بنائے جو ساری طاقتوں کا مالک ہے۔ اسی طرح موت کے بعد ایک اور زندگی کو ماننا عین قسط ہے۔ کیونکہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ عدم سے وجود کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس لئے موت کے بعد دوبارہ پیدا ہونے کو ماننا عین اسی حقیقت کو ماننا ہے جو اول پیدائش کے وقت ہر آدمی کے ساتھ پیش آچکی ہے

حق کے داعی کا انکار کرنے کے لئے آدمی قدیم بزرگوں کا سہارا لیتا ہے۔ قدیم بزرگ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی عظمت تاریخی طور پر قائم ہو چکی ہے۔ ہر آدمی کی نظر میں ان کا برسرحق ہونا مسلمہ امر بنا ہوا ہوتا ہے۔ دوسری طرف سامنے کا داعی حق ایک نیا آدمی ہوتا ہے جس کے ساتھ ابھی تاریخ کی تصدیق جمع نہیں ہوئی ہے۔ قدیم بزرگ کو آدمی اس کی تاریخ کے ساتھ دیکھ رہا ہوتا ہے اور نئے داعی کو اس کی تاریخ کے بغیر۔ وہ قدیم بزرگوں کے نام پر داعی حق کا انکار کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ عین ہدایت پر ہے۔ مگر اس طرح کی غلط فہمی کسی کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتی۔ یہ خدا کے نام پر شیطان کی پیروی ہے نہ کہ حقیقۃً خدا کی پیروی۔

اے اولادِ آدم، ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہنو اور کھاؤ پیو۔ اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ کہو، اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا جو اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کھانے کی پاک چیزوں کو۔ کہو وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لئے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انہیں کے لئے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔ کہو، میرے رب نے تو بس فحش باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے وہ کھلی ہوں یا چھپی۔ اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاؤ جس کا تم علم نہیں رکھتے ۳۳-۳۱

عرب کے کچھ قبائل ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اس کو بڑی قربت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ ایسا کرتے کہ جب وہ حج کے لئے نکلتے تو بعض متعین چیزیں مثلاً بکری کا دودھ یا گوشت استعمال کرنا چھوڑ دیتے اور یہ خیال کرتے کہ وہ پرہیزگاری کا کوئی بڑا عمل کر رہے ہیں۔ یہ گمراہی کی وہ قسم ہے جس میں ہر زمانہ کے لوگ مبتلا رہے ہیں۔ ایسے افراد اپنی حقیقی اور مستقل زندگی میں دین کے تقاضوں کو شامل نہیں کرتے۔ البتہ چند مواقع پر کچھ غیر متعلق قسم کے بے فائدہ اعمال کا خصوصی اہتمام کر کے یہ مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین پر معمولی جزئیات کی حد تک عمل کر رہے ہیں۔ وہ خدا کی مرضیات پر کامل ادائگی کی حد تک قائم ہیں۔

انسان کے بارے میں اللہ کی اصل مرضی تو یہ ہے کہ آدمی اسراف سے بچے، وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز نہ کرے۔ وہ حلال کو حرام نہ کرے اور خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو اپنے لئے حلال نہ سمجھ لے۔ وہ فحش کاموں سے اپنے کو دور رکھے۔ وہ ان برائیوں سے بچے جن کا برا ہونا عقل عام سے ثابت ہوتا ہے۔ وہ بنی کی روش چھوڑ دے۔ جب بھی اس کے سامنے کوئی حق آئے تو ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر کے وہ حق کو اختیار کر لے۔ وہ شرک سے اپنے آپ کو پوری طرح پاک کرے، اللہ کے سوا کسی سے وہ برتر تعلق قائم نہ کرے جو صرف ایک خدا کا حق ہے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ اپنی پسند کا ایک طریقہ اختیار کرے اور اس کو بلا دلیل خدا کی طرف منسوب کر دے، اپنے ذاتی دین کو خدا کا دین کہنے لگے۔ وہ پوری طرح خدا کا بندہ بن کر رہے، ایسی کوئی روش اختیار نہ کرے جو بندہ ہونے کے اعتبار سے اس کے لئے درست نہ ہو۔

آخرت میں کسی کو جو نعمتیں ملیں گی وہ بطور انعام ملیں گی۔ اس لئے وہ صرف ان خدا کے بندوں کے لئے ہوں گی جن کے لئے خدا جنت میں داخلہ کا فیصلہ کرے گا۔ مگر دنیا میں کسی کو جو نعمتیں ملتی ہیں وہ محدود مدت کے لئے بطور آزمائش ملتی ہیں۔ اس لئے یہاں کی نعمتوں میں ہر ایک کو اس کے پرچۂ امتحان کے بقدر حصہ مل جاتا ہے۔ اس امتحان میں پورا اترنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی خود سامانِ امتحان سے دوری اختیار کرلے۔ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو مقرر کی ہوئی حدود کے مطابق استعمال کرے۔ وہ ان کے ملنے پر شکر کا جواب پیش کرے نہ کہ بے نیازی اور ڈھٹائی کا۔

اور ہر قوم کے لئے ایک مقررہ مدت ہے۔ پھر جب ان کی مدت آجائے گی تو وہ نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ اے بنی آدم، اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیات سنائیں تو جو شخص ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ میری آیات کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ ان کے نصیب کا جو حصہ لکھا ہوا ہے وہ انھیں مل کر رہے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کے لئے ان کے پاس پہنچیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں۔ وہ کہیں گے کہ وہ سب ہم سے کھوئے گئے۔ اور وہ اپنے اوپر اقرار کریں گے کہ بے شک وہ انکار کرنے والے تھے ۳۷ - ۳۴

موجودہ دنیا میں کسی کو کام کا موقع اسی وقت تک ہے جب تک اس کی امتحان کی مقررہ مدت پوری ہو جائے۔ فرد کی مدت اس کی عمر کے ساتھ پوری ہوتی ہے۔ مگر قوم کے بارے میں خدائی فیصلہ کے نفاذ کی اس قسم کی کوئی حد نہیں۔ اس کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ حق کے سامنے آنے کے بعد وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے۔ جس قوم کی مدت پوری ہو جائے اس کو کبھی غیر معمولی عذاب بھیج کر فنا کر دیا جاتا ہے اور کبھی اس کی سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کو عزت و بڑائی کے مقام سے ہٹا دیا جائے۔

کسی آدمی کے لئے جنت یا دوزخ کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے جب حق آیا تو اس نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ جب بھی کوئی حق ایسے دلائل کے ساتھ سامنے آجائے جس کی صداقت پر آدمی کی عقل گواہی دے رہی ہو تو اس آدمی پر گویا خدا کی حجت پوری ہو گئی۔ اس کے بعد بھی اگر آدمی اس حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ یقیناً کبر کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا رکھنے کی نفسیات اس کے لئے رکاوٹ بن گئی کہ وہ حق کو بڑا بنا کر اس کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا بنانے پر راضی کرلے۔ ایسے آدمی کے لئے خدا کے یہاں جہنم کے سوا کوئی انجام نہیں۔

آدمی جب بھی حق کا انکار کرتا ہے تو وہ کسی اعتماد کے اوپر کرتا ہے۔ کسی کو دولت و اقتدار کا اعتماد ہوتا ہے۔ کوئی اپنی عزت و مقبولیت پر بھروسہ کئے ہوئے ہوتا ہے۔ کسی کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ اس کے معاملات اتنے درست ہیں کہ حق کو نہ ماننے سے اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ کسی کو یہ ناز ہوتا ہے کہ اس کی ذہانت نے اپنی بات کو عین خدا کی بات ثابت کرنے کے لئے شاندار الفاظ دریافت کر لئے ہیں۔ مگر یہ انسان کی بہت بڑی بھول ہے۔ وہ آزمائش کی چیزوں کو اعتماد کی چیز سمجھے ہوئے ہے۔ قیامت کے دن جب یہ تمام جھوٹے سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو اس وقت اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ وہ محض سرکشی کی بنا پر حق کا انکار کرتا رہا۔ اگرچہ اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لئے وہ بہت سے اصولی الفاظ بولتا تھا۔

خدا کہے گا، داخل ہو جاؤ آگ میں جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں کے ساتھ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ جب بھی کوئی گروہ جہنم میں داخل ہوگا وہ اپنے ساتھی گروہ پر لعنت کرے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اس میں جمع ہو جائیں گے تو ان کے پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں کہیں گے، اے ہمارے رب، یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا پس تو ان کو آگ کا دہرا عذاب دے۔ خدا کہے گا کہ سب کے لئے دہرا ہے مگر تم نہیں جانتے۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے، تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ پس اپنی کمائی کے نتیجہ میں عذاب کا مزہ چکھو ۳۹ ـ ۳۸

اس آیت میں "امت" سے مراد گمراہ کرنے والے لیڈر اور "اخت" سے مراد گمراہ ہونے والے عوام ہیں۔ آخرت میں جب ہر دور کے بے راہ قائدین اور ان کا ساتھ دینے والے بے راہ عوام جہنم میں ڈالے جائیں گے تو یہ ایک بڑا عبرت ناک منظر ہوگا۔ دنیا میں تو وہ ایک دوسرے کے بڑے خیر خواہ اور فداکار بنے ہوئے تھے۔ قائدین اپنے عوام کی ہر خواہش کا احترام کرتے تھے اور عوام اپنے قائدین کو ہیرو بنائے ہوئے تھے۔ مگر جب جہنم کی آگ انھیں پکڑے گی تو ان کی آنکھوں سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جائیں گے۔ اب ہر ایک دوسرے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے لگے گا۔ پیروی کرنے والے اپنے قائدین سے کہیں گے کہ تم پر لعنت ہو۔ تمھاری قیادت کیسی بری قیادت تھی جس نے چند دن کے جھوٹے تماشے دکھائے اور اس کے بعد ہم کو اتنی بڑی تباہی میں ڈال دیا۔ اس کے جواب میں قائدین اپنے پیروؤں سے کہیں گے کہ تم اپنی پسند کا ایک دین چاہتے تھے اور ایسا دین ہمارے پاس دیکھ کر ہمارے پیچھے دوڑ پڑے۔ ورنہ عین اسی زمانہ میں ایسے بھی خدا کے بندے تھے جو تم کو کامیابی کے سچے راستہ کی طرف بلاتے تھے۔ تم نے ان کی پکار سنی مگر تم نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

رہنما اپنے پیروؤں سے کہیں گے کہ تم کسی اعتبار سے ہم سے بہتر نہیں ہو۔ ہم نے اپنی خواہشوں کی خاطر قیادتیں کھڑی کیں اور تم نے بھی اپنی خواہشوں کی خاطر ہمارا ساتھ دیا۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں کا درجہ ایک ہے۔ اس لئے یہاں تم کو بھی وہی سزا بھگتنی ہے جو ہمارے لئے ہمارے اعمال کے سبب سے مقدر کی گئی ہے۔

پیروؤں کی جماعت اپنے رہنماؤں کے بارے میں خدا سے کہے گی کہ انھوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا اس لئے ان کو ہمارے مقابلہ میں دگنا عذاب دیا جائے۔ جواب ملے گا کہ تمھارے رہنماؤں میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب مل رہا ہے مگر تم کو اس کا احساس نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہنم میں جس کو جو عذاب ملے گا وہ اس کو اتنا زیادہ سخت معلوم ہوگا کہ وہ سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ تکلیف میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ہر شخص جس تکلیف میں ہوگا وہی تکلیف اس کو سب سے زیادہ معلوم ہوگی۔

دنیا میں مفاد پرست رہنما اور ان کے مفاد پرست پیرو خوب ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے پاس دوسرے کے لئے عمدہ الفاظ ہیں۔ ہر ایک دوسرے کی بہتری میں لگا ہوا ہے۔ مگر آخرت میں ہر ایک دوسرے سے نفرت کرے گا، ہر ایک دوسرے کو شدید تر عذاب میں دھکیلنا چاہے گا۔

بے شک جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ان کے لئے دوزخ کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا۔ اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ــــــ ہم کسی شخص پر اس کی طاقت کے موافق ہی بوجھ ڈالتے ہیں ــــــ یہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے سینہ کی ہر خلش کو ہم نکال دیں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہم کو یہاں تک پہنچایا اور ہم راہ پانے والے نہ تھے اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ کرتا۔ ہمارے رب کے رسول سچی بات لے کر آئے تھے۔ اور آواز آئے گی کہ یہ جنت ہے جس کے تم وارث ٹھہرائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے ۴۰-۴۳

خدا کے داعیوں کے مقابلہ میں کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ان کے مدعو کے اندر متکبرانہ نفسیات جاگ اٹھتی ہیں اور وہ داعی کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داعی کی طرف صرف نشانی (دلیل) کا زور ہوتا ہے اور مدعو کی طرف مادی رونقوں کا زور۔ داعی دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے اور اس کے مدعو مادیات کی بنیاد پر۔ دلیل کی طاقت دکھائی نہیں دیتی اور مادی طاقت آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے۔ یہی فرق لوگوں کے اندر کبر کا مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ لوگ داعی کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کا خدا کی رحمت میں داخل ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا۔ انھوں نے خدا کو نظر انداز کیا اس لئے خدا نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا۔ خدا نے اپنے داعی کے ذریعہ ان کو اپنی جھلکیاں دکھائیں۔ خدا ان کے سامنے دلائل کے روپ میں ظاہر ہوا۔ مگر انھوں نے اس کو بے وزن سمجھا۔ انھوں نے خدائی نشانیوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ ایسے لوگ کیوں کر خدا کی رحمتوں میں حصہ پا سکتے ہیں۔

دوزخیوں کا یہ حال ہوگا کہ جو لوگ دنیا میں ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے وہ وہاں باہم متنفر ہو جائیں گے اور ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہوں گے۔ مگر جنت کا ماحول اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ یہاں سب کے دل ایک دوسرے کے لئے کھلے ہوئے ہوں گے۔ ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لئے محبت اور خیر خواہی کا چشمہ پھوٹ رہا ہوگا۔ دوزخی انسان کے لئے اس کا ماضی ایک دکھ بھری داستان بنا ہوا ہوگا اور جنتی انسان کے لئے اس کا ماضی ایک خوش گوار یاد۔

برے لوگوں کے لئے ان کی اگلی زندگی اس طرح شروع ہوگی کہ ان کا سینہ حسرت اور یاس کا قبرستان بنا ہوا ہوگا۔ ان کا ماضی ان کے لئے تلخ یادوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ دوسری طرف اچھے لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ ان کی زبانیں اس خدا کی یاد سے تر ہوں گی جس کو انھوں نے بجا طور پر اپنا سہارا بنایا تھا۔ وہ حق کے علم برداروں کی دی ہوئی خبر کو عین سچا پا کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ خدا کا یہ کتنا بڑا احسان تھا کہ اس نے انھیں ان داعیان حق کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائی۔

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے کہ ہم نے ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو سچا پایا، کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدہ کو سچا پایا۔ وہ کہیں گے ہاں۔ پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔ جو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اس میں کجی ڈھونڈتے تھے اور وہ آخرت کے منکر تھے ۴۴-۴۵

انحکایات میں قدیم زمانہ کے کچھ لوگوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ جنت اور جہنم تو ایک دوسرے سے بہت زیادہ دور واقع ہوں گی، جنت آسمانوں کے اوپر ہوگی اور دوزخ سب سے نیچے تحت الثریٰ میں۔ پھر جنت والوں کی آواز جہنم والوں تک کس طرح پہنچے گی۔ مگر اب ریڈیو اور ٹیلی وژن کے دور میں یہ سوال کوئی سوال نہیں۔ آج انسان یہ جان چکا ہے کہ دور کے فاصلوں سے کسی کو دیکھنا بھی ممکن ہے اور اس کی آواز سننا بھی۔ جو بات قدیم انسان کو ناقابل فہم نظر آتی تھی وہ آج کے انسان کے لئے خود اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں پوری طرح قابل فہم ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی کوئی بات اگر آج کی معلومات کی روشنی میں سمجھ میں نہ آرہی ہو تو اس بنا پر اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگانا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ علم کے اضافہ کے بعد کل وہ چیز ایک جانی پہچانی چیز بن جائے جو آج بظاہر انجان چیز کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ آخرت میں جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان تعلق موجودہ قسم کے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعہ قائم ہوگا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جدید دریافتوں نے اس بات کو قابل فہم بنا دیا ہے کہ خدا کی کائنات میں ایسے انتظامات بھی ممکن ہیں کہ ایک حصہ سے بہت دور رہ کر بھی دو آدمی ایک دوسرے کو دیکھیں اور ایک دوسرے سے بخوبی طور پر بات کریں۔

کسی دلیل کا وزن آدمی اسی وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ جو لوگ آخرت کو اہمیت نہ دیں وہ آخرت سے متعلق دلائل کا وزن بھی محسوس نہیں کر پاتے۔ آخرت کی بات ان کے سامنے انتہائی مضبوط دلائل کے ساتھ آتی ہے۔ مگر اس کے بارے میں ان کا غیر سنجیدہ ذہن اس کے اندر کوئی نہ کوئی عیب تلاش کر لیتا ہے۔ وہ طرح طرح کے اعتراض نکال کر خود بھی شک و شبہ میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی شک و شبہ میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں سخت مجرم ہیں۔ وہ آخرت میں صرف خدا کی لعنت کے مستحق ہوں گے خواہ دنیا میں وہ اپنے کو خدا کی رحمتوں کا سب سے بڑا حق دار سمجھتے رہے ہوں۔

کوئی دلیل خواہ کتنی ہی وزنی اور قطعی ہو، آدمی کے لئے ہمیشہ یہ موقع رہتا ہے کہ وہ کچھ خوبصورت الفاظ بول کر اس کی صداقت کے بارے میں لوگوں کو مشتبہ کر دے۔ عوام ایک حقیقی دلیل اور ایک لفظی شوشہ میں فرق نہیں کر پاتے اس لئے وہ اس قسم کی باتیں سن کر حق سے بدک جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اس طرح کے شوشے نکال کر لوگوں کو حق سے بدکاتے ہیں وہ آخرت کے دن خدا کی رحمتوں سے آخری حد تک دور ہوں گے۔

اور دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی۔ اور اعراف کے اوپر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو۔ وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر وہ امیدوار ہوں گے۔ اور جب دوزخ والوں کی طرف ان کی نگاہ پھیری جائے گی تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم کو شامل نہ کرنا ان ظالم لوگوں کے ساتھ۔ اور اعراف والے ان اشخاص کو پکاریں گے جنھیں وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ تمہارے کام نہ آئی تمہاری جماعت اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کی نسبت تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ ان کو کبھی اللہ کی رحمت نہ پہنچے گی۔ جنت میں داخل ہو جاؤ، اب نہ تم پر کوئی ڈر ہے اور نہ تم غمگین ہوگے ۴۶ ـ ۴۹

دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کی جانب سے آئی ہوئی سختیوں سے مومن و مسلم سب یکساں دوچار ہوتے ہیں۔ مگر آخرت میں ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں دونوں کے درمیان "آڑ" قائم ہو جائے گی۔ وہاں مومنین کو ملی ہوئی نعمتوں کی کوئی خوشبو کافروں کو نہیں ملے گی اور اسی طرح کافروں کو ملی ہوئی تکلیفوں کا کوئی اثر جنت والوں تک نہیں پہنچے گا۔

عرف کے معنی عربی زبان میں بلندی کے ہوتے ہیں۔ اعراف والے کا مطلب ہے بلندیوں والے۔ اس سے مراد پیغمبروں اور داعیوں کا گروہ ہے جنھوں نے مختلف وقتوں میں لوگوں کو حق کا پیغام دیا۔ قیامت میں جب لوگوں کا حساب ہوگا اور ہر ایک کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے اور داعیٔ حق کی بات جو وہ دنیا میں کہتا تھا آخری طور پر صحیح ثابت ہو چکی ہوگی اس وقت ہر داعی اپنی قوم کو خطاب کرے گا۔ خدا کے حکم سے آخرت میں ان کے لئے اونچے اسٹیج مہیا کیا جائے گا جس پر کھڑے ہو کر وہ پہلے اپنے ماننے والوں کو خطاب کریں گے۔ یہ لوگ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر وہ اس کے امیدوار ہوں گے۔ اس کے بعد ان کا رخ ان کے جھٹلانے والوں کی طرف کیا جائے گا۔ وہ ان کی بری حالت دیکھ کر کمال عبدیت کی وجہ سے کہہ اٹھیں گے کہ خدایا ہمیں ان ظالموں میں شامل نہ کر۔ وہ گروہ منکرین کے لیڈروں کو ان کے چہرہ کی ہیئت سے پہچان لیں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم کو اپنے جس جتھے اور اپنے جس سازوسامان پر گھمنڈ تھا اور جس کی وجہ سے تم نے ہمارے پیغام حق کو جھٹلا دیا وہ آج تمہارے کچھ کام نہ آسکا۔

حق کا انکار کرنے والے وقت کے قائم شدہ نظام کے سایہ میں ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں ان کی حیثیت ہمیشہ مضبوط ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ حق کے داعیوں کا ساتھ دیتے ہیں ان کا ساتھ دینا صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ وقت کے جمے ہوئے نظام کی سرپرستی انھیں حاصل نہ رہے۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ حق کو نہیں مانتے وہ ماننے والوں کی بے چارگی کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی جنتوں میں جائیں گے۔ اصحاب اعراف قیامت میں ایسے لوگوں سے کہیں گے کہ اب دیکھ لو کہ حقیقت کیا تھی اور تم اس کو کیا سمجھے ہوئے تھے۔ بالآخر کون کامیاب رہا اور کون ناکام ٹھہرا۔

اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ پانی ہم پر ڈال دو یا اس میں سے جو اللہ نے تمھیں کھانے کو دے رکھا ہے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ نے ان دونوں چیزوں کو کافروں کے لئے حرام کر دیا ہے۔ وہ جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا لیا تھا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ پس آج ہم ان کو بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور جیسا کہ وہ ہماری نشانیوں کا انکار کرتے رہے ۵۰-۵۱

دنیا دو قسم کی غذاؤں کا دسترخوان ہے۔ ایک دنیوی اور دوسری اخروی۔ ایک انسان وہ ہے جس کی روح کی غذا یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو نمایاں ہوتے ہوئے دیکھے۔ دنیا کی رونقیں اپنے گرد پا کر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مادی ساز و سامان کا مالک ہو کر وہ اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے۔ ایسا آدمی خدا اور آخرت کو بھولا ہوا ہے۔ اس کے سامنے خدا کی بات آئے گی تو وہ اس کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دے گا۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سرسری سلوک کرے گا جیسے وہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ ہو بلکہ محض کھیل تماشا ہو۔

ایسے آدمی کے لئے آخرت کے انعامات میں کوئی حصہ نہیں۔ اس نے اپنے اندر ایک ایسی روح کی پرورش کی جس کی غذا صرف دنیا کی چیزیں بن سکتی تھیں۔ پھر آخرت کی چیزوں سے اس کی روح کیونکر اپنی خوراک پا سکتی ہے، جو انسان آج آخرت میں نہ جیا ہو اس کے لئے آخرت، کل کے دن بھی زندگی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

دوسرا انسان وہ ہے جو غیبی حقیقتوں میں گم رہا ہو۔ جس کی روح کو آخرت کی یاد میں لذت ملی ہو۔ جس کی غذا یہ رہی ہو کہ وہ خدا میں جئے اور خدا کی فضاؤں میں سانس لے۔ یہی وہ انسان ہے جس کے لئے آخرت رزق کا دسترخوان بنے گی۔ وہ جنت کے باغوں میں اپنے لئے زندگی کا سامان حاصل کرے گا۔ اس نے عالم غیب میں خدا کو پایا تھا اس لئے عالم شہود میں بھی وہ خدا کو پالے گا۔

خدا کی دنیا میں آدمی خدا کو کیوں بھلا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا ایسی نشانیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے جو صرف سوچنے سے ذہن کی پکڑ میں آتی ہیں، جب کہ دنیا کی چیزیں آنکھوں کے سامنے اپنی تمام رونقوں کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ آدمی ظاہری چیزوں کی طرف جھک جاتا ہے اور خدا کی طرف اشارہ کرنے والی نشانیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر ایسا ہر عمل دنیا کی قیمت پر آخرت کو چھوڑنا ہے۔ اور جس نے موت سے پہلے والی زندگی میں آخرت کو چھوڑا وہ موت کے بعد والی زندگی میں بھی آخرت سے محروم رہے گا۔

اللہ جب ایک چیز کو حق کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے لائے اور وہ اس کو اہمیت نہ دیں، وہ اس کے ساتھ غیر سنجیدہ معاملہ کریں تو یہ دراصل خود خدا کو غیر اہم سمجھنا اور اس کے ساتھ غیر سنجیدہ معاملہ کرنا ہے۔ دنیا میں حق کو نظر انداز کرنے سے آدمی کا کچھ بگڑتا نہیں، حق کی پشت پر جو خدائی طاقتیں ہیں وہ ابھی غیب میں ہونے کی وجہ سے اس کو نظر نہیں آتیں۔ یہ صورت حال اس کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ جو لوگ اس طرح حق کو نظر انداز کریں وہ یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ خدا بھی آخرت کے دن انھیں نظر انداز کر دے۔

اور ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنیاد پر مفصل کیا ہے، ہدایت اور رحمت بنا کر ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔ کیا اب وہ اسی کے منتظر ہیں کہ اس کا مضمون ظاہر ہو جائے۔ جس دن اس کا مضمون ظاہر ہو جائے گا تو وہ لوگ جو اس کو پہلے بھولے ہوئے تھے بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے پیغمبر حق لے کر آئے تھے۔ پس اب کیا کوئی ہماری سفارش کرنے والے ہیں کہ ہماری سفارش کریں یا ہم کو دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ ہم اس سے مختلف عمل کریں جو ہم پہلے کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور ان سے گم ہو گیا وہ جو وہ گھڑتے تھے ۵۲-۵۳

قرآن آدمی کو موت کے بعد آنے والی زندگی سے ڈراتا ہے، وہ آخرت کے حساب کتاب سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر آدمی چوکنا نہیں ہوتا۔ قرآن کی یہ خبریں اگرچہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ وہ کائنات کی اٹل حقیقتیں ہیں۔ تاہم ابھی وہ واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئیں، ابھی وہ مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس بنا پر غافل انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ وہ ان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

مگر یہ باتیں خدا کی طرف سے ہیں جو تمام باتوں کا جاننے والا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی فطرت کو بگاڑا نہیں ہے۔ جن کی آنکھوں پر مصنوعی پردے نہیں پڑے ہوئے ہیں وہ قرآن کی ان باتوں کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔ وہ ان کو عین وہی چیز معلوم ہوگی جس کی تلاش ان کی فطرت پہلے سے کر رہی تھی۔ قرآن ان کے لئے زندگی اور یقین کا خزانہ بن جائے گا۔

اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہے جو قرآن کی آگاہی کو کوئی سنجیدہ چیز نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی اسی غفلت کی حالت میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ وہ وقت ان پر پھٹ پڑے جس کی خبر انھیں دی جا رہی ہے۔ اس وقت آدمی اچانک دیکھے گا کہ وہ بالکل بے سہارا ہو چکا ہے۔ وہ جن مسائل کو اہم سمجھ کر ان میں الجھا ہوا تھا اس دن وہ بالکل بے حقیقت نظر آئیں گے۔ وہ جن چیزوں پر بھروسہ کئے ہوئے تھا وہ سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں گے۔ وہ جن امیدوں پہ جی رہا تھا وہ سب جھوٹی خوش خیالیاں ثابت ہوں گی۔

آخرت کا مسئلہ آج محض ایک نظریہ ہے، وہ بظاہر کوئی سنگین مسئلہ نہیں۔ اس لئے آدمی اس کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو پاتا۔ مگر موت کے بعد آنے والی زندگی میں جب آخرت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ پھٹ پڑے گی، اس وقت ہر آدمی اس بات کو ماننے پر مجبور ہوگا جس کو وہ اس سے پہلے ماننے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت آدمی جان لے گا کہ اس سے پہلے جو بات دلیل کی زبان میں کہی جا رہی تھی وہ عین حقیقت تھی مگر میں اس کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو سکا اس لئے میں اس کو سمجھ بھی نہ پایا۔

جب وہ تمام چیزیں آدمی کا ساتھ چھوڑ دیں گی جن کو وہ دنیا میں اپنا سہارا بنائے ہوئے تھا تو وہ چاہے گا کہ دنیا میں اسے دوبارہ بھیج دیا جائے تاکہ وہ صحیح زندگی گزارے۔ مگر زندگی کا یہ موقع کسی کو دوبارہ ملنے والا نہیں۔

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ اڑھاتا ہے رات کو دن پر، دن اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا۔ اور اس نے پیدا کئے سورج اور چاند اور ستارے، سب تابعدار ہیں اس کے حکم کے۔ یاد رکھو، اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم کرنا۔ بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد۔ اور اسی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں سے قریب ہے ۵۴ ۔ ۵۶

زمین و آسمان اور اس کی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ اس پیدا کرنے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ وہ تمام چیزوں کو بنا کر ان کو انتشار کی حالت میں چھوڑ دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے تمام چیزوں کو ایک حد درجہ کامل اور حکیمانہ نظام کے تحت جوڑا اور ان کو اس طرح چلایا کہ ہر چیز ٹھیک اسی طرح کام کرتی ہے جیسا کہ مجموعی مصلحت کے اعتبار سے اس کو کرنا چاہئے۔

انسان بھی اسی دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ پھر ایسی اصلاح یافتہ دنیا میں اس کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ اس کا رویہ وہی ہونا چاہئے جو بقیہ تمام چیزوں کا ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو اسی خالق کے منصوبے میں دے دے جس کے منصوبہ میں بقیہ کائنات پوری تابعداری کے ساتھ اپنے آپ کو دئے ہوئے ہے۔

کائنات کی تمام چیزیں احسان (حسن کارکردگی) کی حد تک اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے انسان کو بھی احسان کی حد تک اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا چاہئے۔ یہاں کوئی چیز کبھی اعتداء (اپنی مقررہ حد سے تجاوز) نہیں کرتی۔ اس لئے انسان کے واسطے بھی لازم ہے کہ وہ عدل اور حق کی خدائی حدوں سے تجاوز نہ کرے۔ مزید یہ کہ انسان نطق اور شعور کی اضافی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس لئے نطق اور شعور کی سطح پر بھی اس کی حوالگی رب کا اظہار ہونا ضروری ہے۔ انسان کے اندر خدا کی معرفت اتنی گہرائی تک اتر جانا چاہئے کہ اس کی زبان سے بار بار اس کا اظہار ہونے لگے۔ وہ خدا کو اس طرح پکارے جس طرح بندہ اپنے خالق و مالک کو پکارتا ہے۔ اس کو خدا کی خدائی کا اتنا ادراک ہونا چاہئے کہ خدا کے سوا اس کی امیدوں اور اس کے اندیشوں کا کوئی مرجع باقی نہ رہے۔ وہ خدا ہی سے ڈرے اور اسی سے اپنی تمام تمنائیں وابستہ کرے۔ خدا کے ساتھ خوف اور طمع کو وابستہ کرنا خدا کی تابعداری کی آخری اور انتہائی صورت ہے۔

بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کو خدا کی رحمت حاصل ہو، مگر یہ رحمت صرف ان اشخاص کا حصہ ہے جو اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا زیادہ متعلق کر لیں کہ ان کے تمام جذبات کا رخ اللہ کی طرف ہو جائے۔ وہ اسی کو پکاریں اور اسی کے ساتھ عاجزی کریں۔ ان کو پانے کی امید اسی سے ہو اور چھننے کا ڈر بھی اسی سے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی قربت چاہی اس لئے خدا نے بھی ان کو اپنے قریب جگہ دے دی۔

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر جب وہ بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کے ذریعہ پانی اتارتے ہیں۔ پھر ہم اس کے ذریعہ سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم غور کرو۔ اور جو زمین اچھی ہے اس کی پیداوار نکلتی ہے اس کے رب کے حکم سے اور جو زمین خراب ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان کے لئے جو شکر کرنے والے ہیں ۵۸ - ۵۷

دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ اس کے مادی واقعات اس کے روحانی پہلوؤں کی تمثیل بن گئے ہیں۔

جب کہیں بارش ہوتی ہے تو اس مقام کے ہر حصہ تک اس کا پانی یکساں طور پر پہنچتا ہے۔ مگر فیض اٹھانے کے اعتبار سے مختلف زمینوں کا حال مختلف ہوتا ہے۔ کوئی حصہ وہ ہے کہ پانی اس کو ملا تو اس کے اندر سے ایک لہلہاتا ہوا چمنستان نکل آیا۔ دوسری طرف کسی حصہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بارش پاکر بھی بے فیض پڑا رہتا ہے۔ وہاں جھاڑ جھنکاڑ کے سوا کچھ نہیں اگتا۔

یہی حال اس روحانی بارش کا ہے جو خدا کی طرف سے ہدایت کی صورت میں اترتی ہے۔ اس ہدایت کا پیغام ہر آدمی کے کانوں تک پہنچتا ہے۔ مگر فائدہ ہر ایک کو اپنی اپنی استعداد کے بقدر ملتا ہے۔ جس کے اندر قبول حق کی صلاحیت زندہ ہے وہ اس سے بھرپور فیض حاصل کرتا ہے۔ اس سے اس کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ اس کی فطرت اچانک جاگ اٹھتی ہے۔ اس کا ربط اپنے مالک اعلیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی خشک نفسیات میں ربانی کیفیات کا باغ کھل اٹھتا ہے۔

اس کے برعکس حال اس شخص کا ہوتا ہے جس نے اپنی فطری اسلامتی کو کھو دیا ہو۔ ہدایت کی بارش اپنے تمام بہترین امکانات کے باوجود اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ اس کے بعد بھی وہ ویسا ہی خشک پڑا رہتا ہے جیسا کہ وہ اس سے پہلے تھا۔ اور اگر اس کے اندر کوئی فصل نکلتی ہے تو وہ بھی جھاڑ جھنکاڑ کی فصل ہوتی ہے۔ ہدایت کی بارش پاکر اس کے اندر سے حسد، کبر، حجت بازی، حق کی مخالفت جیسی چیزیں جاگ اٹھتی ہیں نہ کہ حق کا اعتراف کرنے اور اس کا ساتھ دینے کی۔

بارش کے پانی کو قبول کرنے کے لئے زمین کا خشک ہونا ضروری ہے۔ جو زمین خشک نہ ہو، پانی اس کے اوپر سے گزر جائے گا، وہ اس کے اندر داخل نہیں ہوگا۔ اسی طرح خدا کی ہدایت صرف اس آدمی کے اندر جڑ پکڑتی ہے جو اس کا طالب ہو، جس نے اپنی روح کو غیر خدائی باتوں سے خالی کر رکھا ہو۔ اس کے برعکس جو شخص خدا کی ہدایت سے بے پروا ہو، جس کا دل دوسری دلچسپیوں یا دوسری عظمتوں میں اٹکا ہوا ہو، اس کے پاس خدا کی ہدایت آئے گی مگر وہ اس کے اندرون میں داخل نہیں ہوگی، وہ اس کی روح کی غذا نہیں بنے گی، وہ اس کی فطرت کی زمین کو سیراب کرکے اس کے اندر خدا کا باغ نہیں اگائے گی۔

جدید علم کلام

جدید علم کلام کا مطلب ہے جدید ذہن کی رعایت سے دین کی باتوں کو مدلل کرنا، جدید طرز استدلال میں اسلامی تعلیمات کو بیان کرنا۔ اب دیکھئے کہ جدید ذہن کیا ہے۔ جدید ذہن دراصل سائنسی ذہن کا دوسرا نام ہے۔ سائنسی ذہن کا مطلب حقائق کو اہمیت دینے والا ذہن ہے۔ سائنس کے انقلاب نے موجودہ زمانہ میں انسانی فکر میں جو تبدیلی کی ہے وہ یہ ہے کہ جو بات کہی جائے تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر کہی جائے نہ کہ مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر۔ موجودہ زمانہ میں جو انقلاب آیا ہے وہ حقائق فطرت کے مطالعہ سے آیا ہے۔ بائیسکل سے لے کر ہوائی جہاز تک اور بجلی کے لیمپ سے لے کر بڑے بڑے صنعتی کارخانوں تک ہر چیز فطری حقائق کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ یہی انقلاب موجودہ زمانہ کا غالب انقلاب ہے۔ اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر ڈالا ہے۔ اسی نے موجودہ زمانہ میں اسلوب کلام کو بھی بدل دیا ہے۔ انسان ہزاروں سال سے پراسرار عملیات کی بنیاد پر لوہے کو سونا بنانے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اب حقائق فطرت کو دریافت کر کے وہ لوہے کو مشینوں میں تبدیل کر رہا ہے جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ ایسی حالت میں بالکل قدرتی بات ہے کہ آج کا انسان حقائق فطرت کی بنیاد پر ثابت ہونے والی بات کو سب سے زیادہ باوزن سمجھے۔ آج کے انسان نے جو ترقیاں کی ہیں وہ حقائق کی بنیاد پر کی ہیں اس لئے آج کا انسان انھیں باتوں کو اہمیت دیتا ہے جو حقائق کے زور پر ثابت ہوتا ہو۔

قدیم اور جدید ذہن کے فرق کو ایک سادہ مثال سے سمجھئے۔ پچاس سال پہلے اطبا کے یہاں اس قسم کے الفاظ بے حد پرکشش سمجھے جاتے تھے —— خاندانی نسخہ، پشتینی علاج، شاہی ترکیب سے بنی ہوئی دوا۔ کسی دوا یا منجن کے بارے میں یہ الفاظ بولنے کا مطلب یہ تھا کہ اس میں پراسرار خواص چھپے ہوئے ہیں۔ مگر آج ان الفاظ کے اندر کوئی قیمت نہیں۔ آج کا ڈاکٹر کسی دوا یا کسی ٹوتھ پیسٹ کی اہمیت کو بتانے کے لئے "قدیمی نسخہ" کی اصطلاح نہیں بولے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ سائنسی طریقوں سے بنایا گیا ہے۔ سائنسی طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی افادیت کو معلوم تجربات و مشاہدات کے ذریعہ جانا جا چکا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی چاہے تو ان تجربات کو دہرا کر دوبارہ ان کے نتائج کی صحت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ جب کہ خاندانی علاج کا مطلب یہ تھا کہ اس کے طبی خواص ہر ایک کے لئے قابل دریافت نہیں ہیں۔ دوا اور مرض کے درمیان تعلق کو متعین تجربات کے ذریعہ معلوم نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت بس یہ ہے کہ وہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ آج کا انسان اسی منجن کو استعمال کرنا پسند کرتا ہے جو سائنسی، بالفاظ دیگر، فطری حقیقتوں کی پیروی کرتے ہوئے بنا ہو۔ اسی طرح وہ صرف ان افکار کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے جن کا برحق ہونا فطری حقائق کے ذریعہ معلوم ہوا ہو۔

سائنسی انقلاب سے پہلے انسانی فکر کی بنیاد فلسفیانہ قیاسات پر قائم تھی، سائنسی انقلاب کے بعد انسانی فکر کی بنیاد معلوم حقائق و واقعات پر رکھی گئی ہے۔ اسی سے قدیم علم کلام اور جدید علم کلام کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ قدیم علم کلام کی بنیاد فلسفیانہ طرز استدلال پر تھی، جدید علم کلام کی بنیاد فطری طرز استدلال پر ہے۔ پہلے قیاسی منطق کے ذریعہ بات کو ثابت کیا جاتا تھا۔ انقلاب وہ زمانہ ہے کہ بات کو حقیقی شواہد کے ذریعہ ثابت کیا جائے۔

جدید ذہن کی اس مختصر وضاحت کے بعد اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جدید طرز استدلال دوسروں کے لئے خواہ جدید ہو مگر اسلام کے لئے وہ جدید نہیں۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ قرآن کا طرز استدلال عین وہی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں حقائق فطری سے استدلال کہا جاتا ہے تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جدید علم کلام دراصل قرآنی علم کلام ہے۔ جدید علم کلام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ قرآنی کلامیات کی طرف لوٹنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قدیم عراق کی مشرک قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو سورج، چاند اور ستاروں کے مشاہدات سے اپنی دعوت کے اوپر دلیل قائم کی۔ آنجناب کا یہ واقعہ سورہ انعام (رکوع ۹) میں بیان ہوا ہے۔ وہاں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وتلك حجتنا آتيناها ابراهيم على قومه (یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے اوپر عطا کی) یہاں حجتنا کا لفظ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو انداز کلام اختیار کیا وہ خدائی انداز کلام تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حجت خداوندی یا استدلال الٰہی کا طریقہ یہ ہے کہ کائنات جیسے معلوم و مشہود حقائق سے استدلال کیا جائے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خدا نے اپنی کتاب میں جو تعلیم قلمی طور پر دی ہے، ساری کائنات کو اس کے حق میں عملی دلیل بنا دیا ہے۔ پھر جو دلیل خود خدا نے مقرر کی ہو اس سے بڑھ کر دلیل اور کون سی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف قرآن میں کہا گیا ہے کہ هذا كتابنا ينطق عليكم بالحق (جاثیہ ۲۹) اور دوسری طرف کائنات کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ماخلقنا هما الا بالحق (دخان ۳۹) قرآن اور کائنات دونوں ایک ہی مشیت ربانی کا اظہار ہیں، ایک جگہ یہ اظہار لفظی صورت میں ہو رہا ہے اور دوسری جگہ عملی صورت میں۔

قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہی طریقہ خدا کے تمام پیغمبروں نے اختیار کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام انتہائی قدیم زمانہ کے پیغمبر ہیں۔ مگر آنجناب کا طرز استدلال بھی ٹھیک وہی تھا جس کو آج ہم فطری یا حقیقی شواہد پر مبنی استدلال کہتے ہیں۔ سورۂ نوح کو دیکھئے۔ حضرت نوح کی زبان سے ارشاد ہوا ہے: فقلت استغفروا ربكم انه كان غفارا۔ يرسل السماء عليكم مدرارا۔ ويمددكم باموال وبنين۔ ويجعل لكم جنات ويجعل لكم انهارا۔ ما لكم لا ترجون لله وقارا۔ وقد خلقكم اطوارا۔ الم تروا كيف خلق الله سبع سماوات طباقا۔ وجعل القمر فيهن نورا وجعل الشمس سراجا۔ والله انبتكم من الارض نباتا۔ ثم يعيدكم فيها

ويخرجكم اخراجا۔ واللہ جعل لکم الارض بساطاً لتسلکوا منہا سبلاً فجاجا (نوح) اس کے بعد آپ قرآن کے دعوتی اسلوب کو دیکھئے تو اس میں بھی آپ کو ہر جگہ یہی طریقہ ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا قرآن اسی اندازِ دعوت سے بھرا ہوا ہے جس کو ہم نے فطری انداز کہا ہے۔ مثلاً افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ و الی السماء کیف رفعت۔ والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت (غاشیہ)

یہی اصل اسلامی استدلال ہے۔ یہی خدا کے تمام پیغمبروں نے اختیار کیا اور اسی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ مگر دوسری صدی ہجری میں عباسی خلافت کے زمانہ میں جب علوم اسلامی کی تدوین ہوئی تو بعض اتفاقی اسباب کے نتیجہ میں اسلامی علم کلام کو قدیم منطق و فلسفہ کی بنیاد پر مرتب کر دیا گیا۔ امام غزالی کے زمانہ میں یہی علم کلام اسلامی مدارس کے نصاب میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد نسل در نسل یہ سلسلہ چلتا رہا حتی کہ علم کلام ایک منطقی علم کے ہم معنی قرار پا گیا۔ مگر یہ قرآن سے سراسر انحراف تھا۔ یہ علم کلام اسلامی استدلال کی بنیاد قیاسی منطق پر رکھ رہا تھا جب کہ قرآن نے اسلامی استدلال کی بنیاد فطرت کے شواہد پر رکھی تھی۔ منطقی کلامیات کا لوگوں کے اوپر اتنا غلبہ ہوا کہ ایک ہزار سال تک بھی وہ اس سے باہر نہ آسکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں خود خارجی حالات ہم کو مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اس کو چھوڑیں اور دوبارہ قرآن کے فطری اسلوب کی طرف واپس جائیں۔ سائنسی انقلاب سے پہلے یہ علم کلام کم از کم علمی حیثیت سے کچھ قدر و قیمت رکھتا تھا۔ مگر آج وہ علمی قدر و قیمت بھی کھو چکا ہے اور دعوتی افادیت جو پہلے بھی اس کے اندر موجود نہ تھی وہ اب اور زیادہ اس سے دور جا چکی ہے۔

جدید علم کلام، بالفاظ دیگر، قرآنی علم کلام کیا ہے۔ اس کو قرآنی آیات کے تتبع سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں مختصر طور پر قرآنی کلامیات کے چند پہلوؤں کو بیان کروں گا۔ یہ پہلو قرآنی علم کلام کو جاننے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ قرآنی کلامیات کے پہلے اصول کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے:

یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (اسراء ۸۵)

لوگ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح خدا کے حکم سے ہے۔ اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے

یہاں سوال کرنے والے نے ایک سوال کیا تھا اور وہ سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ مگر اس کو کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا حقیقی جواب آدمی کے حدود فہم سے باہر ہوتا ہے۔ وہ ایسے جوابات کو اسی طرح نہیں سمجھ سکتا جس طرح ماں کے پیٹ کے اندر کا بچہ باہر کی دنیا کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے جب کوئی شخص ایسے سوالات میں الجھے تو اس کی بہتری یہ ہے کہ اس کو ایسے سوالات میں الجھنے سے روکا جائے۔ اس کے برعکس اگر جواب دینے والا

اس کا جواب دینے بیٹھ جائے تو وہ خود بھی بے راہ ہو گا اور سائل کو بھی بے راہ کرے گا۔

میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سوال میں بہت عرصہ سے الجھا ہوا ہوں، آپ اس کو حل کیجئے۔ پھر انھوں نے کہا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی آدمی کے عمل کے مطابق اس کا عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ اب کوئی شخص ہے جو آج ساٹھ سال گذار کر مرجاتا ہے، کوئی شخص ہے جو دس ہزار سال پہلے اتنی ہی عمر گزار کر مر چکا ہے۔ یہ دونوں اگر جہنمی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکساں برے عمل پر ایک شخص نے دوسرے کے مقابلہ میں دس ہزار سال زیادہ سزا پائی اور دونوں اگر جنتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکساں اچھے عمل پر ایک شخص نے دوسرے کے مقابلہ میں دس ہزار سال زیادہ جنت کا لطف حاصل کیا۔ ایسی حالت میں تو خدا کو چاہئے تھا کہ وہ سب کو ایک وقت میں پیدا کرتا اور سب کو ایک وقت میں مارتا۔ تاکہ ہر ایک کو برابر جزا یا سزا ملے۔

اس قسم کے سوالات صرف ذہنی بے راہی کے سوالات ہیں۔ ہم ایک محدود دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمارا ذہن زمان و مکان کی حد بندیوں میں رہ کر سوچتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس دنیا کی حقیقتوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لا سکتے جو لا محدود ہے اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ ایسی دنیا کے بارے میں ہم صرف اجمالی علم حاصل کر سکتے ہیں اور اس معاملہ میں ہمیں صرف اجمالی علم پر قناعت کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ کی خواہش کرنا صرف اپنے کو بے راہی کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آیتیں اتاری ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک محکمات، دوسری متشابہات۔ محکم آیتیں وہ ہیں جو ہماری معلوم دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسے امور میں خدا نے براہ راست زبان میں اپنا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ ان احکام کو ہم لفظی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے یہ حکم کہ چور کا ہاتھ کاٹو (مائدہ ۳۸)۔ متشابہ آیتوں سے مراد متماثل آیتیں ہیں۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق غیب کی دنیا سے ہے۔ ایسی آیتوں میں اللہ نے بات کو تمثیلی زبان (Symbolic Language) میں بیان کیا ہے جیسے یہ کہ اللہ تخت پر متمکن ہوا (اعراف ۵۴) محکم آیتوں میں تفصیلات اور تعینات تک پہنچنے کی کوشش کرنا مفید ہے۔ لیکن اگر اسی طرح متشابہ آیتوں میں تفصیلات اور تعینات تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔

علم کی یہ تقسیم فطرت کے عین مطابق ہے۔ جدید سائنس نے عالم فطرت کی جو تحقیق کی ہے اس نے انسانی علم کی محدودیت کو آخری طور پر ثابت کر دیا ہے۔ جدید دنیا کا یہ مسلمہ ہے کہ انسان اپنی محدودیتوں کی وجہ سے اشیاء کا صرف جزئی علم حاصل کر سکتا ہے، وہ کلی علم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس اعتبار سے قرآنی کلامیات کا پہلا اصول عین علمی اصول ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس پر جدید ذہن خود اپنی تحقیق کے نتیجہ میں پہنچ چکا ہے۔

۲۔ قرآنی کلامیات کا دوسرا اصول حقائق فطرت سے استدلال ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم

ان کو آفاق کی اور انفس کی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ قرآن کی دعوت سراسر حق ہے۔ (حم سجدہ ۵۳) اس سلسلے میں یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

الف۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، اس کو مانو۔ اس دعوت کے حق میں دلیل کیا ہے۔ قدیم متکلمین نے اپنے فلسفیانہ ذوق کے تحت اس پر قیاسی دلیلیں قائم کیں۔ مگر قرآن اس کے حق میں مشاہداتی دلیل دیتا ہے۔ قرآن کا کہنا ہے کہ جو کائنات تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے اور جس کا تم انکار نہیں کر سکتے، وہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (انبیاء ۳۰)

کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار کو بنایا، پھر کیا وہ ایمان نہیں لاتے

ان آیات میں واضح طور پر اس کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں بگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے۔ خدا کی نگاہ میں اول سے آخر تک تمام انسان ہیں۔ وہ غیر زمانی انداز میں خطاب کرتے ہوئے تمام منکروں سے کہہ رہا ہے کہ ایک خدا کی دلیل خود اس کائنات میں موجود ہے جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ پھر تم اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہو۔

۱۹۱۲ میں امریکی عالم فلکیات وسٹو ملوین سلیفر (Vesto Melvin Slipher) نے لوول آبزرویٹری میں تحقیق کرتے ہوئے پایا کہ کچھ کہکشائیں تیزی سے بیرونی سمت میں بھاگ رہی ہیں۔ اس کے بعد ایڈوین ہبل (Edwin Hubble) اور ملٹن ہیومیسن (Milton Humason) نے ماؤنٹ ولسن کی سوانح کی دوربین پر مشاہدہ کر کے بتایا کہ تمام کی تمام کہکشائیں اپنے بیرونی سمت میں تیزی سے چلی جا رہی ہیں۔ پھر ڈچ عالم فلکیات ویلم ڈی سٹر (Willem de Sitter) نے اس نظریہ کے حق میں مزید تائیدی شواہد جمع کئے۔ ۱۹۶۵ میں نیوجرسی کے آرنو پنزیاز (Arno Penzias) اور ولسن (Robert Wilson) نے ابتدائی کائناتی دھماکہ کے دوران نکلی ہوئی بعض شعاعیں (Radiation) دریافت کیں۔ اس قسم کی مختلف دریافتوں کے بعد اب یہ نظریہ ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھا جانے لگا ہے۔

اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ کائنات ہمیشہ سے نہیں ہے بلکہ وہ واضح طور پر اپنا ایک متعین آغاز رکھتی ہے۔ وہ ایک وقت خاص میں شروع ہوئی۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ ہم ایک پھیلتی ہوئی کائنات میں ہیں۔ ہمارے چاروں طرف کہکشائیں بے حد تیزی سے بیرونی سمت میں بھاگ رہی ہیں۔ حساب سے معلوم ہوا ہے کہ اس بیرونی رفتار کو اگر اندر کی طرف لوٹایا جائے تو تقریباً ۲۰ ہزار ملین سال میں تمام پھیلی ہوئی کائنات سمٹ کر ایک گولا بن جائے گی۔ اس نظریہ نے

خدا کے وجود کو فطرت کے قانون کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے کیونکہ ایک جمے ہوئے مادی گولے کے اندر ایک وقت خاص میں بیرونی سمت کی طرف مسلسل حرکت کسی خارجی محرک کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس نظریہ پر ایک امریکی سائنس داں رابرٹ جیسٹرو (Robert Jastrow) کا مضمون شائع کرتے ہوئے ریڈرز ڈائجسٹ (اکتوبر ۱۹۸۰) نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا ہے: کیا فلکیاتی علما رخدا کو پا گئے ہیں:

Have Astronomers Found God

وہ سائنس داں جنھوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ کائنات کے ہر واقعہ کی اس طرح عقلی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کے کسی طبیعی واقعہ کا نتیجہ نظر آئے۔ ایسے لوگ اس دریافت سے بے حد گھبرا اٹھے کیونکہ اس سے کائنات میں طبیعی عمل اور ردعمل کے بجائے ایک زندہ خدا کی ارادی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ حقائق کا انکار ان کے لئے ممکن نہ تھا، انھوں نے اس واقعہ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے اس کا نام بگ بینگ (بڑا دھماکہ) رکھ دیا۔ گویا کہ کائنات کا آغاز بس ایک بڑا پٹاخہ چھوٹنے کا معاملہ تھا اور بس۔ اسی قسم کے ایک امریکی عالم نے ایک مذہبی شخص سے مذاق کے انداز میں پوچھا کہ خدا نے جب زمین و آسمان نہیں بنائے تھے اس وقت وہ کیا کر رہا تھا۔ مذہبی شخص نے بگڑ کر جواب دیا کہ وہ ان لوگوں کے لئے جہنم تیار کرنے میں مشغول تھا جو اس قسم کے سوالات کرتے ہیں:

He was creating hell for people who asked questions like that

ب۔ قرآن کہتا ہے کہ موجودہ دنیا آخری دنیا نہیں، اس کے بعد ایک اور دنیا ہے۔ یہ دنیا اگرچہ آج ہم کو اپنی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتی مگر وہ ایک مکمل حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ قرآن کے اس دعوے کے حق میں بھی قدیم متکلمین نے فلسفیانہ قیاسات کے ذریعہ دلائل قائم کر لئے تھے۔ مگر قرآن نے اس کے حق میں ایسی دلیل پیش کی جس کو انسان اپنے تجرباتی علم کے ذریعہ جان سکتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ومن کل شیئٍ خلقنا زوجینِ لعلکم تذکرون (ذاریات ۴۹) اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا بنایا تاکہ تم دھیان کرو

یعنی جب ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنی تکمیل کرتی ہے تو اس کائناتی قانون کے مطابق موجودہ دنیا کا بھی ایک جوڑا ہونا چاہئے جو اس کی تکمیل کرے۔ دنیا کے اسی جوڑے کا نام آخرت ہے۔

آدمی میں اور جانوروں میں جوڑے کا ہونا انسان کو قدیم ترین زمانہ سے معلوم تھا۔ پھر درختوں کے اندر جوڑے ہونے کا علم ہوا۔ تاہم ۱۹۲۸ تک یہ معلوم نہ تھا کہ جامد مادہ کا بھی جوڑا ہوتا ہے۔ اسی سال ریاضیاتی طبیعیات کے ایک عالم پال ڈیراک (Paul A.M. Dirac) نے مادی ذرہ کے ساتھ ایک نئے قسم کے غیر مرئی ذرہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا۔ ۱۹۳۲ میں اینڈرسن (K. Anderson) نے کاسمک شعاعوں کے مطالعہ کے دوران معلوم کیا کہ الیکٹران کے ساتھ ایک اور ذرہ ہے جو اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ اس نئے ذرہ کا نام اینٹی

الکٹران رکھا گیا۔ یہ تحقیق آگے بڑھتی رہی۔ بالآخر معلوم ہوا کہ کائنات کے تمام ذرات جوڑوں (Pair Particles) کی شکل میں ہیں۔ پارٹکل کا اینٹی پارٹیکل، ایٹم کا اینٹی ایٹم، میٹر کا اینٹی میٹر، حتی کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ جیسا کہ ڈیراک نے ۱۹۳۲ میں بتایا۔

موجودہ زمانہ میں بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ موجودہ دنیا میٹر کی ترکیب سے بنی ہے، اب کائناتی قانون کے مطابق ایک اور دنیا اینٹی میٹر سے ترکیب یافتہ موجود ہونا چاہئے۔ قیاس ہے کہ ۲۰ ہزار ملین سال پہلے جب بگ بینگ کا واقعہ ہوا تو اسی وقت فوٹان میٹر اور اینٹی میٹر کی دو مختلف صورتوں میں مجتمع ہو گئے اور ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کو بنانے میں لگ گئے

اس نظریہ پر پہلے سویڈش طبیعیات داں اوسکر کلین (Osker Klein) اور طبیعی فلکیات داں ہینز الفوین (Hannes Alfven) نے کام کیا تھا۔ اور ۱۹۶۲ میں اپنے نتائج تحقیق پیش کئے۔ اس کے بعد سوویت ریاضی داں ڈاکٹر گستاف نان (Gustav Naan) نے اس کو مزید مستحکم کیا۔ ڈاکٹر گستاف نان کا کہنا ہے کہ اینٹی ورلڈ کو طبیعیات کے معلوم نظریات و قوانین کے ذریعہ پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا یقین ہے کہ اینٹی ورلڈ آج بھی موجود ہے مگر وہ ہم سے آزاد اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ ہماری موجودہ دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (Unstable) حالت میں ہیں۔ مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (Stable) حالت میں ہوں گے۔ کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔

ج۔ اس سلسلہ میں ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن میں فرعون کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک آیۃ و ان کثیرا من الناس عن آیاتنا لغافلون	پس آج ہم تیرے جسم کو بچالیں گے تاکہ تو پیچھے آنے والوں کے لئے ایک نشان رہے۔ اور بہت سے لوگ ہیں جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔
یونس ۹۲	

اس آیت کے مطابق خدا نے فرعون کی لاش کو بعد کی نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ ۱۸۹۸ کی بات ہے کہ مغرب کے ماہرین اثریات نے فرعون کی لاش کو قدیم مصری شہر تھیبس (Thebes) سے کھدائی کر کے نکالا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کا سابقہ مصر کے دو فرعونوں سے ہوا تھا۔ آپ ریمسس دوم کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ مگر غرقابی کا واقعہ اس کے بعد اس کے بیٹے مرنفتاح (Merneptah) کے ساتھ پیش آیا۔ جس کا زمانہ تیرھویں صدی قبل مسیح ہے۔ دونوں فرعونوں کی ممی کی ہوئی لاش اب قاہرہ کے عجائب خانہ میں عام زیارت کے لئے موجود ہے۔ سائنسی جانچ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مرنفتاح وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پانی میں غرق ہو کر مرا تھا۔

بائبل کا بیان ہے کہ فرعون ڈوب کر ختم ہوگیا۔ وہ اس کی لاش کی موجودگی کا کوئی اشارہ نہیں کرتی۔ تاریخ اس بارے میں مکمل طور پر خاموش ہے۔ قرآن کے نزول کے وقت اور اس کے بعد ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انسان کو فرعون کی لاش کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ کیسی عجیب شہادت ہے کہ موجودہ زمانہ میں حیرت انگیز طور پر اس کی لاش محفوظ حالت میں دریافت ہوگئی۔ ڈاکٹر موریس نے دس صفحات میں اس کی تفصیل دیتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

> Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Quran dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo
>
> The Bible, The Quran and Science, 1976, P. 241

یعنی جو لوگ مقدس کتابوں کی سچائی کے لئے جدید ثبوت مانگتے ہیں وہ قرآن کی ان آیات کو پڑھیں اور اس کے بعد قاہرہ کے میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں تو وہ اس کی نہایت شاندار تصدیق پالیں گے۔

اس موضوع پر جو لوگ زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ ڈاکٹر موریس (Dr. Maurice Bucaille) کی کتاب دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس کا مطالعہ کریں۔ یہ اس موضوع پر ایک قابل قدر کتاب ہے۔ مصنف کو شوق تھا کہ وہ قرآن کے سائنسی بیانات کا جدید تحقیقات سے مقابلہ کریں۔ اس کے لئے انھوں نے برسوں تحقیق کی۔ صرف اسی مقصد سے عربی زبان سیکھی تاکہ قرآن کو براہ راست اس کی زبان میں سمجھ سکیں۔ اس کے بعد انھوں نے ڈھائی سو صفحات پر مشتمل مذکورہ کتاب شائع کی۔

ڈاکٹر موریس نے اپنی اس کتاب میں بہت سے سائنسی حقائق کا مقابلہ قرآن کے بیانات سے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک قدیم کتاب کی جدید تحقیقات سے اس درجہ مطابقت اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ وہ بشری ذہن سے ماورا کسی ذہن سے نکلی ہو۔ وہ اپنی کتاب کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> In view of the level of knowledge in Mohammad's day, it is inconceivable that many of the statesments in the Quran which are connected with science could have been the work of a man. It is, moreover, perfectly legitimate, not only to regard the Quran as the expression of a Revelation, but also to award it a very special place, on account of the guarantee of authenticity it provides and the presence in it of scientific statements which, when studied today, appear as a challenge to explanation in human terms.
> (P. 252)

محمدؐ کے زمانہ میں علم کی جو سطح تھی اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بالکل ناقابل قیاس ہے کہ قرآن کے بہت سے بیانات جو سائنس سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی آدمی کے لکھے ہوئے ہوں۔ یہ بات پوری طرح معقول ہے کہ قرآن کو نہ صرف خدائی الہام کا ظہور سمجھا جائے بلکہ مزید اس کو ایک بہت امتیازی درجہ دیا جائے۔ قرآن اپنے مستند ہونے کی جو ضمانت

دیتا ہے اور اس کے اندر جو سائنسی بیانات ہیں، جب ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو وہ قرآن کو انسانی کتاب قرار دینے کے خلاف ایک چیلنج معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ قرآنی کلامیات کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کائنات کے اس پہلو کو نمایاں کیا جائے کہ خدا نے اس کو ہمارے لئے بطور میزان مقرر کیا ہے۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ انسان خدا کی اطاعت کرے، وہ اپنے عجز کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے ڈال دے۔ اس مطالبہ کے حق میں قرآن نے فلسفیانہ قسم کے دلائل نہیں قائم کئے بلکہ فطری انداز کے دلائل قائم کئے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک آیت کا مطالعہ کیجئے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم النّاس بالقسط و انزلنا الحدید فیہ بأس شدید و منافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ و رسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (حدید ۲۵)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ قائم رہیں انصاف پر۔ اور ہم نے لوہا اتارا اس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ ہے۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون بے دیکھے اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ اللہ قوی اور زبردست ہے۔

میزان عربی زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ آلہ جس سے تول کر کسی چیز کی برابری کسی دوسری چیز سے معلوم کی جائے۔ پوری کائنات اس معنی میں خدا کی میزان ہے۔ کائنات کی ہر چیز کو خدا نے اسی حق و عدل کی بنیاد پر قائم کر رکھا ہے جس کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں جس عدل پر بجبر قائم ہیں اسی عدل پر انسان کو اپنے آزاد ارادہ سے قائم ہونا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کتاب میں اپنی پسند کے تمام عادلانہ طریقے بتا دئے ہیں۔ دوسری طرف کائنات کو عملاً انھیں عادلانہ طریقوں پر قائم کر دیا ہے۔ اب انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ قرآن میں اصول عدل کو پڑھ کر اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ اور اسی کے ساتھ کائنات کے ربانی پیمانہ سے ناپ کر دیکھتا رہے کہ اس کا طریقہ خدا کے پسندیدہ معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں یہاں میزان کے طور پر لوہے کا ذکر کیا گیا ہے۔ لوہے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مومن کے بے خطا کردار کو ممثل کیا ہے۔ موجودہ زندگی میں ہر قسم کا نفع قابل اعتماد کردار سے وابستہ ہے۔ مادہ کی دنیا میں یہی طاقت ور کردار لوہے کا ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں یہی طاقت ور کردار خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال شہد کی مکھی کی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے گھر بنا۔ پھر ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس۔ اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں میں چل۔ اس مکھی کے اندر سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہیں۔

اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ اس واقعہ میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو دھیان دیتے ہیں (نحل)

شہد کی مکھی کا نظام ایک انتہائی جامع اور کامل قسم کا سماجی نظام ہے۔ اس میں وہ تمام اجزاء پائے جاتے ہیں جو انسان کے بنائے ہوئے سماجی اور تمدنی نظام میں ہوتے ہیں۔ مگر شہد کی مکھیوں کا نظام ان تمام خرابیوں سے یکسر خالی ہوتا ہے جس کا شکار انسان کے سماجی اور تمدنی نظام ہمیشہ ہوا کرتے ہیں۔ شہد کی مکھی اپنی بستی بسانے کے لئے ایک جگہ کا انتخاب کرتی ہے۔ وہاں وہ ایک مکمل شہر بساتی ہے۔ وہ ایک انتہائی پیچیدہ قسم کا کارخانہ قائم کرتی ہے۔ وہ اپنے کارخانہ میں سیکڑوں میل سے ضروری سامان حاصل کرکے لاتی ہے۔ ہزاروں مکھیاں بیک وقت اپنے اپنے مقررہ کام میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کی اس تنظیم اور اس جدوجہد کا آخری نتیجہ ایک قیمتی پیداوار (شہد) کی صورت میں برآمد ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کی تیار غذا ہے اور اسی کے ساتھ انسانی امراض میں بہترین علاج بھی۔

شہد کی مکھیاں اتنا بڑا نظام چلاتی ہیں مگر وہ اپنی آبادکاری کے لئے کسی دوسرے کا گھر نہیں اجاڑتیں۔ وہ پھولوں کا رس لینے کے لئے پھولوں کو نہیں مسلتیں۔ ان کی اجتماعی جدوجہد میں کبھی باہمی ٹکراؤ کا واقعہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی پیداوار کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں کرتیں اور نہ اس کو اپنی چیز سمجھ کر سب کا سب اپنے اوپر خرچ کر ڈالتی ہیں۔ وہ اس کا بڑا حصہ دوسروں کی ضرورت کے لئے وقف کر دیتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی دنیا میں ہر کام ٹھیک اسی طرح انجام دیا جاتا ہے جس طرح اسے انجام دیا جانا چاہئے۔ شہد کی مکھی خدا کے حکم سے اس بات کا عملی مظاہرہ کر رہی ہے کہ انسان کو اپنی سماجی زندگی کا نظام کس طرح بنانا چاہئے۔

اسی طرح تمام خدائی احکام کی تمثیل کائنات میں قائم کر دی گئی ہے (سجدہ کی تمثیل درخت کے سایہ کی صورت میں، قابل اعتماد کردار کی تمثیل لوہے کی صورت میں، تصادم کے بغیر سفر حیات کی تمثیل ستاروں کی اپنے اپنے مدار پر گردش کرنے کی صورت میں، اتحاد کار کی تمثیل شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی صورت میں، اپنے اور غیر کو یکساں فیض پہنچانے کی تمثیل سورج کی روشنی کی صورت میں، وغیرہ) توحید اور اطاعت الٰہی کی طرف بلانے کے لئے قرآن کا یہ انداز عین فطری ہے۔ وہ ٹھیک اسی کائناتی استدلال پر قائم ہے جس پر جدید انسان نے اپنے علم وعمل کی پوری بنیاد کھڑی کی ہے۔ اگر ہم اس کو مؤثر طور پر آج کے انسان کے سامنے رکھ سکیں تو یقیناً ان میں سے بہت سے لوگ اسلام کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔ انسان چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے اپنا مہینہ اور سال شمار کرتا ہے۔ وہ زمین اور سورج کی حرکت سے اپنی گھڑیوں کا وقت مقرر کرتا ہے۔ وہ اپنی مشینوں کو قدرت کے نمونوں پر بناتا ہے (کشتی کو مچھلی کے نمونہ پر، ہوائی جہاز کو چڑیا کے نمونہ پر، کیمرہ کو آنکھ کے نمونہ پر، وغیرہ) اسی طرح وہ کائناتی اخلاقیات کو بھی اپنے اخلاق کے لئے معیار قرار دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو صحیح طور پر اس کے سامنے پیش کر دیں۔ اگر وہ کائنات سے اپنا مادی معیار لے رہا ہے تو اسی کائنات سے وہ اپنا اخلاقی معیار کیوں نہیں لے سکتا۔

۴۔ جدید علم کلام کا چوتھا اصول بات کو سادہ انداز میں کہنا ہے۔ سادہ انداز سے مراد حقیقت پسندی کا انداز ہے جس میں بات کو اس کے فطری ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہو نہ کہ ادب کے تقاضوں کی بنا پر کسی قسم کے مصنوعی انداز میں۔

انسان کو خدا نے سادہ فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس لئے جب بات کو سادہ انداز میں کہا جائے تو گویا گول خانہ میں گول چیز رکھی گئی۔ اس کے برعکس جب بات کو کسی قسم کے بناوٹی انداز میں کہا جائے تو یہ گول خانہ میں چوکھنٹی چیز رکھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سادہ انداز میں کہی ہوئی بات انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ وہ اس کے اندر داخل ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ اس کی پوری ہستی میں سما جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب بات کو مصنوعی اور پیچدار انداز میں بیان کیا جاتا ہے تو وہ انسان کی ہستی میں نہیں سماتی، وہ اس کے اندرون کا جزء نہیں بنتی۔ وہ ادھر اُدھر اٹک کر رہ جاتی ہے۔

قدیم زمانہ میں ادبی اسلوب ساری دنیا میں رائج تھا۔ کوئی اپنی بات کو شاعری کے اسلوب میں بیان کرتا تھا اور کوئی سجع کے اسلوب میں۔ کوئی تمثیل کے اسلوب میں اپنی بات پیش کرتا تھا اور کوئی کہانی کے اسلوب میں۔ موجودہ زمانہ میں ان اسالیب کی اہمیت بہت گھٹ گئی ہے۔ اب برتر اسلوب وہ سمجھا جاتا ہے جس میں بات کو واقعہ نگاری اور حقیقت بیانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسلوب جدید سائنسی انقلاب کی دین ہے۔ اسی لئے اس کو سائنسی اسلوب کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اسلوب کا آغاز انسانی تاریخ میں پہلی بار قرآن نے کیا تھا۔

قرآن تاریخ کی پہلی معلوم کتاب ہے جس نے مصنوعی اسلوب کو چھوڑ کر فطری اسلوب میں بات کہنے کی بنیاد ڈالی۔ سائنسی اسلوب دراصل قرآنی اسلوب ہی کی ایک جدید شکل ہے۔ تاہم قرآن کے نزول کے سو برس بعد مسلمانوں کے درمیان قدیم منطق و فلسفہ کا رواج شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ تقریباً تمام اسلامی علوم میں دوبارہ وہی مصنوعی انداز غالب آگیا جس کو قرآن نے ختم کیا تھا۔ لوگ اس کو کمال سمجھنے لگے کہ دین کی سادہ تعلیمات کو فنی موشگافیوں اور منطقی اصطلاحوں میں ڈھالیں اور اس کو منثور نظم یا منظوم نثر میں سجا کر پیش کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دوبارہ قرآنی اسلوب کی طرف لوٹیں۔ آج کے انسان کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرنے کے لئے سائنسی اسلوب لازمی طور پر ضروری ہے۔ تاہم یہ سائنسی اسلوب خود قرآنی اسلوب ہی کا دوسرا نام ہے۔ سائنسی اسلوب کو اختیار کرکے ہم سادہ طور پر صرف قرآنی اسلوب کی طرف لوٹیں گے نہ کہ کوئی نئی چیز اختیار کریں گے۔

دارالعلوم حیدرآباد کے سیمینار بعنوان "دینی تعلیم اور عصر حاضر کے تقاضے" کے موقع پر ۲۴ فروری ۱۹۸۱ کو پڑھا گیا۔

خدا کا انعام

آدمی کو چاہئے کہ خدا سے اتنا قریب ہوجائے کہ ہر وقت اس کو خدا کی یاد آتی رہے ۔ اللہ کی بڑائی کا احساس اس کے اوپر اتنا چھا جائے کہ اپنا وجود اس کو بے حقیقت نظر آنے لگے ۔ جنت اور جہنم کا اس کو اتنا یقین ہوجائے کہ دنیا کے آرام و تکلیف سے زیادہ اس کو آخرت کے آرام و تکلیف کی فکر رہنے لگے ۔ وہ اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھائے کہ اپنی غلطیاں اس کو اس طرح دکھائی دینے لگیں جس طرح کسی کو اپنے دشمن کی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو نفسیاتی گرہوں سے اتنا آزاد کرلے کہ اختلاف اور شکایت کے باوجود دوسرے کے لئے اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں ۔ حق کا اعتراف نہ کرنا اس کو ایسا معلوم ہو گویا وہ اپنے آپ کو قتل کر رہا ہے ۔ دوسرے کا آشیانہ اجاڑنا اس کو ایسا لگے جیسے وہ خود اپنے آشیانہ میں آگ لگا رہا ہے ۔ یہی خدا پرستی کی زندگی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا اپنی جنت میں جگہ دے گا ۔

جو لوگ اللہ کے سچے بندے بن جائیں، ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں انھیں غالب کرے گا ۔ یہ غلبہ ان کی خدا پرستی کا اصل انعام نہیں بلکہ اصل انعام کی ابتدائی علامت ہے ۔ خدا پرستوں کے لئے اللہ نے جو انعام مقدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ ان کو غلبہ و سربلندی عطا کرے ۔ ان کو ہر قسم کے خوف اور حزن سے پاک کرکے اپنی رحمتیں اور نعمتیں دائمی طور پر ان کی وراثت میں دے دے ۔ اسی کا نام جنت والی زندگی ہے جو آخرت میں مومنین صالحین کو حاصل ہوگی ۔ مگر جب اہل ایمان کا کوئی قابل لحاظ گروہ بن جاتا ہے تو اللہ اس دنیا میں بھی اس کو علامتی طور پر غالب کر دیتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں سرکش اور غافل انسانوں کو مغلوب کرکے دکھایا جاتا ہے کہ آخرت کی ابدی دنیا میں کون عزت اور برتری کے مقام پر ہوگا اور کون ذلت اور پستی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا ۔

۱۵۰

حقیقت کے مطابق

اسلام کیا ہے ، فطرت کے مطابق زندگی گزارنا۔ دنیا میں اس طرح رہنا جیسا کہ حقیقت کے اعتبار سے آدمی کو رہنا چاہئے۔ آدمی خود سے نہیں بن گیا۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی خدا کی بڑائی کو مانے اور اس کا احسان مند ہو۔ آدمی کے اندر ڈر اور محبت کے جذبات ہیں۔ وہ کسی چیز پر اعتماد کرنا چاہتا ہے اور کسی چیز کو اپنی دوڑ دھوپ کا مرکز بناتا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی ان حیثیتوں سے خدا کو اپنا مرکز بنائے۔ کیوں کہ دوسری تمام چیزیں مخلوق ہیں، خدا کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔

دنیا میں جتنے آدمی پیدا ہوئے یا پیدا ہوں گے سب کے باپ آدم ہیں، سب بالآخر ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اس لئے حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے کا خیر خواہ ہو، ہر ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کرے۔ ہر آدمی کے اندر ضمیر ہے۔ یہ ضمیر انصاف کو پسند کرتا ہے اور ظلم اور بے انصافی کو ناپسند کرتا ہے۔ اب حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے درمیان اس طرح رہے کہ ہر آدمی دوسرے کا خیر خواہ ہو، ہر ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے۔ آدمی پر ایک روز موت آنی ہے۔ موت ہر آدمی سے وہ چیز چھین لیتی ہے جو دنیا میں اس کو حاصل تھی۔ اس لئے حقیقت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ دنیا کی اونچ نیچ کو وقتی اور مصنوعی خیال کیا جائے۔ ہر آدمی کو یکساں طور پر خدا کا بندہ سمجھا جائے خواہ بظاہر وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اسی طرح آدمی کے سامنے ایک حق آتا ہے وہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ اس کا انکار کر دے۔ مگر وہ سوچتا ہے کہ ایک دن بالآخر ایسا آنے والا ہے جب کہ میں حق کو حق اور باطل کو باطل ماننے پر مجبور ہوں گا۔ یہ سوچ کر وہ اس حق کو آج ہی مان لیتا ہے جس کو وہ کل ماننے پر مجبور ہوگا۔

تین سو کی تعداد فیصلہ کن ہے

قریش میں ایک شخص جمیل بن معمر جمی تھا۔ اس کو باتیں پھیلانے سے بہت دل چسپی تھی، اس کو معلوم ہوا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا ہے تو اس نے بیت اللہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا: الا ان ابن الخطاب قد صبأ (سنو خطاب کا لڑکا بے دین ہو گیا) قریش اس وقت کعبہ کے گرد اپنی مجلسوں میں تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب دیا: کذب ولکنی قد اسلمت وشھدت ان لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ (اس نے جھوٹ کہا۔ بلکہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) اس کے بعد لوگ ان کے اوپر جھپٹ پڑے۔ وہ ان سے لڑتے رہے یہاں تک کہ سورج سر پر آ گیا۔ دونوں تھک کر بیٹھ گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

افعلوا ما بدا لکم فاحلف باللہ ان لو قد کنا ثلاث مائة رجل لقد ترکناھا لکم او ترکتموھا لنا (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)

جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر ہم مسلمان تین سو ہو جائیں تو پھر اس سرزمین کو یا ہم تمہارے لئے چھوڑ دیں گے یا تم اس کو ہمارے لئے چھوڑ دو گے

اسلام ان کے لئے طاقت بن گیا

نبوت کے پانچویں سال مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر تقریباً اسی آدمی مختلف ٹولیوں میں حبشہ گئے۔ ان کے سردار جعفر بن ابی طالب تھے۔ قریش نے اپنا ایک وفد بھیج کر کوشش کی کہ نجاشی ان مہاجرین کو ان کے حوالے کر دے۔ مگر شاہ حبشہ (نجاشی) نے اس سے انکار کر دیا۔ وہ مسلمانوں کی باتوں اور ان کے طرز عمل سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے ان سے کہا: تم لوگ ہمارے ملک میں سیوم (مامون) ہو۔ جو تم کو برا کہے اس سے جرمانہ لیا جائے گا، جو تم کو برا کہے اس سے جرمانہ لیا جائے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جو تم کو برا کہے اس سے جرمانہ لیا جائے گا۔ پہاڑ کے برابر سونا ملے تب بھی میں تم میں سے کسی پر زیادتی نہیں کروں گا۔ تم ہمارے ملک میں جب تک چاہے رہو۔" اس نے مسلمانوں کو کھانا اور کپڑا دئے جانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے پوچھا "کیا تم لوگوں کو کوئی ستاتا ہے" مسلمانوں نے کہا ہاں۔ نجاشی نے منادی کرائی کہ جس نے مسلمانوں میں سے کسی کو ستایا تو ستانے والا اس مسلمان کو چار درہم جرمانہ دے۔ پھر مسلمانوں سے پوچھا کیا یہ کافی ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ اس کے بعد اس نے جرمانہ کی رقم دگنی کر دی۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب یہ مسلمان حبشہ سے واپس ہوئے تو نجاشی نے ان کو سواری اور زاد راہ دے کر رخصت کیا۔

موحد کے لئے دنیا میں سربلندی کا وعدہ ہے

نبوت کے بعد تقریباً دس سال تک ابو طالب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست تھے۔ ابو طالب جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو قریش کے سرداروں کی ایک جماعت ان کے گرد جمع ہوئی۔ ان میں ابو جہل بن ہشام، ابو سفیان بن حرب، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف وغیرہ تھے۔ ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا: آپ کا ہمارے درمیان جو مقام ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ اور آپ پر وہ وقت آ چکا ہے جو سب پر آتا ہے۔ آپ کے بھتیجے اور ہمارے درمیان

ذ بات ہے اس کو آپ جانتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کے بارے میں ہم سے عہد لے لیں اور ہمارے بارے میں ان سے عہد لے لیں۔ تاکہ وہ ہم سے رک جائیں اور ہم ان سے رک جائیں۔ وہ ہم کو ہمارے دین پر چھوڑ دیں اور ہم ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیں۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ اے میرے بھتیجے! یہ قوم کے سردار ہیں۔ یہاں آئے ہیں تاکہ تم کو کچھ قول دیں اور تم سے کچھ قول لیں۔ تو تم ان سے کیا چاہتے ہو۔ آپ نے فرمایا:

كلمة واحدة تعطونيها تملكون بها العرب و تدين لكم بها العجم (البدايه والنهايه)	تم لوگ میری ایک بات مان لو۔ اس سے تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارے مطیع ہو جائیں گے۔

ابوجہل نے کہا، تمہارے باپ کی قسم ہم دس بات کے لئے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا: "لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرو، اللہ کے سوا جن کی پرستش کرتے ہو ان کو نکال پھینکو" یہ سن کر انھوں نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے: کیا ہم تمام معبودوں کو چھوڑ کر ایک معبود کی پرستش کریں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہوگی۔ یہ شخص تم کو کچھ دینے والا نہیں۔ چلو اپنے دین پر قائم رہو یہاں تک کہ اللہ تمہارے اور اس کے درمیان کوئی فیصلہ کر دے۔

جاندار افراد ہوں تو تھوڑے بھی بہت ہیں

ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار ساتھی بہترین ساتھی ہیں۔ دعوتی گروہ کے لئے چار سو کی تعداد بہترین تعداد ہے۔ بہترین لشکر چار ہزار کا لشکر ہے۔ اور اگر بارہ ہزار آدمی ہوں تو وہ محض قلت کی وجہ سے کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے۔ یعنی وہ ہاریں گے تو اس کی وجہ قلت نہیں ہوگی، کوئی اور ہوگی (خير الصحابة اربعة وخير السرايا اربع مأة وخير الجيوش اربعة آلاف ولن يُغلب اثنا عشر الفاً من قلة، رياض الصالحين ۹۵۸)

دشمن کے خلاف کامیاب کارروائی کے لئے پردہ داری ضروری ہے

قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کی تیاری میں مصروف ہو گئے:

امر رسول الله صلى الله عليه وسلم الناس بالجهاز و امر اهله ان يجهزوه فدخل ابوبكر على ابنته عائشة رضي الله عنها وهي تحرك بعض جهاز رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال اى بنية اامركم رسول الله صلى الله عليه وسلم ان تجهزوه قالت نعم۔ قال فاين ترينه يريد قالت والله لا ادرى (سیرت ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۱۴)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سفر کی تیاری کا حکم دیا اور اپنے اہل خانہ سے کہا کہ وہ آپ کا سامان سفر درست کریں۔ پھر حضرت ابوبکر اپنی صاحب زادی حضرت عائشہ کے یہاں آئے اور وہ آپ کے سامان سفر کی تیاری میں مشغول تھیں۔ انھوں نے کہا اے میری بیٹی کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان سفر تیار کرنے کا حکم دیا ہے حضرت عائشہ نے کہا ہاں۔ انھوں نے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے۔ آپ کہاں کے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکری اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

نمبر	کتاب		مصنف		قیمت
۱۔	الاسلام		از مولانا وحید الدین خاں		۱۵—۰
۲۔	مذہب اور جدید چیلنج	..	″	..	۱۵—۰
۳۔	ظہور اسلام	..	″	..	۱۵—۰
۴۔	دین کیا ہے	..	″	..	۲—۰
۵۔	قرآن کا مطلوب انسان	..	″	..	۵—۰
۶۔	تجدید دین	..	″	..	۳—۰
۷۔	اسلام دین فطرت	..	″	..	۳—۰
۸۔	تعمیر ملت	..	″	..	۲—۰
۹۔	تاریخ کا سبق	..	″	..	۳—۰
۱۰۔	مذہب اور سائنس	..	″	..	۵—۰
۱۱۔	عقلیات اسلام	..	″	..	۳—۰
۱۲۔	فسادات کا مسئلہ	..	″	..	۲—۰
۱۳۔	انسان اپنے کو پہچان	..	″	..	۱—۰
۱۴۔	تعارف اسلام	..	″	..	۲—۵۰
۱۵۔	اسلام پندرھویں صدی میں	..	″	..	۲—۰
۱۶۔	راہیں بند نہیں	..	″	..	۳—۰
۱۷۔	دینی تعلیم	..	″	..	۳—۰
۱۸۔	ایمانی طاقت	..	″	..	(زیر طبع)
۱۹۔	اتحاد ملت	..	″	..	
۲۰۔	سبق آموز واقعات	..	″	..	
۲۱۔	اسلامی تاریخ سے	..	″	..	
۲۲۔	قال اللہ	..	″	..	
۲۳۔	اسلامی دعوت	..	″	..	۳—۰۰
۲۴۔	زلزلۂ قیامت	..	″	..	۴—۰۰
۲۵۔	سچا راستہ	..	″	..	۱—۰۰

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں:

۱- الإسلام يتحدى	۲۶۳ صفحات	قیمت	۲۰	روپے
۲- الدين في مواجهة العلم	۱۱۲ صفحات	"	۱۰	روپے
۳- حكمة الدين	۸۷ صفحات	"	۸	روپے
۴- الإسلام والعصر الحديث	۷۷ صفحات	"	۸	روپے
۵- مسئوليات الدعوة	۳۹ صفحات	"	۲	روپے
۶- نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶ صفحات	"	۲	روپے
۷- إمكانات جديدة للدعوة	۳۴ صفحات	"	۲	روپے
۸- الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲ صفحات	"	۲	روپے
۹- المسلمون بين الماضي والحال والمستقبل	۷۲ صفحات	"	۵	روپے
۱۰- نحو بعث إسلامي	۳۲ صفحات	"	۵۰	پیسے

اعلان

ہندستان میں مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی شائع کردہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور دیگر مصنفین کی کتابوں کے شائقین مکتبہ الرسالہ دہلی سے رابطہ قائم فرمائیں انشاء اللہ ان کی فرمائشیں پوری کردی جائیں گی۔ مذکورہ کتابوں کی قیمت ہندستان کے لئے ان کی اصل مطبوعہ قیمت کی دگنا ہوگی۔

ماہنامہ میثاق لاہور (زیر ادارت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب) کا ہندستان کے لئے زرتعاون پچاس روپے سالانہ ہے۔ جو لوگ جاری کرانا چاہیں وہ مکتبہ الرسالہ دہلی میں رقم جمع کرا کے اس کی رسید ماہنامہ میثاق لاہور کے نام بذریعہ ڈاک بھیج دیں۔ میثاق ان کے نام جاری ہوجائے گا۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

[illegible]

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822 76

MAY 1981
ISSUE NO. 54

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DEL (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کو کیا بولنا ہے
مگر عقلمند انسان وہ ہے جو ——————
یہ بھی جانے کہ اس کو کیا بولنا نہیں ہے

شمارہ ۵۵
جون ۱۹۸۱

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

جون ۱۹۸۱
شمارہ ۵۵

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دہلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پروگرام کیا ہے

"آپ نے ہم لوگوں کو سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے"

"وہ کیا"

"آپ نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہمارے اندر ایک جوش ابھار دیا۔ مگر اس کے آگے ہمیں کوئی پروگرام نہیں دیتے"

اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت ہمارا پروگرام صرف یہ ہے کہ ماہنامہ الرسالہ کی آواز کو عام کیا جائے پہلا کام لوگوں کو باشعور بنانا ہے اور یہ کام صرف الرسالہ کو مسلسل پڑھنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ الرسالہ کو عام کرنے کی بہترین صورت ایجنسی ہے۔ آپ خود الرسالہ کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ اپنے ماحول میں پھیلائیے۔ عام ایجنٹوں، کتب فروشوں اور بس اسٹینڈ وغیرہ کے بک اسٹالوں کو آمادہ کیجئے کہ وہ اس کی ایجنسی لیں ـــــ الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیے، یہی اس وقت ہمارا پروگرام ہے

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی **Al-Risala Monthly** لکھیں

موجودہ دنیا ناکافی

گرسن ولوریا (Gerson Viloria) فلپائن کا ایک باشندہ ہے جس کی عمر ۴۳ سال ہے۔ وہ ایک ٹریژری میں کلرک تھا۔ اس نے لوگوں کی طرف سے فرضی دستخط کرکے بہت سے لوگوں کی رقم وصول کر لی۔ اس کا مقدمہ فلپائن کی ایک عدالت میں پیش ہوا۔ جج کا نام رومیو اسکاریل (Romeo M. Escareal) تھا۔ جج نے تفصیلی سماعت کے بعد گرسن ولوریا کو ۱۷ معاملات میں مجرم پایا۔ قانون کے مطابق اس طرح کے ایک جرم میں آدمی کو ۱۰ سال قید بامشقت کی سزا ملنی چاہئے۔ اس کے مطابق جج نے مجرم کو ۱۷۰ سال کی سزا دی۔ اسی کے ساتھ اس نے مجرم پر ۴۶۲۵ ڈالر جرمانہ عائد کیا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں سزائے قید میں اضافہ ہو جائے گا (ٹائمس آف انڈیا ۹ نومبر ۱۹۷۹)

مجرم کی عمر ۴۳ سال ہو چکی ہے۔ اگر "قبل از وقت" اس کا خاتمہ نہ ہو بلکہ وہ اپنی عمر طبعی کو پورا کرکے مرے تب بھی اس کی موت کے وقت اس کی سزا کی مدت میں کم از کم سو سال باقی رہ جائیں گے ——— انسان کا ضمیر کسی عمل کا جو بدلہ یا کسی جرم کی جو سزا چاہتا ہے وہ موجودہ محدود دنیا میں ناممکن ہے۔ جو ہونا چاہئے اور جو ہو رہا ہے کے درمیان یہ تضاد بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا ہونی چاہئے جہاں یہ تضاد ختم ہو جائے اور جو کچھ ہونا چاہئے وہی عملاً بھی ہونے لگے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ تھائی لینڈ میں ہوا۔ تھائی لینڈ کی ایک عدالت میں ایک خاتون پولس کا مقدمہ پیش ہوا۔ اس کا نام مسز امساپ (Mrs. Phenphanchong Imsap) ہے۔ وہ سرحدی علاقہ پیچابون (Petchabun) میں تعینات تھی۔ اس کا تعلق بیرونی افراد کے رجسٹریشن آفس سے تھا۔ اس نے رجسٹریشن کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا اور ان سے رشوت لینا شروع کیا۔ وہ سترہ سال تک حکومت کو اور اسی کے ساتھ لوگوں کو فریب دیتی رہی۔ اس مدت میں اس نے ناجائز طور پر تقریباً ۲۵ ہزار ڈالر کمایا۔ عدالت نے خاتون پولس کو مجرم قرار دیتے ہوئے اس کو ایک ہزار ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دی۔ جج نے اپنے فیصلہ میں مزید لکھا کہ مجرم کو پیرول پر رہائی یا رحم کی درخواست کی رعایت نہ دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ مارچ ۱۹۸۱)

ظاہر ہے کہ خاتون پولیس عدالت کی سزا بھگتنے کے لئے مزید ایک ہزار ایک سال تک زندہ نہیں رہے گی۔ وہ یقینی طور پر اس سے بہت پہلے مر جائے گی۔ پھر جج نے کیوں اس کو اتنی لمبی سزا دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کا جذبۂ انصاف چاہتا ہے کہ جو شخص کوئی بڑا جرم کرے اس کو اس کے جرم کے بقدر لمبی سزا دی جائے۔ مگر موجودہ دنیا میں کوئی جج عملاً ایسا کر نہیں پاتا۔ وہ مجرم کو "ایک ہزار سال" کی سزا دینا چاہتا ہے مگر آدمی کی محدود عمر اس کو ایسا کرنے نہیں دیتی۔ آدمی کے جرم کی عمر "ایک ہزار سال" ہے اور اس کے جینے کی عمر صرف "پچاس سال"۔ آدمی کے عمل اور اس کی عمر دونوں میں یکسانیت نہیں۔ یہ صورت حال ایک اور وسیع تر دنیا کا تقاضا کرتی ہے جہاں آدمی زیادہ لمبی عمر پائے تاکہ وہ پورے انصاف کے ساتھ اپنے عمل کا انجام پا سکے۔

زندہ رہنمائی

اسلام انسان کے لئے خدا کی ابدی رہنمائی ہے۔ اسلام کی صورت میں خدا نے وہ تمام بنیادی اصول بتا دئے ہیں جو انسان کو موجودہ دنیا کی زندگی میں سچائی اور انصاف پر قائم رکھنے والے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ مزید انتظام کیا گیا ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں کے ذریعہ ان اصولوں کا مکمل عملی نمونہ بھی ایک شان دار تاریخ کی صورت میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اسلام کی یہ تاریخ ہر موڑ پر ایک زندہ رہنما کی طرح کھڑی ہوئی ہر آدمی کو بتا رہی ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ایک غریب مسلمان دن بھر کی محنت کے بعد شام کو اپنے گھر واپس آیا۔ اس کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کھانا لائی تو وہ صرف ارہر کی دال اور جو کی روٹی تھی۔ مسلمان اس کو دیکھ کر جھنجلا اٹھا کہ دن بھر کی محنت کے بعد ہم کو یہی کھانا ملا ہے اور کتنے لوگ بغیر محنت کے عمدہ عمدہ کھانا کھا رہے ہیں۔ مگر معاً بعد اس کو خیال آیا کہ خدا کے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کھانا تو اس سے بھی زیادہ معمولی ہوتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ انسانوں کے درمیان معاشی اونچ نیچ اس کو اصل مسئلہ کی نسبت سے غیر اہم نظر آنے لگی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنا کھانا کھایا اور رات کی نماز پڑھ کر سو گیا۔

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چلتے چلتے سیدھے راستہ کے ادھر ادھر بھٹک جاتا ہے۔ وہ اہم اور غیر اہم کے فرق کو بھول جاتا ہے۔ اس کی نظر اصل نشانہ سے ہٹ کر وقتی چیزوں میں الجھ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر اسلام کی تاریخ آدمی کے لئے ایک معیار کا کام دیتی ہے۔ وہ زندہ نمونوں کے ذریعہ آدمی کی تصحیح کرتی رہتی ہے۔ ایک "عام" آدمی بھی اس میں اپنا سبق پا سکتا ہے اور ایک "خاص" آدمی بھی۔

۳ مئی ۱۹۶۹ کو سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی اچانک وفات ہوئی تو مسٹر وی وی گری نائب صدر تھے۔ اس کے بعد دستور ہند کے مطابق وہ قائم مقام صدر ہو گئے۔ تاہم جلد ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے عہدہ سے استعفا دے دیں اور صدارتی الکشن کا مقابلہ کریں۔ ان کے استعفا کے بعد جو قانونی صورت پیدا ہوئی اس کے مطابق جناب محمد ہدایت اللہ (پیدائش ۱۹۰۵) ہندستان کے ایکٹنگ صدر مقرر ہوئے جو اس وقت ہندستانی سپریم کوٹ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کی صدارت ۳۵ دن (۲۰ جولائی تا ۲۴ اگست ۱۹۶۹) جاری رہی۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کے صدر کی حیثیت سے جناب محمد ہدایت صاحب کو جو تجربات ہوئے ان کو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (My Own Boswell) میں درج کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۶۹ کو راشٹرپتی بھون کے مغل گارڈن میں یوم آزادی کی تقریب تھی۔ محمد ہدایت اللہ صاحب بحیثیت صدر روایتی جلوس کے ساتھ راشٹرپتی بھون سے نکلے۔ اعلیٰ فوجی افسران، اے ڈی سی کا عملہ، صدارتی باڈی گارڈ سب جلو میں چل رہے تھے۔ ان کا پرشوکت یونیفارم اور منظم انداز میں حرکت کرنا راشٹرپتی بھون کے شاہانہ ماحول میں عجیب شان دار منظر پیش کر رہا تھا۔ محمد ہدایت اللہ صاحب کہتے ہیں کہ اپنے گرد یہ شان و شوکت دیکھ کر مجھے کسی قدر فخر کا احساس ہونے لگا:

I felt a little pride (P.245)

مگر اگلے ہی لمحہ ان کو فاروق اعظم رض کا وہ واقعہ یاد آگیا جو کسی قدر فرق کے ساتھ تاریخ کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔

شام وفلسطین کی جنگ کے آخری مرحلہ میں عیسائیوں نے پیش کش کی کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ خلیفہ اسلام خود سفر کرکے یہاں آئیں۔ خلیفہ دوم ایک اونٹ اور ایک غلام کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ دمشق کے قریب جابیہ کے مقام پر پہنچے تو ابوعبیدہ بن الجراح اور خالد بن ولید اور اسلامی فوج کے دوسرے سرداروں نے آپ کا استقبال کیا۔ جابیہ میں کئی دن تک قیام رہا اور عیسائیوں سے گفتگو کے بعد یہیں معاہدہ لکھا گیا۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد عمر فاروق رض بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ کے جسم پر پرانے نہایت معمولی کپڑے تھے۔ آپ کی سواری ایک دبلی اونٹنی تھی۔ چنانچہ لوگوں نے آپ کی خدمت میں نیا کپڑا اور ترکی نسل کا عمدہ گھوڑا پیش کیا اور اصرار کیا کہ آپ اونٹنی کو چھوڑ دیں اور اسی گھوڑے پر سفر کرکے جائیں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے تو وہ عجیب شان کے ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد عمر فاروق رض گھوڑے سے اتر گئے اور کہا کہ میری اونٹنی لاؤ، میں اسی پر سوار ہو کر جاؤں گا۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا: میرے دل میں بڑائی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی بڑائی کا جذبہ ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

محمد ہدایت اللہ صاحب کو جب یہ واقعہ یاد آیا تو ان کے دل کی کیفیت بدل گئی۔ اس وقت ان کا جو حال ہوا اس کو وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ــــــ مجھے اپنے اوپر شرم آنے لگی۔ میں نے اسی وقت اس احساس کو اپنے اندر سے نکال دیا اور دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا:

I felt ashamed of myself and put aside the feeling at once and begun thinking of other things (246)

اسلامی تاریخ ہر آدمی کے لئے ایک زندہ رہنما ہے۔ وہ ہر موقع پر آدمی کو متوازن بناتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے اندر کسی "بادشاہ" کے لئے بھی اتنی ہی رہنمائی ہے جتنی ایک "معمولی" انسان کے لئے۔

اندھیرے کے بعد اجالا

قبائلی نظام میں آدمی قبیلہ کی حمایت کے تحت زندگی گزارتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ابتدائی زمانہ میں اپنے چچا ابوطالب کی حمایت میں رہے جو قبیلہ بنو ہاشم کے سردار تھے۔ نبوت کے دسویں سال ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد قبائلی روایات کے مطابق ابولہب قبیلہ بنو ہاشم کا سردار مقرر ہوا۔ اس نے آپ کی حمایت سے انکار کر دیا۔ اب آپ نے ارادہ کیا کہ کسی دوسرے قبیلہ کی حمایت حاصل کر کے اپنا دعوتی کام جاری رکھیں۔ اس غرض کے تحت آپ نے طائف کا سفر فرمایا۔

طائف مکہ کے جنوب مشرق میں ۶۵ میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز و شاداب بستی تھی۔ وہاں آپ کے بعض رشتہ دار تھے۔ چنانچہ آپ اپنے خادم زید بن حارثہ کو لے کر طائف پہنچے۔ اس وقت وہاں کی آبادی میں تین ممتاز سردار تھے۔ عبدیالیل، مسعود اور حبیب۔ آپ ان تینوں سے ملے۔ مگر ہر ایک نے آپ کا ساتھ دینے یا آپ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: خدا نے اگر تم کو رسول بنایا ہو تو میں کعبہ کا پردہ پھاڑ ڈالوں۔ دوسرے نے کہا: خدا کو کیا تمھارے سوا کوئی نہ ملا تھا جس کو وہ رسول بنا کر بھیجتا۔ تیسرے نے کہا: خدا کی قسم میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ اگر تم رسول ہو تو تمھارا جواب دینا گستاخی ہے اور اگر تم جھوٹے ہو تو میرے لئے مناسب نہیں کہ میں تم سے بات کروں (فقال له احدهم هو يمرط ثياب الكعبة إن كان الله ارسلك۔ وقال الآخر اما وجد الله احداً يرسله غيرك۔ وقال الثالث والله لا اكلمك ابداً۔ لئن كنت رسولاً من الله كما تقول لانت اعظم خطراً من ان ارد عليك الكلام ولئن كنت تكذب على الله ما ينبغي لي ان اكلمك، سيرة ابن هشام جلد ۲ صفحه ۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو کر واپس ہوئے۔ مگر ان لوگوں نے پھر بھی آپ کو نہ بخشا۔ انھوں نے بستی کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ گالیوں اور پتھروں سے آپ کا پیچھا کرتے رہے۔ آپ کے خادم زید بن حارثہ نے اپنے کمبل سے آپ کو آڑ میں لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ آپ کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور آپ کا جسم لہولہان ہوگیا۔

بستی سے کچھ دور جا کر عتبہ اور شیبہ دو بھائیوں کا انگور کا باغ تھا۔ یہاں پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی اور آپ نے اس باغ میں پناہ لی۔ آپ زخموں سے چور تھے اور اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ خدایا میری مدد فرما، مجھے تنہا نہ چھوڑ دے۔

عتبہ اور شیبہ دونوں مشرک تھے۔ مگر جب انھوں نے آپ کا حال دیکھا تو ان کو آپ کے اوپر

رحم آگیا۔ انھوں نے اپنے نصرانی غلام کو بلایا جس کا نام عداس تھا۔ انھوں نے عداس سے کہا کہ ان انگوروں کے کچھ خوشے لو اور ان کو ایک برتن میں رکھ کر اس آدمی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اس میں سے کھائے۔ عداس نے ایسا ہی کیا۔ وہ انگور لے کر آیا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ یہ کھاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو بسم اللہ کہا اور پھر کھایا۔

عداس نے آپ کے چہرہ کی طرف دیکھا اور کہا: خدا کی قسم یہ جو آپ نے کہا، اس ملک کے لوگ ایسا نہیں کہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے عداس، تم کس ملک کے رہنے والے ہو اور تمھارا دین کیا ہے۔ عداس نے کہا: میں نصرانی ہوں اور میں نینوا (عراق) کا رہنے والا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مرد صالح یونس بن متی کے شہر کا۔ عداس نے کہا: آپ کو کیسے معلوم کہ یونس بن متی کون تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں (ذاك اخى۔ كان نبيا وانا نبى) یہ سن کر عداس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھک پڑا اور آپ کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگا۔

عتبہ اور شیبہ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: دیکھو اس شخص نے تمھارے غلام کو خراب کر دیا۔ عداس جب لوٹ کر آیا تو انھوں نے اس سے کہا: عداس تمھارا برا ہو۔ تم کو کیا ہوا کہ تم اس کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگے۔ عداس نے کہا اے میرے آقا، زمین پر اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اس آدمی نے مجھ کو ایسی بات بتائی جس کو صرف ایک نبی ہی جان سکتا ہے۔ دونوں نے کہا: اے عداس، تمھارا برا ہو۔ وہ تم کو تمھارے دین سے پھیر نہ دے۔ کیونکہ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے (سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۰)

خدا کے رسول کو ایک ہی سفر میں مختلف لوگوں سے تین الگ الگ قسم کے سلوک کا تجربہ ہوا:

ایک نے آپ کے اوپر پتھر پھینکے۔

دوسرے نے آپ کی ضیافت کی۔

تیسرے نے آپ کی نبوت کا اقرار کر لیا۔

اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ سبق کہ اس دنیا میں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ یہاں اگر چٹیل میدان ہیں تو وہیں سایہ دار درخت بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں کچھ لوگوں سے اگر برے سلوک کا تجربہ ہو تو آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ آدمی اگر خود سچائی پر قائم رہے۔ وہ اپنے دل کو منفی جذبات سے بچائے تو ضرور اس کو خدا کی مدد حاصل ہوگی۔ ایک قسم کے لوگ اگر اس کا ساتھ نہ دیں گے تو کچھ دوسرے لوگوں کے دل اس کے لئے نرم کر دئے جائیں گے۔

کچھ اور کرنا ہے

اٹھارویں صدی میں جن انگریزوں کی سرفروشی نے ہندستان کو برطانیہ کی نوآبادی بنایا ان میں لارڈ رابرٹ کلائیو (۱۷۲۵ – ۱۷۷۴) کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۷۴۳ میں جبکہ اس کی عمر ۱۸ سال تھی، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک کلرک کی حیثیت سے مدراس آیا۔ اس وقت اس کی تنخواہ صرف پانچ پونڈ سالانہ تھی۔ یہ رقم اس کے خرچ کے لئے بہت ناکافی تھی۔ چنانچہ وہ قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبا رہتا اور مایوسانہ جھنجلاہٹ کے تحت اپنے ساتھیوں اور افسروں سے لڑتا جھگڑتا رہتا۔

اس کے بعد ایک حادثہ ہوا جس نے اس کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ اس نے اپنی ناکام زندگی کو ختم کرنے کے لئے ایک روز بھرا ہوا پستول لیا اور اپنے سر کے اوپر رکھ کر اس کی لبلبی دبا دی۔ مگر اس کو سخت حیرت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ اس کا پستول نہیں چلا ہے۔ اس نے پستول کھول کر دیکھا تو وہ گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے ارادہ کی حد تک اپنے کو ہلاک کر لینے کے باوجود وہ بدستور زندہ حالت میں موجود تھا۔

یہ بڑا عجیب واقعہ تھا۔ رابرٹ کلائیو اس کو دیکھ کر چلا اٹھا: خدا نے یقیناً تم کو کسی اہم کام کے لئے محفوظ رکھا ہے" اب اس نے کلرکی چھوڑ دی اور انگریزی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اس زمانہ میں انگریز اور فرانسیسی دونوں بیک وقت ہندستان میں اپنا قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں رابرٹ کلائیو نے غیر معمولی صلاحیت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد اس نے ترقی کی اور اس کو انگریزی فوج میں کمانڈر انچیف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جس کلائیو نے مایوس ہو کر خود اپنے ہاتھ سے اپنے اوپر پستول چلایا تھا، اسی کو اس کے بعد یہ مقام ملا کہ برطانیہ کی تاریخ میں اس کو ہندستان کے اولین فاتح کی حیثیت سے لکھا جائے۔

ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ وہ کسی شدید خطرہ میں پڑنے کے باوجود معجزاتی طور پر اس سے بچ جاتا ہے۔ تاہم بہت کم لوگ ہیں جو رابرٹ کلائیو کی طرح اس سے سبق لیتے ہوں۔ جو اس طرح کے واقعات میں قدرت کا یہ اشارہ پڑھ لیتے ہوں کہ ——— ابھی تمھارا وقت نہیں آیا، ابھی دنیا میں تم کو اپنے حصہ کا کام کرنا باقی ہے۔

ہر آدمی کو دنیا میں کام کرنے کی ایک مدت اور کچھ مواقع دئے گئے ہیں۔ یہ مدت اور مواقع اس سے اس وقت تک نہیں چھنتے جب تک خدا کا لکھا پورا نہ ہو جائے۔ اگر رات کے بعد دوبارہ آپ کے اوپر صبح طلوع کرے تو سمجھ لیجئے کہ خدا کے نزدیک ابھی آپ کے عمل کے کچھ دن باقی ہیں۔ اگر آپ حادثات کی اس دنیا میں اپنی زندگی کو بچانے میں کامیاب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے منصوبہ کے مطابق آپ کو کچھ اور کرنا ہے جو ابھی آپ نے نہیں کیا۔

خدا کا اعتماد سب سے بڑا اعتماد

دوسری جنگ عظیم میں جب اتحادی طاقتوں نے بالآخر جرمنی کو شکست دے دی تو تمام نازی لیڈروں کو اسی برلن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا جہاں وہ ساری دنیا کے قتل کا منصوبہ بنایا کرتے تھے۔

یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۴۶ کا ہے۔ ہٹلر اور گورنگ نے تو پہلے ہی خودکشی کرلی تھی۔ اس کے بعد ربن ٹراپ، کیٹل، کیلٹن برنر، الفریڈ روزن برگ، فرنیک، ولہم فرک جولیس، ساکل، جوڈل، سس انکوارٹ اور دوسرے نازی لیڈر جو زندہ بچے تھے، ایک ایک کرکے ختم کردئے گئے۔

یہ وہ لیڈر تھے جنھوں نے چالیس لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ان کی املاک پر قبضہ کرلیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسی خونی جنگ چھیڑی تھی جس میں ان کے مفروضہ دشمنوں کے علاوہ خود جرمن قوم کے ۲۰ لاکھ سپاہی کام آئے۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کو بیگار کیمپوں (Concentration Camp) میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے کے لئے مجبور کردیا تھا۔ ان کی درندگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ملک کے بوڑھے، معذور اور بیمار لوگوں کو ——— "جرمنی کے لئے بے فائدہ" قرار دے کر گولی سے اڑا دیتے۔ مقتول بچوں، لاشوں سے اٹے ہوئے گڑھوں اور بیواؤں اور یتیموں کے غول کو دیکھ کر بھی ان کا پتھر جیسا دل پسیجنا نہیں جانتا تھا۔

مگر شکست کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ جب وہ پھانسی کے تختے کے سامنے لائے گئے تو ان کے چہرے زرد تھے۔ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، وہ کچھ بولنا چاہتے تو معلوم ہوتا کہ زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ شعلہ بیان لیڈر گویائی کی طاقت کھو چکے تھے۔ جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے تھے وہ اپنے انجام کو دیکھ کر پاگل ہو گئے۔

جس بہادری کا انحصار صرف مادی سہارے پر ہو وہ اس وقت بزدلی میں تبدیل ہو جاتی ہے جبکہ مادی سہارا اس سے چھن جائے۔ البتہ جس کا اعتماد خدائے لازوال پر ہو، وہ ہر حال میں شجاعت و عزیمت کی چٹان بنا رہتا ہے۔ خواہ مادی سہارے اس کا ساتھ دے رہے ہوں یا اس قسم کے تمام خارجی سہاروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

اگر خدا کی مدد کا یقین دلوں میں زندہ ہو تو آدمی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہ طاقت ور دشمنوں میں گھر کر بھی عزم و ہمت کی چٹان بنا رہے گا۔ قاتلوں اور غارت گروں کے ہجوم سے بھی وہ اس طرح زندہ سلامت نکل آئے گا جیسے وہاں کسی کا وجود ہی نہ تھا۔

رسی کا سبق

ایک شخص کے دس لڑکے تھے۔ سب لڑکے تندرست اور ہوشیار تھے اور مل جل کر رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے ہر جگہ ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا ہر کام آسانی سے ہو جاتا تھا۔ کوئی شخص ان کے خلاف کارروائی کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اس خاندان کا اتحاد اور اس کی طاقت لوگوں کے درمیان ضرب المثل بن گئی تھی۔

لڑکوں کا باپ بوڑھا ہو کر مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کو سب سے زیادہ اندیشہ یہ ہوا کہ اس کے بعد اس کے لڑکے باہمی اختلاف کا شکار ہو کر الگ الگ نہ ہو جائیں اور اس طرح اپنے آپ کو کمزور کر لیں۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے ایک روز تمام لڑکوں کو بلایا اور کہا کہ دیکھو اب میں بہت جلد مر جاؤں گا۔ میں تم لوگوں کو ایک سبق دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم میرے اس سبق کو یاد رکھو گے تو زندگی میں کبھی ناکام نہ ہو گے۔ اس کے بعد اس نے ایک موٹی رسی نکالی اور کہا کہ اس کو توڑ دو۔

ہر ایک نے باری باری کوشش کی۔ مگر پورا زور لگانے کے بعد بھی کوئی اسے توڑ نہ سکا۔ اس کے بعد سب نے مل کر اس کو توڑنے کی کوشش کی۔ مگر اب بھی وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اب بوڑھے باپ نے یہ کیا کہ رسی کو کھولا تو اس کی دس لڑیاں الگ الگ ہو گئیں۔ اس نے ایک ایک لڑی ہر لڑکے کو دے کر کہا کہ اسے توڑ دو۔ اب معاملہ آسان تھا۔ ہر لڑکے نے معمولی کوشش سے اپنی اپنی رسی توڑ ڈالی۔ یکجا لڑیوں کو کوئی توڑ نہ سکا۔ مگر منتشر لڑیوں کو ہر ایک نے توڑ کر دو ٹکڑے کر دیا۔

اس تجربہ کے بعد باپ اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوا۔ اس نے کہا: دیکھو، جب تک رسی کی دس لڑیاں ایک ساتھ ملی ہوئی تھیں، تم لوگ اسے توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مگر وہی رسی جب الگ الگ لڑیوں میں بٹ گئی تو تم میں سے ہر شخص نے بآسانی اسے توڑ ڈالا۔ اسی مثال سے تم اپنا معاملہ سمجھ سکتے ہو۔

تم لوگ دس بھائی ہو۔ گویا یہ رسی کی دس لڑیاں ہیں جو اب تک ایک ساتھ ملی رہی ہیں۔ اس لئے تم لوگ ہر جگہ طاقت ور ثابت ہوتے رہے۔ کوئی تمھارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ اگر تم لوگ اسی طرح ایک ساتھ ملے رہو گے تو ہرگز کوئی تم کو توڑ نہ سکے گا۔ اور اگر تم الگ الگ ہو گئے تو تمھارے دشمن تم کو اسی طرح ایک ایک کر کے توڑ ڈالیں گے جس طرح تم نے رسی کی لڑیوں کو الگ الگ ہونے کے بعد توڑ دیا۔

ایک خاندان کا معاملہ ہو یا ایک قوم کا، سب کے لئے طاقت کا سب سے بڑا راز اتحاد ہے۔ وہ تعداد جو اختلاف کے وقت دوسروں کے مقابلہ میں بے زور دکھائی دیتی ہے وہی تعداد اگر متحد ہو جائے تو وہ اتنی طاقت ور ہو جائے گی کہ اس کا حریف اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہی نہ کرے۔

الٹا اہرام

دہلی کی سب سے اونچی عمارت وکاس مینار ہے۔ جب یہ عمارت بنی اور اخبار میں اس کی خبر چھپی تو خبر کا پہلا لفظ یہ تھا: "شہر کی ۲۱ منزلہ عمارت تیار ہوگئی" ظاہر ہے کہ عمارت اس طرح نہیں بنی کہ اس کی ۲۱ ویں منزل سب سے پہلے بن کر کھڑی ہوگئی ہو۔ عمارت کی تعمیر کا کام اس کی بنیاد سے شروع ہوا۔ پھر ہوتے ہوتے کئی سال میں اوپری منزل تک پہنچا۔ مگر خبر کی ترتیب میں "۲۱ منزل" کا لفظ سب سے پہلے تھا۔

اخباروں میں خبر مرتب کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ اس طریقہ کو صحافتی اصطلاح میں مثلث معکوس یا الٹا اہرام (Inverted Pyramid) کہتے ہیں۔ یعنی خبر کو اس کی اصلی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کے بجائے الٹی ترتیب کے ساتھ بیان کرنا۔ کوئی واقعہ جو ہماری زندگی میں پیش آتا ہے وہ ایک فطری ترتیب سے پیش آتا ہے۔ اس کی ایک ابتدا ہوتی ہے۔ پھر درمیانی اجزاء سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا آخری اور انتہائی جزء وقوع میں آتا ہے۔ یہ واقعہ کی فطری ترتیب ہے۔ مگر اخباری رپورٹر کو معاملہ کی واقعاتی ترتیب سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے پیش نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ فوراً کوئی بڑی سی بات کہہ کر قارئین کی توجہ اپنی طرف مائل کرے۔ اسی لئے جب وہ خبر کو مرتب کرتا ہے تو وہ اس کی ترتیب کو الٹ دیتا ہے۔ اصل واقعہ کا جو جزء بالکل آخر میں پیش آیا تھا اس کو وہ آغاز میں رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد پوری خبر بیان کرتا ہے۔ گویا کہ "اہرام" کے بننے کی ترتیب خبر کی صورت اختیار کرتے وقت الٹ جاتی ہے۔ اخباری رپورٹر ایسا اس لئے کرتا ہے تاکہ وہ پہلے ہی مرحلہ میں ناظرین کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکے۔

"الٹا اہرام" اخبار کے صفحات میں بن سکتا ہے مگر وہ زمین پر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ملت کے مستقبل کا قلعہ بھی الٹی سمت سے صرف الفاظ کی دنیا میں کھڑا کیا جا سکتا ہے وہ حقیقت کی دنیا میں وجود میں نہیں آسکتا۔ اگر آپ کو تعمیر ملت کی لفظی مہم چلانا ہے تو وہ ایک "عہد آفریں" اعلان یا ایک "تاریخ ساز" اجلاس کے ذریعہ آخری منزل سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔ مگر کوئی واقعی تعمیر اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ابتدائی مقام سے اپنے کام کا آغاز کیا جائے۔

الفاظ بولنے والا اپنے پہلے ہی جملہ میں آخری منزل پر چھلانگ لگا کر یہ کہہ سکتا ہے "شہر کی بیس منزلہ عمارت تیار ہوگئی" لفظ بولنے والے کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے "عمل" کو آخری مرحلہ سے شروع کرے۔ مگر جو شخص ایک حقیقی واقعہ کو ظہور میں لانا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے عمل کو ابتداء سے شروع کرے، وہ آخری منزل سے اپنے سفر کا آغاز نہیں کرسکتا۔

ایک وراثت یہ بھی ہے

کریم بخش سیدھے سادے دین دار آدمی تھے۔ گاؤں کی معمولی آمدنی پر گزر کر لیتے۔ ۶۵ سال کی عمر میں وہ چار بچے چھوڑ کر مرے تو ان کے لئے انھوں نے کوئی قابل ذکر جائداد نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے رحیم بخش شہر چلے آئے تاکہ اپنے لئے کمائی کی کوئی صورت کر سکیں۔ شہر میں انھوں نے مختصر سرمایہ کے ساتھ ایک کاروبار شروع کر دیا۔

رحیم بخش کے والد نے ان کے لئے کوئی مادی وراثت نہیں چھوڑی تھی۔ مگر قناعت اور سادگی اور کسی سے لڑے بھڑے بغیر اپنا کام کرنے کی وراثت چھوڑ رکھی تھی۔ یہ وراثت رحیم بخش کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ ان کی سادگی اور قناعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی آمدنی کے باوجود وہ مسلسل ترقی کرنے لگے۔ ان کا لڑائی بھڑائی سے بچنے کا مزاج ان کے لئے مزید معاون ثابت ہوا۔ ہر ایک ان سے خوش تھا۔ ہر ایک سے ان کو تعاون مل رہا تھا۔ ان کی ترقی کی رفتار اگرچہ سست تھی مگر وہ ایک دن رکے بغیر جاری رہی۔

رحیم بخش کا کاروبار اگرچہ معمولی تھا مگر ان کی شرافت، ان کی بے غرضی اور ان کی ایمان داری نے ان کو اپنے ماحول میں اتنی عزت دے رکھی تھی جیسے کہ وہ کوئی بڑی حیثیت کے آدمی ہوں۔ ان کے پاس سرمایہ بہت کم تھا مگر لین دین میں صفائی اور وعدہ کا پکا ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازار میں بڑے بڑے تھوک بیوپاری ان سے کہتے کہ "میاں جی، جتنا چاہے مال لے جاؤ۔ پیسہ کی پروانہ کرو۔ پیسے بعد کو آجائیں گے"۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی سے جھگڑے کی نوبت آگئی۔ مگر انھوں نے خود ہی اپنے کو چپ کر لیا۔ وہ شریر آدمی کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہ کرتے بلکہ خاموشی سے اپنے کاروبار میں لگ جاتے اور اس کے حق میں دعا کرتے رہتے۔ جب بھی ان کے دل میں شیطان کوئی بدمعاملگی کا جذبہ ڈالتا تو ان کے والد کا معصوم چہرہ ان کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا۔ ان کو ایسا محسوس ہوتا کہ اگر میں نے کوئی غلط معاملہ کیا یا کسی سے جھگڑا فساد کیا تو میرے باپ کی روح قبر میں تڑپ اٹھے گی۔ یہ خیال فوراً ان کے جذبات کو دبا دیتا۔ وہ دوبارہ اسی تعمیری راستہ پر چل پڑتے جس میں انھیں ان کے باپ نے چھوڑا تھا۔

ان کا کاروبار بڑھا تو ان کو مزید معاون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب انھوں نے اپنے بھائیوں کو بلانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ چاروں بھائی شہر میں منتقل ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کے کاروبار کے چار مستقل شعبے ہو گئے۔ ہر شعبہ ایک ایک بھائی کے سپرد تھا۔ چاروں بھائی ایک ساتھ مل کر رہتے اور ساتھ کھاتے پیتے۔ مگر کاروباری اعتبار سے ہر بھائی اپنے اپنے شعبہ کو آزادانہ طور پر انجام دیتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد رحیم بخش کو محسوس ہوا کہ بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے چونکہ وہی کاروبار کے مالک ہیں اس لئے بقیہ بھائی اپنے کام کو اس دل چسپی سے نہیں کرتے جیسا کہ کوئی آدمی اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہو۔ اب رحیم بخش کے لئے دو صورتوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا سوال تھا۔ یا تو کاروبار کو اپنے قبضہ میں لے کر بقیہ تینوں بھائیوں کو اس سے الگ کر دیں اور اس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے بھائیوں کی دشمنی خرید لیں۔ دوسرے یہ کہ معاملات کو اسی طرح چلنے دیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہی ہو جو عام طور پہ مشترک کاروبار میں ہوتا ہے۔ یعنی باہمی شکایت اور اس کے بعد تلخ یادوں کے ساتھ کاروبار کی تقسیم۔

رحیم بخش نے چند دن سوچا اور اس کے بعد سب بھائیوں کو جمع کر کے ساری بات صاف صاف ان کے سامنے رکھ دی۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے فضل سے ابھی کوئی بات بگڑی نہیں ہے۔ بہترین بات یہ ہے کہ چاروں بھائی ایک ایک کاروبار کو لے لیں اور ہر ایک ذاتی طور پر اپنا کاروبار چلائے۔ اس طرح ہمارے والد کی روح کو سکون پہنچے گا اور مجھے یقین ہے کہ اس میں ہر ایک کے لئے زیادہ برکت ہوگی۔ تینوں بھائیوں نے کہا کہ ہم تو سراپا آپ کے احسان مند ہیں۔ اس لئے آپ جو بھی فیصلہ کر دیں وہ ہم کو منظور ہے۔ مختصر گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ اسی وقت قرعہ کے ذریعہ ہر بھائی کو ایک ایک کاروبار دے دیا گیا۔

اب چاروں بھائی اپنے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر ایک اپنے بچوں کو لے کر اپنے اپنے کام میں صبح سے شام تک محنت کرتا ہے۔ چاروں کے درمیان پہلے سے بھی زیادہ اچھے تعلقات ہیں۔ ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ چاروں نے الگ الگ اپنے مکانات بنا لئے ہیں۔ مگر رحیم بخش اب بھی اسی طرح سب کے "بڑے بھائی" ہیں جیسے وہ پہلے بڑے بھائی تھے۔ ایک بھائی جو بات کہہ دے اس کو دوسرا بھائی کبھی نہیں ٹالتا۔ ایک گھر میں کوئی ضرورت پیش آ جائے تو چاروں گھروں کی عورتیں اور بچے مل کر اس کو اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ ہر ایک کا اپنا کام ہو۔

اکثر باپ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی اولاد کے لئے سب سے بڑی وراثت یہ ہے کہ وہ ان کے لئے مال اور جائداد چھوڑ کر اس دنیا سے جائیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ خوش نصیب اولاد وہ ہے جس کے باپ نے اس کے لئے بااصول زندگی کی وراثت چھوڑی ہو۔ وہ اپنی اولاد کو یہ سبق دے کر دنیا سے گیا ہو کہ اپنی محنت پر بھروسہ کرو، لوگوں سے الجھے بغیر اپنا کام کرو۔ اپنے واجبی حق پر قناعت کرو۔ حال کے فائدوں سے زیادہ مستقبل کے امکانات پر نظر رکھو۔ خوش خیالیوں میں گم ہونے کے بجائے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرو۔ مادی وراثت سے زیادہ بڑی چیز اخلاقی وراثت ہے۔ مگر بہت کم باپ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

استحقاق پیدا کیجئے

ایم اے خان ہائر سکنڈری کے امتحان میں اچھے نمبر سے پاس ہوئے تھے۔ مگر کسی وجہ سے وہ بروقت آگے داخلہ نہ لے سکے۔ یہاں تک کہ اکتوبر کا مہینہ آگیا۔ اب بظاہر کہیں داخلہ ملنے کی صورت نہ تھی۔ تاہم تعلیم کا شوق ان کو ہندو سائنس کالج کے پرنسپل کے دفتر میں لے گیا۔

"جناب، میں بی ایس سی میں داخلہ لینا چاہتا ہوں" انھوں نے ہندو پرنسپل سے کہا۔

"یہ اکتوبر کا مہینہ ہے، داخلے بند ہو چکے ہیں۔ اب کیسے تمھارا داخلہ ہوگا "

"بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ داخلہ لے لیں۔ ورنہ میرا پورا سال بیکار ہو جائے گا"

" ہمارے یہاں تمام سیٹیں بھر چکی ہیں۔ اب مزید داخلہ کی کوئی گنجائش نہیں "

پرنسپل اتنی بے رخی برت رہا تھا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہرگز داخلہ نہیں لے گا اور اگلا جملہ طالب علم کو شاید یہ سننا پڑے گا کہ "کمرہ سے نکل جاؤ"۔ مگر طالب علم کے اصرار پر اس نے بددلی سے پوچھا "تمھارے مارکس کتنے ہیں؟" پرنسپل کا خیال تھا کہ اس کے نمبر یقیناً بہت کم ہوں گے۔ اسی لئے اس کو کہیں داخلہ نہیں ملا۔ چنانچہ طالب علم جب اپنے خراب نتیجہ کو بتائے گا تو اس کی درخواست کو رد کرنے کے لئے معقول وجہ ہاتھ آجائے گی۔ مگر طالب علم کا جواب اس کی امید کے خلاف تھا۔ اس نے کہا جناب ۸۵ فی صد :

Sir, eighty five per cent

اس جملہ نے پرنسپل پر جادو کا کام کیا۔ فوراً اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے کہا "بیٹھو بیٹھو" اس کے بعد اس نے طالب علم کے کاغذات دیکھے اور جب کاغذات نے تصدیق کر دی کہ واقعی وہ پچاسی فی صد نمبروں سے پاس ہوا ہے تو اسی وقت اس نے پچھلی تاریخ میں درخواست لکھوائی۔ اس نے ایم اے خان کو نہ صرف تاخیر کے باوجود اپنے کالج میں داخل کر لیا بلکہ کوشش کر کے ان کو ایک وظیفہ بھی دلوایا۔

یہی طالب علم اگر اس حالت میں پرنسپل کے پاس جاتا کہ وہ تھرڈ کلاس پاس ہوتا اور پرنسپل اس کا داخلہ نہ لیتا تو طالب علم کا تاثر کیا ہوتا۔ وہ اس طرح لوٹتا کہ اس کے دل میں نفرت اور شکایت بھری ہوتی۔ وہ لوگوں سے کہتا کہ یہ سب تعصب کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ میرا داخلہ ضرور ہونا چاہئے تھا۔ داخلہ نہ ملنے کی وجہ اس کا خراب نتیجہ ہوتا مگر اس کا ذمہ دار وہ ہندو کالج کو قرار دیتا۔ ماحول کا ردعمل اکثر خود ہماری حالت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر ہم اس کو ماحول کی طرف منسوب کر دیتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کر سکیں۔

اگر آدمی نے خود اپنی طرف سے کوتاہی نہ کی ہو، اگر زندگی میں وہ ان تیاریوں کے ساتھ داخل ہوا ہو جو زمانہ نے مقرر کی ہیں تو دنیا اس کو جگہ دینے پر مجبور ہوگی۔ وہ ہر ماحول میں اپنا مقام پیدا کرے گا، وہ ہر بازار سے اپنی پوری قیمت وصول کرے گا۔ مزید یہ کہ ایسی حالت میں اس کے اندر اعلیٰ اخلاقیات کی پرورش ہوگی۔ وہ اپنے

تجربات سے جرأت، اعتماد، عالی حوصلگی، شرافت، دوسروں کا اعتراف، حقیقت پسندی، ہر ایک سے صحیح انسانی تعلق کا سبق سیکھے گا۔ وہ شکایت کی نفسیات سے بلند ہو کر سوچے گا۔ ماحول اس کو تسلیم کرے گا۔ اس لئے وہ خود بھی ماحول کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے برعکس اگر اس نے اپنے کو اہل ثابت کرنے میں کوتاہی کی ہو۔ اگر وہ وقت کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ اگر وہ کم تر لیاقت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوا ہو تو لازماً وہ دنیا کے اندر اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہے گا۔ اور اس کے نتیجہ میں اس کے اندر جو اخلاقیات پیدا ہوں گی وہ بلاشبہ پست اخلاقیات ہوں گی۔ وہ شکایت، جھنجلاہٹ، غصہ، حتیٰ کہ مجرمانہ ذہنیت کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جب آدمی ناکام ہوتا ہے تو اس کے اندر غلط قسم کی نفسیات ابھرتی ہیں۔ اگرچہ آدمی کی ناکامی کی وجہ ہمیشہ اپنی کمزوری ہوتی ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرائے۔ وہ ہمیشہ اپنی ناکامیوں کے لئے دوسروں کو مجرم ٹھہراتا ہے۔ وہ صورت حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ کمتر تیاری آدمی کو بیک وقت دو قسم کے نقصانات کا تحفہ دیتی ہے ـــــ اپنے لئے بے جا طور پر ناکامی اور دوسروں کے بارے میں بے جا طور پر شکایت۔

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ البتہ وہ اس آدمی کے لئے نرم ہو جاتا ہے جو اس کو توڑنے کا اوزار رکھتا ہو۔ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوئے ہوں تو آپ اپنی واقعی حیثیت سے بھی زیادہ حق اپنے لئے وصول کر سکتے ہیں۔ "وقت" گزرنے کے بعد بھی ایک اجنبی کالج میں آپ کا داخلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کو اپنا واقعی حق بھی نہیں مل سکتا۔

گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لئے جگہ حاصل کرتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف سے اپنا راستہ بنالیتا ہے۔ درخت سطح کے اوپر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ جو غیر انسانی دنیا میں خدا نے اپنے براہ راست انتظام کے تحت قائم کر رکھا ہے وہی انسان کو بھی اپنے حالات کے اعتبار سے اختیار کرنا ہے۔

ہر آدمی جو دنیا میں اپنے آپ کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہو اس کو سب سے پہلے اپنے اندر کامیابی کا استحقاق پیدا کرنا چاہئے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو جانے اور پھر اپنے حالات کو سمجھے۔ اپنی قوتوں کو صحیح ڈھنگ سے منظم کرے۔ جب وہ ماحول کے اندر داخل ہو تو اس طرح داخل ہو کہ اس کے مقابلہ میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کر چکا ہو۔ اس نے حالات سے اپنی اہمیت منوانے کے لئے ضروری سامان کر لیا ہو۔ اگر یہ سب ہو جائے تو اس کے بعد آپ کے عمل کا جو دوسرا لازمی نتیجہ سامنے آئے گا وہ وہی ہوگا جس کا نام ہماری زبان میں کامیابی ہے۔ (۲۴ر نومبر ۱۹۶۷)

جب پردہ اٹھے گا

امریکی صدر رونالڈ ریگن ۳۰ مارچ ۱۹۸۱ کو پر اعتماد چہرہ کے ساتھ اپنے صدارتی محل (وھائٹ ہاؤس) سے نکلے۔ کاروں کا قافلہ ان کو لے کر واشنگٹن کے ہلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے ہوٹل کے شان دار ہال میں ایک تقریر کی۔ تحسین و آفریں کی فضا میں ان کی تقریر ختم ہوئی۔ وہ آدمیوں کے ہجوم میں ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ باہر آئے۔ وہ اپنی گولی پروف لیموشین (کار) سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر تھے کہ اچانک باہر کھڑے ہوئے مجمع کی طرف سے گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک نوجوان جان ہنکلے نے دو سکنڈ کے اندر چھ فائر کئے۔ ایک گولی مسٹر ریگن کے سینہ پر لگی۔ وہ خون میں لت پت ہو گئے اور فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ اچانک گولی لگنے کے بعد صدر امریکہ کا جو حال ہوا وہ اے پی کا رپورٹر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

Mr Reagan appeared stunned. The smile faded from his lips

مسٹر ریگن جیسے سن ہو گئے۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی (ٹائمس آف انڈیا ۳۱ مارچ ۱۹۸۱) یہ واقعہ اس صورت حال کی ایک تصویر ہے جو موت کے "حملہ" کے وقت اچانک آدمی پر طاری ہوگی۔

آدمی موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد سمجھ رہا ہے۔ وہ نڈر ہو کر جو چاہے بولتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ مال ہاتھ آگیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے اقتدار کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے اس کا اقتدار کبھی چھننے والا نہیں۔ ہر آدمی پر اعتماد چہرہ لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی ہنستے ہوئے اپنی "لیموشین" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اچانک پردہ اٹھتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو موجودہ دنیا سے نکال کر اگلی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

یہ ہر آدمی کی زندگی کا ایک انتہائی بھیانک لمحہ ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو آدمی اپنے اندازہ کے بالکل خلاف صورت حال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ محض دھوکا تھا جس کو اس نے سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیا تھا ——— میں نے اپنے کو آزاد سمجھا تھا مگر میں تو بالکل بے اختیار نکلا۔ میں اپنے کو مال و جائداد والا پا رہا تھا مگر میں تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے پاس طاقت ہے۔ مگر میں تو خدا کی اس دنیا میں مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ بے زور تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں مگر یہاں تو میرا کوئی ایک بھی نہیں۔

آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔

مذہب کی اہمیت

کہا جاتا ہے کہ جدید تہذیب نے مذہب کو فرسودہ اور غیر ضروری ثابت کر دیا ہے۔

وہ کیا چیز ہے جو مغربی تہذیب نے انسانیت کو دی ہے۔ وہ ہیں جدید طرز کی سواریاں۔ نئے طرز کے مکانات، نئے قسم کے ذرائع مواصلات۔ نئے قسم کے لباس۔ مختصر یہ کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے نئے ساز و سامان جو پچھلے سامانوں کے مقابلہ میں زیادہ آرام دہ، زیادہ خوش نما اور زیادہ سریع العمل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کے سامانوں کا خدا اور مذہب پر عقیدہ رکھنے یا نہ رکھنے کے مسئلہ سے کیا تعلق

کیا کسی کے پاس جدید طرز کی رہائش گاہ اور موٹر کار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے خدا کا وجود بے معنی ہو گیا۔ کیا تار اور ٹیلی فون کے ذریعہ خبر رسانی سے وحی والہام کے عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے۔ کیا ہوائی جہاز اور راکٹ کے ذریعہ فضا میں اڑنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا اس کائنات میں کہیں وجود نہیں ہے۔ کیا لذیذ کھانے، خوش نما لباس اور اعلیٰ فرنیچر کے وجود میں آنے کے بعد جنت و دوزخ کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیا جدید عورتوں کے اندر یہ صلاحیت کہ وہ ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر اپنی انگلیاں تیزی سے چلا سکتی ہیں یہ ثابت کرتا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی آیت منسوخ ہو گئی۔ کیا اسمبلی اور پارلیمنٹ کی شاندار عمارتوں میں بیٹھ کر کچھ لوگوں کا قانون سازی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ شریعت کا قانون بے معنی ہو گیا ہے۔

نئے ساز و سامان اور نئے ذرائع و وسائل کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کا مذہب کی صداقتوں کی تائید یا تردید سے کیا تعلق ہے۔

مذہب کا تعلق قدروں (Values) سے ہے نہ کہ تمدنی مظاہر سے۔ تمدنی مظاہر بدلتے رہتے ہیں، مگر زندگی کی قدروں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جدید طرز کی تیز رفتار سواریوں نے قدیم طرز کی سست رفتار گاڑیوں کو فرسودہ قرار دے دیا ہے۔ مگر اس مسئلہ کی اہمیت بدستور اپنی جگہ قائم ہے کہ آدمی سواریوں کو بنانے اور استعمال کرنے میں کن اخلاقی اصولوں کا لحاظ کرے۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے قدیم طرز کے پیغام رسانی کے طریقوں کو بے فائدہ ثابت کر دیا ہے۔ مگر اس سوال کی اہمیت میں اب بھی کوئی فرق نہیں ہوا کہ ان مواصلات کو جھوٹ کی اشاعت کے لئے استعمال کیا جائے یا سچ کی اشاعت کے لئے۔

پارلیمنٹ کے ممبران خواہ پیدل چل کر پارلیمنٹ ہاؤس پہنچیں یا ہوائی جہازوں پر اڑ کر آئیں، اس اصول کی اہمیت بدستور باقی رہے گی کہ ان کی قانون سازی کا کام اسی خدائی قانون کی مطابقت میں ہونا چاہئے جس پر ساری کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ عدالت کے دفاتر خواہ چھپر میں ہوں یا کسی عالی شان عمارت میں، یہ معیار یکساں طور پر باقی رہے گا کہ عدالتوں کو اس طرح کام کرنا چاہئے کہ کوئی شخص اپنا جائز حق لینے سے محروم نہ رہے اور نہ کوئی شخص اپنے جرم کی سزا پانے سے۔

زبان جنت بھی ہے اور جہنم بھی

عن ابی هریرة رضی اللہ عنه عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال : انّ العبدَ لیتکلّم بالکلمةِ من رضوانِ اللہ تعالیٰ ما یُلقی لہا بالاً یرفعه اللہ بہا درجاتٍ ، وانّ العبدَ لیتکلّم بالکلمةِ من سَخَطِ اللہ تعالی لا یُلقی لہا بالاً یہوی بہا فی جہنم (بخاری، کتاب الرقاق)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بندہ اللہ کی رضا کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے اللہ اس کے درجات بہت بلند کر دیتا ہے۔ اسی طرح بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔

ایک معاملہ میں دو قسم کے کلام کی ایک مثال وہ ہے جو غزوہ بنی مصطلق (۶ھ) کے موقع پر پیش آئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ ایک اتفاقی سبب سے وہ قافلہ سے بچھڑ گئیں اور بعد کو صفوان بن معطل کے ساتھ مدینہ آئیں۔ اس طرح کے واقعات قدیم صحرائی زندگی میں غیر معمولی نہ تھے۔ مگر اس سادہ سے واقعہ کو عبداللہ بن ابی نے، جو رسول اللہ کو بدنام کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتا تھا، غلط رنگ دیا اور حضرت عائشہ کو صفوان کے ساتھ ملوث کر کے آپ کی عزت و عصمت پر حملے کئے۔ قرآن میں ہے کہ اس کی وجہ سے عبداللہ بن ابی عذاب عظیم کا مستحق ہو گیا (نور ۱۱)

اس واقعہ کی بے ضرر توجیہہ بھی ہو سکتی تھی۔ مگر اس نے اس واقعہ سے افک (جھوٹ) کی غذا لی۔ اس نے کہا: "عائشہ رض کا قافلہ سے بچھڑنا اور پھر ایک غیر مرد کے اونٹ میں بیٹھ کر واپس آنا محض اتفاقیہ نہیں ہو سکتا،" اس قسم کی کوئی بات جو کسی پاک دامن خاتون کے کردار کو مشتبہ کرے اللہ کی نظر میں جرم عظیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا ایک جملہ بھی آدمی کو جہنم میں گرا دینے کے لئے کافی ہے۔

ایسے مواقع پر صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس سے ظن خیر کی غذا لے۔ وہ اپنی آبرو پر دوسرے کی آبرو کو قیاس کرے۔ اس کی ایک مثال حضرت ابوایوب (خالد بن زید انصاری) کا واقعہ ہے۔ جب یہ قصہ پھیلا تو ان کی بیوی نے کہا: اے ابوایوب، کیا آپ نے نہیں سنا کہ عائشہ کے بارے میں لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب، کیا تم ایسا کرو گی۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم نہیں، میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ ابوایوب انصاری نے کہا: پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے بہتر ہیں (ان ابا ایوب قالت له امرأته ام ایوب۔ یا ابا ایوب، الا تسمع ما یقول الناس فی عائشة۔ قال بلی وذلک الکذب۔ اکنت یا امّ ایوب

فاعلة - قالت لا واللہ ماکنت لافعلہ - قال فعائشۃ واللہ خیر منک، سیرت ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۳۴۷)

قرآن میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

لولا اذ سمعتموہ ظن المومنون والمومنات بانفسہم خیرا وقالوا ھذا افک مبین (نور ۱۲)

ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے لوگوں کی بابت اچھا گمان کیا ہوتا اور کہتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان ہے۔

جب کسی کے متعلق کوئی بات سامنے آئے تو ہمیشہ اس کو اچھے مفہوم میں لینے کی کوشش کرنا چاہئے۔ انسانی زندگی کا معاملہ ایک بے حد پیچیدہ معاملہ ہے۔ کسی انسانی واقعہ کو بخوبی طور پر سمجھنے کے لئے بہت سی چیزوں کے بارے میں قطعی معلومات ضروری ہیں جو عام طور پر ایک آدمی کو حاصل نہیں ہوتیں۔ کسی انسانی واقعہ کے بہت سے اجزاء ہوتے ہیں۔ ایک ہی واقعہ کو ناکافی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کچھ نظر آتا ہے اور کافی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کچھ۔ بیشتر حالات میں کسی شخص کے سامنے واقعہ کے تمام اجزاء نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد رائے قائم کرنے والا اکثر غلط رائے قائم کرتا ہے۔ پھر کوئی آدمی کیوں غیر ضروری طور پر اپنے کو آزمائش میں ڈالے۔ وہ کیوں ایسی بات کہے جس کو وہ سچائی کی عدالت میں صحیح ثابت نہ کر سکتا ہو۔

اسلامی معاشرہ خدا سے ڈرنے والوں کا معاشرہ ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں ہر آدمی کی زبان پر اللہ کے ڈر کی لگام لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہوں وہ دوسرے کے بارے میں کبھی بدخواہی کا کلمہ نہیں کہہ سکتے۔ جو آدمی اس پر یقین رکھتا ہو کہ بالآخر سارے معاملات خدا کے یہاں پیش ہونے والے ہیں وہ دوسرے کے بارے میں کوئی بات زبان سے نکالتے ہوئے فوراً یہ سوچتا ہے کہ میری بات اگر خدا کے یہاں بے دلیل ٹھہرے تو میں کیا کروں گا۔ ایسا آدمی دوسروں کے ساتھ کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ جو اس کو خدا کے یہاں بے قیمت کر دینے والا ہو۔ کسی آدمی کے ساتھ برا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے اس آدمی کے ساتھ خود خدا کھڑا ہوا ہو۔

خدا سے ڈرنے والا آدمی نہ صرف یہ کہ دوسرے کے خلاف کوئی بات کہنے میں بے حد محتاط ہوتا ہے بلکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص ایک مسلمان کو بے آبرو کر رہا ہے تو وہ اس مسلمان کی طرف سے مدافعت کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ مظلوم کے حق میں غیر جانب دار نہیں رہتا بلکہ وہ اس کا طرف دار بن جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے بھائی کی عزت و آبرو کا محافظ سمجھتا ہے۔ وہ جب کسی کو دیکھتا ہے کہ وہ دوسرے کی بے آبروئی کر رہا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے ــــــ ھذا افک مبین

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ نوح نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے بڑوں نے کہا کہ ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو۔ نوح نے کہا کہ اے میری قوم، مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے۔ بلکہ میں بھیجا ہوا ہوں سارے عالم کے پروردگار کا۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں۔ اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تم کو اس پر تعجب ہوا کہ تمھارے رب کی نصیحت تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم بچو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ پس انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے نوح کو بچا لیا اور ان لوگوں کو بھی جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے ان لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ بے شک وہ لوگ اندھے تھے ۶۴ - ۵۹

حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک تمام اولاد آدم توحید پر قائم تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ اس کے بعد لوگوں نے اپنے اکابر اسلاف کی شکلیں بنانا شروع کیں تاکہ ان کے احوال و عبادات کی یاد تازہ رہے۔ ان بزرگوں کے نام وُد، سواع، یغوث، یعوق، نسر تھے۔ دھیرے دھیرے ان بزرگوں نے ان کے درمیان معبود کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہ لوگ قدیم عراق میں آباد تھے۔ جب بگاڑ اس نوبت کو پہنچا تو اللہ نے ان کی اصلاح کے لئے حضرت نوح کو پیغمبر بنا کر ان کی طرف بھیجا۔ مگر انھوں نے حضرت نوح کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ تقویٰ کی روش اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اس انکار کی وجہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ایک آدمی جو دیکھنے میں انھیں جیسا ہے وہ خدا کی طرف سے خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے چنا گیا ہے۔ وہ اپنے کو جن اکابر کے دین پر سمجھتے تھے ان کے مقابلہ میں حضرت نوح ان کو بہت معمولی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ ان قدیم اکابر کی عظمت صدیوں کی تاریخ سے مسلّم ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلہ میں حضرت نوح ایک معاصر شخص تھے۔ ان کے نام کے ساتھ تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ قوم نے آپ کا انکار کر دیا۔ انھوں نے وقت کے پیغمبر کو احمق اور گمراہ کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق آپ اکابر کے دین سے منحرف ہو گئے تھے۔ حضرت نوح کی خیر خواہی، ان کے ساتھ دلائل کا زور، ان کا راہ حق پر قائم ہونا، کوئی بھی چیز قوم کو متاثر نہ کر سکی۔

حضرت نوح کی طرف سے اتمام حجت کے بعد قوم غرق کر دی گئی۔ اس غرقابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔ انھوں نے چاہا کہ "معمولی شخصیت" کے بجائے کسی "مسلّمہ شخصیت" کے ذریعہ انھیں خدا کا پیغام پہنچایا جائے۔ مگر خدا کی نظر میں یہ اندھاپن تھا۔ خدا نے آدمی کو بصیرت اس لئے دی ہے کہ وہ "نشانی" کے روپ میں حق کو پہچان لے نہ کہ حسی مظاہرہ کی صورت میں۔ جو لوگ نشانی کے روپ میں حق کو نہ پہچانیں وہ خدا کی نظر میں آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے خدا کی رحمت میں کوئی حصہ نہیں۔

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ انھوں نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ سو کیا تم ڈرتے نہیں۔ اس کی قوم کے بڑے جو انکار کر رہے تھے بولے، ہم تو تم کو بے عقلی میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم کو گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ ہود نے کہا کہ اے میری قوم، مجھے کچھ بے عقلی نہیں۔ بلکہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمھارا خیر خواہ اور امین ہوں۔ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ تمھارے رب کی نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے۔ اور یاد کرو جب کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ بھی زیادہ دیا۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۶۹-۶۵

حضرت نوح کی کشتی میں جو اہل ایمان بچے تھے ان میں آپ کے پوتے اِرَم کی اولاد سے ایک نسل چلی۔ وہ قدیم یمن میں آباد تھے اور عاد کہلاتے تھے۔ یہ لوگ ابتداءً حضرت نوح کے دین پر تھے۔ بعد کو جب ان میں بگاڑ پیدا ہوا تو اللہ نے حضرت ہود کو ان کے اوپر اپنا پیغمبر مقرر کیا۔ مگر قوم کے سرداروں کو آپ کے اندر وہ عظمت نظر نہ آئی جو ان کے خیال کے مطابق خدا کے پیغمبر کے اندر ہونا چاہئے تھی۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ شخص یا تو احمق ہے یا پھر وہ جھوٹا دعوی کر رہا ہے۔

"میں تمھارا ناصح اور امین ہوں" پیغمبر کی زبان سے یہ فقرہ بتاتا ہے کہ داعی اور مدعو کا رشتہ قومی حریف یا سیاسی مدمقابل جیسا رشتہ نہیں ہے۔ یہ خیر خواہی اور امانت داری کا رشتہ ہے۔ داعی کو ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے دل میں مدعو کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ مدعو کی طرف سے خواہ کیسا ہی ناخوش گوار رویہ سامنے آئے مگر داعی آخر وقت تک مدعو کا خیر خواہ بنا رہے۔ پھر جو پیغام وہ دے رہا ہے اس کو دیتے ہوئے اس کے اندر یہ احساس نہ ہو کہ یہ میری کوئی اپنی چیز ہے جو میں دوسروں کو عطا کر رہا ہوں۔ بلکہ یہ جذبہ ہو کہ یہ خود دوسروں کی چیز ہے۔ یہ دوسروں کے لئے خدا کی امانت ہے جو میں ان کو پہنچا کر بری الذمہ ہو رہا ہوں۔

پیغمبروں کی دعوت کی بنیاد ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ انسان کے اوپر خدا کی نعمتیں یاد دلائیں اور اس کو اس بات سے ڈرائیں کہ اگر وہ خدا کا شکر گزار بن کر نہ رہا تو وہ خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔ قومی جھگڑوں اور مادی مسائل کو پیغمبر کبھی اپنی دعوت کا عنوان نہیں بناتے۔ وہ آخری حد تک اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اور مدعو کے درمیان اصل دعوت کے سوا کوئی چیز بحث کی بنیاد نہ بننے پائے، قوم ان کو صرف توحید اور آخرت کے داعی کے روپ میں دیکھے نہ کہ کسی اور روپ میں۔

"خدا کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کا استحقاق اس کے لئے ہے جس نے دنیا میں خدا کی نعمتوں کا اعتراف کیا ہو۔ جنت خدا کے منعم و محسن ہونے کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ اس لئے آخرت کی جنت کو وہی پائے گا جس نے دنیا میں خدا کے منعم و محسن ہونے کی حیثیت کو پالیا ہو۔ یہی معرفت جنت کی اصل قیمت ہے۔

ہود کی قوم نے کہا، کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ پس تم جس عذاب کی دھمکی ہم کو دیتے ہو اس کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ ہود نے کہا تم پر تمہارے رب کی طرف سے ناپاکی اور غصہ واقع ہو چکا ہے۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ جن کی خدا نے کوئی سند نہیں اتاری۔ پس انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پھر ہم نے بچا لیا اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور ماننے نہ تھے ۷۰-۷۲

انسان ناموں کے ذریعہ کسی چیز کا تصور قائم کرتا ہے۔ کسی شخص کے ساتھ اچھا لفظ لگ جائے تو وہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور اگر برا لفظ لگ جائے تو برا دکھائی دینے لگتا ہے۔ خدا کے سوا دوسری چیزیں یا ہستیاں جو آدمی کی توجہات کا مرکز بنتی ہیں اس کی وجہ بھی یہی نام ہوتے ہیں۔ لوگ کسی شخصیت کو غوث پاک، گنج بخش، غریب نواز، مشکل کشا جیسے الفاظ سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ الفاظ دھیرے دھیرے ان شخصیتوں کے ساتھ ایسا وابستہ ہو جاتے ہیں کہ لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ جس کو غوث (فریاد رس) کہا جاتا ہے وہ واقعی فریاد کو پہنچنے والا ہے اور جس کو مشکل کشا کے نام سے پکارا جاتا ہے سچ مچ وہ مشکلوں کو حل کرنے والا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نام صرف انسانوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ ان ناموں کا کوئی مسمی کہیں موجود نہیں۔ ان کے حق میں نہ کوئی شرعی دلیل ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل۔

ناموں کی شریعت کی ایک قسم وہ ہے جو جاہل انسانوں کے درمیان رائج ہے۔ تاہم اس کی ایک زیادہ مہذب صورت بھی ہے جو پڑھے لوگوں کے درمیان مقبول ہے۔ یہاں بھی کچھ شخصیتوں کے ساتھ کچھ غیر معمولی الفاظ وابستہ کر دئے جاتے ہیں۔ مثلاً قدسی صفات، محبوب خدا، ستون اسلام، نجات دہندۂ ملت وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ دھیرے دھیرے مذکورہ شخصیتوں کے نام کا جزء بن جاتے ہیں۔ لوگ ان شخصیتوں کو ویسا ہی غیر معمولی سمجھ لیتے ہیں جیسا کہ ان کو دئے ہوئے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔

جو چیز "باپ دادا" سے چلی آرہی ہو، بالفاظ دیگر جس نے تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہو اور طویل روایات کے نتیجہ میں جس کے ساتھ ماضی کا تقدس شامل ہو گیا ہو وہ لوگوں کی نظر میں ہمیشہ عظیم ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں "آج" کے داعی کی بات ہلکی دکھائی دیتی ہے۔ وہ حال کے داعی کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کو اعتماد ہوتا ہے کہ وہ اسلاف کی عظمتوں کے وارث ہیں پھر کون ان کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

خدا کے معاملہ میں ڈھٹائی آدمی کو دھیرے دھیرے بے حس بنا دیتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ وہ نصیحت اور یاد دہانی کی زبان میں کوئی اصلاح قبول کر سکے۔ ایسے لوگ گویا اس بات کے منتظر ہیں کہ خدا عذاب کی زبان میں ان کے سامنے ظاہر ہو

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ انھوں نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک کھلا ہوا نشان آگیا ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے۔ پس اس کو چھوڑ دو کہ وہ کھائے اللہ کی زمین میں۔ اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچانا ورنہ تم کو ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ اور یاد کرو جب کہ خدا نے عاد کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں ٹھکانا دیا، تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو ۷۴ - ۷۳

قوم عاد کی تباہی کے بعد اس کے صالح افراد عرب کے شمال مغرب میں حجر کے علاقہ میں آباد ہوئے۔ ان کی نسل بڑھی اور انھوں نے زراعت اور تعمیرات میں بڑی ترقیاں کیں۔ انھوں نے میدانوں میں محل بنائے اور پہاڑوں کو تراش کر ان کو بڑے بڑے حجری مکانات کی صورت دے دی۔ بعد کو ان میں وہ خرابیاں پیدا ہوگئیں جو مادی ترقی اور دنیوی خوش حالی کے ساتھ قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ عیش پرستی، آخرت فراموشی، حدود اللہ سے بے پروائی، اللہ کی بڑائی کو بھول کر اپنی بڑائی قائم کرنا۔ اس وقت اللہ نے حضرت صالح کو کھڑا کیا تاکہ وہ ان کو اللہ کی پکڑ سے ڈرائیں۔ مگر انھوں نے نصیحت قبول نہ کی۔ وہ اپنے فساد کو صلاح میں بدلنے پر راضی نہ ہوئے۔ جس کائنات میں تمام چیزیں خدا کی تابع بن کر رہ رہی ہیں وہاں انھوں نے خدا کا سرکش بن کر رہنا چاہا۔ جہاں ہر چیز اپنی حد کے اندر اپنا عمل کرتی ہے وہاں انھوں نے اپنی حد سے تجاوز کرکے زندہ رہنا چاہا۔ یہ ایک اصلاح یافتہ دنیا میں فساد پھیلانا تھا۔ چنانچہ ان کو دنیا میں بسنے کے نااہل قرار دے دیا گیا۔

قوم ثمود کو جانچنے کے لئے خدا نے ایک اونٹنی مقرر کی اور کہا کہ اس کو تکلیف نہ پہنچانا ورنہ ہلاک کر دیے جاؤ گے۔ خدا کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان کے لئے ایک خوفناک شیر مقرر کر دے۔ مگر خدا نے شیر کے بجائے اونٹنی کو مقرر فرمایا۔ اس کا راز یہ ہے کہ آدمی کی خدا ترسی کا امتحان ہمیشہ "اونٹنی" کی سطح پر لیا جاتا ہے نہ کہ "شیر" کی سطح پر۔ سماج میں ہمیشہ کچھ ناقۃ اللہ (خدا کی اونٹنی) جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ کم زور افراد ہیں جن کے ساتھ وہ مادی زور نہیں ہوتا جو لوگوں کو ان کے خلاف کارروائی کرنے سے روکے۔ جن کے ساتھ حسن سلوک کا محرک صرف اخلاقی احساس ہوتا ہے نہ کہ کوئی ڈر۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جن کی سطح پر لوگوں کی خدا پرستی جانچی جا رہی ہے۔ یہی وہ افراد ہیں جن کے ذریعہ کسی کو جنت کا سرٹیفکٹ دیا جا رہا ہے اور کسی کو جہنم کا۔

ثمود نے فن تعمیر میں کمال پیدا کیا۔ متعلقہ علوم مثلاً ریاضی، ہندسہ، انجینیرنگ میں بھی یقیناً انھوں نے ضروری دستگاہ حاصل کی ہوگی ورنہ یہ ترقیات ممکن نہ ہوتیں۔ مگر ان کو جس بات کا مجرم ٹھہرایا گیا وہ ان کی مادی ترقیاں نہیں تھیں بلکہ زمین میں فساد پھیلانا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جائز حدود میں ترقی کرنے سے خدا نہیں روکتا۔ البتہ زندگی کے معاملات میں آدمی کو اس نظام اصلاح کا پابند رہنا چاہیے جو خدا نے پوری کائنات میں قائم کر رکھا ہے۔

ان کی قوم کے بڑے جنھوں نے گھمنڈ کیا، ان مومنین سے بولے جو ناتوان گنے جاتے تھے، کیا تم کو یقین ہے کہ صالح اپنے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو جو وہ لے کر آئے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔ پھر انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے پھر گئے۔ اور انھوں نے کہا، اے صالح اگر تم پیغمبر ہو تو وہ عذاب ہم پر لے آؤ جس سے تم ہم کو ڈراتے تھے۔ پھر انھیں زلزلہ نے آپکڑا اور وہ اپنے گھر میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ اے میری قوم، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے

۷۵ — ۷۹

پیغمبر جب آتا ہے تو اپنے زمانہ میں وہ ایک متنازعہ شخصیت ہوتا ہے نہ کہ ثابت شدہ شخصیت۔ مزید یہ کہ اس کے ساتھ دنیا کی رونقیں جمع نہیں ہوتیں، وہ دنیا کی گدیوں میں سے کسی گدی پر بیٹھا ہوا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ پیغمبر کے معاصر ہوتے ہیں وہ پیغمبر کے پیغمبر ہونے کو سمجھ نہیں پاتے اور اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ وہ شخص جس کو ہم صرف ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے جانتے ہیں وہی وہ شخص ہے جس کو خدا نے اپنے پیغام کی پیغام رسانی کے لئے چنا ہے۔

"ہم صالح کے پیغام (بما ارسل بہ) پر ایمان لائے ہیں"، حضرت صالح کے ساتھیوں کا یہ جواب بتاتا ہے کہ ان میں اور دوسروں میں کیا فرق تھا۔ منکرین نے حضرت صالح کی شخصیت کو دیکھا اور مومنین نے آپ کے اصل پیغام کو۔ منکروں کو حضرت صالح کی شخصیت میں ظاہری عظمت دکھائی نہ دی، انھوں نے آپ کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے برعکس مومنین نے حضرت صالح کے پیغام میں حق کے دلائل اور سچائی کی جھلکیاں دیکھ لیں، وہ فوراً ان کے ساتھی بن گئے۔ سچائی ہمیشہ دلائل کے زور پر ظاہر ہوتی ہے نہ کہ دنیوی عظمتوں کے زور پر۔ جو لوگ دلائل کے روپ میں حق کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ فوراً اس کو پا لیتے ہیں۔ اور جو لوگ ظاہری بڑائیوں میں اٹکے ہوئے ہوں وہ مشتبہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں کبھی حق کا ساتھ دینے کی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔

حضرت صالح کی اونٹنی کو مارنے والا اگرچہ قوم کا ایک سرکش آدمی تھا۔ مگر یہاں اس کو پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا "ان لوگوں نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی گروہ کا ایک شخص برا عمل کرے اور دوسرے لوگ اس کے برے فعل پر راضی رہیں۔ تو سب کے سب اس مجرمانہ فعل میں شریک قرار دے دئے جاتے ہیں۔

جو قوم خواہش پرستی کا شکار ہو اس کو حقیقت پسندی کی باتیں اپیل نہیں کرتیں۔ وہ ایسے شخص کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی جو اس کو سنجیدہ عمل کی طرف بلاتا ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ خوش نما الفاظ بولیں اور جھوٹی امیدوں کی تجارت کریں۔ ان کے گرد بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ سچے خیر خواہ کے لئے اس کے اندر کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ ان لوگوں کی طرف وہ تیزی سے دوڑ پڑتی ہے جو اس کا استحصال کرنے کے لئے اٹھے ہوں۔

اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم کھلی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھیں اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔ پھر ہم نے بچا لیا لوط کو اور اس کے گھر والوں کو، اس کی بیوی کے سوا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی۔ اور ہم نے ان پر بارش برسائی پتھروں کی، پھر دیکھو کہ کیسا انجام ہوا مجرموں کا ۸۴ — ۸۰

حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ وہ جس قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے وہ دریائے اردن کے کنارے جنوبی شام کے علاقہ میں آباد تھی۔ اس قوم کی خوش حالی اس کو عیش پرستی کی طرف لے گئی۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کی بے راہ روی اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے ہم جنسی کے طریقے کو اختیار کرلیا۔ پیغمبر نے ان کو اس کھلی ہوئی بے حیائی سے ڈرایا۔

کائنات کے لئے فطرت کی ایک اسکیم ہے۔ اس اسکیم کو قرآن میں اصلاح کہا گیا ہے۔ اس اصلاح کے خلاف چلنے کا نام فساد ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں اسی اصلاحی راستہ پر چل رہی ہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو اپنی آزادی کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے اور فطرت کے راستہ کے خلاف اپنا راستہ بناتا ہے۔ حضرت لوط کی قوم اسی قسم کے ایک فساد میں مبتلا تھی۔ جنسی تعلق کا فطری طریقہ یہ ہے کہ عورت مرد باہم بیوی اور شوہر بن کر رہیں۔ یہ اصلاح کے طریقہ پر چلنا ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ ہو کہ مرد مرد یا عورت عورت کے درمیان جنسی تعلقات قائم کئے جانے لگیں تو یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے گزر جانا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں فساد کہا گیا ہے۔

حضرت لوط پر صرف ان کے قریبی لوگوں میں سے چند افراد ایمان لائے۔ باقی پوری قوم اپنی ہوس پرستی میں غرق رہی۔ انھوں نے کہا "جب یہ ہم سب لوگوں کو گندہ سمجھتے ہیں اور خود پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام۔ پھر تو یہ نکل جائیں ہمارے شہر سے" ان کا یہ قول دراصل گھمنڈ کا قول تھا۔ ان کو یہ کہنے کی جرأت اس لئے ہوئی کہ وہ اپنی اکثریت اور مادی تفوق کی وجہ سے اپنے کو محفوظ حالت میں سمجھتے تھے۔ گھمنڈ کی نفسیات میں مبتلا لوگ ہمیشہ اپنے کمزور پڑوسیوں سے کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہمارا طریقہ پسند نہیں وہ ہماری زمین کو چھوڑ دیں۔ مگر یہ خدا کی دنیا میں شرک کرنا ہے اور شرک سب سے بڑا جرم ہے۔

حضرت لوط کی قوم پر خدا کا عذاب آیا تو عذاب کا شکار ہونے والوں میں پیغمبر کی بیوی بھی شامل تھیں۔ اس سے انعام اور سزا کے باب میں خدا کا بے لاگ انصاف ظاہر ہوتا ہے۔ خدا کے انصاف کے ترازو میں رشتوں اور دوستیوں کا کوئی لحاظ نہیں۔ خدا کا فیصلہ اتنا بے لاگ ہے کہ اس نے حضرت نوح کے بیٹے، حضرت ابراہیم کے باپ، حضرت لوط کی بیوی اور حضرت محمدؐ کے چچا کو بھی معاف نہیں کیا۔ اور دوسری طرف فرعون کی بیوی نے صالح عمل کا ثبوت دیا تو اس کو جنت میں داخل کردیا۔

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل پہنچ چکی ہے۔ پس ناپ اور تول پوری کرو۔ اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں۔ اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور راستوں پر مت بیٹھو کہ ڈراؤ اور اللہ کی راہ سے ان لوگوں کو روکو جو اس پر ایمان لا چکے ہیں اور اس راہ میں کجی تلاش کرو۔ اور یاد کرو جب کہ تم بہت تھوڑے تھے پھر تم کو بڑھا دیا۔ اور دیکھو فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔ اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس پر ایمان لایا ہے جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۸۵ - ۸۷

حضرت ابراہیم کے ایک صاحب زادہ مدیان تھے جو آپ کی تیسری بیوی قطورہ سے پیدا ہوئے۔ اہل مدین انھیں کی نسل سے تھے۔ یہ قوم بحر احمر کے عرب ساحل پر آباد تھی۔ یہ لوگ خدا کو ماننے والے تھے اور اپنے کو دین ابراہیمی کا حامل سمجھتے تھے۔ مگر حضرت ابراہیم کے پانچ سو سال بعد ان کے اندر بگاڑ آگیا۔ یہ ایک تجارت پیشہ قوم تھی اور اس کے بگاڑ کا سب سے زیادہ اظہار اسی پہلو سے ہوا۔ وہ ناپ تول اور لین دین میں دیانت داری کے اصولوں پر پوری طرح قائم نہیں رہے۔

دوسرے سے معاملہ کرنے میں بے انصافی خدا کے قائم کردہ نظام اصلاح کے خلاف ہے۔ خدا نے اپنی دنیا کا نظام کامل انصاف پر قائم کیا ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو لیتے وقت دوسرے سے زیادہ لے اور دیتے وقت دوسرے کو کم دے۔ یہاں ہر چیز حسابی صحت کی حد تک انصاف کے اصول پر قائم ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو بھی وہی کرنا چاہئے جو اس کے گرد و پیش کی ساری کائنات کر رہی ہے۔ ایسا نہ کرنا خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرنا ہے۔

اہل مدین کا معاملاتی بگاڑ جب بہت بڑھ گیا تو خدا نے حضرت شعیب کو ان کی طرف اپنا پیغام لے کر بھیجا۔ آپ نے ان کو بتایا کہ معاملات میں راستی اور دیانت داری کا طریقہ اختیار کرو۔ آپ نے کھلے کھلے دلائل کے ذریعہ ان کو آخری حد تک باخبر کر دیا۔ مگر وہ نصیحت قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ ان کا حال یہ ہوا کہ خود حضرت شعیب کی دعوت کو مٹانے پر تل گئے۔ وہ آپ کی باتوں میں طرح طرح کے شوشے نکال کر لوگوں کو آپ کے بارے میں غلط فہمی میں ڈالتے۔ وہ جارحانہ کارروائیوں کے ذریعہ کوشش کرتے کہ لوگ آپ کا ساتھ نہ دیں۔ بالآخر ان پر خدائی عذاب آیا اور وہ تباہ کر دئے گئے۔ بندوں کے حقوق کی رعایت اور باہمی معاملات کی درستگی خدا کی نظر میں اتنی زیادہ اہم ہے کہ اس کی مخالفت پر ایک قوم، ایمان کی دعوے دار ہونے کے باوجود تباہ کر دی گئی۔ خدا بہتر فیصلہ کرنے والا ہے اور بہتر فیصلہ جانب داری کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ خدا بے کلمہ والوں کو ان کی بے انصافی پر پکڑے اور کلمہ والوں کو ٹھیک اسی بے انصافی پر چھوڑ دے۔

قوم کے بڑے جو متکبر تھے انھوں نے کہا کہ اے شعیب ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آجاؤ۔ شعیب نے کہا، کیا ہم بیزار ہوں تب بھی۔ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر ہم تمھاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دی۔ اور ہم سے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارا رب ہر چیز کو اپنے علم سے گھیرے ہوئے ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور ان بڑوں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے انکار کیا تھا کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو تم برباد ہو جاؤ گے۔ پھر ان کو زلزلہ نے پکڑ لیا۔ پس وہ اپنے گھر میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا گویا وہ کبھی اس بستی میں بسے ہی نہ تھے، جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی گھاٹے میں رہے۔ اس وقت شعیب ان سے منہ موڑ کر چلا اور کہا، اے میری قوم میں تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا چکا اور تمھاری خیر خواہی کر چکا۔ اب میں کیا افسوس کروں منکروں پر ۸۸ - ۹۳

حضرت شعیب کی قوم خدا کے انکار کی مجرم نہ تھی بلکہ خدا پر افترا کرنے کی مجرم تھی۔ یعنی اس نے خدا کی طرف ایک ایسے دین کو منسوب کر رکھا تھا جس کو خدا نے ان کے لئے اتارا نہ تھا۔ یہی تمام انبیاء کی قوموں کا حال رہا ہے۔ انبیاء کی قومیں سب وہی تھیں جن پر اس سے پہلے خدا نے اپنا دین اتارا تھا مگر بعد کو انھوں نے خود ساختہ تبدیلیوں اور اضافوں کے ذریعہ اس کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ انھوں نے خدا کے دین کو اپنی خواہشات کا دین بنا ڈالا اور اسی کو خدا کا دین کہنے لگے۔

وقت کے قائم شدہ دین میں جن لوگوں کو عزت اور بڑائی کا مقام ملا ہوا تھا انھوں نے محسوس کیا کہ دلیل کے اعتبار سے ان کے پاس پیغمبر کی باتوں کا توڑ نہیں ہے۔ تاہم اقتدار کے ذرائع سب انھیں کے پاس تھے۔ انھوں نے دلیل کے میدان میں اپنے کو لاجواب پاکر یہ چاہا کہ زور و قوت کے ذریعہ وہ پیغمبر کو خاموش کر دیں۔ انھوں نے پیغمبر کے ساتھیوں کو اس نازک صورت حال کی یاد دلائی کہ وقت کے نظام میں زندگی کے تمام سرے انھیں لوگوں کے پاس ہیں جن کو وہ باطل ٹھہرا رہے ہیں۔ یہ باطل لوگ اگر ان کے خلاف متحرک ہو جائیں تو اس کے بعد وہ زندگی کے ذرائع کہاں پائیں گے۔ مگر وہ بھول گئے کہ خدا ان سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اور خدا جس کے خلاف ہو جائے اس کے لئے کہیں جائے پناہ نہیں۔

کسی شخص کے لئے صرف اس وقت تک چھوٹ ہے جب تک اس پر امر حق واضح نہ ہوا ہو۔ امر حق جب بخوبی طور پر واضح ہو جائے اور اس کے بعد بھی آدمی سرکشی کرے تو وہ ہمدردی کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ اسی بنیاد پر دنیا میں بھی کسی مجرم کے لئے سزا ہے اور اسی بنیاد پر آخرت میں بھی لوگوں کے لئے ان کے جرم کے مطابق سزا کا فیصلہ ہوگا۔

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا، اس کے باشندوں کو ہم نے سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ گڑگڑائیں۔ پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا یہاں تک کہ انھیں خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ تکلیف اور خوشی تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچتی رہی ہے۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا گمان بھی نہ رکھتے تھے۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی نعمتیں کھول دیتے۔ مگر انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو پکڑ لیا ان کے اعمال کے بدلے۔ پھر کیا بستی والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آپڑے جب کہ وہ سوتے ہوں۔ یا کیا بستی والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہمارا عذاب آپہنچے ان پر دن چڑھے جب وہ کھیلتے ہوں۔ کیا یہ لوگ اللہ کی تدبیروں سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ پس اللہ کی تدبیروں سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہوں ۹۴ - ۹۹

حدیث میں آیا ہے کہ مومن پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور منافق کی مثال گدھے کی طرح ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے مالک نے کس لئے اس کو باندھا اور کیوں اس کو چھوڑ دیا (لا یزال البلاء بالمومن حتیٰ یخرج نقیا من ذنوبہ والمنافق مثلہ کمثل الحمار لا یدری فیم ربطہ اھلہ ولا فیم ارسلوہ، تفسیر ابن کثیر)

خدا انسان کے اوپر مختلف قسم کی تکلیفیں ڈالتا ہے تاکہ اس کا دل نرم ہو۔ خدا کے سوا دوسری چیزوں پر اس کا اعتماد ٹوٹ جائے، اس کا وہ گھمنڈ جاتا رہے جو آدمی کے لئے اپنے سے باہر کسی سچائی کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس طرح خدائی انتظام کے تحت آدمی کے اندر کمی اور بے چارگی کی نفسیات پیدا کی جاتی ہے تاکہ وہ حق کی آواز پر کان لگائے۔ خدا کا یہ معاملہ عام لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور پیغمبر کے مخاطب گروہ کے ساتھ بھی۔ تاہم یہ معاملہ سنت الٰہی کے تحت التباس و اشتباہ کے پردہ میں ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آفت آتی ہے تو وہ اسباب و علل کے روپ میں آتی ہے۔ یہ صورت حال بہت سے لوگوں کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ تو ایک ہونے والی بات تھی جو ہوئی۔ پھر جب وہ مصیبتوں سے اثر نہیں لیتے تو خدا ان کے حالات بدل کر ان کو خوش حالی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اب اس قسم کے لوگ اور بھی زیادہ مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ محض حوادث روزگار کی بات تھی۔ یہ تو عام اتار چڑھاؤ تھا جو ہمیشہ لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہم کو برے دن کے بعد اچھے دن دیکھنے کو ملے۔ وہ پہلی تنبیہ سے بھی سبق لینے سے محروم رہتے ہیں اور دوسری تنبیہ سے بھی۔

سرکشی کے بعد کسی کو ترقی ملنا سخت خطرناک ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا نے اس کو ایسی حالت میں پکڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے جب کہ وہ اپنے پکڑے جانے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بے خوف ہو چکا ہو۔

ایمان اور تقویٰ کی زندگی کا فائدہ اگرچہ اصلاً آخرت میں ملنے والا ہے۔ تاہم خدا اگر چاہتا ہے تو دنیا میں بھی وہ ایسے لوگوں کو فراخی اور عزت کی صورت میں ان کے عمل کا ابتدائی انعام دے دیتا ہے۔

کیا سبق نہیں ملا ان کو جو زمین کے وارث ہوئے ہیں اس کے اگلے باشندوں کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو پکڑ لیں ان کے گناہوں پر۔ اور ہم نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے پس وہ نہیں سمجھتے۔ یہ وہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ہمارے رسول نشانیاں لے کر آئے تو ہرگز نہ ہوا کہ وہ ایمان لائیں اس بات پر جس کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اس طرح اللہ منکرین کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ اور ہم نے ان کے اکثر لوگوں میں عہد کا نباہ نہ پایا اور ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان پایا ۱۰۲ــ۱۰۰

زمین پر بار بار یہ واقعہ ہوتا ہے کہ ایک قوم کو یہاں عزت اور خوش حالی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس پر زوال آتا ہے۔ وہ میدان سے ہٹا دی جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم عزت اور خوش حالی کے تمام مقامات پر قابض ہو جاتی ہے۔

یہ واقعہ خدا کی ایک نشانی ہے۔ وہ آدمی کو خدا کی یاد دلانے والا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ملنے یا نہ ملنے کے سرے کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ خدا نے انسان کو دیکھنے اور سمجھنے کی جو طاقت دی ہے اس کو کام میں لا کر وہ بآسانی اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ جان سکتا ہے کہ اصل سرچشمہ اگر کسی اور کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو جو گروہ ایک بار غالب آجاتا وہ کبھی دوسرے کو اوپر آنے نہ دیتا۔ آدمی اگر اس قسم کا سبق لے تو قوموں کے عروج و زوال میں اس کو ربانی غذا ملے گی۔ مگر جب بھی ایک قوم پیچھے ہٹتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم اوپر آتی ہے تو اس کے افراد اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ پچھلی قوم کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ صرف پچھلی قوم کے لئے تھا، ہمارے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

خدا نے آنکھ اور کان اور عقل کی صلاحیت انسان کو اس لئے دی ہے کہ وہ اس سے سبق لے، وہ ان کے ذریعہ خدا کے اشارات کو سمجھے۔ مگر جب آدمی اپنی ان صلاحیتوں سے وہ کام نہیں لیتا جو اس کو لینا چاہئے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ خدا کے قانون کے تحت اس کے دل کی حساسیت مردہ ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ان معاملات میں اس کے جذبات کند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے دل و دماغ پر بے حسی کی مہر لگ جاتی ہے۔ اب اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ دیکھنے کے باوجود نہ دیکھے اور سننے کے باوجود نہ سنے۔ وہ عقل رکھتے ہوئے بھی باتوں کو نہ سمجھے۔ وہ انسان ہوتے ہوئے بے انسان بن جائے۔

انسانیت کا آغاز حضرت آدم کے مومنین سے ہوا۔ اس کے بعد جب بگاڑ ہوا تو یاددہانی کے لئے خدا کے پیغمبر آئے۔ اب یہ ہوا کہ پیغمبر کے ذریعہ اصلاح قبول کرنے والے افراد کو بچا کر ان لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا جنھوں نے اصلاح قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ مگر بعد کی نسلیں دوبارہ اپنے پیغمبر کے ہاتھ پر کئے ہوئے عہد اسلام کو بھلا بیٹھیں اور دوبارہ وہی انجام پیش آیا جو پہلی بار مومنین آدم کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ صورت بار بار پیش آتی رہی حتی کہ نسل انسانی کی اکثریت کے لئے تاریخ نافرمانی اور عہد شکنی کی تاریخ بن گئی۔

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس۔ مگر انھوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا۔ پس دیکھو کہ مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔ اور موسیٰ نے کہا اے فرعون، میں پروردگار عالم کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ سزاوار ہوں کہ اللہ کے نام پر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں۔ میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں۔ پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔ فرعون نے کہا، اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ تب موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو یکایک وہ ایک صاف اژدہا بن گیا۔ اور اس نے اپنا ہاتھ نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ تم کو تمھاری زمین سے نکال دے۔ اب تمھاری کیا صلاح ہے۔ انھوں نے کہا، موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو مہلت دو اور شہروں میں ہرکارے بھیجو کہ وہ تمھارے پاس سارے ماہر جادوگر لے آئیں ۱۱۲ – ۱۰۳

پیغمبر کا خطاب اولاً ان لوگوں سے ہوتا ہے جو وقت کے سردار ہوں، جن کو ماحول میں فکری قیادت حاصل ہو۔ یہ لوگ اپنی برتر ذہنی صلاحیت کی وجہ سے سب سے زیادہ اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ سچائی کے پیغام کو اس کی گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے پیغمبرانہ دعوت کے ساتھ ہمیشہ "ظلم" کا سلوک کیا۔ یعنی اپنی ذہانت کو اس کے لئے استعمال کیا کہ حق کے پیغام کو ٹیڑھے معنی پہنائیں۔ مثلاً ایک نشانی جو یہ ثابت کر رہی ہو کہ وہ خدا کے زور پر ظاہر ہوئی ہے اس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ یہ جادو کے زور پر دکھائی گئی ہے۔ یا تحریک کو بدنام کرنے کے لئے اس کو سیاسی معنی پہنانا اور یہ کہنا کہ یہ لوگ محض اپنے اقتدار کے لئے اٹھے ہیں۔ عوام چونکہ باتوں کا تجزیہ نہیں کر پاتے اس لئے اس قسم کی باتیں ان کو حق سے مشتبہ کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ مگر داعیٔ حق کے خلاف ایسے شوشے نکالنا بہت بڑا جرم ہے۔ اس طرح وقت کے بڑے اپنی قیادت کا تحفظ تو ضرور کر لیتے ہیں مگر یہ تحفظ ان کو صرف اس قیمت پر ملتا ہے کہ ان کی آخرت ہمیشہ کے لئے غیر محفوظ ہو جائے۔

خدا کامل حق پر ہے۔ اس لئے جو شخص خدا کی طرف سے اٹھے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ حق وانصاف کے سوا کوئی دوسرا کلمہ اپنی زبان سے نکالے۔ اگر وہ حق کے سوا کوئی بات بولے تو وہ خدا کی نمائندگی کے استحقاق کو کھودے گا اور خدا کے یہاں انعام کے بجائے سزا کا مستحق ہو جائے گا۔

حضرت موسیٰ بیک وقت بنی اسرائیل کی طرف بھی مبعوث تھے اور فرعون اور اس کی قبطی قوم کی طرف بھی۔ بنی اسرائیل میں اگرچہ اس وقت بہت سی کمزوریاں آچکی تھیں۔ تاہم بنیادی طور پر انھوں نے حضرت موسیٰ کا ساتھ دیا۔ اس کے برعکس فرعون اور اس کی قوم نے (چند افراد کو چھوڑ کر) آپ کا انکار کیا۔ بالآخر چالیس سالہ تبلیغ کے بعد آپ نے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے باہر جانے دے تاکہ وہ بیابان کی کھلی فضا میں جا کر ایک خدا کی عبادت کر سکیں (خروج ۱۰) حضرت موسیٰ اگرچہ سچائی کے نمائندہ تھے۔ مگر فرعون نے اس کو جادو کا معاملہ سمجھا اور جادوگروں کے ذریعہ آپ کو زیر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور جادوگر فرعون کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا، ہم کو انعام تو ضرور ملے گا اگر ہم غالب رہے۔ فرعون نے کہا، ہاں اور یقیناً تم ہمارے مقربین میں داخل ہوگے۔ جادوگروں نے کہا، یا تو تم ڈالو یا ہم ڈالنے والے بنتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا۔ تم ہی ڈالو۔ پھر جب انھوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان پر دہشت طاری کر دی اور بہت بڑا کرتب دکھایا، اور ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ اپنا عصا ڈال دو۔ تو اچانک وہ نگلنے لگا اس کو جو انھوں نے گھڑا تھا۔ پس حق ظاہر ہوگیا اور جو کچھ انھوں نے بنایا تھا باطل ہو کر رہ گیا۔ پس وہ لوگ وہیں ہار گئے اور ذلیل ہو کر رہے۔ اور جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔ انھوں نے کہا، ہم ایمان لائے رب العالمین پر جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا　　۱۲۲ — ۱۱۳

کسی ماحول میں جس چیز کی اہمیت لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی ہو اسی نسبت سے ان کے پیغمبر کو معجزہ دیا جاتا ہے۔ قدیم مصر میں جادو کا بہت زور تھا اس لئے حضرت موسیٰ کو اسی نوعیت کا معجزہ دیا گیا۔

فرعون کے طے کردہ پروگرام کے مطابق مصریوں کے قومی تیوہار (یوم الزینہ) کے موقع پر ان کے تمام بڑے بڑے جادوگر جمع ہوئے۔ جادوگروں نے کہا کہ پہلے ہم اپنا کرتب سامنے لائیں یا تم جو کچھ دکھانا چاہتے ہو دکھاؤ گے۔ حضرت موسیٰ نے کہا پہلے تم اپنا کرتب سامنے لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے دشمن کے خلاف اقدام کرنے میں کبھی پہل نہیں کرتا۔ وہ آخر وقت تک دشمن کو موقع دیتا ہے کہ وہ خود پہل کرے۔ فریق مخالف جب اس طرح پہل کی ذمہ داری اپنے اوپر لے چکا ہوتا ہے اس وقت پیغمبر اپنی پوری قوت کو استعمال کرکے اسے زیر کر دیتا ہے۔ نظریاتی دعوت کے معاملہ میں پیغمبر کا طریقہ اقدام کا ہوتا ہے اور عملی ٹکراؤ کے معاملہ میں دفاع کا۔

مصر میں حضرت موسیٰ کی دعوت تقریباً چالیس سال تک جاری رہی ہے۔ جادوگروں سے مقابلہ کا واقعہ اس کے آخری زمانہ کا ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جادوگر حضرت موسیٰ کی دعوت سے آشنا رہے ہوں گے۔ تاہم ابھی تک ان کی آنکھ کا پردہ نہیں ہٹا تھا۔ جب انھوں نے اپنے مخصوص فن کے میدان میں حضرت موسیٰ کی برتری دیکھی تو حجابات اٹھ گئے۔ ان کو نظر آگیا کہ یہ جادوگری کا معاملہ نہیں بلکہ خدائی پیغمبری کا معاملہ ہے۔ وہ بے اختیار ہو کر خدا کے سامنے گر پڑے۔

جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو خیال بندی کی وجہ سے وہ لوگوں کو چلتا پھرتا سانپ نظر آنے لگیں۔ مگر جب حضرت موسیٰ کا عصا سانپ بن کر میدان میں گھوما تو جادوگروں کی ہر لاٹھی اور رسی صرف لاٹھی اور رسی ہو کر رہ گئی۔ جادوگر جادو کے حدود کو جانتے تھے — اس واقعہ میں جادوگروں کو نظر آگیا کہ انسانی تدبیریں اپنے آخری کمال پر پہنچ کر بھی کتنی حقیر ہیں اور خدا کتنا عظیم اور کتنا زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کے بعد فرعون ان کو اپنے تمام اقتدار کے باوجود بے وقعت نظر آنے لگا۔ وہی جادوگر جو خدا کی عظمت کو دیکھنے سے پہلے فرعون سے انعام کے طالب تھے اب انھوں نے فرعون کی طرف سے بدترین سزاؤں کی دھمکی کو بھی اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

فرعون نے کہا، تم لوگ موسیٰ پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں۔ یقیناً یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے شہر میں اس غرض سے کی ہے کہ تم اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو، تو تم بہت جلد جان لوگے۔ میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ انھوں نے کہا، ہم کو اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ تو ہم کو صرف اس بات کی سزا دینا چاہتا ہے کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے۔ اے رب، ہم پر صبر انڈیل دے اور ہم کو وفات دے اسلام پر۔ ۱۲۳ـ۱۲۶

حق کے لئے جان قربان کرنا حق کے حق ہونے کی آخری گواہی دینا ہے۔ جادوگروں کو خدا کی مدد سے اسی کی توفیق حاصل ہوئی۔ جادوگروں نے اپنے آپ کو سخت ترین سزا کے لئے پیش کرکے یہ ثابت کردیا کہ ان کا حضرت موسیٰ پر ایمان لانا کوئی حیلہ اور سازش کا معاملہ نہیں، یہ سچے اعتراف حق کا معاملہ ہے۔ مگر جادوگروں کا سب سے بڑا عمل فرعون کی متکبرانہ نفسیات کے لئے سب سے بڑا تازیانہ تھا۔ انھوں نے فرعون کے مقابلہ میں موسیٰ کا ساتھ دے کر فرعون کو ساری قوم کے سامنے رسوا کردیا تھا۔ چنانچہ فرعون ان کے خلاف غصہ سے بھر گیا۔ اس نے جادوگروں کے ساتھ اسی ظالمانہ کارروائی کا فیصلہ کیا جو ہر وہ متکبر شخص کرتا ہے جس کو زمین پر کسی قسم کا اختیار حاصل ہوجائے۔ جادوگر بھی دلیل کے میدان میں ہارے اور فرعون بھی۔ مگر جادوگر اپنی شکست کا اعتراف کرکے خدا کی ابدی نعمتوں کے مستحق بن گئے اور فرعون نے اس کو اپنی عزت کا مسئلہ بنالیا۔ اس کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ اپنی جھوٹی انانیت کی تسکین کے لئے دنیا میں وہ حق پرستوں پر ظلم کرے اور آخرت میں خدا کے ابدی عذاب میں ڈال دیا جائے۔

فرعون نے موسیٰ کی دعوت قبول کرنے یا نہ کرنے کو اپنی "اجازت" کا مسئلہ سمجھا۔ اور جادوگروں نے "نشانی" کا۔ متکبر آدمی کا مزاج ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے نہ کہ دلیل اور ثبوت کو۔ ایسے لوگ کبھی حق کو قبول کرنے کی توفیق نہیں پاتے

اس نازک ترین موقع پر جادوگروں نے جو کامل استقامت دکھائی وہ سراسر خدا کی مدد سے تھی اور ان کی زبان سے جو دعا نکلی وہ بھی تمام تر الہامی دعا تھی۔ جب کوئی بندہ اپنے آپ کو ہمہ تن خدا کے حوالے کردیتا ہے تو اس وقت وہ خدا کے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ اس کو خدا کا خصوصی فیضان پہنچنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو خدا کے القا کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ وہی دعا کرتا ہے جس کے متعلق اس کا خدا پہلے ہی فیصلہ کرچکا ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے قبول کرلی گئی ہے۔

جادوگروں کا یہ کہنا کہ خدایا ہمارے اوپر صبر انڈیل دے اور ہماری موت آئے تو اسلام پر آئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ ہم نے اپنے بس بھر اپنے آپ کو تیرے حوالے کردیا ہے۔ اب جو کچھ ہمارے بس سے باہر ہے اس کے واسطے تو ہمارے لئے کافی ہوجا۔ جب بھی کوئی بندہ دین کی راہ میں دل سے یہ دعا کرتا ہے تو خدا یقیناً اس کی مشکلات میں اس کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔

تبلیغ کی طاقت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تم منکروں کی بات نہ مانو اور ان کے ساتھ جہاد کرو، بڑا جہاد (فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا، فرقان ۵۲) سورہ فرقان بالاتفاق مکی سورہ ہے۔ مکی دور میں قتال کا حکم نہیں اترا تھا بلکہ صراحتہً اس سے روکا گیا تھا (کفوا ایدیکم واقیموا الصلاۃ، نساء ۷۷) اس لئے یہاں جہاد کو لازماً غیر حربی مفہوم میں لینا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بہ کی ضمیر کا مرجع قرآن لیا ہے اور جاھدھم بہ کی تفسیر جاھدھم بالقرآن سے کی ہے (تفسیر ابن کثیر) اس تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی دعوت پیش کرنے میں پوری کوشش کرو۔ قرآن کی نظریاتی اشاعت کے ذریعہ باطل کا مقابلہ کرو۔

جہاد کا لفظ قرآن کے دوسرے مقامات پر جنگ وقتال کے لئے بھی آیا ہے۔ مگر ایسے مقامات پر صرف جہاد کا لفظ ہے۔ مگر سورہ فرقان میں جس عمل کا ذکر ہے اس کو "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں سب سے بڑا جہاد وہ نہیں ہے جو میدان جنگ میں ہتھیاروں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا جہاد وہ ہے جو قرآنی پیغام کی تبلیغ واشاعت کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔

اسلام کا اصل مقصد لوگوں سے لڑنا نہیں بلکہ لوگوں کو خدا کی رحمت کے سایہ میں لانا ہے۔ لڑائی اسلام کا ایک اتفاقی عمل ہے جب کہ دعوت اسلام کا اصلی اور دائمی عمل۔ مومن دوسروں کے حق میں حد درجہ خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا کے بندوں کو جہنم کے خطرے سے بچائے اور ان کو جنت کے راستہ پر لگائے۔ یہ کام سنجیدہ تبلیغ اور حکیمانہ نصیحت کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ لڑائی بھڑائی کے ذریعہ۔ نیز خارجی دنیا میں فتح کی اصل جڑ بھی دلوں کی فتح ہے۔ لوگوں کے دلوں پر قبضہ حاصل ہو جائے تو گویا ان کی ساری چیز قبضہ میں آگئی۔ تلوار کے ذریعہ حاصل کی ہوئی فتح عارضی اور جزئی ہوتی ہے اور دل کی راہ سے حاصل کی ہوئی فتح مستقل اور مکمل ہوتی ہے۔ اگر آپ نے جنگ کا میدان جیتا تو آپ نے صرف ایک "میدان" جیتا۔ لیکن اگر آپ نے دلوں کو جیت لیا تو آپ نے پوری قوم اور اس کے سارے اثاثہ کو جیت لیا۔

جو چیز حکمت سے حاصل ہو سکتی ہے اس کو جبر سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا صرف یہ خطرہ مول لینا ہے کہ وہ کبھی حاصل نہ ہو۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں حساب کتاب کا نظام قائم ہوا تو دفاتر کے لئے وہی اجنبی زبانیں اختیار کر لی گئیں جو پہلے سے مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں۔ مثلاً ایران کے لئے فارسی، شام کے لئے سریانی، مصر کے لئے قبطی۔ اگر اول دن سے عربی زبان پر اصرار کیا جاتا تو غیر ضروری قسم کے لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے جو کبھی ختم نہ ہوتے۔ مگر مقامی زبانیں اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور عربیت کی اشاعت

پُرامن عمل اپنی فطری رفتار سے جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر یہ تمام علاقے عرب علاقے بن گئے اور سب کی زبان عربی زبان ہوگئی۔

اسلام کی اصل طاقت تلوار نہیں، اسلام کی اصل طاقت تبلیغ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں ماسٹر راسنگھ (۱۹۶۷ — ۱۸۸۵) کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے:

جب کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ حضرت محمد صاحب نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا تھا تو مجھے اس شخص کی ناسمجھی پر ہنسی آتی ہے۔ اس اعتراض کرنے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس اعتراض سے تو وہ محمد صاحب کو غیبی طاقت کا مالک تسلیم کر رہا ہے۔ اگر ایک تنہا محمدؐ دنیا کے مقابلہ میں تلوار سے کامیاب ہوتا ہے تو یقیناً یہ ایک معجزہ ہے۔ اپنی سچائی اور ایمان داری کی مدد سے کامیابی حاصل کرنا اتنا بڑا معجزہ نہیں جتنا کہ تلوار کے زور سے مذہب پھیلانے میں کامیابی حاصل کرنا۔

فرض کیا جائے کہ محمد نے پہلا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا مسلمان تلوار کے زور سے ہی بنایا تھا تو یہ اشخاص جبراً مسلمان کئے جانے کی وجہ سے محمد صاحب کے دشمن ہو گئے ہوں گے۔ ایک ایک کو تو تلوار کے زور سے محمد صاحب مسلمان کر سکتے تھے۔ لیکن جب وہ تین چار اکٹھے ہوئے تھے تو انھوں نے کیوں محمد صاحب سے بدلہ نہ لیا۔ اگر اس بات کا جواب یہ دیا جائے کہ وہ مسلمان تو تلوار کے زور سے ہی ہوئے تھے لیکن بعد میں وہ محمد صاحب پر صدق دل سے ایمان لے آئے تھے، تو یہ ایک فضول سی بات ہے جسے کوئی ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ جس پر جبر کیا جائے وہی بعد میں دوست بن جائے۔ ایسی بھدی دلیل کے یہ معنی ہیں کہ کوئی ایک شخص جو جسمانی طور پر دوسروں سے طاقت ور ہے ایک ایک کو فتح کرنے کے بعد اپنا مذہب پھیلا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی مہمل دلیل ہے کہ اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں نے بعض موقعوں پر مذہب کی مدد کے لئے تلوار کا استعمال ضرور کیا تھا۔ لیکن اس بات کی ذمہ داری حضرت محمد صاحب پر نہیں آسکتی۔ جو شخص مذہب کے نام پر تلوار کی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا ہے اس کا ایمان بھی کافی حد تک مضبوط ہوتا ہے۔ یقین کی پختگی کے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو جنگ کے خطرہ میں نہیں ڈالے گا۔ اس لئے تلوار چلانے کے لئے بھی تو پہلے یقین کرنے والے مضبوط دلوں کی ضرورت ہے جو صرف وعظ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ تلوار بھی وعظ سے پیدا ہوئے یقین کے بغیر نہیں اٹھائی جا سکتی (رسول نمبر رسالہ مولوی دہلی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مصر ایک غیر مسلم ملک تھا۔ وہاں عیسائی اور مشرک قومیں بستی تھیں۔ وہاں کی زبان قبطی تھی۔ اس کے بعد مصر کو مسلمانوں نے فتح کیا۔ مصر نہ صرف سیاسی اعتبار سے فتح ہوا بلکہ سارا مصر

مسلمان ہوگیا۔ وہاں کی زبان بدل کر عربی زبان ہوگئی۔ ایسا کیوں کر ہوا۔ عام آدمی جس نے تاریخ کا گہرا مطالعہ نہ کیا ہو وہ کہہ دے گا کہ یہ تلوار کے ذریعہ ہوا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ مصر کو اور مصریوں کو جس نے فتح کیا وہ عربی تلوار نہیں تھی بلکہ عربی قرآن تھا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو غیر مسلم محققین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ سر آرتھر کیتھ ایک مشہور انگریز مورخ ہے۔ اس نے مصر کی قدیم تاریخ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے مصر میں اسلام کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مصریوں کو جس چیز نے فتح کیا وہ تلوار نہیں تھی بلکہ قرآن تھا:

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran (303)

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب دی پریچنگ آف اسلام (۱۸۹۶) خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ انھوں نے اسلام کی دعوتی تاریخ پیش کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ کس طرح اسلام اپنے نظریات کے زور سے پھیلتا رہا۔ یہاں اس کتاب کے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:

"پیغمبر محمد کے پیرو پیغمبر کی موت کے صرف ایک سو سال میں رومن ایمپائر سے بھی زیادہ بڑی سلطنت کے مالک بن چکے تھے۔ بعد کی صدیوں میں اگرچہ عظیم مسلم سلطنت کے ٹکڑے ہوگئے اور اسلام کی سیاسی طاقت کم زور پڑ گئی۔ تاہم اس کی روحانی فتوحات بغیر کسی وقفہ کے جاری رہیں:

Still its spiritual conquests went on uninterruptedly (2)

جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی عظمت کو خون کے دریا میں بہا دیا، جب ۱۲۳۶ء میں فرڈیننڈ نے مسلمانوں کو قرطبہ و غرناطہ سے نکال دیا جو اسپین میں اسلام کا آخری مرکز تھا تو عین اسی وقت اسلام نے سماترا اور ملایا میں اپنے لئے زمین حاصل کرلی۔ اپنے سیاسی تنزل کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کی ہیں:

In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests

سلجوقی ترکوں نے گیارھویں صدی عیسوی میں اور منگولوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں قومی پیمانہ پر اسلام قبول کرلیا۔ یہ دونوں کے دونوں اسلام کے فاتح تھے مگر فاتحین نے اپنے مفتوحوں کے دین کو قبول کرلیا:

in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered

بغیر کسی دنیوی اور مادی طاقت کے مسلمان مبلغین اپنے دین کو وسط افریقہ، چین اور ایسٹ انڈیز جزائر تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے:

Unaided by the temporal power, Muslim missionaries have carried their faith into Central Africa, China and the East Indies Islads (2)

خدا کی خاطر بے اختیار ہونے والے

اس دنیا میں سارا اختیار صرف خدا کا ہے، اس کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ مگر امتحان کی غرض سے خدا نے انسان کو آزادی دے دی ہے۔ ایک مکمل طور پر بے اختیار دنیا میں انسان کو مکمل طور پر اختیار دیا گیا ہے اور اب خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اختیار کو پاکر کیا کرتا ہے۔ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرکے اللہ کے آگے جھک جاتا ہے یا ظاہری اختیار کی وجہ سے دھوکے میں پڑکر سرکشی کرتا ہے۔

جنت ان لوگوں کے لئے ہے جو اختیار رکھتے ہوئے اللہ کی خاطر اپنے کو بے اختیار کرلیں۔ جو بے خوفی کا موقع ہوتے ہوئے اللہ سے ڈریں۔ بظاہر خود سب کچھ ہوتے ہوئے اللہ کو اپنا سب کچھ بنالیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اسباب کے پردہ میں رزق دیا گیا مگر اس کو انھوں نے براہ راست اللہ کی طرف سے آیا ہوا رزق سمجھا۔ ان کو اللہ نے ظلم کی قدرت دی مگر انھوں نے اللہ کے خوف سے اپنے ہاتھوں کو ظلم کرنے سے روک لیا۔ اللہ نے ان کو غصہ، نفرت، انتقام کے مواقع دئے مگر اللہ کی خاطر انھوں نے غصہ کے موقع پر صبر کیا اور نفرت اور انتقام کے موقع پر درگزر کرنے کا طریقہ اپنایا۔ اللہ نے ان کی تعریف میں لوگوں کی زبانیں کھلوائیں مگر ان کو عجز و تواضع میں لذت ملی۔ اللہ نے ان کو دولت دی مگر دولت کو اپنے ذاتی عیش میں خرچ کرنے کے بجائے انھیں اس میں تسکین ملی کہ وہ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں لٹائیں۔ وہ اپنی مرضی پر چلنے کے بجائے اللہ کی مرضی پر چلے۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے صرف اللہ کے لئے جئے۔

جنت کی نفیس دنیا ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنایا۔ جنھوں نے پابند نہ ہوکر بھی خدائی پابندی کے رویہ کو اپنے لئے پسند کرلیا۔ جو پوری طرح آزاد ہونے کے باوجود پوری طرح خدا کے تابعدار بن گئے۔

آدمی کا امتحان

زندگی کا سارا معاملہ امتحان کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص بظاہر اچھے حالات میں ہے اور کوئی بظاہر برے حالات میں۔ مگر اس اعتبار سے دونوں یکساں ہیں کہ دونوں امتحان کے ترازو میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر آدمی کا امتحان لیا جارہا ہے۔ کسی کا امتحان ایک قسم کے حالات میں ہے اور کسی کا دوسرے قسم کے حالات میں۔

اللہ ہر آدمی کو مختلف قسم کے حالات میں ڈال کر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے حالات میں کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اسی ردعمل پر آدمی کے آخرت کے انجام کا فیصلہ ہونا ہے۔ اللہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں ایک شخص حق پر ہوتے ہوئے کمزور پڑ جائے اور دوسرا شخص ناحق پر ہوتے ہوئے مضبوط حیثیت حاصل کرلے، اب جس شخص نے دوسرے سے معاملہ کرنے میں حق کا لحاظ کیا وہ جنتی ٹھہرا اور جس شخص نے دوسرے سے معاملہ کرنے میں موقع پرستی کا طریقہ اختیار کیا وہ جہنم کا سزاوار ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پیدا کرتا ہے جس میں ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ اب جس شخص نے ایسے موقع پر تواضع کا طریقہ اختیار کیا وہ جنتی قرار پایا اور جس نے گھمنڈ کا مظاہرہ کیا وہ جہنمی بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کسی کو کمزور بناتا ہے اور کسی کو طاقت ور۔ اب جس شخص نے انصاف کے پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے اس کے مطابق لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا وہ جنت کا مستحق ٹھہرا اور جو شخص طاقت ور کے آگے جھکے اور کمزور کو ذلیل کرے وہ جہنم کا مستحق ہوگیا۔

اسی طرح آدمی کی زندگی میں روزانہ جو معاملات پیش آتے ہیں وہ اس کے لئے خدا کی طرف سے امتحان کے پرچے ہیں۔ ہر روز آدمی اپنے رویہ سے یا تو اپنے کو جنت کی طرف لے جاتا ہے یا جہنم کی طرف۔ آدمی کی زندگی میں ہر روز دو راستے کھلتے ہیں۔ آدمی ایک رخ پر جاکر اپنے کو جنت میں داخل کردیتا ہے اور دوسرے رخ پر جاکر اپنے کو جہنم میں گرا لیتا ہے۔

جانچا جا رہا ہے

موجودہ دنیا میں ارادہ کی حد تک انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ مگر واقعات برپا کرنے کا اختیار کسی کو نہیں۔ دنیا میں جتنے واقعات ہوتے ہیں سب خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور ان کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ مختلف حالات میں ڈال کر افراد کا امتحان لیا جائے۔

کوئی واقعہ اس لئے ہوتا ہے کہ ایک شخص کو صبر، انصاف اور حق پرستی کا کریڈٹ دیا جائے اور دوسرے شخص کو بے صبری، ظلم اور حق سے بے پروائی کا مجرم ٹھہرایا جائے۔ کوئی واقعہ اس لئے پیش آتا ہے کہ ایک شخص کو کسی بندۂ خدا کے خلاف سازش، بدمعاملگی اور زیادتی کا موقع دے کر اس کے جھوٹے دعویٰ اسلام کو باطل ثابت کیا جائے۔ دوسری طرف اس بندۂ خدا کی خصوصی تائید کر کے لوگوں کو بتایا جائے کہ وہ سچائی پر ہے اور اس کی مدد پر خدا کھڑا ہوا ہے۔ ایک شخص حق پر ہوتا ہے، اس کے باوجود اس کو بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دوسرا شخص ناحق پر ہوتا ہے اس کے باوجود اس کے گرد دنیا کی رونقیں جمع کر دی جاتی ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون ہے جو ظاہر سے گزر کر حق کو پا لیتا ہے اور حق کا ساتھ دینے والا قرار پاتا ہے اور کون ہے جو ظاہری چیزوں میں اٹک جاتا ہے اور اس کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ خدا کے یہاں اس کو حق کو نظر انداز کرنے والوں میں اٹھایا جائے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز امتحان کے لئے ہے۔ یہاں طاقتور ہونا بھی امتحان کے لئے ہے اور کمزور ہونا بھی امتحان کے لئے۔ یہاں کسی کو امیر بنا کر جانچا جا رہا ہے اور کسی کو غریب بنا کر۔ موجودہ دنیا میں نہ کسی کامیاب شخص کے لئے خوش ہونے کا موقع ہے اور نہ کسی ناکام شخص کے لئے غمگین ہونے کا۔ کیوں کہ دونوں یکساں طور پر امتحان کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا مختلف قسم کے واقعات برپا کر کے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے حالات میں کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اسی ردعمل پر کسی کے لئے جنت کا فیصلہ ہوتا ہے اور کسی کے لئے جہنم کا۔

کوئی دنیا کما رہا ہے کوئی آخرت

ایک آدمی وہ ہے جس کا مقصود پیسہ ہے۔ اس نے کوئی ایسا کام پکڑ لیا ہے جس سے پیسہ ملتا ہے اور اپنے پورے وقت اور اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس میں مصروف ہے۔ جب اس کی سرگرمیوں کا نتیجہ پیسہ کی صورت میں اس کی طرف لوٹتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور جب پیسہ نہ ملے تو وہ تردد میں پڑ جاتا ہے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو عزت و شہرت کا طالب ہے۔ وہ ہر اس کام کی طرف دوڑ پڑتا ہے جس میں اس کا نام اونچا ہو اور جس میں شرکت کی وجہ سے ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگے۔ اعزاز اور مقبولیت کے مقام پر کھڑا ہو کر اس کے نفس کو لذت ملتی ہے اور اگر اس کو اعزاز اور مقبولیت کے مقام پر کھڑا ہونے کا موقع نہ ملے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی دنیا کھو گئی ہے۔ تیسرا آدمی وہ ہے جو اقتدار کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کی بہترین تمنا یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے اوپر اس کا حکم چلے۔ لوگوں کی گردنیں اس کی مٹھی میں ہوں۔ لوگوں کے درمیان اس کو سب سے اوپر جگہ ملے۔ اس کے مقابلہ میں لوگ بے اختیار ہوں اور اس کو لوگوں کی قسمتوں پر اختیار حاصل ہو ـــــــ یہ تینوں آدمی وہ ہیں جنھوں نے اپنے عمل کا نتیجہ اسی دنیا میں چاہا۔ ایسے لوگ دنیا میں خواہ جتنا بھی حاصل کر لیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

اس کے بعد وہ اللہ کا بندہ ہے جو آخرت کو چاہنے والا ہے اور آخرت کی راہ میں اپنی سرگرمیوں کو لگائے ہوئے ہے۔ لوگوں کا عمل بازار میں ہوتا ہے اور اس کا عمل فطرت کی خاموش کائنات میں۔ لوگ مجمع عام میں اپنی سرگرمیاں دکھاتے ہیں اور وہ اپنی تنہائیوں میں مصروف عمل ہوتا ہے۔ لوگ دنیا کی عزت و کامیابی پا کر خوش ہوتے ہیں اور وہ اس امید میں جی رہا ہوتا ہے کہ اس کا مالک اس کو اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لے۔ بظاہر وہ اسی دنیا میں دکھائی دیتا ہے مگر اپنی سوچ اور جذبات کے اعتبار سے وہ آخرت میں جیتا ہے۔ لوگ سامنے کی دنیا میں گم ہوتے ہیں اور وہ خدا کی چھپی ہوئی کائنات میں۔

حقیقت نہ کہ صورت

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اعمال کا دارو مدار نیت پر ہے (الاعمال بالنیات) اس سے معلوم ہوا کہ دین میں جو اعمال بتائے گئے ہیں وہ محض اپنی شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں بلکہ حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ یعنی ہر عمل کی ایک روح ہے۔ کسی عمل میں اگر وہ روح پائی جائے جس کے لئے وہ عمل مقرر کیا گیا ہے تو اس عمل کی قیمت ہے اور اگر وہ روح نہ پائی جائے تو پھر اس عمل کی کوئی قیمت اللہ کے یہاں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ اعمال جن پر بڑے بڑے ثواب بتائے گئے ہیں انھیں کے بارے میں بالکل دوسرے قسم کے اقوال بھی وارد ہیں۔ مثلاً قرآن خدا کی کتاب ہے اور اس کو پڑھنا بہت ثواب ہے۔ مگر اسی کے ساتھ حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے (رُبّ تال للقرآن والقرآن یلعنہ) نماز اہم ترین عبادت ہے مگر حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ نماز نماز نہیں جس میں خشوع نہ ہو (لا صلاۃ لمن لم یتخشع) روزہ کا اجر اللہ کے یہاں بہت ہے مگر اسی کے ساتھ حدیث بتاتی ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزہ سے ان کو بھوک پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا (کم من صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع والعطش) اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بہت ثواب کی چیز ہے مگر حدیث میں ہے کہ جس نے دکھانے کے لئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا (من تصدق یرائی فقد اشرک) قربانی بہت اعلیٰ عبادت ہے مگر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کو تمھارا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے (لن ینال اللہ لحومہا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم)

اسی طرح کے نصوص اکثر اعمال کے بارے میں وارد ہیں۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تمھارے جسموں اور تمھاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے (ان اللہ تعالیٰ لا ینظر الی اجسامکم ولا الی صورکم ولکن ینظر الی قلوبکم۔ مسلم) گویا صورت اور جسم کی سطح پر جو عمل ہوتا ہے وہ اللہ کا مطلوب عمل نہیں ہے۔ اللہ کا مطلوب عمل وہ ہے جو دل کی سطح پر کیا جائے۔

اگر آپ کو کسی سے محبت ہے تو دیکھنے میں آپ ظاہری اعضاء سے اس سے محبت کرتے ہیں۔ مگر محبت کا واقعہ حقیقۃً دل کے اندر ہوتا ہے نہ کہ زبان کے الفاظ یا ہاتھ پاؤں کی حرکت کی سطح پر۔ یہی حال اسلامی اعمال کا ہے۔ خدا کے یہاں وہی عمل قیمت والا ہے جو دل سے نکلا ہو۔ جو روح کے اندر پیدا ہونے والی ہلچل کا خارجی ظہور ہو۔ جس میں آدمی کی اندرونی ہستی ڈھل گئی ہو۔ اگر آدمی کا عمل محض اوپری عمل ہو، اس کے دل کی دھڑکنیں اس میں شامل نہ ہوئی ہوں تو ایسے عمل کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

عبادت ظاہری رسموں کا نام نہیں

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز وعظ فرما رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص دھوپ میں کھڑا ہوا ہے۔ آپ نے اس کا حال پوچھا۔ بتایا گیا کہ وہ ابو اسرائیل انصاری ہیں۔ انھوں نے روزہ رکھا ہے اور یہ نذر مانی ہے کہ وہ سایہ میں نہ جائیں گے۔ بیٹھے گے نہیں بلکہ کھڑے رہیں گے۔ کسی سے بات چیت نہ کریں گے، خاموش رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: ان سے کہو کہ وہ بات چیت کریں، سایہ میں جائیں اور بیٹھیں اور اس طرح اپنے روزے کو پورا کریں (مروہ فلیتکلم ویستظل ولیقعد ولیتم صومہ، تفسیر قرطبی، بقرہ)

خدا بننے کی کوشش نہ کرو

حمدون قصار نیشاپوری (م ۲۷۱ھ) سے کسی نے پوچھا کہ بندہ کون ہے۔ انھوں نے جواب دیا: "وہ جو عبادت کرے اور یہ نہ چاہے کہ لوگ اس کی عبادت کریں"

عبادت اس طرح نہ کی جائے کہ کسی کو تکلیف ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے۔ آپ نے سنا کہ کچھ لوگ اونچی آواز سے پڑھ رہے ہیں۔ آپ نے اعتکاف کا پردہ اٹھایا اور کہا: دیکھو، تم سب خدا سے مناجات کر رہے ہو، پس ایک شخص دوسرے شخص کو ہرگز تکلیف نہ دے اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے کے اوپر آواز بلند نہ کرے (اعتکف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد فسمعهم یجهرون بالقرآن فکشف الستر فقال الا ان کلکم مناج ربہ فلا یوذین بعضکم بعضاً ولا یرفع بعضکم علی بعض فی القراءۃ، ابوداؤد)

برکت والی تقریب وہ ہے جو سادہ تقریب ہو

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جو سب سے کم بوجھ والا ہو (ان اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ، رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ظاہری چیزوں میں شدت برتنا غلط ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا: هلك المتنطعون هلك المتنطعون هلك المتنطعون (ہلاک ہو گئے شدت برتنے والے، ہلاک ہو گئے شدت برتنے والے، ہلاک ہو گئے شدت برتنے والے)

سہولت کا طریقہ اختیار کرو نہ کہ مشقت کا

ایک صحابی کا واقعہ ہے۔ وہ میدان میں تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ انھوں نے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے نماز پڑھی۔ ایک خارجی نے اس پر اعتراض کیا کہ دیکھو یہ صحابی ہیں اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ صحابی نے جواب دیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ وہ آسانی کو پسند کرتے تھے۔ اگر میں گھوڑے کو چھوڑ دیتا تو وہ بھاگ جاتا۔ میں پیدل چلنے پر قادر نہ تھا۔ مجھ کو خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑتی۔

(حدیث نماز کے وقت باگ پکڑنے کے بارے میں نہیں تھی۔ انھوں نے ایک عام حکم سے استنباط کرتے ہوئے ایسا کیا)

غیر ضروری مشقت اٹھانے کا نام نیکی نہیں

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فریٰ رجلاً قد اجتمع الناس علیہ وقد ظُلِّلَ علیہ فقال مالہ قالوا رجل صائمٌ فقال لیس البرّ ان تصوموا فی السفر
(بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے ۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص کو لوگ گھیرے ہوئے ہیں۔ اور اس پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہے۔ لوگوں نے کہا ایک روزہ دار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔

دینی قائد کو عوام کی رعایت کرنی چاہئے

نسائی نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ اس میں انھوں نے سورہ بقرہ اور سورہ نساء پڑھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: اے معاذ، کیا تم لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے والے ہو۔ کیا تمھارے لئے یہ کافی نہ تھا کہ تم سورہ طارق اور سورہ شمس جیسی سورتیں پڑھتے (روی النسائی عن جابر بن عبد اللہ قال: صلی معاذ المغرب فقرأ البقرۃ و النساء فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم افتان انت یا معاذ۔ ما کان یکفیک ان تقرأ بالسماء و الطارق والشمس وضحاھا ونحوھا)

بزرگی کا تعلق دل سے نہ کہ ظاہری اعمال سے

ابوبکر مزنی نے کہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت دوسرے صحابہ پر اس لئے نہیں تھی کہ وہ دوسروں سے زیادہ روزے رکھتے تھے یا دوسروں سے زیادہ نمازیں پڑھتے تھے۔ ان کی یہ فضیلت ایک ایسی چیز کی وجہ سے تھی جو ان کے دل میں تھی۔ ابن علیہ نے ابوبکر مزنی کے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں جو چیز تھی وہ تھی اللہ کی محبت اور اللہ کے بندوں کے لئے خیر خواہی (قال ابن علیۃ فی قول ابی بکر المزنی: ما فاق ابوبکر رضی اللہ عنہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بصوم ولا صلاۃ۔ ولکن بشئ کان فی قلبہ۔ قال: الذی کان فی قلبہ الحب للہ عز وجل والنصیحۃ فی خلقہ، جامع العلوم والحکم ۷۱)

دین میں توسع ہے، تنگی نہیں

عن غضیف بن الحارث قال دخلت علی عائشۃ فسألتہا فقلت اکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یغتسل من اول اللیل او من آخرہ قالت کل ذلک کان ربما اغتسل من اولہ وربما اغتسل من آخرہ قلت الحمد للہ الذی جعل فی الامر سعۃ
نسائی کتاب الغسل والتیمم

غضیف بن حارث رضہ کہتے ہیں۔ میں عائشہ رضہ کے یہاں گیا۔ میں نے ان سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے ابتدائی حصہ میں غسل کرتے تھے یا رات کے آخری حصہ میں۔ عائشہ رضہ نے جواب دیا سب وقتوں میں۔ آپ کبھی رات کے ابتدائی حصہ میں غسل کرتے اور کبھی رات کے آخری حصہ میں۔ میں نے کہا: شکر ہے اللہ کا جس نے دین میں وسعت رکھی۔

اللہ کا نام لے کر حق کے سوا نہ کہو

حضرت موسیٰ علیہ السلام ساڑھے تین ہزار سال پہلے مصر میں آئے۔ اس وقت بنی اسرائیل (یہود) مصر میں آباد تھے۔ مصر کی مشرک قوموں کے ساتھ رہتے رہتے بنی اسرائیل میں بھی مشرکانہ طریقے سرایت کر گئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے جاؤ اور وہاں آزادانہ ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت کرو۔ قرآن کی ساتویں سورہ (اعراف) میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ فرعون کے دربار میں گئے اور اس سے کہا کہ میں رب العالمین کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی پیغمبری کے ثبوت میں کچھ معجزے دکھائے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ معجزات دیکھنے کے بعد فرعون کے درباری مبہوت ہو گئے۔ انھوں نے کہا: یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم کو تمھاری زمین سے نکال دے (اعراف ۱۱۰)

اس آیت پر حاشیہ لکھتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک انقلابی مفسر اپنی تفسیر کی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غلام قوم کا ایک بے سروسامان آدمی یکایک اٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں جا کھڑا ہوتا ہے جو شام سے لیبیا تک اور بحر روم کے سواحل سے حبش تک کے عظیم الشان ملک کا نہ صرف مطلق العنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہوا تھا تو محض اس کے اس فعل سے اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنت مصر کا تختہ الٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمراں طبقہ سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کر دے گا۔ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا بھی کیوں ہوا جب کہ اس شخص نے صرف نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا تھا کہ یہ شخص پورے نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتا ہے جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لئے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لئے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے سامنے سیاسی و معاشی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا"

تبصرہ

سورۂ اعراف (آیت ۱۰۳ تا ۱۳۴) کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ پوری تفسیر مصنف کا اپنا ذہنی تخیل ہے۔ قرآن کی متعلقہ آیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۔ اس انقلابی تفسیر کی بنیاد تمام تر صرف فرعون کے درباریوں کے اس مختصر جملہ پر ہے کہ موسیٰ چاہتے ہیں کہ تم کو تمھارے ملک سے نکال دیں (۱۱۰) سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت خود حضرت موسیٰ کی تقریر سے معلوم ہوگی یا آنجناب کے مخالفین کی باتوں سے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ موسیٰ کی نشانیوں پر ظلم کرتے رہے (۱۰۳) ظلم کے معنی ہوتے ہیں وضع الشیٔ فی غیر محلہ۔ یعنی انھوں نے حضرت موسیٰ کی باتوں کو اس کے موقع و محل سے ہٹا کر بیان کیا اور ان کو خود ساختہ معنی پہنائے۔

۲۔ فرعون کے دربار میں جس طرح حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مصری قوم کو اس کے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں اسی طرح انھوں نے یہ بھی کہا کہ موسیٰ جادوگر ہیں (۱۰۹) وہ زمین میں فساد پیدا کرنا چاہتے ہیں (۱۲۷) مصری قوم پر جو مصیبتیں آرہی ہیں وہ موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کی وجہ سے آرہی ہیں (۱۳۱) تو کیا یہ سب باتیں بھی محض فرعون اور اس کے درباریوں کے کہنے کی وجہ سے درست مان لی جائیں گی۔

۳۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے جو مطالبہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس کی طرف سے اپنی پیغمبری کی نشانیاں لے کر آیا ہوں لہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے (۱۰۵) قرآن کی اس واضح نص کے مطابق حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ ملک مصر سے باہر چلے جانا چاہتے تھے۔ پھر جب وہ خود ہی فرعون کے ملک سے نکل رہے تھے تو فرعون کو اس کے ملک سے نکالنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوگیا۔

۴۔ فرعون کے درباریوں نے حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ مصری قوم کو اس کے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں (ان یخرجکم من ارضکم۔ ۱۱۰) اس کے بعد جب جادوگر تائب ہو کر حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تو فرعون جادوگروں کے بارے میں بھی یہی الفاظ کہتا ہے کہ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس شہر میں کی تاکہ تم اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو (لتخرجوا منہا اھلہا ۱۲۳) اب کیا اس تفسیر کے حامی یہ دعویٰ کریں گے کہ جادوگروں سے مقابلہ پیش آنے سے پہلے حضرت موسیٰ اور جادوگروں نے مل کر یہ خفیہ منصوبہ بنایا تھا کہ "مصر کے دارالسلطنت میں اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا جائے"

۵۔ قرآن کی اگلی آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے مذکورہ بات محض شرارت میں کہی تھی۔ وہ آپ کی دعوت کو سیاسی معنی پہنا کر اپنے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکا دینا چاہتے تھے جیسا کہ ہر حکمراں اپنے مخالفین کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ چنانچہ فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے جب آفتوں میں ڈالا تو اس وقت وہ اپنا شرارت کا کلمہ بھول گئے اور کہہ اٹھے: اے موسیٰ اپنے رب سے دعا کرو۔ اگر وہ ہم پر سے یہ بلائیں ٹال دے تو ہم تمھاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ مصر کے باہر بھیج دیں گے (لنومنن لک و لنرسلن معک بنی اسرائیل ۱۳۴)

سورہ اعراف کی مذکورہ آیات میں یہ تعلیم ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہی جائے (۱۰۵) مگر عجیب بات ہے کہ انھیں آیتوں کو اللہ کا نام لے کر حق کے سوا بات کہنے کا ذریعہ بنا لیا گیا۔

قــرآن فہمی

علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے سامنے قرآن کی یہ آیت پڑھی گئی:

یَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ جس دن ہم بلائیں گے تمام آدمیوں کو ان کے مقتدا کے ساتھ۔

اس آدمی نے آیت کا مطلب یہ نکالا: جس دن ہم بلائیں گے سب کو ان کی ماؤں کے ساتھ۔

امام کا لفظ جو مفرد تھا، اس کو اُمّ (ماں) کی جمع سمجھ لیا گیا۔ حالاں کہ وہ شخص اگر قواعد صرف سے واقف ہوتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ اُمّ کی جمع امام نہیں آتی۔ اسی طرح مثلاً لفظ "مسیح" دو مادوں سے مشتق ہو سکتا ہے۔ اور دونوں کے الگ الگ معنی ہیں۔ اس کا اشتقاق مسح سے ہو تو اس کے معنے چھونے اور تر ہاتھ کسی چیز پر پھیرنے کے ہوں گے۔ اور اگر مساحت سے ہو تو اس کے معنی پیمائش کے ہوں گے، وغیرہ

انہیں وجوہ سے اہل فن نے قرآن کی تفسیر کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتائی ہے:

۱۔ لغت، جس سے قرآن کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہو سکیں۔

۲۔ نحو، یعنی اعراب کا علم، کیونکہ عربی زبان میں زبر زیر کے فرق سے معنی بدل جاتے ہیں۔

۳۔ صرف، صیغوں کے اختلاف کو جاننا۔

۴۔ اشتقاق، یعنی کون لفظ کس مادہ سے بنا ہے۔

۵۔ علم معانی، جس سے کلام کی ترکیبیں معنی کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔

۶۔ علم بیان، جس سے کلام کا ظہور و خفا، تشبیہہ و کنایہ معلوم ہوتا ہے۔

۷۔ علم بدیع، جس سے کلام کی خوبیاں تعبیر کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔

۸۔ علم قرأت، کیونکہ مختلف قرأتوں کی وجہ سے مختلف معنی معلوم ہوتے ہیں۔

۹۔ علم عقائد، تاکہ یہ معلوم ہو کہ کہاں ظاہر معنی مراد ہیں اور کہاں تاویل کی ضرورت ہے۔

۱۰۔ اصول فقہ، جس سے وجوہ استدلال و استنباط معلوم ہوتے ہیں۔

۱۱۔ اسباب نزول، کیونکہ شان نزول جاننے سے آیت کے معنی زیادہ واضح ہوتے ہیں۔

۱۲۔ علم ناسخ و منسوخ، تاکہ منسوخ شدہ احکام معمول بہا سے ممتاز ہو سکیں۔

۱۳۔ علم فقہ، کیونکہ جزئیات کے احاطہ سے کلیات پہچانے جاتے ہیں۔

۱۴۔ روایات، یعنی وہ تفسیری روایات جو قرآن کی بعض آیات کی تفسیر کرتی ہیں۔

۱۵۔ علم وہبی، وہ علم خاص جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

بعض لوگوں نے قرآن فہمی کے لئے اس سے کم یا اس سے زیادہ علوم بھی بیان کئے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام

غیر ضروری شرائط ہیں۔ ان کا غیر متعلق ہونا اس سے واضح ہے کہ ان میں سے اکثر علم وہ ہیں جن سے صحابہ بالکل ناواقف تھے، وہ بعد کے دور میں بنائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک ایمان، دوسرے عربی زبان۔ اگر آدمی کو فی الواقع ایمانی شعور حاصل ہو اور وہ عربی زبان سے بخوبی واقف ہو تو یقیناً اللہ کی مدد سے وہ کلام الٰہی کو سمجھ لے گا واضح ہو کہ ایمان میں ایمان بالرسالت اور احادیث سے کما حقہ آشنا ہونا بھی لازماً شامل ہے۔

ایمان محض کلمہ کے الفاظ کو دہرانا نہیں ہے۔ ایمان دراصل فطرۃ اللہ کو پالینے کا نام ہے، وہ فطرت جس پر سارے انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ایمان، مجمل شعور کے طور پر، آدمی کو خالق اور مخلوق کے تمام رموز سے آشنا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ عربی زبان جانتا ہو اور قرآن کو پڑھے تو وہ اپنے آپ کو ملہم کے مقام پر کھڑا ہوا پاتا ہے۔ اس کو محسوس ہونے لگتا ہے گویا کہ خدا براہ راست اس سے مخاطب ہو گیا ہے۔ اس مقام کو پہنچنے کے بعد انسانی ساخت کے دوسرے علوم قرآن اور بندہ کے درمیان ایک قسم کی رکاوٹ بن جاتے ہیں، کجا کہ وہ قرآن کے معانی کو آدمی کے اوپر کھولنے کا ذریعہ بنیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور جب میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو بتا دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ پس انھیں چاہئے کہ میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ شاید کہ وہ راہ راست پالیں (بقرہ ۱۸۶) یہ خدا جو ہر وقت ہمارے پاس ہوتا ہے یہی قرآن کا مصنف بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا طالب علم ہر وقت اس کے مصنف سے اپنی مشکلات کے بارے میں پوچھ سکتا ہے۔ یہ قرآن کی ایک ایسی انوکھی صفت ہے جو کسی بھی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔

امام ابن تیمیہ ایک انتہائی متبحر عالم تھے۔ ان کا معمول تھا کہ جب قرآن کی کسی آیت کا مضمون ان پر نہ کھلتا تو وہ کسی سنسان مسجد میں چلے جاتے۔ وہاں وضو کر کے نماز پڑھتے اور سجدہ میں گر کر دعا کرتے: یا معلّمَ ابراھیم علمنی (اے ابراہیمؑ کو بتانے والے مجھے بھی بتا دے) اس طرح کے واقعات دوسرے علماء کے بارے میں بھی مختلف شکلوں میں کتابوں میں آئے ہیں۔

کسی کتاب کو سمجھنے کی سب سے اہم شرط یہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا مزاج مصنف کے مزاج سے مل جائے۔ مزاج میں جتنی زیادہ دوری ہوگی، کتاب کو سمجھنے میں اتنی ہی مشکل پیش آئے گی۔ یہی معاملہ قرآن کا بھی ہے۔ قرآن سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ آدمی اس حد تک اپنے کو خالص کرے کہ اس کا فکر خداوندی فکر سے ہم آہنگ ہو جائے۔ یہ ہم آہنگی آدمی کو جتنا زیادہ حاصل ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ خدا کی کتاب کو سمجھنے میں کامیاب ہوگا۔ قرآن کو پانے والا وہ ہے جو خود خدا کو پالے۔ خدا کو پائے بغیر کوئی شخص قرآن کو نہیں پا سکتا۔ جو شخص اپنے آپ کو خدا میں ملا دیتا ہے خدا اس کا معلم بن جاتا ہے جس سے وہ سوال کرے اور اپنے سوال کا جواب پائے۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

۱۔	الاسلام		از مولانا وحید الدین خاں		۱۵ —۰
۲۔	مذہب اور جدید چیلنج	..	//	..	۱۵ —۰
۳۔	ظہور اسلام	..	//	..	۱۵ —۰
۴۔	دین کیا ہے	..	//	..	۲/ —۰
۵۔	قرآن کا مطلوب انسان	..	//	..	۵ —۰
۶۔	تجدید دین	..	//	..	۳ —۰
۷۔	اسلام دین فطرت	..	//	..	۳ —۰
۸۔	تعمیر ملت	..	//	..	۲ —۰
۹۔	تاریخ کا سبق	..	//	..	۳ —۰
۱۰۔	مذہب اور سائنس	..	//	..	۵ —۰
۱۱۔	عقلیات اسلام	..	//	..	۳ —۰
۱۲۔	فسادات کا مسئلہ	..	//	..	۲ —۰
۱۳۔	انسان اپنے کو پہچان	..	//	..	۱ —۰
۱۴۔	تعارف اسلام	..	//	..	۲ —۵۰
۱۵۔	اسلام پندرھویں صدی میں	..	//	..	۲ —۰
۱۶۔	راہیں بند نہیں	..	//	..	۳ —۰
۱۷۔	دینی تعلیم	..	//	..	۳ —۰
۱۸۔	ایمانی طاقت	..	//	..	(زیر طبع)
۱۹۔	اتحاد ملت	..	//	..	
۲۰۔	سبق آموز واقعات	..	//	..	
۲۱۔	اسلامی تاریخ سے	..	//	..	
۲۲۔	قال اللہ	..	//	..	
۲۳۔	اسلامی دعوت	..	//	..	۳ —۰۰
۲۴۔	زلزلۂ قیامت	..	//	..	۴ —۰۰
۲۵۔	سچا راستہ	..	//	..	۱ —۰۰

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

JUNE 1981
ISSUE NO. 55

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

آدمی کی بے صبری اس کے دشمن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے
سب سے زیادہ نادان وہ ہے ——————
جو خود اپنی طرف سے دشمن کو یہ ہتھیار فراہم کردے

شمارہ ۵۶
جولائی ۱۹۸۱

زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

جولائی ۱۹۸۱
شمارہ ۵۶

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعلان

اس سے پہلے اعلان کیا گیا تھا کہ ماہنامہ الرسالہ مستقل طور پر خسارہ میں چل رہا ہے۔ الرسالہ کے ہمدرد اصحاب اپنے تعاون سے اس کی تلافی فرمائیں۔ مگر ابھی تک اس سلسلہ میں ہم کو خاطر خواہ تعاون حاصل نہ ہو سکا۔

اب یہ آخری بار اعلان کیا جا رہا ہے۔ ہماری انتہائی کوشش ہے کہ الرسالہ کی قیمت میں اضافہ کئے بغیر اس کو جاری رکھا جا سکے۔ تاہم اگر اس اعلان کے بعد بھی لوگوں کا تعاون ہم کو نہیں ملا تو آئندہ الرسالہ کی قیمت بڑھا کر تین روپیہ فی شمارہ کر دی جائے گی۔

واضح ہو کہ الرسالہ کے نقصان کی تلافی کے لئے عام تعاون کے علاوہ زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں بھی دی جا سکتی ہیں۔

دریافت کی لذت

سورج ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا اور اس سے ساڑھے نوکروڑ میل دور ہے۔ پھر بھی سورج کی روشنی اور حرارت بے پناہ مقدار میں ہم تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سورج کائنات کا نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ ہے جو قریب ہونے کی وجہ سے ہم کو بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں اور اس سے بہت زیادہ روشن بھی۔ روشنی اور حرارت کی یہ عظیم دنیائیں جن کو ستارہ کہا جاتا ہے بے شمار تعداد میں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کھرب ہا کھرب سال سے دہکنے کے باوجود ان کا حرارتی بھنڈار ختم نہیں ہوتا۔

ستاروں میں یہ بے پناہ قوت (Energy) کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہنس بیٹے (Hans Bethe) نے فلکیاتی طبیعیات کے میدان میں لمبی تحقیق کے بعد بتایا کہ اس کا راز کاربن سائیکل (Carbon Cycle) ہے۔ اسی تحقیق پر ۱۹۶۷ میں موصوف کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر بیٹے (پیدائش ۱۹۰۶) نے جس دن کاربن سائیکل کی یہ سائنسی دریافت کی، وہ ان کے لئے جوش و مسرت کا ایک ناقابلِ بیان لمحہ تھا۔ ان کی بیوی روز بیٹے (Rose Bethe) کہتی ہیں کہ رات کا وقت تھا۔ ہم نیو میکسیکو کے صحرا میں تھے۔ صحرائی ماحول میں آسمان کے ستارے عجیب شان کے ساتھ چمک رہے تھے۔ روز بیٹے نے اوپر نگاہ کی اور حیران ہو کر کہا "آکاش کے ستارے کتنا زیادہ چمک رہے ہیں" ڈاکٹر بیٹے نے جواب دیا: کیا تم کو خبر ہے کہ اس وقت تم اس واحد انسان کے عین قریب کھڑی ہو جو یہ جانتا ہے کہ یہ ستارے آخر چمکتے کیوں ہیں۔

Do you realize, just now you are standing next to the only human who knows why they shine at all.

ہنس بیٹے کی دریافت اصل حقیقت کا بے حد جزئی پہلو تھا۔ اس نے ستاروں میں کاربن سائیکل کا عمل دریافت کیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود کاربن سائیکل کا عمل ستاروں میں کیوں ہے۔ اس عظیم تر راز کو مومن خدا کی صورت میں دریافت کرتا ہے۔ ایمان باللہ ایک دریافت (Discovery) ہے جو تمام دریافتوں سے زیادہ بڑی ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ سائنس داں کو معمولی دریافت ہوتی ہے تو وہ وفورِ جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ مگر ایمان والے سب سے بڑی چیز ——— خدا کو دریافت کرتے ہیں اور ان کے اندر کوئی جذباتی ابال پیدا نہیں ہوتا۔ شاید خدا پر ایمان کے دعوے داروں نے ابھی تک خدا کو دریافت نہیں کیا۔

سب کچھ عجیب ہے

۱۹۵۷ میں روس نے پہلا اسپٹنک خلا میں بھیجا تھا۔ امریکہ نے ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ کو پہلی خلائی بس (کولمبیا) دو آدمیوں کے ساتھ بھیجی۔ وہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ تقریباً سو بار خلائی سفر کے لئے استعمال ہو سکتی ہے

کولمبیا کا وزن ۷۵ ٹن ہے۔ اس کے بنانے میں تقریباً دس ارب ڈالر خرچ ہوئے ہیں اور وہ نو سال میں بن کر تیار ہوئی ہے۔ کولمبیا اپنے دو مسافروں کو لے کر خلا میں روانہ ہوئی۔ اس کی رفتار ۲۶ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ ۵۴ گھنٹہ خلا میں رہی۔ اس نے زمین کے گرد ۳۶ چکر لگا کر ۱۰ لاکھ میل طے کئے اور پھر ۱۴ اپریل کو واپس آگئی۔ واپسی کے وقت مخصوص راڈ اور راکٹوں کے ذریعہ اس کی رفتار کو گھٹا کر ۳۴۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ کیا گیا۔ جب وہ ہوائی کرہ میں داخل ہوئی تو ہوا کی رگڑ سے گرم ہو کر سرخ اینٹ کی مانند ہو گئی۔ اس وقت اس کا بیرونی درجہ حرارت ۱۵۰۰ درجہ سنٹی گریڈ تھا۔ مگر کولمبیا کے بیرونی سمتوں میں ہر طرف گرمی روکنے والے ٹائل ۳۱ ہزار کی تعداد میں لگائے گئے تھے اس کی وجہ سے اس کے اندر کے دونوں مسافر محفوظ رہے۔

کولمبیا کو امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے صحرا میں ایک ہوائی میدان میں اتارا گیا۔ وہ صرف ۱۰ سکنڈ کے فرق سے اپنے ٹھیک وقت پر اتر گئی۔ تقریباً دو لاکھ آدمی اس کے اترنے کا منظر دیکھنے کے لئے وہاں جمع تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے کروڑوں آدمیوں نے اس واقعہ کو ٹیلی وژن پر دیکھا۔ کیلی فورنیا کے صحرا میں ۲۰ ٹرک اور کئی ہوائی جہاز اور دوسرے سامان موجود تھے تاکہ اترنے کے بعد وہ کولمبیا کی ہر ضرورت کو پورا کر سکیں۔ کولمبیا راکٹ کی طرح عمودی شکل میں اوپر گئی۔ وہ ایک تابع سیارہ کی طرح زمین کے گرد گھومی اور پھر گلائڈر (ہوائی جہاز) کی طرح زمین پر اتر آئی۔

کولمبیا کے دو مسافروں میں سے ایک مسٹر ینگ (John Young) تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۵۰ سال ہے۔ ۵۴ گھنٹہ بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ اس حیران کن خلائی سفر سے واپس کیلی فورنیا پہنچے تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ——— کیسا عجیب ہے اس طرح سے کیلی فورنیا آنا:

What a way to come to California

مسٹر ینگ خلائی سفر طے کر کے کولمبیا کے ذریعہ کیلی فورنیا میں اترے تو یہ بات ان کو بہت عجیب معلوم ہوئی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز عجیب ہے۔ کوئی سفر خواہ پیدل ہو یا سواری کے ذریعہ ہو، اس میں اتنے بے شمار کائناتی اسباب شامل ہوتے ہیں کہ آدمی ان کے بارے میں سوچے تو معمولی سفر بھی اس کو ایسا حیران کن معلوم ہو کہ وہ پکار اٹھے: میرا اپنے پیروں سے چل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا بھی اتنا ہی عجیب ہے جتنا کولمبیا کے ذریعہ خلائی سفر طے کر کے کیلی فورنیا کے صحرا میں اترنا۔ عام آدمی صرف کسی انوکھے واقعہ کے عجوبہ کو دیکھ پاتا ہے، عقلمند وہ ہے جو معمولی واقعات میں بھی اسی عجوبہ کو دیکھ لے۔

ماضی اور حال

اسکاٹ لینڈ کا ایک نوجوان اپنے ملک سے نکل کر ۱۲۱۷ء میں اسپین آیا۔ اس کا نام مائیکل (Michael) تھا۔ اس کا مقصد طلیطلہ اور قرطبہ کے عرب علمی مراکز میں تعلیم حاصل کرنا تھا۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ لاطینی یورپ کو ارسطو سے واقف کرائے۔ یونانی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ اصل یونانی متن سے اس کا ترجمہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا لاطینی ترجمہ عربی ترجمہ کی مدد سے کیا۔ اسپین کے قیام کے دوران وہ عربی زبان بخوبی سیکھ چکا تھا۔

۱۲۳۱ء میں سلرنو (سسلی) میں پہلا طبی کالج کھولا گیا۔ اس طبی کالج کے نصاب کے لئے ڈنمارک کے ہنڈرک (Hendrink Harpestraeng) نے سات جلدوں میں ایک کتاب تیار کی تھی جو اب بھی اسٹاک ہام کی نیشنل لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہنڈرک کا ماخذ بھی مذکورہ مائیکل کا وہی ترجمہ تھا جو اس نے الرازی اور ابن سینا کی طبی کتابوں کا عربی سے لاطینی زبان میں کیا تھا۔

جارج سارٹن (George Sarton) نے پانچ جلدوں میں سائنس کی تاریخ (History of Science) لکھی ہے۔ اس نے سائنس کی تاریخ کو چند ادوار پر تقسیم کیا ہے۔ اس کی تقسیم کے مطابق ہر دور نصف صدی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر نصف صدی کے دور کو وہ ایک مرکزی شخصیت سے متعلق قرار دیتا ہے۔ اس طرح ۴۵۰ تا ۴۰۰ قبل مسیح کو سارٹن افلاطون کا دور قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد کے ادوار کو وہ ارسطو، اقلیدس اور ارشمیدس کا دور کہتا ہے، وغیرہ۔ پھر ۶۰۰ سے لے کر ۷۰۰ء تک کے زمانہ کو اس نے چینی علماء کا دور قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ۷۵۰ سے لے کر ۱۱۰۰ء تک اس کی تقسیم کے مطابق مسلسل جابر، خوارزمی، رازی، مسعودی، بیرونی، ابن سینا، ابن الہیثم اور عمر خیام کا دور ہے۔ یہ سب کے سب عرب، ترک، افغانی اور ایرانی مسلمان تھے۔ سارٹن کے نزدیک تاریخ سائنس میں ساڑھے تین سو سال تک بلا انقطاع صرف مسلم سائنس دانوں کا دور رہا ہے۔ جارج سارٹن کی تقسیم کے مطابق ۱۱۰۰ء کے بعد پہلی بار مغربی اشخاص کا نام سائنس کی دنیا میں آنا شروع ہوتا ہے۔ مثلاً گیرارڈ، راجر بیکن۔ تاہم اس کے بعد بھی ۲۵۰ سال تک ابن رشد، نصیر الدین طوسی اور ابن نفیس کا ذہنی غلبہ یورپ پر قائم رہا۔ ابن نفیس وہ شخص ہے جس نے پہلی بار جسم کے اندر دوران خون کا امکان ظاہر کیا تھا، بعد کو ہاروے نے اسے دریافت کیا۔ اس طرح گویا سائنس کی تاریخ میں مسلسل چھ سو سال ایسے ہیں جب کہ مسلمانوں کو دنیا کی علمی قیادت حاصل رہی ہے۔

۱۳۵۰ کے بعد مسلم دنیا نے اپنا علمی برتری کا مقام کھو دیا۔ تیمور کے پوتے الغ بیگ کے سمرقند کے

دربار میں ۱۷۴۳ء میں اور مغل شہنشاہ دہلی کے دربار میں ۱۷۲۰ء میں کچھ علمی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مگر مسلم دنیا کا علمی زوال بدستور جاری رہا۔ اس کے لئے دوبارہ اپنے ماضی کی طرف واپس جانا ممکن نہ ہوسکا۔ موجودہ زمانہ میں تاریخ کے پہیہ نے الٹے رخ پر سفر شروع کیا ہے۔ پہلے مغرب کے لوگ مسلم دنیا میں علم سیکھنے کے لئے آتے تھے، اب مسلمان علم سیکھنے کے لئے مغربی دنیا میں جارہے ہیں۔ تاہم موجودہ زمانہ میں مسلمان مغرب کے تہذیبی مقلد تو بنے ہیں، وہ ان کے علمی ہمسر ابھی تک نہ ہوسکے۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ کو یونسکو کے زیر انتظام بلگریڈ کے اجتماع میں تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے ایک واقعہ بتایا۔ کسی مغربی سائنس داں سے گفتگو کے دوران انھوں نے شکایت کی کہ مغربی ممالک مسلم ممالک کی سائنسی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے کافی مدد نہیں کرتے۔ مغربی سائنسداں نے اس کے جواب میں کہا: سلام، کیا واقعتہً تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان قوموں کو سنبھالیں۔ ان کو مدد دیں، انھیں زندہ رکھیں جنھوں نے انسان کے علمی خزانہ میں ایک ذرہ برابر بھی کوئی تخلیق یا اضافہ نہیں کیا ہے:

> Salam, do you really think we have an obligation to succour, aid and keep alive those nations, who have never created or added an iota to man's stock of knowledge.

ڈاکٹر عبدالسلام اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے دل کو اس وقت شدید جھٹکا لگتا ہے جب میں جدید طرز کے ایک اسپتال میں داخل ہوتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ پنسلین سے لے کر زندگی کو بچانے والے دوسرے طبی سامان جو وہاں ہیں ان میں سے کسی چیز کی دریافت یا ترقی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ہم کسی طرح یہ امید نہیں کرسکتے کہ دوسروں کی مدد ہمیں جدید دنیا کی ترقی یافتہ قوم بنا سکتی ہے۔ جو قوم دنیا کو کچھ نہ دے رہی ہو اس کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہئے کہ دنیا اسے کوئی چیز دے گی۔

مسلم قوموں کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود اپنی کوشش سے آگے بڑھیں۔ عربوں کی بے پناہ دولت بھی اس معاملہ میں ذاتی کوشش کا بدل نہیں بن سکتی۔ آج مسلم ممالک بڑے پیمانہ پر مشینیں اور ہتھیار مغربی ممالک سے درآمد کر رہے ہیں مگر اس قسم کی مشینی درآمدات کے اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے فنی بنیاد (Technical Base) کی ضرورت ہے اور وہ کسی مسلم ملک کے پاس موجود نہیں۔ ایک سائنس داں نے بجا طور پر کہا ہے کہ تمام بنیادی علوم ایک دوسرے سے متعلق علوم ہیں:

> All basic science is relevant science

حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد ہی کوئی قوم ترقی کرسکتی ہے نہ کہ محض چند علوم میں۔

دونوں ایک سطح پر

۳۱ مارچ ۱۹۸۱ کو تمام دنیا کے اخبارات کی پہلی سرخی یہ تھی " صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ" ۔ ایک نوجوان نے خودکار گن سے صدر رونالڈ ریگن پر حملہ کیا اور دو سکنڈ میں چھ فائر کئے ۔ ایک گولی صدر کے سینہ کو چھید کر ان کے پھیپھڑے میں لگی ۔ اسپتال تک پہنچتے پہنچتے ان کے جسم کا آدھا خون بہہ چکا تھا۔ مگر فوری طبی مدد کارگر ثابت ہوئی اور رونالڈ ریگن کی جان بچ گئی ۔

رونالڈ ریگن اس سے پہلے ایک فلم ایکٹر تھے ۔ فلم کی دنیا میں وہ کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے ۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور بالآخر ۱۹۸۰ کے الکشن میں امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے ۔ گولی لگنے کے بعد صدر ریگن نے واشنگٹن کے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

If I'd got this much attention in Hollywood, I would never have left

اگر میں ہالی وڈ (فلمی دنیا) میں اتنی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوتا تو میں فلمی دنیا کو کبھی نہ چھوڑتا (ہندستان ٹائمس یکم اپریل ۱۹۸۱) دوسری طرف نوجوان حملہ آور جان ہنکلے (John Hinckley) کی روداد کے ذیل میں آیا ہے کہ اس کو نوجوان فلم ایکٹرس جاڈی فاسٹر (Jodie Foster) سے محبت ہو گئی تھی ۔ وہ اس کو خطوط لکھتا رہا مگر مس فاسٹر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی ۔ بالآخر اس نے حملہ سے ایک دن پہلے مذکورہ ایکٹرس کو خط لکھا جس میں یہ فقرہ تھا Now you'll know who I am (H.T. 2-4-1981)

اب تم جان لوگی کہ میں کون ہوں ۔ اس خط کے اگلے دن اس نے صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ کیا ۔ اس کے بعد ایک گمنام نوجوان اچانک ساری دنیا کے اخباروں کی شاہ سرخی بنا ہوا تھا ۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کی خبروں میں اس نے پہلا مقام حاصل کر لیا ۔ صرف ایک بندوق کی لبلبی دبا کر اس نے وہ شہرت حاصل کر لی جو بے شمار لوگوں کو ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی نہیں ملتی ۔

ایک آدمی بظاہر مجرم ہو اور دوسرا بظاہر بے قصور مگر دونوں شہرت کے طالب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے جینے کی سطح ایک ہے ۔ دنیا کا قانون لوگوں سے ان کے ظاہر کے اعتبار سے معاملہ کرتا ہے ، آخرت وہ مقام ہے جہاں لوگوں سے ان کے باطن کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا ۔ ایک شخص نام و نمود کے لئے دین کا علم بردار بنے ، دوسرا شخص نام و نمود کے لئے لیڈری کرے تو دین دار کا انجام بھی وہی ہوگا جو خود پسند لیڈروں کا خدا کے یہاں ہونے والا ہے ۔

کوئی چیز مشکل نہیں

ہیرا ہماری تمام معلوم دھاتوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ہیرے سے زیادہ سخت نہیں ہوتی۔ شیشہ کا فریم بنانے والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ "قلم" کی صورت کی ایک چیز شیشہ کے تختہ پر گزارتا ہے اور شیشہ کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس قلم میں ہیرے کا ٹکڑا لگا ہوتا ہے۔ ایسا اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ ہیرا انتہائی سخت چیز ہے، خواہ وہ قدرتی ہو یا مصنوعی۔

تمام دوسری معدنیات کے برعکس ہیرے پر کسی قسم کا ایسڈ (تیزاب) اثر نہیں کرتا۔ آپ ہیرے کو خواہ کسی بھی تیزاب میں ڈالیں وہ ویسا کا ویسا باقی رہے گا۔ مگر اسی سخت ترین ہیرے کو اگر ہوا کی موجودگی میں خوب گرم کیا جائے تو وہ ایک بے رنگ گیس بن کر اڑ جائے گا۔ اور یہ گیس کاربن ڈائی آکسائڈ ہوگی۔

اسی طرح ہر چیز کا ایک "توڑ" ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی مشکل کا مقابلہ وہاں کریں جہاں وہ اپنی سخت ترین حیثیت رکھتی ہے تو ممکن ہے کہ آپ کی کوشش کامیاب نہ ہو۔ مگر کسی دوسرے مقام سے آپ کی یہی کوشش انتہائی حد تک نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

جب بھی آپ کا مقابلہ کسی مشکل سے پیش آئے تو سب سے پہلے یہ معلوم کیجئے کہ اس کا کمزور مقام کون سا ہے۔ اور جو اس کا کمزور مقام ہو وہیں سے اپنی جدوجہد شروع کر دیجئے۔ ایک چیز کسی اعتبار سے ناقابل شکست ہو سکتی ہے۔ مگر وہی چیز دوسرے اعتبار سے آپ کے لئے موم ثابت ہوگی۔

ایک شخص جس کو آپ کڑوے بول سے اپنا موافق نہ بنا سکے اس کو آپ میٹھے بول سے اپنا موافق بنا سکتے ہیں۔ اپنے جس حریف کو آپ لڑائی کے ذریعہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے اس کو آپ اخلاق اور شرافت کے ذریعہ دبانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک ماحول جہاں آپ مطالبہ اور احتجاج کے ذریعہ اپنا مقام حاصل نہ کر سکے وہاں آپ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

ہیرا تیزاب کے لئے سخت ہے مگر وہ آنچ کے لئے نرم ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک آدمی اگر ایک اعتبار سے سخت نظر آئے تو اس کو ہمیشہ کے لئے سخت نہ سمجھ لیجئے۔ اگر وہ ایک اعتبار سے سخت ہے تو دوسرے اعتبار سے نرم بھی ہو سکتا ہے۔

ہر چیز کا یہ حال ہے کہ وہ کسی اعتبار سے سخت ہے اور کسی اعتبار سے نرم۔ ایک شخص ایک انداز سے معاملہ کرنے میں بے لچک نظر آتا ہے مگر وہی دوسرے انداز سے معاملہ کرنے میں ہر شرط پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو جاننے میں زندگی کی تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

حقیقت پسندی

امریکہ نے اگست ۱۹۴۵ میں اپنے دو ایٹم بم جاپان پر گرائے۔ اس کے نتیجہ میں جاپان تہس نہس ہو کر رہ گیا۔ مگر جاپانیوں کو اس پر غصہ نہیں۔ کیونکہ امریکیوں کی کارروائی یک طرفہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ جاپان کی متشددانہ کارروائی کے جواب میں کی گئی ———— جاپانیوں کا یہی حقیقت پسندانہ مزاج ہے جس نے انھیں موجودہ زمانہ میں غیر معمولی ترقی کے مقام تک پہنچایا ہے۔

امریکہ نے جاپان کے دو بڑے صنعتی شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے۔ چند منٹ کے اندر دونوں آباد شہر عظیم الشان کھنڈر بن گئے۔ ان میں سے ہر ایک شہر ۱ میل سے زیادہ بڑے رقبہ میں بسا ہوا تھا۔ مگر جب ان پر ایٹم بم گرا تو یہ حال ہوا کہ انسان، حیوان، درخت سب جل بھن کر رہ گئے۔ ڈیڑھ لاکھ آدمی مر گئے۔ دس ہزار آدمی ایسے تھے جو حادثہ کے بعد فوراً بخارات میں تبدیل ہو گئے۔ آج یہ دونوں شہر شاندار طور پر دوبارہ آباد ہو چکے ہیں۔ چوڑی سڑکیں، کشادہ مکانات، جگہ جگہ پارک اور باغ نے شہر کو بالکل نیا منظر عطا کیا ہے۔ اب شہر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی عمارت باقی ہے جو دیکھنے والوں کو یاد دلاتی ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں اس شہر پر کیسی قیامت آئی تھی۔

ہندستان ٹائمس (نئی دہلی) کے ایڈیٹر مسٹر خوشونت سنگھ جاپان گئے تھے۔ اپنے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے جاپان میں ایک بے حد عجیب بات دیکھی۔ جب کہ بقیہ دنیا نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے واقعات کو بہت بڑے پیمانہ پر امریکہ کے خلاف پروپگنڈے کے لیے استعمال کیا ہے، خود جاپانی ان واقعات کو امریکہ کے خلاف نہیں لیتے۔ خوشونت سنگھ نے اپنے جاپانی رفیق سے اس کی بابت سوال کیا تو خلاف توقع اس نے نرم لہجہ میں کہا:

We hit them first at Pearl Harbour. We killed a lot of them. They warned us of what they were going to do but we thought they were only bluffing. They beat us fair and square. We were quits. And now we are friends.

پہلے ہم نے ان کے پرل ہاربر پر حملہ کیا۔ ہم نے ان کے بہت سے لوگوں کو مار ڈالا۔ اس کے جواب میں وہ جو کچھ کرنے والے تھے اس سے انھوں نے ہمیں آگاہی دی۔ مگر ہم نے سمجھا کہ یہ محض دھونس ہے۔ انھوں نے ہمیں کسی دھوکے کے بغیر کھلے طور پر مارا۔ پہلے ہم ایک دوسرے سے دور تھے۔ اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں (ہندستان ٹائمس ۴ اپریل ۱۹۸۱)

ایٹمی حملہ سے مرنے والوں کی یادگار ہیروشیما میں قائم کی گئی ہے امن میوزیم (Peace Museum)

میں جنگی تباہ کاریوں کی تصویریں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے ہر سال تقریباً ۷ لاکھ جاپانی ہیروشیما آتے ہیں۔ گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عام جاپانی کے دل میں امریکہ کے خلاف نفرت چھپی ہوئی موجود ہے۔ تاہم وہ اپنے عملی رویہ میں اس کا اظہار ہونے نہیں دیتے۔ انھوں نے اپنے مخالفانہ جذبات پر حقیقت پسندی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ جاپانیوں کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ جنگ کے بعد بہت تھوڑی مدت میں انھوں نے دوبارہ غیر معمولی ترقی کر لی۔ ان کے یہاں نہ تیل نکلتا ہے اور نہ ان کے پاس معدنیات کی کانیں ہیں۔ ان کو بیشتر خام مال باہر سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود جاپان آج اپنے اعلیٰ سامانوں کی بدولت دنیا کی مارکٹ پر چھایا ہوا ہے۔

مسٹر خوشونت سنگھ نے جاپان میں وکیلوں کی بابت معلوم کیا۔ انھیں بتایا گیا کہ یہاں وکالت کے پیشہ کا حال اچھا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان جب کوئی نزاع پیدا ہوتی ہے تو وہ عدالت میں جانے کے بجائے باہمی گفتگو سے اس کو طے کر لیتے ہیں۔ جب آدمی اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار ہو تو جھگڑا کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ جھگڑا ختم نہ ہونے کی وجہ اکثر حالات میں یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی یک طرفہ طور پر دوسرے کو الزام دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے دوسرے کے اندر بھی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مسئلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب ایک فریق اپنی جانب کی غلطی مان لے تو دوسرے کے اندر بھی جھکاؤ پیدا ہوگا اور مسئلہ وہیں کا وہیں ختم ہو جائے گا۔

اس حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کا جاپان کو یہ بہت بڑا فائدہ ملا ہے کہ ایک جاپانی دوسرے جاپانی پر اعتماد کرتا ہے۔ ہندستان جیسے ملکوں میں تجارتی معاہدے اور تجارتی خط وکتابت عام طور پر ایسے ماہرین انجام دیتے ہیں جو بہت بندھے ہوئے الفاظ اور قانونی پہلوؤں کی کامل رعایت کرنے والی زبان لکھنا جانتے ہیں۔ مگر جاپانی اپنا وقت اس قسم کے تحریری مسودات تیار کرنے میں ضائع نہیں کرتے۔ امریکہ میں قانون دانوں کی تعداد ۵۰ ہزار ہے جب کہ جاپان میں قانون دانوں کی تعداد صرف ۱۱ ہزار ہے۔ جاپان میں ایسے لفظی ماہرین کا زیادہ کام ہی نہیں۔

جاپان کے اکثر تجارتی ادارے زبانی معاہدوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اولاً اس کا رواج جاپانیوں کے باہمی تعلقات میں ہوا مگر اب باہر کے تاجر بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ جاپانی کے منھ سے بولے ہوئے لفظ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ قانونی بندشوں سے اس آزادی کا یہ فائدہ ہے کہ کام تیزی سے ہوتا ہے اور غیر ضروری لفظی پابندیاں کارکردگی میں حارج نہیں بنتیں۔

جاپان کے اس مزاج نے اس کو باہمی اتحاد کا تحفہ دیا ہے۔ اور اتحاد بلاشبہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ جاپان کی ترقی کا راز جاپانیات کے ایک ماہر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

Never quarrelling amongst themselves, always making everything together

آپس میں کبھی نہ جھگڑنا، ہر کام ہمیشہ مل جل کر کرنا (ہندستان ٹائمس ۴ اپریل ۱۹۸۱)

عبادت کی روح

"نماز روزہ الگ چیز ہے اور معاملہ الگ چیز" ایک صاحب نے کہا "نماز روزہ میں تو میں خدا کے حکم پر چلتا ہوں مگر جب کوئی دنیاداری کا معاملہ ہو تو اس کو تو دنیادارانہ طریقہ سے حل کرنا پڑتا ہے" مذکورہ شخص نے یہ بات جس طرح صفائی کے ساتھ کہہ دی اس طرح ہر آدمی نہیں کہے گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آج ہر آدمی اسی اصول پر عمل کر رہا ہے۔ وہ نماز روزہ کو تو انھیں آداب و قواعد کے ساتھ دہرانے کی کوشش کرتا ہے جیسے خدا نے بتایا ہے۔ مگر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے وقت اس طرح معاملہ کرتا ہے جس طرح اس کا جی چاہتا ہے کہ معاملہ کیا جائے۔ وہ نماز روزہ کے وقت اپنے کو پابند سمجھتا ہے اور اس کے بعد اپنے کو بالکل آزاد۔ حالاں کہ نماز روزہ اسی وقت نماز روزہ ہے جب کہ اس کی روح معاملات اور باہمی سلوک میں ظاہر ہو۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ نماز روزہ کو اپنے وقت پر ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر جب ان کا پڑوسی ان سے شکایت کرتا ہے کہ آپ کے فلاں عمل سے مجھ کو اور میرے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے تو وہ صرف اس وقت اس کو قابل لحاظ سمجھیں گے جب کہ پڑوسی طاقت ور اور صاحب حیثیت ہو، اگر پڑوسی کمزور ہو تو وہ اس کی شکایت پر اتنی توجہ بھی نہ دیں گے کہ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

یہی حال تمام معاملات کا ہے۔ لوگ نماز روزہ کا تو اہتمام کریں گے مگر نماز روزہ کے تقاضے پورے نہ کریں گے۔ جب ان کی کسی سے شکایت ہو جائے تو وہ تواضع کے بجائے گھمنڈ کا مظاہرہ کریں گے۔ اگر کسی کے خلاف کچھ کرنا ہو تو وہ صبر کے بجائے بے صبری پر اتر آئیں گے۔ جب وہ کسی سے وعدہ کریں گے تو مشکل ہی سے ان کو یہ دھیان رہے گا کہ اس کو پورا کرنا ہے۔ جب وہ کسی سے بگڑ جائیں تو وہ بالکل بھول جائیں گے کہ کسی اوپر ظلم کرنا درحقیقت خود اپنے خلاف خدا کے سامنے کھلی ہوئی حجت قائم کر رہا ہے۔

نماز میں آدمی خدا کے سامنے جھکتا ہے۔ روزہ میں آدمی خدا کے حکم سے اپنی انتہائی ضروری چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کی زندگی اس دنیا میں خدا کے حکموں کی پابند ہوگی نہ کہ اس کے حکموں سے آزاد۔ اب جو شخص نماز روزہ تو کرے مگر زندگی کے معاملات میں جب خدا کا ایک حکم سامنے آئے تو وہ اس کو ٹھکرا دے اور اس کے بجائے نفس کے تقاضوں پر چلنے لگے تو گویا اس نے نماز پڑھ کر بھی نماز نہیں پڑھی۔ اس نے روزہ رکھ کر بھی روزہ نہیں رکھا۔ کیونکہ اس کا روزہ اور نماز محض ظاہری روزہ اور نماز تھا نہ کہ حقیقی روزہ اور نماز۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے

نپولین (۱۸۲۱ - ۱۷۶۹) جب پہلی قید کے بعد جزیرہ البا (Elba) سے بھاگا تو اس کے ساتھ اس کے وفادار سپاہیوں کی صرف ایک مختصر جماعت تھی۔ اس معزول تاجدار کے عزائم یہ تھے کہ وہ فرانس کے تخت پر دوبارہ قبضہ کرے۔ مگر پہلے ہی معرکہ میں اس کو فرانس کے ۲۰ ہزار جوانوں کا سامنا کرنا پڑا۔

نپولین دنیا کے انتہائی بہادر انسانوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا کہ اپنی فوجی کمی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے حریف سے ٹکرا جائے۔ جب دونوں فریق آمنے سامنے ہوئے تو وہ اکیلا بالکل غیر مسلح حالت میں اپنی جماعت سے نکلا اور نہایت اطمینان کے ساتھ فریق مخالف کی صفوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور اپنے سینہ کو ننگا کر دیا۔ اس کے بعد جذباتی انداز میں اپنے مخالف سپاہیوں سے، جن میں سے اکثر اس کے ماتحت رہ چکے تھے، خطاب کر کے بولا:

"تم میں سے کون وہ سپاہی ہے جو اپنے باپ کے ننگے سینہ پر فائر کرنے کو تیار ہو"

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے "کوئی نہیں، کوئی نہیں" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تمام سپاہی مخالف جماعت کو چھوڑ کر نپولین کے جھنڈے کے نیچے آگئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نپولین اپنی بے سروسامانی کے باوجود فاتح ہوا۔ اس نے ملک فرانس کے تخت پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ حالاں کہ اس وقت وہ جس بے سروسامانی کی حالت میں تھا، اس کے ساتھ اگر وہ فرانس کی فوجوں سے لڑ جاتا تو میدان جنگ میں شاید اس کی لاش تڑپتی ہوئی نظر آتی۔

آدمی کے پاس کتنا ہی ساز و سامان ہو لیکن خطرہ پیش آنے کی صورت میں اگر وہ گھبرا اٹھے تو اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ صورت حال کے بارے میں سوچے اور مقابلہ کے لئے اپنا منصوبہ بنائے۔ اس کے برعکس اگر وہ خطرہ کے وقت اپنے ذہن کو حاضر رکھے تو بہت جلد ایسا ہوگا کہ وہ خطرہ کی اصل نوعیت کو سمجھ لے اور اپنے ممکن ذرائع کو بروقت استعمال کر کے کامیاب رہے۔

تاریخ میں بار بار کم تعداد اور کم طاقت والوں نے زیادہ تعداد اور زیادہ طاقت والوں پر کامیابی حاصل کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دشمن ہمیشہ اس سے بہت کم طاقت ور ہوتا ہے جتنا کہ وہ بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ اس دنیا کا نظام کچھ اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو جائے اس کے اندر کوئی نہ کوئی کمزوری موجود رہتی ہے۔ اسی کمزوری کو استعمال کرنے کا نام دشمن پر فتح حاصل کرنا ہے۔ کسی شخص کی واحد طاقت اس کے فریق کی کمزوری ہے، اور یہ طاقت ہمیشہ ہر ایک کو حاصل رہتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس ہوشیاری کا ثبوت دے سکے کہ وہ اپنے حریف کی کمزوری کو استعمال کرنا جانتا ہے۔

اپنا حصہ ادا کرنا پڑتا ہے

ایک لطیفہ ہے کہ ایک شخص اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ خدا رازق ہے اور وہی آدمی کو کھلاتا ہے۔ اس کے ساتھی اس کو سمجھاتے مگر وہ نہ مانتا۔ آخر اس نے کہا کہ میں اس کا تجربہ کروں گا۔ چنانچہ ایک روز وہ بالکل سویرے گھر سے نکلا اور جنگل میں جاکر ایک درخت کے اوپر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا: اگر کھلانے والا خدا ہے تو وہ ضرور یہاں بھی میرا رزق بھیجے گا۔

وہ سارا دن پیڑ پر بیٹھا رہا مگر خدا کی طرف سے اس کا کھانا نہ آیا۔ صبح ناشتہ کا وقت گزرا۔ پھر دوپہر کے کھانے کا وقت گزر گیا۔ اس کے بعد شام آئی اور شام کے کھانے کا وقت بھی گزر گیا اور اس کا کھانا نہ آیا۔ اب اس کو یقین ہو گیا کہ یہ بات غلط ہے کہ خدا کھلاتا ہے۔ اتنے میں اس کو کچھ آدمی آتے ہوئے نظر پڑے۔ وہ مسافر تھے اور انھیں کسی درخت کی تلاش تھی جس کے نیچے وہ رات گزار سکیں۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اسی درخت کو پسند کیا جس کے اوپر مذکورہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔

درخت پر بیٹھے ہوئے آدمی نے بالکل خاموشی اختیار کر لی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ مسافروں نے پڑاؤ ڈالنے کے بعد لکڑیاں جمع کیں۔ پھر اپنی گٹھری کھولی اور چاول دال نکال کر کھچڑی پکانے لگے۔ جب کھچڑی تیار ہو گئی تو انھوں نے سوچا کہ اس کو بگھار بھی دے دیں۔ تیل میں مرچا ڈال کر جب انھوں نے گرم کیا تو اس کا دھواں اوپر اٹھا اور درخت پر بیٹھے ہوئے آدمی تک پہنچا۔ اس کی وجہ سے اس کو چھینک اور کھانسی آ گئی۔ کھانسی کی آواز سن کر مسافروں کو معلوم ہوا کہ درخت کے اوپر بھی کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ انھوں نے اس کو آواز دے کر بلایا اور اس کو درخت سے اتار کر اپنے کھانے میں شریک کر لیا۔

صبح کو آدمی خوش خوش اپنے گھر واپس آیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم نے جو بات کہی وہ صحیح تھی۔ مگر تم لوگوں نے مجھے آدھی بات بتائی۔ بے شک خدا کھلاتا ہے مگر وہ کھانسی آنے کے بعد کھلاتا ہے۔

اس لطیفہ میں تمثیل کے ذریعہ یہ بات بتائی گئی ہے کہ آدمی جو کچھ پاتا ہے وہ خدا کے دئے سے پاتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسے اپنا بھی ایک حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ خدا اسی کو دیتا ہے جو خدا کے منصوبہ میں اپنے کو شریک کرے۔ انسان کی شرکت اگرچہ پورے واقعہ کا بے حد جزئی حصہ ہوتی ہے۔ مگر وہ بہر حال ضروری ہے۔ اس دنیا میں آدمی اس کا ثبوت دئے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔ یہی دینا تو پانے کا امتحان ہے۔ اسی شرط پر پانے کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ پھر اپنی طرف سے دینے کی شرط پوری کئے بغیر کوئی شخص خدا کے یہاں پانے والوں کی فہرست میں کس طرح شامل ہو سکتا ہے۔

بہادری یہ ہے

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت علی چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے۔ اس وقت ملکی انتظام منتشر ہو رہا تھا۔ حضرت علی نے نظم ونسق کو از سر نو درست کرنے کے لئے حضرت عثمان کے زمانہ کے عمال بدل دئے۔ امیر معاویہ شام کے عامل (گورنر) چلے آرہے تھے۔ حضرت علی نے ان کی جگہ سہل بن حنیف کو حکومت شام کا فرمان دے کر روانہ کیا۔ وہ تبوک پہنچے تھے کہ امیر معاویہ کے سواروں نے روکا اور سہل کو مدینہ واپس ہونے پر مجبور کیا۔ حضرت علی نے امیر معاویہ کو لکھا کہ مہاجرین وانصار نے اتفاق عام کے ساتھ میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اس لئے تم یا تو میری اطاعت کر دیا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس کے بعد مزید اسباب جمع ہوتے گئے، یہاں تک کہ جمل اور صفین کی لڑائیاں پیش آئیں جن میں تقریباً ۸۰ ہزار مسلمان خود مسلمانوں کی تلوار سے ہلاک ہو گئے۔

جنگ صفین (۳۷ھ) کے آخر زمانہ کا واقعہ ہے۔ حضرت علی فوج کے آگے تھے۔ وہ صفوں کو چیرتے ہوئے امیر معاویہ کے مقصورہ تک پہنچ گئے۔ انھوں نے پکار کر کہا "معاویہ، خلق خدا کا خون کیوں بہاتے ہو۔ آؤ ہم تم لڑ کر باہم فیصلہ کر لیں" امیر معاویہ کے ساتھی عمرو بن العاص نے کہا: بات تو انصاف کی ہے۔ امیر معاویہ نے کہا: کیا تم کو معلوم نہیں کہ جو اس شخص سے مقابلہ کرتا ہے وہ زندہ نہیں بچتا۔ عمرو بن العاص نے دوبارہ کہا: جو کچھ بھی ہو، تم کو مقابلہ کے لئے نکلنا چاہئے۔ امیر معاویہ نے کہا: تم چاہتے ہو کہ مجھ کو مروا کر میرے منصب پر قابض ہو جاؤ۔

امیر معاویہ جب سامنے نہیں آئے تو عمرو بن العاص خود حضرت علی سے مقابلہ کے لئے نکلے۔ دیر تک دونوں میں شمشیر زنی کا مقابلہ ہوتا رہا۔ آخر حضرت علی نے ایسا سخت وار کیا جس سے بچنا ممکن نہ تھا۔ عمرو بن العاص بدحواس ہو کر اپنے گھوڑے سے لڑکھڑائے اور زمین پر اس طرح گر پڑے کہ ان کا جسم ننگا ہو گیا۔ حضرت علی نے جب عمرو بن العاص کو برہنہ حالت میں زمین پر پڑا ہوا دیکھا تو اپنا منھ پھیر لیا اور ان کو چھوڑ کر اپنی فوج میں واپس آگئے۔

عمرو بن العاص بے حد ہوشیار آدمی تھے۔ وہ امیر معاویہ کے دست راست تھے۔ حضرت علی اس وقت عمرو بن العاص کا خاتمہ کر کے امیر معاویہ کی مخالفانہ مہم کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ مگر حریف کو برہنہ حالت میں دیکھ کر انھیں شرم آگئی۔ اپنے سخت ترین مدمقابل پر پوری طرح قابو پانے کے باوجود وہ اس کو چھوڑ کر چلے آئے۔ ان کی بہادری نے گوارا نہ کیا کہ وہ عاجز حریف کو اپنی تلوار کا نشانہ بنائیں۔

انصاف کی جیت

حضرت عمر بن عبد العزیز (۱۰۱- ۶۲ ھ) پانچویں خلیفہ راشد ہیں۔ آپ کے خادم ابو امیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز آپ کی اہلیہ سے کہا کہ مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا برا حال ہوگیا ہے۔ خاتون نے جواب دیا: تمہارے خلیفہ کا بھی روز کا کھانا یہی ہے۔ آپ سے پہلے خلیفہ کی حفاظت کے لئے ایک سو سپاہی مقرر تھے، جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سب کو دوسرے سرکاری کاموں میں لگادیا اور فرمایا: میری حفاظت کے لئے قضاء قدر ہی کافی ہے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کی سلطنت کے حدود سندھ سے لے کر فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

آپ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ سمرقند کے باشندوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے ایک فوجی سردار قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارے میں یہ شکایت کی کہ اسلامی قاعدہ کے مطابق انھوں نے ہم کو پیشگی تنبیہ نہیں کی اور ہمارے شہر میں اچانک اپنی فوجیں داخل کردیں۔ لہذا ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبد العزیز سے پہلے ہوئی تھی۔ اور اب اس پر سات سال گزر چکے تھے۔ مگر آپ نے انصاف کے تقاضے کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے عراق کے حاکم کو لکھا کہ سمرقند کے لوگوں کے مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک خصوصی قاضی مقرر کریں۔ عراق کے حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جمیع بن حاضر الباہلی کو اس کا قاضی مقرر کیا۔ ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ دونوں فریق نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ آخر میں قاضی نے سمرقند والوں کی شکایت کو درست قرار دیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ ——

مسلمانوں کی فوج سمرقند کو چھوڑ کر باہر آجائے اور اہل سمرقند کو ان کا قلعہ اور تمام دوسری چیزیں واپس کردی جائیں۔ اس کے بعد اسلامی قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کا فوجی سردار ان کے سامنے ضروری شرطیں پیش کرے۔ اگر وہ تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کردیں تو پھر اس کے بعد ان سے جنگ کی جائے۔

اسلامی فوج اس وقت فاتحانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے چین جیسے ملک کے بادشاہوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا تھا۔ مگر جب قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا تو اسلامی فوج کے سردار نے کسی بحث کے بغیر اس کو مان لیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پوری فوج سمرقند چھوڑ کر نکل آئے۔ تاہم اس پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی۔ سمرقند کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اس قدر با اصول اور انصاف پسند ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی ایسے بے لاگ انصاف کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم فوج کا آنا ان کے لئے رحمت کا آنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے مسلم حکومت کو قبول کرلیا۔ وہ کہہ اٹھے: خوش آمدید، ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں (مرحبا سمعنا واطعنا، فتوح البلدان للبلاذری)

کل کو جانئے

ضیاء الرحمٰن (۱۹۸۱-۱۹۳۶) سابق صدر بنگلہ دیش ڈھاکہ سے چاٹگام گئے۔ وہاں وہ ۳۰ مئی ۱۹۸۱ کو سرکاری ریسٹ ہاؤس میں آرام کر رہے تھے کہ رات کے وقت ان پر حملہ کرکے انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ ان کو ہلاک کرنے والا بنگلہ دیش کا ایک فوجی افسر میجر جنرل منظور تھا۔ میجر جنرل منظور نے یہ گمان کیا تھا کہ صدر ضیاء الرحمٰن کو اقتدار سے ہٹانے کے بعد وہ بنگلہ دیش کی حکومت پر قبضہ کر لیں گے۔ مگر ان کا اندازہ غلط نکلا۔ فوج کے ایک دستہ کے سوا عام فوجیوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ صرف دو دن بعد ۲ جون ۱۹۸۱ کو مخالف فوجیوں نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

جنرل منظور کا جو انجام ہوا وہی اس دنیا میں ہر آدمی کا انجام ہو رہا ہے۔ کسی کا بظاہر فوج کی گولی کے ذریعہ ہوتا ہے اور کوئی فرشتوں کے ذریعہ موت کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ کوئی "جنرل منظور" یہ نہیں سوچتا کہ اپنے حریف کو قتل کرنے کے اگلے ہی دن وہ بھی قتل کر دیا جائے گا۔ دوسرے کو موت کے گڑھے میں گرانے کے بعد وہ خود بھی لازمی طور پر موت کے گڑھے میں دھکیل دیا جائے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو کسی نہ کسی دائرہ میں اقتدار دیا جاتا ہے۔ کسی کے اختیار کا دائرہ بڑا ہے اور کسی کا دائرہ چھوٹا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے دائرہ میں وہی بن جاتا ہے جو دوسرا اپنے دائرہ میں بنا ہوا ہے۔ یہاں ہر شخص "جنرل منظور" ہے۔ ہر شخص دوسرے کی کاٹ میں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی نفی پر اپنا اثبات کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کا غلط اندازہ کرکے سمجھتا ہے کہ اگر اس نے دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا تو اس کا خالی مقام اسے مل جائے گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جو چیز اس کا انتظار کر رہی ہے وہ کسی کا خالی مقام نہیں بلکہ خود اس کی اپنی قبر ہے۔

ہر شخص جو آج اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے وہ کل اپنے کو ناکام دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص آج کے بعد آنے والے کل کو نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنے "آج" کو جاننے کا ماہر ہے، کسی کو اپنے "کل" کی خبر نہیں۔

اپنے آج کو جاننے والو، اپنے کل کو جانو۔ کیونکہ بالآخر تم جس سے دوچار ہونے والے ہو وہ تمھارا کل ہے نہ کہ تمھارا آج۔

زندگی کا سفر

مصطفیٰ رشید شیروانی مشہور مجاہد آزادی اور صنعت کار اور ممبر راجیہ سبھا، ٹرین کے ذریعہ الہ آباد سے دہلی جارہے تھے۔ گورنر کشمیر مسٹر جھا بھی انھیں کے کمپارٹمنٹ میں تھے۔ ٹرین غازی آباد پہنچی تھی کہ مصطفیٰ رشید شیروانی پر دل کا سخت دورہ پڑا۔ قبل اس کے کہ انھیں کوئی طبی امداد پہنچے، فوراً ہی ٹرین میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ ۸ اپریل ۱۹۸۱ کا واقعہ ہے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۵۹ سال تھی۔

اس طرح کے واقعات مختلف شکلوں میں ہر روز ہوتے ہیں۔ ہر دن بے شمار زندہ لوگ موت کے دروازہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ہر روز لاکھوں آدمیوں کے ساتھ یہ واقعہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے نکل کر کسی "دہلی" کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مگر درمیان ہی میں ان کو خدا کے فرشتے پکڑ لیتے ہیں اور ان کو "دہلی" کے بجائے آخرت کی منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

ہر آدمی امیدوں اور تمناؤں کی ایک دنیا اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی امیدوں کی دنیا کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں اپنے خوابوں والے "کل" کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ مگر بہت جلد اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمناؤں والی دنیا کے بجائے خدا کی دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ دنیا کی منزل کی طرف نہیں بلکہ آخرت کی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آدمی کہاں جارہا ہے اور کہاں پہنچ رہا ہے، مگر کسی کو اس کی خبر نہیں۔

آدمی اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھ کر خوش ہو وہ خود اپنے اس مستقبل کی طرف ہانک دیا جاتا ہے جس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ آدمی اپنے آرام کے لئے ایک شان دار مکان کھڑا کرتا ہے مگر ابھی وہ وقت نہیں آتا کہ وہ اپنے خوابوں کے مکان میں سکھ چین کے ساتھ رہے کہ موت اس کے اور اس کے مکان کے درمیان حائل ہوجاتی ہے۔ آدمی اپنی معاش کو بڑھاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں عزت و ترقی کی بلندیوں پر اپنے کو بٹھانے جارہا ہوں مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا دن اس کے لئے جس چیز کا انتظار کر رہا تھا وہ ایک سنسان قبر تھی نہ کہ عزت و ترقی کی رونقیں۔

خدا ہر دن کسی "دہلی" کے مسافر کو "قبر" میں پہنچا رہا ہے۔ مگر آدمی ان واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ اس کے باوجود ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ وہ "دہلی" کی طرف چلا جا رہا ہے، قبر کی منزل اس کے لئے کبھی آنے والی نہیں۔

مشورہ پر اصرار نہیں

بدر کی لڑائی (۲ ھ) سے کچھ پہلے قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ساٹھ آدمیوں کی سرکردگی میں شام بھیجا گیا تھا۔ اس تجارتی قافلہ میں مکہ کے مردوں اور عورتوں نے اپنا تمام سرمایہ لگا دیا تھا۔ بدر کی لڑائی میں قریش کو مکمل شکست ہوئی۔ تاہم ابوسفیان کو اس میں کامیابی ہوئی کہ وہ تجارتی قافلہ کو ساحلی راستہ سے چلا کر مکہ پہنچ جائیں۔ جنگ کے بعد سارا مکہ جوش انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ قریش کے ذمہ دار افراد کا ایک اجتماع دارالندوہ میں ہوا۔ اس اجتماع میں متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ تجارتی قافلہ کے شرکا صرف اپنا اصل سرمایہ لے لیں اور منافع کی رقم پوری کی پوری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کی تیاری میں لگا دی جائے۔ منافع کی یہ رقم پچاس ہزار دینار تھی جو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اب قریش نے زبردست تیاری کی اور شوال ۳ھ میں مکہ سے نکل کر مدینہ پر حملہ کے لئے روانہ ہوئے۔

اسی جنگ کا نام جنگ احد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بڑے صحابہ میں سے اکثر کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ مگر نوجوان طبقہ اس کا پرجوش مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم یہاں ٹھہریں گے تو دشمن اس کو ہماری بزدلی اور کم زوری پر محمول کرے گا۔ اس لئے ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ عبداللہ بن ابی کی رائے بھی وہی تھی جو اکابر صحابہ کی تھی۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۷)

جن لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، اس کی بڑی وجہ مدینہ کا جغرافیہ تھا جو ایک قدرتی حصار کا کام کرتا تھا۔ مدینہ کا جائے وقوع ایسا تھا کہ اس کے جنوب میں کھجوروں کے گھنے باغات اس کثرت سے تھے کہ ادھر سے کوئی فوج بستی کے اوپر حملہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی طرح مشرق اور مغرب کے بڑے حصہ میں پہاڑیاں تھیں جو کسی فوجی پیش قدمی کے لئے قدرتی روک کا کام کر رہی تھیں۔ اس لئے کوئی دشمن صرف ایک ہی سمت سے مدینہ پر حملہ کر سکتا تھا۔ اس جغرافی پوزیشن نے مدینہ کو جنگی اعتبار سے کافی محفوظ شہر بنا دیا تھا۔ گویا مدینہ ایک قسم کا قلعہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر وہ چاروں طرف سے دشمن کی زد میں ہو جاتے تھے جب کہ مدینہ کے اندر صرف ایک طرف سے مقابلہ کا انتظام کرنا تھا۔ غزوۂ احزاب میں مدینہ کے اسی جائے وقوع سے فائدہ اٹھایا گیا اور اس کی کھلی سمت میں (شمال مغربی رخ پر) خندق کھود کر پورے شہر کو محفوظ کر لیا گیا تھا۔

اکابر صحابہ کی اکثریت اور عبداللہ بن ابی کی رائے اگرچہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی۔ مگر

آپ نے نوجوان طبقہ کی رائے کا لحاظ کیا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے نکل کر احد کی طرف روانہ ہوئے۔ عبد اللہ بن ابی نے جب دیکھا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی جو بظاہر حالات معقول بھی تھی تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ وہ مدینہ سے ساتھ نکل پڑا تھا مگر دل کے اندر غصہ باقی تھا۔ چنانچہ اسلامی لشکر ابھی مدینہ اور احد کے درمیان تھا کہ عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینہ کی طرف واپس ہوگیا۔ عبد اللہ بن ابی نے کہا:

اطاعهم وعصاني، ما ندري علامَ نقتلُ انفسنا هٰهنا ايها الناس

رسول اللہ نے ان کی بات مان لی اور میری بات نہیں مانی۔ اے لوگو! ہم کو نہیں معلوم کہ ہم اپنی جانوں کو یہاں کیوں ہلاک کریں۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸)

احد کی جنگ میں شکست نے یہ ثابت کیا کہ انھیں لوگوں کی رائے درست تھی جو مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کے لئے کہتے تھے اور باہر نکلنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد غزوۂ خندق (۵ھ) میں اسی رائے کو اختیار کیا گیا اور مدینہ میں رہ کر مقابلہ کی تدبیر کی گئی۔ تاہم تمام بڑے صحابہ اپنے اختلاف رائے کو بھول کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور جنگ میں شدید نقصان اور تکلیف کے باوجود پوری بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ صرف عبد اللہ بن ابی الگ ہوا اور اس کی بنا پر رئیس المنافقین کہلایا۔ عبد اللہ بن ابی کی رائے اصولاً درست تھی۔ تجربہ نے بھی اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی۔ مگر صحت رائے کے باوجود اطاعت سے نکلنا اس کے لئے گمراہی اور خدا کی ناراضی کا سبب بن گیا۔

اسلام میں مشورہ کی بے حد اہمیت ہے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنا مشورہ پیش کرے۔ لیکن ہر مشورہ دینے والا اگر یہ بھی چاہے کہ اس کے مشورہ پر ضرور عمل کیا جائے تو کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا کیونکہ مختلف رایوں میں سے کسی ایک ہی رائے کو عملاً اختیار کیا جا سکتا ہے نہ کہ ہر رائے کو۔ سچے مسلمان وہ ہیں جو مشورہ پیش کرنے کے بعد اپنا مشورہ بھول جائیں اور ذمہ داروں کی طرف سے جو فیصلہ ہو اس کو اس طرح مان لیں جیسے وہی ان کی اپنی رائے تھی۔

"سب سے بڑی قربانی رائے کی قربانی ہے"، کسی شخص کا یہ قول بہت بامعنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے کی قربانی واحد چیز ہے جس کے اوپر کوئی مضبوط اجتماعیت کھڑی ہوتی ہے۔ کوئی عمارت صرف اس وقت بنتی ہے جب کہ کچھ اینٹیں اپنے آپ کو زمین میں دبانے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح کوئی حقیقی اجتماعیت صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ اس کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی رایوں کو اپنے سینہ میں چھپا لیں گے اور اختلاف رائے کے باوجود اتحاد عمل کا ثبوت دیں گے۔ اس قربانی کے بغیر کسی انسانی اجتماعیت کا وجود میں آنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اینٹوں کے بنیاد میں دفن ہوئے بغیر عمارت کا وجود میں آنا۔

قوم فرعون کے سرداروں نے کہا، کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑیں۔ فرعون نے کہا کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔ اور ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور آخری کامیابی اللہ سے ڈرنے والوں ہی کے لئے ہے۔ موسیٰ کی قوم نے کہا، ہم تمھارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمھارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا قریب ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو ۱۲۹ — ۱۲۷

بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کے سامنے جو مسئلہ پیش کیا وہ حکومت کا پیدا کیا ہوا تھا۔ مگر پیغمبر نے اس کا جو حل بتایا وہ یہ تھا کہ اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی مسائل کے بارے میں دنیادار لیڈروں کے سوچنے کے انداز اور پیغمبر کے سوچنے کے انداز میں کیا فرق ہے۔ دنیادار لیڈر اس قسم کے مسئلہ کا حل حکومت کی سطح پر تلاش کرتا ہے، خواہ وہ حکومت سے مصالحت کی صورت میں ہو یا حکومت سے تصادم کی صورت میں۔ مگر پیغمبر نے جو حل بتایا وہ یہ تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہو اس کو برداشت کرتے ہوئے خدا سے مدد کے طالب بنو، حکومت کی طرف سے بے نیاز ہو کر خدا کی طرف رجوع کرو۔

پھر پیغمبر نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ عام قومی ذوق کے خلاف جو حل پیش کر رہا ہے وہ کیوں پیش کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسائل اگرچہ بظاہر اقتدار کی طرف سے پیش آرہے ہیں اور بظاہر اقتدار ہی کے ذریعہ ان کا حل بھی نکلے گا۔ مگر خود اقتدار کیسے کسی کو ملتا ہے۔ وہ محض اپنی تدبیروں سے کسی کو نہیں مل جاتا بلکہ براہ راست خدا کی طرف سے کسی کو دیئے جانے کا فیصلہ ہوتا ہے اور کسی سے چھینے جانے کا۔ جب اقتدار کا تعلق خدا سے ہے تو مسئلہ کے حل کی جڑ بھی یقیناً خدا ہی کے پاس ہو سکتی ہے۔

پھر یہ کہ یہ اقتدار جس کو بھی دیا جائے وہ حقیقتاً اس کے حق میں آزمائش ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بے طاقتی بھی آزمائش ہے اور طاقتور ہونا بھی آزمائش۔ آج جس کے پاس اقتدار ہے، اس کے پاس بھی اسی لئے ہے کہ اس کو آزمایا جائے کہ وہ ظالم اور متکبر بنتا ہے یا انصاف اور تواضع کی روش اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جب اقتدار کا فیصلہ تمھارے حق میں کیا جائے گا اس وقت بھی اس کا مقصد تم کو جانچنا ہی ہوگا۔ جس طرح ایک گروہ کی نااہلی کی بنا پر اس سے اقتدار چھین کر کسی دوسرے گروہ کو دیا جاتا ہے اسی طرح دوسرا گروہ اگر نااہل ثابت ہو تو اس سے بھی چھین کر دوبارہ کسی اور کو دے دیا جائے گا۔

خوش حالی اور اقتدار جس کو آدمی دنیا میں چاہتا ہے وہ حقیقت میں آخرت میں ملنے والی چیز ہے۔ کیونکہ دنیا میں یہ چیزیں بطور آزمائش ملتی ہیں اور آخرت میں وہ بطور انعام خدا کے صالح بندوں کو دی جائیں گی۔

اور ہم نے فرعون والوں کو قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو نصیحت ہو۔ لیکن جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے کہ یہ ہمارے لئے ہے اور اگر ان پر کوئی آفت آتی تو اس کو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے۔ سنو، ان کی بدبختی تو اللہ کے پاس ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ اور انھوں نے موسیٰ سے کہا، ہم کو مسحور کرنے کے لئے تم خواہ کوئی بھی نشانی لاؤ، ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں ۱۳۰—۳۲

کسی بات کو غلط کہنا ہو تو اس کا غلط ہونا لفظوں کی صورت میں بتایا جاتا ہے اور کسی بات کو صحیح کہنا ہو تو اس کو بھی لفظوں ہی کے ذریعہ صحیح کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کو مجرم قرار دینا ہو تو اس کو لفظوں کے ذریعہ مجرم قرار دیا جاتا ہے اور اگر کسی کو برسرِ حق ظاہر کرنا ہو تو اس کا برسرِ حق ہونا بھی لفظوں میں بتایا جاتا ہے۔ مگر الفاظ کا استعمال کرنے والا انسان ہے، اور موجودہ امتحان کی دنیا میں انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ الفاظ کو جس طرح چاہے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔

امتحان کی اس دنیا میں آدمی کو جو آزادی دی گئی ہے اس میں سب سے زیادہ نازک آزادی یہ ہے کہ وہ حق کو باطل کہنے کے لئے بھی الفاظ پالیتا ہے اور باطل کو حق کہنے کے لئے بھی۔ وہ ایک کھلے ہوئے پیغمبرانہ معجزے کو جادو کہہ کر نظرانداز کرسکتا ہے۔ خدا اس کو کوئی نعمت دے تو وہ اس کو ایسے الفاظ میں بیان کرسکتا ہے گویا کہ اس کو جو کچھ ملا ہے اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کی بدولت ملا ہے۔ حق کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے خدا اس کے اوپر کوئی تنبیہی سزا بھیجے تو وہ آزاد ہے کہ اس کو وہ انھیں خداپرست بندوں کی نحوست کا نتیجہ قرار دیدے جن کے ساتھ برا رویہ اختیار کرنے ہی کی وجہ سے اس پر یہ تنبیہ آئی ہے۔ خدا کی طرف سے ہر بات اس لئے آتی ہے کہ آدمی اس سے نصیحت پکڑے۔ مگر الفاظ کے ذریعہ آدمی ہر نصیحت کو ایک الٹا رخ دے دیتا ہے اور اس کے اندر جو سبق کا پہلو ہے اس کو پانے سے محروم رہ جاتا ہے۔

"تم خواہ کوئی بھی نشانی دکھاؤ ہم ایمان نہیں لائیں گے" فرعون کا یہ جملہ بتاتا ہے کہ حق اپنی مکمل صورت میں موجود ہونے کے باوجود صرف اسی کو ملتا ہے جو اس کو پانا چاہے۔ بالفاظ دیگر، جو شخص حق کے معاملہ میں سنجیدہ ہو، جس کے اندر فی الواقع یہ آمادگی ہو کہ حق خواہ جہاں اور جس صورت میں بھی ملے وہ اس کو لے لے گا، اس پر حق کا حق ہونا کھلتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اس معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو۔ جس کا حال یہ ہو کہ جو کچھ اس کے پاس ہے بس اسی پر وہ مطمئن ہے، وہ حق کو حق کی صورت میں دیکھنے سے عاجز رہے گا اور اسی لئے وہ اس کو اختیار بھی نہ کرسکے گا۔ اپنے حال پر مگن رہنا آدمی کو اپنے سے باہر کی چیزوں کے لئے بے خبر بنا دیتا ہے۔ وہ جان کر بھی نہیں جانتا، وہ سن کر بھی نہیں سنتا۔

آدمی اگر غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے تو وہ ضرور حقیقت کو پالے گا۔ مگر اکثر لوگ اپنی نفسیات کے زیر اثر رائے قائم کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقت کو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔

پھر ہم نے ان کے اوپر طوفان بھیجا اور ٹڈی اور جوئیں اور مینڈک اور خون۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ دکھائیں۔ پھر بھی انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ اور جب ان پر کوئی عذاب پڑتا تو کہتے اے موسیٰ، اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کرو جس کا اس نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ اگر تم ہم پر سے اس عذاب کو ہٹا دو تو ہم ضرور تم پر ایمان لائیں گے اور تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ پھر جب ہم ان سے دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لئے جہاں بہر حال انھیں پہنچنا تھا تو اسی وقت وہ عہد کو توڑ دیتے ۱۳۵—۱۳۳

حضرت موسیٰ نے مصر میں تقریباً ۴۰ سال تک پیغمبری کی۔ آپ کے مشن کے دو اجزاء تھے۔ ایک، فرعون کو توحید کا پیغام دینا۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے جانا اور وہاں آزادانہ فضا میں ان کی دینی تربیت کرنا۔ بنی اسرائیل (حضرت یعقوب کی اولاد) اس وقت شدید طور پر قبطی بادشاہ (فرعون) کی گرفت میں تھے۔ قبطی قوم ان کو اپنے زراعتی اور تعمیری کاموں میں بطور مزدور استعمال کرتی تھی۔ اس لئے قبطی حکمراں نہیں چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل مصر سے باہر چلے جائیں۔

حضرت موسیٰ نے ابتداءً جب فرعون سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ مصر سے باہر جانے دے تو فرعون اور اس کے درباریوں نے اس کو سیاسی معنی پہنا کر آنجناب پر یہ الزام لگایا کہ وہ قبطی قوم کو مصر سے نکال دینا چاہتے ہیں (۱۱۰) یہ بات سراسر بے معنی تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰ کا منصوبہ تو خود اپنے آپ کو مصر سے باہر لے جانے کا تھا' اور فرعون نے سیاسی الزام لگایا کہ وہ قبطیوں کو ان کے ملک سے باہر نکال دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت فرعون اور اس کے ساتھی اقتدار کے گھمنڈ میں تھے اس لئے سیدھی بات بھی ان کو ٹیڑھی نظر آئی۔

مگر بعد کے مرحلہ میں خدا نے فرعون اور اس کی قوم پر ہر طرح کی بلائیں نازل کیں۔ ان پر کئی سال تک مسلسل قحط پڑے۔ شدید گرج چمک کے ساتھ اولوں کا طوفان آیا۔ ٹڈیوں کے دل کے دل آئے جو فصل اور باغ کو کھا گئے اور ہر قسم کی سبزی کا خاتمہ کر دیا۔ جوئیں اور مینڈک اس کثرت سے ہو گئے کہ کپڑوں اور بستروں میں جوئیں ہی جوئیں تھیں اور گھروں اور راستوں میں ہر طرف مینڈک ہی مینڈک کودنے لگے۔ دریاؤں اور تالابوں کا پانی خون ہو گیا۔ فرعون اور اس کی قوم جب ان عجیب و غریب مصیبتوں میں مبتلا ہوئے تو وہ کہہ اٹھے کہ خدا اگر ان مصیبتوں کو ہم سے ٹال دے تو ہم بنی اسرائیل کو موسیٰ کے ساتھ جانے دیں گے ——— حضرت موسیٰ کے جس مطالبہ میں پہلے قبطیوں کے اخراج کی سیاسی سازش دکھائی دی تھی وہ اب خود بنی اسرائیل کی ہجرت کے ہم معنی نظر آنے لگی۔

آدمی اپنے کو محفوظ حالت میں پا رہا ہو تو وہ طرح طرح کی باتیں بناتا ہے۔ مگر جب اس سے حفاظت چھین لی جائے اور اس کو عجز اور بے بسی کے مقام پر کھڑا کر دیا جائے تو اچانک وہ حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ اب وہ بات خود ہی اس کی سمجھ میں آجاتی ہے جو پہلے سمجھانے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر انکار کی طاقت رکھتے ہوئے اقرار کرنے کا نام اقرار ہے۔ الفاظ چھن جانے کے بعد کوئی اقرار اقرار نہیں۔

پھر ہم نے ان کو سزا دی اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا ہو گئے۔ اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان کو ہم نے اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا نیک وعدہ پورا ہو گیا بہ سبب اس کے کہ انھوں نے صبر کیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا جو وہ بناتے تھے اور جو وہ چڑھاتے تھے ۱۳۶ — ۱۳۷

انبیاء کی مخاطب قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ تکذیب آیات کی بنا پر آتا ہے یعنی نشانیوں کو جھٹلانا۔ اس کے مقابلہ میں انبیاء کے ساتھیوں پر جو خصوصی نصرت اترتی ہے اس کا استحقاق ان کو صبر کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اپنے جذبات کو تھام کر اللہ کے طریقہ پر ثابت قدم رہنا۔

نشانیوں سے مراد وہ دلائل ہیں جو حق کو حق ثابت کرنے والے ہوتے ہیں مگر آدمی اپنی متکبرانہ نفسیات کی وجہ سے ان کو ماننے پر قادر نہیں ہوتا۔ وہ دلیل کے معاملہ کو دلیل پیش کرنے والے کا معاملہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ دلیل مان لی تو فلاں شخص کے مقابلہ میں میرا مرتبہ گھٹ جائے گا۔ وہ دلیل پیش کرنے والے کے مقابلہ میں اپنے کو بالا رکھنے کی خاطر دلیل کی بالاتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر یہی انسان کی آزمائش کا اصل مقام ہے۔ موجودہ دنیا میں خدا نشانیوں یا دلائل کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے، آخرت میں وہ بے حجاب ہو کر ظاہر ہو جائے گا۔ مگر ایمان وہی معتبر ہے جب کہ آدمی پردہ داری کے ساتھ ظاہر ہونے والے حق کو پالے۔ بے حجابی کے ساتھ ظاہر ہونے والے حق کو ماننا صرف آدمی کے جرم کو ثابت کرے گا نہ کہ وہ اس کو انعام کا مستحق بنائے۔ ایسا اقرار صرف اس بات کا ثبوت ہو گا کہ آدمی نے اپنی بے پروائی کی وجہ سے حق کو نہ جانا۔ اگر وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہوتا تو یقیناً وہ اس کو جان لیتا۔

اس کے مقابلہ میں خدا کے وفادار بندے ہیں جن کی سب سے نمایاں خصوصیت صبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی زندگی سراسر صبر کی زندگی ہے۔ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان سے حق کا اعلان سن کر اس کو مان لینا، عادتوں اور مصلحتوں پر قائم شدہ زندگی کو حق اور اصول کی بنیاد پر قائم کرنا، لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی ایذاؤں کو خدا کی خاطر نظر انداز کرنا، حق کے مخالفین کی ڈالی ہوئی مصیبتوں سے پست ہمت نہ ہونا، یہ سب ایمان کے لازمی مراحل ہیں اور آدمی صبر کے بغیر ان مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔

فرعون کو اپنے اقتدار پر اور اپنے باغوں اور عمارتوں پر گھمنڈ تھا۔ حضرت موسیٰ کی ہجرت کے بعد فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ اولوں اور ٹڈیوں نے مصر کے سرسبز و شاداب باغات کو اجاڑ دیا اور زلزلوں نے ان کی شاندار عمارتیں ڈھا دیں۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ کی چند نسلوں کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے زمانہ میں بنی اسرائیل اطراف مصر (شام و فلسطین) پر قابض ہو گئے۔ نشانیوں کو جھٹلانے والے ہمیشہ خدا کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں اور صبر کرنے والے ہمیشہ خدا کی نصرت کے۔

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ پھر ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کے۔ انھوں نے کہا اے موسیٰ، ہماری عبادت کے لئے بھی ایک بت بنا دے جیسے ان کے بت ہیں۔ موسیٰ نے کہا، تم بڑے جاہل لوگ ہو۔ یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ باطل ہے۔ اس نے کہا، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمھارے لئے تلاش کروں حالاں کہ اس نے تم کو تمام اہل عالم پر فضیلت دی ہے۔ اور جب ہم نے فرعون والوں سے تم کو نجات دی جو تم کو سخت عذاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش تھی ۱۳۸ – ۱۴۱

بنی اسرائیل بحر احمر کے شمالی سرے کو پار کرکے جزیرہ نمائے سینا میں پہنچے۔ پھر شمال سے جنوب کی طرف سمندر کے کنارے کنارے اپنا سفر شروع کیا۔ اس درمیان میں کسی مقام سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل نے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ بت کی پرستش میں مشغول ہے۔ اس وقت بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں نے (نہ کہ سارے بنی اسرائیل نے) یہ تقاضا کیا کہ ان کے لئے ایک بت بنا دیا جائے۔

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ظاہر پرستی ہے۔ وہ غیب میں چھپے ہوئے خدا پر اپنا ذہن پوری طرح جما نہیں پاتا، اس لئے وہ کسی نہ کسی ظاہری چیز میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ کچھ بے شعور لوگ پتھر اور دھات کے بنے ہوئے بتوں کے آگے جھکتے ہیں۔ اور جو لوگ زیادہ مہذب ہیں وہ کسی شخصیت، کسی قوم یا کسی تمدنی ڈھانچہ کو اپنا مرکز توجہ بنا لیتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے کچھ افراد نے جب حضرت موسیٰ سے ظاہری بت گھڑنے کی فرمائش کی تو آپ نے فرمایا یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ سب برباد کیا جانے والا ہے۔ یعنی ہمارا مشن تو یہ ہے کہ ہم ان ظاہری خداؤں کو توڑ کر ختم کردیں اور آدمی کو پوری طرح صرف ایک خدا کا پرستار بنائیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ہم خود ہی اس قسم کا ایک ظاہری خدا اپنے لئے گھڑ لیں۔

"بنی اسرائیل کو تمام اہل عالم پر فضیلت دی" سے مراد کسی قسم کی نسلی فضیلت نہیں ہے بلکہ منصبی فضیلت ہے۔ یہ اسی معنی میں ہے جس میں امت محمدی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "تم خیر امت ہو" اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی گروہ کو اپنی کتاب کا حامل بناتا ہے اور اس کے ذریعہ دوسری اقوام تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ منصب بنی اسرائیل (یہود) کو حاصل تھا، ختم نبوت کے بعد یہ منصب امت محمدی کو دیا گیا ہے۔

فرعون کو یہ موقع ملنا کہ وہ بنی اسرائیل پر ظلم کرے۔ یہ بنی اسرائیل کے لئے بطور آزمائش تھا نہ کہ بطور عذاب۔ اس طرح کی آزمائش اس لئے ہوتی ہے کہ اہل ایمان کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا جائے۔ یہ معلوم کیا جائے کہ کون مشکل حالات میں خدا کے دین سے پھر جاتا ہے اور کون ہے جو صبر کی حد تک خدا کے دین پر قائم رہنے والا ہے۔

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا، میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا، اصلاح کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔ اور جب موسیٰ ہمارے وقت پر آگیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا، مجھے اپنے کو دکھا دے کہ میں تجھ کو دیکھوں۔ فرمایا، تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو تم بھی مجھ کو دیکھ سکو گے۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب ہوش آیا تو بولا میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں ۱۴۲-۱۴۳

حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے بڑے بھائی تھے، حضرت موسیٰ کی عمر ان سے تین سال کم تھی۔ مگر نبوت اصلاً حضرت موسیٰ کو ملی اور حضرت ہارون ان کے ساتھ صرف مددگار کی حیثیت سے شریک کیے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی عہدوں کی تقسیم میں اصل اہمیت استعداد کی ہے نہ کہ عمر یا اسی قسم کی دوسری اضافی چیزوں کی۔

حضرت موسیٰ کو مصر میں دعوتی احکام دیے گئے تھے اور صحرائے سینا میں پہنچنے کے بعد پہاڑی پر بلا کر قانونی احکام دیے گئے۔ اس سے خدائی احکام کی ترتیب معلوم ہوتی ہے۔ عام حالات میں خدا پرستوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ ذاتی زندگی کو درست کریں اور خدا کے پرستار بن کر رہیں۔ اسی کے ساتھ دوسروں کو بھی توحید و آخرت کی طرف بلائیں۔ مگر جب اہل ایمان آزاد اور با اختیار گروہ کی حیثیت حاصل کر لیں، جیسا کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل تھے، تو ان پر یہ فرض بھی عائد ہو جاتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو شرعی قوانین کی بنیاد پر قائم کریں۔

حضرت موسیٰ نے اپنی غیر موجودگی کے لئے جب حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کا نگراں بنایا تو فرمایا: اَصْلِحْ ولا تتبع سبیل المفسدین (۱۴۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی سربراہ کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا بنیادی اصول کیا ہے۔ وہ ہے ــــــ اصلاح اور مفسدین کی پیروی نہ کرنا۔ اصلاح سے مراد یہ ہے کہ مختلف افراد کے درمیان انصاف کا توازن کسی حال میں ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ ہر ایک کو وہی ملے جو اس کو از روئے عدل ملنا چاہیے اور ہر ایک سے وہی چھینا جائے جو از روئے عدل اس سے چھینا جانا چاہیے۔ اس [illegible] میں اکثر اس وقت خرابی پیدا ہوتی ہے جب کہ سردار (؟) مفسدین کی پیروی کرنے لگے۔ یہ پیروی کبھی اس [illegible] ہوتی ہے کہ اس کے مقربین اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر جو کچھ کہیں وہ ان کو مان لے۔ اور کبھی اس طرح ہوتی ہے کہ مفسدین کی طاقت سے خوف زدہ ہو کر وہ خاموشی اختیار کر لے۔

حضرت موسیٰ نے خدا کو دیکھنا چاہا اور جب معلوم ہوا کہ خدا کو دیکھنا ممکن نہیں تو انھوں نے توبہ کی اور بغیر دیکھے ایمان کا اقرار کیا ــــــ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر خدا کو مانے۔ خدا کو دیکھنا ایک اخروی انعام ہے پھر وہ موجودہ دنیا میں کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔

اللہ نے فرمایا، اے موسیٰ میں نے تم کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور اپنے کلام کے ذریعہ سے سرفراز کیا۔ پس اب لو جو کچھ میں نے تم کو عطا کیا ہے۔ اور شکر گزاروں میں سے بنو۔ اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔ پس اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔ عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا ۱۴۵-۱۴۴

حضرت موسیٰ کو پہلی بار نبوت پہاڑ کے اوپر ملی تھی اور دوسری بار بھی توراۃ کے احکام ان کو پہاڑ پر بلا کر دئے گئے۔ یہ اس بات کا ایک اشارہ ہے کہ خدا کا فیضان حاصل کرنے کی سب سے زیادہ موزوں جگہ فطرت کا ماحول ہے نہ کہ انسانی آبادیوں کا ماحول۔ انسانوں کی پرشور دنیا سے نکل کر آدمی جب پتھروں اور درختوں کی خاموش دنیا میں پہنچتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ مصنوعی احساسات سے خالی ہو کر اپنی فطری حالت پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ کسی آدمی کے لئے بہترین لمحہ ہوتا ہے جب کہ وہ بے آمیز فطری انداز میں سوچے اور یکسو ہو کر اپنے رب سے جڑ سکے۔

پیغمبر عام انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی اعتبار سے کوئی غیر انسانی مخلوق نہیں ہوتا۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیدائشی استعداد کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اس لئے خدا اس کو چنتا ہے کہ وہ اس کے پیغام کا حامل بنے اور لوگوں کے درمیان اس کی قابل اعتماد نمائندگی کرے۔ حضرت موسیٰ اس وقت اپنی قوم کے بہترین شخص تھے اس لئے خدا نے ان کو اپنا پیغمبر چنا اور ان پر اپنا کلام اتارا۔

خدا کے کلام میں اگرچہ ہدایت سے متعلق ہر قسم کی ضروری تفصیل موجود ہوتی ہے مگر وہ الفاظ میں ہوتی ہے اور موجودہ امتحانی دنیا میں بہرحال اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ آدمی ان الفاظ کی غلط تشریح کر کے اس کو غیر مطلوب معنی پہنا دے۔ مگر جو شخص ہدایت کے معاملہ میں سنجیدہ ہو اور خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو وہ ان الفاظ سے وہی معنی لے گا جو کلام الٰہی کے شایان شان ہے نہ کہ وہ جو اس کے نفس کو مرغوب ہے۔

"میں عنقریب تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا"، یعنی اپنے اس سفر میں آگے چل کر تم ان قوموں کے کھنڈرات سے گزرو گے جنھیں اس سے پہلے خدا کی ہدایت دی گئی تھی۔ مگر وہ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ حالات کے دباؤ یا جذبات کے میلان کو نظر انداز کر کے وہ اس پر ٹھیک طرح قائم نہ رہ سکے۔ چنانچہ ان کا انجام یہ ہوا کہ وہ ہلاک کر دئے گئے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا انجام بھی دنیا و آخرت میں وہی ہوگا جو ان پچھلی قوموں کا ہوا۔ خدا کا معاملہ جیسا ایک قوم کے ساتھ ہے ویسا ہی معاملہ دوسری قوم کے ساتھ ہے۔ عدل الٰہی کی میزان میں ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اس دنیا میں یہ موقع ہے کہ آدمی اپنی خودساختہ تشریح سے خدا کے احسن کلام کا کوئی غیر احسن مفہوم نکال لے۔ مگر یہ ایسی جسارت ہے جو فرماں برداری کے دعوے دار کو بھی نافرمانوں کی فہرست میں شامل کر دیتی ہے۔

۔میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق گھمنڈ کرتے ہیں۔ اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں۔ اور اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو نہ اپنائیں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنالیں گے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کی طرف سے اپنے کو غافل رکھا۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال اکارت ہو گئے اور وہ بدلے میں وہی پائیں گے جو وہ کرتے تھے ۱۴۶۔۱۴۷

دنیا میں زندگی گزارنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی نے اپنے آنکھ اور کان کھلے رکھے ہوں۔ وہ چیزوں کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھتا اور سنتا ہو۔ ایسے آدمی کے سامنے حق آئے گا تو وہ اس کو پہچان لے گا۔ دنیا میں بکھری ہوئی خدائی نشانیاں اس کو جو سبق دیں گی وہ ان کو پالے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی متکبرانہ نفسیات کے ساتھ جی رہا ہو۔ وہ زمین میں اس طرح رہتا ہو جیسے وہ اس کا مالک ہے، اس کو اپنے ذاتی داعیات کے سوا کسی اور چیز کی پروا نہ ہو۔ وہ سمجھتا ہو کہ یہاں جو کچھ اسے مل رہا ہے وہ اپنی لیاقت کی وجہ سے مل رہا ہے۔ اپنی ملی ہوئی چیزوں میں اس کو کسی اور کی مرضی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس دوسرے آدمی کا استغنار اس کے لئے قبول حق میں رکاوٹ بن جائے گا۔

پہلے آدمی کی نفسیات لینے والی نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اپنے کھلے ذہن کی وجہ سے خدا کے ہر اشارہ کو پڑھ لیتا ہے۔ اور فوراً اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے آدمی کی نفسیات بے نیازی کی نفسیات ہوتی ہے۔ اس کے سامنے حق کے دلائل آتے ہیں مگر وہ ان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے سامنے قدرت خاموش زبان میں اپنا نغمہ چھیڑتی ہے مگر وہ اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس کو اپنے سے باہر کسی سچائی کی طرف رغبت نہیں ہوتی ——— موت کے بعد آنے والی دنیا صرف پہلے لوگوں کے لئے ہے۔ دوسرے لوگ خدا کی ابدی دنیا میں اسی طرح نظر انداز کر دئے جائیں گے جس طرح موجودہ امتحان کی دنیا میں وہ خدا کی بات کو نظر انداز کئے ہوئے تھے۔

گمراہی کا راستہ نفس کے محرکات کے تحت بنتا ہے اور ہدایت کا راستہ وہ ہے جو نفس اور ماحول کے اثرات سے اوپر اٹھ کر خالص خدا کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اب جو لوگ اپنی ذات کی سطح پر جی رہے ہوں، جو صرف اپنے نفس کے اندر ابھرنے والے داعیات کو جانتے ہوں وہ گمراہی کے راستہ کو عین اپنی چیز سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ ہدایت کا راستہ ان کو اپنے مزاج کے اعتبار سے اجنبی دکھائی دے گا اس لئے وہ اس کی طرف بڑھنے میں بھی ناکام ثابت ہوں گے۔

بُرائی کی نفسیات اس چیز کو بآسانی قبول کر لیتی ہے جس میں اس کی بڑائی باقی رہے۔ اور جہاں اس کی بڑائی مشتبہ ہوتی ہو اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیور دں سے ایک بچھڑا بنایا، ایک دھڑ جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے اور نہ کوئی راہ دکھاتا ہے۔ اس کو انھوں نے معبود بنالیا اور وہ بڑے ظالم تھے۔ اور جب وہ پچھتائے اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ گمراہی میں پڑ گئے تھے تو انھوں نے کہا، اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہم کو نہ بخشا تو یقیناً ہم برباد ہوجائیں گے۔ اور جب موسیٰ رنج اور غصہ میں بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف لوٹا تو اس نے کہا، تم نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی۔ کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے پہلے ہی جلدی کرلی۔ اور اس نے تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ہارون نے کہا، اے میری ماں کے بیٹے، لوگوں نے مجھے دبالیا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں۔ پس تو دشمنوں کو میرے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھ کو ظالموں کے ساتھ شامل نہ کر۔ موسیٰ نے کہا، اے میرے رب معاف کر دے مجھ کو اور میرے بھائی کو اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ۱۵۱ — ۱۴۸

بنی اسرائیل کے گروہ میں اس وقت سامری نام کا ایک بہت شاطر آدمی تھا۔ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو حضرت ہارون کی نگرانی میں چھوڑ کر پہاڑ پر چلے گئے تو اس نے لوگوں کو بہکایا۔ اس نے لوگوں سے زیورات لے کر ان کو بچھڑے کی صورت میں ڈھال دیا۔ بت گری کے قدیم مصری فن کے مطابق بچھڑے کی یہ مورت اس طرح بنائی گئی تھی کہ جب اس کے اندر سے ہوا گزرے تو اس کے منھ سے خوار (بیل کی ڈکار کی سی آواز) آئے۔ لوگ عام طور پر عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ چنانچہ اتنی سی بات پر بہت سے لوگ شبہ میں پڑ گئے اور اس کے بارے میں خدائی تصور قائم کرلیا۔ ایک شاطر آدمی نے کچھ عوامی باتیں کرکے بھیڑ کی بھیڑ اپنے گرد جمع کرلی۔ اس کا زور اتنا بڑھا کہ حضرت ہارون اور اغلباً ان کے چند ساتھیوں کے سوا کوئی کھلم کھلا احتجاج کرنے والا بھی نہ نکلا۔ ظاہر ہے کہ جس عوامی طوفان میں پیغمبر کے نائب کی آواز دب جائے وہاں کیسے کوئی بولنے کی جرأت کرسکتا ہے۔

عوام کا ذوق ہر زمانہ میں یہی رہا ہے اور آج بھی وہ پوری طرح موجود ہے۔ آج بھی ایک ہوشیار آدمی اپنی تقریروں اور تحریروں سے کسی نہ کسی "خوار" پر لوگوں کی بھیڑ جمع کرلیتا ہے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ جس چیز کے گرد وہ جمع ہورہے ہیں وہ محض ایک تماشا ہے نہ کہ فی الواقع کوئی حقیقت۔ کوئی سنجیدہ آدمی اگر اس تماشے کی حقیقت کو کھولتا ہے تو اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو بنی اسرائیل کے درمیان حضرت ہارون کا ہوا۔

حضرت موسیٰ نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل مشرکانہ فعل میں مشغول ہیں تو ان کو گمان ہوا کہ حضرت ہارون نے اصلاح کے سلسلہ میں کوتاہی کی ہے۔ چنانچہ غصہ میں انھیں پکڑ لیا۔ مگر جیسے ہی انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنی اصلاحی کوشش میں کوئی کمی نہ کی تھی تو ان کے بیان کے بعد فوراً رک گئے اور اپنے لئے اور حضرت ہارون کے لئے خدا سے دعا کرنے لگے ——— ایک مومن کو دوسرے مومن کے بارے میں بڑی سے بڑی غلط فہمی ہوسکتی ہے مگر معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ ایسا ہوجاتا ہے جیسے اس کو غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کو ان کے رب کا غضب پہنچے گا اور ذلت دنیا کی زندگی میں۔ اور ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں جھوٹ باندھنے والوں کو۔ اور جن لوگوں نے برے کام کئے پھر اس کے بعد توبہ کی۔ اور ایمان لائے تو بے شک اس کے بعد تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے ۱۵۳ — ۱۵۲

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے کو یہاں افترار (جھوٹ باندھنا) کہا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ باطل کام حق کے نام پر کیا تھا۔ انھوں نے اپنا یہ کام خدا کے دین کا انکار کرکے نہیں کیا تھا بلکہ خدا کے دین کو مانتے ہوئے کیا تھا۔ اپنی اس بے دینی کو وہ دینی الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ مشرکین کے عام عقیدہ کی طرح، وہ کہتے تھے کہ خدا ان کی گھڑی ہوئی مورت میں حلول کر آیا ہے۔ اس لئے اس کی عبادت خود خدا کی عبادت کے ہم معنی ہے۔ حتیٰ کہ اس فعل کے لیڈر سامری نے اس کے حق میں کشف و کرامت کی دلیل بھی تلاش کرلی۔ اس نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جبریل آئے ہیں اور میں نے ان کے گھوڑے کے نقش قدم سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اس کے اندر وہ مٹی ڈال دی تو مقدس مٹی کی برکت سے وہ بچھڑا بولنے لگا۔ گویا سامری اور اس کے ساتھی خدا کی طرف ایسی بات منسوب کر رہے تھے جو خدا نے خود نہیں بتائی تھی۔ اس قسم کی نسبت افترار (خدا پر جھوٹ باندھنا) ہے خواہ وہ ایک صورت میں ہو یا دوسری صورت میں۔

کوئی حامل دین گروہ جب اس قسم کا افترار کرتا ہے، وہ بے دینی کے فعل کو دین کا نام دے دیتا ہے، تو یہ چیز خدا کے غضب کو شدید طور پر بھڑکا دیتی ہے۔ اس کے متعلق یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس کو آخرت سے پہلے دنیا کی زندگی ہی میں رسوا کن سزا دی جائے۔ بنی اسرائیل کے لئے یہ دنیوی سزا اس صورت میں آئی کہ حضرت موسیٰ کے حکم پر ہر قبیلہ کے مخلص ذمہ داروں نے اپنے اپنے قبیلہ کے ان افراد کو پکڑا جنھوں نے بچھڑا بنانے کے اس کام میں حصہ لیا تھا اور اس فتنہ میں براہ راست شریک رہے تھے۔ اس کے بعد ہر قبیلہ کے افراد نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے قبیلہ کے مجرمین کو قتل کر دیا۔ اس دردناک انجام سے صرف وہ لوگ بچے جو اپنے اس فعل پر سخت شرمندہ ہوئے اور انھوں نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے توبہ کی۔

بنی اسرائیل کے جرم پر خدا نے جس سزا کا فیصلہ کیا اس کا نفاذ خود ان کی اپنی تلواروں کے ذریعہ کیا گیا۔ تاہم اس قسم کے فیصلہ کا نفاذ کبھی اغیار کی تلواروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اور اغیار کی تلواروں سے اس کا نفاذ اس وقت ہوتا ہے جب کہ سزا کے ساتھ رسوائی کو بھی شامل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا ہو۔

گناہ پر توبہ یہ ہے کہ گناہ ہو جانے کے بعد آدمی اپنے اس فعل پر شدید شرمندہ ہو۔ توبہ کی اصل حقیقت شرمندگی ہے۔ یہ شرمندگی اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود سے فیصلہ کرے کہ آئندہ وہ ایسا فعل نہ کرے گا۔ کوئی گنہ گار جب اس طرح شرمندگی کا اور آئندہ کے لئے پرہیز کے عزم کا ثبوت دے دیتا ہے تو گویا کہ وہ دوبارہ ایمان لاتا ہے، دین کے دائرہ سے نکل جانے کے بعد وہ دوبارہ خدا کے دین میں داخل ہوتا ہے۔

اور جب موسیٰ کا غصہ تھما تو اس نے تختیاں اٹھائیں اور جو ان میں لکھا ہوا تھا اس میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت کے لئے۔ پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا تو موسیٰ نے کہا اے رب، اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ان کو ہلاک کر دیتا اور مجھ کو بھی۔ کیا تو ہم کو ایسے کام پر ہلاک کرے گا جو ہمارے اندر کے بیوقوفوں نے کیا۔ یہ سب تیری آزمائش ہے تو اس سے جس کو چاہے گمراہ کر دے اور جس کو چاہے ہدایت دے۔ تو ہی ہمارا تھامنے والا ہے۔ پس ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔ اور تو ہمارے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ اللہ نے کہا، میں اپنا عذاب اسی پر ڈالتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو۔ پس میں اس کو لکھ دوں گا ان کے لئے جو ڈر رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں ۱۵۴ — ۱۵۶

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ ان کے اندر خدا پر وہ یقین نہیں ہے جو ہونا چاہئے۔ چنانچہ ان کو پہاڑ پر بلایا گیا۔ حضرت موسیٰ مقررہ وقت کے مطابق بنی اسرائیل کے ستر نمائندہ افراد لے کر دربار کوہ طور پر گئے۔ وہاں خدا نے گرج چمک اور زلزلہ کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کئے جس سے بنی اسرائیل کے لوگوں کے اندر انابت و خشیت پیدا ہو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ خدا کے سامنے روئے گڑگڑائے اور اجتماعی توبہ کی۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ تورات کے احکام پر سچائی کے ساتھ عمل کریں گے۔

اس موقع پر حضرت موسیٰ نے دعا کی "اے ہمارے رب، ہمارے لئے دنیا اور آخرت میں بھلائی لکھ دے" اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا "میں جس پر چاہتا ہوں اپنا عذاب ڈالتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے" حضرت موسیٰ کی دعا بحیثیت مجموعی اپنی پوری امت کے لئے تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے جواب میں واضح کر دیا۔ کہ نجات اور کامیابی کوئی گروہی چیز نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ ہر ہر فرد کے لئے اس کے ذاتی عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگرچہ میں تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم ہوں۔ مگر جو شخص عمل صالح کا ثبوت نہ دے وہ میری پکڑ سے بچ نہیں سکتا، خواہ وہ کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

خدا کی کتاب ہدایت و رحمت ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی زندگی میں آدمی کے لئے بہترین رہنما ہے اور آخرت میں خدا کی رحمت کا یقینی ذریعہ۔ مگر خدا کی کتاب کا یہ فائدہ صرف اس کو ملتا ہے جو "ڈر" رکھتا ہو، جس کو اندیشہ لگا ہوا ہو کہ معلوم نہیں خدا میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سچے طالب حق ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے جب حق آتا ہے تو وہ کسی قسم کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر اس کو پا لیتے ہیں۔ اس کے بعد خدا ان کے خوف اور امید کا مرکز بن جاتا ہے۔ ان کا سب کچھ خدا کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ ان کا ڈر ان کے شعور کو بیدار کر دیتا ہے۔ ان کی نگاہ سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والی نشانیوں کو پہچاننے میں وہ کبھی نہیں چوکتے۔ وہ اندیشہ کی نفسیات میں جیتے ہیں نہ کہ قناعت کی نفسیات میں۔

جو لوگ پیروی کریں گے اس رسول کی جو نبی امی ہے، جس کو وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور ان کو برائی سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور قیدیں اتارتا ہے جو ان پر تھیں۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی عزت کی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

۱۵۷

بنی اسرائیل دیکھتے چلے آرہے تھے کہ جتنے نبی آتے ہیں وہ سب ان کی اپنی قوم میں آتے ہیں۔ آخری رسول خدا کے منصوبہ کے مطابق بنی اسماعیل میں آنے والا تھا اس لئے خدا نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ذریعہ انھیں پہلے سے اس کی خبر کر دی۔ ان کی کتابوں میں کثرت سے اس کی پیشین گوئیاں ابھی تک موجود ہیں۔ ایسا اس لئے ہوا تاکہ جب آخری رسول آئے تو وہ کسی بڑے فتنہ میں نہ پڑیں اور بہ آسانی اس کو پہچان کر اس کے ساتھی بن جائیں۔

پیغمبر اسلام پڑھے لکھے نہ تھے۔ آپ امی رسول تھے۔ امیت کے ساتھ پیغمبری، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آخری اور انتہائی صورت میں جمع ہوئی، یہی ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ معرفت خداوندی کا اظہار ہمیشہ "امیت" کی سطح پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ کسی ایسے شخص کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے جو دنیوی معیار کے لحاظ سے اس قسم کے عظیم کام کا اہل نہ سمجھا جاتا ہو۔ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا نے بقراط اور افلاطون کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہو۔

دین کی اصل روح اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب اندرونی روح سرد پڑتی ہے تو ظواہر کا زور بہت بڑھ جاتا ہے۔ اب غیر ضروری موشگافیاں کرکے نئے نئے مسائل بنائے جاتے ہیں۔ روحانیت کے نام پر مشقوں اور ریاضتوں کا ایک پورا ڈھانچہ کھڑا کر لیا جاتا ہے۔ عوامی توہمات مقدس ہو کر نئی شریعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہود کا یہی حال ہو چکا تھا۔ انھوں نے خدا کے دین کے نام پر توہمات اور جکڑبندیوں کا ایک خود ساختہ ڈھانچہ بنا لیا تھا اور اس کو خدا کا دین سمجھتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے ان کے سامنے دین کو اس کی فطری صورت میں پیش کیا۔ غیر ضروری پابندیوں کو ختم کرکے سادہ اور سچے دین کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی۔

پیغمبر جب آتا ہے تو سب سے بڑی نیکی یہ ہوتی ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ مگر یہ ایمان عام معنوں میں محض ایک کلمہ پڑھنا نہیں ہے۔ یہ بے روح ڈھانچہ والے دین سے نکل کر زندہ شعور والے دین میں داخل ہونا ہے۔ سابقہ مذہبی ڈھانچہ سے آدمی کی وابستگی محض تاریخی روایات یا نسلی رواج کے زور پر ہوتی ہے۔ مگر نئے پیغمبر کے دین کو جب وہ قبول کرتا ہے تو وہ اس کو شعوری فیصلہ کے تحت قبول کرتا ہے، وہ رسم سے نکل کر حقیقت کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ سادہ بات ہر دور میں انسان کے لئے مشکل ترین بات ثابت ہوئی ہے۔

کہو اے لوگو، بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے امی رسول و نبی پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کے مطابق رہنمائی کرتا ہے اور اسی کے مطابق انصاف کرتا ہے ۱۵۹ — ۱۵۸

"کہو میں سب انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں" کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے تمام پیغمبر قومی پیغمبر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین اقوامی پیغمبر ہیں۔ یہ بات بطور تقابل نہیں کہی گئی ہے بلکہ بطور واقعہ کہی گئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی دو بعثتیں ہیں۔ ایک براہ راست، دوسری بواسطہ امت۔ آپ کی براہ راست بعثت عرب کے لئے تھی (انعام ۹۲) اور آپ کی بالواسطہ بعثت سارے عالم کے لئے ہے (حج ۷۸) حکمائی نوعیت خدا کے تمام پیغمبروں کی تھی۔ مگر دوسرے پیغمبروں کا دین محفوظ حالت میں باقی نہ رہ سکا اس لئے یہ ممکن نہیں ہوا کہ وہ تمام عالم کے لئے نذیر و بشیر بنتے۔ آج مسیحیت کی تبلیغ سارے عالم میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود حضرت مسیح کی نبوت صرف فلسطین تک محدود ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ حضرت مسیح کے بعد ان کی تعلیمات اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہیں۔ آج مسیحیت کے نام سے جو دین لوگوں تک پہنچ رہا ہے وہ حقیقۃً سینٹ پال کا دین ہے نہ کہ مسیح کا دین۔ گویا نبیوں کے وسعت کار میں جو فرق ہے وہ فرق باعتبار واقعہ ہے نہ کہ باعتبار تفویض۔

پیغمبر عربی کے متعلق بائبل میں یہ پیشین گوئی ہے کہ زمین کے سب قبیلے اس کے وسیلے سے برکت پائیں گے (پیدائش ۱۲) سب قوموں تک آپ کی برکت پہنچنا اس لئے ممکن ہو سکا کہ آپ کا لایا ہوا دین محفوظ ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کا دین محفوظ نہیں۔ اس لئے بظاہر اس کی آواز سب تک پہنچ کر بھی اس کی برکت سب تک نہ پہنچ سکی۔

عرب میں یہودی قبائل آباد تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو یہ فخر تھا کہ ان کے پاس خدا کی مقدس کتاب ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے سے باہر کسی سچائی کو ماننے کے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ ان کا یہ احساس کہ وہ سب سے بڑی سچائی کو لئے ہوئے ہیں ان کے لئے کسی دوسرے کی طرف سے آنے والی سچائی کو قبول کرنے میں مانع ہو جاتا ہے۔ یہی حال یہود کا ہوا۔ ان کی بہت بڑی اکثریت ضد اور تعصب کی نفسیات میں مبتلا ہو گئی۔ صرف چند لوگ (عبداللہ بن سلام وغیرہ) ایسے نکلے جنھوں نے کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھا۔ انھوں نے اپنی دنیوی عزت کی پروا کئے بغیر اس کی صداقت کا اعلان کیا اور اپنی دنیوی زندگی کو اس کے حوالے کر دیا۔

"رسول ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے کلمات (ارشادات) پر" یہ جملہ بتاتا ہے کہ فلسفیوں کے خدا اور پیغمبر کے خدا میں کیا فرق ہے۔ فلسفی کا خدا ایک مجرد روح ہے۔ اس کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے کائنات میں قوت کشش کو ماننا۔ قوت کشش نہ بولتی اور نہ حکم دیتی۔ مگر پیغمبر کا خدا ایک زندہ اور باشعور خدا ہے۔ وہ انسانوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے اور اس حکم کے ماننے یا نہ ماننے پر ہر ایک کے لئے انعام یا سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

جب بگاڑ آتا ہے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جنت کا ملنا نہ مسلمانوں کی تمناؤں پر ہے اور نہ یہود کی تمناؤں پر، جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا اس کو اس کا بدلہ ضرور دیا جائے گا (لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءً یجز بہ، نساء ۱۲۳) یعنی خدا نے جو دنیا بنائی ہے وہ عدل کے اصول پر بنائی ہے۔ یہ عدل کا اصول ہے ——— عمل اور انجام میں مطابقت۔ یہاں کسی کے ساتھ نہ ظلم ہے اور نہ جانب داری۔ یہاں ہر ایک کو ٹھیک وہی ملنے والا ہے جو اس نے کیا ہے۔ نہ کئے پر کسی کے لئے سزا نہیں اور کئے پر کوئی چھوٹ جانے والا نہیں۔ ایسی ایک دنیا میں اگر کوئی گروہ یہ سمجھے کہ اس کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا جائے گا، اس کو اس ترازو پر نہیں تولا جائے گا جس ترازو پر دوسرے لوگ تولے جانے والے ہیں تو یہ صرف اس کی جھوٹی تمنائیں ہیں اور محکم قوانین پر مبنی اس خدائی دنیا میں کسی کی جھوٹی تمناؤں کے لئے یقینی طور پر کوئی جگہ نہیں۔

کسی گروہ کو آسمانی کتاب کا حامل بنانا اس کو دیگر قوموں کے مقابلہ میں خصوصی مقام دینا ہے۔ اس معنی میں پہلے یہود کو افضل الامم (بقرہ ۴۷) کہا گیا تھا۔ اور اسی معنی میں امت محمدی کو خیر الامم (آل عمران ۱۱۰) کہا گیا ہے۔ جو گروہ اس مقام افضلیت پر کھڑا کیا جائے اس پر دنیا میں خدا کے خصوصی انعامات ہوتے ہیں اور آخرت میں اس کے لئے جنت کی بشارتیں دی جاتی ہیں۔ مگر یہ انعامات کسی نسل یا قوم سے تعلق کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ تمام تر کارکردگی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ بعد کے دور میں اس گروہ کے افراد اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ یہیں سے امانی (جھوٹی تمناؤں) کا آغاز ہوجاتا ہے۔ لوگ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ وہ خواہ عمل کریں یا نہ کریں خدا کے وعدے ان کے حق میں ضرور پورے کئے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی کتاب کی حامل کسی قوم کی صحت کیا ہے اور اس کا مرض کیا۔ اس کو اگر آج کل کی زبان میں بیان کرنا ہو تو یہ کہنا درست ہوگا کہ ایسی قوم جب صحیح ایمانی حالت پر ہو تو اس کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج ہوتا ہے اور حالت مرض میں ہو تو خوش خیالی کا۔

آخرت کی سرفرازیاں جن لوگوں کو جھوٹی تمناؤں اور خوش خیالیوں کی بنیاد پر مل رہی ہوں وہ مین اپنی نفسیات کی بنا پر دنیا کے معاملات میں بھی خوش خیال ہوجاتے ہیں۔ ان کی ساخت خوش خیالی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ وہ اپنی فرضی کارروائیوں سے حیرت انگیز طور پر بڑے بڑے نتائج کی امید کرنے لگتے ہیں۔ وہ حقیقت کی اس دنیا میں ایک خوش خیال گروہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

تقویٰ ہر چیز کا بدل

قال علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ : من اراد غنی بلا مال و ھیبۃ بلا سلطان و عزا بلا عشیرۃ فلیتق اللہ فان اللہ یابی ان یذل الا من عصاہ

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص چاہتا ہو کہ اس کو مال کے بغیر دولت مندی اور اقتدار کے بغیر رعب اور قبیلہ کے بغیر قوت ملے تو وہ اللہ سے ڈرے۔ کیونکہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نافرمانوں کے سوا کسی کو ذلیل نہیں کرتا۔

طبیعیاتی دنیا کے لئے اللہ کا ایک اٹل قانون ہے جس کو قانونِ فطرت کہا جاتا ہے۔ جو شخص بھی اس قانون فطرت کی پابندی کرے گا وہ طبیعیات کی دنیا میں کامیاب رہے گا۔ اسی طرح انسانی دنیا میں کامیابی کے لئے بھی اللہ کا ایک قانون ہے۔ اس قانون کا نام تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسانی زندگی کی واحد یقینی شاہراہ ہے۔ جو شخص تقویٰ کی زندگی اختیار کرے وہ آخرت کی دنیا میں جنت کا مستحق بنتا ہے۔ نیز موجودہ دنیا میں بھی اللہ اس کو اپنی نصرت سے کامیاب کر دیتا ہے۔

تقویٰ کیا ہے، اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنا۔ جو شخص اللہ سے ڈرے وہ حد درجہ قابل اعتماد انسان بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ وہ جو وعدہ کرتا ہے اس کو پورا کرتا ہے۔ کسی کا کوئی حق ہو تو وہ حد درجہ ذمہ داری کے ساتھ اس کو ادا کرتا ہے۔ جو شخص ماحول میں اس قسم کا اعتماد حاصل کر لے اس کو دوسروں کا ساز و سامان ملنے لگتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے مال پر تجارت کرے۔ دوسروں کے سودے پر اپنی دکان سجائے۔ دوسروں کے وسائل پر اپنی تعمیر کرے۔ اعتماد سب سے بڑا سرمایہ ہے اور تقویٰ اس اعتماد کو کسی انسان میں کامل درجہ میں پیدا کرتا ہے۔

رعب کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ آدمی کے اندر سے لالچ نکل جائے۔ تقویٰ کسی آدمی کے اندر سے حرص و لالچ کو بالکل نکال دیتا ہے۔ جو آدمی کسی سے ڈرتا نہ ہو۔ کسی سے کوئی غرض نہ رکھتا ہو۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس کی رغبت سے اس کا دل خالی ہو گیا ہو تو اس کے بعد فطری طور پر اس میں خود اعتمادی آجاتی ہے اور خود اعتمادی ایک ایسی تسخیری قوت ہے کہ جس کے اندر وہ پیدا ہو جائے اس سے لوگ مرعوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔

حق پرست آدمی کا ایک نمائندہ خود اس کے حریف کے اندر موجود ہوتا ہے اور یہ انسانی فطرت ہے۔ جس کا یہ حال ہو جائے کہ وہ تمام تر مظلوم ہو اور دوسرا تمام تر ظالم، وہ تمام تر انصاف پر ہو اور دوسرا تمام تر بے انصافی پر، وہ لوگوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرنے والا ہو اور لوگ اس کے معاملہ میں اللہ سے نڈر ہو جائیں تو ایسے شخص کی طرف لوگوں کے دل خود بخود کھنچ اٹھتے ہیں، وہ اکیلا ہوتے ہوئے بھی اپنے لئے بہت سے مددگار پالیتا ہے۔

دور جدید کا شرک

مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۲ ـ ۱۹۵۶) نے لکھا ہے: پہلوں کی عقلوں کو سورج کی شعاعوں اور آگ کے شعلوں نے اگر چندھیایا تھا تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برق کی قوتوں، ایٹم کی طاقتوں، پٹرول کی توانائیوں نے چکا چوند نہیں لگائی ہے۔ بزرگوں کے کارنامے، سورماؤں کی اولوالعزمیوں نے اگر پہلوں کو ان بزرگوں کی پتھر میں کھدی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا تو کیا پچھلوں کے لیڈروں نے اور قائدوں کے کارناموں نے ان کے اسٹیچو اور فوٹو کے ساتھ ساری قومی عزت و فلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے (النبی الخاتم صفحہ ۱۵۶)

جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ نہیں مانتے۔ مگر جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ بھی اکثر مشرکانہ انداز میں اس کو مانتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جس طرح دوسرے معاملات میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اسی طرح شرک کی صورتیں بھی بدل گئی ہیں۔ قدیم شرک کی بنیاد اگر توہمات پر تھی تو جدید شرک کی بنیاد علم اور تہذیب پر ہے۔ بہت سے لوگ صورتوں کی تبدیلی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شرک میں مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن اگر گہرائی کے ساتھ جائزہ لیجئے تو وہ بھی معروف مشرکوں سے کم مشرک نظر نہیں آئیں گے۔

خدا کو ماننے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک فطری سطح اور دوسرے شعوری سطح۔ خدا انسان کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ وہ فطرت انسانی میں ہر دوسری چیز سے زیادہ پیوست ہے۔ اس لئے آدمی ہر حال میں خدا کو ماننے پر مجبور ہے۔ حتیٰ کہ غافل اور ملحد انسان بھی نازک لمحات میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ مگر یہ سب فطری سطح پر خدا کا اقرار ہے۔ اور فطری سطح پر خدا کا اقرار معتبر نہیں۔ خدا کا اقرار صرف وہ معتبر ہے جو شعور کی سطح پر پیدا ہوا ہو۔

مشرک انسان کا معاملہ یہی ہے۔ وہ فطرت کی سطح پر خدا کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ مگر وہ شعور کی سطح پر خدا کا یقین نہیں کر پاتا۔ اس لئے خدا کے رسمی اقرار کے ساتھ وہ کچھ اور ہستیاں بنا لیتا ہے جن سے وہ اپنی امیدوں اور تمناؤں کو وابستہ کر سکے۔ خدا کو اگرچہ وہ مانتا ہے۔ مگر خدا صرف اس کے رسمی عقیدہ کا جزء ہوتا ہے، وہ اس کے شعور کا جزء نہیں ہوتا۔ وہ بظاہر خدا کو مانتا ہے مگر وہ اس کے شعور اور احساس میں ایک زندہ حقیقت کے طور پر شامل نہیں ہوتا۔ وہ اس کے فکر و عمل میں روح بن کر نہیں دوڑتا۔ اس کے شعور کو زندہ یقین اس کے مفروضہ خداؤں سے ملتا ہے۔ اس کے احساس کو تر و تازہ تڑپ ان ہستیوں سے ملتی ہے جن کو اس نے محسوس طور پر اپنے سامنے بٹھا رکھا ہے۔ خدا اس کے روایتی عقیدہ کا جزء ہوتا ہے اور شرکاء

اس کے جیتے جاگتے ذہن کا جزء ہوتے ہیں۔

شرک کسی صورت کا نام نہیں بلکہ حقیقت کا نام ہے۔ اور انسان اتنا ظاہر پسند ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی محسوس خدا گھڑ لیتا ہے۔ وہ خدا کو مانتے ہوئے بھی عملاً دوسروں کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان بھی اتنا ہی مشرک ہے جتنا قدیم زمانہ کا انسان تھا۔ اگرچہ آج کے دیوتاؤں کے نام کچھ اور ہیں اور پہلے کے کچھ اور۔

توحید یہ ہے کہ آدمی اپنی عقیدت اور اپنے اعتماد کے جذبات کو صرف ایک خدا کے ساتھ وابستہ کر دے۔ اور شرک یہ ہے کہ وہ زبان سے تو خدا کو خدا کہے۔ مگر اس کی حقیقی توجہ اور دلچسپیاں خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ لگی ہوئی ہوں۔

موجودہ زمانہ میں بت کی پرستش بہت سے لوگوں نے چھوڑ دی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شرک ختم ہو گیا ہے۔ شرک اب بھی پوری شان کے ساتھ لوگوں کے یہاں موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج پتھر کے بت کے بجائے دوسری چیزیں پوجی جاتی ہیں۔ بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اعلیٰ ترین جذبات کا مرکز اپنے قائدوں اور رہنماؤں کو بنا رکھا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے اداروں اور اپنی جماعتوں کے ساتھ وہی قلبی وابستگی رکھتے ہیں جو خدا کے ساتھ ہونی چاہئے۔ بہت سے لوگ اپنے ملک اور اپنی قوم کو خدا کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لئے معیار زندگی اور مادی ترقیاں وہی برتر مقام حاصل کئے ہوئے ہیں جو خدا کا مقام ہونا چاہئے۔

موجودہ زمانہ میں بت پرستی کا شرک زیادہ تر عوام میں باقی رہ گیا ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کا شرک شخصیت پرستی اور مادہ پرستی ہے۔ لوگ خدا کو مانتے ہوئے اپنی محبوب شخصیتوں کے پرستار بنے ہوئے ہیں۔ وہ زبان سے خدا کا اقرار کرتے ہیں مگر عملاً ان کی ساری گرویدگی صرف مادی مصلحتوں اور دنیوی مفادات سے ہے۔

توحید کا پرستار وہ ہے جس کے جذبات خدا سے اتنا زیادہ وابستہ ہو جائیں کہ اس کی تنہائیاں خدا کی یاد میں بسر ہوتی ہوں۔ اس کو خدا کے تذکرہ سے لذت ملتی ہو۔ وہ اپنی صبح و شام کی زندگی میں خدا کو سب سے اونچا مقام دئے ہوئے ہو۔ اس کی نظر میں خدا کے سوا ہر دوسری چیز ہیچ بن گئی ہو۔ وہ سب کچھ خدا کے حوالے کر کے اپنے آپ کو اس کے لئے خالی کر لے۔

موحد صرف اللہ والا ہوتا ہے اور مشرک اللہ کے ساتھ دوسروں والا بھی۔

جھگڑے سے بچ کر

دو کسانوں کے کھیت ملے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک مینڈ کا جھگڑا ہو گیا۔ ہر ایک کہتا تھا کہ مینڈ میری ہے۔ دونوں کھیت کی مینڈ پر لڑ گئے۔ یہ جھگڑا پہلے "مینڈ" کا تھا پھر وہ "ساکھ" کا مسئلہ بن گیا۔ ہر ایک کو دکھائی دینے لگا کہ مینڈ سے ہٹنا لوگوں کی نظر میں اپنے آپ کو بے عزت کرنا ہے۔ چنانچہ جھگڑا بڑھتا رہا۔ وہ یہاں تک بڑھا کہ دونوں طرف قتل ہوئے، کھیت کاٹے گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی چیزیں جلائیں۔ اس کے بعد معاملہ اور بڑھا۔ وہ پولس اور عدالت کا معاملہ بن گیا۔ مقدمہ بازی کا لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ مقدمات ۲۰ سال بعد صرف اس وقت ختم ہوئے جب کہ ان کے کھیت، باغ، زیورات سب بک گئے۔ ایک معمولی مینڈ کو پانے کے لئے دونوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

یہی مینڈ کا جھگڑا ایک اور کسان کے ساتھ پیدا ہوا۔ مگر اس نے فوری اشتعال کے تحت کارروائی کرنے کے بجائے اس پر غور کیا۔ سمجھ دار لوگوں سے مشورے کئے۔ آخر کار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مینڈ کا جھگڑا مینڈ پر طے نہیں ہوتا۔ جھگڑے کو طے کرنے کی جگہ دوسری ہے۔ یہ سوچ کر اس نے جھگڑے کی مینڈ چھوڑ دی۔

اس نے یہ کیا کہ مسئلہ پر "آج" سے سوچنے کے بجائے "پیچھے" سے سوچنا شروع کیا۔ مینڈ کے واقعہ سے اس کے دل کو بھی چوٹ لگی۔ اس کو بھی اپنے نقصان اور اپنی بے عزتی سے وہی تکلیف ہوئی جو ہر انسان کو ایسے وقت پر ہوتی ہے۔ مگر اس نے اپنے جذبات کو تھاما۔ فوری جوش کے تحت کارروائی کرنے کے بجائے سوچ سمجھ کر اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرے حریف کو میری مینڈ پر قبضہ کرنے کی جرات ہی کیوں ہوئی، اس سوال پر غور کرتے کرتے وہ اس رائے پر پہنچا کہ اس کی وجہ حریف کے مقابلہ میں میری کمزوری ہے۔ میرا اور حریف کا اصل معاملہ مینڈ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ میری پوزیشن میرے حریف کے مقابلہ میں اتنی زیادہ نہیں کہ وہ مجھ سے دبے اور میرے حقوق پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرے۔ ٹھنڈے ذہن سے سوچنے کے بعد اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اگر وہ اپنی طاقت اور حیثیت کو بڑھائے تو وہ زیادہ بہتر طور پر اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اس کے حریف کو اس کے اوپر دست اندازی کی جرأت ہی نہ ہوگی۔

اب اس نے اپنے کھیتوں پر پہلے سے زیادہ محنت شروع کر دی۔ جو طاقت وہ حریف کو برباد

کرنے کی کوششوں میں لگاتا اس طاقت کو اس نے خود اپنی تعمیر میں لگانا شروع کر دیا۔ اس نئی فکر نے اس کے اندر نیا حوصلہ جگا دیا۔ وہ نہ صرف اپنے کھیتوں میں زیادہ محنت کرنے لگا بلکہ کھیتی کے ساتھ کچھ اور قریبی کاروبار بھی شروع کر دیا۔ اس کے نئے شعور کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کو از سر نو منظم کیا۔ وہ خرچ کو کم کرنے اور آمدنی کو بڑھانے کے اصول پر سختی سے عمل کرنے لگا۔ اسی کے ساتھ اپنے بچوں کو تعلیم کی راہ پر لگا دیا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنے ہر بچہ کو اعلیٰ مرحلہ تک تعلیم دلائے گا۔

اس دوسرے شخص کو بھی اپنی کوششوں میں اسی طرح ۲۰ سال لگ گئے جس طرح پہلے شخص کو ۲۰ سال لگے تھے۔ مگر پہلے شخص کے لئے ۲۰ سال بربادی کے ہم معنی تھا، جب کہ دوسرے شخص کے لئے ۲۰ سال آبادی کے ہم معنی بن گیا۔ اس ۲۰ سال میں اس کے بچے پڑھ لکھ کر اچھے عہدوں پر پہنچ چکے تھے۔ اس نے اپنی کھیتی اتنی بڑھالی تھی کہ اس کے یہاں ہل بیل کے بجائے ٹریکٹر چلنے لگا تھا۔ جس کسان سے اس کا مینڈ کا جھگڑا ہوا تھا اس کا وہ پورا کھیت اس نے مینڈ سمیت خرید لیا۔

جس آدمی نے مینڈ کا جھگڑا مینڈ پر طے کرنے کی کوشش کی وہ تباہ ہو گیا۔ اس کے برعکس جس نے مینڈ کو چھوڑ کر دوسرے میدان میں مقابلہ کی کوشش کی وہ آخر کار نہ صرف مینڈ کا مالک بنا بلکہ حریف کا پورا کھیت اس کے قبضہ میں آگیا۔

بجلی کا بلب جلتے جلتے بجھ جائے یا پنکھا چلتے چلتے رک جائے تو ہم بلب کو توڑ کر نہیں دیکھتے یا پنکھے سے نہیں الجھتے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بلب بجھنے اور پنکھا بند ہونے کی وجہ بلب اور پنکھے کے اندر نہیں ان کے باہر ہے۔ اور پھر جہاں سے فرق پڑا ہو وہاں درست کرکے اپنے بلب اور پنکھے کو دوبارہ چلا لیتے ہیں۔ انسانی معاملات بھی اکثر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ بلب اور پنکھے کے معاملہ میں جو بات آدمی کبھی نہیں بھولتا اسی بات کو انسانی معاملہ میں ہمیشہ بھول جاتا ہے۔

آدمی کی یہ عام کمزوری ہے کہ جب بھی اس کی زندگی میں کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی مقام پر اپنا سر ٹکرانے لگتا ہے جہاں مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کہیں پیدا ہوتا ہے اور اس کی وجہ کہیں ہوتی ہے۔ "حال" کا ایک واقعہ اکثر "ماضی" کے کسی واقعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک معاملہ میں کسی کی زیادتی اکثر حالات میں کسی اور معاملہ میں پائی جانے والی ایک صورت حال کے سبب سے وقوع میں آتی ہے۔ ایسی حالت میں بہترین عقل مندی یہ ہے کہ آدمی جائے وقوع پر سر نہ ٹکرائے۔ بلکہ اصل سبب کو معلوم کرکے بات کو وہاں بنانے کی کوشش کرے جہاں بات بگڑ جانے کی وجہ سے اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا ہے جس میں وہ آج اپنے کو مبتلا پاتا ہے۔

قومی ترقی کا راز

قدرت کا یہ قانون ہے کہ مقناطیسی میدان اور حرکت کو یکجا کیا جائے تو وہاں جتنے تار ہوں گے سب میں الکٹران دوڑنے لگیں گے۔ جنریٹر اسی قانون قدرت کو استعمال کرکے بجلی پیدا کرتا ہے۔ اب اگر ایسا ہو کہ جنریٹر چالو کرنے کے بعد کسی تار میں الکٹران دوڑیں اور کسی تار میں نہ دوڑیں تو سارا تمدنی نظام درہم برہم ہو جائے۔ کیونکہ پھر بجلی پیدا کرنے کا عمل رک جائے گا۔ اور جب بجلی پیدا نہ ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری تمدنی مشین ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔

ایک چرواہا سیکڑوں بھیڑ بکریوں کو لے کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں چراتا ہے۔ بکریاں چرتے چرتے اونچی نیچی کھائیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ مگر جب لوٹنے کا وقت آتا ہے تو چرواہا ایک جگہ کھڑا ہو کر آواز دیتا ہے اور اور اس کی ایک آواز پر تمام بھیڑ بکریاں اپنی اپنی جگہ سے نکل کر آواز کی طرف چل پڑتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں گلہ تیار ہو جاتا ہے اور چرواہا ان کو لے کر اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ چرواہے کی آواز کے باوجود بھیڑ بکریاں اپنی اپنی جگہ پر بہری بن کر پڑی رہیں تو چرواہی اور گلہ بانی کا کام کرنا غیر ممکن ہو جائے۔

یہی اصول قوموں کے معاملہ میں بھی ہے۔ کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ کوئی فکر اس کے افراد میں اس طرح اتر جائے کہ وہ پوری قوم کو متحرک کر سکے۔ گستاولی بان نے عربوں کا تاریخی مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

انسانی ترقی کا سب سے بڑا سبب کسی ایک تخیل کی پرستش ہے۔ یہ تخیل خواہ کوئی بھی ہو، اس قدر کافی ہے کہ وہ اتنا قوی ہو کہ قوم میں متحدہ احساس اور متحدہ امید پیدا کر دے۔ اور قوم کے ہر فرد کا اعتقاد اس کی نسبت اتنا زور آور ہو کہ وہ اس کے لئے اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جائے۔ رومیوں کا تخیل شہر روم کی ترقی تھی۔ عیسائیوں کا تخیل عقبیٰ کا آرام حاصل کرنا تھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی انسان نے نئے نئے معبود بنا لئے ہیں جو یقیناً فرضی ہیں مگر ان کے لئے وہ اتنے ہی مؤثر ہیں جتنا قدیم قوموں کے لئے ان کے معبود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ محض ان حوادث کی ایک سرگزشت ہے جن کو انسان نے کسی تخیل کی تلاش میں طے کیا ہے۔ اگر یہ تخیل نہ ہوتا تو انسان ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہوتا اور کسی قسم کا تمدن قائم نہ کر سکتا۔ قوم کا تنزل اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جس دن اس کے پاس کوئی ایسا تخیل نہ رہے جس کی حفاظت کے لئے ہر ایک فرد قوم اپنی جان دینے پر آمادہ ہو۔

عربوں نے ملک کے ملک فتح کئے۔ انھوں نے پہلے حکومت یونان و روم کے جانشینوں سے شکست کھائی۔ مگر وہ بالکل ہمت نہ ہارے۔ انھوں نے انھیں حریف قوموں سے فنون جنگ کو سیکھا۔ جب وہ فن جنگ میں ان کے برابر ہو گئے تو پھر وہ برابر کامیاب ہوتے رہے۔ ہر عرب سپاہی اس تخیل پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار تھا جس کے سایہ میں وہ لڑ رہا تھا۔ اس کے برعکس یونانیوں اور رومیوں کی فوج میں سارا جوش، سارا ولولہ اور سارے اعتقادات مدت دراز سے مر چکے تھے (تمدن عرب ۶۲۹-۳۰)

واقعات کے درمیان

آدمی کی زندگی میں روزانہ جو واقعات پیش آتے ہیں انھیں کے درمیان یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کیا ہے۔ ہر واقعہ ہمارے اندر کسی نہ کسی قسم کی ہلچل پیدا کرتا ہے اور ہماری نفسیات کسی نہ کسی صورت میں اس کا جواب پیش کرتی ہے، جو آدمی خدا کو بھولا ہوا ہے، اس پر جب کوئی واقعہ گزرتا ہے تو اس کا جواب اس کی خواہشات اور اس کے مفادات کے تابع ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے کہ جب اس کی زندگی میں کوئی واقعہ پیش آئے تو وہ خدا کو یاد کرے، وہ اس کے اندر نفسانیت کے جذبات کو نہ ابھارے بلکہ خداپرستی کے جذبات کو ابھارے۔

زندگی میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ کبھی آرام ملتا ہے اور کبھی تکلیف۔ کبھی تعریف سننی ہوتی ہے اور کبھی تنقید۔ کبھی کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے اور کبھی خوش گوار۔ یہ اتار چڑھاؤ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ کامیابی یہ ہے کہ ان واقعات سے آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خداپرستی جاگے۔ خوشی اور آرام ہو تو اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔ کسی سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اندر عجز اور عبدیت کی روح پیدا ہو۔

دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہی ہے کہ مختلف حالات کے درمیان وہ کس قسم کا جواب پیش کرتا ہے۔ دولت واقتدار کے ملنے پر آدمی کے اندر اگر بڑائی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ ناکام ہو گیا اور اگر تواضع کا جذبہ پیدا ہو تو وہ کامیاب ہوا۔ کسی سے اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ضد اور نفرت ابھر آئے تو وہ ناکام رہا اور اگر ہمدردی اور معافی کے احساسات ابھریں تو وہ کامیاب رہا۔ کسی سے معاملہ پیش آنے کی صورت میں اگر آدمی بے انصافی کرنے لگے تو وہ ناکام رہا اور اگر انصاف کے مطابق پورا پورا حق ادا کرے تو وہ کامیاب ہو گیا۔

انتخاب ہورہا ہے

ہماری قریبی کہکشاں میں تقریباً دو سو ارب بہت بڑے بڑے ستارے ہیں اس قسم کی بے شمار کہکشائیں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کائنات ناقابل قیاس حد تک وسیع ہے۔ تاہم ساری معلوم کائنات میں نظام شمسی صرف ایک ہے۔ اسی نظام شمسی میں زمین ہے۔ زمین جیسا کرہ ساری کائنات میں کوئی دوسرا نہیں۔ پھر زمین کے اوپر انسان جیسی انوکھی مخلوق ہے انسان کے اندر زندگی ہے۔ وہ چلتا ہے اور بولتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اور جانتا ہے۔ وہ ذاتی ارادہ کے تحت عمل کرتا ہے۔ یہ انسان ایسی انوکھی چیز ہے جس کے انوکھے پن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اتنا انوکھا انسان اللہ نے کیوں بنایا۔ جواب یہ ہے کہ ــــ ایک اور زیادہ انوکھی اور معیاری دنیا کے باسیوں کا انتخاب کرنے کے لئے جس کا نام جنت ہے۔

موجودہ دنیا ان مخلوقات کی دنیا ہے جو مجبورانہ اطاعت کر رہی ہیں، جو پابند ہو کر اللہ کی تابع ہیں۔ اب اللہ کو ایک ایسی مخلوق درکار ہے جو ارادی اطاعت کرنے والی ہو، جو پابند نہ ہو کر اس کی تابع ہو جائے۔ یہاں ایسے ہی افراد کا چناؤ ہو رہا ہے۔ اللہ کو ایسے لوگ مطلوب ہیں جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائیں۔ جو اللہ کو نہ دیکھتے ہوئے اس کو دیکھنے لگیں۔ جو دنیا میں گھرے رہ کر آخرت والے بن جائیں۔ جو انکار اور سرکشی کا موقع رکھتے ہوئے اعتراف اور اطاعت کا طریقہ اختیار کر لیں یہاں جو افراد اس صلاحیت کا ثبوت دیں گے وہ اگلی زندگی میں جنتی دنیا میں بسائے جائیں گے۔ جنت انتہائی معیاری انسانوں کی انتہائی معیاری بستی ہوگی۔ وہ اتنی حسین اور لذید ہوگی کہ آدمی کبھی اس سے نہ اکتائے گا، وہاں نہ کوئی دکھ ہوگا اور نہ کوئی اندیشہ۔ وہاں انسان کے لئے وہ سب کچھ موجود ہوگا جو وہ چاہے۔

اللہ والے

ہر آدمی کسی نہ کسی چیز کے لئے جیتا ہے۔ کوئی اپنے بیوی بچوں کے لئے جیتا ہے۔ کوئی مال و دولت کے لئے اور کوئی عزت و اقتدار کے لئے۔ مگر اس قسم کی زندگی مومنانہ زندگی نہیں۔ مومنانہ زندگی وہ ہے جب کہ آدمی اللہ کے لئے جینے لگے۔ اس کی سرگرمیاں خدا کے گرد گھومنے لگیں۔ اس کی سوچ اور خواہش پر خدا کا غلبہ ہو جائے۔ وہ زبان کھولے تو یہ سوچ کر کھولے کہ خدا کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کو حرکت دے تو انھیں حدود میں حرکت دے جو خدا کی طرف سے اس کے لئے مقرر ہیں۔

آدمی کے سامنے کسی کی طرف سے ایک بات آتی ہے۔ اس کا نفس اس کے جواب کے لئے فوراً کچھ الفاظ سجھاتا ہے۔ مگر جو اللہ میں جینے والے ہیں وہ نفس کے دئے ہوئے الفاظ کو نہیں دہراتے بلکہ خدا سے الفاظ لے کر بولتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ کل جب میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں گا تو وہاں کون سے الفاظ مانے جائیں گے اور کون سے الفاظ رد کر دئے جائیں گے۔ جن الفاظ کے متعلق اس کا ضمیر کہتا ہے کہ وہ خدا کے یہاں رد ہو جائیں گے ان کو وہ اسی دنیا میں رد کر دیتا ہے اور صرف ان الفاظ کو اپنی زبان پر لاتا ہے جو خدا کے یہاں قبول کئے جانے والے ہوں۔

اسی طرح آدمی کے سامنے ایک معاملہ آتا ہے۔ اس کا نفس فوراً اس کو ایک طریقہ کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر اللہ میں جینے والا آدمی نفس کے بتائے ہوئے طریقہ پر نہیں دوڑ پڑتا بلکہ یہ سوچتا ہے کہ کون سا طریقہ خدا کی ترازو میں انصاف کا طریقہ ثابت ہوگا اور کون سا بے انصافی کا۔ وہ بے انصافی کے طریقے کو چھوڑ دیتا ہے خواہ اس میں اس کو عزت اور دولت ملتی ہو اور انصاف والے طریقے کو پکڑ لیتا ہے خواہ بظاہر اس میں سبکی ہوتی ہو اور دنیا کا نقصان ہوتا ہوا نظر آتا ہو۔ وہ ہر بات کو خدا کے لحاظ سے دیکھتا ہے نہ کہ کسی اور لحاظ سے۔

کمینہ پن نہیں

مومن غلطی کرسکتا ہے مگر وہ کمینہ پن نہیں کرسکتا۔ غلطی وہ ہے جو جذبات سے مغلوب ہوکر وقتی طور پر ہوجائے۔ پھر جب جذبہ ٹھنڈا پڑے تو آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہو۔ وہ شرمندہ ہو کہ مجھ سے ایسا کیوں ہوگیا۔ جس کے ساتھ غلطی ہوگئی ہے اس سے مل کر معافی مانگے۔ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور اگر عملی تلافی کی صورت نہ ہو تو وہ اس کے لئے دعا کرے۔ وہ اللہ سے کہے کہ خدایا تو میری غلطی کو معاف فرما اور میری طرف سے اس کے حق میں دعائے خیر لکھ دے۔ اس کو اپنی غلطی کا اتنا شدید احساس ہو کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔

کمینہ پن اس سے الگ چیز ہے۔ کمینہ پن محض وقتی جذبہ کے تحت نہیں ہوتا۔ وہ مستقل ذہن کے تحت ہوتا ہے، کمینہ آدمی کو اپنے کئے پر شرمندگی نہیں ہوتی، اس کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے بلکہ وہ مقابل کے آدمی کو اور زیادہ تکلیف پہنچاکر خوش ہونا چاہتا ہے۔ کمینہ آدمی کو جب کسی سے شکایت ہوجاتی ہے تو وہ صرف اس سے بے تعلق ہوجانے کو کافی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس پر جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ وہ اس کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ اس کے اوپر جھوٹے مقدمے چلاتا ہے۔ اس کو اکھاڑنے اور اس کو برباد کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ صرف اس کی غلطیوں کو غلطی کہنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ اس کی ہر چیز کو غلط ثابت کرنے میں لگ جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس کی طرف سے بدگمان کرتا ہے۔ وہ اس کے بنتے ہوئے کام کو بگاڑنا چاہتا ہے اور اس کے ملتے ہوئے فائدہ کو بھنگ کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے —— یہ سب کمینہ پن کی صورتیں ہیں اور کمینہ پن اور خدا کا دین دونوں ایک ساتھ کسی شخص کے اندر جمع نہیں ہوسکتے۔

کمینہ پن یہ ہے کہ آدمی اعتراف نہ کرے۔ ایک ہی قسم کی صورت میں وہ اپنے لوگوں سے کچھ معاملہ کرے اور دوسرے لوگوں سے کچھ۔ وہ حسد اور انتقام سے اوپر اٹھ کر نہ سوچ سکے۔ ایسا آدمی خدا سے دور ہوتا ہے اور شیطان سے قریب۔

مومن کی دولت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو خوش خبری دے دو کہ ایک دن آئے گا کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (توبہ ۳۵) یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا اب ہم کون سا مال جمع کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی بابت سوال کیا۔ آپ نے فرمایا:

لیتخذ احدکم قلبا شاکراً ولساناً ذاکراً وزوجۃ مومنۃ تعین احدکم علیٰ امر الآخرۃ (ابن ماجہ)

تم میں سے ہر شخص شکر کرنے والا دل اور یاد کرنے والی زبان کو اپنائے اور مومن بیوی کو جو آخرت کے معاملہ میں اس کی مدد کرے۔

دولت وہی ہے جو زندگی کے مسائل میں کام آئے۔ مومن کے لئے سب سے بڑا مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہوتا ہے، اس لئے وہ اسی چیز کو دولت سمجھتا ہے جو آخرت میں کام آنے والی ہو۔ آخرت میں جو چیز آدمی کے کام آئے گی وہ یہ کہ دنیا میں وہ اس طرح رہے کہ ہر حال میں وہ اللہ کا شکر کرنے والا ہو۔ اس کا دل اس طرح اللہ میں اٹکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کو اللہ کی یاد آتی رہے۔ جو شخص اپنے لئے آخرت والی زندگی پسند کرے وہ اپنی زندگی کا ساتھی بھی کسی آخرت پسند کو بنائے گا۔ ایسے آدمی کے لئے ایسی ایک بیوی بہت بڑی دولت ہے جو دنیا کے بجائے آخرت کو چاہتی ہو۔ جو اس کو دنیا کی وقتی چیزوں کی طرف کھینچ کر نہ لے جائے بلکہ اس کو آخرت کی طرف چلنے میں مدد دے۔

لوگ سونا چاندی کو دولت سمجھتے ہیں۔ مگر مومن کی دولت خدا ہے۔ وہ ان چیزوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جو اس کو خدا سے قریب کرنے والی ہوں۔ جو بعد کو آنے والی دنیا میں اس کو خدا کی رحمتوں کا مستحق بنائیں۔

حالات کا لحاظ ضروری

خالد بن ولید رضؓ اسلامی فوج کے سب سے بڑے سپہ سالار اور فاتح تھے۔ مگر ۱۷ھ میں عین فتوحات کے زمانہ میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ نے ان کو معزول کر دیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ خالد بن ولید رضؓ اپنی جرأت اور دلیری کی وجہ سے بعض اوقات ایسے اقدام کر دیتے تھے جس کے لئے پہلے سے پوری تیاری نہ کی گئی ہو۔ چنانچہ محاصرۂ حمص (۱۷ھ) میں جب کہ ہرقل اہل جزائر سے متفق ہو کر حمص پر حملہ آور ہوا تو خالد بن ولید مرکز خلافت کی ممانعت کے باوجود قلعہ سے باہر نکل آئے اور فوری جنگ پر تیار ہو گئے۔ اطراف و جوانب سے جو اسلامی کمک آنے والی تھی، اس کا انتظار نہیں کیا۔ حضرت عمر رضؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس اقدام کو سخت ناپسند فرمایا۔ شاہ ولی اللہ صاحب اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اگر چہ اس لڑائی میں اللہ کا فضل شامل حال رہا اور تائید الہی سے فتح حاصل ہوئی۔ (مگر اس قسم کا اقدام احتیاط کے خلاف تھا) کیونکہ ایسی صورتوں میں بلا امداد لئے ہوئے جرأت کر کے جنگ میں کود پڑنا بعض اوقات شکست کا باعث ہوتا ہے"۔ (ازالۃ الخفاء)

معاملہ کے وقت راز داری کی قسم

ہجرت کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ نے راستہ کی رہنمائی کے لئے قبیلہ بنو الدیل کے ایک مشرک کی خدمات اجرت پر حاصل کیں۔ اس کا نام عبد اللہ بن اریقط تھا اور وہ حجاز کے راستوں کا ماہر تھا۔ اس شخص نے عرب دستور کے مطابق پانی کے پیالے میں انگلیاں ڈال کر قسم کھائی کہ وہ راز داری کے ساتھ کام کرے گا۔ اس نے معروف شاہراہ کو چھوڑ کر ساحلی راستہ سے آپ کو مدینہ پہنچایا (قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین)

جواب نہ دینا بہادری کے خلاف نہیں

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ غزوۂ احد کے بعد جب مسلمانوں کی جماعت منتشر ہو گئی تو قریش کے سردار ابو سفیان نے قریب آکر آواز دی: کیا تم میں محمدؐ موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا "جواب مت دو" اس کے بعد ابو سفیان نے آواز دی "کیا تم میں ابن ابی قحافہ موجود ہیں" آپ نے فرمایا "چپ رہو"۔ پھر ابو سفیان نے پکار کر کہا "کیا تم میں ابن خطاب موجود ہیں"۔ آپ نے فرمایا چپ رہو، کوئی جواب مت دو۔ جب تین بار جواب نہیں ملا تو ابو سفیان نے کہا "بلاشبہ یہ سب مارے گئے، اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے"۔ عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر ضبط نہ کر سکے اور فرمایا "اے اللہ کے دشمن تو نے جھوٹ کہا۔ اللہ تجھ کو ذلیل ہونے کے لئے زندہ رکھے (بخاری)

سوال بدل کر حقیقت معلوم کر لی

مسلمان جنگ بدر کے لئے کوچ کر رہے تھے۔ راستہ میں مکہ کے دو آدمی نظر آئے۔ ایک قریشی اور دوسرا غلام مسلمانوں نے پکڑنے کی کوشش کی۔ قریشی بھاگ گیا اور غلام کو گرفتار کر لیا گیا۔ لوگوں نے غلام سے مکہ کی فوج کی تعداد پوچھی جو مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ اس نے جواب میں کہا: ان کی تعداد بہت ہے اور ان کی طاقت بڑی ہے"

تی کرنے پر بھی اس نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ اس کے بعد اس غلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے س لایا گیا۔ آپ کے سوال پر بھی اس نے اپنے اسی سابقہ جملہ کو دہرایا: "ان کی تعداد بہت ہے اور ان کی طاقت ی ہے"۔ آپ نے کوشش کی کہ وہ دشمن کی صحیح تعداد بتائے۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ آخر آپ نے اپنے سوال کو ل دیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "وہ لوگ روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں"؟ غلام نے کہا "دس اونٹ" پ نے فوراً کہا: اس حساب سے دشمن کی فوج کی تعداد ایک ہزار ہے۔ کیونکہ ایک اونٹ ایک سو آدمیوں کی دراک کے لئے کافی ہوتا ہے"۔

وہ کام نہ کرو جو تمہارے بس کا نہ ہو

لیفہ ثانی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ۱۳سو برس پہلے فرمایا: جس نے بھیڑئے کی چرواہی کی اس نے ظلم کیا (من استرعی الذئب ظلم، ابن مردویہ عن ابن عمر)

معاملات میں صرف نیک نیت ہونا کافی نہیں

نگ جمل (۳۶ھ) زوروں پر تھی۔ دونوں طرف مسلمانوں کی لاشیں میدان میں گر رہی تھیں۔ حضرت عائشہ رض رچہ جنگ جمل میں شریک تھیں مگر وہ مقام جنگ سے بہت دور تھیں۔ کعب بن سور مسلمانوں کے خون سے یشان تھے۔ وہ حضرت عائشہ کے پاس آئے اور کہا کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے اونٹ پر سوار ہو جائیں ر میدان جنگ کی طرف چلیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی سواری کو دیکھ کر لوگ جنگ سے رک جائیں اور صلح کی ورت پیدا ہو جائے۔ حضرت عائشہ خود بھی باہمی کشت وخون سے پریشان تھیں وہ فوراً راضی ہو گئیں اور اپنے نٹ پر سوار ہو گئیں۔ آپ کے ہودج کے چاروں طرف لوگوں نے احتیاط کی غرض سے زرہیں پھیلا دیں۔ اور ن کے اونٹ کو لا کر ایسے مقام پر کھڑا کر دیا جہاں سے پورا لشکر ان کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر نتیجہ امید کے بالکل خلاف کلا۔ لڑائی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی۔ لوگ سمجھے کہ ام المومنین بنفس نفیس میدان جنگ میں آگئی ہیں اور ان بہادری کے ساتھ لڑنے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ اس طرح ان کی موجودگی مزید اشتعال و اشتداد پیدا کرنے کا بب بن گئی۔ حضرت عائشہ کا اونٹ مسلمانوں کے کشت وخون کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ حضرت علی نے اپنے ساتھیوں ے کہا کہ اس اونٹ کو مار کر گرا دو۔ جب تک یہ اونٹ نہیں گرے گا جنگ نہیں رک سکتی۔

کبھی بولنے کے بجائے چپ رہنا ضروری ہوتا ہے

حد کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے۔ مشہور ہو گیا کہ آپ قتل ہو گئے ان محمد اقد قتل) مسلمان کہنے لگے کہ جب آپ قتل ہو گئے تو اب ہم کس پر لڑیں (علام نقاتل اذا کان محمد ند قتل) اس دہشت میں سب سے پہلے جس نے آپ کو گڑھے میں دیکھا وہ کعب بن مالک انصاری تھے۔ وہ پکار ٹھے: اے مسلمانوں کے گروہ تم کو خوشخبری ہو (یا معشر المسلمین ابشروا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نا انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ چپ رہو (فاشار الیہ الرسول ان اصمت)

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

۱۔	الاسلام		از مولانا وحیدالدین خاں		۱۵—۰
۲۔	مذہب اور جدید چیلنج	..	〃	..	۱۵—۰
۳۔	ظہور اسلام	..	〃	..	۱۵—۰
۴۔	دین کیا ہے	..	〃	..	۲—۰
۵۔	قرآن کا مطلوب انسان	..	〃	..	۵—۰
۶۔	تجدید دین	..	〃	..	۳—۰
۷۔	اسلام دین فطرت	..	〃	..	۳—۰
۸۔	تعمیر ملت	..	〃	..	۲—۰
۹۔	تاریخ کا سبق	..	〃	..	۳—۰
۱۰۔	مذہب اور سائنس	..	〃	..	۵—۰
۱۱۔	عقلیات اسلام	..	〃	..	۳—۰
۱۲۔	فسادات کا مسئلہ	..	〃	..	۲—۰
۱۳۔	انسان اپنے کو پہچان	..	〃	..	۱—۰
۱۴۔	تعارف اسلام	..	〃	..	۲—۵۰
۱۵۔	اسلام پندرھویں صدی میں	..	〃	..	۲—۰
۱۶۔	راہیں بند نہیں	..	〃	..	۳—۰
۱۷۔	دینی تعلیم	..	〃	..	۳—۰
۱۸۔	ایمانی طاقت	..	〃	..	(زیر طبع)
۱۹۔	اتحاد ملت	..	〃	..	
۲۰۔	سبق آموز واقعات	..	〃	..	
۲۱۔	اسلامی تاریخ سے	..	〃	..	
۲۲۔	قال اللہ	..	〃	..	
۲۳۔	اسلامی دعوت	..	〃	..	۳—۰۰
۲۴۔	زلزلۂ قیامت	..	〃	..	۴—۰۰
۲۵۔	سچا راستہ	..	〃	..	۱—۰۰

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) بسلسلۂ فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں :

۱ - الإسلام يتحدى	۲۶۳ صفحات	قیمت	۲۰	روپے
۲ - الدين في مواجهة العلم	۱۱۲ صفحات	"	۱۰	روپے
۳ - حكمة الدين	۸۷ صفحات	"	۸	روپے
۴ - الإسلام والعصر الحديث	۷۷ صفحات	"	۸	روپے
۵ - مسئوليات الدعوة	۳۹ صفحات	"	۲	روپے
۶ - نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶ صفحات	"	۲	روپے
۷ - إمكانات جديدة للدعوة	۳۴ صفحات	"	۲	روپے
۸ - الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲ صفحات	"	۲	روپے
۹ - المسلمون بين الماضي والحال والمستقبل	۶۲ صفحات	"	۵	روپے
۱۰ - نحو بعث إسلامي	۳۲ صفحات	"	۵۰	پیسے

دینی تعلیم

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۴۸ قیمت ۳/- روپے

سچا راستہ

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۱۶ قیمت ایک روپیہ

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

JULY 1981
ISSUE NO. 56

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ٦ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قیمت میں اضافہ

سابقہ اعلان کے مطابق ماہنامہ الرسالہ کی قیمت بڑھا دی گئی ہے۔
ماہ ستمبر ۱۹۸۱ سے اس کی قیمت فی شمارہ تین روپیہ ہوگی۔

●

جو حضرات الرسالہ کی ایجنسی لئے ہوئے ہیں وہ اگر اپنی مطلوبہ تعداد میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو براہ کرم فوری طور پر بذریعہ ڈاک مطلع فرمائیں

●

ایجنسی کے تحت پرچوں کا کمیشن آئندہ حسب ذیل ہوگا:

ایک سو پرچوں تک	۲۵ فی صد
ایک سو سے زائد کے لئے	۳۳ فی صد

ایجنسی کے شرائط کی مزید تفصیل آخر میں ایجنسی کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ ● خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے ● بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

جب سفر ختم ہوگا

اکسپرس ٹرین لمبا سفر طے کرنے کے بعد منزل پر پہنچ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ظاہر ہونے والے آثار بتا رہے تھے کہ آخری اسٹیشن قریب آگیا ہے۔ ٹرین کے سیکڑوں مسافروں میں نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی بستر باندھ رہا تھا۔ کوئی کپڑے بدل رہا تھا۔ کوئی اشتیاق بھری نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، ہر ایک آنے والے پُر مسرت لمحہ کا منتظر تھا جبکہ وہ ٹرین سے اتر کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

اچانک زور کا دھماکا ہوا۔ اکسپرس ٹرین یارڈ میں کھڑی ہوئی دوسری ٹرین سے ٹکرا گئی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ——— خوشیاں اچانک غم میں تبدیل ہوگئیں۔ زندگیاں موت کی آغوش میں سوگئیں، امیدوں کے محل کی ایک ایک اینٹ بکھر گئی۔ ایک کہانی جس کا اختتام بظاہر طربیہ (Comedy) پر ہو رہا تھا، اپنے آخری نقطہ پر پہنچ کر اچانک المیہ (Tragedy) میں تبدیل ہوگیا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا ہے۔ آدمی بے شمار کوششوں کے بعد پُر اعتماد معاشی زندگی بناتا ہے۔ وہ اپنے حوصلوں کو ایک بنے ہوئے گھر کی صورت میں تعمیر کرتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایک کامیاب زندگی کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت اس کی موت آجاتی ہے۔ اپنے گھر کو سونا چھوڑ کر وہ قبر میں لیٹ جاتا ہے۔ اس کا چکنا جسم مٹی اور کیڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی کوششوں کا حاصل اس سے اس طرح جدا ہو جاتا ہے جیسے آدمی اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

"کوٹھی" کا خواب دیکھنے والا مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ "قبر" میں داخل ہو، وہ قبر کے راستہ سے گزر کر حشر کے میدان میں پہنچ جائے۔ یہ دوسری دنیا اس کی آرزوؤں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں وہ اتنا مفلس ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر کپڑا بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ساری کمائی اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس کا زور اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز وہاں اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہوتی جن کے بل پر وہ دنیا میں گھمنڈ کر رہا تھا۔

آہ وہ سفر بھی کیسا عجیب ہے جو عین اختتام پر پہنچ کر حادثہ کا شکار ہو جائے۔

تولے جانے سے پہلے تول لو

موجودہ دنیا میں چیزوں کے دو روپ ہیں۔ ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ یہاں ہر آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے باطنی وجود میں برائی لئے ہوئے ہو مگر زبان سے خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو اچھی صورت میں ظاہر کرے۔ قیامت اس لئے آئے گی کہ ظاہر و باطن کے اس فرق کو مٹا دے۔ قیامت کا زلزلہ تمام ظاہری پردوں کو پھاڑ دے گا تاکہ ہر انسان کے اوپر سے اس کا خول اتر جائے اور وہ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں سامنے آجائے۔

وہ دن بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم ترین شخصیت سمجھے جاتے ہیں اس دن وہ کیڑوں مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب موجود ہوتا ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہو جائیں گے جیسے کہ ان کے منہ میں الفاظ ہی نہیں۔

آج ایک شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ستائے اس کے باوجود اس کو دینداری کے اسٹیج پر بیٹھنے کے لئے نمایاں جگہ ملی ہوئی ہو۔ ایک شخص اپنی شان و شوکت دکھانے کے لئے سرگرم ہو پھر بھی وہ مجاہد اسلام کے نام سے شہرت پائے۔ ایک شخص اپنے اہل معاملہ سے بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے اس کے باوجود امن و انصاف کے اجلاس میں اس کو صدارت کرنے کے لئے بلایا جائے۔ ایک شخص کی خلوتیں اللہ کی یاد سے خالی ہوں مگر اجتماعی مقامات پر وہ اللہ کے نام کا جھنڈا اٹھانے والا سمجھا جاتا ہو۔ ایک شخص کے اندر مظلوم کی حمایت کا کوئی جذبہ نہ ہو اس کے باوجود اخبارات کے صفحہ پر اس کو مظلوموں کے حامی کی حیثیت سے نمایاں کیا جا رہا ہو۔

ہر آدمی کی حقیقت خدا کے علم میں ہے مگر دنیا میں خدا لوگوں کی حقیقت چھپائے ہوئے ہے۔ آخرت میں وہ ہر ایک کی حقیقت کھول دے گا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا کی ترازو کھڑی ہو اور ہر آدمی کو تول کر دکھا دیا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔ اس وقت کا آنا مقدر ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو ٹال سکتا اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا۔ کامیاب صرف وہ ہے جو آج ہی اپنے کو خدا کی ترازو میں کھڑا کرے۔ کیونکہ جو شخص کل خدا کی ترازو میں کھڑا کیا جائے اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

لعنت کیوں

یہود کو اللہ تعالیٰ نے افضل الامم قرار دیا تھا، ان کو تمام دنیا والوں کے اوپر فضیلت عطا کی تھی (بقرہ ۴۷) ان کے لئے دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس کے بعد یہود میں بگاڑ آیا۔ جس کے نتیجہ میں خدا ان سے ناراض ہوا۔ یہاں تک کہ ان پر لعنت کر دی گئی۔ یعنی وہ ہر قسم کے خیر سے دور کر دئے گئے۔ ان کے لئے دنیا میں محکومی لکھ دی گئی اور آخرت میں عذاب۔

یہود کے وہ کون سے جرائم تھے جن کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی، ان کا ذکر قرآن میں تفصیل سے موجود ہے۔ یہاں اس سلسلے میں کچھ حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

حق کو پہچان لینے کے باوجود اس کو نہ ماننا	بقرہ ۸۹
خدا کی طرف سے ملی ہوئی سچائی کو چھپانا اور اس کو لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا	بقرہ ۱۵۹
خدا کے حکم کو سیاق و سباق سے ہٹا کر اس کا خود ساختہ مفہوم نکالنا	نسار ۴۶
سچے اہل ایمان کی ضد میں غیر اللہ کے پرستاروں کو اچھا بتانا	نسار ۵۲
کسی مسلمان کو جان بوجھ کر ناحق ہلاک کرنا	نسار ۹۳
خدا کے دین کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرنا	مائدہ ۱۳
اپنے درمیان ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر برائی کرتے دیکھنا مگر اس کو روکنے کی کوشش نہ کرنا	مائدہ ۷۹
ایمان و اسلام کا دعوے دار ہوتے ہوئے نفاق کی روش اختیار کرنا	توبہ ۶۸
اللہ نے جن لوگوں سے جُڑنے کا حکم دیا ہے ان سے قطع تعلق کا معاملہ کرنا	رعد ۲۵
باعصمت خواتین پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگانا	نور ۲۳
بے آمیز حق پر قائم ہونے کے سبب سے کسی شخص کو ستانا	مائدہ ۶۰
اختیار پا کر اس کو بگاڑ اور بے انصافی کے لئے استعمال کرنا۔	محمد ۲۲

یہ چند علامتی برائیاں جو یہاں نقل کی گئیں وہ سب کی سب آج مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہیں۔ ان میں نہ صرف ان کے چھوٹے گرفتار ہیں بلکہ ان کے بڑے بھی پوری طرح ان میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر مسلمان یہ سمجھیں کہ وہ خدا کی اُس سنت سے مامون ہیں جس کی پکڑ میں یہود آ گئے تو خدا کی اس محکم دنیا میں اس سے زیادہ نادانی کی بات اور کوئی نہ ہوگی۔ خدا کے یہاں نہ یہود کی خوش خیالیوں کا کوئی اعتبار ہے اور نہ مسلمانوں کی خوش خیالیوں کا۔ جو بھی برا عمل کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا (نسار ۱۲۳)

بے خوفی کا راز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ ذات الرقاع ہے جو سنہ ۴ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے صحیح بخاری (کتاب المغازی) میں نقل ہوا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں بھی یہ واقعہ معمولی فرق کے ساتھ آیا ہے۔

بنو غطفان کا ایک شخص جس کا نام غورث ابن الحارث تھا، اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا میں تمھارے لئے محمد کو قتل کر دوں (الا اقتل لکم محمدا) انھوں نے کہا ضرور، مگر تم کیسے ان کو قتل کروگے۔ غورث نے کہا: میں ان کو غفلت کی حالت میں پکڑوں گا اور قتل کر دوں گا۔ اس کے بعد غورث روانہ ہوا۔ وہ ایک مقام پر پہنچا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اس مقام پر درخت اور جھاڑیاں تھیں لوگ جھاڑیوں کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ رسول اللہ علیہ وسلم بھی ایک درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے اور اپنی تلوار آپ نے درخت کی شاخ سے لٹکا دی تھی۔ اتنے میں مذکورہ اعرابی (غورث) آپ کو تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس نے جب دیکھا کہ آپ تنہا لیٹے ہوئے ہیں اور آپ کی تلوار بھی آپ سے الگ درخت کے اوپر لٹک رہی ہے تو اس نے بڑھ کر آپ کی تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر تلوار کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا اور کہا: آپ کو کون مجھ سے بچائے گا (یا محمد من یمنعک منی) آپ نے فرمایا اللہ عز وجل۔ اعرابی نے تلوار کو ہلاتے ہوئے کہا: اپنی اس تلوار کی طرف دیکھو جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تم کو اس سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں تم سے کیوں ڈروں۔ جب کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ مجھے بچائے گا (یمنعنی اللہ منک) آپ کے پُر اعتماد جواب کے بعد اعرابی کو اقدام کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے تلوار میان میں ڈال کر آپ کو واپس کر دی (فشام الاعرابی السیف) اب آپ نے اعرابی کو بٹھایا اور لوگوں کو آواز دی۔ لوگ آئے تو دیکھا کہ ایک اعرابی آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے پورا قصہ بتایا۔ اعرابی سہما ہوا تھا کہ اب شاید تلوار میری گردن پر چلے گی۔ مگر آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس کو کوئی سزا نہ دی (سیرت ابن ہشام جلد ۳، تفسیر ابن کثیر جلد اول)

جو لوگ اللہ پر پورا بھروسہ کر لیں ان کو کسی دوسری چیز کا خوف نہیں رہتا۔ یہ عقیدہ کہ اللہ ایک زندہ اور طاقت ور ہستی کی حیثیت سے ہر وقت موجود ہے، ان کو ہر دوسری طاقت کے مقابلہ میں نڈر بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں کسی شخص کی سب سے بڑی طاقت بے خوفی ہے۔ دشمن کو اگر یقین ہو جائے کہ اس کا حریف اس سے نہیں ڈرتا تو وہ خود اس سے ڈرنے لگتا ہے۔

موت کے غار میں بھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دعوت کا آغاز کیا تو آپ کی شدید ترین مخالفت کی گئی۔ آپ کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ آپ کو دبانے اور ناکام کرنے کے لئے وہ لوگ جو کچھ کر سکتے تھے وہ سب انھوں نے کیا۔ مگر آپ کا مشن بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ مدینہ کے لوگوں تک اسلام کی آواز پہنچی۔ وہاں کثرت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ آپ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کو بھی مکہ والے بہت ستاتے تھے۔ آپ نے مکہ کے مسلمانوں سے کہا مدینہ میں اللہ نے تمھارے لئے کچھ بھائی اور مددگار مہیا کر دئے ہیں، تم لوگ وہاں چلے جاؤ۔ لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے۔ قریش کو اس منصوبہ کا علم ہوا تو انھوں نے کوشش کی کہ لوگوں کو جانے سے روکیں۔ کچھ لوگوں کو مارا، کچھ لوگوں کو پکڑ کر گھروں میں بند کر دیا۔ تاہم بیشتر لوگ کسی نہ کسی طرح مکہ سے مدینہ پہنچ گئے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری تھی۔ قریش کو اندازہ ہوگیا کہ تمام مسلمانوں کو مدینہ بھیجنے کے بعد اب پیغمبر اسلام خود بھی مدینہ چلے جائیں گے۔ چنانچہ بنو ہاشم کے سوا تمام قبائل قریش کے سردار دار الندوہ (قصی بن کلاب کا مکان) میں جمع ہوئے۔ مشورہ میں مختلف تجویزیں سامنے آئیں۔ بالآخر اس رائے پر اتفاق ہوا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی تلوار لے اور بیک وقت حملہ آور ہو کر محمدؐ کو قتل کر دے۔ اس طرح محمدؐ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے گا۔ بنو ہاشم تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور قصاص کے بجائے دیت پر راضی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اگلی رات کو تمام سرداروں نے آپ کا مکان گھیر لیا۔ تاکہ صبح کو جب آپ گھر سے باہر نکلیں تو اچانک حملہ کر کے آپ کا خاتمہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام حالات کی خبر تھی اور آپ بھی خاموشی کے ساتھ اپنی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، چنانچہ اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق آپ اسی رات کو ابوبکر صدیق رضؓ کے ساتھ مکہ سے نکل گئے۔ آپ مکہ سے چل کر چار میل کے فاصلہ پر جبل ثور کے ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ آپ کو اندازہ تھا کہ قریش کو جب معلوم ہوگا کہ آپ مکہ سے چلے گئے ہیں تو وہ آپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلیں گے۔ اس لئے آپ چاہتے تھے کہ چند دن غار ثور میں گزاریں اور جب قریش کی تلاش رکے تو مدینہ کا سفر کریں۔

اب قریش کے سوار چاروں طرف آپ کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دستہ غار ثور تک بھی پہنچ گیا۔ یہ لوگ تلواریں لئے ہوئے غار ثور کے پاس اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے پاؤں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دکھائی دے رہے تھے۔ یہ انتہائی خطرناک لمحہ تھا۔ ابوبکر صدیق نے کہا: اے خدا کے رسول، دشمن تو یہاں تک پہنچ گیا۔ آپ نے کہا لا تحزن ان اللہ معنا (غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے) پھر اطمینان کے ساتھ فرمایا: اے ابوبکر، ان دو کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو (یا ابا بکر ما ظنک باثنین اللہ ثالثھما)

لطیف تجربات

الاصمعی عبد الملک بن قریب کا بیان ہے کہ میں نے بصرہ میں دیکھا کہ دو قبریں ہیں، ان کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی ہوئی رو رہی ہے۔ غم کی وجہ سے اس کا برا حال ہو رہا ہے۔ میں قریب ہوا تو میں نے سنا کہ وہ ان الفاظ میں دعا کر رہی ہے:

اللھم انك كائن قبل كل شيئ وانك كائن بعد كل شيئ وانك خالق كل شيئ وانك یارب قد خلقت ابوی من قبلی ثم خلقتنی بعد هما منهما وانك آنستنی بهما ماشئت ثم اوحشتنی منهما اذ شئت۔ اللّٰهم فكن لهما راحما وكن لی بعد هما حافظا

اے اللہ، تو ہی سب سے پہلے ہے اور تو ہی سب سے بعد ہے۔ تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اے میرے رب تو ہی نے میرے ماں باپ کو مجھ سے پہلے پیدا کیا، اس کے بعد ان دونوں سے مجھ کو پیدا کیا۔ تو نے ان کے ساتھ مجھے سکون دیا جب تک تو نے چاہا اور پھر جب چاہا تو نے ان کو مجھ سے جدا کر دیا۔ اے اللہ، تو ان دونوں پر رحم فرما اور ان کے بعد میری حفاظت فرما۔

اصمعی کا بیان ہے کہ اس لڑکی کے حسن کلام نے میری عقل کو مبہوت کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اے بیٹی اپنے کلام کو پھر ایک بار دہرا۔ یہ سن کر اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولی: اے شیخ، خدا کی قسم میں تمہاری بیوی نہیں کہ تم مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو۔ تم کو اپنے گھر والوں سے بے تکلف ہونا چاہیے۔ اصمعی کہتے ہیں: خدا کی قسم میں یہ سن کر شرما گیا اور وہاں سے بھاگ آیا (ففررت والله عنها حیاء منها)

ایک معمولی لڑکی کے لئے یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ اتنے گہرے انداز میں دعا کرے۔ اس کی وجہ وہ حادثہ تھا جو اس پر گزرا۔ آدمی جب کسی جھٹکے سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر چھپے ہوئے لطیف جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں پالیتا ہے جو اس نے اس سے پہلے نہیں پائی تھیں۔ وہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جو اس سے پہلے کبھی اس کی زبان پر نہیں آئے تھے۔ آدمی طبعی طور پر آسودگی کے حالات کو پسند کرتا ہے۔ مگر آسودگی کسی آدمی کو صرف اس قیمت پر ملتی ہے کہ وہ ان ربانی تجربات سے محروم رہ جائے جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے تھے۔

بے کچھ سے سب کچھ تک

جو شخص کم فائدہ پر قناعت کرے گا وہ بڑے فائدہ کا مالک بنے گا ——————— یہ ایک ایسا بے خطا اصول ہے جو اپنے اندر ابدی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ جس معاملہ میں بھی اس کو آزمائیں گے یقینی طور پر آپ کامیاب رہیں گے۔

ایک شخص نے بازار میں چھوٹی سی دکان کھولی۔ وہ کپڑا دھونے کا صابن اور کچھ اور چیزیں بیچتا تھا۔ اس کی دکان پر بہت جلد بھیڑ لگنے لگی۔ دن کے کسی وقت بھی اس کی دکان گاہکوں سے خالی نہ رہتی۔ اس کا راز یہ تھا کہ وہ دو روپے کا صابن پونے دو روپے میں بیچتا تھا۔ آدمی اگر چار صابن خریدے تو عام نرخ کے لحاظ سے اس کا ایک روپیہ بچ جاتا تھا۔ ایک آدمی نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پونے دو روپیہ اس صابن کی تھوک قیمت ہے۔ دکان دار کو وہ صابن کارخانہ سے پونے دو روپے میں ملتا تھا اور اسی دام پر وہ اس کو گاہکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔

اس آدمی نے دکان دار سے پوچھا کہ تم دام کے دام صابن بیچتے ہو۔ پھر تم کو اس میں کیا فائدہ ملتا ہے۔ دکان دار نے کہا کہ میری دکان پر اتنا صابن بکتا ہے کہ اس کی ۲۵ پیٹیاں دن بھر میں خالی ہو جاتی ہیں۔ میں ان خالی پیٹیوں کو ایک روپیہ فی پیٹی کے حساب سے ۲۵ روپیہ میں بیچ دیتا ہوں، اس طرح ہر روز میرے ۲۵ روپے بچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب آدمی میرے یہاں سے صابن لیتا ہے تو اکثر وہ کچھ نہ کچھ دوسری چیزیں بھی خرید لیتا ہے، یہ فائدہ اس کے علاوہ ہے۔

یہ دکان دار دھیرے دھیرے ترقی کرتا رہا۔ اس کا نفع پہلے ۲۵ روپے روز تھا۔ پھر ۵۰ روپے روز ہوا۔ پھر وہ سو روپے اور دو سو روپے روز تک پہنچا۔ آدمی نے پیسہ بچا کر اپنے بغل کی دکان بھی حاصل کر لی اور دونوں کو ملا کر ایک کافی بڑی دکان بنالی۔ اب اس کا کاروبار اور بڑھا۔ یہاں تک کہ دس سال میں وہ شہر کا ایک بڑا دکان دار بن گیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے امکانات کس قدر زیادہ ہیں۔ حتیٰ کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی آج "بے نفع" کی تجارت شروع کرے اور کل وہ زبردست نفع والا تاجر بن جائے۔ آج وہ اپنے آپ کو "بے کچھ" پر راضی کرے اور کل وہی وہ شخص ہو جو "سب کچھ" کا مالک بنا ہوا ہو۔ مگر دنیا کے ان بے حساب امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کی لازمی شرط صبر اور عقل مندی ہے۔ جس کے پاس صرف بے صبری اور نادانی کا سرمایہ ہو اس کے لئے دنیا کے بازار میں کچھ نہیں۔

معمولی تدبیر سے

ایک ڈاکٹر نے مطب شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کامیاب ہوگیا۔ انھوں نے یہ خصوصیت دکھائی کہ وہ ہر آنے والے مریض کو سلام میں پہل کرتے۔ عام طور پر ڈاکٹر لوگ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مریض ان کو سلام کرے۔ یہاں ڈاکٹر نے خود مریض کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ یہ طریقہ کامیاب رہا اور جلد ہی ان کا مطب خوب چلنے لگا۔ حالانکہ وہ باقاعدہ سند یافتہ نہیں تھے صرف "آر۔ ایم۔ پی" تھے۔

ایک دکان دار نے دیکھا کہ گاہک کے پاس اگر کئی نوٹ ہیں تو عام طور پر وہ میلے اور پھٹے ہوئے نوٹ دکان دار کو دیتا ہے اور اچھے اور صاف نوٹوں کو بچا کر جیب میں رکھتا ہے۔ اس سے دکان دار نے سمجھا کہ گاہک صاف نوٹ کو پسند کرتا ہے۔ اس نے گاہک کی اس نفسیات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ اصول بنایا کہ جب کوئی گاہک اس سے سامان خریدے گا اور قیمت ادا کرنے کے لئے بڑا نوٹ دے گا تو وہ حساب کرتے وقت ہمیشہ گاہک کو نئے اور صاف نوٹ لوٹائے گا۔

دکان دار کے بکس میں ہر طرح کے نوٹ ہوتے۔ مگر جب وہ گاہک کو دینے کے لئے اپنا بکس کھولتا تو پرانے اور پھٹے ہوئے نوٹوں کو الگ کرتا جاتا اور نئے نوٹ چھانٹ کر گاہک کو دیتا۔ نئے نوٹ حاصل کرنے کے لئے اس نے یہ کیا کہ اپنے تمام پرانے نوٹ جمع کر کے اپنے بینک کو دے دیتا اور اس کے بدلے بینک سے چھوٹے نئے نوٹ حاصل کر لیتا۔ وہ نئے نوٹوں کو اپنے بکس کے پرانے نوٹوں میں ملا دیتا تاکہ گاہک کے سامنے دونوں قسم کے نوٹ ہوں اور وہ دیکھے کہ اس کا دکان دار بکس کے خراب نوٹوں کو الگ کرتا جا رہا ہے اور صاف نوٹوں کو چھانٹ چھانٹ کر اسے دے رہا ہے۔

دکان دار کی یہ تدبیر بظاہر معمولی اور بے قیمت تھی۔ مگر اس نے گاہکوں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ سمجھے کہ ان کا دکان دار ان کا بہت خیال کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے اس معمولی تدبیر سے گاہکوں کے دل جیت لئے۔ اس کی دکان اتنی کامیاب ہوگئی کہ ہر وقت اس کے یہاں بھیڑ لگی رہتی۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ آپ اپنے اندر کوئی امتیازی خصوصیت پیدا کریں، آپ یہ ثابت کریں کہ آپ لوگوں کے ہمدرد ہیں۔ یہ کام کسی معمولی تدبیر سے بھی ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ محض چند الفاظ بولنے یا پرانے نوٹ کے بدلے نیا نوٹ دینے سے بھی۔

خوش خیالی حقیقت کا بدل نہیں

سڑک پر مجمع ۲۱ نمبر کی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک بس آتی دکھائی دی اور سارے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ "اوہ! یہ تو ۱۲ نمبر کی بس ہے"۔ بورڈ دیکھ کر ایک شخص بولا۔ "۱۲ کو ۲۱ کر لو اور چلے جاؤ" دوسرے نے کہا۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف مذاق تھا۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ کھریا مٹی لے کر بس پر اپنا مطلوبہ نمبر لکھے اور اس پر بیٹھ کر سمجھے کہ اب وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ یہ ہندسہ کا فرق نہیں، حقیقت کا فرق تھا۔ اور حقیقت کے فرق کو ہندسہ کے فرق سے بدلا نہیں جا سکتا —— یہ بات اپنی ذاتی زندگی کے معاملات میں ہر شخص جانتا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ ملت کے رہنما جب ملت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اٹھتے ہیں تو وہاں وہ اس انتہائی معلوم حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندسہ کو بدل کر وہ اس کام کا کریڈٹ حاصل کر لیں جو اسباب کی اس دنیا میں صرف حقیقت کو بدلنے کے نتیجہ میں کسی کو ملتا ہے۔

ایک ایسا سماج جہاں امتیاز اور لیاقت کی بنیاد پر لوگوں کو درجات ملتے ہیں، ہم مراعات اور تحفظات کے عنوان پر کانفرنس کر رہے ہیں۔ ایک ایسا نظام جہاں علمی اور اقتصادی طاقت کے بل پر قوموں کے فیصلے ہوتے ہیں، ہم احتجاج اور مطالبات کے پوسٹر دیواروں پر چپکا رہے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں زبان و بیان نے بالکل نیا انداز اختیار کر لیا ہے، ہم اپنے روایتی کتب خانہ کے بورڈ پر "دور جدید" کا لفظ لکھنے کے لئے آرٹسٹ کی خدمات حاصل کر رہے ہیں۔ ایک ایسا زمانہ جہاں عالمی ذہن نے سیاست کو سیکولر بنیادوں پر قائم کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، ہم عوام کا ذہن بدلے بغیر بیلٹ بکس سے اسلامی نظام برآمد کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسی آبادی جہاں اختلاف اور شکایت کے گہرے مادی اسباب موجود ہیں، ہم لفظی تقریروں کے کرشمے دکھا کر حالات کو درست کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں ہم تعلیم، اقتصادیات، باہمی اتحاد ہر لحاظ سے تمام گروہوں میں سب سے پیچھے ہیں، ہم جلسوں اور کنونشنوں کے ذریعہ ملک کی قسمت بدلنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ایک ایسا جغرافیہ جہاں ہمارے پاس اپنے تحفظ کی بھی طاقت نہیں، ہم "حریف کو نقصان پہنچاؤ" کا طریق کار اختیار کر کے باعزت زندگی حاصل کرنے کی تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔ اس قسم کی تمام باتیں اسی طرح بے معنی ہیں جس طرح ۱۲ نمبر کی بس پر ۲۱ نمبر لکھ کر اپنی منزل کی طرف سفر شروع کرنا۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی۔ کسی چیز کو اگر اس کے فطری طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے ضروری اسباب فراہم کر دئے جائیں تو اس کا حصول اسی طرح ممکن ہو جاتا ہے جیسے رات پوری ہونے کے بعد سورج کا نکلنا۔ لیکن اگر فطرت کے مقررہ طریقہ سے انحراف کیا جائے اور مطلوبہ چیز کے مطابق ضروری اسباب جمع نہ کئے جائیں تو اس کے بعد ناکامی اتنی ہی یقینی ہو جاتی ہے جتنی پہلی صورت میں کامیابی۔ عالم فطرت پر یہ انسان کا حق ہے کہ وہ اس کو کامیاب کرے۔ مگر وہ کامیاب اس کو کرتا ہے جو اس کے مقررہ شرائط کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو۔

شکر کی اہمیت

چارلس رشٹر (Charless Richter) ایک امریکی سائنس داں ہیں۔ وہ زلزلہ کے ماہرین میں سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مخصوص پیمانہ دریافت کیا ہے جو آج دنیا بھر میں زلزلہ کی پیدا کردہ طاقت کو ناپنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو رشٹر پیمانہ (Richter Scale) کہتے ہیں۔

چارلس رشٹر نے کیلی فورنیا کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں نصف صدی تک زلزلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ان سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ زلزلہ کے خطرہ سے بچنے کے لئے آدمی کو کہاں بھاگنا چاہئے۔ کیلی فورنیا میں اس کا جواب بالکل سادہ ہے، وہ یہ کہ کہیں نہیں۔ امریکہ کی ۴۸ ریاستوں میں زلزلہ کا سب سے کم خطرہ فلوریڈا اور ساحلی ٹکساس میں ہے۔ مگر پھر میں سوال کروں گا کہ طوفان کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقہ کے اپنے کچھ خطرات ہیں۔ اس لئے واحد بدل یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے مقام پر چلا جائے اور کسی دوسرے خطرہ کو گوارا کرے (ہندستان ٹائمس ، ۱ اکتوبر ۸۰)

آدمی کا یہ مزاج ہے کہ جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس پر وہ مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ نہیں ملا ہے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ کوئی بظاہر خوش نصیب آدمی جس کو لوگ قابل رشک سمجھتے ہیں وہ بھی اندر سے اتنا ہی غیر مطمئن ہوتا ہے جتنا وہ لوگ جو اس کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی نعمت ملی ہوئی ہے۔ مگر جس کے اندر شکر کی نفسیات نہیں ہوتی وہ غیر حاصل شدہ نعمت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جو نعمت ہر وقت اسے حاصل ہے اس کو حقیر سمجھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر اپنے خدا کے لئے شکر کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ عین اسی چیز سے محروم رہ جاتا ہے جس کو اسے سب سے زیادہ اپنے سینہ کے اندر پرورش کرنا چاہئے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مکمل راحت کسی کے لئے نہیں۔ ایک جغرافیہ کا آدمی وہاں کے مسائل سے گھبرا کر دوسرے جغرافیہ میں چلا جائے تو اس کو دوسرے جغرافیہ میں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ یہاں بھی مسائل ہیں۔ اسی طرح اگر کم آمدنی والے کے مسائل ہیں تو زیادہ آمدنی والے کے بھی مسائل ہیں۔ اگر بے زور آدمی کے مسائل ہیں تو ان کے بھی مسائل ہیں جن کو زور و قوت حاصل ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں کسی آدمی کو مسائل سے فرصت نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ جن مسائل کے درمیان ہے ان کو گوارا کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے۔ اس کی توجہات کا مرکز خدا کی رضا حاصل کرنا ہو نہ کہ مسائل سے پاک زندگی کا مالک بننا، کیونکہ وہ تو آخرت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

قانع بنئے

ایک صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز معمولی ملازمت سے کیا تھا اور اب ان کا کافی بڑا کاروبار ہوچکا ہے، انھوں نے ایک ملاقات میں کہا: "جب میں دوسو روپیہ کا ملازم تھا تو میں اپنے کو سو روپیہ کا آدمی سمجھتا تھا، اب جب کہ میرا کاروبار دو کرور روپیہ تک پہنچ چکا ہے تب بھی میں اپنے کو صرف ایک کرور روپیہ کا آدمی سمجھتا ہوں" —— یہ وہی چیز ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں قناعت کہا جاتا ہے۔ اس قناعت کا تعلق انفرادی معاملات سے بھی ہے اور اجتماعی معاملات سے بھی۔

یہ بات جو ایک آدمی نے سادہ طور پر کہی، یہی زندگی کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ اکثر حالات میں آدمی صرف اس لئے ناکام رہتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں زیادہ اندازہ کرلیتا ہے، وہ اپنی حقیقی استعداد سے زیادہ بڑا اقدام کر دیتا ہے، وہ "کم" پر قناعت نہ کرتے ہوئے "زیادہ" کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ آدمی اگر مذکورہ تاجر کے اصول پر رہے تو وہ کبھی ناکامی سے دوچار نہیں ہوسکتا۔

جو آدمی زیادہ خرچ کی استطاعت رکھتے ہوئے کم خرچ کرے وہ کبھی اقتصادی بحران کا شکار نہیں ہوگا۔ جو آدمی دوڑنے کی طاقت رکھتے ہوئے آہستہ چلے اس کے ساتھ کبھی یہ حادثہ پیش نہ آئے گا کہ وہ راستہ میں تھک کر بیٹھ جائے۔ جو اپنے مخالف پر دار کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے صبر کرجائے وہ کبھی اپنے مخالف سے شکست نہیں کھا سکتا۔ جو بڑے کام کے قابل ہوتے ہوئے اپنے آپ کو چھوٹے کام میں لگا دے وہ کبھی اپنی کوششوں کو رائگاں کرنے والا ثابت نہیں ہوگا۔ جو سیاسی مقابلہ آرائی کا موقع رکھتے ہوئے غیر سیاسی کام میں اپنے کو مشغول کرے اس کا یہ انجام کبھی نہ ہوگا کہ پُرشور عمل کے بعد بالآخر اس کے حصہ میں جو چیز آئے وہ صرف احتجاج اور فریاد ہو۔ جس کے لئے شہرت کا میدان کھلا ہوا ہو مگر وہ اپنے کو گم نامی کے میدان میں کام کرنے پر راضی کرے۔ وہ کبھی اس حال میں دنیا سے نہیں جاسکتا کہ اس نے اپنے پیچھے اپنا شان دار مقبرہ تو چھوڑا ہو مگر اس کے عمل کے شان دار نتائج کا کہیں پتہ نہ ہو۔

ایک شخص کا قول ہے: دور کے بڑے فائدہ کی خاطر قریب کے چھوٹے فائدہ کو قربان کیا جاسکتا ہے:

Present short interest can be sacrificed for the larger long range gain

اس میں شک نہیں کہ یہ ترقی کا بہت اہم اصول ہے۔ مگر اس اصول کو وہی لوگ برت سکتے ہیں جو دور تک سوچ کر اقدام کرنا جانیں نہ کہ فوری طور پر بھڑک کر اٹھ کھڑے ہوں۔

معنویت کی تلاش

آرتھر کوئسلر نے البرٹ آئن سٹائن کا ایک قول نقل کیا ہے۔ اس نے کہا: میں یہ مانتا ہوں کہ سائنسی تحقیق میں سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ اعلیٰ محرک جو چیز ہوتی ہے وہ کائناتی مذہبیت ہے۔ ایک معاصر سائنس داں نے بجا طور پر کہا ہے کہ ہمارے موجودہ مادی دور میں بھی سنجیدہ علمی تحقیق کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو گہرا مذہبی آدمی ہو (ٹائمس آف انڈیا ۵ اکتوبر ۱۹۸۰)

I maintain that cosmic religiousness is the strongest and most noble driving force of scientific research A contemporary has said, not unrightly, that the serious research scholar in our **generally material-istic** age is the only deeply religious human being.

(Einstein as quoted by Koestler in Janus)

مذکورہ قول میں مذہبی ہونے کا مطلب ان دیکھی معنویت پر یقین کرنا ہے۔ سائنس داں جب اپنی تلاش میں نکلتا ہے تو اس وقت جو چیز اس کی رہنما بنتی ہے وہ اس کے اندر یہ چھپا ہوا عقیدہ ہوتا ہے کہ کائنات میں وحدت اور معنویت ہے۔ اگر وہ اس یقین سے خالی ہو تو کبھی وہ اپنی تلاش میں سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔

گویا باعتبار حقیقت ایک سائنس داں اور ایک مذہبی انسان میں کوئی فرق نہیں۔ ایک مذہبی انسان کچھ اعمال کرتا ہے۔ ان اعمال کا مقصد خدا کو خوش کرنا یا آخرت کی دنیا میں اس کا انعام پانا ہے۔ مذہبی انسان خدا کو نہیں دیکھتا اور نہ آخرت کو۔ مگر وہ انتہائی انہماک کے ساتھ اپنے عمل میں مشغول رہتا ہے۔ اس انہماک کی وجہ نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں پر اس کا کامل عقیدہ ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ سائنسداں کا ہے۔ وہ ساری عمر کسی حقیقت کی جستجو کرتا ہے۔ یہ حقیقت نامعلوم دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ تاہم سائنس داں پیشگی طور پر یہ یقین قائم کر لیتا ہے کہ جو چیز وہ چاہتا ہے وہ کائنات کے اندر چھپی ہوئی موجود ہے، اگرچہ ابھی تک وہ اس کے علم میں نہیں آئی۔

مذہب کی اصل کائنات کی معنویت پر یقین کرنا ہے۔ ایسی معنویت جو بظاہر ہم کو اپنی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ سائنسی کھوج کی نوعیت بھی اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہی ہے۔ اس دنیا میں ایک سائنس داں بھی ٹھیک اسی مقام پر کھڑا ہوا ہے جہاں ایک مذہبی انسان —— اس دنیا میں تمام اعلیٰ حقیقتیں چھپی ہوئی حقیقتیں ہیں۔ اس لئے وہ شخص زیادہ سنجیدگی کے ساتھ کسی اعلیٰ تحقیقی کام میں مصروف ہوگا جو چھپی ہوئی حقیقت پر یقین رکھنے والا ہو۔

حیوان اور انسان کا فرق

حیوان اور انسان جسمانی بناوٹ میں ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں۔ دونوں کا حیاتیاتی نظام بعض ظاہری فرق کو چھوڑ کر، تقریباً یکساں ہے۔ مگر حیوان کا بچہ حیوان پیدا ہوتا ہے اور بڑا ہو کر بھی حیوان ہی رہتا ہے۔ وہ حیوانیت کے مقام سے آگے نہیں بڑھتا۔ جب کہ انسان کے آغاز و انجام میں بہت فرق ہے۔ وہ ابتدائی پیدائش کے وقت بظاہر حیوان کی سطح پر ہوتا ہے مگر بڑھتے بڑھتے بالکل دوسری مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ حیوانیت کی سطح سے اٹھ کر انسانی کمال کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض حیاتیاتی مشابہت کے باوجود حیوان حیوان ہے اور انسان انسان۔

انسانی جنین میں کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو حیوانی جنین میں نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ سے انسانی جنین بڑھتے بڑھتے بالآخر ایک "دوسری مخلوق" بن جاتا ہے۔ جب کہ حیوانی جنین میں ترقی کی یہ صلاحیت نہیں ہوتی، وہ بڑھنے کے بعد بھی حیوانی مرحلہ ہی میں ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے اندر وہ خصوصیات موجود نہیں ہوتیں جو اس کو آگے لے جا سکیں۔ کوئی بھی کوشش حیوانی جنین کو انسان تک ترقی نہیں دے سکتی۔

معلوم ہوا کہ حیوان اور انسان میں ظاہری مشابہت کے باوجود، بہت بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ حیوان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے حیوانی مرتبہ سے آگے بڑھ کر مرحلہ در مرحلہ میکانکی ترقی کرتا ہوا انسان کے مرتبہ تک پہنچ جائے، جیسا کہ ارتقاپسند علماء دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان کے لئے فطری طور پر مقدر ہے کہ وہ ان ترقیاتی مرحلوں سے گزرے اور بالآخر کامل انسانیت کے مقام کو حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ حیوان اور انسان دو بالکل مختلف نوعیں ہیں۔ ابتدائی ہیولیٰ اگرچہ دونوں کا بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ دونوں کو ایک ہی طرح کی دنیا میں رہنا بسنا ہوتا ہے۔ مگر انسان کے اندر خدا نے اپنی روح پھونکی جس کی وجہ سے انسان ایک اور ہی مخلوق بن گیا۔ یہی خدائی روح ہے جس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ انسانی جنین حیوان کی منزل سے گزر کر ایک اعلیٰ مخلوق کی صورت اختیار کرے۔ دونوں ہی کا تعلق خدائی مقدرات سے ہے۔ حیوان کے لئے اول دن سے یہ مقدر رہتا ہے کہ وہ حیوان بنے اور انسان بھی اول دن یہ قدرتی فیصلہ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے کہ اس کو بالآخر انسان بن کر کھڑا ہونا ہے۔

موت کے وقت

عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور سفر میں تھا کہ سخت بیمار پڑا اور راستہ میں ہی سنہ ۱۵۸ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ آخر وقت میں اس کی زبان پر یہ فقرہ تھا: بادشاہ وہ ہے جو نہ مرے۔

یزید بن معاویہ کے بعد معاویہ بن یزید بن معاویہ کو خلیفہ بنایا گیا۔ بہت تھوڑی مدت میں سنہ ۶۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت ان سے کہا گیا "اپنے خاندان میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کر دیجئے" اس کے جواب میں انھوں نے کہا "میں نے خلافت سے نہ زندگی میں فائدہ اٹھایا ہے اور نہ مرنے کے بعد اس کا بوجھ اٹھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بنو امیہ اس کی شیرینی لیں اور میرے حصہ میں اس کی تلخی آئے۔

مامون الرشید بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ ۲۱۸ھ میں جب وہ مرنے لگا تو آخری جملہ جو اس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا ——— اے وہ جس کی سلطنت کبھی زائل نہ ہوگی، اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہو رہی ہے۔ اے وہ جو کبھی نہیں مرے گا، اس پر رحم فرما جو مر رہا ہے۔

خلیفہ واثق باللہ کی وفات ۲۳۲ھ میں ہوئی۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے حکم دیا کہ فرش اٹھا دیا جائے۔ جب فرش ہٹا دیا گیا تو اس نے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا اور کہا: اے وہ جس کی بادشاہی لازوال ہے، اس پر رحم کر جس کی بادشاہی ختم ہو گئی"۔ یہ کہتے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

خلیفہ معتضد باللہ عباسی کا انتقال ۲۸۹ھ میں ہوا۔ اس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے چند عربی شعر پڑھے جن کا مطلب یہ ہے: میں نے بڑے بڑے بہادر مارے، میں نے کوئی دشمن نہ چھوڑا۔ کسی کو بھی میں نے سرکشی پر باقی رہنے نہ دیا۔ میں نے دارالسلطنت کو تمام مخالفوں سے خالی کر دیا۔ ان کو پراگندہ کر کے انھیں مشرق و مغرب میں پھیلا دیا۔ لیکن جب میں اپنی عزت و بلندی میں ستاروں تک پہنچ گیا اور تمام مخلوق کی گردنوں میں میری غلامی کا طوق پڑ گیا تو ایسا ہوا کہ موت نے مجھ پر ایک تیر چلایا اور میری آگ کو بجھا دیا۔ دیکھ لو، اب میں جلد ہی اپنے گڑھے میں ڈالا جانے والا ہوں۔

حجاج بن یوسف نے گورنر بننے کے بعد عراق میں خطبہ دیا: گردنیں اونچی ہو رہی ہیں۔ سروں کی فصل پک چکی ہے اور کٹائی کا وقت آگیا ہے۔ میری نظریں وہ خون دیکھ رہی ہیں جو پگڑیوں اور داڑھیوں کے درمیان بہہ رہا ہے"۔ یزید کے بعد بنو امیہ کی حکومت کو دوبارہ مستحکم کرنے کے لئے اس نے لاکھوں آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ ۵۴ سال کی عمر میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کو بے حد سخت تکلیف تھی۔ ابو منذر یعلی نے لوگوں کی طرف سے اس پر لعنت کرتے ہوئے کہا کہ تو اس قوم کا فرعون تھا، آج تیرے لئے نہ نجات ہے اور نہ فریاد۔ حجاج یہ سن کر بری طرح رو پڑا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور کہا: الٰہی مجھے بخش دے کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ تو مجھے نہیں بخشے گا۔ آہ میری ہلاکت، آہ میری ہلاکت، اگر اس جبار و قہار نے مجھ پر رحم نہ کیا۔

تضاد فکری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اللہ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے اور نہ تمھاری بیویوں کو جن کو تم ماں کہہ بیٹھتے ہو تمھاری مائیں بنایا اور نہ تمھارے منھ بولے بیٹوں کو تمھارے بیٹے بنایا۔ یہ تمھارے اپنے منھ کی بات ہے۔ اور اللہ حق کہتا ہے اور وہ صحیح راہ دکھاتا ہے۔ منھ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہی پورا انصاف ہے اللہ کے یہاں (احزاب، ابتدائی آیات)

قدیم عربوں میں یہ رواج تھا کہ اگر کوئی شخص نادانی میں اپنی بیوی کو ماں کہہ دیتا (مثلاً انتِ علیّ کظھر امی) تو وہ اس کے لئے حقیقی ماں کی طرح حرام ہو جاتی۔ گویا اس لفظ کے بولنے سے وہ سچ مچ اس کی ماں بن گئی ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی کو منھ بولا بیٹا (تبنّیٰ) بنا لیتا تو وہ اس کو صُلبی بیٹے کی طرح سمجھنے لگتے اور اس پر وہی احکام صادر کرتے جو حقیقی بیٹے کے لئے ہوتے ہیں۔ اسلام نے اس جاہلی رواج کے خاتمہ کا اعلان کیا۔

"ایک سینہ میں دو دل"، کا مطلب کسی شخص کا بیک وقت دو متضاد نقطۂ نظر رکھنا ہے۔ خدا نے جب انسان کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے سوچنے کے انداز میں بھی دوئی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ بات خدائی اسکیم کے خلاف ہے کہ کوئی شخص بیک وقت دو مختلف اور متضاد نظریہ کو اپنے اندر جگہ دے۔ ایک طرف وہ حقیقی ماں اور بیٹے کو ماں اور بیٹا سمجھے اور دوسری طرف محض زبان سے کسی کو ماں یا بیٹا کہہ دینے کی بنا پر بھی اس کو ماں یا بیٹا ماننے لگے۔

جو شخص ایسا کرے اس نے گویا فکری دوئی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ایک طرف ایک حقیقی چیز کو حقیقت سمجھا اور دوسری طرف ایک بے حقیقت چیز کو بھی حقیقت قرار دیا۔ یہ دو متضاد خیالات کو ایک دل میں جگہ دینا ہے جو فطرت کے وحدانی نقشہ کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سچائی اور تعصب کو ایک ساتھ ماننا ہے۔ حقیقت پسندی اور توہم پرستی کو بیک وقت اپنے ذہن میں جگہ دینا ہے۔ ایک رواجی نقطۂ نظر کو بھی اسی طرح تسلیم کرنا ہے جس طرح خالص عقلی نقطۂ نظر کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اسی طرح توحید کے عقیدہ کے ساتھ مشرکانہ خیالات کو ماننا، حقیقت واقعہ اور توہمات کو ایک ساتھ اپنے ذہن میں جگہ دینا، اصولی صداقت کا اقرار کرنے کے ساتھ شخصیت پرستی کو اختیار کرنا۔ قرآن کی محکم آیتوں پر عقیدہ رکھتے ہوئے پُر عجوبہ قصے کہانیوں میں مشغول ہونا۔ سب ایک دل والے سینہ کو دو دل والا سینہ بنانا ہے جو سراسر تضاد ہے اور ایسا ہر تضاد خدا کی اس بے تضاد دنیا میں جگہ پانے کے قابل نہیں۔

رہنما کی ضرورت

ہم کو بھوک لگتی ہے۔ ہم اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کھانا موجود تھا جو ہماری بھوک کو مٹائے۔ ہم کو پیاس لگتی ہے۔ ہم اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے عمل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں پانی موجود تھا جو ہماری پیاس کو بجھائے۔ ایسا ہی معاملہ سچائی کا ہے۔ آدمی ہمیشہ سے سچائی کی تلاش میں ہے۔ یہ تلاش ہی اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ یہاں کوئی سچائی ہے جسے آدمی کو جاننا چاہئے۔ سچائی کھانے اور پینے سے زیادہ بڑی ہے۔ پھر جب ہماری چھوٹی طلب کا جواب اس دنیا میں موجود ہے تو ہماری بڑی طلب کا جواب یہاں کیوں نہ موجود ہوگا۔

سچائی کا سوال اپنی حقیقت کو جاننے کا سوال ہے۔ آدمی اچانک ایک روز پیدا ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ اس نے خود کو پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دنیا میں پاتا ہے جو اس سے الگ خود اپنے آپ قائم ہے۔ وہ پچاس سال یا سو سال اس دنیا میں رہ کر مرجاتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ وہ مر کر کہاں جاتا ہے۔ زندگی اور موت کی اسی حقیقت کو جاننے کا سوال سچائی کا سوال ہے۔

مگر ایک شخص جس طرح کھانا اور پانی کو جان لیتا ہے اسی طرح وہ سچائی کو نہیں جان سکتا۔ سچائی یقینی طور پر لامحدود اور ابدی ہے۔ سچائی اگر لامحدود اور ابدی نہ ہو تو وہ سچائی نہیں۔ مگر آدمی کی عقل اور اس کی عمر دونوں محدود ہیں۔ محدود عقل لامحدود سچائی تک نہیں پہنچ سکتی، محدود عمر کا آدمی ابدی سچائی کو دریافت نہیں کرسکتا۔

آدمی کی یہی نارسائی یہ ثابت کرتی ہے کہ سچائی کو جاننے کے لئے اسے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ "پیغمبری" کیا ہے۔ پیغمبری کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچائی جہاں تک آدمی اپنے آپ نہیں پہنچ سکتا تھا وہ خود آدمی تک پہنچ جائے۔ جس سچائی کو ہم اپنی کوششوں سے نہیں جان سکے، وہ خود ظاہر ہوکر اپنے بارے میں ہمیں بتادے۔

حقیقت سے لوگوں کو پیشگی طور پر باخبر کرنے کے لئے اس کو خدا نے پیغمبر کے ذریعہ کھولا۔ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد اس کو براہ راست ہر آدمی پر کھول دیا جائے گا۔ پیغمبر نے بتایا کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ جس خدا کی اطاعت ساری کائنات جبر کے تحت کر رہی ہے اسی خدا کی اطاعت انسان ارادہ کے تحت کرنے لگے۔ وہ اپنے اختیار سے خود کو خدا کے آگے بے اختیار بنالے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کے باوجود جو لوگ خدا کے محکوم بن جائیں ان کے لئے جنت ہے اور جو لوگ آزادی پاکر سرکش بن جائیں ان کے لئے جہنم۔

اور ہم نے ان کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کرکے انھیں الگ الگ گروہ بنا دیا۔ اور جب موسیٰ کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا پانی پینے کا مقام معلوم کر لیا۔ اور ہم نے ان پر بدلیوں کا سایہ کیا اور ان پر من وسلویٰ اتارا۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں جا کر بس جاؤ۔ اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ اور کہو ہم کو بخش دے اور دروازہ میں جھکے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ ہم نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ظالموں نے بدل ڈالا دوسرا لفظ اس کے سوا جو ان سے کہا گیا تھا۔ پھر ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اس لئے کہ وہ ظلم کرتے تھے ۱۶۰-۱۶۲

مصر کی مشرکانہ فضا سے نکال کر خدا نے بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں پہنچایا۔ یہاں ان کی تنظیم قائم کی گئی۔ ان کو بارہ جماعتوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر جماعت کے اوپر ایک نگراں تھا اور حضرت موسیٰ سب کے اوپر نگراں تھے۔

پھر بنی اسرائیل کو خصوصی طور پر تمام ضروریات زندگی عطا کی گئیں۔ پہاڑی چشمے نکال کر ان کے لئے پانی فراہم کیا گیا۔ کھلے صحرا میں سایہ کے لئے ان پر مسلسل بدلیاں بھیجی گئیں۔ ان کی خوراک کے لئے من وسلویٰ اترا جو بآسانی انھیں اپنے خیموں کے سامنے مل جاتا تھا۔ ان کی باقاعدہ سکونت کے لئے ایک پورا شہر اریحا (وادی یردن میں) ان کے حوالے کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ تمھاری تمام ضروریات کا ہم نے انتظام کر دیا ہے۔ اب حرص اور لذت چشی میں مبتلا ہو کر ناپاک چیزوں کی طرف نہ دوڑو۔ اس کے بجائے قناعت اور اللہ کے آگے شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرو۔

"باب (دروازہ) میں جھکے ہوئے داخل ہو" یہاں باب سے مراد بستی کا دروازہ نہیں ہے بلکہ ہیکل سلیمانی کا دروازہ ہے۔ زمین میں اقتدار دینے کے بعد بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اپنی عبادت گاہ میں خاشع بن کر جاؤ اور گناہوں سے مغفرت مانگو۔ مسلمانوں کے یہاں جس طرح کعبہ کو بیت اللہ (خدا کا گھر) کہا جاتا ہے اسی طرح یہود کے یہاں ہیکل کو باب اللہ (خدا کا پھاٹک) کہا جاتا ہے۔ یہود کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے عبادت خانہ میں عجز و تواضع کے ساتھ داخل ہو کر اپنے رب کی عبادت کرو اور اللہ کے عظمت و جلال کو یاد کرکے اس کے آگے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے رہو۔ مگر یہود خدا کی نصیحتوں کو بھول گئے۔ وہ خدا کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کے بجائے خدا کے نام پر خود ساختہ راہوں کی طرف چلنے لگے۔ انھوں نے عجز کے بجائے سرکشی کا طریقہ اپنایا۔ شکر کا کلمہ بولنے کے بجائے وہ بے صبری کے کلمات بولنے لگے۔

یہود جب بگاڑ کی اس حد کو پہنچ گئے تو خدا نے اپنی عنایات ان سے واپس لے لیں۔ رحمت کے بجائے ان کو مختلف قسم کے عذابوں نے گھیر لیا۔

اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے تھی۔ جب وہ سبت (سنیچر) کے بارے میں تجاوز کرتے تھے۔ جب ان کے سبت کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر آتیں اور جس دن سبت نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ ان کی آزمائش ہم نے اس طرح کی، اس لئے کہ وہ نافرمانی کر رہے تھے۔ اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے۔ انھوں نے کہا، تمھارے رب کے سامنے الزام اتارنے کے لئے اور اس لئے کہ شاید وہ ڈریں ۱۶۳-۱۶۴

یہود کو یہ تلقین کی گئی تھی کہ وہ ہفتہ کا ایک دن (سنیچر) عبادت اور ذکر خدا کے لئے خاص رکھیں۔ اس دن کوئی معاشی کام نہ کریں۔ بائبل کے مطابق حکم یہ تھا کہ جو شخص سبت کے قانون کی خلاف ورزی کرے وہ مار ڈالا جائے (خروج ۳۱) مگر جب یہود میں بگاڑ آیا تو وہ اس کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ ان کے مصلحین نے متوجہ کیا تو وہ نہ ملنے تاہم مصلحین نے اپنی کوشش مسلسل جاری رکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کا کام اگرچہ بظاہر دوسروں کے لئے ہوتا ہے مگر وہ خود اپنے لئے کیا جاتا ہے، اس کا اصل محرک اپنے آپ کو اللہ کے یہاں بری الذمہ ٹھہرانا ہے۔ اگر یہ محرک زندہ نہ ہو تو آدمی درمیان میں ٹھیر جائے گا، وہ اپنے اصلاح اور تبلیغ کے عمل کو آخر وقت تک جاری نہیں رکھ سکتا۔

یہود کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ کو ان کے لئے اور سخت کر دیا گیا۔ بحر قلزم کی مشرقی خلیج کے کنارے ایلہ شہر میں یہود کی آبادیاں تھیں۔ ان کی معیشت کا انحصار زیادہ تر مچھلیوں کے شکار پر تھا۔ خدا کے حکم سے یہ ہوا کہ سنیچر کے دن ان کے ساحل پر مچھلیوں کی آمد بہت بڑھ گئی۔ بقیہ چھ دنوں میں مچھلیاں بہت کم آتیں۔ مگر ممنوعہ دن (سنیچر) کو وہ کثرت سے پانی کی سطح کے اوپر تیرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔

یہ یہود کے لئے بڑی سخت آزمائش تھی۔ گویا پہلے اگر یہ نوعیت تھی کہ سنیچر کے علاوہ چھ جائز دنوں میں شکار کرنے کا پورا موقع تھا تو اب صرف ایک حرام دن ہی شکار کرنے کا موقع ان کے لئے باقی رہ گیا۔ اب یہود نے یہ کیا کہ وہ حیلہ کے ذریعہ حرام کو حلال کرنے لگے۔ وہ سنیچر کے دن شکار نہ کرتے۔ البتہ وہ سمندر کا پانی کاٹ کر بنائے ہوئے حوضوں میں لاتے۔ سنیچر کے دن مچھلیاں چڑھتیں تو وہ نالی کے راستہ سے ان کے بنائے ہوئے حوض میں آجاتیں۔ اس کے بعد وہ حوض کا منھ بند کر کے مچھلیوں کے دریا میں لوٹنے کا راستہ روک دیتے۔ پھر اگلے دن اتوار کو جا کر ان کو پکڑ لیتے۔ اس طرح وہ ایک ناجائز فعل کو جواز کی صورت دینے کی کوشش کرتے تاکہ ان پر یہ حکم صادق نہ آئے کہ انھوں نے سنیچر کے دن شکار کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص جائز ذرائع سے اپنی ضروریات فراہم کرنے پر قناعت نہ کرے تو وہ اپنے آپ کو اس خطرہ میں ڈالتا ہے کہ اس کے لئے جائز ذرائع کا دروازہ سرے سے بند کر دیا جائے اور ناجائز ذریعہ کے سوا اس کے لئے حصول معاش کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

پھر جب انھوں نے بھلا دی وہ چیز جو ان کو یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ پھر جب وہ بڑھنے لگے اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ ۱۶۶-۱۶۵

ایک کام جس سے خدا نے منع کیا ہو اس کو کرنا گناہ ہے اور حیلہ کے ذریعہ ناجائز کو جائز بنا کر کرنا گناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ قانون سبت کی خلاف ورزی کر کے یہود اسی قسم کے مجرم بن گئے تھے۔ ایسے لوگ خدا کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ خدا کی ان عنایتوں سے محروم ہو جاتے ہیں جو اس نے اس دنیا میں صرف انسان کے لئے مخصوص کی ہیں۔ ایسے لوگ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آ جاتے ہیں۔

قانون سبت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا۔ " اللہ نے ان کو بندر بنا دیا " کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی صورت بندروں کی صورت ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اخلاق بندروں جیسا ہو گیا۔ ان کا دل اور ان کی سوچ انسانوں کے بجائے بندر جیسے ہو گئے (قیل بل جعل اخلاقھم کاخلاقھا وان لم تکن صورتھم کصورتھا، مفردات امام راغب۔ رُوی عن مجاھد انہ انما مسخت قلوبھم وردّت افھامھم کافھام القردۃ، تفسیر قرطبی)

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے اندر اس کے خالق نے عقل اور ضمیر رکھ دیا ہے۔ اس کے اندر جب کوئی خواہش اٹھتی ہے تو اس کی عقل و ضمیر متحرک ہو کر فوراً اس کے سامنے یہ سوال کھڑا کر دیتے ہیں کہ ایسا کرنا تمھارے لئے درست ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس بندر کا حال یہ ہے کہ اس کی خواہش اور اس کے عمل کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں۔ جو بات بھی اس کے جی میں آجائے وہ فوراً اس کو کر ڈالتا ہے۔ اس کو نہ اپنی خواہش کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہوتی اور نہ اس پر عمل کرنے کے بعد اس پر شرمندہ ہونے کی۔

اب انسان کا بندر ہو جانا یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور اپنی ضمیر کے خلاف عمل کرتے کرتے اتنا بے حس ہو جائے کہ اس قسم کے نازک احساسات اس کے اندر سے جاتے رہیں۔ اس کے دل میں جو بھی خواہش پیدا ہو اس کو وہ کر گزرے۔ جب بھی کوئی شخص اس کی زد میں آجائے تو وہ اس کی عزت اور اس کے مال پر حملہ کر دے۔ کسی سے شکایت پیدا ہو تو فوراً اس کو ذلیل کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ کسی سے اختلاف ہو جائے تو اس پر غرانے لگے۔ کوئی اس کو اپنی راہ میں رکاوٹ نظر آئے تو فوراً اس سے لڑنا شروع کر دے۔ سچا انسان وہ ہے جو اپنے آپ پر خدا کی لگام لگا لے۔ اور بندر انسان وہ ہے جو بے قید ہو کر وہ سب کچھ کرنے لگے جو اس کا نفس اس سے کرنے کے لئے کہے۔

برائی سے روکنا ایک قسم کا اعلان برأت ہے۔ اس لئے کسی گروہ پر جب خدا کی یہ سزا آتی ہے تو اس کی زد میں آنے سے وہ لوگ بچائے جاتے ہیں جو برائی سے اس حد تک بیزار ہوں کہ وہ اس کے روکنے والے بن جائیں۔

اور جب تمھارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ یہود پر قیامت کے دن تک ضرور ایسے لوگ بھیجتا رہے گا جو ان کو نہایت برا عذاب دے۔ بے شک تیرا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ہم نے ان کو گروہ گروہ کر کے زمین میں متفرق کر دیا۔ ان میں کچھ نیک ہیں اور ان میں کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم نے ان کی آزمائش کی اچھے حالات سے اور برے حالات سے تاکہ وہ باز آئیں ۱۶۸ — ۱۶۷

ان آیات میں یہود کے لئے جس سزا کا اعلان ہے اس کے ساتھ الی یوم القیامہ (قیامت کے دن تک) کی شرط لگی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا وہ ہے جس کا تعلق دنیا سے ہے۔ آخرت کے انجام کا معاملہ اس سے الگ ہے جس کا ذکر دوسرے مقامات پر آیا ہے۔

کسی کام کے کرنے پر جب بڑا انعام رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کو نہ کرنے پر اتنی ہی بڑی سزا بھی ہوگی۔ یہی معاملہ اس قوم کا ہے جو کتاب آسمانی کی حامل بنائی گئی ہو۔ یہود کو خدا نے اسی منصب پر فائز کیا تھا۔ چنانچہ آخرت کے وعدہ کے علاوہ دنیا میں بھی ان کو غیر معمولی انعامات دئے گئے۔ مگر یہود نے مسلسل نافرمانی کی۔ وہ دین کے نام پر بے دینی کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ان کو منصب فضیلت سے ہٹا دیا۔ ان کے لئے یہ فیصلہ ہوا کہ جب تک دنیا قائم ہے وہ خدا کی سزا کا مزہ چکھتے رہیں گے۔ اور آخرت میں جو کچھ ہونا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب قیامت تک ان پر کبھی اچھے حالات نہیں آئیں گے۔ جیسا کہ خود ان آیات میں صراحت ہے، ان پر "حسنات" کے وقفے بھی پڑیں گے۔ مگر یہ حسنہ کا وقفہ بھی ان کے لئے ایک قسم کا عتاب ہوگا تاکہ وہ مزید سرکشی کر کے اور زیادہ سزا کے مستحق بنیں۔

ان آیات میں یہود کے لئے دو سزاؤں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ ان پر ایسی قومیں مسلط کی جائیں گی جو ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہود کبھی بخت نصر اور کبھی تیتس رومی کے شدائد کا نشانہ بنے۔ کبھی وہ مسلمانوں کی ماتحتی میں دئے گئے۔ موجودہ زمانہ میں انھوں نے مشرقی یورپ میں اپنا زبردست اقتصادی جال پھیلایا تو ہٹلر نے انھیں تباہ و برباد کر ڈالا۔ اب ارض مقدس میں ان کا اجتماع بظاہر اس کی علامت ہے کہ ان کی پوری قوت شاید اجتماعی طور پر ہلاک کی جانے والی ہے۔

دوسری سزا جس کا یہاں ذکر ہے وہ "تقطیع" ہے۔ یعنی ان کی جمعیت کو مختلف حصوں میں بانٹ کر منتشر کر دینا۔ یہ دوسرا واقعہ بھی تاریخ میں بار بار ان کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

اللہ کا یہ قانون صرف یہود کے لئے نہیں تھا۔ وہ بعد کے اس گروہ کے لئے بھی ہے جس کو یہود کی معزولی کے بعد خدا کی گواہی کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ مسلمان اگر اپنے کو اس حال میں پائیں کہ کفار و مشرکین نے ان پر غلبہ پا لیا ہو اور ان کی جمعیت چھوٹے چھوٹے جغرافیوں میں بٹ کر متفرق ہو گئی ہو تو ان کو خدا کی طرف لوٹنا چاہئے۔ کیوں کہ

پھر ان کے پیچھے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث بنے، وہ اسی دنیا کی متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یقیناً بخش دیے جائیں گے۔ اور اگر ایسی ہی متاع ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیں گے۔ کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا گیا ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہیں۔ اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لیے، کیا تم سمجھتے نہیں۔ اور جو لوگ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، بے شک ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ اور جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر اٹھایا گویا کہ وہ سائبان ہے۔ اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر آپڑے گا۔ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے، اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم بچو۔ ۱۷۱-۱۶۹

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہود کو جب خدائی احکام دیے گئے تو اس کی کارروائی پہاڑ کے دامن میں ہوئی تھی۔ اس وقت ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ یہود کو محسوس ہوا کہ پہاڑ ان کے اوپر گرا چاہتا ہے۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ خدا سے عہد باندھنے کا معاملہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ اگر تم نے اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا تو یاد رکھو کہ اس عہد کا دوسرا فریق وہ عظیم ہستی ہے جو چاہے تو پہاڑ کو تمھارے اوپر گرا کر تمھیں ہلاک کردے۔

اس وقت یہود میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اللہ سے ڈرنے والے اور نیک عمل کرنے والے تھے۔ مگر بعد کو دھیرے دھیرے انھوں نے دنیا کو اپنا مقصود بنا لیا۔ وہ جائز ناجائز کا فرق کیے بغیر مال جمع کرنے میں لگ گئے۔ آسمانی کتاب کو اب بھی وہ پڑھتے تھے مگر اس کی تعلیمات کی خود ساختہ تاویلیں کرکے اس کو انھوں نے ایسا بنا لیا کہ خدا بھی ان کو اپنی باغیانہ زندگی کا حامی نظر آنے لگا۔ ان کی بے حسی یہاں تک بڑھی کہ وہ یہ کہہ کر مطمئن ہوگئے کہ ہم برگزیدہ امت ہیں۔ ہم نبیوں کی اولاد ہیں۔ خدا اپنے محبوب بندوں کے صدقے میں ہم کو ضرور بخش دے گا۔

یہی واقعہ ہر نبی کی امت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ابتدائی دور میں اس کے افراد خدا سے ڈرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر اگلی نسلوں میں یہ روح نکل جاتی ہے۔ وہ دوسرے دنیا دار لوگوں کی طرح ہوجاتے ہیں۔ ان کے درمیان اب بھی دین موجود ہوتا ہے۔ خدا کی کتاب اب بھی ان کے یہاں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ مگر یہ سب قومی وراثت کے طور پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً عہد خداوندی کے طور پر۔ وہ عملاً آخرت کو بھول کر دنیا پرستی کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ صحیح اور غلط سے بے نیاز ہوکر اپنی خواہشوں کو اپنا مذہب بنا لیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی فخر ہوتا ہے کہ وہ افضل الامم ہیں۔ وہ محبوب خدا کے امتی ہیں۔ وہ آسمانی کتاب کے وارث ہیں۔ کلمہ توحید کی برکت سے وہ ضرور بخش دیے جائیں گے۔

مگر اصل چیز یہ ہے کہ آدمی خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے، وہ نماز کو قائم کرے۔ اور کتاب الٰہی کو پکڑنے اور نماز کو قائم کرنے کا معیار یہ ہے کہ آدمی "مصلح" بن گیا ہو۔ خدا کی کتاب سے تعلق اور خدا کی عبادت کرنا آدمی کو مصلح بناتا ہے نہ کہ مفسد۔

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی۔ یا کہو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے۔ تو کیا تو ہم کو ہلاک کرے گا اس کام پر جو غلط کار لوگوں نے کیا۔ اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ رجوع کریں　۱۷۴ــ۱۷۲

ایک جانور کو اس کے ماں باپ سے الگ کر دیا جائے اور اس کی پرورش بالکل علیحدہ ماحول میں کی جائے تب بھی بڑا ہو کر وہ مکمل طور پر اپنی نسلی خصوصیات پر قائم رہتا ہے۔ وہ اپنے تمام معاملات میں عین وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو اس کی جبلت (Instinct) میں پیوست ہے۔ یہی معاملہ انسان کا "شعور رب" کے بارہ میں ہے۔ انسان کی روح میں ایک خالق و مالک کا شعور اتنی گہرائی کے ساتھ جما دیا گیا ہے کہ وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتا۔ موجودہ زمانہ میں ایک اعتبار سے روس اور دوسرے اعتبار سے ترکی کا تجربہ بتاتا ہے کہ مکمل طور پر مخالفِ مذہب ماحول میں تربیت پانے کے باوجود انسان کی فطرت عین وہی باقی رہتی ہے جو اقرارِ مذہب کے ماحول میں ہمیشہ پائی جاتی رہی ہے۔

تاہم جانور اور انسان میں ایک فرق ہے۔ جانور اپنی فطرت کی خلاف ورزی پر قادر نہیں۔ وہ مجبور ہیں کہ عملاً بھی وہی کریں جو ان کے اندر کی فطرت انھیں سبق دے رہی ہے۔ اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ شعور فطرت کی حد تک پابند ہونے کے باوجود عمل کے معاملہ میں وہ پوری طرح آزاد ہے۔ جب بھی کوئی بات سامنے آتی ہے تو اس کی عقل اور اس کا ضمیر اندر سے اشارہ کرتے ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ مگر اس کے باوجود انسان کو اختیار رہے کہ وہ چاہے اپنی اندرونی آواز کی پیروی کرے، چاہے اس کو نظر انداز کرکے من مانی کارروائی کرنے لگے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا امتحان ہو رہا ہے اور اسی پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہونا ہے۔ جو شخص خدائی آواز پر کان لگائے اور وہی کرے جو خدا فطرت کی خاموش زبان میں اس سے کہہ رہا ہے، وہ امتحان میں پورا اترا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دئے جائیں گے۔ اور جو شخص فطرت کی سطح پر نشر ہونے والی خدائی آواز کو نظر انداز کر دے وہ خدا کی نظر میں مجرم ہے۔ اس کو مرنے کے بعد جہنم میں ڈالا جائے گا۔ خدا بھی اس کو نظر انداز کرے گا جس طرح اس نے خدا کی آواز کو نظر انداز کیا تھا۔

فطرت کی یہ آواز ہر آدمی کے اوپر خدا کی دلیل ہے۔ اب کسی کے پاس نہ تو بے خبری کا عذر ہے اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا کہ ماضی سے جو ہوتا چلا آرہا تھا وہی ہم بھی کرنے لگے۔ جب انسان پیدائش ہی سے خدا کا شعور لے کر آتا ہے اور ماحول کے علی الرغم اس کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے تو اب کسی شخص کے پاس بے راہ ہونے کا کیا عذر ہے۔

اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر بوجھ لادے تب بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم یہ احوال ان کو سناؤ تاکہ وہ سوچیں۔ کیسی بری مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ اللہ جس کو راہ دکھائے وہی راہ پانے والا ہوتا ہے اور جس کو وہ بے راہ کر دے تو وہی گھاٹا اٹھانے والے ہیں ۱۷۸ — ۱۷۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص امیہ بن ابی الصلت تھا۔ اعلیٰ انسانی اوصاف کے ساتھ وہ حکیمانہ کلام میں بھی ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں میں ایک پیغمبر کے آنے کی پیشین گوئیاں موجود ہیں تو اس کو گمان ہوا کہ شاید وہ پیغمبر میں ہی ہوں۔ بعد کو جب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی خبر ملی اور اس نے آپ کا اعلیٰ کلام سنا تو اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ پیغمبر اسلام کا مخالف بن گیا۔ امیہ بن ابی الصلت کو خدا نے جو اعلیٰ خصوصیات دی تھیں ان کا صحیح استعمال یہ تھا کہ وہ خدا کے پیغمبر کو پہچانے اور ان کا ساتھی بن جائے۔ مگر خدا کی نوازشوں سے اس نے اپنے اندر یہ ذہن بنایا کہ اب خدا کو میرے سوا کسی اور پر اپنا فضل نہ کرنا چاہئے۔ پیغمبر خدا کو نہ ماننے میں اسے دنیوی فائدہ نظر آتا تھا اس کے برعکس آپ کو ماننے میں اخروی فائدہ تھا۔ اس نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دی۔ وہ اگر اعتراف کے رخ پر چلتا تو وہ فرشتوں کو اپنا ہم سفر بناتا۔ مگر جب وہ حسد اور گھمنڈ کے راستہ پر چل پڑا تو وہاں شیطان کے سوا کوئی اور نہ تھا جو اس کا ساتھ دے۔ یہ مثال ان تمام لوگوں پر صادق آتی ہے جو حسد اور کبر کی بنا پر سچائی کو نظر انداز کریں یا اس کو ماننے سے انکار کر دیں۔

کسی آدمی کا ایسا بننا اپنے آپ کو انسانیت کے مقام سے گرا کر کتے کے مقام پر پہنچا دینا ہے۔ کتا اچھے سلوک پر بھی ہانپتا ہے اور برے سلوک پر بھی۔ یہی حال ایسے آدمی کا ہے۔ خدا نے جب اس کو دیا تب بھی اس نے اس سے سرکشی کی غذا لی اور نہ دیا تب بھی وہ سرکش ہی بنا رہا۔ حالاں کہ چاہئے یہ تھا کہ جب خدا نے اس کو دیا تھا تو وہ اس کا احسان مند ہوتا اور جب خدا نے نہیں دیا تو وہ خدا کی تقسیم پر راضی رہ کر اس کی طرف رجوع کرتا۔

کسی کو راستہ دکھانے کے لئے خدا خود سامنے نہیں آتا بلکہ وہ نشانیوں (دلائل) کی صورت میں اپنا راستہ لوگوں کے اوپر کھولتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ دلائل اور نشانیوں کے روپ میں ظاہر ہونے والے حق کو پہچان لیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے پر راضی ہو جائیں وہی اس دنیا میں ہدایت یاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ دلائل اور نشانیوں کو اہمیت نہ دیں ان کے لئے ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور ہم نے جنات اور انسان میں سے بہتوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں غافل۔ اور اللہ کے لئے ہیں سب اچھے نام۔ پس انھیں سے اسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو، جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں۔ وہ بدلہ پاکر رہیں گے اپنے کاموں کا۔ اور ہم نے جن کو پیدا کیا ہے ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ اور میں ان کو ڈھیل دیتا ہوں، بے شک میرا داؤ بڑا مضبوط ہے ۱۸۳ — ۱۷۹

سچائی ایک ایسی چیز ہے جس کو ہر آدمی کو خود پانا پڑتا ہے۔ خدا نے ہر آدمی کو دل اور آنکھ اور کان دئے ہیں۔ آدمی انھیں صلاحیتوں کو استعمال کرکے سچائی کو پاتا ہے۔ اور جو شخص ان صلاحیتوں کو استعمال نہ کرے وہ یقیناً سچائی کو پانے سے محروم رہے گا، خواہ سچائی اس سے کتنا ہی زیادہ قریب موجود ہو۔

سچائی کو پانا ہر آدمی کا ایک شعوری اور ارادی فعل ہے۔ سچائی کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے اپنے دل کے دروازے اس کے لئے کھلے رکھے ہوں۔ اس کو وہی دیکھ سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر مصنوعی پردے نہ ڈالے ہوں۔ اس کی آواز اسی کو سنائی دے سکتی ہے جس نے اپنے کان میں کسی قسم کے ڈاٹ نہ لگا رکھے ہوں۔ ایسے لوگ سچائی کی آواز کو پہچان کر اس کے آگے اپنے کو ڈال دیں گے۔ اور جس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہو وہ چوپایوں کی طرح نا سمجھ بنا رہے گا۔ پہاڑ جیسے دلائل کا وزن محسوس کرنا بھی اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اس کے سامنے خدا کی تجلیاں ظاہر ہوں گی مگر وہ اس کو دیکھنے سے عاجز ہوگا۔ اس کے پاس خدا کا نغمہ چھیڑا جائے گا مگر وہ اس کو سننے سے محروم رہے گا۔ سچائی ہمیشہ بیدار لوگوں کو ملتی ہے۔ غافلوں کے لئے کوئی سچائی سچائی نہیں۔

خدا کے بارے میں انسان کے بے راہ ہونے کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہوئے اپنے ذہن میں خدا کی غلط تصویر بنا لیتا ہے۔ وہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیتا ہے جو اس کے شایان شان نہیں ہیں۔ مثلاً انسانوں کے حالات پر قیاس کرکے خدا کے مقربین کا عقیدہ بنا لینا۔ بادشاہوں کو دیکھ کر یہ فرض کر لینا کہ جس طرح بادشاہوں کے نائب اور مددگار ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے بھی نائب اور مددگار ہیں۔ خدائی فیصلہ کے بارے میں ایسا خیال قائم کر لینا جس میں آدمی کی اپنی خواہشیں تو پوری ہو رہی ہوں مگر وہ خداوندی عدل سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ یہ خدا کے ناموں میں کجی کرنا ہے کہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو اس کی عظمت کے شایان شان نہ ہوں۔

خدا کسی آدمی کی کج روی پر فوراً اس کو نہیں پکڑتا۔ اس طرح اس کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ یا تو خدا کی تنبیہات کو دیکھ کر سنبھل جائے یا مزید ڈھیٹ ہو کر اپنے جرم کو پوری طرح ثابت شدہ بنا دے۔

کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو ایک صاف ڈرانے والا ہے۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام پر نظر نہیں کی اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے ہر چیز سے اور اس بات پر کہ شاید ان کی مدت قریب آگئی ہو۔ پس اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔ جس کو اللہ بے راہ کردے اس کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ اور وہ ان کو سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کی بابت پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا۔ کہو اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ وہ بھاری ہو رہی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ وہ جب تم پر آئے گی تو اچانک آجائے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی تحقیق کر چکے ہو۔ کہو اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ کہو میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب کو جانتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک ڈرانے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں ۱۸۴—۱۸۸

بامقصد آدمی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر مصلحت پسند انسان ہوتا ہے۔ وہ وقت کے رواج سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔ وہ ماحول میں جمے ہوئے مصالح سے بے پروا ہو کر اپنا کام کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے نشانہ کی خاطر اپنا جان و مال سب کچھ قربان کر دیتا ہے جس کا کوئی نتیجہ بظاہر اس دنیا میں ملنے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بامقصد آدمی کو اکثر اپنے معاصرین کی طرف سے جو سب سے بڑا خطاب ملتا ہے وہ "مجنون" ہے۔ خدا کا پیغمبر اپنے وقت کا سب سے بڑا بامقصد انسان ہوتا ہے۔ اس لئے خدا کے پیغمبروں کو ہر زمانہ کے لوگوں نے یہی کہا کہ یہ مجنون ہو گئے ہیں۔

خدا کے دین کے داعی کو مجنون کہنا تمام ظلموں میں سب سے بڑا ظلم ہے۔ کیونکہ وہ جس پیغام کو لے کر اٹھتا ہے وہ ایک ایسا پیغام ہے جس کی تصدیق تمام زمین و آسمان کر رہے ہیں۔ وہ ایسے خدا کی طرف بلاتا ہے جو اپنی کائناتی تخلیقات میں ہر طرف انتہائی حد تک نمایاں ہے۔ وہ ایسی آخرت کی خبر دیتا ہے جو زمین و آسمان میں اسی طرح سنگین حقیقت بنی ہوئی ہے جس طرح کسی ماں کے پیٹ میں پورا حمل۔ لوگ حق کے بارے میں سنجیدہ نہیں، اس لئے حق کی خاطر جان کھپانے والا انھیں مجنون دکھائی دیتا ہے۔ اگر وہ حق کی قدر و قیمت کو جانتے تو کبھی ایسا نہ کہتے۔

"قیامت کس تاریخ کو آئے گی" اس قسم کے سوالات غیر سنجیدہ ذہن سے نکلے ہوئے سوالات ہیں۔ قیامت کو ماننے کا انحصار قیامت کے حق میں اصولی دلیل پر ہے نہ کہ اس بات پر کہ قیامت کی تاریخ متعین صورت میں بتا دی جائے۔ جب یہ دنیا دار الامتحان ہے تو یہاں قیامت کو تنبیہ کی زبان میں بتایا جائے گا نہ کہ حسابی تعینات کی زبان میں۔

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اس کو ایک ہلکا سا حمل رہ گیا۔ پھر وہ اس کو لئے پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ اپنے رب سے دعا کی، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد دی تو ہم تیرے شکر گزار رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو تندرست اولاد دے دی تو وہ اس کی بخشی ہوئی چیزیں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا وہ شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کرسکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کرسکتے ہیں۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لئے پکارو تو وہ تمھاری پکار پر نہ چلیں گے۔ برابر ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمھارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس تم ان کو پکارو، وہ تمھیں جواب دیں اگر تم سچے ہو ۱۹۴ — ۱۸۹

کائنات اپنے خالق کا جو تعارف کراتی ہے وہ ایسا تعارف ہے جو کسی حال میں شرک کے تصور کو قبول نہیں کرتا۔ کائنات میں بے شمار اجزاء الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ مگر تمام اجزاء مل کر ایک ہم آہنگ کل بن جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا تضاد یا ٹکراؤ نہیں۔ یہ کامل ہم آہنگی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس دنیا کا خالق و مالک ایک ہو اور وہی تنہا اس کو چلا رہا ہو۔

مرد اور عورت کے معاملہ کو دیکھئے۔ ایک مرد اور ایک عورت میں جو کامل مطابقت ہوتی ہے وہ شاید موجودہ کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے جس کا تجربہ ایک شخص کرتا ہے۔ مرد ایک منفرد اور مستقل وجود ہے اور عورت اس سے الگ ایک مستقل وجود۔ مگر یہ مرد اور عورت جب میاں اور بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دونوں کا وجود اس طرح ایک دوسرے میں شامل ہو جاتا ہے کہ ان میں کوئی دوئی باقی نہیں رہتی۔ ہر ایک کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اُس کے لئے پیدا کیا گیا ہوں اور وہ میرے لئے۔ دونوں کے درمیان یہ گہری سازگاری اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایک ہی ارادہ نے اپنے پیشگی منصوبہ کے تحت دونوں کو ایک خاص ڈھنگ پر بنایا ہے۔ کائنات میں اگر ایک سے زیادہ ہستیوں کی کارفرمائی ہوتی تو دو مختلف اور متضاد چیزوں کے درمیان یہ کامل ہم آہنگی ممکن نہ ہوتی۔

مگر کیسی عجیب بات ہے کہ جس کائنات میں توحید کے اتنے زیادہ دلائل موجود ہیں وہاں آدمی شرک کو اپنا مذہب بناتا ہے۔ دو انسانوں میں "وحدت" کے کرشمہ سے ایک تیسرے بچہ نے جنم لیا مگر جب وہ پیدا ہوگیا تو کسی نے یہ عقیدہ بنا لیا کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ بزرگ کی برکت سے ہوئی ہے۔ کسی نے اس کو مفروضہ دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیا۔ کسی نے کہا کہ یہ مادہ کی اندھی طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ ہے۔ کسی نے یہ سمجھا کہ یہ خود اس کی اپنی کمائی ہے جو ایک خوبصورت بچہ کی صورت میں اس کو حاصل ہوئی ہے۔

کیا ان کے پاؤں ہیں کہ ان سے چلیں۔ کیا ان کے ہاتھ ہیں کہ ان سے پکڑیں۔ کیا ان کے آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھیں۔ کیا ان کے کان ہیں کہ ان سے سنیں۔ کہو، تم اپنے شریکوں کو بلاؤ۔ پھر تم لوگ میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ یقیناً میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ کارسازی کرتا ہے نیک بندوں کی۔ اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ نہ تمھاری مدد کرسکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کرسکتے ہیں۔ اور اگر تم ان کو راستہ کی طرف پکارو تو وہ تمھاری بات نہ سنیں گے اور تم کو نظر آتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر وہ کچھ نہیں دیکھتے ۱۹۸ — ۱۹۵

بت پرست لوگ پتھر یا دھات کی جو مورتیاں بناتے ہیں اس کا فلسفہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خارجی مظاہر ہیں جن کے اندر ان کا مزعومہ دیوتا حلول کر آیا ہے۔ ان مظاہر کی پرستش ان کے نزدیک اُن معبودوں کی پرستش ہے جن کی وہ محسوس علامتیں ہیں۔ تاہم عوام کی سطح پر عملاً بت پرستی جو شکل اختیار کرتی ہے وہ یہ کہ لوگ خود ان مورتیوں کو مقدس سمجھنے لگتے ہیں۔ ان بتوں میں نہ چلنے کی طاقت ہوتی، نہ پکڑنے کی، نہ دیکھنے کی اور نہ سننے کی۔ مگر وہی انسان ان کی بابت یہ فرض کرلیتا ہے کہ وہ اس کے کام آئیں گے اور اس کی حاجتیں پوری کریں گے۔

تاہم یہ معاملہ معروف قسم کے بتوں ہی کا نہیں ہے۔ ان کے سوا جن چیزوں کو انسان معبودیت کا درجہ دیتا ہے ان کا حال بھی یہی ہے، وطن اور قوم سے لے کر زندہ یا مردہ شخصیتوں تک جن جن چیزوں سے بھی وہ جذبات وابستہ کیے جاتے ہیں جو صرف ایک خدا کا حق ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ کوئی بھی پاؤں یا ہاتھ یا آنکھ والا ایسا نہیں جس کے پاؤں اور ہاتھ اور آنکھ اس کے اپنے ہوں۔ ہر "پاؤں" والے کے پاس دیا ہوا پاؤں ہے اور اگر اس کا پاؤں چھن جائے تو وہ اس کو دوبارہ واپس نہیں لاسکتا۔ ہر "ہاتھ" والے کے پاس دیا ہوا ہاتھ ہے اور اگر اس کا ہاتھ باقی نہ رہے تو وہ دوبارہ اپنا ہاتھ نہیں بنا سکتا۔ ہر "آنکھ" والے کی آنکھ دی ہوئی آنکھ ہے اور اگر اس کی آنکھ جاتی رہے تو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دوبارہ اپنے لئے آنکھ تیار کرلے۔

غیر اللہ کی پرستش کرنے والے لوگ اپنے بتوں کے بھروسہ پر ہمیشہ ایک خدا کے پرستاروں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ مگر یہ لوگ بہت جلد جان لیں گے کہ خدا کی اس دنیا میں ان کا بھروسہ کس قدر بے بنیاد تھا۔ جس خدا کا ظہور موجودہ دنیا میں کتابی میزان کی صورت میں ہوا ہے، اس کا ظہور عنقریب عدالتی میزان کی صورت میں ہونے والا ہے۔ اس وقت ہر آدمی دیکھ لے گا کہ کام بنانے والا صرف خدا تھا، اگرچہ آدمی اپنی نادانی کی وجہ سے دوسروں کو اپنا کام بنانے والا سمجھتا رہا۔ شریکوں کے پاس تو سرے سے مدد کرنے کی کوئی طاقت ہی نہیں، مگر خدا اپنے وفادار بندوں کی مدد دنیا میں بھی کرتا ہے اور آخرت میں بھی۔

درگزر کرو۔ نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اور اگر تم کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کمی نہیں کرتے ۲۰۲ - ۱۹۹

توحید اور آخرت، نیکی اور عدل کی طرف بلانا "عُرف" کی طرف بلانا ہے۔ یعنی ان بھلائیوں کی طرف جو عقل و فطرت کے نزدیک جانی پہچانی ہیں۔ مگر یہ سادہ ترین کام ہر زمانہ میں مشکل ترین کام رہا ہے۔ انسان کی حُبِ عاجلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر زمانہ میں لوگ اپنی زندگی کا نظام دنیوی مفاد اور ذاتی مصلحتوں کی بنیاد پر قائم کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ حق کا نام لے کر باطل پرستی کے مشغلہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب بھی سچائی کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو ہر آدمی اپنے آپ پر اس کی زد پڑتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی اس کا مخالف بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

ایسی حالت میں داعی کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے درگزر اور اعراض۔ یعنی لوگوں سے الجھے بغیر بالکل ٹھنڈے طور پر اپنا کام جاری رکھنا۔ داعی اگر لوگوں کے نکالے ہوئے شوشوں کا جواب دینے لگے تو حق کی دعوت مناظرہ کی صورت اختیار کرے گی۔ داعی اگر لوگوں کی طرف سے چھیڑے ہوئے غیر ضروری سوالات میں اپنے کو مشغول کرے تو وہ صرف اپنے وقت اور اپنی طاقت کو ضائع کرے گا۔ داعی اگر لوگوں کی طرف سے آنے والی تکلیفوں پر ان سے جھگڑنے لگے تو دعوت حق دعوت حق نہ رہے گی بلکہ معاشی اور سیاسی لڑائی بن جائے گی۔ اس لئے حق کی دعوت کو اس کی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ داعی جاہلوں اور معاندوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گواریوں پر صبر کرے اور ان سے الجھے بغیر اپنے مثبت کام کو جاری رکھے۔

تاہم موجودہ دنیا میں کوئی شخص نفس اور شیطان کے حملوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صرف اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہی حساسیت موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ڈھال ہے۔ جب بھی آدمی کے اندر کوئی غلط خیال آتا ہے یا کسی قسم کی منفی نفسیات ابھرتی ہے تو اس کی حساسیت فوراً اس کو بتا دیتی ہے کہ وہ پھسل گیا ہے۔ ایک لمحہ کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگتے ہوئے دوبارہ اپنے کو درست کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ کے ڈر سے خالی ہوتے ہیں ان کے اندر شیطان داخل ہو کر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور ان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھی بن کر وہ کس گڑھے کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ حساسیت آدمی کی سب سے بڑی محافظ ہے جب کہ بے حسی آدمی کو شیطان کے مقابلہ میں غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔

اور جب تم ان کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) نہیں لائے تو کہتے ہیں کہ کیوں نہ تم چھانٹ لائے کچھ اپنی طرف سے۔ کہو، میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ سوجھ کی باتیں ہیں تمھارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اپنے دل میں، عاجزی اور خوف کے ساتھ اور پست آواز سے، اور غافلوں میں سے نہ بنو۔ جو (فرشتے) تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے۔ اور وہ اس کی پاک ذات کو یاد کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں

۲۰۳ — ۲۰۶

مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے کہ اگر تم خدا کے پیغمبر ہو تو خدا کے یہاں سے کوئی معجزہ کیوں نہیں لائے۔ خدا کے لئے انتہائی آسان تھا کہ وہ آپ کو ایک معجزہ دے دیتا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اصل مقصد جاتا رہتا۔

مثلاً فرض کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جدید طرز کی ایک موٹر کار اتار دی جاتی جس میں لاؤڈ اسپیکر نصب ہوتا۔ آپ اس میں بیٹھ کر چلتے اور لوگوں کے درمیان تبلیغ کرتے۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں ایسی ایک کار لوگوں کے لئے انتہائی حیرت ناک معجزہ ہوتی۔ مگر اس کا نقصان یہ ہوتا کہ لوگوں کی توجہ اصل بات سے ہٹ جاتی۔ اصل مقصد تو یہ تھا کہ خدا کا کلام لوگوں کے لئے بصیرت بنے۔ اس سے لوگوں کو سوچنے کا ڈھنگ اور عمل کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ اس سے روحوں کو خدائی ٹھنڈک ملے۔ مگر مذکورہ معجزہ کے بعد یہ سارا منصوبہ دھرا رہ جاتا اور لوگ بس طلسماتی سواری کے عجوبہ میں محو ہو کر رہ جاتے۔

کراماتی چیزوں میں کھونے کا نام دین نہیں۔ دین یہ ہے کہ آدمی خدا کے کلام پر دھیان دے۔ اس کو غور کے ساتھ پڑھے اور توجہ کے ساتھ سنے۔ دین دار ہونے کی پہچان یہ ہے کہ خدا کے ساتھ آدمی کا گہرا تعلق قائم ہو جائے۔ اس کے دل میں گداز پیدا ہو۔ وہ خدا کی یاد کرنے والا بن جائے۔ خدا کی عظمت اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ وہ اس کے اندر تواضع اور خوف کی کیفیت پیدا کر دے۔ خدا کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی آواز پست ہو جائے۔ وہ غفلت سے نکل کر بیداری کے عالم میں پہنچ جائے۔

آخر میں فرشتوں کا کردار بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ تم بھی ایسا ہی کرو تاکہ تمھیں فرشتوں کی معیت حاصل ہو۔ جب آدمی اپنے آپ کو گھمنڈ سے پاک کرتا ہے۔ اور خدا کے کمالات سے اتنا سرشار ہوتا ہے کہ اس کے دل سے ہر وقت اس کی یاد ابلتی رہتی ہے تو وہ فرشتوں کا ہم سطح ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں کسی انسان کی ترقی کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے ملکوتی کردار کا حامل بن جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے فرشتوں کے پڑوس میں زندگی گزارنے لگے۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

وہ تم سے انفال (مال غنیمت) کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ انفال اللہ اور اس کے رسول کے ہیں۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت ہیں اور ان کے لئے عزت کی روزی ہے ۴ ۔ ۱

سورۂ انفال جنگ بدر (۲ ھ) کے بعد اتری۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی اور اس کے بعد میدان جنگ سے کافی مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔ مگر یہ اموال عملاً ایک گروہ کے قبضہ میں تھے۔ اس بنا پر جنگ کے بعد غنیمت کی تقسیم پر نزاع پیدا ہو گئی۔ جنگ میں کچھ لوگ پچھلی صف میں تھے۔ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ آخری مرحلہ میں دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اس طرح میدان جنگ سے مال غنیمت لوٹنے کا موقع ایک خاص فریق کو ملا۔ دوسرے لوگ جو اس وقت میدان جنگ سے دور تھے وہ دشمن کے چھوڑے ہوئے اموال کو حاصل نہ کر سکے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اصولی طور پر تو جنگ کے تمام شرکاء اپنے کو مال غنیمت میں حصہ دار سمجھتے تھے۔ مگر مال غنیمت عملاً صرف ایک گروہ کے قبضہ میں تھا۔ ایک فریق کے پاس دلیل تھی اور دوسرے فریق کے پاس مال۔ ایک کے پاس اپنے حق کو ثابت کرنے کے لئے صرف الفاظ تھے۔ جبکہ دوسرے کا حق کسی دلیل و ثبوت کے بغیر خود قبضہ کے زور پر قائم تھا۔

اس قسم کے تمام جھگڑے خدا کے خوف کے منافی ہیں۔ خدا کا خوف آدمی کے اندر ذمہ داری کی نفسیات ابھارتا ہے۔ ایسے آدمی کی توجہ فرائض پر ہوتی ہے نہ کہ حقوق پر۔ وہ اپنی طرف دیکھنے کے بجائے خدا کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس کا دل خدا اور رسول کی اطاعت کے لئے نرم پڑ جاتا ہے۔ وہ خدا کا عبادت گزار بندہ بن جاتا ہے۔ لوگوں کو دے کر اسے تسکین ملتی ہے نہ کہ لوگوں سے چھین کر۔ یہ اوصاف آدمی کے اندر حقیقت پسندی اور حق کے اعتراف کا مادہ پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت پسندی اور اعتراف حق کی فضا کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپس کے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کبھی اتفاقاً ابھرتے ہیں تو ایک بار کی تنبیہ ان کی اصلاح کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

خدا کی پکڑ کا اندیشہ ہر ایک کو اس حد پر پہنچا دیتا ہے جس حد پر اس کو فی الواقع ہونا چاہئے تھا۔ اور جہاں ہر آدمی اپنی واقعی حد پر رکنے کے لئے راضی ہو جائے وہاں جھگڑے کا کوئی گزر نہیں۔

جیسا کہ تمھارے رب نے تم کو حق کے ساتھ تمھارے گھر سے نکالا۔ اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تم سے جھگڑ رہے تھے باوجودیکہ وہ ظاہر ہوچکا تھا، گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں آنکھوں دیکھتے۔ اور جب خدا تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک تم کو مل جائے گی۔ اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے۔ اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ حق کا حق ہونا ثابت کردے اپنے کلمات سے اور منکروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہوکر رہے اور باطل باطل ہوکر رہ جائے خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو ۸ ــ ۵

شعبان ۲ھ میں معلوم ہوا کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے مکہ کی طرف واپس جارہا ہے۔ اس قافلہ کے ساتھ تقریباً ۵۰ ہزار اشرفی کا سامان تھا۔ اس کا راستہ مدینہ کے قریب سے گزرتا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے قافلۂ تجارت پر حملہ کریں۔ چنانچہ قافلہ کے سردار ابوسفیان بن حرب نے تیز رفتار ایلچی کے ذریعہ مکہ والوں کے پاس یہ خبر بھیجی کہ مدد کے لئے دوڑو ورنہ مسلمان تجارتی قافلہ کو لوٹ لیں گے۔ مکہ میں اس خبر سے بڑا جوش پیدا ہوگیا۔ چنانچہ ۹۵۰ سوار جن میں ۶۰۰ زرہ پوش تھے مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تمام خبریں مل رہی تھیں۔ اب مدینہ کے مسلمان دو گروہوں کے درمیان تھے۔ ایک شام سے آنے والا تجارتی قافلہ۔ دوسرا مکہ سے مدینہ کی طرف بڑھنے والا جنگی لشکر۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ تجارتی قافلہ کی طرف بڑھا جائے۔ اس قافلہ کے ساتھ بمشکل ۴۰ محافظ تھے۔ اس کو بآسانی مغلوب کرکے اس کے سامان پر قبضہ کیا جاسکتا تھا۔ مگر خدا کا منصوبہ دوسرا تھا۔ خدا کو دراصل منکرینِ حق کا زور توڑنا تھا نہ کہ کچھ اقتصادی فائدہ حاصل کرنا۔ خدا نے مخصوص حالات پیدا کرکے ایسا کیا کہ تمام مخالف سرداروں کو مکہ سے نکالا اور ان کو مدینہ سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر بدر کے مقام پر پہنچا دیا تاکہ مسلمانوں کو ان سے ٹکرا کر ہمیشہ کے لئے ان کا خاتمہ کردیا جائے۔ اللہ کے رسول نے جب مسلمانوں کو خدا کے اس منصوبہ سے مطلع کیا تو سب کے سب متفق ہوکر بدر کی طرف بڑھے۔ ان کی تعداد اگرچہ صرف ۳۱۳ تھی۔ ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔ مگر اللہ نے ان کی خصوصی مدد فرمائی۔ انھوں نے قریش کے لشکر کو بری طرح شکست دی۔ ان کے ستر سردار قتل ہوئے اور ستر گرفتار کرلئے گئے۔ بدر کا میدان کفر کے مقابلہ میں اسلام کی فتح کا میدان بن گیا ــــ جب بھی ایسا ہو کہ ایک طرف مادی فائدہ ہو اور دوسری طرف دینی فائدہ تو یہ تقسیم خود اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا کی مرضی دینی فائدہ کی طرف ہے نہ کہ مادی فائدہ کی طرف۔

اسلامی جدوجہد کا نشانہ کبھی معاشی مفاد حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ اسلامی جدوجہد کا نشانہ ہمیشہ باطل کا زور توڑنا ہوتا ہے۔ خواہ وہ نظریاتی طاقت کے ذریعہ ہو یا حالات کے اعتبار سے مادی طاقت کے ذریعہ۔

برائی کی علامت

۱۳ مئی ۱۹۸۱ کو دنیا کی سب سے زیادہ گرما گرم خبر یہ تھی کہ ویٹکن (اٹلی) کے پوپ جان پال دوم پر ایک شخص نے پستول سے قاتلانہ حملہ کیا۔ پوپ شدید طور پر زخمی ہوئے تاہم وہ بچ گئے۔

حملہ کرنے والا ایک ترک نوجوان محمد علی اغسا تھا۔ اس کو پولیس نے فوراً گرفتار کر لیا۔ پوچھ تاچھ کے دوران محمد علی اغسا نے بتایا کہ وہ مظلوم اور پس ماندہ قوموں کا حامی ہے۔ وہ دنیا کے ایک ایسے بڑے کو قتل کرنا چاہتا تھا جو سامراج کی علامت (Symbol of Imperialism) ہو۔ اس نے بتایا کہ اس نے پہلے برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر ان کو چھوڑ دیا کہ وہ ایک عورت ہے۔ اس کے بعد اس نے چاہا کہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم کو قتل کرے۔ مگر وہ امریکہ میں رہتے ہیں اور امریکہ پہنچنے کے ذرائع اس کے پاس نہ تھے۔ بالآخر اس نے اٹلی کے پوپ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ محمد علی اغسا ایک مخلص مسلمان ہے۔ وہ فرائض کا پابند ہے۔ وہ شراب اور سگرٹ اور سور کے گوشت سے مکمل پرہیز کرتا ہے۔ مظلوم انسانوں کا اس کو اتنا درد ہے کہ اس نے بستر پر سونا چھوڑ دیا ہے۔ وہ رات کے وقت کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی میز پر سر رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے سوتا ہے اور اس کے بعد اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔

ترک نوجوان کی یہ کہانی موجودہ زمانہ میں ہمارے بیشتر لیڈروں کی کہانی ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے یہ کیا کہ کسی حکمراں، کسی لیڈر، کسی قوم یا کسی خاندان کو برائی کی علامت قرار دے لیا اور بس اس کو نیچا دکھانے یا اس کو ختم کرنے میں اپنی ساری طاقت لگا دی۔ ہمارے لیڈروں میں سے اکثر اس اعتبار سے کامیاب رہے کہ انھوں نے جس کو برائی کی علامت سمجھا تھا اس کا کسی نہ کسی طرح خاتمہ ہو گیا مگر اس کے باوجود برائی اپنی پوری طاقت کے ساتھ باقی رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ برائی کا بے حد ناقص اندازہ ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ کسی خاص شخص یا خاص گروہ میں مجسم ہوئی ہے۔ اس قسم کی چیز فوری شہرت اور قیادت حاصل کرنے میں ضرور کارآمد ہو سکتی ہے، مگر اس قسم کی چیزوں سے کبھی برائی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ برائی کی جڑیں ہمیشہ اس سے بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں کہ ایک علامتی شخصیت کو ہلاک کر کے ان کا خاتمہ کیا جا سکے۔ یہ دراصل سستا کریڈٹ لینے کی کوشش ہے اور سستا کریڈٹ خدا کی اس محکم کائنات میں کبھی کسی کو نہیں ملتا۔

داعیانہ اخلاق کی ضرورت

ایک شخص تاجر کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرے، دوسرا شخص داداگیری کو اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہو تو دونوں کا اخلاق یکساں نہیں ہو سکتا۔ تاجر کا اخلاق اور ہو گا اور داداگیری کرنے والے کا اور۔ یہی معاملہ داعی کا ہے۔ جو شخص یا گروہ حق کا داعی بنے ضروری ہے کہ اس کی اخلاقیات بھی اس کے مطابق ہوں۔ اگر وہ زبان سے داعی ہونے کا مدعی ہو مگر اس کا اخلاق غیر داعیانہ ہو تو وہ لوگوں کی نظر میں مسخرہ بن کر رہ جائے گا، وہ داعی کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

انتہائی لازمی طور پر ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان غیر دعوتی امور پر جھگڑے نہ کھڑے کئے جائیں۔ غیر دعوتی جھگڑے اس فضا ہی کو ختم کر دیتے ہیں جس میں داعی اپنی دعوت پیش کرے اور مدعو اس کو سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ سنے۔

تاہم یہ دعوتی فضا داعی سے بہت بڑی قیمت مانگتی ہے۔ یہ قیمت صبر ہے۔ داعی کو ارادی اور شعوری طور پر یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ نقصانات اور تکلیفوں پر صبر کرے گا۔ حضرت مسیح کے تمثیلی الفاظ میں مدعو اگر اس کا کرتا چھینے تو وہ اس کو اپنا چغہ بھی دینے کے لئے تیار رہے۔ مدعو اگر ایک کوس بیگار چلنے کو کہے تو وہ دو کوس بیگار چلا جائے۔ تاکہ کوئی غیر متعلق جھگڑا کھڑا ہو کر دونوں کے درمیان ایسی صورت نہ پیدا کر دے کہ سننے اور سنانے کا ماحول ہی ختم ہو جائے۔

ماں اپنے بچہ کو دوا کھلانا چاہتی ہو اور اس وقت بچہ کوئی دوسری ضد شروع کر دے تو ماں بچہ کی اس ضد کی راہ میں حائل نہیں ہوتی کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ دوا کھلانے کا کام رک جائے اور بچہ اور ماں کے درمیان ساری نزاع ایک غیر متعلق ضد پر ہونے لگے۔ اسی طرح داعی کو چاہئے کہ مدعو کے ہر وار کو اپنے اوپر سہتا رہے تاکہ دونوں کے درمیان اعتدال کی فضا قائم رہے اور داعی اپنی اصل بات کو مدعو کے دل میں اتار سکے۔ مدعو گروہ سے دوسری دوسری شکایتوں پر کش مکش صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے ذہنوں میں اپنے داعی ہونے کا شعور ختم ہو گیا ہو جنھوں نے اپنی داعیانہ حیثیت کھو دی ہو اور وہ دوسری قوموں کی طرح محض ایک قوم بن کر رہ گئے ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر سے داعیانہ شعور ختم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام سرگرمیاں بالکل قومی بن کر رہ گئی ہیں۔ اس روش نے مسلمانوں کو خدا کی نصرت سے محروم کر دیا ہے۔ کیونکہ خدا کی نصرت دعوت الی اللہ کے لئے اٹھنے والوں کو ملتی ہے نہ کہ قومی جھگڑا کرنے والوں کو۔

بد دعا سے بچنا اور ہمیشہ اچھی دعا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ سے اپنے حق میں دعا کے لئے کہتا تو آپ فوراً انھیں الفاظ میں اس کے لئے دعائیہ کلمات کہتے جن الفاظ میں اس نے اپنے لئے دعا کی درخواست کی تھی۔ حضرت ابوہریرہ رض نے اپنی مشرک ماں کے لئے دعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا: اے خدا کے رسول، اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے (ادع اللہ ان یھدی ام ابی ھریرۃ) آپ نے فوراً دعا کرتے ہوئے کہا: اے اللہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے (اللھم اھد ام ابی ھریرۃ) نیز حسب موقع اس میں کچھ بہتر الفاظ کے ساتھ اضافہ فرما دیتے۔ ایک بار حضرت ابوہریرہ نے آپ سے کہا کہ اے خدا کے رسول میرے لئے خدا سے دعا کر دیجئے کہ وہ مجھ کو اور میری ماں کو اپنے مومن بندوں میں محبوب بنا دے (ادع اللہ ان یحببنی وامی الی عبادہ المومنین) آپ نے فرمایا: اے اللہ ابوہریرہ اور ان کی ماں کو اپنے مومن بندوں میں محبوب بنا دے اور اپنے مومن بندوں کو ان دونوں کے لئے محبوب کر دے (اللھم حبّب عبیدک ھذا وامہ الی عبادک المومنین وحببھم الیھما)

یہ طریقہ آپ کا اچھی دعا کے لئے تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص بد دعا کے لئے کہتا تو اس صورت میں آپ کا طریقہ دوسرا ہوتا۔ اب آپ آدمی کی درخواست کے برعکس اس کے لئے بہتری کی دعا کرنے لگتے۔ طفیل بن عمرو الدوسی مکہ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اس کے بعد اپنے وطن واپس جا کر قبیلہ دوس میں تبلیغ کرنے لگے۔ مگر ان کی بیوی کے والد کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ وہ دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، قبیلہ دوس کے لئے بد دعا فرمائیے۔ آپ نے حضرت طفیل سے کوئی بحث نہ کی بلکہ ان الفاظ میں دعا کرنا شروع کر دیا: اے اللہ قبیلہ دوس کے لوگوں کو ہدایت دے (اللھم اھد دوسا) اس کے بعد حضرت طفیل نے دوبارہ اپنے قبیلہ میں واپس آکر تبلیغ کی تو سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ انھیں میں سے ایک حضرت ابوہریرہ بھی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ واقعات میں جو طریقہ ملتا ہے یہی مومن کا اصل مزاج ہے۔ مومن کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بھی ایک مومن کے لئے وہی بہتر چیز چاہنے لگتا ہے جس کا وہ مومن خود خواہاں ہو۔ مومن دوسرے کی ہدایت کا حریص ہوتا ہے، اس لئے جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص صحیح راستہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو وہ اس کے خلاف بد دعا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے حق میں خدا سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کا سینہ ہدایت کے لئے کھول دے۔

نجات کی دو شرطیں

آخرت میں نجات کن لوگوں کو حاصل ہوگی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دو شرطوں میں سے کم از کم ایک شرط کا ثبوت دیا ہو۔ اول وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں ظلم کو شامل نہیں کیا ——— اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی ظلم نہیں ملایا انھیں کے لئے امن ہے اور وہی سیدھی راہ پر ہیں (انعام ۸۳)

یہاں ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جو آدمی کے لئے یقین کے ہم معنی بن جاتا ہے اور ظلم سے مراد شرک ہے۔ جو لوگ اللہ کو اس طرح پائیں کہ وہ ان کی نفسیات کا جزء بن کر ان کے اوپر چھا جائے۔ وہ ان کے دل و دماغ کو اپنے احاطہ میں لے لے۔ ان کا ایمان اور ان کا سوچنا اور چاہنا الگ الگ نہ رہیں بلکہ دونوں ایک ہو جائیں۔ ان کا یقین و اعتماد، ان کا خوف و محبت، ان کی دلچسپیاں اور وفاداریاں سب اسی کے لئے ہو جائیں جو ان کا ایمان باللہ ان سے تقاضا کرتا ہے۔ ایسے لوگ اعلیٰ ترین معنی میں ہدایت یافتہ مومن ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ میں جیتے ہیں۔ ان کا سب کچھ اللہ بن جاتا ہے۔ وہ دنیا کی زندگی ہی میں خدا کی پناہ میں آچکے ہوتے ہیں۔ اور جو دنیا ہی میں خدا کی پناہ حاصل کر چکا ہو اس کے متعلق کون شبہ کر سکتا ہے کہ وہ آخرت میں محروم ہوگا۔

دوسرا درجہ وہ ہے جس کو "اعتراف" کہا گیا ہے ——— اور کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ انھوں نے نیک عمل کے ساتھ برا عمل ملا دیا۔ بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے۔ وہ بخشنے والا مہربان ہے (توبہ ۱۰۲) پہلے گروہ کے لئے اگر "عمل" باعث نجات بنے گا تو دوسرے گروہ کے لئے "اعتراف"۔ آدمی کو اپنے رب کے سامنے یا کامل عمل پیش کرنا ہے یا کامل اعتراف۔ ان دو کے بعد نجات کا کوئی تیسرا درجہ نہیں۔

آدمیوں میں کچھ مضبوط ارادہ کے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ کمزور ارادہ کے لوگ۔ مضبوط ارادہ کے لوگ جب دل سے اللہ کا اقرار کر لیتے ہیں تو ان کا عمل ان کے اقرار سے الگ نہیں رہتا۔ وہ اپنے عمل میں بھی وہی بن جاتے ہیں جو وہ اپنے دل کے اندر بنے ہیں۔ مگر کمزور ارادہ کے لوگ اپنے اقرار اور اپنے عمل میں اتنی یکسانی پیدا نہیں کر پاتے۔ وہ بار بار شیطان اور نفس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاہم ایسے لوگوں کے لئے بھی اللہ کے یہاں رحمتوں کا سایہ ہے۔ مگر یہ سایہ اس شرط پر ہے کہ انھوں نے ڈھٹائی کے بجائے اعتراف کا ثبوت دیا ہو۔ انھوں نے تاویلوں کا سہارا لینے کے بجائے کھلے طور پر اقرار کر لیا ہو۔ وہ بحث کرنے کے بجائے چپ ہو گئے ہوں۔ جب ان کی کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے تو بپھرنے کے بجائے انھوں نے اپنا سر جھکا لیا ہو۔ جن کے اوپر عزت نفس کے بجائے شرمندگی طاری ہوئی ہو۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہ اپنے رب کے سامنے حسن عمل نہ پیش کر سکے ہوں تو انھوں نے اپنے رب کے سامنے عجز کے آنسو پیش کئے ہوں۔ جو لوگ یہ آخری چیز بھی نہ پیش کر سکیں ان کو خدا بخشنے کا تو کس بہانے بخشے گا۔

بحث و جدال تنزل کی علامت ہے

قال الاوزاعی بلغنی ان اللہ اذا اراد بقوم شراً الزمھم الجدل ومنعھم العمل ابن عبدالبر ،
جامع بیان العلم وفضلہ جز ۶ ثانی، صفحہ ۹۲ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر (اللہ جب کسی قوم کے لئے شر کا ارادہ
کرتا ہے تو اس کو جدال میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کو عمل سے روک دیتا ہے)

مومن کی لذت غصہ کو پی جانے میں ہے نہ کہ غصہ کو ظاہر کرنے میں

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کسی بندہ کے لئے دودھ یا شہد کا گھونٹ پینا اتنا شیریں نہیں جتنا غصہ
کا گھونٹ پی لینا (ما تجرع عبد جرعۃ من لبن او عسل خیر من جرعۃ غیظ، رواہ احمد)

مومن کی جنگ فتنہ کو ختم کرنے کے لئے نہ کہ فتنہ کو پیدا کرنے کے لئے

نافع رض سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رض کے پاس عبداللہ بن زبیر رض کے فتنہ میں دو آدمی آئے اور کہا:
لوگ تباہ ہو گئے۔ آپ عمر فاروق رض کے صاحبزادے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ پھر
آپ کو نکلنے میں کیا چیز مانع ہے۔ عبداللہ بن عمر رض نے فرمایا: میرے لئے یہ چیز مانع ہے کہ اللہ نے میرے لئے
میرے بھائی کے خون کو حرام کر دیا ہے۔ دونوں آدمیوں نے کہا: کیا اللہ نے اپنی کتاب میں نہیں فرمایا
ہے وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ (ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے) عبداللہ بن عمر رض نے جواب
دیا: ہم لوگوں سے لڑے یہاں تک کہ فتنہ نہ رہا اور دین اللہ کے لئے ہو گیا۔ اور تم لوگ چاہتے ہو کہ تم لڑو
یہاں تک کہ فتنہ پیدا ہو جائے اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے (فانتم تریدون ان تقاتلوا حتی
تکون فتنۃ ویکون الدین لغیر اللہ، بخاری)

اپنے خلاف تنقید سننے کا شوق

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ اور حضرت معاذ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: میری
نگرانی رکھو، میں تم لوگوں کی نگرانی سے بے نیاز نہیں ہوں۔

اپنے خلاف تنقید سن کر بپھرنا خلاف ایمان ہے

عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں خوش حالی بڑھی تو لوگ شادیوں میں بڑی بڑی مہریں باندھنے لگے۔ عمر
رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی حیثیت سے یہ طے کیا کہ مہر کی مقدار چار سو درہم سے زیادہ نہ ہونی چاہئے۔ چنانچہ ایک
خطبہ میں آپ نے اس کا اعلان فرمایا اور کہا کہ جو شخص چار سو درہم سے زیادہ مہر باندھے گا تو زائد رقم کو
ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا۔ آپ اس اعلان کے بعد ممبر سے اترے تو ایک دراز قد، چپٹی
ناک والی بوڑھی عورت کھڑی ہو گئی۔ اس نے کہا: عمر کو مہر کی حد بندی کا کوئی حق نہیں، جب کہ قرآن نے اس معاملہ میں
رخصت دی ہے۔ پھر اس نے یہ آیت پڑھی وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احدٰھن قنطاراً فلا تاخذوا منہ شیئاً (نساء ۴) یعنی اگر تم ایک عورت کی جگہ دوسری عورت بدلنا چاہو اا

تم نے اس کو بہت سا مال دے رکھا ہو تو اس سے کچھ واپس نہ لو۔ عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو فوراً کہہ اٹھے: امرأة خاصمت عمر فخصمته۔ ایک عورت عمر سے جھگڑ پڑی اور غالب ہوگئی (مصنف عبدالرزاق) دوسری روایت میں ہے: اللهم عفوا، كل الناس افقه من عمر حتى العجائز (خدایا مجھے معاف فرما۔ تمام لوگ عمر سے زیادہ جانتے ہیں حتیٰ کہ بڑھیاں بھی) اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ دوبارہ منبر پر چڑھے اور اعلان کیا کہ میں اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔ جو شخص جتنا چاہے مہر دے۔ اس کو اپنے معاملہ کا اختیار ہے (فتح الباری) البتہ بطور نصیحت فرمایا کہ زیادہ مہر اگر کرامت و شرافت کی علامت ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ حق دار تھے۔ حالاں کہ آپ نے عام طور پر مہریں چار سو درہم تک رکھی ہیں (مسند احمد، ترمذی)

آپس کی لڑائی اسلام کے خلاف ہے

من حمل علينا السلاح فليس منا (حدیث) جس نے ہمارے اوپر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں۔

اللہ کے حوالے کر کے صبر کر لینا

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے امیر معاویہ کے بعد یزید کی خلافت پر بیعت کی تھی۔ بیعت کے وقت انھوں نے فرمایا: اگر یہ خیر ہے تو ہم اس سے راضی ہیں۔ اور اگر یہ شر ہے تو ہم نے اس پر صبر کیا۔

ٹکراؤ کے باوجود ایک دوسرے کا احترام

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں میں جو باہمی لڑائیاں ہوئیں وہ اگرچہ ایک ناپسندیدہ فعل تھا تاہم یہ اونچے انسانوں کی لڑائیاں تھیں، نہ کہ ذلیل طبیعت کے لوگوں کی۔ عین جنگ کے وقت کے بہت سے قصے تاریخوں میں درج ہیں جو ان کی طبیعت کی بلندی اور بہادری کو بتاتے ہیں۔ مثلاً حضرت علی اور امیر معاویہ کی جنگوں میں یہ حال تھا کہ دونوں فریق دن کے وقت ایک دوسرے سے لڑتے اور رات کے وقت ایک لشکر کے لوگ دوسرے لشکر میں جا کر مقتولین کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیتے (البدایہ والنہایہ، جلد ۷، صفحہ ۲۷۰-تہذیب تاریخ ابن عساکر، جلد ۱، صفحہ ۳۷) اسی طرح حضرت حسین کی لڑائی جو یزید بن معاویہ کی فوجوں سے ہوئی، اس میں یہ حال تھا کہ دونوں فوجیں جو ایک دوسرے کے خلاف برسر جنگ تھیں۔ جب نماز کا وقت آتا تو سب مل کر نماز پڑھتے۔ ایک فوج کا سردار دوسری فوج کے سپاہیوں کی امامت کرتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت حسین رضی امام ہوتے اور فریق مخالف ان کے پیچھے صف باندھ کر نماز ادا کرتا

دوستی میں بھی اعتدال، دشمنی میں بھی اعتدال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے دوست سے اعتدال کے ساتھ دوستی کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمھارا دشمن بن جائے۔ اور اپنے دشمن سے اعتدال کے ساتھ دشمنی کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمھارا دوست بن جائے (احبب حبيبك هونًا ما عسى ان يكون بغيضك يومًا ما وابغض بغيضك هونًا ما عسى ان يكون حبيبك يومًا ما)

آہ یہ بے شعوری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مارکسی پروفیسر پر یونیورسٹی کے کچھ مسلمان لڑکوں نے حملہ کیا۔ اس کے بعد دہلی کا ایک اخباری رپورٹر علی گڑھ پہنچا اور اس نے مذکورہ مارکسی پروفیسر کا انٹرویو لیا جو انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۳ جنوری ۱۹۸۱) میں چھپا۔ اس انٹرویو میں مذکورہ پروفیسر نے یونیورسٹی کے اندرونی نظام کی بعض خرابیوں کا ذکر کیا جس کے نتیجہ میں وہاں ہنگامہ پسند لڑکوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور تعلیمی معیار مسلسل گر رہا ہے۔ یہ انٹرویو چھپا تو یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ مشتعل ہوگئے اور یونیورسٹی کیمپس میں توڑ پھوڑ اور ادھم بازی شروع کر دی۔ حالاں کہ ان کا پُرتشدد ردعمل صرف یہ ثابت کر رہا تھا کہ پروفیسر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یونیورسٹی کیمپس میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر موجود ہیں۔

مسلم صحافت اور قیادت نے حسب معمول اس معاملہ میں طلبہ کا ساتھ دیا۔ مسلم اخبارات نے اس انٹرویو کو انتہائی قابل اعتراض (۱۶ مئی ۱۹۸۱) قرار دے کر اس کے خلاف پرشور مضامین لکھے۔ مگر اردو یا انگریزی کے کسی بھی اسلام پسند اخبار نے انٹرویو کے اصل الفاظ شائع نہیں کیے۔ جن لوگوں نے اصل انٹرویو کو انڈین اکسپریس میں پڑھا ہے وہ اتفاق کریں گے کہ اس یک طرفہ لفظی طوفان کی وجہ یہ تھی کہ اگر یہ مسلم اخبارات اصل انٹرویو شائع کر دیتے تو قارئین پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ وہ یقینی طور پر "انتہائی قابل اعتراض" نہیں تھا۔ وہ بس ایسا ہی تھا کہ یا تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا یا اس کے جواب میں ایک وضاحتی مضمون مرتب کر کے شائع کر دیا جاتا ——

یہ ہے ہماری وہ غیر عادلانہ سیاست جس پر ہم یقین کیے بیٹھے ہیں کہ خدائے عادل ہمارے اوپر اپنی نصرتوں کی بارش برسائے گا۔

اس قسم کے لایعنی ہنگاموں کا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر علی گڑھ کے طلبہ کے یہ ہنگامے جو اسلام کے نام پر کیے گئے ان پر دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا نے تین قسطوں میں ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ مسٹر جے۔ ڈی سنگھ نے اپنی اس رپورٹ میں جو باتیں کہی ہیں ان میں سے ایک بات ان کے الفاظ میں یہ ہے۔

> Why do the AMU students raise the cry of 'Islam in danger' at the slightest pretext ? Is Islam which has withstood major onslaughts on it in the past, become so fragile as to be seen to crumble before a mere newspaper article by a marxist.

ایسا کیوں ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ انتہائی معمولی باتوں کو لے کر "اسلام خطرہ میں" کی چیخ پکار بلند کرنے لگتے ہیں۔ اسلام جو ماضی میں اپنے اوپر بڑے بڑے حملوں کے مقابلہ میں قائم رہا کیا اب اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ ایک اخبار میں کسی مارکسسٹ کا محض ایک مضمون چھپ جانے سے وہ منہدم ہوتا ہوا نظر آنے لگے (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ مئی ۱۹۸۱)

اس سے اندازہ کیجئے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے علم بردار کس طرح اسلام کے نادان دوست ثابت ہوئے ہیں

مسلم یونیورسٹی کا یہ واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے جس میں ان تمام سرگرمیوں کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے جو ہمارے یہاں ملت کے نام پر جاری ہیں۔ نیز اسی مثال سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری ملی سرگرمیاں اپنی ساری دھوم کے باوجود اس قدر ناکام کیوں ہیں۔

۱۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ ایجی ٹیشن پروفیسر عرفان حبیب کے ایک انٹرویو کے نام پر شروع کیا گیا۔ اس ایجی ٹیشن میں حصہ لینے اور اس کی حمایت کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مگر آپ جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر بہت ہی کم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اس انٹرویو کو انگریزی میں مکمل طور پر پڑھا ہے۔ زیادہ تر لوگ بس سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اس کے خلاف مجاہد بنے ہوئے ہیں۔ یہ قرآن کے اس حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے کہ:

یا ایها الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأٍ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجهالة فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین (حجرات ۶)

اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو پھر اپنے کئے پر تم کو پچھتانا ہو

۲۔ پروفیسر موصوف نے جو کچھ کیا تھا وہ صرف ایک اخباری مضمون کی اشاعت تھی۔ مگر اس کے جواب میں جو کچھ کیا گیا وہ مار پیٹ، ہنگامہ اور توڑ پھوڑ تھا۔ یہ بھی قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی تھی کہ:

والذین اذا اصابهم البغی هم ینتصرون و جزاء سیئة سیئة مثلها (شوری ۴۰)

اور وہ لوگ کہ جب ان پر سرکشی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی

۳۔ پروفیسر موصوف کا انٹرویو یونیورسٹی کے نظم ونسق کے بارے میں تھا۔ اس اعتبار سے یہ ایک عام تعلیمی بات تھی مگر اس کو غلط طور پر اسلام اور کفر کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ یہ اپنی دنیوی سیاست کے لئے دین کا نعرہ استعمال کرنا تھا۔ اس اعتبار سے یہ قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی تھی جس میں کہا گیا ہے:

ولا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا (بقرہ ۴۱)

اور میری آیتوں پر تھوڑی پونجی نہ خریدو

۴۔ پروفیسر موصوف نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ یونیورسٹی میں انتظام اور تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ تھا کہ خاموش تعمیری جدوجہد کے ذریعہ انتظام اور تعلیم کے معیار کو بلند کر دیا جاتا۔ یہ مذکورہ بیان کی نہایت کامیاب تردید ہوتی۔ اس کے برعکس شور وغل اور ہنگامہ بازی شروع کر دی گئی۔ یہ قرآن کے الفاظ میں ایسے کام کا کریڈٹ لینا تھا جس کو آدمی نے کیا نہیں۔ یہ حضرات اپنے آپ کو یونیورسٹی کے خادم کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے۔ حالانکہ یونیورسٹی کی جو اصل خدمت تھی اس کو انھوں نے انجام ہی نہیں دیا۔ ایسے لوگوں کو قرآن کے اس انتباہ سے ڈرنا چاہئے:

لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنهم بمفازة من العذاب ولهم عذاب الیم (آل عمران ۱۸۸)

جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو تو ان کو تم عذاب سے بچاؤ میں نہ سمجھو اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

طبیعیات سے مابعد الطبیعیات کی تصدیق

لندن سے ایک انسائیکلوپیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے "قاموس جہالت" اس میں ساٹھ مشہور سائنسداں مختلف علمی شعبوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان کن چیزوں کے بارے میں ابھی تک لاعلم ہے۔ یہاں ان میں سے دس مختلف سائنس دانوں کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی شعبوں کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے شعبہ کی واحد سب سے بڑی نامعلوم حقیقت کیا ہے۔

۱۔ کائنات اتنی یکساں کیوں

آئن رکسبرگ، پروفیسر تطبیقی ریاضیات، کوئن میری کالج، لندن: کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کیے گئے ہیں، وہ حکمی اعداد پر مشتمل ہیں جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے حکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لئے ان اعداد میں وہی متناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔

۲۔ کیا کوئی زِڈ ذرہ ہے

عبد السلام، پروفیسر نظری طبیعیات، امپیریل کالج، لندن: اگلے دس برسوں میں ہمیں یا تو زڈ ذرہ کا وجود تسلیم کرنا ہے یا یہ ثابت کرنا ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ اگر اس کا وجود ثابت ہو گیا جیسا کہ موجودہ نظریہ کی پیشین گوئی ہے تو اس کے بعد عالم فطرت کی چار طاقتیں جن کا ہمیں علم ہے ان میں سے دو طاقتوں کا ایک ہونا ثابت ہو جائے گا۔ (یہ چار طاقتیں یہ ہیں: کشش، برقی مقناطیسیت، طاقت ور نیوکلیر فورس جو کہ ایٹم کے نیوکلیس کو آپس میں باندھے رہتی ہے، اور کمزور نیوکلیر فورس جو ریڈیائی لہروں سے متعلق ہے) پروفیسر عبد السلام اور دوسرے سائنس دانوں نے حال میں کمزور نیوکلیر فورس اور برقی مقناطیسیت کو ایک ثابت کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی ہے۔ زڈ ذرہ کی دریافت سے قوی تجرباتی تائید حاصل ہو گی۔

۳۔ ڈی این اے سے پہلے کیا تھا

ڈاکٹر گراہم کیرنس اسمتھ، لکچرر کیمسٹری، گلاسگو یونیورسٹی: ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک نیا

جنیٹک مادہ دریافت کریں جوڈی این اے سے بالکل مختلف ہو۔ (ڈی این اے کا دہرا مرغولہ نما ڈھانچہ کیمبرج میں ۱۹۵۳ء میں فرانسس کریک اور جیمس واٹسن نے دریافت کیا تھا) مجھے یقین نہیں کہ ڈی این اے ابتدائی زمین پر بن سکتا تھا۔ ضروری ہے کہ زندگی کسی اور چیز سے شروع ہوئی ہو اور ڈی این اے کا ارتقا بعد کو ہوا ہو۔

۴۔ جین کس طرح متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں

سرجان کینڈریو، چیرمین یوروپین مالے کیولر بیالوجی آرگنائزیشن، ہائڈلبرگ: جین کس طرح بیکٹیریا میں متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں، ان کی بابت ہم کسی قدر جانتے ہیں۔ مگر اعلیٰ حیوانات میں یہ واقعہ کیونکر ہوتا ہے، اس کی بابت ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ (جین کے متحرک اور غیر متحرک ہونے ہی کی وجہ سے ایسا ہے کہ ایک جسم کے سل، جو سب کے سب ایک قسم کے جین پر مشتمل ہوتے ہیں، وہ مختلف قسم کے عمل کر پاتے ہیں اور نسوں، جلد وغیرہ کے اجزائے ترکیبی بن جاتے ہیں)

۵۔ ہمارے اندر محفوظ نظام کیوں

جسم کا مانعی نظام ہم کو چھوت سے بچاتا ہے۔ یہی ہمارے اندر الرجی کا سبب ہے، اور اعضاء کی پیوند کاری کو اس قدر مشکل بنا دیتا ہے۔ مگر اڈنبرا یونیورسٹی کے ڈاکٹر میکلم کے نزدیک "سب سے زیادہ دلچسپ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ مانعی نظام کیسے کام کرتا ہے، بلکہ یہ کہ خود اس کا وجود ہی کیوں ہے۔ بے ریڑھ کے جانور اس کے بغیر بھی اچھی طرح گزر کر لیتے ہیں۔ مگر ریڑھ دار حیوانات میں یہ نظام ناقابل یقین حد تک پیچیدگی کے ساتھ شامل ہے۔ پچھلے دس سالوں سے اس خیال کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے کہ اس نظام کی ضرورت اس لئے تھی کہ خلیہ کی سطح میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں جو سرطان کا سبب بن سکتی ہیں، ان کا پتہ لگایا جا سکے، مگر بہت سی حالیہ دریافتیں اس کی تائید کرتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔

۶۔ ارتقار کی پیمائش ہم کیسے کریں

جان مینرڈ اسمتھ، پروفیسر حیاتیات، سیسکس یونیورسٹی کا خیال ہے کہ ارتقار کا نظریہ ایک ناقابل حل اندرونی مسئلہ سے دوچار ہے۔ نظریہ ارتقار کے تین حقیقی اجزار ہیں:

تغیر (جین میں تبدیلی کا واقع ہونا)

انتخاب (فرق کا باقی رہنا یا مختلف اقسام کی زرخیزی

نقل مکانی

یہ نظریہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک، اکثر حالات میں ناقابلِ پیمائش حد تک نچلی سطح پر، ارتقار کے عمل پر گہرے اثرات ڈال سکتا ہے۔ اس طرح ہم تین طریقوں سے واقف ہیں جن کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ وہ ارتقار کے عمل کا تعین کرتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس ایک ریاضیاتی نظریہ ہے جو ہم کو بتاتا ہے کہ یہ تینوں طریقے ایسی سطحوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں جن کی بالواسطہ پیمائش کی ہم امید نہیں رکھتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے پاس برقی مقناطیسیت کا ایک نظریہ تو ہو مگر ہمارے پاس نہ تو برقی لہروں کو ناپنے کا کوئی ذریعہ ہو اور نہ مقناطیسی زور کو ناپنے کا۔

۷۔ نظام عصبی کس طرح بنتا ہے

فرانسس کریک، سالک انسٹی ٹیوٹ، کیلی فورنیا: حیاتیاتی ترقیات میں شاید سب سے بڑا علمی چیلنج یہ سوال ہے کہ ایک جاندار میں عصبی نظام کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ بہت سال پہلے راجر اسپری نے تجربہ کرکے دکھایا تھا کہ اگر ایک دریائی چھپکلی کی آنکھ اس طرح نکالی جائے کہ اس کی نظر کی نس آنکھ سے دماغ تک ٹوٹ جائے۔ اس کے بعد اگر اس کی آنکھ کو دوبارہ الٹ کر بھی لگا دیا جائے تو نظر کی نس آنکھ کے پردے سے دوبارہ شروع ہو کر دماغ کی طرف بڑھے گی اور دوبارہ اس سے جڑ جائے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد جانور اس آنکھ سے دوبارہ دیکھ سکتا تھا۔ مگر ہمیشہ الٹی شکل میں (کیونکہ آنکھ الٹی لگی ہوئی تھی) دوسرے لفظوں میں یہ کہ نیا تعلق بالکل درست تھا۔ بجز اس کے کہ آنکھ کو یہ پتہ نہ تھا کہ وہ الٹی لگی ہوئی ہے۔ یہ نتائج بتا رہے ہیں کہ اعصاب کے ایک نظام کو اعصاب کے دوسرے نظام سے ٹھیک ٹھیک مربوط کرنے کے لئے بہت ہی درست اور پیچیدہ طریقے کارفرما ہوتے ہیں۔ مگر یہ طریقِ عمل کیا ہے، اس کو ہم متعین طور پر نہیں جانتے۔ (دوسرے لفظوں میں خود یہ واقعہ کہ آنکھ الٹی لگی تھی، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ رابطے کس قدر متعین ہوتے ہیں)

۸۔ کوانٹم نظریہ کیا کشش کے نظریہ پر بھی چسپاں ہوتا ہے

سر ہرمن بونڈی، چیف سائنٹسٹ، شعبۂ انرجی: اگر ہم آئن سٹائن کے مقبول عام نظریۂ کشش کو مانیں تو کسی مقناطیسی میدان کے مرکز میں یکایک تبدیلی (مثلاً دو ستاروں میں جو ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے ہوں) سے ایسا ہونا چاہئے کہ کشش کی لہریں روشنی کی سی رفتار سے پیدا ہوں۔ ریڈی ایشن کی دوسری تمام صورتیں "کوانٹم" کے مطابق ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلسل نہیں ہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی مقداروں کی شکل میں غیر مسلسل طور پر آتی ہیں۔ یہ بات مشکل قابلِ فہم ہے کہ کشش کی لہریں مقداروں کی شکل میں نہیں ہوتیں۔ مگر ابھی تک کوئی اس بات کو ثابت نہیں کر سکا ہے، حالاں کہ بہت سے لوگ اس کی کوشش کر چکے ہیں۔

۹۔ دماغ کے مختلف حصے کس طرح رابطہ قائم کرتے ہیں

پروفیسر ہوریس بارلو، کیمبرج: ہم تقریباً مکمل طور پر اس بات سے بے خبر ہیں کہ دماغ کے مختلف حصے کیونکر ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُس وقت دماغ کے سننے والے حصہ میں اور بقیہ حصوں میں کس قسم کا ارتباط قائم ہوتا ہے جب کہ ہم کسی مانوس آواز کو پہچانتے ہیں۔ تم بول کو مثال میں پیش کرسکتے ہو۔ وہ صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ مگر وہ ایک بچہ کی توتلاہٹ سے کہیں زیادہ بامعنی ہوتی ہے جو خود بھی صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ دماغ کے اندر عصبی حرکات صوتی لہروں کے مساوی ہوتی ہیں۔ مگر ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کس طرح بامعنی ہو جاتی ہیں۔

۱۰۔ انسان کب سے زمین پر ہے

ڈاکٹر ڈونالڈ جانسن، میوزیم آف نیچرل ہسٹری، کلیولینڈ، اوہائو: یورپ افریقہ اور ایشیا میں جو متحجرات (فاسل) برآمد ہوئے ہیں، وہ انسان کی ابتدا کو اور زیادہ پیچھے کی طرف لے جارہے ہیں۔ بہرحال یہ بات دن بدن نمایاں ہوتی جارہی ہے کہ ارتقار کا معاملہ (سابقہ تصور کے خلاف) کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، وہ مدت جس کا تعین ایک مسئلہ ہے، وہ تین ملین سے لے کر دس ملین سال پیچھے تک ہے۔ انسان کے امکانی آباواجداد میں بظاہر بہت زیادہ فرق رہا ہے۔ اور ہم کو نہیں معلوم کہ ان کے درمیان باہمی رشتہ کیا تھا (اس کی وجہ جزئی طور پر ڈاکٹر جانسن کی حبش میں دریافتیں ہیں۔ نیز اس سے بھی زیادہ قدیم متحجرات پاکستان میں ملے ہیں)

تبصرہ

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی توجیہ خالق کو مانے بغیر نہیں ہوسکتی۔ سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات میں عددی تناسب ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق میں ایک ریاضیاتی ذہن کام کر رہا ہے۔ انسان کی بناوٹ میں اتنی حکمتیں کارفرما ہیں کہ کوئی بھی طبیعیاتی توجیہ اس کی تشریح کے لئے کافی نہیں ہوسکتی۔ ایک جان دار کی آنکھ نکال کر اس کو دوبارہ الٹ کر لگا دیا جائے تو وہ جان دار اب بھی دیکھے گا مگر اس کو ہر چیز الٹی دکھائی دے گی۔ جسم کے مختلف اجزار جو انتہائی صحت کے ساتھ کام کرتے ہیں وہ ایک بے حد نازک ترکیب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آواز سائنسی اعتبار سے کچھ لہروں کا نام ہے مگر یہ لہریں انسان کے دماغ میں داخل ہو کر بامعنی کلام کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس قسم کے بے شمار عجائب ہماری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ یقینی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دنیا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ظہور میں آنے والا واقعہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک اعلیٰ ذہن ہے جو زبردست طاقت کے ساتھ اس کو کنٹرول کر رہا ہے۔ کائنات کے نظم اور معنویت کی اس کے سوا کوئی اور توجیہ نہیں کی جاسکتی ——— دنیا کے بارے میں انسان کی لاعلمی ایک بہت بڑے علم کا پتہ دے رہی ہے۔ یہ علم کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے جو اس کو حد درجہ حکمت کے ساتھ چلا رہا ہے۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا


روزہ داروں کے لیے بھی
طاقت کا ذریعہ
سنکارا
روزوں میں اپنی صحت کا خاص خیال رکھیے!
سنکارا روزہ داروں کے لیے قوت و توانائی کا خاص وسیلہ ہے۔
سحری و افطار کے وقت اس کی ایک ایک خوراک لینے سے
تھکاوٹ اور کمزوری دور ہو کر چستی و طاقت بحال ہو جاتی ہے۔
سنکارا
وٹامنوں اور قدرتی اجزا سے بھرپور
ہر موسم میں گھر بھر کے لیے مثالی ٹانک
ہمدرد
HWL-6905

REGD. R. N. NO. 28822/76 ISSUE NO. 57

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست

مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

ستمبر ۱۹۸۱

شمارہ ۵۸

عیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ٦ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ کو کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو خریداری کے کام کو صرف اس لئے چھوڑ دے کہ چیزوں کی
ں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں۔ مگر بازار میں خریداروں کی بھیڑ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

تاہم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے صرف اس لئے الرسالہ کی خریداری بند کر دی ہے کہ اس کی قیمت میں
نی کے سبب سے ایک روپیہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ الرسالہ کا خریدنا کوئی بازار کا سودا خریدنے کا معاملہ نہیں ہے۔
وتِ حق کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے۔ اسلام کی ایک تاریخ وجود میں آرہی ہے۔ اب جو شخص چاہے
تاریخ کا جزء بن جائے۔ اور جو شخص اس کا جزء بننے کے لئے تیار نہ ہو وہ خود سوچ لے کہ جس مہنگائی کو وہ
دنیا کے معاملات میں پوری طرح گوارا کئے ہوئے تھا اسی مہنگائی کو آخرت کے معاملہ میں گوارا نہ کرنے کے لئے
کے پاس خدا کے یہاں کیا جواب ہو گا۔

ر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

تضاد ختم ہوگا

میں آبادی سے دور ایک پہاڑ کے سامنے کھڑا تھا۔ سرسبز درخت میرے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ چڑیوں کی بولیاں کانوں میں آرہی تھیں۔ مختلف قسم کے جانور چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اوپر عجیب تاثر ہوا۔ کیسا عظیم اور کیسا کامل ہوگا وہ خدا جس نے اتنی بڑی دنیا بنائی اور پھر اس کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے بتائے ہوئے نقشہ کی انتہائی پابند رہتے ہوئے حرکت کرے۔

کتنی حسین اور کتنی معصوم ہے یہ دنیا۔ یہاں چڑیاں وہی آوازیں نکالتی ہیں جو ان کے خالق نے انھیں سکھایا ہے۔ یہاں بلّی اور بکری بالکل اسی طرح اپنا اپنا رزق کھاتے ہیں جو پیدائشی طور پر ان کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہاں درخت عین اسی منصوبہ کے مطابق اُگتے اور بڑھتے ہیں جو ازل سے ان کے مالک نے ان کے لئے متعین کر دیا ہے۔ یہاں دریا ٹھیک اسی قانون کے مطابق رواں ہوتا ہے جو اس کے لئے ابدی طور پر مقدر ہے۔ خدا کی کائنات انتہائی کامل مجموعہ ہے اور یہاں کی ہر چیز ادنیٰ انحراف کے بغیر عین اسی طرح عمل کرتی ہے جس کا حکم اس کے خدا نے اسے دے رکھا ہے۔

مگر انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے منھ سے ایسی آوازیں نکالتا ہے جس کی اجازت اس کے خدا نے اسے نہیں دی۔ وہ ایسی چیزوں کو اپنا رزق بناتا ہے جس سے اس کے مالک نے اس کو روک رکھا ہے۔ وہ اپنے سفر حیات کے لئے ایسے راستے اختیار کرتا ہے جہاں کاتب ازل نے ہمیشگی طور پر اس کے لئے لکھ دیا ہے کہ "یہاں سے گزرنا منع ہے"۔ انسان خدا کی کائنات کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ مگر وہ عظیم کائنات کے مجموعی نظام سے بغاوت کرتا ہے، وہ خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرتا ہے۔

یہ خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کو دخل دینا ہے۔ یہ ایک ہم آہنگ مجموعہ میں بے آہنگی کا جوڑ لگانا ہے۔ یہ ایک حسین تصویر میں بدصورتی کا دھبہ ڈالنا ہے۔ یہ ایک کامل دنیا میں ناقص چیز کا اضافہ کرنا ہے۔ یہ فرشتوں کی سرگرمیوں کے ماحول میں شیطان کو سرگرم ہونے کا موقع دینا ہے۔

خدا کی قدرت اور اس کے حسن ذوق کا ثبوت جو عظیم تر کائنات میں ہر لمحہ نظر آتا ہے وہ اس گمان کی تردید کرتا ہے کہ یہ صورت حال اسی طرح باقی رہے۔ خدا کی قدرت یقیناً اس ظلم کی اجازت نہیں دے سکتی۔ خدا کا حسن ذوق ہرگز اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ضرور ہے کہ وہ دن آئے جب کائنات کا یہ تضاد ختم ہو، خدا کی مرضی انسانی دنیا میں بھی اسی طرح پوری ہونے لگے جس طرح وہ بقیہ دنیا میں پوری ہو رہی ہے۔

عیدالفطر

عیدالفطر کے لفظی معنی ہیں افطار کی عید۔ یعنی روزہ ختم کرنے اور کھانے پینے کی عید۔ یہ اسلام کا سالانہ تیوہار ہے جو رمضان کے مہینے کے فوراً بعد شوال کی پہلی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ عیدالفطر ایک سادہ تیوہار ہے۔ اس میں کوئی چیز بھی بطور فرض یا لازم کے نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ سنت یا مستحب ہے۔ یہ تو لازم کیا گیا ہے کہ عیدالفطر کے دن کوئی شخص روزہ نہ رکھے مگر یہ لازم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ فلاں فلاں عمل ضرور کرے۔ گویا کہ عیدالفطر مکمل آزادی کا دن ہے۔

عیدالفطر کے دن مسلمان صبح اٹھ کر نہاتے دھوتے ہیں۔ نیا کپڑا پہنتے ہیں۔ خوشبو لگاتے ہیں۔ اپنی پسند کی میٹھی چیز (مثلاً سوئیاں) کھاتے ہیں۔ اور پھر اجتماعی عبادت کے لئے مسجد کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ وہاں وہ دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ اس نماز میں اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کا لفظ عام نمازوں سے کچھ زیادہ بار دہرایا جاتا ہے۔ نماز کے بعد سب مل کر خدا سے دعائیں کرتے ہیں۔ مسجد جاتے ہوئے اور مسجد سے واپس ہوتے ہوئے راستہ میں یہ کہتے جاتے ہیں: اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد (اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے اور اسی کے لئے ہے ساری تعریف) یہ بات پسندیدہ ہے کہ بستی کے سارے مسلمان ایک مقام پر اکٹھا ہو کر نماز ادا کریں، مرد، عورت اور بچے سب وہاں حاضر ہوں اور گھر سے مسجد آنے اور جانے کا راستہ بدل دیں۔ یہ سب اس لئے ہے تاکہ خداپرست گروہ کی شوکت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ ہو۔

نماز کے بعد آپس میں ملنے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دینے کا پروگرام ہوتا ہے۔ لوگ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے گھر جاتے ہیں۔ چھوٹے اپنے بڑوں کو سلام کرتے ہیں اور بڑے اپنے چھوٹوں کو تحفے اور عیدی پیش کرتے ہیں۔ اس طرح سارا دن خوشیاں منانے اور کھانے پینے میں گزر جاتا ہے۔

یہ عیدالفطر عام معنوں میں محض ایک قومی تیوہار نہیں ہے، اس کی بہت خاص معنویت ہے اور زندگی کے اسلامی تصور سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق عید اس دن کی علامت یا تمثیل ہے جب کہ ساری بڑائی صرف ایک خدا کے لئے ہوگی۔ ہر قسم کی شان و شوکت صرف ان لوگوں کو ملے گی جو موجودہ امتحان کی دنیا میں خدا کے وفادار بن کر رہے تھے۔ جب خداپرستوں کے لئے مشکلوں اور مصیبتوں کے دن ختم ہو جائیں گے اور ان کا خدا ان کو خوشیوں اور راحتوں کی ابدی دنیا میں داخل کر دے گا جہاں سے کبھی نکلنا نہ ہوگا۔

اسلام کے نزدیک آدمی کی زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ ایک موت سے پہلے اور دوسرا موت کے بعد۔ موت سے پہلے کا مرحلہ عمل کرنے کا مرحلہ ہے اور موت کے بعد کا مرحلہ اپنے عمل کا انجام پانے کا مرحلہ۔ موت سے پہلے پابند اور ذمہ دار زندگی گزارنا ہے اور موت کے بعد اس کے انعام کے طور پر ایسی زندگی ملے گی جس میں آدمی ہر طرح آزاد اور خوش حال ہوگا ــــــــ روزہ کا مہینہ موت سے پہلے کی زندگی کی علامت ہے اور عید الفطر کا دن موت کے بعد کی زندگی کی علامت۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی کو جو کچھ کرنا ہے وہ یہ کہ وہ خدا کی مرضی کا پابند ہو کر زندگی گزارے۔ وہ جو کچھ کرے جائز دائرہ میں کرے، خدا کے منع کئے ہوئے دائرہ میں داخل نہ ہو۔ مثلاً وہ سچ بولے اور جھوٹ نہ بولے۔ وہ محنت کی کمائی کھائے اور لوٹ کھسوٹ کے طریقوں سے بچے۔ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف برتے اور بے انصافی کا طریقہ کبھی اختیار نہ کرے۔ اس کے دل میں لوگوں کے لئے محبت اور خیر خواہی ہو نہ کہ بغض اور حسد۔

روزہ اسی پابند زندگی کی مشق ہے، وہ آدمی کو یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا میں اس کو ذمہ دارانہ زندگی گزارنا ہے نہ کہ غیر ذمہ دارانہ زندگی۔ روزہ میں آدمی خدا کے حکم سے کھانا پانی چھوڑ دیتا ہے۔ اپنے معمولات کو بدل دیتا ہے، اپنی خواہشوں پر روک لگاتا ہے۔ اپنی مرضی پر چلنے کے بجائے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کا پابند بناتا ہے۔ اس طرح مسلسل ایک ماہ تک وہ اپنے آپ کو ایک پُرمشقت کورس سے گزارتا ہے۔ یہ روزہ کی صورت میں اس پابند زندگی کا ایک علامتی سبق ہے جو آدمی کو موجودہ دنیا میں اپنی زندگی میں نباہنا ہے۔ رمضان میں ایک مہینہ تک اس قسم کی پابند زندگی گزارنے کے بعد یکم شوال کو عید الفطر کا دن آتا ہے جب کہ ساری پابندیاں ختم کر دی جاتی ہیں اور آدمی آزاد ہوتا ہے کہ وہ خوشیوں اور راحتوں کا دن منائے۔ روزہ کے مہینہ میں اگر اس کو موت سے پہلے کی زندگی کا سبق دیا گیا تھا تو عید الفطر کے دن اس کو موت کے بعد کی زندگی کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ روزہ مسلمان کی دنیوی زندگی کی تمثیل ہے اور عید الفطر مسلمان کی آخرت کی زندگی کی تمثیل۔

روزہ کا مہینہ اور اس کے فوراً بعد عید الفطر آدمی کو یاد دلاتے ہیں کہ اگر اس نے موجودہ دنیا میں خدا کے حکموں کے مطابق پابند زندگی گزاری تو اگلی دنیا میں اس کو خوشی اور آزادی کی پر بہار جنتوں میں داخل کیا جائے گا۔ اس کے بعد نہ اس پر کوئی پابندی ہوگی اور نہ کسی قسم کی تکلیف۔

نوٹ: یہ تقریر ۳ اگست ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

کائنات مشین نہیں

موجودہ زمانہ میں مشینی انسان بنائے گئے ہیں جن کو عام طور پر روبوٹ (Robot) کہا جاتا ہے۔ روبوٹ بظاہر بالکل آدمی کی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ چلتا ہے، وہ بولتا ہے، وہ کام کرتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ ایک مشین ہوتا ہے نہ کہ کوئی شعور۔ وہ اسی طرح میکانکی انداز میں عمل کرتا ہے جیسے انسان کی بنائی ہوئی دوسری تمام مشینیں۔

لندن کے ایک دفتر میں ایک روبوٹ رکھا گیا تاکہ وہ چپراسی (Office Boy) کے طور پر کام کرسکے۔ یہ روبوٹ جب تیار ہوکر دفتر میں آیا تو دفتر کی خاتون سکریٹری مس جینی سیف (Jennie Seff) نے اس کو آزمائشی حرکت (Trial Run) دینا چاہا۔ وہ روبوٹ کی بیٹری جانچ رہی تھیں کہ روبوٹ حرکت میں آگیا۔ وہ سکریٹری کے پیچھے چلنے لگا۔ اب یہ صورت ہوئی کہ خاتون سکریٹری آگے آگے بھاگ رہی ہیں اور آہنی مشین ان کو پیچھے سے دوڑا رہی ہے۔ روبوٹ اس طرح چل رہا تھا گویا اس نے کنٹرول قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اس بھاگ دوڑ میں ایک نیا ٹائپ رائٹر ٹکرا کر زمین پر گر پڑا اور ٹوٹ گیا۔ بالآخر بڑی مشکل سے روبوٹ کو قابو میں لایا گیا (ہندستان ٹائمس ۳۰ جون ۱۹۸۱)

موجودہ زمانہ میں جو لوگ خدا کو نہیں مانتے ان کا کہنا ہے کہ کائنات اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بہت بڑی مشین ہے۔ وہ بس اسی طرح چل رہی ہے جس طرح کوئی "روبوٹ" میکانکی طور پر چلتا ہے۔ مگر کائنات کا کھرب ہا کھرب سال سے انتہائی منظم طور پر یکساں حالت میں چلنا اس مفروضہ کی تردید کررہا ہے۔ اگر کائنات محض ایک میکانکی مشین ہوتی جیسے روبوٹ، تو یقیناً اس میں بار بار اسی قسم کے ٹکراؤ ہوتے جیسا کہ لندن کے آفس میں مذکورہ بالا واقعہ کی صورت میں ہوا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت کرسکتی۔ ہر ایک اپنے خاص دائرہ میں گردش کرتے ہیں (یٰس ۴۰ - ۳۸) قرآن کا یہ بیان موجودہ زمانہ میں ایک ثابت شدہ انسانی مشاہدہ بن چکا ہے اور یہی واقعہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ یہاں ایک باشعور ہستی ہے جو کائنات کو کنٹرول کررہی ہے۔ اس کے بغیر کائنات کے اندر یہ تنظیم اور یہ باقاعدگی اتنی کامل صورت میں ممکن نہ ہوتی۔

دنیا کی خاطر عمل کرنے والے

لوگ خوش اخلاق ہیں۔ وہ ہدیے دیتے ہیں اور دعوتیں کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے کام آنے کے لیے دوڑتے ہیں۔ وہ دوسرے کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بناتے ہیں۔ وہ غمی کے موقع پر اظہار درد کے لئے پہنچتے ہیں اور خوشی کے موقع پر مبارک باد دینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ وہ اختلاف کے باوجود اختلاف کو بھول جاتے ہیں اور شکایت کے باوجود شکایت کو پی جاتے ہیں۔

لوگ خوش ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔

مگر لوگوں کی یہ خوش معاملگی کس کے ساتھ ہے۔ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن سے ان کا کوئی فائدہ وابستہ ہے۔ جن سے انھیں امید ہے کہ وہ وقت پر ان کے کام آسکتے ہیں۔ جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ جن کے زور قوت کا رعب ان کے اوپر چھایا ہوا ہے۔ جن سے کٹ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے کٹ جائیں گے، جن سے جڑ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے جڑے رہیں گے۔

لوگوں کی یہ خوش اخلاقی تمام تر مفاد پرستانہ خوش اخلاقی ہے۔ اس کا راز اس وقت معلوم ہو جاتا ہے جب کہ معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے کے لئے مذکورہ محرکات میں سے کوئی محرک موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر اچانک وہی آدمی بالکل بد اخلاق بن جاتا ہے جو اس سے پہلے نہایت خوش اخلاق دکھائی دے رہا تھا۔

اب اس کو یہ شوق نہیں ہوتا کہ وہ سلام میں پہل کرے۔ اب وہ اپنی دعوتوں میں اس کو بلانا بھول جاتا ہے۔ اب وہ اس کی مشکلوں میں کام آنے کے لئے نہیں دوڑتا۔ اب وہ معمولی شکایت پر بگڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب اس کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کے جذبات کی رعایت کرے۔ دنیوی فائدہ کے لئے اخلاق دکھانے والا آدمی اس وقت بے اخلاق ہو جاتا ہے جب کہ اس میں کوئی دنیوی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔

لوگوں کو جاننا چاہئے کہ اس قسم کی خوش اخلاقی اور انسانیت کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ وہ کسی آدمی کو جہنم کی آگ سے بچانے والی نہیں خواہ وہ کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں آدمی کے اندر پائی جارہی ہو۔ خدا کے ہاں جو کچھ بدلہ ہے صرف اس عمل کا ہے جو خالص خدا کی رضا اور آخرت کی نجات کے لئے کیا گیا ہو۔ اور جو عمل دنیا میں اپنا معاملہ درست رکھنے کے لئے کیا جائے اس کا خدا کے یہاں کوئی بدلہ نہیں۔ ایسے عمل کا پشتارہ لے کر خدا کے یہاں پہنچنے والوں سے خدا کہہ دے گا ——— تم نے جو کچھ کیا وہ اپنی دنیا کے لئے کیا۔ تم دنیا میں اس کا بدلہ پا چکے۔ اب آخرت میں تمھارے لئے اس کے بدلے میں کچھ نہیں۔

کائنات کا دسترخوان

قرآن میں ہے کہ اللہ آسمان وزمین کا نور ہے (نور) اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا تمام کی تمام خدائی صفات کا مظہر ہے۔ حساس قلب کو یہاں کی ہر چیز میں خدا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ رزق خداوندی کا دسترخوان ہے۔

خدا پر ایمان اگر کسی آدمی کو وہ حساسیت دیدے جو خدا پر سچے ایمان سے پیدا ہوتی ہے تو کائنات میں فی الواقع اس کو ہر طرف خدا کا نور دکھائی دے گا۔ ہوا کے لطیف جھونکے جب اس کے جسم کو چھوئیں گے تو اس کو ایسا محسوس ہوگا کہ لمس خداوندی کا کوئی حصہ اسے مل رہا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں اس کو رحمتِ حق کا جوش ابلتا ہوا نظر آئے گا۔ چڑیوں کے چہچے جب اس کے کان میں رس گھولیں گے تو اس کے دل کے تاروں پر زمزمۂ خداوندی کے نغمے جاگ اٹھیں گے۔ پھولوں کی مہک جب اس کے مشام جان کو معطر کرے گی تو وہ اس کے لئے خدائی خوشبو میں نہانے کے ہم معنی بن جائے گی۔

ساری کائنات مومن کے لئے رزق روحانی کا دسترخوان ہے، ویسے ہی جیسے جنت اس کے لئے رزق مادی کا دسترخوان ہوگی۔ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر انسان عبرت حاصل کرے، ان کے ذریعہ وہ ان ربانی کیفیات کو پائے جو ان کے اندر ان لوگوں کے لئے رکھ دی گئی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

ڈھاک ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے اوپر بے حد حسین پھول اُگتے ہیں۔ موسم خزاں کے پت جھڑ کے بعد اس کا درخت بظاہر ایک سوکھی لکڑی کی مانند، اس سے بھی زیادہ ایک سوکھی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاموش انقلاب آتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر نہایت خوش رنگ پھول اس کی شاخوں میں کھل اٹھتے ہیں۔ سوکھی لکڑی کا ایک ڈھانچہ لطیف اور رنگین پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک محروم اور بے قیمت وجود کے لئے خدا نے خصوصی طور پر اپنی خوب صورت چھتری بھیج دی ہے۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا اس کو دیکھ کر کہے ———— "خدایا! میں بھی ایک ڈھاک ہوں، تو چاہے تو میرے اوپر حسین پھول کھلا دے۔ میں ایک ٹھنٹھ ہوں، تو چاہے تو مجھ کو سرسبز و شاداب کر دے۔ میں ایک بے معنی وجود ہوں، تو چاہے تو میری زندگی کو معنویت سے بھر دے۔ میں جہنم کے کنارے کھڑا ہوں تو چاہے تو مجھ کو جنت میں داخل کر دے۔

یہ یقین کی طاقت تھی

قریش کے لوگوں میں ایک شخص عمرو بن عبدوُد نام کا تھا۔ وہ غیر معمولی ڈیل ڈول کا پہلوان آدمی تھا۔ بدر کی لڑائی میں وہ قریش کی طرف سے شریک ہوا اور زخمی ہوکر بھاگا۔ اسی زخم کی وجہ سے وہ اُحد کی لڑائی میں شریک نہ ہوسکا۔ غزوۂ خندق کا وقت آیا تو وہ بڑی شان کے ساتھ نکلا۔ ایک مقام پر جہاں خندق کی چوڑائی نسبتاً کم تھی وہ گھوڑا کدا کر مسلمانوں کی طرف آگیا اور آواز دی کہ کون مجھ سے جنگ کرتا ہے۔ علی بن ابی طالبؓ اٹھے اور کہا کہ اے خدا کے رسول مجھے اس سے لڑنے کی اجازت دیجئے۔ آپ نے کہا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے، بیٹھو (انہ عمرو اجلس) وہ بیٹھ گئے۔ عمرو بن عبدود نے دوبارہ آواز دی کہ تمہاری وہ جنت کہاں ہے جس کے متعلق تمہارا گمان ہے کہ تم میں سے جو شخص مارا جائے گا وہ اس میں داخل ہوگا۔ حضرت علی دوبارہ اٹھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ان کو بٹھا دیا۔ اس نے تیسری بار آواز دی۔ حضرت علی پھر اٹھے۔ رسول اللہ نے پھر فرمایا کہ یہ عمرو ہے (انہ عمرو) حضرت علی نے کہا: خواہ وہ عمرو ہی کیوں نہ ہو (وان کان عمروا) اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی۔

حضرت علی نکلے تو دیو پیکر عمرو بن عبدود کے مقابلہ میں وہ بچہ دکھائی دیتے تھے۔ عمرو بن عبدود نے کہا: اے میرے بھتیجے، مجھ کو ناپسند ہے کہ میں تمہارا خون بہاؤں۔ حضرت علی نے کہا: مگر خدا کی قسم میں تمہارا خون بہانے کو برا نہیں سمجھتا۔ یہ سن کر عمرو بن عبدود غصہ میں آگیا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور حضرت علی پر اتنی زور سے تلوار ماری کہ وہ ان کی ڈھال کو توڑتی ہوئی ان کے سر تک پہنچ گئی۔ مگر زخم کھا کر حضرت علی کی شجاعت میں اور اضافہ ہوگیا۔ حضرت علی نے انتہائی تیزی کے ساتھ جوابی وار کیا۔ حضرت علی کی تلوار عمرو بن عبدود کے کندھے پر پڑی اور اس کی گردن کی رگ کٹ گئی۔ وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ زمین پر گر پڑا اور اس کے گرنے سے غبار اڑا۔ اس کے بعد تکبیر کی آواز سنائی دی تو صحابہ نے جان لیا کہ حضرت علی نے عمرو بن عبدود کو قتل کر دیا ہے۔ اس موقع پر حضرت علی کی طرف ایک نظم منسوب ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:

اليوم يمنعني الفرار حفيظتي ومصمم في الرأس ليس بنابي

لا تحسبن الله خاذل دينه ونبيه يا معشر الاحزاب

میرے تحفظ (ایمانی) نے آج مجھ کو بھاگنے سے روک دیا اور ضرب (دشمن کے) سر سے چوکنے والی نہیں۔ اے مسلمانوں کی جماعت، تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ اپنے دین اور اپنے نبی کو رسوا کرے گا۔

مجھ کو زیادہ قیمت مل رہی ہے

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں قحط پڑا اور لوگ سخت پریشان ہو گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ نہ گھبراؤ۔ اللہ جلد ہی تمھارے لئے کشادگی کی صورت پیدا کر دے گا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ شام سے آیا، اس میں ایک ہزار اونٹ تھے اور سب کے سب گیہوں اور کھانے کی چیزوں سے لدے ہوئے تھے۔ یہ خبر مدینہ میں پھیلی تو شہر کے تاجر عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آئے۔ ان کے پاس ایک چادر تھی جس کو وہ اپنے کندھے پر اس طرح ڈالے ہوئے تھے کہ اس کا ایک سرا سامنے کی طرف لٹک رہا تھا اور دوسرا سرا پیچھے کی طرف۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم لوگ کیوں آئے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ تاجروں نے کہا: ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ گیہوں اور غذائی سامان آیا ہے۔ ہم ان کو خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے ہاتھ یہ غذائی سامان بیچ دیں تاکہ ہم اس کو مدینہ کے ضرورت مندوں تک پہنچا سکیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اندر آؤ اور گھر میں بیٹھ کر بات کرو۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ غذائی اشیاء کے ایک ہزار ڈھیر گھر کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔

اب بات چیت شروع ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میری شام کی خریداری پر تم مجھ کو کتنا زیادہ نفع دوگے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر بارہ درہم۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر چودہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا اچھا دس درہم پر پندرہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کون آپ کو اس سے زیادہ دے رہا ہے۔ جب کہ مدینہ کے جتنے تاجر ہیں سب یہاں جمع ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو ہر ایک درہم کے بدلے دس درہم مل رہا ہے۔ پھر کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی کتاب پاک میں فرمایا ہے کہ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے اس کا دس گنا بدلہ ہے (انعام ۱۶۰) تو اے مدینہ کے تاجرو، گواہ رہو کہ میں نے یہ تمام غذائی سامان اللہ کے لئے شہر کے ضرورت مندوں پر صدقہ کر دیا (العبقریات الاسلامیہ ۲ / ۵۷) خدا کے وعدوں پر یقین آدمی کے حوصلے کو اتنا بلند کر دیتا ہے کہ بڑی سے بڑی قربانی بھی اس کے لئے کوئی مشکل چیز نہیں رہتی۔

ایمانی غیرت

جنگ قادسیہ (۱۴ھ) کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کی فوج میں ایک شخص ابو محجن ثقفی تھے۔ وہ بہت بہادر تھے۔ مگر کبھی کبھی شراب پی لیا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کو کوڑے لگتے تھے۔ بالآخر حضرت سعد بن ابی وقاص نے ان کو ایک خیمہ میں قید کر دیا۔ ایک روز حضرت سعد زخمی تھے اور اپنے خیمہ کے پاس بلندی پر بیٹھ کر فوج کو ہدایات دے رہے تھے۔ اس دن ایرانی فوج کا زور بہت زیادہ تھا اور مسلمان ان کو پسپا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ ابو محجن ثقفی بیڑیاں پہنے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے دکھ کے عالم میں یہ شعر پڑھا:

کفی حزنا ان تلتقی الخیل بالقنا　　　واترک مشدوداً علیّ وثاقیا

غم گین ہونے کے لئے یہ کافی ہے سوار نیزوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوں اور مجھے بیڑیوں میں باندھ کر چھوڑ دیا جائے

ابو محجن ثقفی نے حضرت سعد کی بیوی کے پاس ایک باندی کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا کہ آج میری بیڑیاں کھول دو اور مجھ کو سعد کا گھوڑا اور ان کا ہتھیار دے دو۔ اگر میں زندہ رہا تو ابو محجن پہلا شخص ہوگا جو تمھاری طرف لوٹ کر آئے گا اور دوبارہ بیڑیاں پہن لے گا۔ حضرت سعد کی بیوی کو یہ پیغام ملا تو انھوں نے ابو محجن ثقفی کی بیڑیاں کھول دیں اور گھوڑا اور ہتھیار بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اب وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے نکلے اور مسلمانوں کے لشکر میں جا کر شامل ہو گئے۔ وہ اتنی بے جگری سے لڑے کہ جدھر گھستے دشمنوں کا صفایا کر دیتے۔ حضرت سعد دور سے ان کو دیکھتے اور تعجب کرتے کہ یہ سوار کون ہے۔

بالآخر مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ ابو محجن فوراً لوٹے اور گھوڑا اور ہتھیار واپس کر کے دوبارہ بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعد شام کو گھر میں آئے تو ان کی بیوی نے پوچھا کہ آج تمھاری لڑائی کیسی رہی۔ انھوں نے کہا کہ آج کی لڑائی بڑی سخت تھی۔ یہاں تک کہ اللہ نے ایک شخص کو چتکبرے گھوڑے پر سوار کر کے بھیج دیا۔ اگر میں نے ابو محجن کو زنجیروں میں باندھا نہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ ابو محجن کے حملے ہیں۔ بیوی نے کہا کہ خدا کی قسم وہ ابو محجن ہی تھے۔ اس کے بعد انھوں نے سارا قصہ بتایا۔ حضرت سعد نے ابو محجن کو بلایا اور ان کی زنجیریں کھول دیں اور کہا: خدا کی قسم اب میں شراب پینے پر تم کو سزا نہیں دوں گا۔ ابو محجن ثقفی نے کہا: میں بھی خدا کی قسم اب کبھی شراب نہ پیوں گا (وانا واللہ لا اشربها ابداً)

غیرت مند آدمی ایک معمولی واقعہ سے بھی تڑپ اٹھتا ہے۔ مگر جو شخص غیرت سے خالی ہو اس کی اصلاح کے لئے کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔

کھجور کی چپل پہننے والے

موجودہ افغانستان قدیم زمانہ میں سجستان کہا جاتا تھا۔ اس کا دارالسلطنت کابل تھا۔ یہاں ایک راجہ کی حکومت تھی۔ وہ بدھ مذہب کو مانتا تھا اور اس کا خاندانی لقب رُتبیل (زَندبیل) تھا۔ یہ علاقہ معاویہ کے زمانہ میں اسلامی خلافت میں شامل ہوا۔ رتبیل نے ابتداءً اسلامی فوجوں سے مقابلہ کیا۔ اس بعد اس نے دس لاکھ درہم سالانہ خراج پر معاہدہ کرکے اپنے لئے امان حاصل کرلی۔ رتبیل ایک مدت خراج دیتا رہا۔ اس کے بعد اس نے خراج دینا بند کردیا۔ اس کے علاقہ پر بار بار فوجیں بھیجی گئیں مگر مطیع نہ ہوا۔

اس سلسلہ میں تاریخوں میں جو واقعات آتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ یزید بن عبدالملک (م ۱۰۵ھ) کے زمانہ میں جب خلافت دمشق کے کچھ نمائندے اس کے پاس خراج طلب کرنے کے لئے تو اس نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے۔ ان کے پیٹ فاقہ کی طرح دبے ہوئے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ نشان پڑے رہتے تھے اور وہ کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے " راوی کا بیان ہے کہ یہ کہہ کر رتبیل نے خراج دینے سے انکار کردیا اور تقریباً چوتھائی صدی تک اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

صحابہ کے زمانہ کے سیدھے سادے معمولی لوگ رتبیل کی نظر میں اس سے زیادہ طاقتور تھے جتنا کہ میں کے زمانہ کے شان و شوکت والے لوگ۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی آدمی کی طاقت کا راز کے جسم پر دکھائی دینے والی ظاہری رونقیں نہیں ہیں بلکہ اس کی اندرونی صلاحیت ہے۔ یہ اندرونی صلاحیت کے لوگوں میں بہت زیادہ تھی اگرچہ ظاہری طور پر وہ معمولی حالت میں دکھائی دیتے تھے۔

طاقتور وہ ہے جس کی ضروریات مختصر ہوں۔ جس کی آرزوئیں محدود ہوں۔ جو لذت اور جاہ کا طالب جس کو تواضع میں تسکین ملتی ہو نہ کہ اپنے کو بڑا بنانے میں۔ ایسا آدمی نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے لئے صحیح فیصلہ کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ مصلحتوں کا خیال کبھی اس کا قدم نہیں روکتا۔ اپنے مقصد خاطر قربانی کی حد تک جانے میں اس کے لئے کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس جو لوگ مصنوعی چیزوں میں گھرے ہوئے ہوں وہ زندگی کی حقیقی معرفت سے محروم رہتے ہیں۔ وری تکلفات ان کے لئے ایسا بندھن بن جاتے ہیں کہ وہ نہ تو کسی بات کو صحیح رنگ میں دیکھ پاتے اور نہ اس میں اپنے کو واقعی طور پر شامل کرسکتے۔ وہ ذات کے لئے زیادہ اور مقصد کے لئے کم ہو کر رہ جاتے ہیں

ظالم کا دل ہل گیا

ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل نے اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اور عراق، ایران، ترکستان میں مسلم تہذیب وسلطنت کو زیروزبر کرڈالا۔ مگر اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو نرم کیا اور تقریباً پوری کی پوری قوم مسلمان ہوکر اسلام کی پاسبان بن گئی۔ اس زمانہ کے دعوتی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جارہے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور شکار کے لئے نکلا ہوا تھا۔ یہ شہزادہ تاتاریوں کی چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا جو ایران پر حکومت کررہی تھی۔ شیخ جمال الدین ایرانی چلتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ تاتاری اس زمانہ میں ایرانیوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ شہزادہ کے سپاہیوں نے شکارگاہ میں ایک ایرانی کی موجودگی کو برا فال سمجھا اور ان کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ اس گستاخ ایرانی کو شہزادہ کے پاس لے گئے۔ شہزادہ ان کو دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ غصہ کی حالت میں اس کی زبان سے نکلا: تم ایرانیوں سے تو ایک کتا اچھا ہے۔ شیخ جمال الدین تاتاری کے اس نفرت انگیز سوال کو سن کر سنجیدہ انداز میں بولے: اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے۔

تاتاری اگرچہ وحشی تھے مگر ان میں فطری مردانگی کا جوہر موجود تھا۔ وہ منافقت سے خالی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کا یہ جواب تغلق تیمور کے لئے سخت جھنجھوڑنے والا ثابت ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ جب میں شکار سے فارغ ہوجاؤں تو اس ایرانی کو میری خدمت میں حاضر کرو۔ شیخ جمال الدین جب حاضر کئے گئے تو وہ ان کو تنہائی میں لے گیا اور ان سے پوچھا کہ یہ دین کیا ہے۔ شیخ جمال الدین نے نڈر ہوکر اس کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ اس گفتگو نے تاتاری شہزادہ کا دل ہلادیا۔ بے دینی کی حالت میں مرنا اسے بڑا خطرناک معلوم ہونے لگا۔ وہ اس پر آمادہ ہوگیا کہ اسلام قبول کرلے۔ تاہم ابھی وہ ولی عہد تھا، بادشاہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت اگر میں اسلام قبول کرتا ہوں تو میں اپنی رعایا کو اسلام کے دین پر نہیں لاسکتا۔ اس نے شیخ جمال الدین سے کہا: اچھا اس وقت تم جاؤ۔ جب تم سنو کہ میری تاج پوشی ہوئی ہے اور میں تخت پر بیٹھ گیا ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا۔

شیخ جمال الدین اپنے گھر واپس آگئے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب کہ تغلق تیمور کی تخت نشینی کی خبر انھیں معلوم ہو۔ مگر یہ وقت ان کی زندگی میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے۔ اس وقت انھوں نے اپنے لڑکے شیخ رشید الدین کو بلایا اور تاتاری شہزادہ کا قصہ بتا کر کہا کہ دیکھو میں ایک مبارک گھڑی کا انتظار کررہا تھا۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آنا میری زندگی میں مقدر نہیں۔ اس لئے میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ جب تم سنو کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوئی ہے تو تم وہاں جانا اور اس کو میرا اسلام کہنا

اور بے خوفی کے ساتھ اس کو شکار کا واقعہ یاد دلانا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ شاید اللہ اس کا سینہ حق کے لئے کھول دے۔

اس کے بعد شیخ جمال الدین کا انتقال ہوگیا۔ باپ کی وصیت کے مطابق ان کے لڑکے شیخ رشید الدین تاتاری شہزادہ کی تخت نشینی کا انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی ان کو خبر ملی کہ تغلق تیمور تخت پر بیٹھ گیا ہے۔ اب وہ اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچے تو دربانوں نے خیمہ کے اندر جانے سے روک دیا۔ کیوں کہ ان کے پاس دربانوں کو بتانے کے لئے کوئی بات نہ تھی کہ وہ کیوں بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ خیمہ کے قریب ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔

ایک روز وہ فجر کے لئے اٹھے۔ اول وقت تھا اور فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے بلند آواز سے اذان دینا شروع کیا۔ یہ آواز خیمہ کے اس حصہ تک پہنچ گئی جہاں شاہ تغلق تیمور سو رہا تھا۔ بادشاہ کو ایسے وقت میں یہ آواز بے معنی شور معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے ملازموں سے کہا کہ دیکھو یہ کون پاگل ہے جو اس وقت ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہا ہے۔ اس کو پکڑ کر ہمارے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ شیخ رشید الدین فوراً بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دئے گئے۔

اب بادشاہ نے ان سے سوال و جواب شروع کیا کہ تم کون ہو اور کیوں ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہے ہو۔ شیخ رشید الدین نے اپنے والد شیخ جمال الدین کی پوری کہانی سنائی اور کہا کہ آپ کے سوال کے جواب میں جب میرے والد نے کہا تھا کہ اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے تو آپ نے کہا تھا کہ اس وقت میں کچھ نہیں کہتا مگر جب میری تخت نشینی ہو جائے تو تم میرے پاس آنا۔ مگر اس کے انتظار میں میرے والد کا آخری وقت آگیا۔ اب ان کی وصیت کے مطابق میں آپ کے پاس وہ بات یاد دلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

بادشاہ نے پورے قصہ کو غور کے ساتھ سنا۔ آخر میں بولا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمھارے انتظار میں تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا کہ ایک راز میرے سینہ میں تھا جس کو آج اس ایرانی فقیر نے یاد دلایا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اسلام قبول کرلوں۔ تمھاری کیا رائے ہے۔ وزیر نے کہا کہ میں بھی یہی راز اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ سچا دین یہی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ اور وزیر دونوں شیخ رشید الدین کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد بقیہ درباریوں نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ بادشاہ کے قبول اسلام کے بعد پہلے ہی دن ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا اور بالآخر ایران کی پوری تاتاری قوم نے بھی۔

سچائی کی فتح

تیرھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر، یوپی) کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع شروع ہوگئی۔ یہ نزاع مسجد سے متصل ایک زمین کے بارے میں تھی۔ مسلمان اس زمین کو مسجد کی ملکیت قرار دے کر مسجد میں شامل کرنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ یہ قدیم مندر کا حصہ ہے۔ جھگڑا بڑھا تو معاملہ عدالت تک پہنچا اور کئی سال تک اس کا مقدمہ چلتا رہا۔

مجسٹریٹ انگریز تھا۔ جو شواہد اس کے سامنے پیش کئے گئے وہ اتنے قطعی نہ تھے کہ انکی بنیاد پر وہ کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کرسکے۔ بالآخر مجسٹریٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ الگ گفتگو کی۔
اس نے مسلمانوں سے کہا کہ کیا تمھاری نظر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔ اگر تم کسی ایسے ہندو کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ کردوں گا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم کسی ہندو کا نام نہیں بتا سکتے، یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور ہم کو کسی ہندو سے یہ امید نہیں کہ ایسے مذہبی معاملہ میں وہ جانب داری کے بغیر بالکل سچ بات کہہ سکے اور یہ گواہی دے کہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔
اس کے بعد انگریز مجسٹریٹ نے ہندوؤں کو بلایا اور کہا کہ کیا تم کسی ایسے مسلمان کا نام بتا سکتے ہو جو تمھارے دعوے کی تصدیق کرے اور یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ملکیت ہے۔ اگر تم ایسے کسی مسلمان کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ تمھارے حق میں کردوں گا۔" ہندوؤں نے باہم مشورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ مسئلہ قومی عزت کا معاملہ بن گیا ہے۔ اس لئے بہت مشکل ہے کہ کوئی مسلمان یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ہے تاہم ہماری بستی میں ایک بزرگ ایسے ہیں جن سے ہم کو امید ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔

ہندوؤں نے جس مسلمان کا نام بتایا وہ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کے والد مولانا محمود بخش (م ۱۲۵۸ھ) تھے۔ مجسٹریٹ کا کیمپ اس وقت کاندھلہ کے قریب موضع ایلم میں تھا۔ اس نے فوراً مولانا محمود بخش کے یہاں پیغام بھیجا کہ وہ کچہری پہنچ کر متعلقہ مسئلہ میں اپنا بیان دیں۔ مجسٹریٹ کا بھیجا ہوا آدمی جب مولانا موصوف کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا منھ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ اپنا چپراسی بھیج کر کہلایا کہ اس کا انتظام رہے گا کہ میں یا کوئی دوسرا انگریز آپ کے سامنے نہ پڑے۔ آپ مہربانی کرکے تشریف لائیں، کیونکہ آپ ہی کے بیان پر ایک اہم مقدمہ کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس نے مزید کہلایا کہ آپ

کی مذہبی کتاب قرآن میں یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو پیش کرے، وہ ہرگز اس کو نہ چھپائے۔

اب مولانا محمود بخش کاندھلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں تشریف لائے۔ مجسٹریٹ خیمہ کے اندر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا۔ مولانا دروازہ کے پاس باہر کی طرف کھڑے ہوگئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد خیمہ کے باہر جمع تھی۔ ہر ایک ملے جلے جذبات کے ساتھ منتظر تھا کہ دیکھئے آج کیا پیش آتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ نے بلند آواز سے پوچھا کہ مولانا محمود بخش صاحب یہ بتائیے کہ یہ متنازعہ جگہ ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے، مسلمانوں کا دعویٰ اس کے بارہ میں غلط ہے۔ مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش صاحب کے اسی بیان پر اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ یہ زمین کاندھلہ کی موجودہ جامع مسجد کی جنوب مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ ہندوؤں نے مجسٹریٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد یہاں مندر تعمیر کر دیا۔ اب بھی اس جگہ پر وہ مندر موجود ہے۔

مسلمان کچہری سے اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کے چہرے اداس تھے اور ان کے دلوں میں شکست کا احساس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ "مولوی نے قوم کو غیروں کے سامنے رسوا کر دیا" مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ قانون کی عدالت کا فیصلہ اگرچہ ہو چکا ہے مگر اخلاق کی عدالت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ مولانا محمود بخش کی اس سچائی اور بے لاگ حق پرستی کا ہندوؤں پر بہت اثر پڑا۔ وہ مولانا کی سچائی کے واقعہ میں اس دین کی سچائی کو دیکھنے لگے جس نے ان کے اندر یہ زبردست قوت پیدا کی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملہ میں بھی انصاف سے نہیں ہٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاندھلہ کے کئی ہندو خاندان اسلام سے متاثر ہوئے اور مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔ ان نومسلم خاندانوں میں سے ایک گھرانہ ۱۹۴۷ تک کاندھلہ میں موجود تھا جو تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔

مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے مگر اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا۔

دو شخصوں یا گروہوں میں جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر مفاد اور مصلحت کی طرف چلی جاتی ہے۔ جس چیز میں بظاہر فائدہ نظر آئے، جو قومی وقار کے مطابق ہو۔ جس میں دنیوی سربلندی حاصل ہوتی ہو، آدمی بس اسی کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی کا راستہ یہ ہے کہ معاملہ کو حق اور ناحق اور انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھا جائے۔ جو طریقہ حق کے مطابق ہو اس کو اختیار کر لیا جائے اور جو طریقہ حق کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ اصولی موقف ہے اور اس دنیا میں بالآخر اصولی موقف کامیاب ہوتا ہے نہ کہ افادی موقف۔

جاننا کافی نہیں

بوعلی سینا (۳۷۰ - ۴۲۸ھ) بہت عالم فاضل شخص تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے زمانہ کے ایک بزرگ شیخ ابوسعید ابوالخیر سے ملے اور ان کے یہاں چند دن گزارے۔ بوعلی سینا جب واپس جانے لگے تو انھوں نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کی خدمت میں رہنے والے ایک شخص سے کہا: آج میں یہاں سے جارہا ہوں۔ تم ایسا کرنا کہ میرے بعد شیخ میرے بارے میں جو کچھ کہیں وہ تم ایک خط میں لکھ کر میرے پاس بھیج دینا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شیخ کا خیال میرے بارے میں کیا ہے۔

بوعلی سینا کی واپسی کو کئی دن گزر گئے مگر شیخ ابوسعید ابوالخیر نے ان کے بارے میں کوئی بات نہ کہی۔ اچھا یا برا کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بالآخر کئی دن کے انتظار کے بعد مذکورہ شخص نے شیخ سے سوال کیا کہ حضرت، آپ کے پاس بوعلی سینا آئے تھے، وہ آپ کی نظر میں کیسے آدمی ہیں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر نے جواب دیا کہ وہ ایک اچھے حکیم ہیں اور ان کے پاس بہت علم ہے۔ مگر وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتے۔

مذکورہ شخص نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کا یہ تبصرہ ایک کاغذ پر لکھا اور اس کو بوعلی سینا کے پاس بھیج دیا۔ بوعلی سینا نے اس کو پڑھا تو ان کو بڑا جھٹکا لگا۔ انھوں نے مذکورہ شخص کو اس کا جواب لکھ کر بھیجا۔ اس جواب میں انھوں نے یہ لکھا کہ مجھے تمھاری تحریر پر تعجب ہے۔ میں نے مکارم اخلاق پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ پھر شیخ میرے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں مکارم اخلاق نہیں جانتا۔ مذکورہ شخص نے بوعلی سینا کا یہ جواب شیخ ابوسعید ابوالخیر کو بتایا۔ وہ اس کو سن کر مسکرائے اور کہا:

من ایں نگفتم کہ مکارم اخلاق نہ داند، گفتہ ام کہ ندارد (فوائدالفراد)	میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ مکارم اخلاق نہیں جانتے، میں نے یہ کہا ہے کہ وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتے۔

ایک چیز ہے "جاننا" اور ایک چیز ہے "ہونا"۔ جاننا ذہن اور حافظہ کی سطح پر ہوتا ہے۔ اور ہونا آدمی کے پورے وجود کی سطح پر۔ جاننے والا آدمی صرف جانتا ہے اور ہونے والا آدمی خود اس میں شامل ہوجاتا ہے۔ جاننا بہت آسان ہے۔ کوئی بھی شخص پڑھ کر اور سیکھ کر دین و اخلاق کی باتوں کو جان سکتا ہے۔ مگر ہونا اتنا ہی زیادہ مشکل ہے۔ ہونے کے لئے آدمی کو اپنے آپ کو پیس ڈالنا پڑتا ہے۔ کیونکہ پسا ہوا سفوف ہی پانی میں گھلتا ہے نہ کہ جمے ہوئے ٹکڑے۔ مگر اصل اہمیت اعتبار کی ہے۔ اور حقیقت کی دنیا میں جو کچھ اعتبار ہے وہ ہونے کا ہے نہ کہ جاننے کا۔

جس جاننے کے ساتھ ہونا نہ ہو، حقیقت کی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

راکھ کی گواہی

دہلی کا ایک محلہ ہے جس کا نام نبی کریم ہے۔ یہاں ایک نوجوان مزدور اشوک نام کا رہتا تھا۔ ۵ ستمبر ۱۹۸۰ کو وہ اپنے گھر کے پاس مرا ہوا پایا گیا۔ ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کی وجہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ کی کوئی رپورٹ پولس میں درج نہ ہو سکی۔ اگلے دن اشوک کی لاش جمنا کے کنارے لے جائی گئی اور اس کو جلا کر دریا میں بہا دیا گیا۔

بظاہر معاملہ ختم ہو چکا تھا۔ اور اگر اس میں کوئی مجرمانہ سازش ہو تو اس کا پتہ لگانے کا کوئی امکان اب باقی نہیں رہا تھا۔ مگر جلائی ہوئی لاش کی راکھ نے وہ بات بتا دی جو معروف ذرائع نہیں بتا سکے۔

اشوک کی ماں چمیلی دیوی کو بعض وجوہ سے یہ شبہ ہوا کہ اشوک طبعی موت نہیں مرا ہے بلکہ اس کے ایک دوست سریش (۲۶ سال) نے اس کو شراب میں زہر دے کر اسے مارا ہے۔ ماں نے ۷ ستمبر کو پولس میں رپورٹ درج کرائی۔ پولس کے لئے اب واحد صورت یہ باقی تھی کہ وہ مردہ کی راکھ حاصل کرکے اس کی چھان بین کرے۔ رپورٹ کے بعد اسی دن ایک پولس پارٹی لاش جلانے والے گھاٹ پر پہنچی۔ یہ ستمبر کی سات تاریخ تھی۔ مگر خوش قسمتی سے شمشان بھومی کے مذکورہ پلیٹ فارم پر ابھی تک کوئی دوسری لاش نہیں جلائی گئی تھی۔ پولس نے راکھ جمع کی اور اس جلی ہوئی راکھ کو سنٹرل فارنسک سائنس لیبورٹری (آر کے پورم) میں جانچ کے لئے بھیج دیا۔ وہاں سے چھ ماہ بعد ۱۲ مارچ ۱۹۸۱ کو رپورٹ آئی۔ رپورٹ نے تصدیق کر دی کہ مرنے والا طبعی موت نہیں مرا بلکہ زہر کے سبب سے مرا ہے۔ ۱۶ مارچ کو سریش کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا (ہندستان ٹائمس ۱۷ مارچ ۱۹۸۱)

اخباری رپورٹر نے اس واقعہ کی روداد درج کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں: مرے ہوئے آدمی کوئی بات نہیں بتلاتے مگر ان کی جلی ہوئی راکھ بتا سکتی ہے۔

Dead men tell no tales, but their ashes may

انسان ظلم کرتا ہے اور "ریکارڈ" جلا کر سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے عمل کا ثبوت مٹا دیا۔ وہ برائی کرتا ہے اور اپنی ہوشیاری اور طاقت سے اس پر پردہ ڈال کر یقین کر لیتا ہے کہ اس نے اپنی برائی کو ہمیشہ کے لئے چھپا دیا۔ مگر وہ بھول جاتا ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہے بلکہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہے۔ اور خدا نے اپنی دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہر عمل وجود میں آتے ہی کائناتی صفحہ پر اس طرح ثبت ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کو مٹانا کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔ ہر آدمی عمل کرنے کے لئے آزاد ہے مگر وہ اپنے عمل کا نشان مٹانے کے لئے آزاد نہیں۔ آدمی اگر اپنی اس بے بسی کو جان لے تو وہ ظلم اور برائی کے قریب بھی نہ جائے۔

جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سنی کہ میں تمہاری مدد کے لئے ایک ہزار فرشتے لگا تار بھیج رہا ہوں۔ اور یہ اللہ نے صرف اس لئے کیا کہ تمہارے لئے خوش خبری ہو اور تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔ اور مدد تو اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے۔ یقیناً اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ جب اللہ نے تم پر اونگھ ڈال دی اپنی طرف سے تمہاری تسکین کے لئے اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی اتارا کہ اس کے ذریعہ سے تمھیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کردے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کردے اور اس سے قدموں کو جمادے۔ جب تیرے رب نے فرشتوں کو حکم بھیجا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم ایمان والوں کو جمائے رکھو۔ میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا۔ پس تم ان کی گردنوں کے اوپر مارو اور ان کے پور پور پر ضرب لگاؤ۔ یہ اس سبب سے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔ یہ تو اب چکھو اور جان لو کہ منکروں کے لئے آگ کا عذاب ہے۔ ۹-۱۴

بدر کی لڑائی بڑے نازک حالات میں ہوئی۔ تقریباً ایک ہزار مسلح دشمنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی۔ ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔ دشمنوں نے مقام جنگ (بدر) پر پہلے پہنچ کر وہاں اچھی جگہ اور پانی کے چشمے پر قبضہ کر لیا۔ اس قسم کے حالات دیکھ کر مسلمانوں کے دل میں یہ وسوسہ آنے لگا کہ جس مشن کے لئے وہ اپنی زندگی ویران کر رہے ہیں اس کے ساتھ شاید خدا کی مدد شامل نہیں۔ اگر وہ حق ہوتا تو ایسے نازک موقع پر خدا کیوں ان کا ساتھ نہ دیتا، کیوں اسباب کے تمام سرے ان کے ہاتھ سے نکل کر دشمنوں کی طرف چلے جاتے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے بدر کے علاقہ میں زور کی بارش برسائی۔ مسلمانوں نے حوض بنا بنا کر بارش کا پانی جمع کر لیا۔ دشمن نے مسلمانوں کو زمین کے پانی سے محروم کیا تھا، خدا نے ان کے لئے آسمان سے پانی کا انتظام کر دیا۔ اسی طرح خدا نے یہ غیر معمولی انعام فرمایا کہ مسلمانوں کے اوپر نیند طاری کر دی۔ سونا آدمی کے تازہ دم ہونے کے لئے بہت ضروری ہے۔ مگر میدان جنگ کے حالات اس قدر وحشت ناک ہوتے ہیں کہ آدمی کی نیند اڑ جاتی ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یہ خصوصی مدد فرمائی کہ جنگ کے دن سے پہلے والی رات کو ان پر نیند طاری کر دی۔ وہ رات کو ذہنی بوجھ سے فارغ ہو کر سو گئے اور صبح کو پوری طرح تازہ دم ہو کر اٹھے —— جو حالات مسلمانوں کے اندر وسوسہ پیدا کرنے کا سبب بن رہے تھے، انھیں حالات کے اندر خدا نے ایسے امکانات پیدا کر دئے کہ ان کے اندر نیا یقین و اعتماد ابھر آیا۔

مقابلہ کے وقت اہل حق سے جو چیز مطلوب ہے وہ ثابت قدمی ہے۔ انھیں کسی حال میں بددل نہیں ہونا چاہئے۔ اس ثابت قدمی کا نقد انعام خدا کی طرف سے یہ ملتا ہے کہ دشمنان حق کے دلوں میں رعب ڈال دیا جاتا ہے۔ اور جو گروہ اپنے حریف سے مرعوب ہو جائے اس کو کوئی چیز شکست سے نہیں بچا سکتی۔

اے ایمان والو، جب تمہارا مقابلہ منکرین سے میدان جنگ میں ہو تو ان سے پیٹھ مت پھیرو۔ اور جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری، سوا اس کے کہ جنگی چال کے طور پر ہو یا دوسری فوج سے جاملنے کے لئے، تو وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے ۱۶ - ۱۵

اسلام اور غیر اسلام کا ٹکراؤ جب جنگ کے میدان تک پہنچ جائے تو یہ گویا دونوں فریقوں کے لئے آخری فیصلہ کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے نازک لمحہ میں اگر کوئی شخص یا گروہ ایسا کرے کہ عین معرکہ کے وقت وہ میدان چھوڑ کر بھاگے تو اس نے بدترین جرم کیا۔ ایک طرف اس نے حق کو بچانے کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بچانے کو زیادہ اہم سمجھا، اس نے اپنے مقصد کے مقابلہ میں اپنی ذات کو ترجیح دی۔ اور یہ سب کچھ اس نے اس وقت کیا جب کہ اس حق کی زندگی کی بازی لگی ہوئی تھی جس کو اعلیٰ ترین صداقت قرار دے کر وہ اس پر ایمان لایا تھا۔

دوسرے یہ کہ ایسے نازک موقع پر اکثر ایک چھوٹا سا واقعہ بہت بڑے واقعہ کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک شخص یا ایک گروہ کا میدان چھوڑ کر بھاگنا پوری فوج کا حوصلہ توڑ دیتا ہے۔ ایک شخص کی بھگدڑ بالآخر عام بھگدڑ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور ہنگامی حالات میں جب کسی مجمع میں عام بھگدڑ شروع ہو جائے تو وہ اپنی آخری حد پر پہنچنے سے پہلے کہیں نہیں رکتی۔

اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورت ہے جب کہ کوئی سپاہی یا سپاہیوں کا کوئی دستہ کسی جنگی تدبیر کے لئے پیچھے ہٹتا ہے یا وہ اپنے ایک مورچہ سے ہٹ کر کسی دوسرے مورچہ کی طرف سمٹنا چاہتا ہے۔ فرار کے طور پر اگر کوئی پیچھے ہٹتا ہے تو وہ بلاشبہ ناقابل معافی جرم کرتا ہے۔ مگر جو پیچھے ہٹنا تدبیر جنگ سے تعلق رکھتا ہو وہ جائز ہے۔ اس کے لئے آدمی پر کوئی الزام نہیں۔

مذکورہ حکم اصلاً جنگ سے متعلق ہے۔ تاہم دوسری مشابہ صورتیں بھی درجہ بدرجہ اسی کے ذیل میں آسکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص بے آمیز اسلام کے خاموش اور تعمیری عمل کی طرف لوگوں کو پکارے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد جب وہ دیکھے کہ اس کی دعوت لوگوں میں زیادہ مقبول نہیں ہو رہی ہے تو وہ بے صبری کا شکار ہو جائے اور خاموش تعمیر کے محاذ کو چھوڑ کر ایسے اسلام کی طرف دوڑ پڑے جس کے ذریعہ عوام میں بہت جلد شہرت اور مرتبہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

جنگ کے میدان سے بھاگنا شعور اور ارادہ کے تحت ہوتا ہے۔ مگر جنگی میدان کے باہر جو معرکہ جاری ہے اس سے "بھاگنا" ایک غیر شعوری واقعہ ہے۔ آدمی طبعی طور پر نتیجہ پسند واقع ہوا ہے۔ وہ اپنے کام کا اعتراف چاہتا ہے۔ اس کا یہ مزاج غیر شعوری طور پر اس کو ان کاموں سے ہٹا دیتا ہے جن میں فوری نتیجہ نکلتا ہوا نظر نہ آتا ہو۔ وہ اپنے اندر کام کرنے والے غیر شعوری اثرات کے تحت ان چیزوں کی طرف کھنچ اٹھتا ہے جن میں بظاہر یہ امید ہو کہ فوراً عزت و کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ اس قسم کا ہر انحراف اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسی نوعیت کی چیز ہے جس کو مذکورہ آیت میں میدان مقابلہ سے بھاگنا کہا گیا ہے۔

پس ان کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا۔ اور جب تو نے ان پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تاکہ اللہ اپنی طرف سے ایمان والوں پر خوب احسان کرے۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ تو ہو چکا۔ اور بے شک اللہ منکرین کی تمام تدبیریں بے کار کرکے رہے گا۔ اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو فیصلہ تمہارے سامنے آگیا۔ اور اگر تم باز آجاؤ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے اور تمہارا جتھا تمہارے کچھ کام نہ آئے گا خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ہو۔ اور بے شک اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے ۱۷—۱۹

روایات میں آتا ہے کہ جب بدر کا معرکہ گرم ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دعا کرتے ہوئے یہ الفاظ نکلے: یاربِّ اِن تُھلک ھٰذہ العصابۃ فلن تُعبد فی الارض ابداً (اے میرے رب، اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو کبھی زمین پر تیری پرستش نہ ہوگی) پھر آپ نے اپنے ہاتھ میں مٹھی بھر خاک لی اور اس کو مشرکین کی طرف پھینکتے ہوئے کہا شاھت الوجوہ (چہرے بگڑ جائیں) اس کے بعد کافروں کے لشکر کا یہ حال ہوا جیسے سب کی آنکھوں میں ریت پڑ گئی ہو۔ چنانچہ مسلمانوں نے نہایت آسانی سے جس کو چاہا قتل کیا اور جس کو چاہا گرفتار کر لیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے کہ وہ اہل ایمان کی مدد کرتا ہے۔ ان کے دشمن خواہ کتنی ہی سازشیں کریں وہ ان کی سازشوں کو اپنی تدبیروں سے بے اثر کر دیتا ہے۔ وہ ان کو مغلوب کرکے اہل ایمان کو ان کے اوپر غالب کر دیتا ہے۔ مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ اہل ایمان اپنے ارادہ کو خدا کے ارادہ میں اس طرح ملا دیں کہ خدا کی منشا اور اہل ایمان کی منشا دونوں ایک ہو جائے۔ جب بندہ اس طرح اپنے آپ کو خدا کے مطابق کر لیتا ہے تو جو کچھ خدا کا ہے وہ اس کا ہو جاتا ہے کیونکہ جو کچھ اس کا ہے وہ خدا کو دے چکا ہوتا ہے۔

بدر کے لئے روانگی سے پہلے مکہ کے سردار بیت اللہ گئے اور کعبہ کے پردہ کو پکڑ کر یہ دعا کی: خدایا اس کی مدد کر جو دونوں لشکروں میں سب سے اعلیٰ ہو، جو دونوں گروہوں میں سب سے معزز ہو، جو دونوں قبیلوں میں سب سے بہتر ہو (اللّٰھم انصر اعلیٰ الجندین واکرم الفئتین وخیر القبیلتین) بدر کی لڑائی میں سرداران مکہ کو کامل شکست اور اہل ایمان کو کامل فتح ہوئی۔ اس طرح خود سرداران مکہ کے معیار کے مطابق یہ ثابت ہوگیا کہ خدا کے نزدیک اعلیٰ و اشرف گروہ وہ نہیں ہیں بلکہ اہل اسلام ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ جو لوگ ایسا کریں ان کے لئے آخرت میں سخت ترین عذاب ہے اور اسی کے ساتھ دنیا میں بھی۔

"دونوں میں جو سب سے اعلیٰ اور سب سے اشرف ہو اس کو فتح دے" یہ بظاہر دعا تھی مگر حقیقۃً وہ اپنے حق میں پُرفخر اعتماد کا اظہار تھا۔ اس کے پیچھے ان کی یہ نفسیات کام کر رہی تھی کہ ہم کعبہ کے پاسبان ہیں، ہم ابراہیم و اسماعیل سے نسبت رکھنے والے ہیں۔ جب ہمارے ساتھ اتنی بڑی فضیلتیں جمع ہیں تو جیت بہرحال ہماری ہونی چاہئے۔ مگر خدا کے یہاں ذاتی عمل کی قیمت ہے نہ کہ خارجی انتسابات کی۔ خارجی انتساب خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو آدمی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو حالاں کہ تم سن رہے ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالاں کہ وہ نہیں سنتے۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور اگر ان میں کسی بھلائی کا علم اللہ کو ہوتا تو وہ ضرور انھیں سننے کی توفیق دیتا اور اگر اب وہ انھیں سنوا دے تو وہ ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے ۲۳ — ۲۰

آدمی کے سامنے جب حق بات پیش کی جائے تو ایک صورت یہ ہے کہ وہ اس کو ان تمام صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے سنے جو خدا نے اس کو بحیثیت انسان عطا کی ہیں۔ وہ اس پر پوری طرح دھیان دے۔ وہ اس کی صداقت کے وزن کو محسوس کرلے۔ اور پھر اپنی زبان سے وہ صحیح جواب پیش کرے جو ایک حق کے مقابلہ میں انسان کی فطرت کو پیش کرنا چاہئے۔ جو شخص ایسا کرے اس نے گویا پیش کی ہوئی بات کو انسان کی طرح سنا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس کو اس طرح سنے جیسے کہ اس کے پاس سننے کے لئے کان نہیں ہیں۔ اس کے سمجھنے کی صلاحیت اس کی سچائی کو پکڑنے سے عاجز رہ جائے۔ وہ اپنی زبان سے وہ صحیح جواب پیش نہ کرسکے جو اس کو ازروئے واقعہ پیش کرنا چاہئے۔ جو شخص ایسا کرے اس نے گویا پیش کی ہوئی بات کو جانور کی طرح سنا۔

کوئی بات خواہ وہ کتنی ہی برحق ہو اس کی حقانیت صرف اسی شخص پر کھلتی ہے جو دل کی آمادگی کے ساتھ اس کو سنے۔ اس کے برعکس جو شخص حسد، کبر، مصلحت اندیشی اور ظاہر پرستی کا مزاج اپنے اندر لئے ہوئے ہو وہ سچائی کو قابل غور نہیں سمجھے گا، وہ اس کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنے گا، اس لئے وہ اس کی صداقت کو پانے میں بھی یقینی طور پر ناکام رہے گا۔

ایمان بظاہر ایک قول ہے۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک انسانی فیصلہ ہے۔ ایمان محض شہادت کے الفاظ کی تکرار نہیں بلکہ اپنی معنوی حالت کا لفظی اظہار ہے۔ اگر آدمی کی حالت فی الواقع وہی ہو جس کا وہ ان الفاظ کے ذریعہ اعلان کر رہا ہے تو وہ خدا کی نظر میں حقیقی مومن ہے۔ مومن سنجیدہ ترین انسان ہے اور سنجیدہ انسان کبھی ایسا نہیں کرسکتا کہ اس کی اندرونی حالت کچھ ہو اور بولے ہوئے الفاظ میں وہ اپنے کو کچھ ظاہر کرے۔

جس آدمی کا ایمان اپنی اندرونی حقیقت کے اعلان کے ہم معنی ہو وہ ایمان کا اقرار کرتے ہی عملاً خدا کو اپنا معبود بنالے گا اور اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اس کی پیروی کرنے والا بن جائے گا۔ زبان سے ایمان کا اقرار اس کے لئے اپنی سمت سفر بتانے کے ہم معنی ہوگا نہ کہ کسی قسم کے لسانی تلفظ کے ہم معنی۔ اس کے برعکس حالت اس شخص کی ہے جس نے بات سنی۔ وہ اس کے دلائل کے مقابلہ میں لاجواب بھی ہوگیا۔ مگر وہ اس کی روح میں نہیں اتری۔ وہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں شامل نہیں ہوئی۔ تاہم اوپری طور پر اس نے زبان سے کہہ دیا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ مگر اس کی واقعی زندگی اس کے بعد بھی ویسی ہی رہی جیسی کہ وہ اس سے پہلے تھی۔ یہ دوسری صورت نفاق کی صورت ہے اور خدا کے یہاں ایسے منافقانہ ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔

ے ایمان والو، اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تم کو اس چیز کی طرف بلا رہا ہے جو تم کو زندگی دینے والی
ے۔ اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ اسی کی طرف تمہارا اکٹھا ہونا
ے۔ اور ڈرو اس فتنہ سے جو خاص انھیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اور جان لو کہ اللہ
ت سزا دینے والا ہے ۲۴-۲۵

"زندگی کی پکار" سے مراد یہاں جہاد کی پکار ہے۔ یعنی حق کو دوسروں تک پہنچانے کی جدوجہد۔ یہ جدوجہد
راۂ زبان وقلم کے ذریعہ تلقین کی صورت میں شروع ہوتی ہے۔ مگر مدعو کا مخالفانہ ردعمل اس کو مختلف مراحل تک
پہنچا دیتا ہے، حتیٰ کہ ہجرت اور جنگ تک بھی۔

آدمی انفرادی سطح پر اپنے خیال کے مطابق ایک دینی زندگی بناتا ہے۔ اس زندگی کو وہ اپنے حالات سے اس
رح مطابق کر لیتا ہے کہ وہ اس کو عافیت کا جزیرہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ دوسروں
ا اصلاح کے لئے اٹھا تو اس کا بنا بنایا آشیانہ اجڑ جائے گا۔ اس کی لگی بندھی زندگی بے ترتیب ہو کر رہ جائے گی۔
ں کے وقت اور اس کے مال کا وہ نظام باقی نہ رہے گا جو اس نے اپنے ذاتی تقاضوں کے تحت بنا رکھا ہے۔

اس قسم کے اندیشے اس کے لئے دعوت واصلاح کی جدوجہد میں نکلنے اور اس کی راہ میں جان ومال پیش کرنے
ے لئے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ مگر یہ سراسر نادانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس عافیت کدہ کو اپنے لئے زندگی سمجھ رہا
، وہ اس کا قبرستان ہے۔ اور جس قربانی میں اس کو اپنی موت نظر آتی ہے اسی میں اس کی زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔

دعوت واصلاح کا عمل، بشرطیکہ وہ آخرت کے لئے ہو نہ کہ دنیوی مقاصد کے لئے، انتہائی اہم عمل ہے۔ وہ
می کے مردہ دین کو زندہ دین بناتا ہے۔ وہ اعلیٰ ترین سطح پر انسان کو خدا سے جوڑتا ہے۔ وہ ان قیمتی دینی تجربات سے
دمی کو آشنا کرتا ہے جو انفرادی خول میں رہ کر کبھی حاصل نہیں ہوتے۔ خدا کی طرف سے اتنی اہم پکار کو سن کر جو لوگ
ں کے بارے میں بے توجہ رہیں وہ یہ خطرہ مول لے رہے ہیں کہ ان کے اور حق کے درمیان ایک نفسیاتی آڑ کھڑی ہو جائے
کی یہ فطری صلاحیت ہمیشہ کے لئے کند ہو جائے کہ وہ حق کی پکار کو سنیں اور اس کی طرف دوڑ کر اپنے رب کو پالیں۔

انسان کی زندگی ایک سماجی زندگی ہے۔ کوئی شخص اس کے اندر اپنا انفرادی جزیرہ بنا کر نہیں رہ سکتا۔ اگر
شخص ذاتی دین داری پر قانع ہے تو وہ ہر وقت اس اندیشہ میں ہے کہ اجتماعی بگاڑ کے نتیجہ میں کوئی عمومی آگ پھیلے اور وہ خود
ی اس کی لپیٹ میں آجائے۔ اصلاحی جدوجہد اصلاح کے ساتھ برأت بھی ہے۔ اگر آدمی اپنی برأت پیش کرنے میں ناکام
ہے تو خدا اس کے معاملہ کو کیوں دوسروں سے الگ کرے گا۔

کوئی برائی ہمیشہ چھوٹی سطح سے شروع ہوتی ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے بڑی بن جاتی ہے۔ اگر ایسا ہو کہ برائی جب
پنی ابتدائی حالت میں ہو اسی وقت کچھ لوگ اس کے خلاف اٹھ جائیں تو وہ آسانی کے ساتھ اسے کچل دیں گے۔ لیکن جب برائی
پھیل چکی ہو تو اس کی جڑیں اتنی گہری ہو جاتی ہیں کہ پھر اس کو ختم کرنا ممکن نہیں رہتا۔

اور یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے اور زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ لوگ اچانک تم کو اچک نہ لیں۔ پھر اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور اپنی نصرت سے تمھاری تائید کی اور تم کو پاکیزہ روزی دی تاکہ تم شکر گزار بنو۔ اے ایمان والو، خیانت نہ کرو اللہ اور رسول کی اور خیانت نہ کرو اپنی امانتوں میں حالاں کہ تم جانتے ہو۔ اور جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش ہیں۔ اور یہ کہ اللہ ہی کے پاس ہے بڑا اجر ۲۸ — ۲۶

مکہ میں مسلمان بالکل بے بسی کی حالت میں تھے۔ ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا کہ کب ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ وہ ایسے کمزور کی مانند تھے جس کو ہر طرح دبایا جاتا ہے اور اس کے جائز حقوق بھی اس کو نہیں دئے جاتے۔ بالآخر ان کے لئے مدینہ کا راستہ کھلا۔ ان کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ مدینہ جا کر اپنا مرکز بنائیں اور وہاں کے ماحول میں آزادی اور عزت کے ساتھ رہیں۔

مشکل کے بعد آسانی فراہم کرنے کا یہ معاملہ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔ آدمی کے حالات جب اس حد پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اچانک خدا کی مدد ظاہر ہو کر حالات کو بدل دیتی ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے تاکہ آدمی یقین کرے کہ جو کچھ ہوا وہ خدا کی طرف سے ہوا۔ اس احساس کی بنا پر وہ خدا کے انعامات کے جذبہ سے سرشار ہو جائے۔

آدمی خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اس طرح وہ عہد کرتا ہے کہ وہ خدا و رسول کے راستہ پر چلے گا۔ مگر جب ایمانی طریقہ کو اختیار کرنے میں اس کے مال و اولاد کے تقاضے حائل ہوتے ہیں تو وہ ایمان کے تقاضے کو چھوڑ کر مال و اولاد کے تقاضے کو پکڑ لیتا ہے۔ یہ ایمانی عہد کے ساتھ کھلی ہوئی غداری ہے۔ اس غداری کی شناعت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ آدمی جس چیز کی خاطر خدا کے ساتھ غداری کا معاملہ کر رہا ہے وہ بھی خود خدا کا ایک عطیہ ہے۔

آدمی کا مال اور اس کی اولاد کیا ہے۔ وہ خدا ہی کا دیا ہوا تو ہے۔ وہ بندہ کے پاس خدا کی امانت ہے۔ اس امانت کا اگر کوئی سب سے بہتر مصرف ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ جب دینے والا اس کو مانگے تو اس کو خوشی اس کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر جب خدا کہتا ہے کہ میرے دین کے لئے اٹھو اور اس میں اپنی قوتیں لگاؤ تو آدمی اسی امانت کو اپنے لئے عذر بنا لیتا ہے جس کو خدا کے دین کی راہ میں دے کر اسے خدا سے کئے ہوئے عہد ایمان کو پورا کرنا تھا — وہ کامیابی کے کنارے پہنچ کر اپنے کو ناکاموں کی فہرست میں لکھوا لیتا ہے۔

کوئی فعل خدا کے یہاں جرم اس وقت بنتا ہے جب کہ یہ جانتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے کہ وہ غلط ہے۔ کسی شخص پر اگر اس کے ایک کام کی غلطی واضح ہو جاتی ہے اور اس کے بعد بھی وہ اس کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہے۔ کیونکہ غلطی کو غلطی جاننے کے بعد اس کو دہرانا ڈھٹائی ہے اور ڈھٹائی خدا کے یہاں قابل معافی نہیں۔

ان والو، اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لئے فرقان بہم پہنچائے گا اور تم سے تمھارے گناہوں کو دور
ے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے، اور جب کافر تمھاری نسبت تدبیریں سوچ رہے تھے
قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیریں کر رہا تھا اور اللہ
تدبیر والا ہے ۲۹ - ۳۰

فرقان کے معنی ہیں فرق کرنے والی چیز۔ یہاں فرقان سے مراد حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہے۔
اللہ سے ڈرے، وہ وہی کرے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اس سے بچے جس سے اللہ نے منع کیا ہے تو اس کو
کی توفیق ملتی ہے کہ وہ حق اور باطل کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھ سکے (من اتقی بفعل اوامرہ
زواجرہ وُفق لمعرفۃ الحق من الباطل، ابن کثیر)

انسانی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والی سب سے بڑی چیز ڈر ہے۔ جس معاملہ میں انسان کے اندر ڈر کی نفسیات
جائے اس معاملہ میں وہ حد درجہ حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ ڈر کی نفسیات اس کے ذہن کے تمام پردوں کو
ح ہٹا دیتی ہے کہ اس بارہ میں وہ ہر قسم کی غفلت یا غلط فہمی سے بلند ہو کر صحیح ترین رائے قائم کر سکے۔ یہی معاملہ
ہ خدا کے ساتھ پیش آتا ہے جس کو رب العالمین کے ساتھ تقویٰ (ڈر) کا تعلق پیدا ہو گیا ہو۔

یہ فرقان تقریباً وہی چیز ہے جس کو معرفت یا بصیرت کہا جاتا ہے۔ بصیرت کسی آدمی میں وہ اندرونی روشنی پیدا
ہے کہ وہ ظاہری پہلوؤں سے دھوکا کھائے بغیر ہر بات کو اس کے اصل روپ میں دیکھ سکے۔ جب بھی کوئی آدمی کسی
ں اپنے کو اتنا زیادہ شامل کرتا ہے کہ وہ اس کی پروا کرنے لگے۔ وہ اس کے بارے میں اندیشہ ناک رہتا ہو تو اس
اس کے اندر ایک خاص طرح کی حساسیت پیدا ہوتی ہے جو اس کو اس معاملہ کے موافق اور مخالف پہلوؤں کی
رادیتی ہے۔ یہ فرقانی معاملہ ہر ایک کے ساتھ پیش آتا ہے خواہ وہ ایک مذہبی آدمی ہو یا ایک تاجر اور ڈاکٹر اور
کوئی بھی آدمی جب اپنے کام سے تقوی (کھٹک) کی حد تک اپنے کو وابستہ کرتا ہے تو اس کو اس معاملہ کی ایسی
ہو جاتی ہے کہ ادھر ادھر کے مغالطوں میں اُلجھے بغیر وہ اس کی حقیقت تک پہنچ جائے۔

کسی آدمی کے اندر یہ خدائی بصیرت (فرقان) پیدا ہونا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہ برائیوں سے
ہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرے اور بالآخر خدا کے فضل کا مستحق بن جائے۔ یہ فرقان (حق و باطل کی
ی تمیز) پیدا ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو حق کے ساتھ اتنا زیادہ وابستہ کر چکا ہے کہ اس میں
یں کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ اور حق دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن چکے ہیں۔ اس کے بعد اس کا بچایا جانا اتنا ہی
ی ہو جاتا ہے جتنا حق کو بچایا جانا۔ ایسے لوگ براہ راست خدا کی پناہ میں آ جاتے ہیں۔ اب ان کے خلاف تدبیریں
ود حق کے خلاف تدبیریں کرتا بن جاتا ہے۔ اور خدا کے خلاف تدبیر کرنے والا ہمیشہ ناکام رہتا ہے خواہ اس
ی بڑی تدبیر کر رکھی ہو۔

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کر دیں۔ یہ تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں۔ اور جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ اگر یہی حق ہے تیرے پاس سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا اور کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ اور اللہ ایسا کرنے والا نہیں کہ ان کو عذاب دے اس حال میں کہ تم ان میں موجود ہو اور اللہ ان پر عذاب لانے والا نہیں جب کہ وہ استغفار کر رہے ہوں۔ اور اللہ ان کو کیوں نہ عذاب دے گا حالاں کہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں جب کہ وہ اس کے متولی نہیں۔ اس کے متولی تو صرف اللہ سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے۔ اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ پس اب چکھو عذاب اپنے کفر کا ۳۵ ــ ۳۱

ہم بھی ایسا کلام بنا سکتے ہیں، ہم ناحق پر ہیں تو ہمارے اوپر پتھر کیوں نہیں برستا ــــــــ یہ سب گھمنڈ کی باتیں ہیں۔ آدمی جب دنیا میں اپنے کو محفوظ حیثیت میں پاتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ حق کا انکار کرنے یا اس کو نظر انداز کرنے سے اس کا کچھ نہیں بگڑا تو اس کے اندر جھوٹے اعتماد کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ بالکل درست ہے۔ اس کا یہ احساس اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلواتا ہے جو عام حالات میں کسی کی زبان سے نہیں نکلتے۔

اس قسم کے لوگوں میں یہ دلیری خدا کے قانون مہلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا یقیناً مجرموں کو سزا دیتا ہے مگر خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ آدمی کو ہمیشہ اس وقت پکڑتا ہے جب کہ اس کے اوپر حق و باطل کی وضاحت کا کام مکمل طور پر انجام دے دیا گیا ہو۔ اس کام کی تکمیل سے پہلے کسی کو ہلاک نہیں کیا جاتا۔ نیز یہ کہ دعوتی عمل کے درمیان اگر ایک ایک دو دو آدمی اس سے متاثر ہو کر اپنی اصلاح کر رہے ہوں تب بھی سزا کا نزول رکا رہتا ہے تاکہ یہ عمل اس حد تک مکمل ہو جائے کہ جتنی سعید روحیں ہیں سب اس سے باہر آچکی ہوں۔

امتوں میں بگاڑ آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ ان کے درمیان سے دین کی صورتیں مٹ جائیں۔ بگاڑ کے زمانہ میں ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ خوف خدا والا دین جاتا رہتا ہے اور اس کی جگہ دھوم دھام والا دین آجاتا ہے۔ اب قوم کے پاس عمل نہیں ہوتا بلکہ ماضی کی شخصیتیں اور ان کے نام پر قائم شدہ گدیاں ہوتی ہیں۔ لوگ ان شخصیتوں اور ان گدیوں سے وابستہ ہو کر سمجھتے ہیں کہ ان کو وہی عظمت حاصل ہو گئی ہے جو تاریخی اسباب سے خود ان شخصیتوں اور گدیوں کو حاصل ہے۔ لوگ اندر سے خالی ہوتے ہیں مگر بڑے بڑے ناموں پر نمائشی اعمال کر کے سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا دینی کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

مکہ کے لوگ اسی قسم کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ ان کو فخر تھا کہ وہ بیت اللہ کے وارث ہیں۔ ابراہیم و اسماعیل جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی امت ہیں۔ ان کو کعبہ کے خادم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب ان کو اتنے دینی اعزازات حاصل ہیں اور وہ اتنے بڑے بڑے دینی کارنامے انجام دے رہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ خدا ان کو جہنم میں ڈال دے۔

جن لوگوں نے انکار کیا وہ اپنے مال کو اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ وہ اس کو خرچ کرتے رہیں گے پھر یہ ان کے لئے حسرت بنے گا پھر وہ مغلوب کئے جائیں گے۔ اور جنھوں نے انکار کیا ان کو جہنم کی طرف اکٹھا کیا جائے گا۔ تاکہ اللہ ناپاک کو الگ کردے پاک سے اور ناپاک کو ایک پر ایک رکھے پھر اس ڈھیر کو جہنم میں ڈال دے، یہی لوگ ہیں خسارہ میں پڑنے والے ۳۶-۳۷

انسانوں میں کچھ پاک ہیں اور کچھ ناپاک۔ کچھ روحوں کی غذا وہ چیزیں ہوتی ہیں جو خدا کو پسند ہیں اور کچھ روحوں کو ان چیزوں میں لذت ملتی ہے جو ان کے نفس کو یا شیطان کو مرغوب ہیں۔

عام حالات میں یہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے سے ملے رہتے ہیں۔ بظاہر ان میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان حق و باطل کی کش مکش برپا کرتا ہے تاکہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور یہ معلوم ہو جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا تھا۔

اس کش مکش کے دوران کھل جاتا ہے کہ کون حق کے سامنے آنے کے بعد فوراً اس کو مان لیتا ہے اور کون وہ ہے جو اس کا انکار کر دیتا ہے۔ کون دوسروں کے ساتھ معاملہ پڑنے پر انصاف کی حد پر قائم رہتا ہے اور کون بے انصافی پر اتر آتا ہے۔ کون خدا کی زمین میں متواضع بن کر رہتا ہے اور کون سرکش بن کر۔ کون سچائی کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے والا ہے اور کون تعصب اور نمائش کی راہ میں۔

جو لوگ حق کو چھوڑ کر دوسری راہوں میں اپنی کوششیں صرف کرتے ہیں ان کے اس عمل کو شیطان ان کی نظر میں اس طرح حسین بنا تا رہتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اعلیٰ کارنامے انجام دے رہے ہیں، وہ شاندار مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر اس غلط فہمی کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ بہت جلد آدمی پر وہ وقت آجاتا ہے جب کہ وہ جان لیتا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ صرف اپنی قوت اور اپنے مال کو ضائع کرنا تھا، وہ جس مستقبل کی طرف بڑھ رہا تھا وہ حسرت اور مایوسی کا مستقبل تھا، اگرچہ جھوٹی خوش فہمی کے تحت وہ اس کو روشن مستقبل کی طرف سفر کے ہم معنی سمجھتا رہا تھا۔

بے آمیز حق کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ تمام لوگ اپنے اوپر اس کی زد پڑتی ہوئی محسوس کرتے ہیں جو ملاوٹی دین کی بنیاد پر سرداری قائم کئے ہوئے تھے۔ وہ اس رواجی ڈھانچہ کی حفاظت میں اپنی ساری طاقت خرچ کر دیتے ہیں جس کے اندر انھیں بڑائی کا مقام حاصل ہے۔ مگر ایسے لوگ بے آمیز حق کے مقابلہ میں لازماً ناکام ہوتے ہیں، کبھی دلیل کے میدان میں اور کبھی اسی کے ساتھ عمل کے میدان میں بھی۔

موجودہ دنیا کے ہنگامے صرف اس لئے جاری کئے گئے ہیں کہ پاک روحوں اور ناپاک روحوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ یہ چھانٹنے کا عمل جب پورا ہو جائے گا تو خدا پاک روحوں کو جنت میں داخل کر دے گا اور ناپاک روحوں کو ایک ساتھ جمع کر کے جہنم میں دھکیل دے گا۔

انکار کرنے والوں سے کہو کہ اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے وہ انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہ پھر وہی کریں گے تو ہمارا معاملہ اگلوں کے ساتھ گزر چکا ہے۔ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے ان کے عمل کا۔ اور اگر انھوں نے اعراض کیا تو جان لو کہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مددگار ۴۰ ۔ ۳۸

اسلام کا اصول یہ ہے کہ جو شخص جیسا عمل کرے اس کے مطابق وہ اپنا بدلہ پائے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس عام اصول میں اپنی رحمت سے ایک خاص استثنا رکھا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی جب "توبہ" کرے تو اس کے بعد اس کے پچھلے اعمال پر اس کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ ایک شخص خدا سے دوری کی زندگی گزار رہا تھا۔ پھر اس کو ہدایت کی روشنی ملی۔ اس نے سچا مومن بن کر صالح زندگی اختیار کر لی تو اس سے پہلے اس نے جو برائیاں کی تھیں وہ سب معاف کر دی جائیں گی۔ اس کے پچھلے گناہوں کی بنا پر اس کو نہیں پکڑا جائے گا۔

ٹھیک یہی اصول اجتماعی اور سیاسی معاملہ میں بھی ہے۔ کسی مقام پر حق اور باطل کی کشمکش برپا ہوتی ہے آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے، اس ٹکراؤ کے دوران میں باطل کے علم بردار حق کے لئے اٹھنے والوں پر ظلم کرتے ہیں۔ بالآخر جنگ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ حق پرست غالب آجاتے ہیں اور ناحق کے علم دار مغلوب ہو کر زیر کر دئے جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی اسلام کا اصول وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی فتح کے بعد پچھلے ظلم وستم پر کسی کو سزا نہیں دی جائے گی۔ البتہ جو شخص فتح کے بعد کوئی ایسی حرکت کرے جو اسلامی قانون میں جرم قرار دی گئی ہو تو ضروری کارروائی کے بعد اس کو وہ سزا ملے گی جو شریعت نے ایسے ایک مجرم کے لئے مقرر کی ہے۔

فتنہ کا مطلب ستانا (Persecution) ہے۔ قدیم زمانہ میں سرداری اور حکومت شرک کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ آج حکومت کرنے والے عوام کا نمائندہ بن کر حکومت کرتے ہیں، ماضی میں خدا یا خدا کے شریکوں کا نمائندہ بن کر لوگ حکومت کیا کرتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں شرک کو قدیم سماج میں باقتدار حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اہل شرک اہل توحید کو ستاتے رہتے تھے۔ اللہ نے اپنے رسول اور آپ کے ساتھیوں کو حکم دیا کہ شرک اور اقتدار کے باہمی تعلق کو توڑ دو تاکہ مشرکین اہل توحید کو ستانے کی طاقت سے محروم ہو جائیں۔ چنانچہ آپ کے ذریعہ جو عالمی انقلاب آیا اس نے ہمیشہ کے لئے شرک کا رشتہ سیاسی نظام سے ختم کر دیا۔ اب شرک ساری دنیا میں صرف ایک مذہبی عقیدہ ہے نہ کہ وہ سیاسی نظریہ جس کی بنیاد پر حکومتوں کا قیام عمل میں آتا ہے۔

تاہم جہاں تک عرب کا تعلق ہے وہاں یہ مقصد دہرا صورت میں مطلوب تھا، یہاں شرک اور مشرکین دونوں کو ختم کرنا تھا تاکہ حرمین کے علاقہ کو ابدی طور پر خالص توحید کا مرکز بنا دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جزیرۂ عرب سے مشرکین کو نکال دو۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شروع ہوا اور حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں اپنی تکمیل کو پہنچا۔

اور جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تمھیں حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر اتاری فیصلہ کے دن، جس دن کہ دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۴۱

غنیمت عربی زبان میں اس مال کو کہتے ہیں جو میدان جنگ میں دشمن سے لڑکر حاصل کیا گیا ہو۔ قدیم زمانہ میں یہ رواج تھا کہ جنگ کے بعد دشمن کی جو چیز جس کے ہاتھ لگے وہ اسی کی سمجھی جائے۔ اسلام نے یہ اصول مقرر کیا کہ ہر ایک کو جو کچھ ملا ہو وہ سب کا سب لاکر امیر کے پاس جمع کرے، کوئی شخص سوئی کا دھاگا تک چھپا کر نہ رکھے۔

اس طرح سارا مال غنیمت اکٹھا کرنے کے بعد اس میں سے پانچواں حصہ خدا کا ہے جس کو رسول نیابت کے طور پر وصول کرکے پانچ جگہ اس طرح خرچ کرے گا کہ ——— ایک حصہ اپنی ذات پر، پھر اپنے ان رشتہ داروں پر جنھوں نے رشتہ کی بنیاد پر مشکل وقتوں میں آپ کے دینی مشن میں آپ کا ساتھ دیا، اور یتیموں پر اور حاجت مندوں پر اور مسافروں پر ——— اس کے بعد بقیہ چار حصے کو تمام فوجیوں کے درمیان اس طرح تقسیم کیا جائے کہ سوار کو دو حصہ ملے اور پیدل کو ایک حصہ۔

اسلام یہ ذہن بنانا چاہتا ہے کہ آدمی جو چیز پائے اس کو وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھے۔ اس دنیا میں کسی واقعہ کو ظہور میں لانے کے لئے بے شمار اسباب کی بیک وقت موافقت ضروری ہے جو کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ بدر کی لڑائی میں ایک بے حد طاقت ور گروہ کے مقابلہ میں ایک کمزور گروہ کا فیصلہ کن طور پر غلبہ پانا اس بات کا ایک غیر معمولی ثبوت تھا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوا ہے۔ ایسی حالت میں فتح کے بعد ملی ہوئی چیز کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھنا عین اس حقیقت کو ماننا تھا جو واقعات کے نتیجہ میں فطری طور پر سامنے آئی ہے۔

مال غنیمت میں دوسرے مستحق بھائیوں کا حصہ رکھنا اس بات کا سبق ہے کہ اموال میں حق دار ہونے کی بنیاد صرف محنت اور وراثت نہیں بلکہ ایسی بنیادیں بھی ہیں جو محنت اور وراثت جیسی چیزوں کے دائرہ میں نہیں آتیں۔ استحقاق کی ان دوسری مدوں کا اعتراف گویا اس واقعہ کا عملی اعتراف ہے کہ آدمی چیزوں کو خدا کی چیز سمجھتا ہے نہ کہ اپنی چیز۔

غنیمت کے اس قانون میں تیسرا زبردست سبق یہ ہے کہ ملکیت کی بنیاد قبضہ نہیں بلکہ اصول ہے۔ کوئی شخص محض اس بنا پر کسی چیز کا مالک نہیں بن جائے گا کہ وہ اتفاق سے اس کے قبضہ میں آگئی ہے۔ قبضہ کے باوجود آدمی کو چاہئے کہ اس چیز کو ذمہ دار افراد کے حوالے کرے اور اصولی اور قانونی بنیاد پر اس کو جتنا ملنا چاہئے اس کو لے کر اس پر راضی ہو جائے۔

اور جب کہ تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر۔ اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔ اور اگر تم اور وہ وقت مقرر کرتے تو ضرور اس تقرر کے بارے میں تم میں اختلاف ہو جاتا۔ لیکن جو ہوا وہ اس لئے ہوا تاکہ اللہ اُس امر کا فیصلہ کر دے جس کو ہو کر رہنا تھا، تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جس کو زندگی حاصل کرنا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ یقیناً اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جب اللہ تمھارے خواب میں ان کو تھوڑا دکھاتا رہا۔ اگر وہ ان کو زیادہ دکھا دیتا تو تم لوگ ہمت ہار جاتے اور آپس میں جھگڑنے لگتے اس معاملہ میں۔ لیکن اللہ نے تم کو بچا لیا۔ یقیناً وہ دلوں تک کا حال جانتا ہے۔ اور جب اللہ نے ان لوگوں کو تمھاری نظر میں کم کر کے دکھایا اور تم کو ان کی نظر میں کم کر کے دکھایا تاکہ اللہ اس امر کا فیصلہ کر دے جس کا ہونا طے تھا۔ اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں ۴۴ ـ ۴۲

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا لوگوں پر پوری طرح کھل جائے۔ یہ کام ابتداءً دعوت کے ذریعہ دلائل کی زبان میں ہوتا ہے۔ داعی طاقت ور اور عام فہم دلائل کے ذریعہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کرتا ہے۔ احقاق حق اور ابطال باطل کے اس کام کی تکمیل بالآخر غیر معمولی واقعات سے کی جاتی ہے، خواہ یہ غیر معمولی واقعہ کوئی آسمانی معجزہ ہو یا زمینی غلبہ۔ بدر کی جنگ میں یہی دوسرا واقعہ پیش آیا۔

قریش مکہ سے اس لئے نکلے کہ شام سے آنے والے اپنے تجارتی قافلہ کی مدد کریں۔ مسلمان مدینہ سے اس لئے نکلے کہ تجارتی قافلہ پر حملہ کریں۔ تجارتی قافلہ معروف راستہ کو چھوڑ کر سمندری ساحل سے گزرا اور بچ گیا۔ اور یہ دونوں فریق بدر پہنچ کر آمنے سامنے ہو گئے۔ یہ اللہ کی تدبیر سے ہوا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اہل ایمان کو فتح دی گئی۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن کی صداقت لوگوں پر پوری طرح کھل گئی۔ جو لوگ سچے طالب تھے ان پر آخری حد تک یہ بات واضح ہو گئی کہ یہی حق ہے۔ اور جو لوگ اپنے اندر کسی قسم کی نفسیاتی پیچیدگی لئے ہوئے تھے انھوں نے اس کے بعد بھی اپنے مسلک پر قائم رہ کر ثابت کر دیا کہ وہ اسی قابل ہیں کہ انھیں ہلاک کر دیا جائے۔

بدر میں قریش کی فوج کی تعداد زیادہ تھی۔ اگر مسلمان ان کی اصل تعداد کو دیکھتے تو کوئی کہتا کہ لڑو اور کوئی کہتا کہ نہ لڑو۔ اس طرح اختلاف پیدا ہو جاتا اور اصل کام ہونے سے رہ جاتا۔ خدا نے حسب موقع کبھی تعداد گھٹا کر دکھائی اور کبھی بڑھا کر۔ اس طرح ممکن ہو سکا کہ تمام مسلمان بے جگری کے ساتھ لڑیں۔ خدا کو جب کوئی کام مطلوب ہوتا ہے تو وہ اسی طرح اپنی مدد بھیج کر اس کام کی تکمیل کا سامان کر دیتا ہے۔

عمل کے دوران جو حالات پیش آتے ہیں وہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور یہ دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں کہ کس شخص نے اپنے حالات کے اندر کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔

اے ایمان والو جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو تم ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تمہارے اندر کمزوری آجائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اور ان لوگوں کے سے نہ بنو جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھلاتے ہوئے نکلے اور جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں ۔ حالاں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۴۷ — ۴۵

کامیابی خدا کی مدد سے آتی ہے۔ مگر خدا کی مدد ہمیشہ اسباب کے پردہ میں آتی ہے نہ کہ بے اسبابی کے حالات میں۔ مسلمان اگر اپنے ممکن اسباب کو جمع کر دیں تو بقیہ کمی خدا کی طرف سے پوری کر کے انھیں کامیاب کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ بے اسبابی کا مظاہرہ کریں تو خدا کبھی ایسا نہیں کرسکتا کہ بے اسبابی کے نقشہ میں ان کے لئے اپنی مدد نہ بھیج دے۔

اسباب کیا ہیں۔ اسباب یہ ہیں کہ مسلمان اقدام میں پہل نہ کریں۔ وہ اپنی جڑوں کو مضبوط کرنے میں لگے رہیں تاآنکہ حریف خود چڑھائی کر کے ان سے لڑنے کے لئے آجائے۔ پھر جب ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو وہ اس کے مقابلہ میں پوری طرح جماؤ کا ثبوت دیں۔ اللہ کی یاد، بالفاظ دیگر، مقصودِ اصلی کا مکمل استحضار رکھیں تاکہ ان کا قلبی حوصلہ باقی رہے۔ سردار کے حکم کے تحت پوری طرح منظم رہیں۔ باہمی اختلافات کو نظر انداز کریں نہ یہ کہ اختلافات کو بڑھا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ وہ اپنے اتحاد سے حریف کو مرعوب کر دیں۔ وہ صبر کریں، یعنی جوش کے بجائے ہوش کو اپنائیں۔ جلد کامیابی کے شوق میں غیر پختہ اقدام نہ کریں۔ ان کی نظر ہمیشہ آخری منزل پر ہو نہ کہ وقتی مصالح اور منافع پر ——— انھیں چیزوں کا نام اسباب ہے اور انھیں اسباب کے پردہ میں خدا کی مدد آتی ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا "غیب" میں رہ کر اپنے تمام تصرفات انجام دیتا ہے، اسی لئے جب وہ مسلمانوں کی مدد کرتا ہے تو اسباب کے پردہ میں کرتا ہے۔ مسلمان اگر اسباب کا ماحول پیدا نہ کریں وہ بے حوصلگی کا ثبوت دیں، وہ ابتدائی تیاری کے بغیر اقدامات کرنے لگیں۔ وہ اختلاف و انتشار میں مبتلا ہوں، تو ان کو کبھی یہ امید نہ کرنی چاہئے کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا اور بے اسبابی کا شکار ہونے کے باوجود ماورائے اسباب طریقوں سے ان کی مدد کر کے ان کے تمام کام بنا دے گا۔

مسلمان اگر اپنے حریف کے مقابلہ میں اپنے کو بہتر حالات میں پائیں تب بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کافروں کی طرح اپنی طاقت پر گھمنڈ کریں، وہ فخر و نمائش کے جذبات میں مبتلا ہو جائیں۔ وہ بڑائی کے زعم میں اس حد تک آگے بڑھیں کہ ایک شخص کے صرف اس لئے مخالف بن جائیں کہ وہ ایسے حق کی دعوت دے رہا ہے جس کی زد خود ان کی اپنی ذات پر بھی پڑ رہی ہے۔

اور جب شیطان نے انھیں ان کے اعمال خوش نما بنا کر دکھائے اور کہا کہ لوگوں میں سے آج کوئی تم پر غالب نے والا نہیں اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور ہا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ خت سزا دینے والا ہے۔ جب منافق اور جن کے دلوں میں روگ ہے کہتے تھے کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے ھوکے میں ڈال دیا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ بڑا زبردست اور حکمت والا ہے ۴۸-۴۹

مکہ کے مخالفین اپنے آپ کو برسر حق اور پیغمبر کے ساتھیوں کو برسر باطل سمجھتے تھے۔ اس پر ان کو اتنا یقین تھا کہ انھوں نے کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کی کہ خدایا، دونوں فریقوں میں سے جو فریق حق پر ہو تو اس کو امیاب کر اور جو فریق باطل پر ہو تو اس کو ہلاک کر دے۔ تاہم ان کا یہ یقین جھوٹا یقین تھا۔ اس قسم کا یقین ہمیشہ شیطان کی تزئین کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

شیطان نے مکہ کے لوگوں کو سکھایا کہ تم تاریخ کے مسلّمہ پیغمبروں (ابراہیمؑ و اسماعیلؑ) کے ماننے والے ہو ب کہ مسلمان ایک ایسے شخص کو مانتے ہیں جس کا پیغمبر ہونا ابھی ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ تم کعبہ کے وارث ہو جب لہ مسلمانوں کو کعبہ کی سرزمین سے نکال دیا گیا ہے۔ تم اسلاف کی روایتوں کو قائم رکھنے کے لئے لڑ رہے ہو ب کہ مسلمان اسلاف کی روایتوں کو توڑنے کے لئے اٹھے ہیں۔ شیطان نے مکہ والوں کے دلوں میں اس قسم کے خیالات ڈال کر ان کو جھوٹے یقین میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں بالکل درست کر رہے ہیں اور خدا کی مدد بہر حال ہمیں حاصل ہوگی۔

مکہ کے مخالفین ایک طرف اپنے جھوٹے یقین کو اس قسم کی چیزوں کی بنا پر سچا یقین سمجھ رہے تھے۔ دوسری طرف جب وہ دیکھتے کہ پیغمبر کے ساتھی ان سے بھی زیادہ یقین اور سرفروشی کے جذبہ کے ساتھ اسلام کے محاذ پر اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہیں تو وہ ان کے سچے یقین کو یہ کہہ کر بے اعتبار ثابت کرتے تھے کہ یہ محض ایک مذہبی جنون ہے۔ وہ ایک شخص (پیغمبر) کی خوبصورت باتوں سے جوش میں آکر دیوانے ہو رہے ہیں۔ ان کے یقین اور قربانی کی اس سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں۔

مگر جب دونوں گروہوں میں مقابلہ ہوا اور مسلمانوں کے لئے اللہ کی مدد اتر پڑی تو شیطان مخالفین اسلام کو چھوڑ کر بھاگا۔ ایک طرف خدا کی مدد سے مسلمانوں کے دل اور زیادہ قوی ہو گئے۔ دوسری طرف مخالفین کا جھوٹا یقین بے دلی اور پست ہمتی میں تبدیل ہو گیا۔ کیونکہ ان کا اعتماد شیطان پر تھا اور شیطان اب ان کو چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔

جو لوگ اللہ پر بھروسہ کریں اللہ ضرور ان کی مدد کرتا ہے۔ مگر اللہ کی مدد ہمیشہ اس وقت آتی ہے جب کہ اہل ایمان اللہ پر یقین کا اتنا بڑا ثبوت دے دیں کہ بے یقین لوگ کہہ اٹھیں کہ یہ مجنون ہو گئے ہیں۔

اسلام کی زمین

قدیم عربوں میں انسان کے اعلیٰ کردار کو بتانے کے لئے دو لفظ خاص طور پر بہت اہمیت رکھتے تھے مروّۃ اور عرض۔ مروّۃ کا لفظ مرء سے بنا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں مردانگی۔ قدیم عرب کے ذہن میں (یا مروّت) کا لفظ ان تمام خصوصیات کا جامع تھا جو ایک سچے مرد کے اندر ہونی چاہئیں۔ مثلاً حوصلہ، بہا فیاضی، عالی ظرفی، قول کا پکا ہونا، کمزوروں کی حمایت، اختلاف اور شکایت کے باوجود بہتر سلوک و جاہلی دور کا ایک شاعر کہتا ہے:

اذا المرء اعیته المروءۃ ناشئا — فمطلبها کھلا علیہ شدید

آدمی اگر جوانی میں مروءۃ کے درجہ تک پہنچنے سے عاجز رہے تو بڑھاپے میں اس کو حاصل کرنا اس کے لئے دشوار ہے۔

دوسرا لفظ عرض ہے۔ عرض کے معنی ہیں آبرو، عزت۔ یعنی آدمی میں یہ جوہر ہونا کہ وہ کچھ اخلاقیات کو لئے عزت کا سوال سمجھے اور ہر حال میں اس کو کرے خواہ اس کے کرنے میں کتنی ہی مشکل پیش آئے اور اس کچھ خلاف اخلاق باتوں کو وہ اپنی عزت اور آن کے خلاف سمجھے اور کسی حال میں اس کے قریب نہ جائے۔ جاہلی شاعر کہتا ہے:

اذا المرء لم یدنس من اللؤم عرضہ — فکل رداء یرتدیہ جمیل

آدمی اگر ذلیل حرکت سے اپنی عرض کو داغدار نہ کرے تو جو چادر بھی وہ اوڑھے وہ اس کے لئے اچھی ہے

یہ مردانگی اور آن عربوں میں کمال درجہ میں تھی۔ ان کے قول و فعل میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ جو کہتے تھے وہی کر تھے اور جو کرتے تھے وہی کہتے تھے۔ وہ وعدہ سے پھرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ اپنے دشمن کے ساتھ بھی کوئی حرکت نہیں کرسکتے تھے۔ کوئی مظلوم جب ان کو پکارتا تھا تو اس کی پکار پر دوڑنا وہ اپنے لئے فرض سمجھتے تھے سے کوئی شخص عالی ظرفی سے کم تر درجہ کے سلوک کی امید نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اپنے مخالف کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے جو واقعہ کے خلاف ہو۔ وہ جس بات کو حق سمجھ لیتے تھے اس سے ہٹنا ان کے ناممکن تھا خواہ اس کی خاطر انھیں کتنی ہی قربانی دینی پڑے۔ وہ جس معیار سے اپنے آپ کو دیکھتے تھے اسی سے دوسروں کو بھی دیکھتے تھے۔ وہ شرافت اور عالی ظرفی کو اپنی آن کا مسئلہ سمجھتے تھے اور اس کی خاطر کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

یہی انسانی کردار وہ ابتدائی بنیاد ہے جس پر اسلام کی بلند عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ جن لوگوں اعلیٰ اوصاف ہوں وہی خدا کے دین کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ جو لوگ ان ابتدائی خصوصیات سے خالی ہوں وا

اس بنیاد ہی سے محروم ہیں جس کے اوپر دین کی بلند و بالا عمارت قائم ہوتی ہے۔

یہی حقیقت ہے جو ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

تجدون الناس معادن کمعادن الذهب والفضة خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام اذا فقهوا۔ وتجدون خیر الناس فی هذا الشان اشدهم له کراهیة حتی یقع فیه۔ وتجدون شر الناس ذا الوجهین الذی یاتی هؤلاء بوجه و هؤلاء بوجه (بخاری و مسلم)

تم لوگوں کو مثل کانوں کے پاؤ گے (جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں) ان میں جو لوگ قبل از اسلام بہتر تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوں گے جبکہ وہ دین کی سمجھ پیدا کرلیں۔ اور تم اس چیز (عہدہ) کے معاملہ میں سب سے بہتر اس شخص کو پاؤ گے جو اس سے انتہائی بے رغبت ہو اور تم لوگوں میں سب سے برا اس شخص کو پاؤ گے جو دو منھ والا ہو۔ وہ ایک کے پاس ایک منھ لے کر جائے اور دوسرے کے پاس دوسرا منھ۔

زمین میں طرح طرح کی معدنی کانیں ہیں۔ کسی سے کوئلہ جیسی معمولی چیز نکلتی ہے اور کسی سے سونے چاندی جیسی قیمتی دھاتیں۔ یہی حال انسان کا ہے۔ انسان بھی طرح طرح کی صلاحیتوں کے ہیں۔ ہر آدمی گویا ایک کان ہے۔ ان میں سے کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کو "کھودا" جائے تو اس کے اندر سے کوئلہ اور کنکر جیسی چیزیں نکلیں گی۔ اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو کھودئے تو اس کے اندر سے سونے جیسا قیمتی کردار برآمد ہوگا۔ یہی چیز اسلام میں آدمی کے مقام کو متعین کرتی ہے۔ جو آدمی اپنے اندر کمزور عمل اور سطحی نفسیات لئے ہوئے ہو وہ جب اسلام میں آئے گا تو یہاں بھی اس سے کمزوری اور سطحیت کا مظاہرہ ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی فطرت میں طاقت ور ارادہ اور اعلیٰ جذبات کا خزانہ چھپائے ہوئے ہو وہ جب اسلام کی صف میں آئے گا تو اس سے طاقت ور کردار اور برتر سلوک جیسی چیزوں کا اظہار ہوگا۔

حدیث میں بغرض وضاحت دونوں قسم کے انسانوں کی ایک ایک مثال دی گئی ہے۔ ایک انسان وہ ہے جو سونا انسان ہے اور دوسرا انسان وہ ہے جو کوئلہ انسان ہے — "سونا انسان" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جاہ اور اقتدار سے انتہائی حد تک بے رغبت ہوتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی میں جیتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں یہ تمنا جگہ نہیں پکڑتی کہ وہ اپنی بڑائی کا مینار قائم کرے۔ اس کے برعکس "کوئلہ انسان" کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ موقع پرست ہوتا ہے۔ وہ حالات کے لحاظ سے کلام کرتا ہے۔ جہاں جیسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہاں اس کے مطابق الفاظ بول دیتا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ بہترین لوگ ہیں اور دوسری قسم کے لوگ بدترین لوگ۔

ذرہ سے پہاڑ تک

ایک پرانی کہاوت ہے: "اگر تم پہاڑ کو سرکانا چاہتے ہو تو پہلے ذروں کو سرکانا سیکھو" آدمی اگر یکبارگی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانا چاہے تو وہ اس کو نہیں ہٹا سکتا۔ لیکن اگر وہ اس راز کو جان لے کہ پہاڑ بہت سے چھوٹے چھوٹے ذروں سے مل کر بنا ہے تو وہ ذروں سے اپنا عمل شروع کرکے یقیناً ایک روز پہاڑ تک پہنچ جائے گا۔ ذروں کو پکڑتے پکڑتے کوئی بھی شخص پہاڑ کو پکڑ سکتا ہے۔ مگر جو آدمی پہلے ہی دن پہاڑ کو پکڑنا چاہے وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

زندگی میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ ناممکن صرف یہ ہے کہ ممکن چیز کو ناممکن طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ ایک ایک اینٹ رکھ کر یقینی طور پر اپنے لئے ایک مکان تیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ یکایک پورا مکان آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو ایسا مکان کبھی آپ کے لئے تیار نہ ہوگا۔ دنیا کے بنانے والے نے اس دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جزء سے کل تک پہنچنے کا قانون رائج ہے۔ آدمی کو قدرت کے اسی قانون کی پیروی کرنی ہے۔ اس دنیا میں اس کے سوا کوئی اور طریقہ کامیابی حاصل کرنے کا نہیں۔

اکثر لوگوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ "ذرہ" سے اپنا کام شروع کرنا نہیں چاہتے بلکہ پورے "پہاڑ" کو یکبارگی اپنی جگہ سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک ایک ذرہ سے نمٹنے میں تو بہت دیر لگے گی، کیوں نہ پورے پہاڑ کو اکٹھے ہی سر کر لیا جائے۔ مگر یہ بہت بڑی بھول ہے۔ ذرہ ذرہ سے چلنے والے کے لئے تو کسی نہ کسی دن پہاڑ کی منزل آجائے گی۔ مگر جو شخص پورے پہاڑ پر بیک وقت قابو پانا چاہے گا وہ کبھی اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہوگا، خواہ اس میں وہ کروروں سال بتا دے۔

ایک مقام پر دو بھائی تھے۔ ایک بھائی فوری طور پر بڑا فائدہ چاہتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا "دے مولا چھین کرور کی چوتھائی"۔ پہلے وہ ایک عرصہ تک عملیات اور تسخیری ورزشیں کرتا رہا تاکہ جنوں کو قبضہ میں کرے اور ان کے ذریعہ سے اچانک کوئی بڑا خزانہ حاصل کرلے۔ مگر سالہا سال کی محنت کے باوجود وہ کسی جن کو مسخر نہ کر سکا۔ اس کو نہ کوئی جن ملا اور نہ کوئی خزانہ۔ اس کے بعد اس نے لاٹری اور معمے کا تجربہ شروع کیا۔ سارے مہینہ اس کا یہ مشغلہ رہتا کہ لاٹری کے ٹکٹ خریدتا اور معمے بھر کر روانہ کر دیتا۔ اس میں بھی کتنے سال گزر گئے۔ مگر چھپر پھاڑ کر دولت اس کے اوپر نہیں برسی۔ آخرکار مایوسی کے عالم میں ایک روز اس کا انتقال ہوگیا۔

دوسری طرف اس کے دوسرے بھائی نے یہ کیا کہ پہلے انھوں نے کتابت سیکھی۔ ایک عرصہ تک وہ اخباروں اور رسالوں میں کتابت کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک پرنٹنگ پریس میں ملازمت کرلی۔ جب چھپائی کا کام اچھی طرح آگیا تو انھوں نے ایک چھوٹا سا ہینڈ پریس خرید لیا۔ اب وہ مزید ترقی کرکے ایک بڑا چھاپہ خانہ کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ اس میں وہ اور ان کے سب بچے لگے ہوئے ہیں۔ وہ عزت کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کی سب ضرورتیں

فراغت کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں ـــــــ ایک بھائی نے بیک وقت پورے پہاڑ کو قبضہ میں لینا چاہا، وہ ناکام ہو گیا۔ دوسرا بھائی ذرہ ذرہ کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھا، وہ کامیاب رہا۔

اسماعیل میرٹھی اردو کے مشہور شاعر اور ادیب گزرے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

یوں ہی بوندیوں بوندیوں بھرے جھیل تال　　　یوں ہی کوڑی کوڑی ہوا جمع مال

یہ شعر ایک ایسی حقیقت بیان کر رہا ہے جو زندگی کے تمام معاملات میں صد فی صد درست ہے۔ گنگا یا اور کوئی بڑا دریا میدانی علاقہ میں سمندر کا ایک پھیلا ہوا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس کو اس پہاڑی مقام پر دیکھیں جہاں سے وہ شروع ہوتا ہے تو آپ پائیں گے کہ میدان کا عظیم دریا پہاڑ کا معمولی چشمہ ہے۔ یہاں کی برفانی بلندی پر آپ کو بالکل دوسرا منظر دکھائی دے گا۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر پانی کی چھوٹی چھوٹی بے شمار دھاریں بہہ بہہ کر نیچے ایک مقام پر آکر ملتی ہیں۔ یہاں ان کے ملنے سے دریا بنتا ہے۔ یہ دھاریں الگ الگ بس پانی کی سوت سی ہوتی ہیں۔ مگر ان کے یکجا ہونے سے ایک بڑا دھارا بہہ نکلتا ہے جو آگے میدانی علاقہ میں پہنچ کر دریا کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ پہاڑ کی چوٹی سے پہلے ہی قدم پر ایک گنگا بہا دے تو ایسا گنگا کبھی وجود میں نہ آئے گا۔ گنگا پانی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی سوتوں سے مل کر بنتا ہے نہ کہ اچانک پانی کا سمندر بہہ پڑنے سے۔

معتدل زندگی

جاپان میں ایک شخص ہے جس کا نام ہے شیگی چیو ایزومی۔ وہ دنیا کا سب سے زیادہ معمر آدمی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش ۲۹ جون ۱۸۶۵ میں ہوئی تھی۔ اتنی زیادہ عمر کے باوجود ابھی تک اس کی جسمانی حالت بہت اچھی ہے۔ وہ جنوبی جاپان کے ایک جزیرہ ٹوکو نوشیما میں ایک نارمل آدمی کی طرح رہتا ہے۔ غیر معمولی طور پر لمبی عمر کے باوجود تندرست ہونے کی وجہ سے اس نے بہت شہرت پائی ہے۔ وہ جاپان میں آنے والے سیاحوں کی فہرست کا ضروری جزء بن گیا ہے۔ چنانچہ ہر روز تقریباً ۲۰۰ سیاح اس کو دیکھنے کے لئے اس جاپانی جزیرہ میں پہنچتے ہیں۔ اس سے ملنے والے عام طور پر ایک سوال ضرور کرتے ہیں: "آپ کے نزدیک زندگی گزارنے کا بہتر طریقہ کیا ہے" ایزومی کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ:

Live an ordinary life and don't go to extremes

معمولی زندگی گزارو اور کسی معاملہ میں انتہا پسندی تک نہ جاؤ (ہندستان ٹائمس ۸ جولائی ۱۹۸۱)

یہ بظاہر سیدھی سادی بات بہت قیمتی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی اگر کھانے، کپڑے، مکان اور دوسری ضروریات زندگی میں سادہ اور معمولی طریقہ کو اپنائے تو وہ کہیں زیادہ سکھی اور تندرست رہے اور بہت سی الجھنوں اور دشواریوں سے اپنے آپ بچ جائے۔ زیادہ تر مسئلے غیر ضروری تکلفات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ان سے بچنے کی سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ اس قسم کے غیر ضروری تکلفات کو اپنی زندگی میں شامل ہی نہ کیا جائے۔

آپ کسی بھی مقام پر دونوں قسم کی مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک شخص وہ ہے جس پر ہر وقت یہ احساس چھایا رہتا ہے کہ اس کی پوزیشن خراب نہ ہو۔ وہ اپنے اس مزاج کی وجہ سے مہمانوں کی تواضع میں بے حد تکلف کرتا ہے۔ گھر کو سجانے میں اپنی بساط سے زیادہ پیسہ خرچ کرتا ہے۔ گھر سے باہر نکلنا ہو تو کافی وقت اس کو اپنے بنانے سنوارنے میں لگانا پڑتا ہے۔ تعلقات اور بات چیت میں خواہ مخواہ تصنع برتتا ہے۔ کوئی سفر کرنا پڑے تو ہر قسم کے لوازم کی فراہمی میں اتنا زیادہ سامان اپنے ساتھ لاد لیتا ہے کہ اس کا سفر غیر ضروری طور پر ایک مصیبت بن جائے۔ ایسا آدمی کبھی خوش نہیں ہوگا اور نہ اس کی صحت اچھی رہے گی۔

دوسری طرف وہ شخص ہے جو ضرورت دیکھتا ہے نہ کہ پوزیشن۔ جب کوئی شخص اس کے یہاں آتا ہے تو گھر میں جو کچھ موجود ہوتا ہے وہ بے تکلف اسے کھلا دیتا ہے۔ مکان کے معاملہ میں وہ صرف صفائی کو ضروری سمجھتا ہے نہ کہ سجاوٹ اور تزئین کو۔ اس کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو اسی حال میں باہر چلا جاتا ہے جیسے کہ وہ گھر کے اندر تھا۔ اس کا سفر اتنا ہلکا پھلکا ہوتا ہے کہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کب گیا تھا اور کب واپس آگیا۔ ایسا آدمی ہمیشہ خوش رہے گا۔ اس کی صحت بھی اچھی ہوگی۔ اس کے دماغ پر کسی قسم کا تناؤ نہیں ہوگا۔ وہ دن کو نشاط کے ساتھ کام کرے گا اور رات کو چین کی نیند سوئے گا۔

اسی طرح یہ ایک واقعہ ہے کہ انتہا پسندی اکثر حالات میں آدمی کے لئے مشکلات کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے مختلف اسباب سے ایک شخص کا دوسرے سے ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے مواقع پر لوگ عام طور پر انتہا پسندانہ طریقوں کی طرف جھک جاتے ہیں۔ وہ اعتدال اور توسط کا طریقہ اختیار نہیں کر پاتے بلکہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا پسند کرتے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ ایک فریق کی انتہا پسندی دوسرے فریق کے اندر جوابی انتہا پسندی پیدا کرتی ہے اور مسئلہ ختم ہونے کے بجائے اور زیادہ الجھتا چلا جاتا ہے۔ ایک مسئلہ کی جگہ کئی مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ دوسری مثال بھی ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے خلاف با[ت] کا شدید اثر لیتے ہیں۔ جو دوسروں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں ہمیشہ آخری انتہا پر چلے جاتے ہیں، جن کی دوستی بھی حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور دشمنی بھی حد سے بڑھی ہوئی، ایسے لوگ کبھی پرسکون زندگی کے مالک نہیں بن سکتے۔ اس کے برعکس جو لوگ خلاف مزاج باتوں کو نظر انداز کریں، جو دوسروں کے بارے میں ہمیشہ اعتدال کے ساتھ رائے قائم کریں، جو دوستی میں بھی درمیانی راہ اختیار کریں اور دشمنی میں بھی درمیانی راہ۔ ایسے لوگ ہمیشہ چین کے ساتھ رہیں گے۔ ان کا دن بھی سکون کے ساتھ گزرے گا اور رات بھی۔ یہی وہ زندگی ہے جس کے متعلق ویلنگٹن نے کہا ہے —— موت کے بعد جنت میں رہنے کے لئے موت سے قبل بھی جنت میں رہنا ہوگا۔

نوٹ: یہ تقریر ۲-۱ اگست ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

اسلام کی دو قسمیں

کیمونزم ایک سماجی نظریہ ہے۔ اس کا تعلق آدمی کی اپنی ذات سے نہیں بلکہ خارجی نظام سے ہے۔ کسی شخص کو جب کیمونزم کی دریافت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس نے اپنے تزکیہ یا اپنی نجات کے ایک راستہ کو دریافت کیا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسا سماجی نظریہ ملا ہے جس سے وہ خارجی دنیا میں اپنے حوصلوں کو پورا کرسکتا ہے۔ ایک کیمونسٹ قربانی بھی دیتا ہے مگر یہ قربانی خارجی انقلاب کے لئے ہوتی ہے نہ کہ حقیقۃً کسی داخلی انقلاب کے لئے۔ اس کے برعکس ایک مومن کو جب تقویٰ کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ اس کے لئے مکمل طور پر ایک داخلی واقعہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے ایک اندرونی انقلاب کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

اسی طرح اسلام کو پانے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک وہ اسلام ہے جس کو آدمی اپنے باہر باہر پاتا ہے۔ دوسرا اسلام وہ ہے جو آدمی اپنے اندرون میں پاتا ہے۔ اسلام کو اپنے باہر کی سطح پر پانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کیمونزم کو پالے۔ ایسا اسلام شکل کے اعتبار سے اسلام ہوسکتا ہے۔ مگر حقیقی اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حقیقی اسلام وہ ہے جو اندر کی سطح پر ملے۔ جو پانی اور ہوا کی طرح آدمی کی غذا بن جائے۔

اسلام کو باہر کی سطح پر پانا یہ ہے کہ آدمی اسلام کو رسمی اعمال کی صورت میں پائے۔ کسی شخصیت یا کسی ادارہ کی سطح پر اس کو اسلام ملا ہو۔ کسی خارجی شور وغل کی صورت میں اس نے اسلام کی تعبیر حاصل کی ہو۔ اپنے سے باہر کچھ بحثیں اور تقریریں ہوں جن کو اس نے اسلام سمجھ لیا ہو۔ جلسوں اور مظاہروں میں مشغول ہونا اس کو اسلام نظر آتا ہو۔ اسلام کو اندر کی سطح پر پانا وہ ہے جب کہ اسلام آدمی کی اندرونی زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہو۔ ایسے آدمی کو اسلام دل کی تڑپ کی صورت میں ملتا ہے۔ وہ اس کے لئے خدا اور آخرت میں گم ہونے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے ایک اندرونی انقلاب کا پیغام بن جاتا ہے۔

پہلا اسلام احتساب خویش کا جذبہ ابھارتا ہے اور دوسرا اسلام احتساب اغیار کا۔ پہلا اسلام اعتراف کا مزاج بناتا ہے اور دوسرا اسلام لامتناہی بحثوں کا۔ پہلے اسلام میں آدمی ہر مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے اور دوسرے اسلام میں ہر مسئلہ کو دوسروں کا مسئلہ۔ پہلے اسلام کو پاکر آدمی کی زبان بند ہو جاتی ہے اور دوسرے اسلام کو پاکر آدمی کی زبان ہمیشہ سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ پہلے اسلام میں آدمی کی سرگرمیاں آخرت کے میدان میں جاری ہوتی ہیں اور دوسرے اسلام میں دنیا کے میدان میں۔ پہلے اسلام میں آدمی ہمہ تن خدا کی طرف دوڑتا ہے اور دوسرے اسلام میں خدا کا نام لے کر خود اپنی طرف۔

پلاسٹک کے پھل اور پھول

آجکل پلاسٹک کے پھول اور پھل بنتے ہیں۔ دیکھنے میں بالکل پھول اور پھل کی طرح معلوم ہونگے لیکن سونگھئے تو اس میں پھول کی خوشبو نہیں اور منھ میں ڈالئے تو اس میں پھل کا مزہ نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں دین داری کی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے۔ بظاہر اس میں دھوم کی حد تک دین دکھائی دے گا۔ لیکن قریب سے تجربہ کیجئے تو وہی چیز موجود نہ ہوگی جو دین کا اصل خلاصہ ہے: اللہ کا ڈر اور انسان کا درد —— پلاسٹک کے دور میں شاید دین داری بھی پلاسٹک کی دین داری بن کر رہ گئی ہے۔

لوگ دین دار ہیں مگر کوئی شخص اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کوئی شخص اللہ کی خاطر اپنی اکڑ ختم کرنا نہیں جانتا۔ ذاتی فائدہ کی خاطر بے شمار لوگ اپنے اختلاف اور شکایت کو بھول کر دوسروں سے جڑے ہوئے ہیں مگر خدا کی زمین پر کوئی نہیں جو خدا کے لئے اپنے اختلاف وشکایات کو بھول کر دوسرے سے جڑ جائے۔

دین اصلاً اس کا نام ہے کہ آدمی اس حقیقت کو پا جائے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو بنایا ہے۔ وہ موت کے بعد تمام انسانوں کو جمع کرکے ان سے حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی جنت میں داخل کرے گا یا ابدی جہنم میں۔ یہ حقیقت اتنی سنگین ہے کہ اگر وہ فی الواقع کسی کے دل ودماغ میں اتر جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں انتہائی حساس ہو جاتا ہے جو آدمی کو جہنم کی آگ میں پہنچانے والی ہے اور ان تمام چیزوں کا انتہائی مشتاق ہو جاتا ہے جو آدمی کو جنت کے باغوں کا مستحق بنانے والی ہیں۔ وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور ہر چیز سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی انفرادی ہستی کو خدا کی عظیم تر ہستی میں کھو دیتا ہے۔

خدا اور آخرت کے بارے میں اس کی بڑھی ہوئی حساسیت اس کو بندوں کے بارے میں بھی انتہائی محتاط اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ ایک انسان سے بدخواہی کرتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرا رہا ہے۔ بندوں کے ساتھ سرکشی کا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے کہ ہر آدمی اپنے ساتھ جہنم کے فرشتوں کی فوج لئے ہوئے ہے۔ اپنے صاحب معاملہ افراد سے بے انصافی کرکے اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے اپنے آپ کو جہنم کے گہرے غار میں دھکیل دیا ہے۔ اب کوئی انسان اس کی نظر میں محض ایک انسان نہیں ہوتا بلکہ ہر انسان ایک ایسا وجود ہوتا ہے جس کے ساتھ خدا اپنے تمام فرشتوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہو۔

موت کو یاد کرو

کچھوا پانچ سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ درخت ایک ہزار سال تک زمین پر کھڑا رہتا ہے۔ پہاڑ اور دریا کروڑوں سال تک اپنی شان کو باقی رکھتے ہیں۔ مگر انسان کی عمر پچاس سال یا سو سال سے زیادہ نہیں۔ انسان جو بظاہر تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف اور افضل ہے وہ سب سے کم زندگی پاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ مختصر زندگی بھی ناکامیوں کی ایک مسلسل داستان کے سوا اور کچھ نہیں۔ آدمی کی زندگی غم اور دکھ سے اتنا زیادہ بھری ہوئی ہے کہ خوشی کے لمحات غفلت کی چند جھلکیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، امیدوں کی مسلسل پامالی کا نام زندگی ہے اور بالآخر اس قسم کے دردناک ایام گزارتے ہوئے ایک دن موت کے آگے شکست کھا جانا۔

ایک غریب کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ اس کے پاس بڑا مکان نہیں۔ اس کے پاس ضروریات زندگی کے لئے کافی پیسہ نہیں۔ مگر دوسری طرف ان لوگوں کا حال بھی بہت زیادہ مختلف نہیں جن کو ایک غریب آدمی رشک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دولت مند آدمی کے لئے پیسہ ہونا اس سے زیادہ بڑے مسائل پیدا کرتا ہے جو غریب کو پیسہ نہ ہونے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ایک مشہور آدمی جس کے گرد انسانوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہو اندر سے اس قدر بے چین ہوتا ہے کہ رات کو گولی کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی۔ غرض اس دنیا میں ہر آدمی دکھی ہے، کوئی ایک صورت میں اور کوئی دوسری صورت میں۔

بالفرض کوئی شخص ناموافق حالات سے بچ جائے اور اس خوش قسمتی کو حاصل کرلے جس کو سکھ اور چین کہتے ہیں تب بھی کتنے دن تک۔ اگر کوئی شخص اتفاقی اسباب کے تحت خوشیوں کا خزانہ اپنے گرد جمع کرلے تو وہ بھی بس صبح سے شام تک کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد اچانک موت کا بے رحم فرشتہ آئے گا اور اس کو اس طرح پکڑے گا کہ نہ اس کی دولت اس کو بچا سکے گی اور نہ اس کی فوج۔ ہوائی جہاز کے مسافر پر بھی موت اسی طرح قابو پالیتی ہے جس طرح ایک پیدل چلنے والے آدمی پر۔ وہ عالی شان محلوں میں بھی اسی طرح فاتحانہ داخل ہوجاتی ہے جس طرح ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں۔ موت آدمی کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔

موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ آج سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ وہ کامیابی کو زندگی کے اُس پار تلاش کرے۔ کامیاب وہ ہے جو موت سے یہ سبق لے لے۔ جو شخص یہ سبق لینے سے محروم رہے اس کی خوشیوں کے چراغ بہت جلد بجھ جائیں گے۔ وہ اپنے کو ایک ایسے بھیانک اندھیرے میں پائے گا جہاں وہ ابدالآباد تک ٹھوکریں کھاتا رہے اور کبھی اس سے نکل نہ سکے۔

اس وقت کیا ہوگا

بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ مجھے قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سناؤ (اقرأ علیّ) میں نے کہا، اے خدا کے رسول میں آپ کو قرآن سناؤں اور وہ آپ کے اوپر اترا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں، مجھے پسند ہے کہ میں قرآن کو اپنے سوا دوسرے سے سنوں۔ میں نے سورۂ نساء پڑھنی شروع کی۔ یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا: فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علیٰ ھؤلاء شہیدا (پھر کیا ہوگا جب ہم ہر قوم سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تم کو گواہ بنا کر لائیں گے) آپ نے فرمایا، بس کرو۔ میں نے دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے (فاذا عیناہ تذرفان)

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب خدا کی عدالت قائم ہوگی۔ کسی کے لئے ڈھٹائی اور انکار کا موقع نہ ہوگا۔ وہی شخص جس کو دنیا میں لوگوں نے بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اسی کو خدا کی طرف سے اس خاص بندہ کی حیثیت سے سامنے لایا جائے گا جس کو خدا نے اپنی طرف سے لوگوں کو آنے والے دن سے باخبر کرنے کے لئے چنا تھا۔ جس کو لوگوں نے اپنے درمیان سب سے کمزور آدمی سمجھ لیا تھا وہی اس وقت خدا کے حکم سے وہ شخص ہوگا جس کی گواہی پر لوگوں کے لئے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے۔

ان لوگوں کا اس وقت کیا حال ہوگا جو دنیا میں بہت بولنے والے تھے مگر وہاں اپنے آپ کو گونگا پائیں گے۔ جو دنیا میں عزت اور طاقت والے سمجھے جاتے تھے وہاں اپنے آپ کو بالکل بے زور دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ جب ان کا ظاہری پردہ اتارا جائے گا اور لوگ دیکھیں گے کہ دین کا لبادہ پہننے والے دین سے بالکل خالی تھے۔ جب کتنی سفیدیاں کالی نظر آئیں گی اور کتنی رونقیں اتنی قبیح ہوجائیں گی کہ لوگ اس کی طرف نظر کرنے سے بھی گھبرائیں گے۔

موجودہ دنیا میں لوگ مصنوعی غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ کسی کے لئے خوبصورت الفاظ اس کی اندرونی حالت کا پردہ بنے ہوئے ہیں اور کسی کے لئے اس کی مادی رونقیں۔ مگر آخرت میں لوگوں کے الفاظ بھی ان سے چھن جائیں گے اور ان کی مادی رونقیں بھی۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں سامنے آجائے گا۔ کیسا سخت ہوگا وہ دن۔ اگر آج لوگوں کو اس کا اندازہ ہوجائے تو ان کے الفاظ کی شدت ختم ہوجائے، کسی چیز میں ان کے لئے لذت باقی نہ رہے۔ دنیا کی عزت بھی ان کو اتنی ہی بے معنی معلوم ہو جتنا دنیا کی بے عزتی۔

مومن وہ ہے جو خدا کی پکار پر فوراً لبیک کہے

سورہ مائدہ میں یہ حکم اترا کہ اے ایمان والو، شراب اور جوا اور بت اور پانسہ بڑے گندے شیطان کے کام ہیں ان سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو۔ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمھارے درمیان دشمنی اور کینہ ڈال دے۔ اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم لوگ اس سے باز آؤ گے (فهل انتم منتهون) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن کا یہ حصہ اترا تو حسب عادت آپ نے اس کو پڑھ کر صحابہ کو سنایا۔ اس کو سناتے ہوئے جب آپ فهل انتم منتهون تک پہنچے تو صحابہ میں سے ہر شخص پکار اٹھا: انتهينا يا رب انتهينا يا رب (اے ہمارے رب ہم باز آئے، اے ہمارے رب ہم باز آئے)

لوگوں کے لئے سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو لوگوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے

معمر تابعی کہتے ہیں کہ صحابہ یہ کہا کرتے تھے کہ تمھارا سب سے زیادہ خیرخواہ وہ ہے جو تمھارے بارے میں اللہ سے ڈرے (انصح الناس لك من خاف الله فيك، جامع العلوم والحكم ۷)

وہ رسول اللہ کے فیصلہ سے ہٹنا نہیں جانتے تھے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں رومیوں سے مقابلہ کے لئے ایک لشکر تیار فرمایا تھا۔ تین ہزار کے اس لشکر میں بڑے بڑے صحابہ شامل تھے۔ ان کے اوپر اسامہ بن زید کو امیر مقرر فرمایا تھا جو نسبتاً ایک نوجوان شخص تھے۔ حسن بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو جیش اسامہ ابھی راستہ میں تھا۔ اسامہ بن زید رض نے حضرت عمر سے کہا کہ آپ خلیفہ رسول کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ ہم کو مدینہ لوٹنے کی اجازت دے دیں۔ ضرورت ہے کہ اس وقت سب سے پہلے مرتدین کا مقابلہ کیا جائے جو مدینہ کے لئے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ حضرت عمر چلے اور حضرت ابوبکر کے پاس آئے۔ انھوں نے آپ کو حضرت اسامہ کا پیغام پہنچایا۔ حضرت ابوبکر نے کہا: اگر کتے اور بھیڑیے مجھ کو پھاڑ کھائیں تب بھی میں اس فیصلہ کو بدلنے والا نہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا: انصار نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ان کا یہ پیغام آپ تک پہنچاؤں کہ وہ ایک ایسا امیر چاہتے ہیں جو عمر میں اسامہ سے زیادہ ہو۔ حضرت ابوبکر اس وقت بیٹھے ہوئے تھے یہ سن کر جھپٹ پڑے اور حضرت عمر کی داڑھی پکڑ کر کہا: اے خطاب کے لڑکے! تیری ماں تجھ کو گم کرے اور معدوم کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو امیر مقرر کیا ہے اور تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں ان سے امارت چھین لوں (ثكلتك امك وعدمتك يا ابن الخطاب، استعمله رسول الله صلى الله عليه وسلم وتامرني ان انزعه، البداية والنهاية جلد ٦)

اللہ کا نام آتے ہی گردن جھکا دینا

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم میرے حجرے میں تھے۔ اتنے میں آپ نے تیز تیز آوازیں سنیں۔ دروازہ کے باہر دو آدمی جھگڑا کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے کو قرض دیا تھا جس کے ذمہ قرض تھا وہ کہہ رہا تھا

کہ قرض کی مقدار میں کچھ کمی کر دو۔ مگر قرض دینے والا اس کو نہیں مان رہا تھا۔ اس نے غصہ میں آکر کہا: واللہ لا افعل (خدا کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل کر ان کے پاس گئے اور فرمایا: کون ہے قسم کھانے والا جو اللہ پر قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نیکی نہیں کروں گا"۔ آپ کی زبان سے یہ سنتے ہی وہ شخص نرم پڑ گیا اور بولا: وہ شخص میں ہوں اے خدا کے رسول۔ اب اس کے لئے وہی ہے جو وہ پسند کرے (انا یا رسول اللہ، فلہ ای ذلک احب، متفق علیہ)

نجات ان کے لئے جو رسول اور اصحاب رسول کے نمونے پر چلیں

ان الیھود اختلفوا علی احدی وسبعین فرقۃ وان النصاری اختلفوا علی اثنین وسبعین فرقۃ وستفترق ھذہ الامۃ علی ثلاث وسبعین فرقۃ کلھا فی النار الا واحدۃ۔ قالوا من ھم یا رسول اللہ قال: ما انا علیہ واصحابی

یہود اکہتر فرقوں میں بٹ گئے اور نصاری بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ سب کے سب آگ میں جائیں گے سوا ایک کے۔ لوگوں نے پوچھا وہ کون ہیں اے اللہ کے رسول، فرمایا: وہ جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔

(مختصر تفسیر ابن کثیر جلد ثالث صفحہ ۶۶)

اللہ کی یاد سب سے بڑی عبادت ہے

قال قتادہ قال ابن عباس: تذاکر العلم بعض لیلۃ احب الیّ من احیائھا (جامع بیان العلم، جزء اول، صفحہ ۲۴) عبداللہ بن عباس رضی نے کہا: رات کے کچھ حصہ میں دینی مذاکرہ کرنا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ساری رات عبادت کروں۔

انسان سے کم، اللہ سے زیادہ

قال ثور بن یزید۔ قرأت فی بعض الکتب ان عیسی علیہ السلام قال: یا معشر الحواریین کلموا اللہ عزوجل کثیرا وکلموا الناس قلیلا۔ قالوا: کیف نکلم اللہ کثیرا۔ قال: اخلوا بمناجاتہ اخلوا بدعائہ (اخرجہ ابو نعیم)

ثور بن یزید کہتے ہیں۔ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین سے کہا۔ اے لوگو! اللہ سے زیادہ باتیں کرو اور انسانوں سے کم باتیں کرو۔ انھوں نے پوچھا۔ کس طرح ہم اللہ سے زیادہ باتیں کریں۔ حضرت عیسیٰ نے کہا: —— تنہائیوں میں اللہ سے سرگوشیاں کرو، تنہائیوں میں اللہ سے دعا مانگو۔

اللہ والے وہ ہیں جو قرآن والے ہیں

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں کچھ اللہ والے ہوتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ اے خدا کے رسول وہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا: وہ قرآن والے ہیں (عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ لِلّٰہِ اَھْلِیْنَ من الناس، قیل من ھم یا رسول اللہ قال اھل القرآن، سنن الدارمی)

محبت کے بجائے نفرت

"میں مراد آباد میں پیدا ہوا۔ پھر دس برس بجنور میں رہا۔ ۱۶ برس دہلی میں اور اب ۳۵ برس سے حجاز میں ہوں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتوے کی بنا پر میں ہندستان کو دارالحرب جانتا تھا اور اس کے قیام کو حرام۔ اسی نظریہ کے تحت انگریزی دور میں ہندستان سے ہجرت کی، بلکہ ہجرت شرعی سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ معاملہ میری نظر میں اتنا سنگین تھا کہ حجاز آنے کے بعد دوبارہ ہندستان واپس جانے کے تصور کو بھی میں ناجائز خیال کرتا تھا۔ ایک بار میں بیوی کے ساتھ حج کے لئے گیا ہوا تھا۔ عرفات کا میدان تھا اور عصر و مغرب کے درمیان کا وقت۔ یہ وقت میدان عرفات میں گناہوں کی بخشش کا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ یہ گناہوں کی معافی کا وقت ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ حقوق العباد کا ہوتا ہے۔ مجھ سے تمھارے حقوق کی ادائگی میں جو کوتاہی ہوئی ہو اس کو معاف کر دو۔ بیوی نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ تم مجھ کو ہندستان لے جاکر ایک بار مجھے میرے عزیزوں سے ملا دو — ہندستان کا نام سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں اور ہندستان۔ پھر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ایک طرف دوزخ ہو اور دوسری طرف ہندستان تو تم دونوں میں سے کس کو ترجیح دوگے۔ اس کے بعد میں نے جو فیصلہ کیا وہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں"

یہ ایک بزرگ کی خودنوشت کہانی کا ایک حصہ ہے جو انھوں نے دہلی کے ایک اردو روزنامہ (۵ اگست ۱۹۸۱) میں شائع کی ہے۔ یہ کوئی ایک کہانی نہیں، اس قسم کی ان گنت کہانیاں ہیں جو ساری مسلم دنیا میں بکھری ہوئی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ایسے بے شمار لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے غیر مسلم قوموں کو اسلام کا حریف سمجھ کر ان سے نفرت کی، مگر وہ ان کو اسلام کا مدعو اور مخاطب سمجھ کر ان سے محبت نہ کر سکے۔ ان خیالات کے تحت بے شمار لوگ ایسے ہجرت اور جہاد میں مصروف رہے جس کا کوئی فائدہ نہ دینی صورت میں نکلنے والا تھا اور نہ دنیوی صورت میں۔

کیسی عجیب بات ہے۔ لوگوں نے ہندستان کو دار حرب سمجھا مگر وہ اس کو دار دعوت نہ سمجھ سکے۔ ہندوؤں کو انھوں نے غیر قوم قرار دیا مگر وہ ان کو مدعو قوم قرار نہ دے سکے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو لوگوں نے شیطان کے بندے کہہ کر ان کے خلاف جہاد کیا مگر وہ ان کو خدا کے بندے سمجھ کر ان کو خدا سے قریب لانے کی کوشش نہ کر سکے۔ انھوں نے مسلم حکمرانوں اور بادشاہوں کو ظالم ٹھہرا کر ان کی ہلاکت کے منصوبے بنائے مگر وہ ان کو اپنا بھٹکا ہوا بھائی جان کر ان کی اصلاح کی خیر خواہانہ کوشش نہ کر سکے۔ کیسی عجیب تھی یہ ہجرت اور کیسا عجیب تھا یہ جہاد۔ اس عجیب و غریب ہجرت اور جہاد کے نتیجہ میں اگر موجودہ دنیا میں اسلام کو غلبہ حاصل نہ ہو سکا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

نادان دوستوں سے بچاؤ

ایک شخص کے پاس ایک گدھا تھا۔ وہ اس گدھے پر سواری کرتا تھا۔ ایک روز آدمی اس پر چڑھا تو گدھے نے اس کو زمین پر پٹک دیا۔ آدمی کو سخت چوٹ آئی۔ مالک کی چوٹ دیکھ کر گدھا سنجیدہ ہوگیا اور اس کو دوبارہ اپنی پیٹھ پر بٹھا کر روانہ ہوا۔ مالک خاموش ہوگیا کہ دیکھو یہ گدھا کہاں جاتا ہے۔ گدھا اس کو لے کر سیدھا اسپتال پہنچا۔ آدمی کے محلہ والوں کو جب معلوم ہوا کہ گدھے نے اس کو پیٹھ سے گرادیا تھا اور اس کے بعد اس کو اٹھا کر اسپتال لے گیا تو انھوں نے اس آدمی کو مبارک باد دی کہ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تم کو ایسا اچھا گدھا ملا ہے۔ آدمی نے کہا: ہاں گدھا تو اچھا ہے مگر وہ مجھ کو جہاں لے گیا وہ مویشیوں کا اسپتال تھا۔

یہ ایک تمثیل ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اخلاص کے ساتھ عقل بھی ضروری ہے۔ آدمی اگر بے وقوف ہو تو اس کا اخلاص بھی ویسا ہی ہوگا جیسا مذکورہ گدھے کا اخلاص۔ وہ ایک آدمی کی تکلیف پر دکھی ہوگا اور اس کو اپنی پیٹھ پر لاد کر اسپتال لے جائے گا۔ مگر وہ جس اسپتال میں اس کو پہنچائے گا وہ "مویشیوں" کا اسپتال ہوگا نہ کہ "آدمیوں" کا اسپتال۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں ہماری قوم اسی قسم کے مخلص نادانوں کی مہربانیوں کا شکارگاہ بنی ہوئی ہے۔ ہر قائد نہایت اخلاص اور درد مندی کے ساتھ قوم کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ مگر وہ قوم کی اصلاح کے لئے ایسی تدبیریں کرتا ہے جو قوم کے مرض کو اور بڑھانے والی ہوں نہ کہ اس کو گھٹانے والی۔

ہماری جدید قومی تاریخ کا سب سے زیادہ الم ناک واقعہ یہ ہے کہ ہر قائد کو لاکھوں، بعض اوقات کروروں ساتھی اور بے شمار اسباب و وسائل ملے۔ ہر قائد اپنے مقررہ نشانہ کو حاصل کرنے میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ مگر اس کے باوجود قوم کی مغلوبیت اور زبوں حالی میں کوئی کمی نہ ہوسکی۔ بلکہ مسائل کی پیچیدگیاں دن بدن بڑھتی چلی گئیں۔ شان دار کامیابیوں کے باوجود شان دار ناکامی کی وجہ یہی مخلصانہ نادانی ہے۔ ہر قائد قوم کو اپنی پیٹھ پر لاد کر اسپتال پہنچا رہا ہے۔ مگر وہ جس اسپتال میں پہنچاتا ہے وہ مویشیوں کا اسپتال ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مویشیوں کے اسپتال کے علاج سے انسان کا مرض اچھا نہیں ہوسکتا ——— چھوٹی سی بات پر لڑ کر بڑے نقصان کو دعوت دینا، ایک معمولی مسئلہ کے نام پر ادھم مچا کر دوسرے ناقابل حل مسائل کھڑے کر لینا، جلسے جلوس کے تماشوں کو عہد ساز اور تاریخ آفریں بتا کر قوم کی بے حساب طاقت اس میں برباد کر دینا، سب اسی نادانی کی مثالیں ہیں (۲۸ مئی ۱۹۸۱)

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز
یتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے
ہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت
ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا
اسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو
پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود
تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ باسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی
ے کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی
ئم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک
ہچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے باسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز
چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے
ت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ
ا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ
روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے
۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری
ت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ
سب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔
یدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ
روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. R. N. NO. 28822/76 ISSUE NO. 60
REGD. NO. D. (DN) 532 SEPTEMBER 1981

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PH 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

لوگ جہنمی انگاروں میں کودتے ہیں
اور سمجھتے یہ ہیں کہ ——————
وہ بے ضرر پھولوں سے کھیل رہے ہیں

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

الرسالہ

اکتوبر ۱۹۸۱
شمارہ ۵۹

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دہلی ٦ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ کو کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو خریداری کے کام کو صرف اس لئے چھوڑ دے کہ چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں۔ مگر بازار میں خریداروں کی بھیڑ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

تاہم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے صرف اس لئے الرسالہ کی خریداری بند کر دی ہے کہ اس کی قیمت میں گرانی کے سبب سے ایک روپیہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ الرسالہ کا خریدنا کوئی بازار کا سودا خریدنے کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ دعوتِ حق کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے۔ اسلام کی ایک تاریخ وجود میں آرہی ہے۔ اب جو شخص چاہے اس تاریخ کا جزء بن جائے۔ اور جو شخص اس کا جزء بننے کے لئے تیار نہ ہو وہ خود سوچ لے کہ جس مہنگائی کو وہ اپنے دنیا کے معاملات میں پوری طرح گوارا کئے ہوئے تھا اسی مہنگائی کو آخرت کے معاملہ میں گوارا نہ کرنے کے لئے اس کے پاس خدا کے یہاں کیا جواب ہوگا۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

خدا کو پانے والے

خدا کی زمین پر شاید ایسے لوگ موجود نہیں جنھوں نے خدا کو ان عظمتوں کے ساتھ پایا ہو جس کے اثرات اس ہیجان خیز کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں جس کو خدا کی یاد کہا گیا ہے۔ جھوٹی عبادت کی دھوم ہر طرف نظر آتی ہے۔ مگر سچی عبادت اتنی نایاب ہے کہ امکان ہی کے درجہ میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کہیں موجود ہوگی۔

آج ساری دنیا میں دین اور اسلام کا غلغلہ بلند ہے۔ مگر وہ انسان شاید خدا کی زمین پر کہیں پایا نہیں جاتا جس نے خدا کو اس طرح دیکھا ہو کہ اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ جو قرآن کو پڑھے تو اس کی روح پکار اٹھے کہ خدایا یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ہدایت کا ایسا انتظام کیا، ورنہ میں جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ رسول کی سنت کو دیکھے تو اس کا وجود اس دریافت سے سرشار ہو جائے کہ یہ خدا کا کیسا غیر معمولی انتظام تھا کہ اس نے پیغمبر کی زندگی میں ہدایت کا بے داغ نمونہ قائم کیا اور پھر تاریخ میں اس کو روشنی کے ابدی مینار کی طرح محفوظ کر دیا۔ جب وہ سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھے تو اس کو یہ احساس ہونے لگے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی رحمت کے آغوش میں لے لیا ہے، جب وہ کوئی غذا اپنی حلق کے نیچے اتارے تو اس کی پوری ہستی میں اس احسان مندی کی لہر دوڑ جائے کہ کیسا عجیب ہے وہ خدا جس نے میرے جسم کی پرورش کے لئے ایسی مکمل غذا کا اہتمام کیا۔ جب وہ پانی پیئے تو اس کی آنکھوں سے ایک اور جھرنا بہہ پڑے اور وہ بے اختیار ہو کر کہے کہ خدایا اگر تو مجھے سیراب نہ کرے تو میں سیراب ہونے والا نہیں، اگر تو مجھے پانی نہ دے تو کہیں سے مجھ کو پانی ملنے والا نہیں۔

آہ، لوگ اپنے کو خدا سے کتنا قریب سمجھتے ہیں مگر وہ خدا سے کتنا زیادہ دور ہیں۔ وہ خدا کا نام لیتے ہیں مگر ان کے منھ میں خدائی مٹھاس کی شکر نہیں گھلتی۔ وہ خدا کو پانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے چمنستان کی کوئی خوشبو ان کے مشام کو معطر نہیں کرتی۔ وہ خدا کے نام پر دھوم مچاتے ہیں مگر خدا کے نورانی سمندر میں نہانے کا کوئی نشان ان کے جسم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی جنتیں ان کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں مگر جنت کے باغ کا کوئی جھونکا ان کے وجود کو نہیں چھوتا۔

کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس کی یاد دل ودماغ کی دنیا میں کوئی اہتزاز (Thrill) پیدا نہ کرے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ جنت جس میں داخلہ کا ٹکٹ آدمی اپنی جیبوں میں لئے پھرتا ہو مگر جنت کا باسی ہونے کی کوئی جھلک اس کے رفتار و گفتار سے نمایاں نہ ہو۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ آخرت والے جن کے لئے آخرت کی ابدی وراثت لکھی جا چکی ہو مگر ان کی ساری دلچسپیاں بدستور اسی عارضی دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں۔

سنتِ رسول

سنت عربی زبان میں طریقہ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد خدا کا وہ پسندیدہ طریقہ ہے جو رسول کے ذریعہ انسان کو بتایا گیا۔ قرآن میں یہ لفظ شریعت خداوندی کے تمام طریقوں کے لئے آیا ہے ۔ اسلامی معاشرت کے احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے :

يُرِيدُ اللهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (نساء ۲۶)	اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان لوگوں کا طریقہ بتا دے جو تم سے پہلے تھے اور تمھارے اوپر توجہ کرے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۔

اللہ نے جب دنیا بنائی تو اسی وقت یہ بھی طے کر دیا کہ اس دنیا کی کارکردگی کے لئے اس کا پسندیدہ طریقہ کیا ہوگا۔ اس طریقہ کو خدا نے بقیہ دنیا میں بزور اس طرح نافذ کر دیا کہ کوئی چیز اس سے ذرا بھی ہٹ نہیں سکتی ۔ مگر انسان کو خدا نے اس کا پابند نہیں کیا۔ انسان کو سوچنے اور کرنے کی آزادی دے کر فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ اپنی آزاد مرضی سے میرے پسندیدہ طریقہ پر چلیں گے ان کے لئے میرے یہاں جنت کے باغ ہیں اور جو لوگ اس سے انحراف کریں گے ان کے لئے دوزخ کی آگ۔

خدا کے اسی پسندیدہ طریقہ کو انسانوں کے سامنے واضح کرنے کے لئے خدا کے رسول آئے ۔ رسول نے زبانی بھی بتایا اور برت کر عملاً بھی دکھا دیا کہ خدا کی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو رسول کی سنت کہا جاتا ہے ۔ رسول کی سنت کا تعلق مسواک اور غسل جیسے معاملات سے بھی ہے اور ملی تعمیر اور اجتماعی اصلاح جیسے معاملات سے بھی۔ جو لوگ اللہ کے یہاں اس کے مقبول بندوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے تمام معاملات میں رسول کی سنت کی پیروی کریں۔ اپنی زندگی کے کسی معاملہ کو اس سے آزاد یا غیر متعلق نہ سمجھیں۔

رسول کی اجتماعی سنتوں میں سے ایک سنت تدریج یا حقیقت پسندی ہے۔ یعنی نظریاتی معیاروں کے نفاذ میں حقیقی حالات و واقعات کی رعایت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی اصلاح کے تمام معاملات میں ہمیشہ تدریجی حکمت کے مطابق عمل کیا ہے۔ آج کل کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا طریقہ انقلابی (Revolutionary) نہیں تھا بلکہ ارتقائی (Evolutionary) تھا۔ حضرت عائشہ رض ایک روایت میں اسی بات کو اس طرح بتاتی ہیں :

انما نزل اول ما نزل سورة من المفصل	قرآن میں سب سے پہلے مفصل سورتیں اتریں جن میں

فیها ذکر الجنة والنار حتی اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا

(بخاری باب تالیف القرآن)

جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام کے لئے ہموار ہوگئے تو حرام وحلال کی آیتیں اتریں۔ اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے

رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ اس کے بعد عرب کا مرکز قیادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آگیا۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ آپ نے بیت اللہ سے متعلق شرعی احکام کا فوری نفاذ نہیں فرمایا۔ بلکہ جو کچھ کرنا تھا تدریج کے ساتھ کیا۔ فتح مکہ کے بعد اسلامی اقتدار قائم ہونے کے باوجود ۸ھ میں جو حج ہوا وہ بدستور قدیم جاہلی رواج کے مطابق ہوا۔ اس کے بعد ۹ھ میں اسلامی دور کا دوسرا حج اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں نے اپنے طریقہ پر حج کیا اور مشرکین نے اپنے طریقہ پر۔ پھر جب ۱۰ھ میں تیسرا حج آیا تو آپ کے حکم کے مطابق اس کو خالص اسلامی طریقہ پر انجام دیا گیا۔ یہی دور اسلامی کا تیسرا حج ہے جو اسلامی تاریخ میں حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔

طبعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ مشرکین بیت اللہ میں آئیں اور اپنے مشرکانہ رواج کے مطابق حج کے مراسم ادا کریں۔ مگر اقتدار حاصل ہونے کے باوجود آپ نے شریعت کے نفاذ میں جلدی نہیں کی۔ فتح مکہ کے بعد دو سال تک آپ حج کی ادائگی کے لئے مکہ نہیں گئے۔ حج کا موسم آیا تو آپ نے فرمایا: مشرکین بیت اللہ میں آئیں گے اور ننگے ہو کر حج کریں گے۔ مجھے پسند نہیں کہ میں حج کروں جب تک یہ چیزیں ختم نہ ہو جائیں (انما یحضر المشرکون فیطوفون عراۃ فلا احب ان احج حتی لا یکون ذلك، تفسیر ابن کثیر، سورہ توبہ)

فتح مکہ کے بعد پہلے سال (۸ھ) میں مسلمانوں نے حج کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لے گئے۔ دوسرے سال (۹ھ) میں آپ نے مسلمان حاجیوں کا قافلہ حضرت ابوبکر کی قیادت میں مدینہ سے مکہ روانہ کیا۔ اس کے بعد قرآن میں یہ حکم اترا کہ مشرکین نجس ہیں، اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آئیں (توبہ ۲۸) چنانچہ آپ نے حضرت علی کو مکہ بھیجا اور حکم دیا کہ حج کے اجتماع میں گھوم گھوم کر یہ اعلان کر دیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لئے نہ آئے اور اب سے کوئی شخص ننگی حالت میں کعبہ کا طواف نہ کرے (لا یحج بعد العام مشرك ولا یطوف بالبیت عریان) اس طرح تیسرے سال

جب دھیرے دھیرے شرک کا خاتمہ کر دیا گیا اس وقت آپ نے مکہ جاکر حج ادا فرمایا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج (حجۃ الوداع) تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام کے نفاذ میں کس طرح تدریجی حکمت کا لحاظ فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ اقتدار پر قبضہ ملنے کے باوجود آپ نے تدریج کے اصول کو ترک نہیں کیا۔ خدا کے پیغمبر نے اپنے آپ کو روک لیا مگر مشرکین کو وقت سے پہلے روکنے کے لئے اقدام نہیں فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صرف وہی نہیں ہے جس کو عام طور پر لوگ "سنت" کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے سوا بھی رسول اللہ کی سنتیں ہیں۔ ان میں سے ایک سنت وہ ہے جس کو تدریج یا حقیقت پسندی کہا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیغمبر کی حیثیت سے ۱۳ سال رہے مگر آپ نے کبھی یہ نہ کیا کہ کعبہ کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالیں۔ حتیٰ کہ فتح و غلبہ حاصل ہونے کے بعد بھی آپ نے بیہودہ مراسم کے خاتمہ کے لئے جلد بازی نہیں کی۔ طاقت ور ہونے کے باوجود آپ نے دو سال تک انتظار فرمایا اور تیسرے حج میں وہ تمام اصلاحات نافذ کیں جو آپ ملک میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔

تدریجی ڈھنگ پر عمل کرنے میں بہت سے فائدے ہیں جو کسی اور طریقے سے حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

۱۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ مطلوبہ نتیجہ تک پہنچنا یقینی ہو جاتا ہے۔ تدریجی طور پر آگے بڑھنا دوسرے لفظوں میں ایک ایک قدم کو سنبھالتے ہوئے اور مستحکم کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ ایسا آدمی صرف جوش کے تحت میدان میں نہیں کود پڑتا بلکہ خارجی اسباب کی رعایت کرتے ہوئے حسب حالات اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ اور جو شخص اپنے سفر میں اس حکمت کو ملحوظ رکھے وہ ضرور منزل پر پہنچ کر رہے گا۔

۲۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی بے فائدہ نقصانات سے بچ جاتا ہے۔ جو شخص اچانک چھلانگ لگا کر مقصد تک پہنچنا چاہے اس کو غیر ضروری طور پر ایسی طاقتوں سے قبل از وقت لڑنا پڑ جاتا ہے جن سے مؤثر مقابلہ کے لئے وہ ابھی تیار نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جان و مال کے ایسے نقصانات بھگتنے پڑتے ہیں جن کی تلافی مدتوں بعد بھی نہ ہو سکے۔

۳۔ تدریج کے ذریعہ روایات توڑے بغیر نظام تبدیل ہو جاتا ہے۔ سماجی زندگی میں روایات کی بے حد اہمیت ہے اور یہ روایات صدیوں میں بنتی ہیں۔ کسی نے بجا طور پر کہا ہے کہ ایک چھوٹی سی روایت بننے کے لئے بہت بڑی تاریخ درکار ہوتی ہے:

It requires a lot of history to make a little tradition

جلد انقلاب لانے کے لئے اگر سماج میں ایجی ٹیشن اور مار دھاڑ کا ماحول قائم ہو جائے تو دوبارہ کام کا مزاج اور ایک دوسرے کے احترام کی روایات پیدا کرنے کے لئے کئی نسل کی جدوجہد درکار ہوگی۔

بیس سال بعد

۱۹۵۰ اور ۱۹۷۰ کے درمیان تقریباً ۲۰ سال تک جاپان کا حال یہ تھا کہ وہ صنعتی ٹکنالوجی کی اعلیٰ قسموں کو مغربی ملکوں سے حاصل کرتا تھا۔ کبھی ادھار، کبھی مانگ کر اور کبھی خرید کر۔ مگر آج جاپان کی اقتصادیات اپنی ذاتی بنیادوں پر قائم ہیں۔ جاپان اس حیثیت میں ہو گیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی مصنوعات کو بلکہ اپنی صنعتی مہارت کو بھی دوسرے ملکوں میں بھیج سکے۔

صنعت میں اپنی ترقی یافتہ تکنکی صلاحیت کی بنا پر اس کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی مدد کر کے ان کی دوستی حاصل کر سکے۔ مختلف ملکوں کی بڑی بڑی اسکیموں کا ٹھیکہ لے کر ان سے تجارتیں کرے۔ جاپانی ماہرین آج تھائی لینڈ میں آب پاشی کے جدید منصوبوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ وہ سنگاپور میں کمپیوٹر پروگرام کی تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ جنوبی کوریا اور چین میں فولاد کے کارخانے تعمیر کر رہے ہیں۔ وہ شرق اوسط میں پٹروکیمیکل صنعتیں قائم کر رہے ہیں۔

جاپانیوں نے ابتداءً فولاد بنانا امریکیوں سے سیکھا تھا، اب وہ اس ہنر کو مزید ترقی دے کر اس کو خود امریکہ کو برآمد کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ جاپان جو کسی وقت امریکہ کا شاگرد تھا، اب اس نے کئی چیزوں، خاص طور پر مواصلات (کمیونی کیشن) اور الکٹرانکس میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ امریکہ خود اپنے فوجی اہمیت کے شعبوں میں جاپان کی تکنکی مدد حاصل کرنے کے لئے جاپان سے معاہدہ کر رہا ہے۔ شاگرد اس قابل ہو گیا ہے کہ اپنے استاد کو سبق دے سکے۔

جاپان کے اس تجربہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک اخباری مبصر (ہندستان ٹائمس ۱۱ جون ۱۹۸۱) نے لکھا ہے ——— ٹکنالوجی کا بہاؤ پہلے جاپان کے اندر تھا، اب اس کا بہاؤ جاپان کے باہر ہے:

Now the flow is out instead of in

جاپان ۲۰ سال تک صنعتی مغلوبیت پر راضی رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اس کو صنعتی غلبہ کا مقام حاصل ہو گیا۔ اگر وہ اول دن سے غلبہ پر اصرار کرتا تو اس کے حصہ میں صرف یہ آتا کہ اس کی مغلوبیت کبھی ختم نہ ہو۔ ہر پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ہر بلندی کے لئے کچھ پستی کو گوارا کرنا ہوتا ہے۔ یہی دنیا کا قانون ہے۔ جو لوگ دنیا کے اس قانون کے ساتھ موافقت کریں وہی خدا کی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس قانون کے ساتھ موافقت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں ان کے حصہ میں صرف یہ آتا ہے کہ وہ ناکام ہو کر رہ جائیں اور اس کے بعد بے فائدہ طور پر دوسروں کو اپنی بربادی کا جھوٹا الزام دیتے رہیں۔

طاقت کا راز

عالمی سطح کے کھلاڑی اکثر یکساں جسمانی قوت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کو تربیت بھی یکساں معیار کی ملتی ہے۔ پھر ان میں ہار جیت کا سبب کیا ہوتا ہے۔ جو شخص جیتتا ہے وہ کیوں جیتتا ہے اور جو ہارتا ہے وہ کس بنا پر ہارتا ہے۔ یہ سوال پچھلے تین سال سے امریکہ کے سائنس دانوں کی ایک جماعت کے لئے تحقیق کا موضوع بنا ہوا تھا، اب انھوں نے تین سال کے بعد اپنی تحقیق کے نتائج شائع کئے ہیں۔

ان سائنس دانوں نے عالمی سطح کے بہترین کشتی لڑنے والوں (Wrestlers) پر تجربات کئے۔ انھوں نے ان کی عضلاتی طاقت اور ان کی نفسیات کا بغور مشاہدہ کیا۔ انھوں نے پایا کہ عالمی مقابلوں میں جیتنے والے پہلوانوں اور ہارنے والے پہلوانوں میں ایک خاص فرق ہوتا ہے۔ مگر یہ فرق جسمانی نہیں بلکہ تمام تر نفسیاتی ہے۔ یہ دراصل پہلوان کی ذہنی حالت (State of Mind) ہے جو اس کے لئے ہار یا جیت کا فیصلہ کرتی ہے۔ ماہرین نے پایا کہ ہارنے والے کے مقابلہ میں جیتنے والا زیادہ با اصول اور قابو یافتہ شخص Conscientious and and in Control) ہوتا ہے۔ ان کی رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

Losers tended to be more depressed and confused before competing, while the winners were positive and relaxed

تجربہ میں پایا گیا کہ ہارنے والے کھلاڑی مقابلہ سے پہلے ہی بددل اور پریشان تھے، جب کہ جیتنے والے پُر اعتماد اور مطمئن تھے (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ جولائی ۱۹۸۱)

یہی بات زندگی کے وسیع تر مقابلہ کے لئے بھی درست ہے۔ زندگی کے میدان میں جب دو آدمیوں یا دو گروہوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو کامیاب ہونے یا نہ ہونے میں اصل فیصلہ کن چیز یہ نہیں ہوتی کہ کس کے پاس مادی طاقت یا ظاہری ساز و سامان زیادہ ہے اور کس کے پاس کم۔ بلکہ اصل فیصلہ کن چیز قلب اور دماغ کی حالت ہوتی ہے، جس کے اندر قلبی اور ذہنی اوصاف زیادہ ہوتے ہیں وہ کامیاب ہوتا ہے اور جس کے اندر یہ اوصاف کم ہوتے ہیں وہی ناکام ہو جاتا ہے خواہ اس کے پاس ظاہری اسباب کی کثرت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

مقصد کی صحت کا یقین، تضاد فکری سے خالی ہونا، نظم و ضبط کو کبھی نہ چھوڑنا، ہیجان خیز لمحات میں بھی ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت، جذبات پر پوری طرح قابو رکھنا، ہمیشہ سوچے سمجھے اقدام کے تحت عمل کرنا، یہ تمام قلب و دماغ سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو زندگی کے معرکہ میں ہمیشہ فیصلہ کن ہوتی ہیں۔

اشتعال نہیں

ایک صاحب ہیں۔ وہ بظاہر عام حلیہ میں رہتے ہیں مگر مزاج کے اعتبار سے بہت دیندار ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور قرآن وحدیث کے موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔

ایک روز نماز جمعہ کے بعد مسجد میں ان کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی۔ موصوف کے ساتھی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ فلاں صاحب ہیں اور وہ قرآن وحدیث پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ بزرگ نے موصوف کی طرف دیکھا تو انھوں نے پایا کہ وہ قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ سر پہ گاندھی ٹوپی ہے۔ داڑھی بھی ایک مشت کے ناپ سے کم ہے۔ بزرگ نے یہ دیکھ کر فرمایا :

صورت سے تو ایسا معلوم نہیں ہوتا

بزرگ کی زبان سے یہ توہین آمیز تبصرہ سن کر موصوف کو غصہ آگیا۔ تاہم انھوں نے برداشت کر لیا۔ وہ ایک لمحہ چپ رہے اور اس کے بعد بولے :

آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کبھی گنہ گاروں سے بھی اپنا کام لے لیتے ہیں

یہ ٹھنڈا جواب مذکورہ بزرگ کے لئے اتنا سخت ثابت ہوا کہ اس کے بعد وہ کچھ بول نہ سکے اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشتعال کے وقت آدمی کو کیسا جواب دینا چاہئے۔ جب بھی کوئی آدمی آپ پر تنقید کرتا ہے، آپ کے خلاف کوئی سخت بات کہہ دیتا ہے تو آپ کے بدن میں آگ جاتی ہے۔ آپ چاہنے لگتے ہیں کہ اس کو بھسم کر دیں جس طرح اس نے آپ کو بھسم کیا ہے، مگر یہ طریقہ شیطانی طریقہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کڑواہٹ کو پی جائیں۔ جو جھٹکا آپ پر لگا ہے اس کو دوسرے کے اوپر ڈالنے کے بجائے خود اپنے آپ پر سہہ لیں۔ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو ایک نئی قوت حاصل ہوگی۔ آپ اس حکمت کو جانیں گے کہ کڑوے الفاظ کا جواب میٹھے الفاظ سے دینا زیادہ سخت جواب ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتعال کے وقت جو شخص صبر کرلے اور سوچ سمجھ کر بولے وہ زیادہ طاقتور انداز میں اپنی بات کہنے کے لائق ہو جاتا ہے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ مشتعل الفاظ کا جواب ٹھنڈے الفاظ سے دے اور ٹھنڈک آگ کو زیادہ بجھانے والی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے مخالف کو معاف کر دے اور معاف کر دینا یقیناً سب سے بڑا انتقام ہے۔

کام کا شوق

ایک تعلیم یافتہ شخص ایک معروف ادارہ میں ہمہ وقتی ملازم تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک انگریزی اخبار میں سب اڈیٹر تھے۔ وہ مذکورہ ملازمت کی ذمہ داریاں پوری طرح نبھاتے تھے اور اسی کے ساتھ اخبار کی ادارتی ذمہ داریاں بھی۔ کسی شخص نے ان سے پوچھا آپ اتنا زیادہ کام کرتے ہیں۔ آپ کو وقت کیسے ملتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ وقت کوئی چیز نہیں، یہ صرف دلچسپیوں کی کارگزاری ہے :

Time is nothing but it is a **function** of interests

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی کام کی تکمیل کے لئے اصل اہمیت وقت کی نہیں، اصل اہمیت دل چسپی کی ہے، یہ آدمی کی دل چسپی ہے جو اس سے کسی کام کو پورا کرا دیتی ہے۔ واقعی لگن اور شوق ہو تو کم وقت میں آدمی بہت سا کام کرے گا۔ اور اگر شوق اور لگن نہ ہو تو زیادہ وقت بھی اس کے لئے تھوڑا بن جائے گا۔

ایک شخص کے پاس ملک کے باہر سے ایک پیش کش آئی۔ وقت صرف تین ہفتہ کا تھا، جب کہ اس کے پاس ابھی تک پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ موجودہ زمانہ میں بیرونی سفر کے لئے بہت سے قانونی تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ بظاہر وقت پر سفر کرنا انتہائی دشوار تھا۔ مگر اس نے رات دن ایک کر کے سارا کام پورا کر لیا اور ٹھیک تاریخ پر وہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر مطلوبہ ملک کو پرواز کر رہا تھا۔

دوسری طرف اسی قسم کا موقع ایک اور شخص کے لئے پیدا ہوا۔ وہ شہر سے دور دیہات میں تھا، اس نے اپنے ایک رشتہ دار کو جو شہر میں رہتے تھے، خط لکھا کہ میرے لئے شہر میں آنا مشکل ہے۔ آپ میرا یہ کام کرا دیجئے اور اس سلسلہ میں جو پیسہ خرچ ہوگا وہ سب میرے ذمہ ہوگا۔ رشتہ دار نے جواب دیا کہ اچھا میں کوشش کروں گا۔ مذکورہ شخص ان کے اطمینان پر رہ گیا۔ اس کے پاس پورے دو مہینے کا وقت تھا مگر اس کا کوئی کام نہیں ہوا اور وہ باہر نہ جا سکا۔ آخر میں مذکورہ رشتہ دار کا پیغام ملا کہ فلاں وجہ پیش آ گئی اس وجہ سے میں تمھارا کام نہ کر سکا۔ یہ زبانی پیغام تاخیر سے اس وقت پہنچا جب کہ وقت گزر چکا تھا ——

پہلے شخص نے اپنا کام سمجھ کر دل چسپی لی تو اس نے کم وقت کے باوجود کام کو پورا کر لیا۔ دوسرے شخص نے اپنے کام کی طرح دلچسپی نہیں لی اس لئے معمولی باتیں اس کے لئے عذر بن گئیں اور زیادہ وقت کے باوجود وہ کام کو انجام نہ دے سکا

آدمی کو جب کام کا شوق ہو تو اس کی عقل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مقصد کو حاصل کرنے کی تڑپ اس کی قوتِ عمل کو بڑھا دیتی ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنوں میں وہ کام کر لیتا ہے جس کو دوسرا شخص ہفتوں اور مہینوں میں بھی نہ کر سکے۔

کام ہے، کام کرنے والے نہیں

مہاراشٹر کا ایک نوجوان رامیش دھوبی (۲۲ سال) بے روزگاری سے سخت پریشان تھا۔ مایوسی نے اس کی زندگی اس کی نظر میں بے قیمت بنا دی تھی۔ آخر کار ایک روز وہ موہدی اسٹیشن پہنچا۔ "میرے اس ہاتھ کی کیا ضرورت ہے جس کے لئے دنیا میں کوئی کام نہ ہو" یہ احساس اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اتنے میں اس کو ایک ٹرین آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ریلوے لائن کے کنارے کھڑا ہوگیا اور جیسے ہی ٹرین سامنے آئی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پہیہ اور پٹری کے بیچ میں ڈال دئے۔ انجام ظاہر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کٹ کر اس کے جسم سے الگ ہو گئے۔

مسافروں نے جب اس کا حال دیکھا تو اس کو لے کر فوراً اسپتال پہنچے اور اس کو ڈاکٹروں کے حوالے کیا۔ رامیش دھوبی سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے جو جواب دیا وہ انگریزی رپورٹنگ (ٹائمس آف انڈیا ۱۴ اگست ۱۹۸۱) میں ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

My hands are useless as I can find no work,
and living is shameful without work

جب میرے لئے کوئی کام نہیں تو میرے ہاتھ بھی بے کار ہیں۔ کام کے بغیر زندگی رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اخبار کی یہ خبر میں نے پڑھ کر ختم کی تھی کہ ایک صاحب کمرہ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ میرے پاس کافی کھیت ہیں اور نہر ہونے کی وجہ سے آب پاشی کا معقول انتظام ہے۔ محنت اور ذمہ داری کے ساتھ کام کیا جائے تو بآسانی ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ اب تک میں خود کرتا رہا۔ مگر اب میرے پاس وقت نہیں۔ اور کوئی ایسا قابل اعتماد آدمی نہیں ملتا جس کے حوالے میں اپنا یہ کام کر سکوں۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ میں اپنی زمینوں کو بیچ دوں۔

آج کی دنیا میں جس طرح بے شمار لوگ بے روزگاری سے پریشان ہیں۔ اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ بے شمار لوگ اس مسئلہ سے دوچار ہیں کہ ان کے پاس کام ہیں مگر ایسے آدمی نہیں ملتے جو سلیقہ کے ساتھ کام کو سنبھال سکیں۔

ان دونوں واقعات کو ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں کام کی کمی نہیں بلکہ کام کرنے والوں کی کمی ہے۔ جو لوگ بے روزگار ہیں اگر وہ اپنے اندر صرف دو صلاحیت پیدا کر لیں تو روزگار خود ان کو تلاش کرے گا نہ کہ وہ روزگار کی تلاش میں ادھر اُدھر پھریں۔ وہ دو صلاحیتیں ہیں —— محنت اور دیانت داری۔

حالات کی رعایت

۱۹ جولائی ۱۹۸۱ کو دہلی ۔ احمد آباد میل حسب معمول اپنے وقت پر روانہ ہوئی ۔ مگر مہسانہ اسٹیشن پر وہ چالیس منٹ لیٹ ہوگئی ۔ ٹرین جب مہسانہ سے آگے بڑھی تو ڈرائیور نے اس کو عام رفتار سے زیادہ تیز دوڑانا شروع کیا تاکہ وہ اپنے مقررہ وقت پر احمد آباد پہنچ جائے ۔ ٹرین ڈنگروا سے دو کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھی کہ ڈرائیور نے دیکھا کہ آگے کی پٹری میں کچھ فش پلیٹیں غائب ہیں ۔ اس نے فوری طور پر بریک لگایا تاکہ ٹرین کو روک کر حادثہ سے بچائے ۔ مگر تیز دوڑتی ہوئی ٹرین اچانک بریک لگنے سے بے قابو ہوگئی ۔ انجن اور اس کے ساتھ لگی ہوئی ۱۲ بوگیاں پٹری سے اچھل پڑیں اور پوری گاڑی اپنی پٹری چھوڑ کر کنارے کے کھڈ میں جا گری ۔ کافی لوگ مر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے ۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ حالات کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی کی گاڑی تیز دوڑانا شروع کر دیں ۔ کیونکہ اس دنیا میں صرف آپ ہی نہیں ہیں بلکہ دوسرے بھی ہیں ۔ یہاں صرف آپ بر سر عمل نہیں ہیں بلکہ دوسرے بھی بر سر عمل ہیں ۔ ایسی ایک دنیا میں اسی شخص یا قوم کا سفر کامیاب ہو سکتا ہے جو خارجی حالات کو اچھی طرح سمجھے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے اپنی گاڑی کو آگے بڑھائے ۔ اگر یہ حکمت نہ برتی جائے تو راستہ میں کوئی بھی غیر موافق واقعہ پیش آکر ہمارے سارے منصوبہ کو خاک میں ملا دے گا ۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بہت سے بڑے بڑے اقدامات کئے اور سب ناکام ہوتے چلے گئے ۔ اس ناکامی کی توجیہہ ہر ایک کے پاس صرف ایک ہے : "فلاں کی سازش نے ان کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا" مگر یہ عذر صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ مذکورہ اقدام میں حالات کی پوری رعایت شامل نہ تھی ۔ خوش فہمی کے تحت اپنی گاڑی دوڑا دی گئی اور اس بات کا اندازہ نہیں کیا گیا کہ آگے کی پٹری پر ایک دشمن موجود ہے جو "فش پلیٹ" نکال کر ہماری گاڑی کو الٹنے کا خفیہ منصوبہ بنائے ہوئے ہے ۔

"گاڑی" خواہ مکمل طور پر آپ کی ہو مگر جس "سڑک" پر آپ کو اپنی گاڑی دوڑانی ہے وہ مکمل طور پر آپ کی نہیں ۔ یہ حقیقت خواہ کسی کے لئے کتنی ہی تلخ ہو مگر بہر حال وہ ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس کو نظر انداز کر کے کوئی شخص اس دنیا میں کامیاب ہو سکے ۔

جو لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی کی گاڑی دنیا کی سڑک پر دوڑائیں ان کے حصہ میں کبھی منزل نہیں آتی ۔ واحد چیز جو اس دنیا میں ان کے لئے مقدر ہے وہ یہ کہ وہ اپنے ہر اقدام کے بعد ناکام ہوں اور پھر کسی نہ کسی "سازش" کا انکشاف کر کے اس کے خلاف فریاد کرتے رہیں ۔

الٹا رخ

ایک مولوی صورت آدمی اکسپریس ٹرین کے فرسٹ کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے سوا کیبن میں تین اور مسافر تھے اور تینوں پورے معنوں میں "مسٹر" تھے۔ مذکورہ مسافر کے سادہ لباس اور اس کے چہرے کی شرعی داڑھی نے اس کو اس ماحول میں اجنبی بنا دیا۔

کئی اسٹیشن گزر گئے۔ تینوں مسٹر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ مگر کسی نے مولوی کی طرف رخ نہیں کیا۔ مولوی شاید ان کے نزدیک اس قابل نہ تھا کہ اس سے بات کی جائے۔ آخر مولوی نے یہ کیا کہ اگلے اسٹیشن پر ایک انگریزی اخبار خریدا اور اس کو ہاتھ میں لے کر الٹی طرف سے دیکھنے لگا۔ مسٹر صاحبان یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑے۔ ایک شخص نے دوسرے سے انگریزی میں کہا: اس مولوی کو دیکھو، الٹی طرف سے اخبار پڑھ رہا ہے۔ دوسرا بولا: یہ شخص جب انگریزی نہیں جانتا تو اس کو خواہ مخواہ انگریزی اخبار خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔

مسٹر صاحبان کو یقین تھا کہ مولوی ان کی گفتگو کو سمجھ نہیں رہا ہے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ "مولوی ان سے زیادہ انگریزی جانتا ہے۔ اس کے بعد مولوی ان کی طرف مخاطب ہوا اور انگریزی زبان میں مسلسل بولنا شروع کیا۔ اس نے انگریزی میں کہا: کیا یہ کوئی قانونی جرم ہے کہ اخبار کو الٹی طرف سے پکڑا جائے۔ آخر آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں انگریزی زبان نہیں جانتا۔ اس کے بعد اس نے گفتگو کو دوسری طرف موڑ دیا۔ اس نے کہا: ایک اخبار کو الٹی طرف سے پکڑنا آپ کو اتنا عجیب معلوم ہوا۔ مگر معاف کیجئے آپ اور آپ جیسے بے شمار لوگ پوری زندگی کو الٹی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔

زندگی کو غیر مادی مقصد کی طرف سے پکڑنا چاہئے اور لوگ اس کو مادی مقاصد کی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اس کو روح کی طرف سے پکڑنا چاہئے اور لوگ اس کو جسم کی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔ زندگی کو دیکھنے کا صحیح رخ یہ ہے کہ اس کو آخرت کی طرف سے دیکھا جائے۔ مگر لوگ اس کو دنیا کی طرف سے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا سب سے اہم مسئلہ موت ہے مگر تمام لوگ زندگی کو سب سے اہم مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ خدا کی نظر سے انسان کو دیکھا جائے مگر آج سارے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ انسان کی نظر سے خدا کو دیکھ رہے ہیں۔

اخبار کا الٹا رخ ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے اور زندگی کا الٹا رخ کسی کو نظر نہیں آتا۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے کو دیکھنے والا سمجھتے ہیں مگر ان کو وہی چیز دکھائی نہیں دیتی جس کو انہیں سب سے زیادہ دیکھنا چاہئے۔

کچھ کام نہ آئے گا

ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ ۲۰ سال پہلے وہ معمولی میکنک تھے۔ اب وہ تقریباً دو درجن مشینوں کے مالک ہیں۔ ان کے کئی کارخانے چل رہے ہیں۔ میں نے ایک ملاقات میں کہا: آپ نے ماشاءاللہ اپنے کاروبار میں کافی ترقی کی ہے۔ انھوں نے خوشی اور اعتماد کے لہجہ میں جواب دیا: اتنی کمائی کرلی ہے کہ بچے کچھ نہ کریں تب بھی وہ سو سال تک آرام سے کھاتے رہیں گے۔

یہ ایک انتہائی مثال ہے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا یہی حال ہو رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں یہی یقین لئے ہوئے ہے کہ اس نے اپنے معاملات کو درست کرلیا ہے۔ اسے اب کسی خطرہ کی ضرورت نہیں۔ کم ازکم "سو سال" تک تو بالکل نہیں۔

کوئی اپنے بڑوں کو خوش کرکے مطمئن ہے۔ کسی کو یہ فخر ہے کہ اس نے اپنے قانونی کاغذات کو پکا کرلیا ہے۔ کسی کو اپنے قابل اعتماد ذریعۂ معاش اور اپنے بینک بیلنس پر ناز ہے۔ کوئی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنی دادا گیری پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تو جس کے پاس ہے وہ اس سے خوشامد اور مصالحت کا تعلق قائم کرکے سمجھتا ہے کہ اس نے بھی ایک چھتری حاصل کرلی ہے، اب اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔

مگر بھونچال جب آتا ہے تو اس قسم کے تمام بھروسوں کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ بھونچال کے لئے پکے محل اور کچی جھونپڑیوں میں کوئی فرق نہیں۔ طاقت ور اور کمزور دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ وہ بے سہارا لوگوں کو بھی اسی طرح تہس نہس کر دیتا ہے جس طرح ان لوگوں کو جو مضبوط سہارا پکڑے ہوئے ہیں۔ بھونچال یہ یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا میں آدمی کس قدر بے بس ہے۔

یہ بھونچال خدا کی ایک پیشگی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ ہر ایک کے لئے بالآخر کیا ہونے والا ہے۔ بھونچال ایک قسم کی چھوٹی قیامت ہے جو بڑی قیامت کا پتہ دیتی ہے۔ جب ہولناک گڑگڑاہٹ لوگوں کے اوسان خطا کر دیتی ہے۔ جب مکانات تاش کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا نچلا حصہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر تھا وہ نیچے دفن ہوجاتا ہے۔ اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں کے آگے بالکل عاجز ہے۔ اس کے لئے صرف یہ مقدر ہے کہ بے بسی کے ساتھ اپنی بربادی کا تماشہ دیکھے اور اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کرسکے۔

قیامت کا بھونچال موجودہ بھونچال سے اربوں اور کھربوں گنا زیادہ سخت ہوگا۔ اس وقت سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ ہر آدمی اپنی ہوشیاری بھول جائے گا۔ عظمت کے تمام منارے اس طرح گر چکے ہوں گے کہ ان کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ اس دن وہی سہارے والا ہوگا جس نے موجودہ چیزوں کو بے سہارا سمجھا تھا۔ اس دن وہی کامیاب ہوگا جس نے اس وقت خدا کو اپنایا تھا جب سارے لوگ خدا کو بھول کر دوسری دوسری چھتریوں کی پناہ لئے ہوئے تھے۔

یہ جہنمی قافلے

"ہر آدمی جنت کی تلاش میں ہے مگر ہر آدمی اپنی جنت کو دوزخ میں تلاش کر رہا ہے" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "لوگ کانٹوں میں پھول کو ڈھونڈ رہے ہیں، وہ اپنی زندگی کو کھنڈر کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بہت جلد ان کے لئے ایک شاندار محل کھڑا ہونے والا ہے"

ہر آدمی اپنی زندگی کو سنوارنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی تجارت اور ملازمت کے میدان میں محنت کر رہا ہے کوئی قیادت کے میدان میں اپنا نام اونچا کرنے کے لئے سرگرم ہے۔ کسی کا دماغ خوبصورت الفاظ کا کارخانہ بنا ہوا ہے تاکہ وہ عوام کی بھیڑ کو زیادہ سے زیادہ اپنے گرد جمع کر سکے۔ ہر آدمی اپنے ذہن میں اپنے مستقبل کا ایک سہانا خواب لئے ہوئے ہے اور ہر آدمی اپنے خواب کو واقعہ بنانے میں رات دن مصروف ہے۔ مگر لوگوں سے قریب ہو کر ان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اپنے خوابوں کی دنیا کو حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے پاس عمل غیر صالح کے سوا کوئی سرمایہ نہیں۔

آدمی اپنے رشتہ داروں کے حقوق سے بے پرواہ ہو کر اپنے بچوں کا مستقبل بنانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو دکھ پہنچا کر دور کے لوگوں میں خوش نام ہونے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بے انصافی کر کے باہر کی دنیا میں انصاف کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے خلاف ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں مگر دوسروں کے خلاف سب کچھ کہنے اور کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔

خدا نے اپنی دنیا میں انسان کے لئے وہ سب کچھ رکھا ہے جو وہ چاہتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ بھی۔ مگر خدا کی دنیا میں ہر اچھی چیز کو پانے کا ذریعہ اچھا عمل ہے —— خدا کا انعام ان لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے متعلقین کے حقوق ادا کریں۔ جو اپنے پڑوسیوں کو اپنے شر سے بچائیں۔ جو اپنے اہل معاملہ کے ساتھ انصاف کریں۔ خود پسندی کے بجائے خدا پسندی کے اوپر اپنی زندگیوں کو اٹھائیں۔ جو لوگوں سے حق اور عدل کی بنیاد پر معاملہ کریں نہ کہ اکڑ اور خود غرضی کی بنیاد پر۔ جو حق کے آگے جھک جائیں چاہے وہ ان کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جو اپنی انا کو خدا کے حوالے کر دیں اور خدا کی دنیا میں بے انا بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں۔

لوگ جہنمی انگاروں میں کود تے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوبصورت پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔ وہ دوزخ کے راستوں میں دوڑ رہے ہیں اور خوش ہیں کہ بہت جلد وہ جنت کے باغوں میں پہنچنے والے ہیں۔ آہ وہ قافلہ جس کے پاس جھوٹی خوش فہمی کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ آہ وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں اپنے لئے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

تدریجی ارتقاء کا ثبوت نہیں

حالیہ تحقیقات نے ارتقاء کے مفروضہ کو عملی طور پر بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ مثلاً متحجرات (Fossils) کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نظریۂ ارتقاء کا یہ مفروضہ مشاہدات کے مطابق نہیں ہے کہ زندگی کی ایک نوع کروروں سال میں ہلکی ہلکی تبدیلی سے دوسری نوع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً ڈارونزم میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ لومڑی کی نسلوں میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں ہوئیں جس کے نتیجہ میں ساٹھ ملین سال کے بعد لومڑی نے گھوڑے کی صورت اختیار کر لی۔ مگر تازہ دریافتیں بتاتی ہیں کہ زندگی کی انواع میں تبدیلی (اگر اس کو تبدیلی کا نام دیا جائے) بالکل اچانک ہوتی ہے یعنی "لومڑی" بالکل اچانک ایک ہی نسل میں گھوڑا بن جاتی ہے۔ زمین کی تہوں میں قدیم زمانہ کے حیاتیاتی آثار جو پتھریلی ہڈیوں یا ڈھانچوں کی صورت میں دفن ہیں وہ قدیم مفروضہ کی مطلق تصدیق نہیں کرتے۔

ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر اسٹیفن جے گولڈ (Stephen Jay Gould) نے جدید شواہد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ متحجرات کے ریکارڈ کے مطابق انواع حیات کروروں سال تک بغیر بدلے ہوئے ایک حالت پر باقی رہتی ہیں اور پھر بالکل اچانک ایک نوع غائب ہو کر دوسری نوع سامنے آجاتی ہے جو بنیادی طور پر پہلی سے مختلف مگر واضح طور پر پہلی کے مشابہ ہوتی ہے:

> For millions of years species remain unchanged in the fossil record, and then they abruptly disappear to be replaced by something substantially different but clearly related.
>
> The Sunday Times (London) 8 March 1981

متحجرات کے مطالعہ میں ایک نوع کروڑوں سال تک بالکل یکساں حالت میں نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد ایسے فاسل ملتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ اچانک ایک نوع سامنے آگئی۔ اس طرح تدریجی تبدیلی کا نظریہ سراسر باطل ثابت ہو جاتا ہے۔ تاہم فاسل کے مطالعہ سے جو بات معلوم ہوئی ہے وہ صرف ایک قسم کے جاندار کے متحجر ڈھانچہ کے بعد اچانک دوسری قسم کے جاندار کے متحجر ڈھانچہ کا ملنا۔ یہ سوال ابھی بدستور حل طلب ہے کہ نئی نوع پچھلی نوع کے بطن سے نکلی یا آزادانہ طور پر وجود میں آئی جس طرح زمین کا پہلا جاندار آزادانہ طور پر وجود میں آیا تھا۔ ارتقاء کے حامیوں کا خیال تھا کہ پہلے جاندار کے متعلق اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ اچانک پیدا ہو گیا تو دوسری تمام قسم کے جانداروں کی پیدائش ارتقائی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر اب حقائق یہ ماننے پر مجبور کر رہے ہیں کہ جس طرح پہلا جاندار "اچانک" پیدا ہوا اسی طرح جانداروں کی دوسری تمام قسمیں بھی "اچانک" پیدا ہوئی ہیں۔ ارتقاء کا نظریہ جس طرح پہلے جاندار کی تشریح میں ناکام تھا اسی طرح وہ بعد کے جانداروں کی تشریح میں بھی ناکام ہو رہا ہے۔

CONVERSION TO GOD

There wasn't much to agree on when two of Britain's most eminent scientists began researching into the origin of life. But on one point they were both quite clear — that the notion of 'Creator' is inconsistent with science. Today, Professor Sir Fred Hoyle, an agnostic of Christian background and Professor Chandra Wickramasinghe, an atheist Buddhist are changed men. They believe. What convinced both men were calculations they each did independently into the mathematical chances of life starting spontaneously. Each found that the odds against the spark of life igniting accidentally on Earth were staggering — in mathematical jargon '10 to the power of 40,000.' If you write down the figure '1' and add 40,000 noughts after it, you have the figure. "That number is such an imponderable in the universe that I am 100 per cent certain that life could not have started spontaneously on Earth," says Wickramasinghe' who has worked with Hoyle since 1962. "It is quite a shocks," says Wickramasinghe, Sri Lankan born Professor of Applied Mathematics and Astronomy at University College, Cardiff. "From my earliest training as a scientist, I was very strongly brainwashed to believe that science cannot be consistent with any kind of deliberate creation. That notion has had to be very painfully shed. I am quite uncomfortable in the situation, the state of mind I now find myself in. But there is no logical way out of it." They did calculations based on the size and age of the universe (15 billion years) and found that the odds against life beginning spontaneously anywhere in space were '10 to the power of 30.' And as they say in their book, Evolution From Space: "Once we see that the probability of life originating at random is so utterly miniscule as to make it absurd, it become sensible to think that the favourite properties of physics on which life depends are in every respect deliberate. Wickramasinghe says: Fred was tencing much more than I towards the higher intelligence Creator. I used to argue against it, but I found myself losing every argument. At the moment I can't find any rational argument to knock down the view which argues for conversion to God. If I could have found an argument-even a filmsy one — I wouldn't have been party to what we wrote in the book We used to have open minds; now we realise that the only logical answer to life is creation, and not accidental random shuffling. I still have a hope that one day I may go back to favour a purely mechanistic explanation — I say 'hopc', because I still cannot come to terms with my conversion. My being a Buddhist — albeit not an ardent one — was never a problem, because it is an atheistic religion which dosen't profess to know anything about creation and doesn't have a creator built into it. But I now find myself driven to this position by logic. There is no other way in which we can understand the precise ordering af the chemicals of the except to invoke the creations on a cosmic scale. "The two also belive that cellular life had already evolved to a high degree before the Earth was born, about three-and-a-half billion years ago. "We received life with the fundamental biochemical problems already solved." Says Wickramasinghe: We were hoping as scientists, that there would be a way round our conclusion — but there isn't. Logic is still hopelessly against that.

The Hindustan Times, September 6, 1981

انکار سے اقرار تک

پروفیسر چندر وکرما سنگھے (پیدائش ۱۹۳۹) شری لنکا کے ایک سائنس داں ہیں اور اس وقت یونیورسٹی کالج، کارڈیف (برطانیہ) میں ریاضیات اور فلکیات کے استاد ہیں۔ اپنے فن میں انھوں نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ پروفیسر سر فریڈ ہائل کے ساتھ ۱۹۶۲ سے ایک تحقیق میں لگے ہوئے تھے۔ تحقیق کا موضوع یہ تھا کہ زمین پر زندگی کا آغاز کس طرح ہوا۔ دونوں پروفیسروں نے اپنی تحقیق کے نتائج ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے ہیں جس کا نام ہے "ارتقاء خلا سے"

پروفیسر وکرما سنگھے نے تحقیق کا آغاز اس ذہن کے ساتھ کیا تھا کہ خالق کا تصور سائنس سے غیر مطابق ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اپنی تحقیق کے آخری نتائج سے مجھے بڑا دھکا لگا۔ سائنسی تعلیم کے دوران شروع سے مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ سائنس کسی بھی قسم کی ارادی تخلیق کے نظریہ سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔ اس نظریہ کو بے حد دکھ کے ساتھ چھوڑنا پڑے گا۔ میرا ذہن مجھ کو جس طرف لے جارہا ہے وہ میرے لئے سخت غیر اطمینان بخش ہے۔ مگر اس سے نکلنے کا کوئی منطقی راستہ موجود نہیں۔

دونوں سائنس دانوں نے الگ الگ اس کا حساب لگایا کہ اتفاقی طور پر زندگی شروع ہونے کا ریاضیاتی امکان کتنا ہے۔ دونوں کی آزادانہ تحقیق اس مشترکہ نتیجہ پر پہنچی کہ اتفاقی پیدائش کا ریاضیاتی طور پر کوئی امکان نہیں۔ انھوں نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ اتفاقی پیدائش کا امکان اگر "ایک" مانا جائے تو اس کے مخالف امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو شمار کرنے کے لئے ایک کے دائیں طرف چالیس ہزار صفر لگانے ہوں گے۔ "یہ تعداد موجودہ حجم اور عمر (۱۵ بلین سال) کی کائنات میں اتنی ناقابل قیاس حد تک زیادہ ہے کہ مجھے صد فی صد یقین ہے کہ زندگی ہماری زمین پر اپنے آپ اچانک شروع نہیں ہوسکتی۔"

کیمیائی اتفاق سے اچانک زندگی کا شروع ہونا اس قدر زیادہ بعید بات ہے کہ وہ بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ یہ سوچنا بالکل معقول ہے کہ طبیعیات کے وہ اوصاف جن پر زندگی کا انحصار ہے وہ ہر اعتبار سے ارادی ہیں۔ وکرما سنگھے لکھتے ہیں "سر فریڈ ہائل مجھ سے زیادہ برتر خالق کی طرف مائل تھے۔ میں اکثر اس کے خلاف ان سے بحث کرتا تھا۔ مگر میں نے پایا کہ میں استدلال کی تمام بنیادیں کھو رہا ہوں۔ اس وقت میں کوئی بھی عقلی دلیل نہیں پاتا جس سے میں خدا کے نظریہ کو باطل ثابت کرسکوں۔ اگر میں کوئی دلیل پاتا، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو تو میں اس کتاب کے لکھنے میں فریڈ کا شریک کار نہ بنتا۔ اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کے بارے میں واحد منطقی جواب یہی ہے کہ وہ تخلیق ہے نہ کہ کوئی الل ٹپ قسم کا الٹ پھیر۔ میں اب بھی اس امید پر ہوں کہ کسی دن میں دوبارہ خالص مشینی توجیہ

پیش کرسکوں۔ ہم بحیثیت سائنس داں کے اس امید میں تھے کہ ہم کوئی راستہ پالیں گے۔ مگر موجودہ تحقیق نتائج کے مطابق اس کی کوئی صورت نہیں۔ منطق اب بھی مایوسانہ طور پر اس کے خلاف ہے۔

میں ایک بدھسٹ ہوں۔ اگرچہ کوئی پرجوش نہیں۔ اس اعتبار سے یہ میرے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کیونکہ بدھ ازم ایک بے خدا مذہب ہے جو اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ تخلیق کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ بدھ ازم کے نظام میں خالق کا کوئی وجود نہیں۔ مگر اب میں پاتا ہوں کہ میں منطق کے ذریعہ اسی مقام پر پہنچا دیا گیا ہوں۔ اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں جس سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ مخصوص کیمیائی مادوں میں وہ حد درجہ درست نظام کیوں کر پایا جاتا ہے جس سے کائناتی سطح پر تخلیقات کا ظہور ہو۔

تبصرہ

پچھلی صدیوں میں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ خدا کا وجود محض ایک ذاتی عقیدہ کی چیز ہے۔ اس کا علمی طرز فکر سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلسل ایسے شواہد مل رہے ہیں کہ انسان یہ ماننے پر مجبور ہو رہا ہے کہ خدا کا وجود ایک علمی و عقلی نظریہ ہے نہ کہ محض ایک بے دلیل عقیدہ۔

مگر سائنسی مطالعہ آدمی کو صرف اس مجرد حقیقت تک پہنچا رہا ہے کہ خدا کا وجود ہے۔ اس کے آگے یہ سوال ہے کہ خدا جب ہے تو اس کا انسان سے کیا تعلق ہے۔ مگر سائنس اس کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات نہیں دیتی اور نہ دے سکتی۔ یہ دراصل وہ مقام ہے جہاں سے مذہب کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

اصولی طور پر تمام مذاہب اس سوال کا جواب ہیں۔ مگر مذاہب کی موجودہ صورت بتاتی ہے کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں۔ کوئی مذہب اس لئے باطل قرار پاتا ہے کہ اس میں سرے سے خدا کا تصور ہی موجود نہیں۔ کسی کا حال یہ ہے کہ وہ کئی خداؤں کا مدعی ہے۔ حالاں کہ تمام علوم یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خدا اگر ہو سکتا ہے تو ایک ہو سکتا ہے۔ کئی خدا کا ہونا ممکن نہیں۔ کسی مذہب کے نظام میں ایسے نظریات جگہ پا گئے ہیں جن کو انسانی ضمیر کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ مثلاً انسانوں کے درمیان رنگ اور نسل کی بنا پر فرق۔ اسی طرح دوسری باتیں۔

علمی حقائق انسان کو خدا تک پہنچا رہے ہیں اور خدا کو ماننے کے بعد اسلام کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب علمی مطالعہ یہ بتا رہا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے تو بے خدا مذاہب اپنے آپ باطل ثابت ہو جاتے ہیں۔ جب کائناتی تحقیق یہ بتائے کہ اس کا پورا نظام ایک وحدت کے تحت چل رہا ہے تو ایسے مذاہب بے معنی ہو جاتے ہیں جو کائنات کے کئی خدا مانتے ہوں۔ ایسی حالت میں آدمی مجبور ہے کہ وہ اسلام کو اپنا مذہب بنائے جو نہ صرف خدا کے صحیح تصور پر مبنی ہے بلکہ واضح طور پر یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان کس قسم کا تعلق ہونا چاہئے۔

اور اگر تم دیکھتے جب کہ فرشتے ان منکرین کی جان قبض کرتے ہیں، مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر اور یہ کہتے ہوئے کہ اب جلنے کا عذاب چکھو۔ یہ بدلہ ہے اس کا جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا تھا اور اللہ ہرگز بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ فرعون والوں کی طرح اور جو ان سے پہلے تھے کہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا پس اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑ لیا۔ بے شک اللہ قوت والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ اس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اس کو نہ بدل دیں جو ان کے نفسوں میں ہے۔ اور بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ فرعون والوں کی طرح اور جو ان سے پہلے تھے کہ انھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا پھر ہم نے ان کے گناہوں کے سبب سے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے فرعون والوں کو غرق کر دیا اور یہ سب لوگ ظالم تھے ۵۴-۵۰

نعمت کا انحصار حالتِ استحقاق نعمت پر ہے۔ قومی سطح پر کسی کو جو نعمتیں ملتی ہیں وہ ہمیشہ اس استحقاق کے بقدر ہوتی ہیں جو نفسی حالت کے اعتبار سے اس کے یہاں پایا جاتا ہے۔ یہ "نفس" چونکہ فرد کے اندر ہوتا ہے اس لئے اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اجتماعی انعامات کا انحصار انفرادی حالات پر ہے۔ افراد کی سطح پر قوم جس درجہ میں ہو اسی کے بقدر اس کو اجتماعی انعامات دئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گروہ اگر خدا کے اجتماعی انعامات کو پانا چاہتا ہے تو اس کو اپنے افراد کی نفسی اصلاح پر اپنی طاقت صرف کرنا چاہئے۔ اسی طرح کوئی قوم اگر اپنے کو اس حال میں دیکھے کہ اس سے اجتماعی نعمتیں چھن گئی ہیں تو اس کو خود نعمتوں کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنے افراد کے پیچھے دوڑنا چاہئے۔ کیونکہ افراد ہی کے بگڑنے سے اس کی نعمتیں چھنی ہیں اور افراد ہی کے بننے سے دوبارہ وہ اسے مل سکتی ہیں۔

جب کوئی قوم عدل کے بجائے ظلم اور تواضع کے بجائے سرکشی کا رویہ اختیار کرتی ہے تو خدا کی طرف سے اس کے سامنے سچائی کا اعلان کرایا جاتا ہے تاکہ وہ متنبہ ہو جائے۔ یہ اعلان کمالِ وضاحت کے اعتبار سے خدا کی ایک نشانی ہوتا ہے۔ اس کو ماننا خدا کو ماننا ہوتا ہے اور اس کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا۔ خدا کی دعوت جب آیت (نشانی) کی حد تک برہنہ ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے پھر بھی وہ اس کا انکار کریں تو اس کے بعد لازماً وہ سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس سزا کا آغاز اگرچہ دنیا ہی سے ہو جاتا ہے۔ تاہم دنیا کی سزا اس سزا کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو موت کے بعد آدمی کے سامنے آنے والی ہے۔ فرشتوں کی مار، ساری مخلوق کے سامنے رسوائی اور جہنم کی آگ میں جلنا۔ یہ سب اتنے ہولناک مراحل ہیں کہ موجودہ حالات میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

انسان جب ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اولاً اس کے لئے تنبیہات ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر وہ ان سے سبق نہ لے تو بالآخر وہ خدا کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آجاتا ہے۔

بے شک سب جانداروں میں بدترین اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے انکار کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے۔ جن سے تم نے عہد لیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔ پس اگر تم ان کو لڑائی میں پاؤ تو ان کو ایسی سزا دو کہ جو ان کے پیچھے ہیں وہ بھی دیکھ کر بھاگ جائیں، تاکہ انھیں عبرت ہو۔ اور اگر تم کو کسی قوم سے بدعہدی کا ڈر ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو، ایسی طرح کہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔ بے شک اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا ۵۸ — ۵۵

مدینہ کے یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرکے خدا کی نظر میں مجرم ہو چکے تھے۔ اس جرم پر مزید اضافہ ان کی بدعہدی تھی۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود مدینہ کے درمیان یہ تحریری معاہدہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے معاملہ میں غیر جانب دار رہیں گے۔ مگر یہود خفیہ طور پر آپ کے دشمنوں (مشرکین) سے مل کر آپ کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ یہ کفر پر بدعہدی کا اضافہ تھا۔ یہ انکار کے ساتھ کمینگی کو جمع کرنا تھا۔ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں ہولناک عذاب ہے اور دنیا میں یہ حکم ہے کہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے تاکہ ان کی شرارتوں کا خاتمہ ہو اور ان کے ارادے پست ہو جائیں۔

اگر کسی قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو اور مسلمان ان کی طرف سے بدعہدی کے اندیشہ کی بنا پر اس عہد کو توڑنا چاہیں تو ضروری ہے کہ وہ پہلے انھیں اس کی اطلاع دیں تاکہ دونوں پیشگی طور پر یہ جان لیں کہ اب دونوں کے درمیان عہد کی حالت باقی نہیں رہی۔ امیر معاویہ اور رومی حکمراں میں ایک بار میعادی معاہدہ تھا۔ معاہدہ کی مدت قریب آئی تو امیر معاویہ نے اپنی فوجوں کو خاموشی کے ساتھ روم کی سرحد پر جمع کرنا شروع کیا تاکہ معاہدہ کی تاریخ ختم ہوتے ہی اگلی صبح کو اچانک رومی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے۔ اس وقت ایک صحابی حضرت عمرو بن عنبسہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ وہ بآواز بلند کہہ رہے تھے اللہ اکبر اللہ اکبر وفاءٌ لا غدرٌ (اللہ اکبر، عہد پورا کرو، عہد کو نہ توڑو) انھوں نے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی: من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عقدۃً ولا یشدھا حتی ینقضی امدھا او ینبذ الیھم علی سواء (جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو کوئی گرہ نہ کھولی جائے اور نہ باندھی جائے یہاں تک کہ معاہدہ کی مدت پوری ہو جائے یا برابری کے ساتھ عہد اس کی طرف پھینک دیا جائے (تفسیر ابن کثیر)

دوسری صورت وہ ہے جب کہ صرف اندیشہ کی بات نہ ہو بلکہ فریق ثانی کی طرف سے عملاً معاہدہ کی واضح خلاف ورزی ہو چکی ہو۔ ایسی صورت میں اجازت ہے کہ فریق ثانی کو مطلع کئے بغیر جوابی کارروائی کی جائے۔ غزوۂ مکہ اسی کی مثال ہے۔ قریش نے آپ کے حلیف (بنو خزاعہ) کے خلاف بنو بکر کی جارحانہ کارروائی میں شریک ہو کر معاہدۂ حدیبیہ کی یک طرفہ خلاف ورزی کی تو آپ نے قریش کو پیشگی اطلاع دئے بغیر ان کے خلاف خاموش کارروائی فرمائی۔

اور انکار کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہرگز اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے۔ اور ان کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے تیار رکھو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ اس سے تمہاری ہیبت رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کروگے وہ تمہیں پورا کردیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لئے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت اور مومنین کے ذریعہ تم کو قوت دی۔ اور ان کے دلوں میں اتفاق پیدا کردیا۔ اگر تم زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کرڈالتے تب بھی ان کے دلوں میں اتفاق پیدا نہ کرسکتے۔ لیکن اللہ نے ان میں اتفاق پیدا کردیا، بے شک وہ زور آور ہے حکمت والا ہے ۵۹ — ۶۳

اسلام کا اعتماد استعمال قوت سے زیادہ مظاہرۂ قوت پر ہے۔ اسی لئے اہل اسلام کو قوت مرہبہ فراہم کرنے کا حکم دیا گیا، یعنی وہ چیزیں جو حریف کو اس قدر مرعوب کریں کہ وہ اقدام کا حوصلہ کھو دے۔ اسلام وقت کے معیار کے مطابق اپنے کو طاقت ور بناتا ہے، مگر لازماً لڑنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس لئے تاکہ اس کے دشمنوں پر اس کی دھاک قائم رہے اور وہ اس کے خلاف جارحانہ کارروائی کی ہمت نہ کریں۔ اسلام کو وقت کے معیار کے مطابق فکری اور عملی اعتبار سے طاقت ور بنانے میں جو لوگ اپنی کمائی خرچ کریں گے وہ کئی گنا زیادہ مقدار میں اس کا بدلہ اپنے رب کے یہاں پائیں گے۔

اسلام کی فتح کا راز اصلاً جنگی مقابلوں میں نہیں بلکہ اس کے اصولوں کی تبلیغ میں ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ جب بھی فریق ثانی صلح کی پیش کش کرے تو ہر اندیشہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو قبول کرلو۔ کیونکہ اندیشہ بہرحال یقینی نہیں اور جنگ بندی کا یہ فائدہ یقینی ہے کہ پرامن فضا میں اسلام کا دعوتی عمل شروع ہوجائے اور اس طرح جنگ کا رکنا اسلام کی نظریاتی توسیع کا سبب بن جائے۔

اسلام خود اپنی ذات میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ خدا اور آخرت کا عقیدہ اگر پوری طرح کسی گروہ کے افراد میں پیدا ہوجائے تو ان کے اندر سے وہ تمام نفسیاتی خرابیاں نکل جاتی ہیں جو نااتفاقی اور باہمی ٹکراؤ کا باعث ہوتی ہیں۔ اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب باہم جڑ کر ایک ہوجاتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے۔ متحد گروہ اگر تعداد میں کم ہو تب بھی وہ اپنے سے زیادہ تعداد رکھنے والے گروہ پر غالب آجائے گا۔

باہمی اتفاق سب سے زیادہ مشکل چیز ہے کسی گروہ کے نصرت یافتہ ہونے کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کے افراد باہم متحد رہیں، کوئی بھی چیز ان کے اتحاد کو توڑنے والی ثابت نہ ہو۔

اے نبی تمھارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ مومنین جنھوں نے تمھارا ساتھ دیا ہے۔ اے نبی مومنین کو لڑائی پر ابھارو۔ اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سو ہوں گے تو ہزار منکروں پر غالب آئیں گے، اس واسطے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اب اللہ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ پس اگر تم میں سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے ۶۶-۶۴

اہل ایمان کی کم تعداد غیر اہل ایمان کی زیادہ تعداد پر غالب آنے کی وجہ یہ بتائی کہ اہل ایمان کے اندر فقہ ہوتی ہے جب کہ غیر اہل ایمان فقہ سے محروم ہیں۔ فقہ کے لفظی معنی سمجھ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ بصیرت اور شعور ہے جو ایمان کے نتیجہ میں ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ خدا پر ایمان کسی آدمی کے لئے وہی معنی رکھتا ہے جو اندھیرے کمرے میں بجلی کا بلب جل جانا۔ بلب پورے کمرے کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ اس کی ہر چیز واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ اسی طرح ایمان آدمی کو ایک ربانی شعور عطا کرتا ہے جس کے بعد وہ تمام حقیقتوں کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے لگتا ہے۔

ایمان کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی اور موت کی حقیقت کو سمجھ لیتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ اصل چیز حیات دنیا نہیں بلکہ حیات آخرت ہے۔ یہ چیز اس کو بے پناہ حد تک نڈر بنا دیتی ہے۔ وہ موت کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ اس کے لئے جنت میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ مومن شہادت کو جنت کا مختصر راستہ سمجھتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جان دینا اس کے لئے مطلوب چیز بن جاتا ہے، جب کہ غیر مومن کی جنت یہی موجودہ دنیا ہے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تاکہ اپنی جنت کا لطف اٹھا سکے۔ غیر مومن قومی شعور کے تحت لڑتا ہے اور مومن جنتی شعور کے تحت، اور قومی شعور والا کبھی اتنی بے جگری کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔

مومن خدا سے ڈرنے والا ہوتا ہے، وہ آخرت کی فکر کرنے والا ہوتا ہے، یہ مزاج اس کو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک کرتا ہے۔ وہ ضد، نفرت، تعصب، انتقام اور گھمنڈ جیسی چیزوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ دوسری طرف غیر مومن کا معاملہ سراسر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر مومن کے اقدامات منفی نفسیات کے تحت ہوتے ہیں اور مومن کے اقدامات ایجابی نفسیات کے تحت۔ غیر مومن جذباتی انداز سے عمل کرتا ہے اور مومن حقیقت پسندانہ انداز سے۔ غیر مومن انسانوں کا دشمن ہوتا ہے اور مومن صرف انسانوں کی برائی کا۔ غیر مومن تنگ ظرفی کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور مومن وسعت ظرف کے ساتھ۔

ہزار کے مقابلہ میں سو اور دو ہزار کے مقابلہ میں ایک ہزار کے الفاظ بتاتے ہیں کہ قتال کا حکم جماعت اور فوج کے لئے ہے۔ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا کہ ایک دو آدمی ہوں تب بھی وہ لڑنے کے لئے کھڑے ہو جائیں۔

کسی نبی کے لئے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خوں ریزی نہ کرلے۔ تم دنیا کے اسباب چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اور اگر اللہ کا ایک لکھا ہوا پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو طریقہ تم نے اختیار کیا اس کے باعث تم کو سخت عذاب پہنچ جاتا۔ پس جو مال تم نے لیا ہے اس کو کھاؤ، تمہارے لئے حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۶۷ - ۶۹

بدر کی لڑائی میں مسلمانوں نے ستر بڑے بڑے کافروں کو قتل کیا۔ اس کے بعد جب ان کے پاؤں اکھڑنے لگے تو ان کے ستر آدمیوں کو گرفتار کرلیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں اکثر سردار تھے۔ جنگ کے بعد مشورہ ہوا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے۔ صحابہ کی اکثریت نے یہ رائے دی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اس وقت اسلام دشمنوں نے مسلسل حالت جنگ برپا کر رکھی تھی۔ مگر مسلمانوں کے پاس مال نہ ہونے کی وجہ سے سامان جنگ کی بہت کمی تھی۔ یہ خیال کیا گیا کہ فدیہ سے جو رقم ملے گی اس سے سامان جنگ خریدا جاسکتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذ اس رائے کے خلاف تھے۔ حضرت عمر نے کہا: اے خدا کے رسول یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں۔ یعنی اس وقت دشمنوں کی اصل طاقت ہماری مٹھی میں آگئی ہے، ان کو قتل کرکے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی رائے پر عمل فرمایا۔

بعد کو جب وہ آیتیں اتریں جن میں جنگ پر تبصرہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے فدیہ کی رقم کو جائز ٹھہراتے ہوئے اس روش پر اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا اگرچہ بظاہر رحمت وشفقت کا معاملہ تھا۔ مگر وہ اللہ کے دوررس منصوبہ کے مطابق نہ تھا۔ اللہ کا اصل منصوبہ کفر وشرک کی جڑ اکھاڑنا تھا۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے قریش کے تمام لیڈروں کو (ابولہب اور ابوسفیان کو چھوڑ کر) بدر کے میدان میں جمع کر دیا اور ایسے حالات پیدا کئے کہ وہ پوری طرح مسلمانوں کے قابو میں آگئے۔ اگر ان لیڈروں کو اس وقت ختم کر دیا جاتا تو کفر وشرک کی مزاحمت بدر کے میدان ہی میں پوری طرح دفن ہو جاتی۔ مگر لیڈروں کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منظم ہوکر دوبارہ اپنی مزاحمت کی تحریک جاری رکھنے کے قابل ہو گئے۔

یہ فیصلہ جنگی مصلحت کے خلاف تھا۔ وہ مسلمانوں کے لئے عذاب عظیم (سخت مصیبتوں) کا باعث بن جاتا۔ یہ لیڈر اپنے عوام کو ساتھ لے کر اسلام کے سارے معاملہ کو تہس نہس کر دیتے۔ مگر اللہ نے آخری رسول اور آپ کے اصحاب کے لئے پہلے سے مقدر کر دیا تھا کہ وہ لازماً غالب رہیں گے، ان کو زیر کرنے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگی تدبیر میں اس کوتاہی کے باوجود قریش اہل ایمان کے اوپر غالب نہ آسکے۔ اور بالآخر وہی ہوا جس کا ہونا پہلے سے خدا کے یہاں لکھا جا چکا تھا، یعنی مسلمانوں کی فتح اور اسلام کا غلبہ۔

اے نبی تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر وہ تمہیں دیدے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر یہ تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بدعہدی کی تو خدا نے تم کو ان پر قابو دے دیا اور اللہ علم والا حکمت والا ہے ۷۱ — ۷۰

بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا مسلمانوں کے لئے ایک جنگی غلطی تھی۔ مگر خود قیدیوں کے حق میں یہ ایک نئی زندگی فراہم کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جو اپنی مخالفتِ حق کے نتیجہ میں ہلاکت کے مستحق ہو چکے تھے ان کو ایک بار اور موقع مل گیا کہ وہ اسلام کی دعوت اور اس کے مقابلہ میں اپنی بے جا روش پر دوبارہ غور کر سکیں۔ اس مہلت نے ان کے لئے اپنی اصلاح کا نیا دروازہ کھول دیا۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ ان قیدیوں کے دل میں شکست کی بنا پر انتقام کی آگ بھڑکے۔ فدیہ دینے کی وجہ سے ان کو جو ذلت اور نقصان ہوا ہے اس کا بدلہ لینے کے لئے وہ بے چین ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ پھر اسی غلطی کو دہرائیں گے جس کے نتیجہ میں وہ خدا کی پکڑ کے مستحق بن گئے تھے۔ وہ اپنی قوتوں کو اسلام کی مخالفت میں صرف کریں گے جس کا انجام دنیا میں ہلاکت ہے اور آخرت میں عذاب۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ بدر کے میدان میں پیش آنے والے غیر معمولی واقعہ پر غور کریں کہ مسلمانوں کو کمتر اسباب کے باوجود اتنی کھلی ہوئی فتح کیوں نصیب ہوئی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا مسلمانوں کے دین کے ساتھ ہے نہ کہ قریش کے دین کے ساتھ۔ یہ دوسرا ذہن اگر پیدا ہو جائے تو وہ ان کو آمادہ کرے گا کہ وہ اپنی سابقہ روش کو بدلیں اور جس دین کو پہلے اختیار نہ کر سکے اس کو اب سے اختیار کر لیں۔ اور اس طرح دنیا و آخرت میں خدا کے انعام کے مستحق بنیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قریش کے لوگوں میں ایک تعداد ایسی نکلی جن کے دل میں مذکورہ سوال جاگ اٹھا اور جلد یا بدیر وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ حضرت عباس بن عبد المطلب نے زمانہ قیدی میں اسلام قبول کر لیا۔ کچھ دوسرے لوگ بعد کو اسلام کے حلقہ میں آ گئے۔ یہ لوگ اگرچہ گروہی تعصب کی نظر میں ذلیل ہوئے مگر انھوں نے خدا کی نظر میں عزت حاصل کر لی۔ دنیا کا نقصان اٹھا کر وہ آخرت کے فائدہ کے مالک بن گئے۔

قیدیوں کو چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ وہ اس کو احسان سمجھ کر اس کا اعتراف نہیں کریں گے بلکہ پہلے کی طرح دوبارہ سازش اور تخریب کاری کا راستہ اختیار کر کے اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں گے۔ مگر قرآن نے اس اندیشہ کو اہمیت نہ دی۔ کیونکہ خالص حق کے لئے جو تحریک اٹھتی ہے وہ عام طرز کی انسانی تحریک نہیں ہوتی۔ وہ ایک خدائی معاملہ ہوتا ہے۔ اس کی پشت پر خود خدا ہوتا ہے اور خدا سے لڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا۔ اور وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی، وہ لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان لائے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمھارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں جب تک کہ وہ ہجرت کرکے نہ آجائیں۔ اور وہ تم سے دین کے معاملہ میں مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے، الا یہ کہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف ہو جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور جو لوگ منکر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ پھیلے گا اور بڑا فساد ہوگا ۷۲ - ۷۳

عام طور پر جب ایک آدمی دوسرے کی مدد کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ آدمی اس کے اپنے خاندان کا ہے، اس سے گروہی اور جماعتی تعلق ہے۔ مگر ہجرت کے بعد مدینہ میں جو اسلامی معاشرہ قائم ہوا وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں گھر والوں نے اپنے گھر ایسے لوگوں کو دے دیے جن سے تعلق کی بنیاد صرف دین تھی۔ جو لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ آئے وہ بھی اللہ کے لئے اور آخرت طلبی کے لئے آئے۔ اور جنھوں نے ان اجنبی لوگوں کو اپنے مال اور اپنی جائداد میں شریک کیا وہ بھی صرف اس لئے تاکہ ان کا خدا ان سے خوش ہو اور آخرت میں انھیں جنتوں میں داخل کرے۔

یہ ایک ایسا سماج تھا جس میں اہم چیز خاندان اور نسب نہیں بلکہ ایمان و اسلام تھا۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے مگر دنیوی فائدہ کے لئے نہیں بلکہ آخرت کے فائدہ کے لئے۔ وہ ایک دوسرے کو دیتے تھے مگر پانے والے سے کسی بدلہ کی امید میں نہیں بلکہ اللہ سے انعام کی امید میں۔ وہی معاشرہ حقیقۃً اسلامی معاشرہ ہے جہاں تعلقات خاندانی رشتوں اور گروہی عصبیتوں پر قائم نہ ہوں بلکہ حق کی بنیاد پر قائم ہوں۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے حامی و ناصر اس بنیاد پر ہوں کہ وہ ان کے دینی بھائی ہیں نہ کہ اس بنیاد پر کہ دنیوی مصلحتوں میں سے کوئی مصلحت ان کے ساتھ وابستہ ہے۔

ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے حق کے معاملہ میں مدد طلب کرے تو اس وقت اس کی مدد کرنا بالکل لازم ہے۔ اگر مسلمانوں میں باہمی مدد کی یہ روح باقی نہ رہے تو یہ ہوگا کہ شریر لوگ کمزور مسلمانوں پر دلیر ہوجائیں گے اور ان کی زندگی اور ان کے ایمان کا محفوظ رہنا سخت مشکل ہوجائے گا۔ حق کے مخالفین اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے انتہائی متعصب ہوتے ہیں پھر حق کے ماننے والے اپنے ساتھیوں کی مدد میں کیوں نہ سرگرم ہوں۔ اس میں استثنا صرف اس وقت ہے جب کہ معاملہ بین اقوامی عہد اور مسلمانوں کی مدد کرنا بین اقوامی پیچیدگیاں پیدا کرنے کے ہم معنی سمجھا جائے۔

"ہجرت" جنت میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ ایک بندہ جب خدا کے ناپسندیدہ مقام سے نکل کر خدا کے پسندیدہ مقام کی طرف جاتا ہے تو دراصل وہ غیر جنت کو چھوڑ کر جنت میں داخل ہوتا ہے۔

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے بخشش ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا وہ بھی تم میں سے ہیں۔ اور خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں اللہ کے نوشتہ میں۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۵ ۷ - ۷۴

خدا پر ایمان لانا خدا کے لئے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ ایسے لوگ اکثر ان لوگوں کے درمیان اجنبی بن جاتے ہیں جو خدا کے سوا کسی اور چیز کی خاطر زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ اجنبیت کبھی اتنی بڑھتی ہے کہ ہجرت کی نوبت آجاتی ہے۔ ماحول کی مخالفت کے نتیجہ میں پوری زندگی جدوجہد اور جاں فشانی کی زندگی بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے نزدیک سچے مومن ہیں۔ اس کے بعد سچا ایمان ان لوگوں کا ہے جو اسلام کی خاطر برباد ہوجانے والے اس قافلہ کے پشت پناہ بنیں وہ ان کو جگہ دیں اور ان کی ہر ممکن مدد کے لئے کھڑے ہوجائیں۔ جن کی زندگیاں جنہیں لٹی ہیں وہ اپنا اثاثہ ان لوگوں کے حوالے کر دیں جن کی زندگیاں اسلام کی راہ میں لٹ گئی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی مسلم بننے کے لئے آدمی کو دو میں سے کم از کم ایک چیز کا ثبوت دینا ہے۔ آدمی یا تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ اس طرح وابستہ کرے کہ اگر اس کو اپنی بنی بنائی دنیا اجاڑ دینی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرے، آرام کی زندگی کو بے آرامی کی زندگی بنا دینا پڑے تو اس کو بھی گوارا کرلے۔ پھر یہ کہ اسلام کی خاطر جب کچھ لوگ اپنا اثاثہ لٹا دیں تو وہ لوگ جو ابھی لٹنے سے محفوظ ہیں وہ پہلے فریق کی مدد کے لئے اپنا بازو کھول دیں، حتی کہ ضرورت ہو تو اپنی کمائی اور اپنی جائداد میں بھی ان کو شریک کرلیں ——— سچا ایمان کسی کو یا تو "مہاجر" بننے کی سطح پر ملتا ہے یا "انصار" بننے کی سطح پر۔

یہی دو قسم کے لوگ ہیں جن کے لئے خدا کے یہاں مغفرت اور رزق کریم ہے۔ آخرت میں آنے والی جنت انتہائی ستھری اور نفیس دنیا ہے۔ وہ ایک کامل دنیا ہے اور کامل دنیا میں بسائے جانے کے لائق وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود بھی کامل ہوں۔ کوئی انسان اپنی بشری کمزوریوں کی بنا پر ایسی کاملیت کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ تاہم اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص مذکورہ دونوں کسوٹی میں سے کسی ایک کسوٹی پر پورا اترے گا خدا اپنی قدرت سے اس کی کمیوں کی تلافی کرکے اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔

دین کی بنیاد پر بھائی بننے والوں کی مدد اور حمایت بے حد اہم ہے تاہم وہ رحمی رشتوں کے حقوق اور ان کے درمیان وراثتوں کی تقسیم پر اثر انداز نہ ہوگی۔ اپنی خواہش کے تحت کوئی شخص اپنے اہل خاندان کے لئے جن چیزوں کو ضروری سمجھے ان کی کوئی اہمیت اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ تاہم اللہ نے خود اپنی کتاب میں اہل خاندان کے لئے حقوق اور وراثت کا جو قانون مقرر کر دیا ہے وہ ہر حال میں قائم رہے گا۔ اور کوئی دوسری چیز اس کی ادائگی کے لئے عذر نہیں بن سکتی۔

آیاتہا ۱۲۹　　　　　　　　سورۃ التوبہ مدنیۃ　　　　　　　　رکوعاتہا ۱۶

اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ منکروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اعلان ہے اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن لوگوں کے لئے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں۔ اب اگر تم لوگ توبہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم منہ پھیرو گے تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوش خبری دے دو۔ مگر جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کیا تھا پھر انھوں نے تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا معاہدہ ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے　۱-۴

موجودہ دنیا میں انسان کو رہنے بسنے کا جو موقع دیا گیا ہے وہ کسی حق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض آزمائش کے لئے ہے۔ خدا جب تک چاہتا ہے کسی کو اس زمین پر رکھتا ہے اور جب اس کے علم کے مطابق اس کی مدت امتحان پوری ہو جاتی ہے تو اس پر موت وارد کرکے اس کو یہاں سے اٹھا لیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ پیغمبر کے مخاطبین کے ساتھ دوسری صورت میں کیا جاتا ہے۔ پیغمبر جن لوگوں کے درمیان آتا ہے ان پر وہ آخری حد تک حق کی گواہی دیتا ہے۔ پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے بعد جو لوگ ایمان نہ لائیں وہ خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق کھو دیتے ہیں۔ وہ آزمائش کی غرض سے یہاں رکھے گئے تھے۔ اتمام حجت نے آزمائش کی تکمیل کر دی۔ پھر اس کے بعد زندگی کا حق کس لئے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے کام کی تکمیل کے بعد ان کے اوپر کوئی نہ کوئی ہلاکت خیز آفت آتی ہے اور ان کا استیصال کر دیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ مگر ان پر کوئی آسمانی آفت نہیں آئی۔ ان کے اوپر خدا کی مذکورہ سنت کا نفاذ اسباب کے نقشہ میں کیا گیا۔ اولاً قرآن کے برتر اسلوب اور پیغمبر کے اعلیٰ کردار کے ذریعہ ان کو دعوت پہنچائی گئی۔ پھر اہل توحید کو مکہ کے اہل شرک پر غالب کرکے ان کے اوپر اتمام حجت کر دیا گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور اس کے باوجود وہ انکار کی روش پر قائم رہے تو ان کو مسلسل خیانت اور عہد شکنی کا مجرم قرار دے کر ان کو الٹی میٹم دیا گیا کہ چار ماہ کے اندر اپنی اصلاح کر لو، ورنہ مسلمانوں کی تلوار سے تمہارا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

پھر یہ سارا معاملہ تقویٰ کے اصول پر کیا گیا نہ کہ قومی سیاست کے اصول پر ——— مشرکین کو دلائل کے میدان میں لاجواب کر دیا گیا، ان کو پیشگی انتباہ کے ذریعہ کئی مہینے تک سوچنے کا موقع دیا گیا۔ آخر وقت تک ان کے لئے دروازہ کھلا رکھا گیا کہ جو لوگ توبہ کر لیں وہ خدا کے انعام یافتہ بندوں میں شامل ہو جائیں۔ جن بعض قبائل نے معاہدہ نہیں توڑا تھا ان کے معاملہ کو معاہدہ توڑنے والوں سے الگ رکھا گیا، وغیرہ۔

پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی گھات میں۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کے امان کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے ۶ — ۵

مہلت کے چار مہینے گزرنے کے بعد یہاں جس جنگ کا حکم دیا گیا وہ کوئی عام جنگ نہ تھی یہ خدا کے قانون کے مطابق وہ عذاب تھا جو پیغمبر کے انکار کے نتیجہ میں ان پر ظاہر کیا گیا۔ انھوں نے اتمام حجت کے باوجود خدا کے پیغمبر کا انکار کرکے اپنے کو اس کا مستحق بنا لیا تھا کہ ان کے لئے تلوار یا اسلام کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رکھی جائے۔ یہ خدا کا ایک خصوصی قانون ہے جس کا تعلق پیغمبر کے مخاطبین سے ہے نہ کہ عام لوگوں سے۔ تاہم اتمام حجت کے بعد بھی اس حکم کا نفاذ اچانک نہیں کیا گیا بلکہ آخری مرحلہ میں پھر انھیں چار ماہ کی مہلت دی گئی۔

انتقام معاف کرنا نہیں جانتا۔ انتقامی جذبہ کے تحت جو کارروائی کی جائے اس کو صرف اس وقت تسکین ملتی ہے جب کہ وہ اپنے حریف کو ذلیل اور برباد ہوتے ہوئے دیکھ لے۔ مگر عرب کے مشرکین کے خلاف جو کارروائی کی گئی اس کا تعلق کسی قسم کے انتقام سے نہیں تھا بلکہ وہ سراسر حقیقت پسندانہ اصول پر مبنی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے شدید حکم کے باوجود ان کے لئے یہ گنجائش ہر وقت باقی تھی کہ وہ دین اسلام کو اختیار کرکے اپنے کو اس سزا سے بچالیں اور اسلامی برادری میں عزت کی زندگی حاصل کریں۔ کسی کی توبہ کے قابل قبول ہونے کے لئے صرف دو عملی شرط کا پایا جانا کافی ہے۔ نماز اور زکوٰۃ۔

جنگ کے دوران میں دشمن کا کوئی فرد یہ کہے کہ میں اسلام کو سمجھنا چاہتا ہوں تو مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس کو امان دے کر اپنے ماحول میں آنے کا موقع دیں اور اسلام کے پیغام کو اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کریں۔ پھر بھی اگر وہ قبول نہ کرے تو اپنی حفاظت میں اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دیں۔ عام حکم کے تحت اگرچہ وہ گردن زدنی ہے مگر ایسا نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے دین کی بات نہیں مانی ہے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ جب کوئی شخص امان میں ہو تو امان کے دوران اس پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔

جنگ کے زمانہ میں دشمن کو اس قسم کی رعایت دینا انتہائی نازک ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ دشمن کا کوئی جاسوس اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے اندر گھس آئے اور ان کے فوجی راز معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ مگر اسلام کی نظر میں دعوت وتبلیغ کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم ہے کہ اس نازک خطرہ کے باوجود اس کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

ایک شخص اگر بے خبری اور لاعلمی کی بنا پر ظلم کرے تو اس کا ظلم خواہ کتنا ہی زیادہ ہو مگر اس کے ساتھ ہر ممکن رعایت کی جائے گی تاوقتیکہ اس کی لاعلمی اور بے خبری ختم ہو جائے۔

ان مشرکوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کوئی عہد کیسے رہ سکتا ہے، مگر جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس، پس جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ کیسے عہد رہے گا جب کہ یہ حال ہے کہ اگر وہ تمھارے اوپر قابو پائیں تو تمھارے بارے میں نہ قرابت کا لحاظ کریں اور نہ عہد کا۔ وہ تم کو اپنے منھ کی بات سے راضی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے دل انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں اکثر بدعہد ہیں۔ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیا، پھر انھوں نے اللہ کے راستہ سے روکا۔ بہت برا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ کسی مومن کے معاملہ میں وہ نہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہد کا، یہی لوگ ہیں زیادتی کرنے والے۔ پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔ اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیات کو جاننے والوں کے لئے ۱۱-۷

مسلمانوں کو جب زور حاصل ہوگیا تو قریش نے ان سے معاہدے کرلئے۔ تاہم وہ ان معاہدوں سے خوش نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے "دشمن" سے یہ معاہدہ انھوں نے اپنی بربادی کی قیمت پر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت اس انتظار میں رہتے تھے کہ جہاں موقع ملے معاہدہ کی خلاف ورزی کرکے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں یا کم از کم انھیں بدنام کریں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک فریق کی طرف سے اس قسم کی خیانت کا مظاہرہ ہو تو دوسرے فریق کے لئے کسی معاہدہ کی پابندی ضروری نہیں رہتی۔

یہ قریش کا حال تھا جن کو مسلمانوں کے عروج میں اپنی قیادت چھنتی ہوئی نظر آتی تھی۔ تاہم کچھ دوسرے عرب قبائل (بنو کنانہ، بنو خزاعہ، بنو ضمرہ) جو اس قسم کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے، انھوں نے مسلمانوں سے معاہدے کئے اور اپنے معاہدے پر قائم رہے۔ جب چار ماہ کی مہلت کا اعلان کیا گیا تو ان کے معاہدہ کی میعاد پوری ہونے میں تقریباً نو مہینے باقی تھے۔ حکم ہوا کہ ان سے معاہدہ کو آخر وقت تک باقی رکھو، کیونکہ تقویٰ کا تقاضا یہی ہے۔ مگر اس مدت کے ختم ہونے کے بعد پھر کسی سے اس قسم کا معاہدہ نہیں کیا گیا اور تمام مشرکین کے سامنے صرف دو صورتیں باقی رکھی گئیں یا اسلام لائیں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

معاشرتی زندگی کی بنیاد ہمیشہ دو چیزوں پر ہوتی ہے۔ رشتہ داری یا قول وقرار۔ جن سے رحمی رشتے ہیں ان کے حقوق کا لحاظ آدمی رحمی رشتوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اور جن سے قول وقرار ہو چکا ہے ان سے قول وقرار کی بنا پر۔ مگر جب آدمی کے اوپر دنیا کے مفاد اور اس کی مصلحت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ دونوں باتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے حقیر فائدہ کی خاطر رحمی حقوق کو بھی بھول جاتا ہے اور قول وقرار کو بھی۔ ایسے لوگ حد سے گزر جانے والے ہیں۔ وہ خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں اگر وہ چھوٹ گئے تو آخرت میں وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہ سکیں گے۔ الا یہ کہ وہ توبہ کریں اور اپنی سرکشی سے باز آئیں۔ کوئی شخص ماضی میں خواہ کتنا ہی برا رہا ہو مگر جب وہ اصلاح قبول کرے تو وہ اسلامی برادری کا ایک معزز رکن بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

اور اگر عہد کے بعد یہ اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں عیب لگائیں تو کفر کے ان سرداروں سے لڑو۔
بے شک ان کی قسمیں کچھ نہیں، تاکہ وہ باز آئیں۔ کیا تم نہ لڑوگے ایسے لوگوں سے جنھوں نے اپنے عہد توڑ دئے
اور رسول کو نکالنے کی جسارت کی اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ میں پہل کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ اللہ زیادہ
مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ ان سے لڑو۔ اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا اور ان کو رسوا
کرے گا اور تم کو ان پر غلبہ دے گا اور مسلمان لوگوں کے سینہ کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دل کی جلن کو دور
کر دے گا اور اللہ توبہ نصیب کرے گا جس کو چاہے گا اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا ہے ۱۲-۱۵

ائمہ کفر سے مراد قریش ہیں جو اپنے قائدانہ مقام کی وجہ سے عرب میں اسلام کے خلاف تحریک کی امامت کر رہے تھے۔ قریش کے اس کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تحریک جب اٹھتی ہے تو اس کا پہلا مخالف کون گروہ بنتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جس کو بے آمیز حق کے پیغام میں اپنی بڑائی پر زد پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وہ سربرآوردہ طبقہ ہے جس کے پاس وہ ذہن ہوتا ہے کہ وہ اسلامی دعوت میں شوشے نکال کر لوگوں کو اس کی طرف سے مشتبہ کرے۔ اسی کے پاس وہ وسائل ہوتے ہیں کہ وہ اسلام کے داعیوں کی حوصلہ شکنی کے لئے ان کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈالے۔ اسی کے پاس وہ زور ہوتا ہے کہ وہ حق پرستوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کی تدبیریں کرے۔ حتٰی کہ اسی کو یہ مواقع حاصل ہوتے ہیں کہ اسلام کے ماننے والوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی آگ بھڑکا سکے۔

"ان کے عہد کچھ نہیں" بہت معنی خیز فقرہ ہے۔ جو لوگ دشمنی اور ضد کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہوں ان کے وعدے اور معاہدے بالکل غیر یقینی ہوتے ہیں۔ ان کی نفسیات میں اپنے حریف کے خلاف مستقل اشتعال برپا رہتا ہے۔ ان کے اندر ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ وہ اگر معاہدہ بھی کرلیں تو اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کو دیر تک باقی رکھنے پر قادر نہیں ہوتے۔ زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ اپنے منفی جذبات سے مغلوب ہو کر وہ معاہدہ کو توڑ دیتے ہیں اور اس طرح اہل حق کو یہ موقع دیتے ہیں کہ اپنے اوپر پہل کا الزام لئے بغیر وہ ان کے خلاف مدافعانہ کارروائی کریں اور خدا کی مدد سے ان کا خاتمہ کردیں۔

تمام حکمت اور دانائی کا سرا اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر اعتراف کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر وہ شعور جگاتا ہے کہ وہ حقیقتوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے کے لئے خدائی منصوبہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ خدائی منشا کو جان کر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے آپ کو اس میں لگا دیتا ہے۔ وہ اس صحیح ترین راستہ پر چل پڑتا ہے جس کی آخری منزل صرف کامیابی ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کی آنکھوں کو اشک آلود کر دیتا ہے۔ مگر اللہ کے لئے بھیگی ہوئی آنکھ ہی وہ آنکھ ہے جس کے لئے یہ مقدر ہے کہ اس کو ٹھنڈک حاصل ہو، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

خدا کی قدرت

ابو العلاء المعری کا ایک شعر ہے :

تَبَارَكْتَ أَنْهَارُ البِلَادِ سَوَائِحٌ   بِعَذْبٍ وَخُصَّتْ بِالْمُلُوحَةِ زَمْزَمُ

خدایا تیری برکت، دنیا کی تمام نہریں میٹھا پانی لے کر بہہ رہی ہیں اور زمزم ہی کو خاص طور پر کھاری بنا دیا گیا۔ یہ تمثیل کے انداز میں ایک بڑی گہری حقیقت کا اظہار ہے۔ دنیا کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں تمام سطحی چیزیں مزہ دار ہیں اور تمام گہری چیزیں بے مزہ ہیں۔ اگر آپ کو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دینا ہو تو آپ کو غصہ اور نفرت کا کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا جب کہ تنگ ظرفی کے لئے اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں کہ آدمی کے اندر جو تلخی یا کڑواہٹ پیدا ہو وہ اس کو دوسرے کے اوپر انڈیل دے۔ اگر آپ کو کوئی حقیقی کام کرنا ہو تو آپ کو با اصول آدمی بننے کی سختی برداشت کرنی ہوگی، جب کہ بے مقصد انسان بن کر جینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ جہاں جیسا موقع ہو وہاں اسی روش کا مظاہرہ کر دیا جائے۔ اگر آپ کو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جینا ہے تو پوری زندگی پر طرح طرح کی روک لگانی پڑے گی، جب کہ بے مقصد زندگی گزارنے کے لئے صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بے لگام چھوڑ دیا جائے۔

آزادی کے بعد ہندستان کی جو پہلی منتخب پارلیمنٹ بنی اس کے ایک ممبر پروفیسر ہیرن مکرجی تھے۔ پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں شرکت کے بعد جب وہ دہلی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے تو ان پر ایک عجیب کیفیت گزری۔ تیز رفتار ٹرین کی فرسٹ کلاس بوگی ان کو لئے ہوئے دہلی کے جنوبی علاقہ سے گزر رہی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے دونوں طرف جھگی جھونپڑیوں اور گندے محلوں کا سلسلہ ہے جو دور تک چلا گیا ہے۔ ان کو یہ سوچ کر سخت صدمہ ہوا کہ آزادی کے انقلاب نے چند خوش قسمت لوگوں کو تو بہت کچھ دیا ہے مگر کروروں عوام کے لئے اس انقلاب کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ کلکتہ پہنچ کر انھوں نے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط لکھا جس میں اپنے مذکورہ تاثر کا ذکر کرتے ہوئے یہ درج تھا کہ جب میں دہلی کی ان غریب بستیوں سے گزرا تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ لوگ اگر مجھ سے پوچھیں کہ تمھاری آزادی سے ہم کو کیا ملا تو میرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔ پنڈت نہرو نے پروفیسر ہیرن مکرجی کے اس خط کا جو جواب دیا اس کا ایک فقرہ یہ تھا: تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو:

You are paying the price of being sensitive

بے ضمیر انسان کو کروروں جھونپڑیوں کا منظر کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کرتا۔ مگر جس شخص کا ضمیر زندہ ہو اس کو یہ گندی جھونپڑیاں اس طرح تڑپا دیں گی کہ اس کا نرم گدا اس کے لئے کانٹوں کا بستر بن جائے ——— اعلیٰ انسانیت ہمیشہ تلخ گھونٹ پی کر ملتی ہے جب کہ گھٹیا انسان بننے کے لئے سطحیت اور موقع پرستی کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

زندگی کا ساز

ایک ماہر نفسیات نے کہا ہے : مصیبت، غم اور درد ہماری زندگی کو مزید پھیلاؤ عطا کرتے ہیں۔ جو لوگ سخت مشکلیں اٹھاتے ہیں وہ زندگی کا ہر پہلو سے تجربہ کرتے ہیں۔ وہ پیالہ کو اس کی تلچھٹ تک پی جاتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ صرف اوپر کے بلبلوں ہی کو پاتے ہیں (ریڈرز ڈائجسٹ اپریل ۱۹۸۱)

Adversity, sorrow and pain give our lives an added dimension. Those who suffer deeply touch life at every point, they drain the cup to the dregs while others sip only the pubbles on top.

ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کو اور اس کے بچوں کو سکھ کی زندگی ملے۔ مگر سکھ کی زندگی ہی آدمی کی سب سے بڑی قاتل ہے۔ سکھ کی زندگی آدمی کے ظاہری جسم میں کچھ رونقوں کا اضافہ ضرور کر دیتی ہے مگر ظاہری وجود کا یہ پُر رونق اضافہ صرف اندرونی وجود کی رونقوں کو ختم کرنے کی قیمت پر حاصل ہوتا ہے۔

زندگی ایک مہر بند ساز ہے۔ اس ساز کو جو چیز چھیڑتی ہے وہ غم ہے نہ کہ مسرت۔ جب آدمی غم سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی فطرت کا ساز بج اٹھتا ہے۔ اس کے اندرونی وجود میں چھپے ہوئے نغموں کا ریکارڈ بجنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ غم سے محروم ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ڈبہ میں بند ہو کر شہر میں آیا اور اسی میں بند رہ کر واپس چلا گیا۔

ایک مغربی شاعر کا شعر ہے کہ ــــ" ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ غمگین نغمے ہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ غم ناک آوازوں میں آدمی کی پوری شخصیت انڈیل اٹھتی ہے جب کہ پُر مسرت نغموں میں آدمی اپنے آپ کو صرف جزئی طور پر ہی منتقل کر پاتا ہے۔ دردمند کلام آدمی کی پوری ہستی کو چھوتا ہے اور درد سے خالی کلام صرف اس کی ہستی کے جزء کو۔

مسرت خواہ ہم کو کتنا ہی پسند ہو مگر وہ ہمارے وجود کے صرف سطحی حصہ کو چھوتی ہے جب کہ غم ہمارے پورے وجود کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہماری رگ رگ میں اتر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غم کے ذریعہ آدمی اس سے زیادہ حقیقتوں کو پالیتا ہے جتنا مسرت کے ذریعہ۔

فانی بدایونی (۱۹۴۰ــ ۱۸۷۹) کے دو شعر یہاں نقل کرنے کے قابل ہیں۔

جنس حرماں کو خدا عزت ارزانی دے   لذتِ درد سے کم مایۂ غم ہیں محروم

تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا   میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول

دو قسم کے انسان

قرآن میں ہے کہ ہر جی اپنے کئے میں پھنسا ہوا ہے (کل نفس بما کسبت رھینۃ، المدثر ۳۸) لوگ خود اپنے کئے کے حوالے کر دئے جائیں گے (اولئک الذین ابسلوا بما کسبوا، انعام ۷۰) قیامت میں لوگوں سے کہا جائے گا کہ چکھو جو تم کماتے تھے (ذوقوا ما کنتم تکسبون، الزمر ۲۴) یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ یہ تمہارا اپنا کیا ہے جو تمہاری طرف لوٹایا جائے گا (انما ھی اعمالکم ترد الیکم)

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی ایک انڈسٹری (کارخانہ) ہے۔ مومن خدا کی انڈسٹری ہے اور غیر مومن شیطان کی انڈسٹری۔ ہر آدمی جو کچھ ہے اس کے مطابق وہ اپنی پیداوار کا ڈھیر لگا رہا ہے۔ خدا کے علم کے مطابق آدمی جب اپنے حصہ کا کام کر چکا ہوتا ہے تو اس پر موت آجاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی اگلی زندگی شروع ہوتی ہے جہاں وہ ابدی طور پر اپنی اگائی ہوئی فصل کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جس نے کانٹوں کی فصل اگائی تھی وہ اپنے آپ کو کانٹوں میں پھنسا ہوا پاتا ہے اور جس نے پھول اور خوشبو کی فصل اگائی تھی وہ پھول اور خوشبو والے باغوں میں ہمیشہ کے لئے چلا جاتا ہے۔

انڈسٹری کیا ہے۔ انڈسٹری وہ نظام ہے جس کے اندر خام مال ڈالا جائے اور پھر وہ تیار شدہ سامان کی صورت میں برآمد ہو۔ ایک انسان وہ ہے جس کو خدا نے بڑائی دی تو اس نے تواضع کی صورت میں اس کا ردعمل پیش کیا۔ اس کا احتساب کیا گیا تو اس نے عجز کی نفسیات کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے خدا کے راستہ میں اس کا استعمال ڈھونڈ نکالا۔ اس کو مواقع ملے تو وہ ان مواقع میں اپنے آپ کو خدا کی خاطر دفن کرنے پر راضی ہو گیا۔ اس نے لوگوں کے اوپر قابو پایا تو وہ ان کے لئے انصاف اور خیر خواہی کا پیکر بن گیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ اس نے اپنے اندر خدا کی انڈسٹری قائم کی تھی۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوئی وہ ربانی پیکر میں ڈھل کر باہر نکلی۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کی انڈسٹری سے صرف زہر اور انگارے برآمد ہوئے۔ اس کو جب موقع ملا تو اس نے اپنی بڑائی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس کو اس نے اپنی نمود ونمائش میں خرچ کیا۔ اس نے کسی کے اوپر غلبہ پایا تو اس کی بربادی کے منصوبے بنائے۔ اس کو کسی سے اختلاف ہوا تو اس کو اس نے زہریلے کلام اور آتشیں عمل کا مزہ چکھایا۔ اس سے جب کسی کا معاملہ پڑا تو اس کو اس سے خود غرضی، بے انصافی اور دھاندلی کا تجربہ ہوا۔

ایسا آدمی گویا اپنے اندر شیطان کی انڈسٹری قائم کئے ہوئے ہے۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ زہر اور آگ اور بدبو بن کر اس کے باہر آتی ہے۔ موت کے بعد اس کی یہ پیداوار اسے گھیر لے گی۔ وہ اپنے آپ کو خود اپنے بنائے ہوئے جہنم میں پھنسا ہوا پائے گا۔

حج میں کیا نہ کریں

حج کے دنوں میں جو کچھ کرنا منع ہے وہ وہی ہے جس کو بقیہ دنوں میں بھی کرنا منع ہے۔ حج کے دوران میں ان کی ممانعت بطور تربیت ہے۔ حج میں شریعت کی ان ممنوعات پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرایا جاتا ہے تاکہ ان کے بارے میں آدمی کا احساس تیز ہو اور بقیہ دنوں میں ان سے بچنے کی خصوصی استعداد اس کے اندر پیدا ہو جائے۔

انسان جب اپنے گھر اور کاروبار میں ہوتا ہے تو وہ اپنے ذاتی معاملات میں الجھا رہتا ہے اور اس سے آگے کی حقیقتوں کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو روزانہ نماز کی ادائگی کے لئے مسجد میں لایا جاتا ہے تاکہ کچھ دیر کے لئے وہ اپنے ذاتی ماحول سے علیحدہ ہو اور اپنے ذہن کو غیر متعلق چیزوں سے خالی کرکے یکسوئی کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔ حج کے دنوں میں اسی مقصد کے لئے آدمی کو اس کے محدود ماحول سے نکال کر زیادہ لمبی مدت کے لئے حجاز (عرب) کے مختلف مقامات پر لے جایا جاتا ہے۔ حج کسی آدمی کے لئے اس کے دنیوی ماحول سے کامل علیحدگی کا نام ہے تاکہ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔

عرب کے ساتھ بہت سی عظیم دینی روایتیں وابستہ ہیں۔ اس بنا پر حج کے مراسم کی ادائگی کے لئے عرب کا جغرافیہ نہایت موزوں جغرافیہ ہے۔ یہاں کعبہ ہے جس کے بارے میں ہزاروں سال سے تقدس کی روایتیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہاں پیغمبروں کی قربانی کی داستانیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں خدا کے نیک بندوں پر خدا کے انعامات کی یادگاریں ہیں۔ یہ وہ زمین ہے جہاں خدا کے آخری رسول اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں کے نشانات ثبت ہیں۔ اس قسم کی تاریخی نسبتوں نے حج کے مقامات کے ساتھ غیر معمولی تقدس اور احترام کی فضا وابستہ کر دی ہے۔ یہاں کے ماحول میں پہنچتے ہی آدمی کے ذہن میں ایک پوری دینی تاریخ جاگ اٹھتی ہے۔ یہاں بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی دینی حس میں اضافہ ہو جائے۔ وہ زیادہ سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ خدا کے مقرر کئے ہوئے فرائض کو ادا کرنے لگے۔ اسی مخصوص تاریخی اہمیت کی بنا پر اس علاقہ کو خدا نے اس کے لئے چنا کہ یہاں اسلامی زندگی کے بارے میں ایک علامتی مشق (ریہرسل) کرائی جائے اور پھر آدمی کو دوبارہ اس کے سابقہ ماحول میں واپس لایا جائے تاکہ وہ زیادہ بہتر طور پر خدا پرستانہ زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

حج کے زمانہ میں مخصوص مراسم کی ادائگی کے دوران حاجی کے لئے جو چیزیں منع ہیں ان میں سے تین خاص چیزوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ زبان سے کسی شخص کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔

۲۔ کسی جانور کو نہ مارنا اور نہ اس کو زخمی کرنا۔

۳۔ لذت اور آرائش کی چیزوں سے پرہیز۔ مثلاً ناخن کاٹنا، بال سنوارنا، سلا ہوا کپڑا پہننا، خوشبو لگانا، ازدواجی تعلقات، وغیرہ

مل جل کر رہنے میں لوگوں کو ایک دوسرے کی جس چیز سے سب سے زیادہ سابقہ پیش آتا ہے وہ زبان ہے۔ ایک شخص کو دوسرے شخص سے سب زیادہ تکلیف زبان ہی سے پہنچتی ہے۔ حج کے زمانہ میں بیک وقت بہت سے لوگوں کا ساتھ ہو جانے کی وجہ سے بار بار یہ موقع آتا ہے کہ آدمی کی زبان بے قابو ہو جائے اور ایک مسلمان سے دوسرے مسلمان کو ٹھیس پہنچے۔ چنانچہ حج کے موسم کو خصوصیت سے اس کی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا زبان سے کسی کو تکلیف پہنچانا عام دنوں میں اسلامی اخلاقیات کا ایک جزء ہے۔ مگر حج کے دنوں میں اس کو اسلامی عبادات کا لازمی جزء بنا دیا گیا تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اہتمام کر کے اپنے کو اس سماجی برائی سے بچائیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: حج کے چند معلوم مہینے (شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ) ہیں۔ جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہو اور نہ بد کلامی اور نہ جھگڑا اور تکرار کیا جائے (بقرہ ۱۹۷) زبان سے دوسروں کو تکلیف پہنچانے کی یہی تین خاص صورتیں ہیں۔ آدمی فحش باتیں اپنی زبان سے نکالتا ہے جو دوسروں کے لئے دل خراشی کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ دوسرے کو برے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اس کے بارے میں نازیبا کلمات بول کر اس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بات چیت کے دوران تکرار اور سخت کلامی پر اتر آتا ہے۔ یہ تمام چیزیں حج میں بالکل حرام کر دی گئیں۔ تاکہ ان کے بارے میں آدمی کی حساسیت بڑھ جائے اور جب وہ حج کے مقدس سفر سے لوٹے تو اس کے اثر سے اس کی زبان ہمیشہ کے لئے ان چیزوں سے محفوظ ہو چکی ہو۔

حج کے لئے احرام باندھنے کے بعد خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا حاجی کے لئے حرام ہے۔ حتیٰ کہ شکار کئے ہوئے جانور کا گوشت بطور ہدیہ قبول کرنا، پرند کا پر اکھاڑنا، شکار میں مدد دینا، شکار کے جانور کو ذبح کرنے کے لئے چھری دینا، وغیرہ سب حاجی کے لئے حرام ہیں۔

حج کے دوران میں حاجی کسی موذی جانور مثلاً سانپ کو مار سکتا ہے۔ یا وہ قربانی کے جانور کو ذبح کرتا ہے جو حج کے مراسم کا ایک جزء ہے۔ اس کے علاوہ کسی جانور کو مارنا یا اسے تکلیف دینا حرام ہے۔ جانور کا شکار عام حالات میں بالکل جائز ہے مگر حج کے دوران شکار کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ دراصل ایک شرعی حکم پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرانا ہے۔ آدمی پر یہ فرض ہے کہ وہ انسان کو نہ مارے، وہ کسی جان دار کو نہ ستائے۔ یہ شریعت کا ایک عام حکم ہے جو ہر آدمی سے ہر حال میں مطلوب ہے، مگر حج کے دوران اس کو شکار کے جانوروں تک وسیع کر کے اس حکم کے بارے میں آدمی کے احساس کو تیز کیا جاتا ہے تاکہ حج سے واپسی کے بعد وہ زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کی تعمیل کر سکے۔

اسلامی زندگی کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھ کر زندگی گزاری جائے۔ حج کے سفر کو اس قسم کی پابند زندگی کے لئے خصوصی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ حج کی یہ حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے: جس شخص نے حج کے مراسم اس طرح ادا کئے کہ مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہے تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے (مَن قضیٰ نُسُکَہ وسَلِمَ المسلمون

[illegible]

جس چیز سے خاص طور پر بچنا ہے وہ یہ کہ اس کی زبان سے کسی بندۂ خدا کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اس کے ہاتھ سے کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو حج آدمی کے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے وہ وہی حج ہے جس سے آدمی اس قسم کی زبان اور اس قسم کا ہاتھ لے کر واپس آیا ہو۔

حج کے دوران لذت اور آرائش کی چیزوں کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ حج کا عمل احرام سے شروع ہوتا ہے۔ احرام ایک سادہ لباس (ایک سفید تہمد اور ایک سفید چادر) ہے جو حرم کے حدود میں داخل ہوتے ہی ہر حاجی اور زائر کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ احرام گویا ایک قسم کا فقیرانہ لباس ہے جو زیارت کعبہ کے لئے پہنا جاتا ہے۔ یہ پہلی علامتی تدبیر ہے جس کے ذریعہ سے خدا اپنے بندوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ سارے انسان برابر ہیں۔ جن ظاہری چیزوں کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں یا کسی کو اونچا یا کسی کو نیچا سمجھتے ہیں وہ سب خدا کی نظر میں سراسر باطل ہیں۔ خدا سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے حج کے زمانہ میں لاکھوں حاجی ایک قسم کا لباس پہننے کی وجہ سے بالکل ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا حج کا احرام اسلام کے اس اصول کا ایک عملی مظاہرہ ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ جو لوگ خدا کے اچھے بندے بننا چاہتے ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے دوسرے "لباس" اپنے اوپر سے اتار دیں اور سب مل کر ایک ہو جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ حاجی کون ہے۔ آپ نے فرمایا "پراگندہ بال اور غبار آلود" ان الفاظ میں اصلی حاجی کی تعریف بتائی گئی ہے۔ الجھے ہوئے بال اور گرد سے اٹا ہوا جسم بامقصد آدمی کی پہچان ہے۔ جب کوئی شخص پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ کو کسی خاص کام کے لئے وقف کر دے تو اس کو آرائش و زیبائش کی فرصت نہیں رہتی۔ حج میں بالقصد اس قسم کا حلیہ بنانے کا حکم گویا بامقصد زندگی گزارنے کا ایک تاکیدی سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدائی مقصد میں اپنے آپ کو اس حد تک مشغول کرے کہ اس کو اپنے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی شدت نہ رہے۔ وہ وقتی لذتوں کو بھول جائے۔ برتر مقصد کو پانے کی دھن میں اس کو اپنے ذاتی تقاضے یاد نہ رہیں۔

حج کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے: اور تم سفر حج میں تقویٰ کا زاد راہ لو، بہترین زاد راہ تقویٰ کا زاد راہ ہے۔ اے عقل والو اللہ سے ڈرو (بقرہ ۱۹۷)

قدیم عرب میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حج کے لئے زاد راہ لے کر نکلنا دنیا دارانہ فعل ہے، جو شخص حج کے لئے اس طرح نکلے کہ وہ دنیا کا سامان لئے بغیر حج کے سفر پر چل پڑا ہو وہ بڑا پارسا اور دین دار خیال کیا جاتا تھا۔ ایسے لوگ اپنے بارے میں کہتے کہ ہم متوکل ہیں (نحن المتوکلون) ہم خدا کے سوا کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتے۔ مگر قرآن میں یہ بتایا گیا کہ اس قسم کی ظاہری نمائش کا نام دین داری نہیں ہے۔ دین داری کا تعلق دل اور ذہن سے ہے نہ کہ کسی قسم کے خارجی مظاہرہ سے۔ آدمی کو جس چیز سے بچنا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا دل اور اس کا ذہن غیر اللہ کے ڈر سے خالی ہو، نہ یہ کہ اس کی جھولی میں کوئی کھانے پینے کا سامان نظر نہ آتا ہو۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۴ ستمبر ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

عمل کے نام پر بے عملی

کسی مفکر کا قول ہے کہ اپنا سفر اتنے پیچھے سے شروع کرو کہ ہر قدم اٹھانا آگے بڑھنا ہو۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اس قول کو اس طرح بدل دیا ہے ـــــــ اپنے سفر کو اتنا آگے سے شروع کرو کہ ہر قدم اٹھانا پیچھے ہٹنا ہو۔

موجودہ زمانہ میں جو بڑے بڑے مسلم رہنما اٹھے ان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اتنے زیادہ لوگوں نے ان کا ساتھ دیا جتنا زیادہ ساتھ دینے والے تاریخ کے کسی دور میں کسی رہنما کو نہیں ملے، حتیٰ کہ پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کو بھی نہیں۔ مگر ان کی بڑی بڑی تحریکیں عملی نتیجہ کے اعتبار سے قوم کو کچھ نہ دے سکیں۔ بلکہ اکثر اوقات قوم کی بربادی میں اضافہ کا باعث ہوئیں۔

اس صورت حال کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ استعداد سے زیادہ بڑا اقدام کرنا، پیچھے سے چلنے کے بجائے آگے سے چلنے کی کوشش کرنا۔ اگر آپ آغاز سے سفر شروع کریں تو کسی نہ کسی دن آپ اختتام پر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اختتام سے اپنا سفر شروع کرنا چاہیں تو آپ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

ہمارے رہنما ایسے عظیم الشان اجتماعات کرنے میں مشغول ہیں جہاں سے لوگ صرف بددلی لے کر لوٹیں وہ ایسے اقدامات کر رہے ہیں جس کا آخری نتیجہ صرف پسپائی کی صورت میں نکلتا ہو۔ وہ ایسی اسلامی حکومتیں قائم کرتے ہیں جس کو دیکھ کر لوگ کہیں کہ اس سے زیادہ اچھی تو غیر اسلامی حکومت تھی۔ وہ ایسی اتحادی تنظیمیں بناتے ہیں جس کے بطن سے صرف اختلاف وانتشار برآمد ہو۔ وہ ایسی تاریخ ساز کانفرنسیں کرتے ہیں جو صرف تاریخ میں ایک الم ناک باب کا اضافہ کرنے کا باعث ہوں۔ وہ ایسی شان دار قیادتیں کھڑی کرتے ہیں جو صرف ایک بے شان وشوکت قوم کے کھنڈر پر وجود میں آئی ہو۔

یہ ایک بہت بڑی برائی ہے جو ہماری جدید تاریخ میں داخل ہو گئی ہے۔ ہر آدمی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جو شان دار الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہو۔ جو اخباروں کے پہلے صفحہ کی خبر بن سکتا ہو، جس کے نتیجہ میں وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظروں میں آجائے۔ جو اس کو ایسے مقام پر پہنچا دے جہاں لغت کے تمام بڑے بڑے الفاظ اس کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے ناکافی معلوم ہونے لگیں۔

یہ سب عمل کے نام پر بے عملی ہے، اور بے عملی سے کبھی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ عملی نتیجہ کسی واقعی عمل سے برآمد ہوتا ہے نہ کہ عمل کے نام پر بے معنی اچھل کود سے۔

نفرت نہیں محبت

کرکٹ کے کھیل میں سب سے زیادہ کامیاب باؤلر وہ سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ تیز گیند پھینکے۔ ڈینس لیلی، (Dennis Lillee) کرکٹ کا مشہور کھلاڑی ہے۔ اس کی باؤلنگ کی رفتار ۱۴۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ ہے۔ ڈینس لیلی (پیدائش ۱۹۴۹) سے پوچھا گیا کہ تیز باؤلنگ کا راز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا: تیز گیند پھینکنے کی حیرت ناک کوشش کو برقرار رکھنے کے لئے آپ کو عملی طور پر بیٹ والے سے نفرت کرنا ہوگا۔ میں بیٹ والوں کو چور سمجھتا ہوں جو میرے رن کو چرانے کی کوشش کر رہے ہوں:

To keep up the tremendous effort of fast bowling, you' ve practically got to hate the batsman. I think of batsman as thieves, trying to steal runs from me

Reader's Digest, June 1981, P. 48

کھیل کے میدان کا یہی اصول سیاست کے میدان میں بھی رائج ہے۔ ہر سیاسی لیڈر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ جانتا ہے کہ سیاست کو کامیاب بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ نفرت ہے۔ وہ اپنے پیرؤوں میں جتنا زیادہ نفرت کا جذبہ پیدا کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ سرگرمی دکھا سکیں گے اور قربانیاں دیں گے۔ اس دنیا میں وہی لیڈر کامیاب ہوتا ہے جو اپنی سیاست کے لئے کوئی ایسا بدنام نشانہ تلاش کرے جس کے نام پر لوگوں کے اندر زیادہ سے زیادہ نفرت کی آگ بھڑکائی جا سکتی ہو۔ موجودہ زمانہ کی تمام بڑی بڑی سیاسی تحریکیں کسی نہ کسی قابل نفرت نشانہ کے اوپر کھڑی ہوئی ہیں، کسی کا نشانہ کوئی قوم ہے، کسی کا کوئی بادشاہ اور کسی کا کوئی حکمراں۔

مگر نفرت کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک خدا کی نظر میں سراسر باطل ہے، خواہ وہ بظاہر مکمل اسلام ہی کے نام پر کیوں نہ اٹھی ہو۔ مخصوص اسباب کی بنا پر موجودہ زمانہ میں دنیا بھر کے مسلمان احساس مظلومی (Persecution Complex) میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ان کے درمیان جب کوئی ایسی تحریک اٹھتی ہے جو کسی مسلم دشمن طاقت کی نشان دہی کرکے اس کو مٹانے کا نعرہ دے رہی ہو تو مسلمان بہت جلد اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ تحریک اسلام کی اصطلاحوں میں بول رہی ہو تو مسلمان اور بھی زیادہ جوش جہاد کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے ہیں کیوں کہ ایسی صورت میں ان کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ ان کی نفرت کی سیاست عین اسلام کی سیاست ہے نہ کہ کوئی غیر اسلامی سیاست۔ مگر یہ سراسر بھول ہے۔ اسلام کی سیاست صرف وہ ہے جو محبت اور خیر خواہی کی بنیاد پر اٹھے۔ جس کی دشمنی "کفر" سے ہو نہ کہ "کافر" سے۔ جو "شرک" کے خلاف برپا ہوئی ہو نہ کہ "مشرک" کے خلاف۔

یہ بھیڑ

پروفیسر ہنری جیکسن (Henry F. Jackson) کا ایک مضمون امریکی جرنل خارجہ پالیسی (Foreign Policy) میں چھپا ہے۔ پروفیسر جیکسن نے مصر کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مصر میں قابل زراعت زمین تقریباً چھ ملین ایکڑ ہے۔ اس میں سے تقریباً ساٹھ ہزار ایکڑ زمین اینٹ بنانے اور بکانے والوں کے مصرف میں آکر زراعت کے لئے بے کار ہو گئی ہے۔ اسوان ڈیم کے ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے زمین کا کٹاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ اس قسم کی مختلف چیزوں کے نتیجہ میں ملک میں تقریباً ۲۵ فی صد قابل کار آدمی بے کار ہو گئے ہیں۔ امریکہ نے مصر کو اربوں ڈالر بطور امداد دئے ہیں مگر یہ امداد عملاً پانچ فی صد اوپر کے طبقات (فوج، بینکر، تاجر، ٹھیکہ دار، عہدہ دار) کے حصہ میں چلی گئی ہے۔ کسان گھرانے کے لوگ مقامی طور پر ذرائع معاش نہ پاکر بڑی تعداد میں شہروں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ وغیرہ

اس جائزہ کے بعد پروفیسر جیکسن لکھتے ہیں: ایسی حالت میں تعجب کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسلامی احیار میں پناہ تلاش کر رہے ہیں، یہ ان کے لئے حکومت کی ناکام اقتصادی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کی ایک صورت ہے:

> Is it any wonder then that more people are seeking escape in Islamic revivalism as a form of protest against the government's unsuccessful economic policies?
>
> The Times of India, September 8, 1981.

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ وقت کے حکمراں کے بارہ میں مختلف وجوہ سے لوگوں کے اندر ناراضی اور عدم اطمینان موجود رہتا ہے۔ ایسی حالت میں جب حکمراں کو ہٹانے کے نام پر کوئی تحریک اٹھتی ہے تو اس قسم کے تمام ناراض عناصر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام تر ایک مصنوعی پھیلاؤ ہوتا ہے۔ یہ اجتماع "بغض معاویہ" کے جذبہ کے تحت ہوتا ہے نہ کہ "حب علی" کے جذبہ کے تحت۔ مگر تحریک کے قائدین خوش فہمی میں سمجھ لیتے ہیں کہ یہ سارے لوگ اسلام کے لئے سرشار ہیں، وہ خالص اسلام کو قائم کرنے کی خاطر اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ خوش خیالی کا یہ گھروندا اس وقت بکھر جاتا ہے جب کہ "اسلام دشمن" حکمراں کو ہٹانے کی تحریک کامیاب ہو جائے۔ اسلام دشمن حکمراں کے ہٹتے ہی اسلام دوست حضرات آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو جس چیز نے اکٹھا کیا تھا وہ صرف ایک منفی نشانہ تھا اور اسلام دشمن حکمراں کے ہٹنے کے بعد وہ نشانہ باقی نہ رہا۔

ماں باپ کے ساتھ سلوک

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: سألتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای العمل احب الی اللہ قال الصلاۃ علی وقتہا۔ قلت ثم ای، قال بر الوالدین۔ قلت ثم ای، قال الجہاد فی سبیل اللہ (رواہ البخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے۔ فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔ پوچھا اس کے بعد۔ فرمایا۔ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک۔ پوچھا اس کے بعد۔ فرمایا۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص ان رجلاً جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: جئت ابایعک علی الہجرۃ وترکت ابوی یبکیان۔ قال ارجع الیہما فاضحکہما کما ابکیتہما (رواہ ابو داؤد)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ ہجرت پر بیعت کروں اور میں نے اپنے ماں باپ کو روتے ہوئے چھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا اپنے ماں باپ کی طرف واپس جاؤ اور ان کو ہنساؤ جس طرح تم نے ان کو رلایا ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ قال: اتی رجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی اشتہی الجہاد ولا اقدر علیہ۔ قال ہل بقی من والدیک احد۔ قال امی۔ قال قابل اللہ فی برہا فاذا فعلت فانت حاج ومعتمر ومجاہد (رواہ ابو یعلی والطبرانی)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں جہاد کی خواہش رکھتا ہوں مگر مجھے اس پر قدرت نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تمھارے والدین میں سے کوئی ہے۔ اس نے کہا میری ماں ہے۔ آپ نے فرمایا ماں کے ساتھ حسن سلوک میں خدا کو پانے کی کوشش کرو۔ جب تم ایسا کروگے تو تم حاجی ہو، تم عمرہ کرنے والے ہو، تم مجاہد ہو۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ من احق بحسن صحابتی قال امک۔ قال ثم من قال امک۔ قال ثم من قال امک قال ثم من قال ابوک (رواہ البخاری ومسلم)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا کہ میری حسن صحبت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ آپ نے فرمایا تمھاری ماں۔ پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا تمھاری ماں۔ پوچھا پھر کون۔ فرمایا تمھاری ماں۔ پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا تمھارا باپ۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رضا اللہ فی رضا الوالد وسخط اللہ فی سخط الوالد (رواہ الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔

الجنۃُ تحتَ اقدامِ الامہات (الجامع الصغیر للسیوطی)

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

تاریک اجالے

احمد اور طبرانی نے حضرت عائشہ کی ایک روایت مختلف الفاظ میں نقل کی ہے۔ بعد کے زمانہ میں حضرت عائشہ نے ایک شخص کو وہ احوال بتائے جو ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان پر گزرے تھے۔ انھوں نے ایک رات کو ٹٹول کر کام کرنے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

نقلت یا ام المومنین علی مصباح۔ قالت لو کان عندنا دھن غیر مصباح لاکلناہ (الترغیب والترہیب، جلد ۵)

راوی کہتے ہیں۔ میں نے حضرت عائشہ سے چراغ کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا: اگر ہمارے پاس چراغ جلانے کے لئے تیل ہوتا تو چراغ جلانا تو درکنار ہم اس کو بھوک کی وجہ سے پی جاتے۔

ہجرت کے بعد جس بستی کو مدینۃ الرسول اور مدینہ طیبہ کا لقب ملا وہاں اس وقت ایک بھی پکا مکان نہ تھا۔ مسجد نبوی بس ایک بڑا سا چھپر تھی جس کو چاروں طرف سے مٹی اور کھجور کے پتوں سے گھیر دیا گیا تھا۔ مسجد میں رات کے وقت روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مسجد نبوی میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلایا گیا ہے۔ پہلا شخص جس نے مدینہ کی مسجد نبوی میں رات کو چراغ جلایا وہ تمیم داری ہیں۔ تمیم داری نے ۹ھ میں اسلام قبول کیا ہے اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا اور تقریباً سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔

جب مسلمانوں کے پاس اپنے گھروں کو روشن کرنے کے لئے چراغ نہ تھے اور مسجدمیں رات کے وقت اندھیرا رہتا تھا تو اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں عزت وغلبہ حاصل تھا۔ آج مسلمانوں کے گھر روشن ہیں۔ ان کی مسجدیں جدید طرز کے قمقموں سے جگمگا رہی ہیں مگر دنیا میں اسلام کا غلبہ نہیں، مسلمانوں کو کہیں عزت حاصل نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عزت وغلبہ کا مقام حاصل کرنے کے لئے اصل اہمیت انسان کی ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں کے یہاں سب کچھ ہے مگر وہی چیز نہیں جس کو "انسان" کہا جاتا ہے۔ اسلامی دنیا مردہ روحوں کا ایک عظیم قبرستان معلوم ہوتی ہے جہاں روشنیوں کی رونقیں اور در و دیوار کی عظمتیں تو بہت ہیں مگر وہ انسان نہیں جو خدا کے لئے تڑپے، جو سچائی کے آگے جھک جائے، جو آخرت کی خاطر اپنی دنیا کو قربان کر سکے، جو اپنی خواہشوں کو برتر اصولوں کے تابع کر دے۔ اسلام کو سربلند کرنے کے لئے وہ انسان درکار ہیں جن کو عظمت خداوندی کے احساس نے پست کر رکھا ہو، جن کا خوفِ آخرت ان سے ان کی اکڑ چھین لے۔ اور یہی وہ انسان ہیں جو اسلام کے بھرے ہوئے شان دار پنڈال میں آج کہیں موجود نہیں۔

خود کفیل زندگی

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان من الذنوب ذنوبا لا تکفرھا الصلاۃ ولا الصیام ولا الحج ولا العمرۃ ولکن یکفرھا الھم فی طلب المعیشۃ (رواہ ابن عساکر وابونعیم فی الحلیۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہوں میں کچھ گناہ ایسے ہیں جن کو نماز اور روزہ اور حج اور عمرہ دور نہیں کرتے ان کو دور کرنے والی چیز معاش کے حصول کی فکر کرنا ہے۔

اس حدیث میں گناہ سے مراد وہ نفسیاتی کمزوریاں ہیں جو اکثر معاشی ذرائع کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً بخل، حسد، تنگ ظرفی، وعدہ خلافی وغیرہ۔ انسانوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو حالات سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دے سکیں۔ مگر ایسے لوگ ہمیشہ بہت کم پائے گئے ہیں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ مال ان کے لئے اخلاقی مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ان کے پاس مال ہو تو وہ فیاضی کا ثبوت دیں گے اور اپنی مالی ذمہ داریوں کو بخوبی طور پر ادا کریں گے۔ لیکن اگر وہ مال سے خالی ہو جائیں تو ان کا دل چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ تعلقات میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت نہیں دے پاتے۔ ان کے ذمہ لوگوں کے جو مالی حقوق ہوں ان کی ادائگی میں ان سے کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔

کوئی شخص اپنے اندر اس قسم کی کمی پائے تو وہ روزہ اور نماز کی زیادتی سے اس کو ختم نہیں کر سکتا۔

ایک شخص جو مالی مشکلات سے دوچار ہو اس کے اندر چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ چڑچڑاپن ایک ایسی اخلاقی کمزوری ہے جو بہت سی دوسری اخلاقی کمزوریوں کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے جب آدمی اپنے اندر اس قسم کی کیفیت محسوس کرے تو اس کو چاہئے کہ اللہ کے بھروسہ پر معاش کے حصول کی جدوجہد میں لگ جائے۔ معاشی فراغت حاصل ہوتے ہی اس کا چڑچڑاپن خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح جو شخص مالی مشکلات میں مبتلا ہو اس کے اندر پست ہمتی آجاتی ہے اور پست ہمتی بہت سی دوسری خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ اس لئے جب آدمی اپنے اندر اس قسم کی علامت دیکھے تو اس کو چاہئے کہ معاش کی جدوجہد میں اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دے۔ معاش کے حصول کے بعد خود بخود ایسا ہوگا کہ اس کا پستی کا مزاج جاتا رہے گا۔ اسی طرح جو شخص مال کی کمی کے مسئلہ سے دوچار ہو اس کے اندر "دینے" سے زیادہ "لینے" کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے جو بہت سی دوسری خرابیوں کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے اندر اس قسم کی کمزوری دیکھے وہ اپنے کو اس قابل بنانے کی کوشش شروع کر دے کہ وہ لوگوں سے لئے بغیر اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ جب ایسا ہوگا تو خود بخود اس کی اصلاح ہو جائے گی۔

تقویٰ نہ کہ شور وغل

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ مکہ کے مشرکین مسجد حرام کے والی بننے کے لائق نہیں۔ اس کے والی تو صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو متقی ہیں۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور ان مشرکین کی نماز کعبہ کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا۔ پس عذاب چکھو اپنے انکار کے سبب سے (انفال ۳۵-۳۴)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکہ کے مشرکین خانہ کعبہ میں جمع ہو کر صرف سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، اس کے سوا کچھ اور نہیں کرتے تھے۔ وہ دراصل اپنے دعوے کے مطابق ابراہیم اور اسماعیل کی عبادت کرتے تھے۔ البتہ انھوں نے اس عبادت پر تالیوں اور سیٹیوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ یہ چیزیں ان کی کل عبادت نہ تھیں بلکہ ان کی اصل عبادت کا جز تھیں۔ جیسا کہ آج بھی گمراہ فرقوں اور قوموں میں عبادت کے ساتھ ساتھ تالی پیٹنے اور گھنٹی اور ناقوس بجانے کا رواج ہے اور ان چیزوں کو وہ اصل عبادت کا ضروری حصہ سمجھتے ہیں۔ قرآن نے مشرکین کے عبادتی مراسم کو تالی اور سیٹی کے تابع کر دیا اور تہدیدی انداز میں کہا کہ انھوں نے سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کو عبادت سمجھ لیا ہے۔ حالاں کہ عبادت تقویٰ کا نام ہے نہ کہ کسی قسم کا شور وغل کرنے کا۔

مشرکین مکہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ کعبہ کا طواف کرتے تو نیم برہنہ ہو جاتے۔ وہ کعبہ کے گرد اسی طرح گھومتے تھے جس طرح آج کوئی حاجی گھومتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ یہ کرتے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں باندھ کر اس میں پھونکتے جس سے سیٹی کی سی آواز نکلتی (انھم کانوا یطوفون بالبیت عراۃ دھم مشبکون بین اصابعھم یصفرون فیھا ویصفقون، تفسیر نسفی) اسی طرح جب وہ نماز پڑھتے تو وہ بھی عام نمازیوں کی طرح سجدہ میں جاتے مگر اس وقت وہ اپنے رخسار زمین پر رکھ دیتے اور اسی کے ساتھ تالیاں بجاتے اور کلمات عبادت کی ادائگی کے ساتھ دوسری آوازیں نکالتے (انھم کانوا یضعون خدودھم علی الارض ویصفقون ویصفرون، تفسیر ابن کثیر)

موجودہ زمانہ میں عبادتی مواقع پر جس طرح لاؤڈ اسپیکروں کا شور بلند ہوتا ہے اور جس طرح دھوم دھام کے ساتھ دینی تقریبات منائی جاتی ہیں ان پر بھی قرآن کے یہ الفاظ پوری طرح صادق آتے ہیں۔ ان مواقع پر اگرچہ حسب قاعدہ کچھ عبادتی افعال بھی کیے جاتے ہیں مگر ان کی عبادت پر ان کے ہنگامے اس طرح غالب رہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ایک دردمند شخص کہہ اٹھے گا:

"انھوں نے شور وغل کو اسلام سمجھ لیا ہے"

پانے کے لئے کھونا پڑتا ہے

طبرانی نے کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ متغیر ہے، میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان کیوں میں آپ کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: میرے پیٹ میں تین دن سے وہ چیز داخل نہیں ہوئی جو کسی جگر والے کے پیٹ میں داخل ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نکلا تو میں نے دیکھا کہ ایک یہودی اپنے اونٹ کو پانی پلا رہا ہے۔ میں نے اس کی مزدوری کی اور ایک ڈول کے بدلے ایک کھجور کی اجرت پر اس کے لئے پانی کھینچا۔ ان کھجوروں کو لے کر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے پوچھا: من این لک یا کعب (اے کعب یہ کھجوریں تم کو کہاں ملیں) میں نے پورا قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: اے کعب کیا تم مجھ سے محبت رکھتے ہو۔ میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہاں۔ آپ نے فرمایا: کوئی بندہ جب اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے تو محتاجی اس کی طرف اس سے بھی زیادہ تیزی سے آتی ہے جیسے سیلاب اپنے بہاؤ کی طرف (ما من عبد یحب اللہ ورسولہ الا الفقر اسرع الیہ من جریۃ السیل علی وجھہ)

دنیوی مصلحتیں رکاوٹ بن جاتی ہیں

نجران (یمن) کا عیسائی وفد ہجرت کے دسویں سال مدینہ آیا۔ اس کے لمبے قصہ میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ مدینہ سے واپس ہوتے ہوئے ان کا بڑا پادری ابوحارثہ بن علقمہ خچر پر سوار تھا۔ خچر نے ایک مقام پر ٹھوکر کھائی۔ پادری زمین پر گر پڑا۔ پادری کا بھائی کرز بن علقمہ جو ساتھ تھا، اس کی زبان سے نکلا تَعِسَ الْاَبعد۔ ابعد سے اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا۔ یعنی محمد کا برا ہو۔ پادری نے فوراً کہا: تعست امک (تمہاری ماں کا برا ہو) کرز بن علقمہ نے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کہا۔ پادری نے جواب دیا: واللہ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہی وہ نبی منتظر ہیں جن کی بشارت ہماری کتابوں میں دی گئی تھی۔ کرز بن علقمہ نے یہ سن کر کہا: پھر آپ لوگ اس کی نبوت کا اقرار کیوں نہیں کرتے۔ پادری نے کہا:

لِاَنَّ ھٰولاءِ الملوک اعطونا اموالا کثیرۃ واکرمونا فلو آمنا بمحمد لاخذوا منا کل ھٰذہ الاشیاء (محمد بن اسحٰق بحوالہ تفسیر رازی)

کیونکہ یہ بادشاہ ہم کو کافی مال دیتے ہیں اور ہماری عزت کرتے ہیں۔ اگر ہم محمد کی نبوت کو مان لیں تو یہ ساری چیزیں وہ ہم سے واپس لے لیں گے۔

فرض سے آگے بڑھ کر قربانی دینا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بدر کے لئے نکلے۔ روحاء پہنچ کر آپ نے قیام کیا اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا، آپ نے پوچھا: کیف ترون (تمہاری کیا رائے ہے) پہلے حضرت ابوبکر رضہ نے جواب دیا۔ مگر آپ نے التفات نہیں فرمایا (فاعرض عنہ) اور دوبارہ فرمایا "تمہاری کیا رائے ہے"۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے۔ مگر آپ نے التفات نہیں فرمایا، اور پھر کہا "تمہاری کیا رائے ہے"۔ اب سعد بن معاذ

انصاری رضؓ اٹھے۔ انھوں نے کہا: واللہ یکاننک ترید نا یارسول اللہ (خدا کی قسم شاید آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے اے خدا کے رسول) آپ نے فرمایا "ہاں"۔ اصل یہ ہے کہ انصار نے آپ سے بیعت نساء کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مدینہ میں آپ کی حفاظت کریں گے۔ مگر باہر (بدر) جاکر دشمنوں سے لڑنا اس بیعت میں شامل نہ تھا۔ اس لئے ان سے پوچھنا ضروری تھا۔ مقداد بن عمر رضؓ نے کہا:

اذاً لا نقول لک یارسول اللہ کما قال قوم موسیٰ لموسی علیہ السلام اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون (البدایہ والنہایہ)

اس وقت ہم آپ کو اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰؑ سے کہا تھا (تم اور تمھارا رب جاکر لڑے ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے)

سعد بن معاذ رضؓ نے کہا: ہم آپ سے عہد کر چکے ہیں کہ ہم آپ کی سنیں گے اور آپ کی اطاعت کریں گے۔ اے خدا کے رسول! چلئے جس چیز کا بھی آپ کا ارادہ ہو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، اگر آپ ہم کو حکم دیں کہ ہم اپنی سواریاں سمندر میں گھسا دیں تو ہم ان کو سمندر میں گھسا دیں گے۔ اگر آپ حکم دیں کہ ہم اپنی اونٹنیوں کو برک غماد (یمن) تک لے جاتے ہوئے ان کا کلیجہ چھلنی کریں تو ہم ایسا ضرور کریں گے۔ ہمارا ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا"۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی اس تقریر سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا چلو۔ اللہ نے تمھارے لئے فتح ونصرت کا فیصلہ کر دیا ہے۔

زندگی اس کے لئے ہے جو موت سے نڈر ہو جائے

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے ایک بار اسلامی سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضؓ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے خالد، موت کے شیدائی بن جاؤ تم کو زندگی مل جائے گی (یا خالد احرص علی الموت توھب لک الحیاۃ)

دین وہی ہے جو آدمی کے اندر گہری تبدیلی پیدا کرے

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے ابو ہریرہ، پرہیزگار بنو تم سب سے زیادہ عبادت کرنے والے ہو جاؤ گے۔ قانع بنو تم سب سے زیادہ شکر کرنے والے بن جاؤ گے۔ اور لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو تم ایمان والے ہو جاؤ گے۔ اپنے پڑوس والوں کے ساتھ بہتر پڑوسی بن کر رہو تم اسلام والے ہو جاؤ گے۔ اور ہنسی کم کرو کیونکہ زیادہ ہنسا دلوں کو مردہ کرتا ہے (یا اباھریرۃ کن ورعا تکن اعبد الناس، وکن قنعا تکن اشکر الناس، واحب للناس ماتحب لنفسک تکن مؤمنا واحسن جوار من جاورک تکن مسلما، واقل الضحک فان کثرۃ الضحک تمیت القلوب، ابن ماجہ)

توبہ نام ہے اپنے کئے پر پچھتانے کا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا التوبۃ الندم یعنی توبہ یہ ہے کہ آدمی نے جو کچھ کیا ہے اس پر اس کو شرمندگی ہو۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

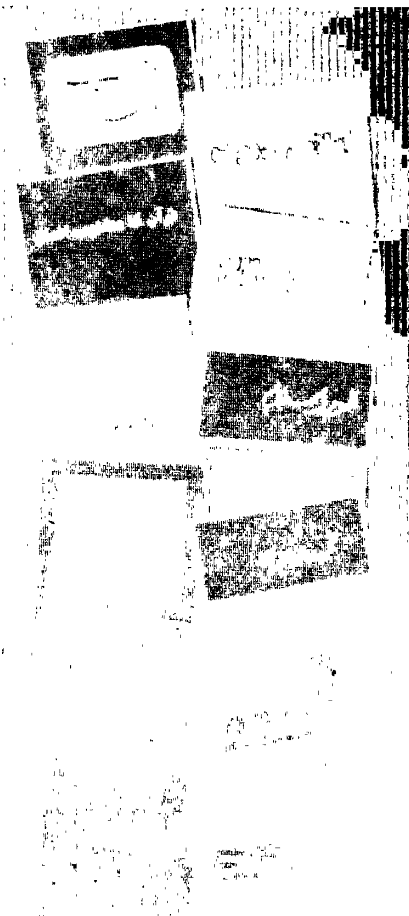
پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا، بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

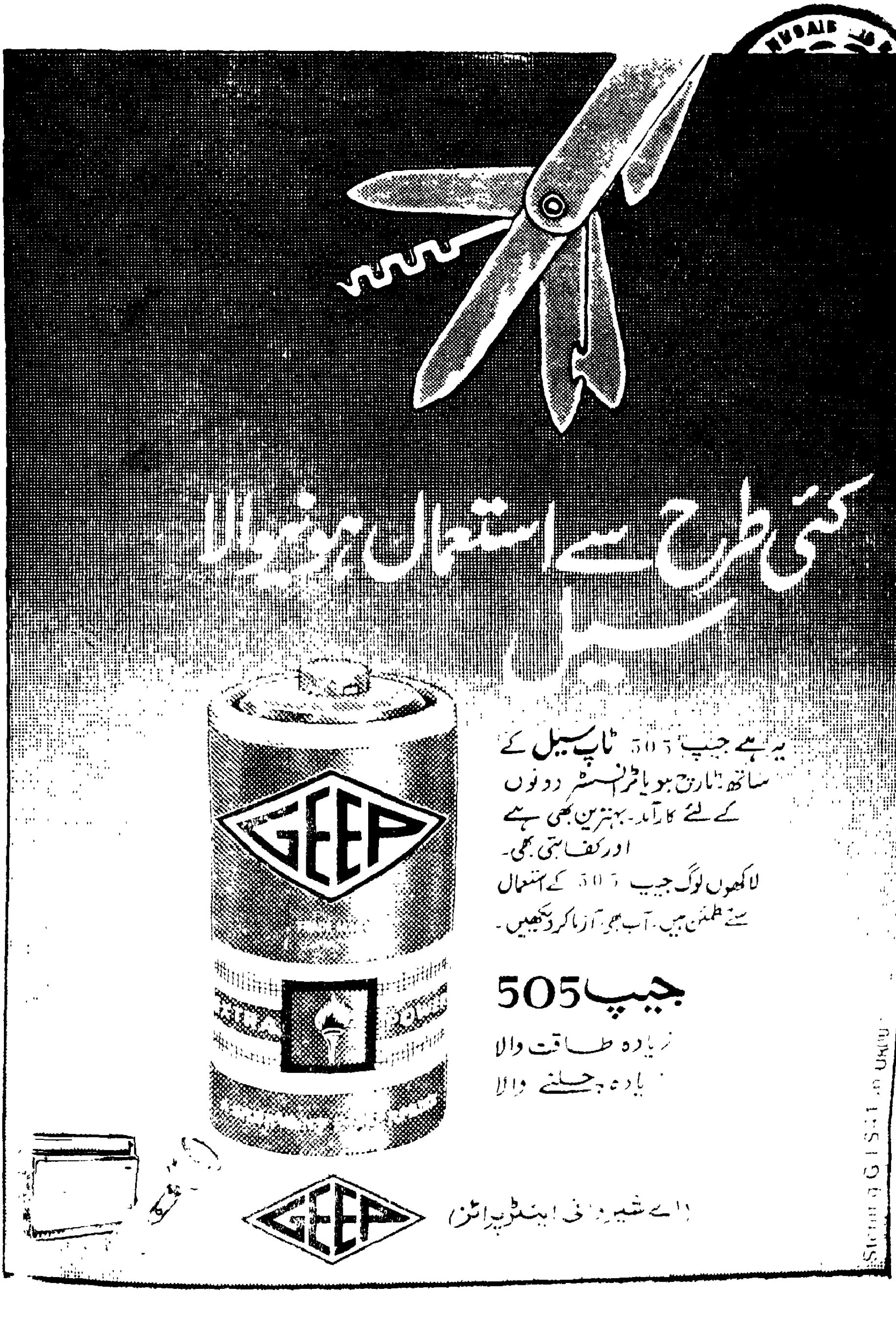
مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے



۱۔ الاسلام	۱۵—۰
۲۔ مذہب اور جدید چیلنج	۱۵—۰
۳۔ ظہور اسلام	۱۵—۰
۴۔ دین کیا ہے؟	۲—۰
۵۔ قرآن کا مطلوب انسان	۵—۰
۶۔ تجدید دین	۳—۰
۷۔ اسلام دین فطرت	۳—۰
۸۔ تعمیر ملت	۳—۰
۹۔ تاریخ کا سبق	۳—۰
۱۰۔ مذہب اور سائنس	۵—۰
۱۱۔ عقلیات اسلام	۳—۰
۱۲۔ فسادات کا مسئلہ	۲—۰
۱۳۔ انسان اپنے آپ کو پہچان	۱—۰
۱۴۔ تعارف اسلام	۲—۵۰
۱۵۔ اسلام پندرھویں صدی میں	۲—۰
۱۶۔ راہیں بند نہیں	۳—۰
۱۷۔ دینی تعلیم	۳—۰
۱۸۔ ایمانی طاقت	۳—۰
۱۹۔ اتحاد ملت	۳—۰
۲۰۔ سبق آموز واقعات	زیر طبع
۲۱۔ اسلامی تاریخ سے	"
۲۲۔ قال اللہ	"
۲۳۔ اسلامی دعوت	۳—۰
۲۴۔ زلزلۂ قیامت	۴—۰
۲۵۔ سچا راستہ	۱—۰

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI 110006 (INDIA) PHONE 232231



الرسالہ

سرپرست

مولانا وحیدالدین خان

اتحادِ ملّت

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

فہرست

قیمت تین روپیہ

اشاعت اول ۱۹۸۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جب کوئی گروہ مل کر رہے اور اختلافات سے بچے تو اس کے بعد اس گروہ کے اندر جو اجتماعی حالت پیدا ہوتی ہے اسی کا نام اتحاد ہے۔ اتحاد کے لئے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا، وہ اپنے آپ حاصل ہوتا ہے، اس کے باوجود اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے۔

اتحاد کی کوئی مادی قیمت نہیں۔ تاہم ہر آدمی کو اس کی ایک قیمت دینی پڑتی ہے۔ یہ نفسیاتی قیمت ہے۔ اتحاد کسی گروہ کے اندر صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ اس کے افراد اتحاد کی خاطر مطلوبہ نفسیاتی قیمت دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

یہ قیمت کیا ہے۔ یہ ذاتی بڑائی کی قربانی ہے۔ انسان کے اندر بڑا بننے کا جذبہ بے پناہ حد تک پایا جاتا ہے۔ یہی جذبہ اتحاد کے راستہ کی اصل رکاوٹ ہے اور یہی جذبہ وہ واحد چیز ہے جس کو قربان کرکے اتحاد قائم ہوتا ہے۔ جہاں ہر آدمی بڑا بننا چاہے وہاں اس کے نتیجہ میں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ انتشار ہے۔ اور جہاں لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ دوسرے کے مقام کو تسلیم کرتے ہوئے چھوٹا بننے پر راضی ہو جائیں وہاں اس کے بعد جو چیز وجود میں آتی ہے اسی کا نام اتحاد ہے۔

اپنے کو چھوٹا بنانا یا اپنے کو دوسرے درجہ پر رکھنا بظاہر مشکل کام ہے مگر جب یہ دیکھا جائے کہ یہ سارا کا سارا ذہنی معاملہ ہے تو اس سے زیادہ آسان اور کوئی چیز نہیں۔ اپنے کو بڑا بناکر خوش ہونا یا اپنے کو چھوٹا بنتے دیکھ کر تکلیف محسوس کرنا دونوں ذہنی کیفیات ہیں۔ وہ ذہن کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور ذہن کے اندر ہی انھیں ختم کیا جاسکتا ہے۔ آدمی اگر اپنے سوچنے کے زاویہ کو بدل دے تو ایک لمحہ میں وہ ایک ایسا سفر طے کر سکتا ہے جو اس کو اور اسی کے ساتھ پوری قوم کو کچھ سے کچھ بنادے۔

اتحاد اس حکمت کا عملی نتیجہ ہے کہ اپنے سوا دوسرے کی بڑائی کو مان لیا جائے، خواہ یہ ماننا بر بنائے حقیقت ہو یا بر بنائے ضرورت۔ حضرت عمر فاروق کا حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کو مان لینا اسلامی تاریخ میں پہلی صورت کی مثال ہے اور حضرت حسن بن علی کا حضرت معاویہ کی خلافت پر راضی ہو جانا دوسری صورت کی مثال۔ ان دو چیزوں کے سوا اتحاد کی کوئی تیسری بنیاد نہیں۔

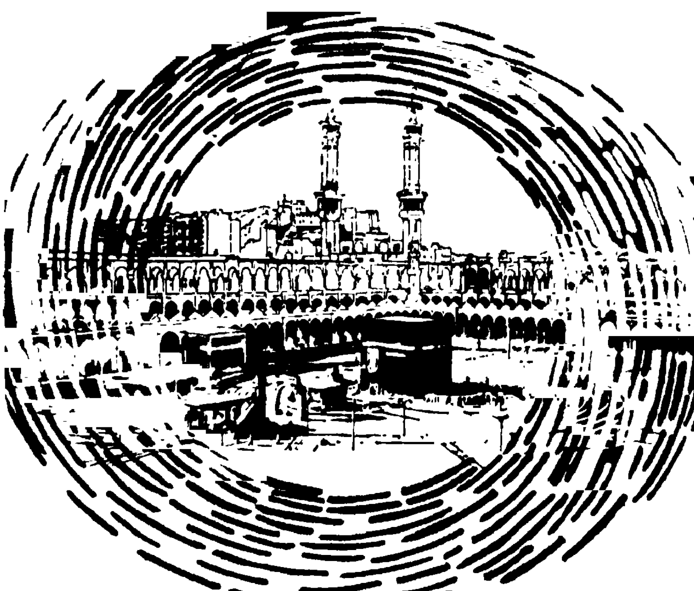
اتحاد قائم کرنے کے لئے بظاہر آدمی اپنی ذات کی قربانی دیتا ہے۔ مگر اپنی ذات کو کھو کر وہ زیادہ بہتر طور پر اپنی ذات کو حاصل کر لیتا ہے۔ اتحاد کے بغیر وہ صرف ایک شخص ہے۔ مگر اتحاد کے ساتھ وہ ایک پوری قوم بن جاتا ہے۔ اتحاد قوم کی طاقت ہے اور اسی کے ساتھ فرد کی طاقت بھی۔

سب سے بڑا اتحاد

میرے سامنے دیوار پر بیت اللہ کی تصویر ہے۔ وسیع مسجد کے درمیان کعبہ کی عمارت ہے اور اس کے چاروں طرف لاکھوں انسان گول دائرہ میں اپنے رب کے آگے جھکے ہوئے عبادت کر رہے ہیں۔ یہ سالانہ اجتماعی نماز ہے جو ہر بار حج کے مہینہ میں دنیا بھر کے ۲۵-۳۰ لاکھ مسلمان مکہ میں جمع ہو کر ادا کرتے ہیں اور جس کا فوٹو لیا جاسکتا ہے۔ لیکن تصور کی آنکھ سے دیکھئے تو یہی واقعہ اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ہر روز پانچ بار ہوتا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اس طرح گویا ہر روز پانچ بار روئے زمین پر مسلمانوں کا گول دائرہ بنتا ہے۔ درمیان میں کعبہ ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اس کے گرد دائرہ بنائے ہوئے مسلمان نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عظیم اور مکمل اجتماعیت ہے جس کی مثال کسی بھی دوسرے مذہبی یا غیر مذہبی گروہ کے یہاں نہیں ملتی۔

اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ مسلمان ہی وہ گروہ ہیں جو آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ غیر متحد ہیں۔ نہ کوئی دنیوی مقصد ان کو متحد کرنے میں کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور نہ کوئی اخروی مقصد۔ اتحاد کے اتنے شاندار امکانات کے باوجود اختلاف کی ایسی بری مثال انسانی تاریخ میں دوسری نہیں ملے گی۔

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ



کعبہ

وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد دنیا بھر کے خدا پرستوں کا عبادتی دائرہ قائم ہوتا ہے۔

اختلاف کی قاتل

دو آدمیوں میں اختلاف ہوا۔ اختلاف بڑھتا رہا، یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ پہلے کے لئے زمین پر سب سے زیادہ قابل نفرت شخص دوسرا تھا اور دوسرے کے لئے زمین پر سب سے زیادہ قابل نفرت شخص پہلا۔

دونوں ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور نقصان پہنچانے میں لگ گئے۔ ہر ایک کے بس میں کہنے اور کرنے کی جو طاقت تھی وہ اس نے پوری طرح دوسرے کی کاٹ میں لگادی۔ دونوں اپنے تخریبی مشغلہ میں مصروف رہے۔ تاہم کوئی دوسرے کو مٹا نہ سکا یہاں تک کہ خود اس کے مٹنے کا وقت آگیا۔ آخرکار دونوں کے درمیان جس چیز نے فیصلہ کیا وہ موت تھی۔ موت نے ہر ایک کو اسی قبر میں پہنچا دیا جس میں وہ اپنے بھائی کو پہنچانے کا عزم کئے ہوئے تھا۔

موت کا یہ واقعہ ہر روز ہمارے سامنے پیش آتا ہے، ہر دن کوئی شخص جو دوسرے کو قبر کے گڑھے میں پہنچانا چاہتا تھا، خود قبر کے گڑھے میں پہنچ جاتا ہے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ موت کا واقعہ اسی آدمی کے لئے ہے جس کے ساتھ وہ بظاہر پیش آیا ہے، خود اس کے اپنے لئے یہ واقعہ کبھی پیش نہیں آئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد ہر قسم کے اختلاف اور دشمنی کی قاتل ہے۔ موت آدمی کی ذات کو ختم کرتی ہے اور موت کی یاد آدمی کی برائیوں کو۔ مگر کوئی آدمی موت کو یاد نہیں کرتا۔ موت کا واقعہ کسی آدمی کے لئے اس کی برائیوں کو ختم کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

حدیث میں ہے کہ موت کو خوب یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے (اکثروا ذکر ھادم اللذات) کسی آدمی کے لئے سب سے بڑی لذت یہ ہے کہ وہ اپنے مخالف کو برباد ہوتا ہوا دیکھے۔ لیکن اگر آدمی موت کو یاد کرنے لگے تو اپنی بربادی کا اندیشہ اس سے دوسرے تمام احساسات کو اس طرح چھین لے گا کہ اس کو یاد بھی نہ رہے گا کہ اس کا کوئی مخالف ہے جس کی بربادی کا منصوبہ اسے بنانا چاہئے۔

ایسا انسان جو ہر لمحہ موت کی زد میں ہو وہ کسی دوسرے کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آدمی خود اپنی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے شخص کو اس کی موت کے کنارے پہنچا رہا ہے۔ نادانی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

باہمی اختلاف

واطیعوا اللّٰہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللّٰہ مع الصابرین (انفال ۴۶)

اے مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو۔ اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تمھارے اندر کمزوری آجائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مسلمان اگر مل جل کر رہیں۔ وہ اللہ اور رسول کی مرکزیت کے گرد متحد رہیں تو وہ زبردست طاقت ہوتے ہیں۔ دیگر قوموں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے اکثر کام محض رعب و دبدبہ سے انجام پاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ان میں آپس کا اختلاف پیدا ہو جائے تو دوسروں کی نظر میں ان کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ ان کے دشمن ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے جری ہو جاتے ہیں۔

اتحاد و اتفاق کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صبر ہے۔ کیوں کہ جب بھی بہت سے لوگ ایک ساتھ رہیں گے تو ان کے درمیان طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوں گی۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے گی۔ کبھی کسی کی تنقید پر کسی کو غصہ آئے گا، کبھی کسی کی ترقی سے کسی کے دل میں جلن پیدا ہوگی۔ کبھی لین دین میں ایک دوسرے کا مفاد ٹکرائے گا۔ کبھی ایک شخص کی امیدیں دوسرے سے پوری نہ ہوں گی اور اس کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اس طرح کے بہت سے اسباب ہیں جو لازماً پیدا ہوں گے۔ ان اسباب کی پیدائش کو روکنا ممکن نہیں ہے۔ ممکن صرف یہ ہے کہ آدمی ناخوش گواریوں کو سہے اور جب بھی اس قسم کی کوئی صورت پیش آئے تو اللہ کے لئے اس پر صبر کرے۔ اختلاف کو برداشت کرنے کی زمین پر اتحاد وجود میں آتا ہے نہ کہ اختلاف کو ختم کرنے کی زمین پر۔ جو لوگ اختلاف اور شکایت کو برداشت کر کے متحد رہ سکیں وہی اپنے درمیان اتحاد قائم کرتے ہیں۔ زندگی کی بیشتر کامیابیوں کا راز صبر ہے اور اسی طرح اتحاد کا بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد رہنے کا۔ اگر یہ برداشت اور یہ وسعت ظرف نہ ہو تو اتحاد کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔

آج ہر طرف مسجدیں بھری ہیں۔ ہر جگہ بے شمار لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان کیوں ذلیل ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں پر اللہ کی نصرت کیوں نازل نہیں ہوتی۔ اتنے بے شمار لوگ اللہ سے تعلق جوڑے ہوئے ہیں، پھر بھی اللہ ان کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے مسلمانوں کا باہمی اختلاف۔ خدا سے جڑنے کے لئے ہر آدمی مسجد کی طرف بھاگ رہا ہے مگر انسان سے جڑنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ انفرادی عبادت ہر ایک کر رہا ہے۔ مگر اجتماعی عبادت جس کا دوسرا نام اتحاد ہے، اس میں اپنے کو شامل کرنے کی اہمیت کو کوئی نہیں جانتا۔

باعزت زندگی ایک ایک مسلمان کو الگ الگ نہیں مل سکتی۔ وہ جب بھی ملے گی پورے گروہ کو یکجائی طور پر

ملے گی۔ مسلمانوں کے لئے باعزت زندگی کا ملنا ایک اجتماعی واقعہ ہے۔ اس کے لئے اللہ کی اجتماعی مدد درکار ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ اجتماعی مدد وہ ہمیشہ اجتماعی عمل پر نازل کرتا ہے۔ انفرادی عمل پر اجتماعی مدد کبھی نہیں آتی۔ آدمی نماز میں خدا سے "ملاقات" کرکے مسجد سے باہر آتا ہے تاکہ وہ بندوں سے "ملاقات" کرے۔ مگر وہ بندوں کی طرف سے منھ پھیر لیتا ہے۔ خدا سے جڑنے والا بندوں سے جڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اللہ سے جڑ کر بھی وہ اکیلا رہتا ہے۔ کروروں مسلمان روزانہ اللہ سے جڑ رہے ہیں مگر وہ آپس میں جڑ کر متحدہ ملت نہیں بنتے۔ حالاں کہ اللہ سے جڑنے کا تقاضا ہے کہ آدمی اللہ کے بندوں کے ساتھ جڑ جائے۔ اللہ سے "اتحاد" اور اللہ کو ماننے والوں سے "اختلاف" خدا کے غضب کو بھڑکانے والا عمل ہے نہ کہ خدا کی نصرت کو کھینچنے والا۔

جب ایسا ہو کہ لوگ اللہ سے جڑتے ہوئے نظر آتے ہوں مگر وہ بندوں کے ساتھ نہ جڑ رہے ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے بھی جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ ظاہری عبادت کو دہرا رہے ہیں مگر عبادت کی حقیقت سے خالی ہیں۔ اللہ کے ساتھ جڑنا آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے ایسا آدمی مسجد سے باہر انسانوں کے ساتھ انانیت اور سرکشی کا مظاہرہ کس طرح کرے گا۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو حساب کے دن کی یاد دلاتا ہے پھر ایسا آدمی بندوں کے درمیان خدا کی پکڑ سے بے خوف ہو کر کس طرح رہے گا۔ اللہ سے جڑنا آدمی کے اندر خداوندی اوصاف پیدا کرتا ہے پھر وہ دوسروں کے اوپر مہربانی کرنے سے کیوں کر خالی ہو سکتا ہے جو اللہ کی سب سے بڑی صفت ہے۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو ایک ایسی ہستی کا پڑوس عطا کرتا ہے جو تمام خوبیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے پھر ایسے آدمی سے دوسروں کو برائی کا تجربہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو اس روز حساب کی یاد دلاتا ہے جب کہ ہر آدمی بے لاگ انصاف کے ترازو پر کھڑا کیا جائے گا۔ پھر وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے انصافی کرکے یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کی پکڑ کی زد میں آجائے۔ اللہ سے جڑنا اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی اللہ سے درخواست کرے کہ وہ اس کی غلطیوں سے درگزر فرمائے پھر جو آدمی خود اپنے لئے عفو و درگزر کی درخواست کر رہا ہے وہ دوسروں کے ساتھ سخت گیری کا رویہ کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔ سورج کی دنیا میں رہنے والا کبھی تاریکی نہیں پھیلاتا پھولوں کے پڑوس میں رہنے والا کبھی بدبو نہیں بکھیرتا۔ یہی معاملہ بندہ مومن کا ہے۔ مومن خدا اور فرشتوں کی صحبت میں اپنے روز و شب گزارتا ہے۔ پھر جو آدمی خدا اور فرشتوں کی صحبت میں رہے اس سے کسی کو ظلم اور بدخواہی کا تجربہ کیسے ہو سکتا ہے اور جس معاشرہ میں ظلم اور بدخواہی نہ ہو وہاں اختلاف کا کیا گزر۔

یہ اوصاف جب کسی کے اندر پیدا ہو جائیں تو اس کے اندر سے ان اوصاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو آدمی کو بندوں سے دور کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کا خدا سے جڑنا لازماً بندوں سے جڑنا بن جاتا ہے۔ اور جب بندے باہم جڑ جائیں تو اللہ کو یہ منظر اتنا زیادہ پسند ہے کہ وہ کل صبح آنے والی بارش کو آج شام ہی ان پر برسا دیتا ہے، وہ کل کی نعمتوں کو آج ہی اپنے بندوں پر انڈیل دیتا ہے۔ اتحاد کسی گروہ کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اتحاد اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اتحاد دنیا کی عزت بھی ہے اور اتحاد آخرت کی عزت بھی۔

اختلاف سے بچو

"اے مسلمانو! خدا سے ڈرو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ اور اس میں متفرق نہ ہو۔ آپس میں اختلاف کرنا آگ کے کنارے کھڑا ہونا ہے۔ خدا کے نزدیک وہی لوگ کامیاب ہیں جو خصوصی اہتمام کے ذریعہ ہر حال میں اپنے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا کو باقی رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے خداوندی علم کی امانت یہود کو دی گئی تھی۔ مگر وہ تفریق اور اختلاف میں پڑ گئے اور اس کے نتیجہ میں اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق بنا لیا۔ ان کے انجام سے ڈرو اور تم بھی انھیں کی طرح نہ ہو جاؤ۔" (آل عمران ۱۰۶ — ۱۰۲)۔

یہ تفریق و اختلاف جس سے بچنے کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے، اس کے بے شمار نقصانات ہیں۔ ان میں سے ایک وہ نقصان ہے جس کو قرآن کی سورہ نمبر ۸ میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

" اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔ آپس میں نزاع مت کرو۔ ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" انفال — ۴۶

اتفاق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اختلاف کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ انسانوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر جو لوگ خدا سے ڈرتے ہوں وہ معاملہ کی وضاحت کے بعد، یا تو اپنے اختلاف کو ختم کر دیتے ہیں اور اگر پھر بھی اختلاف باقی ہو تو وہ اس کو اپنے ذہن تک محدود رکھتے ہیں۔ عملی زندگی میں اس کو پھیلا کر معاشرہ کو خراب نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جن کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں وہ اس کو اپنے عزت و وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ خواہ کتنے ہی دلائل دئے جائیں، وہ اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ اختلاف رائے کو عناد کی حد تک جانے سے روکیں اور اس کو باہمی کدورت کا سبب بننے نہ دیں۔ یہی دوسری قسم کا اختلاف ہے جو قوم کو کمزور کر دیتا ہے۔

اب مسلمان آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ جو طاقت دوسروں کو مغلوب کرنے میں کام آتی وہ ود اپنے بھائیوں کو نیچا دکھانے میں برباد ہونے لگتی ہے۔ اس باہمی لڑائی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دولت مسلمانوں کی جیب سے نکل کر غیر مسلموں کی جیب میں پہنچ جاتی ہے۔ ایک مسلمان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ مسلمان جو اس کے مخالف بنے ہوئے ہیں وہ اس کا ساتھ دینے کے بجائے اس کی مصیبت پر اور خوش ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ اس کے دشمنوں سے مل جاتے ہیں، خواہ یہ دشمن غیر مسلم کیوں نہ ہو۔ نا اتفاقی کی بنا پر پیدا ہونے والی یہ چیزیں مسلمانوں کی مجموعی طاقت کو اس سے بہت کم کر دیتی ہیں جتنا کہ وہ حقیقۃً ہے۔

قولِ اسلام کا معیار اتحادِ اسلام ہے

یاایہاالذین آمنوالم تقولون مالا تفعلون۔ کبرمقتاً عنداللہ ان تقولوا مالا تفعلون ۔ ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص (الصف)

اے ایمان والو کیوں کہتے ہو منھ سے جو نہیں کرتے ۔ بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو ۔ اللہ چاہتا ہے ان کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر جیسے وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی ۔

اس آیت کے مطابق قولِ اسلام کی صداقت کی جانچ اتحادِ اسلام ہے ۔ اسلام کے قائلین اگر اسلامی مہم کے لئے متحد نہ ہو سکیں تو ان کا قول اللہ کی نظر میں مقت کے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی کوئی قیمت نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں ۔

یہ اصول نہایت اہم نکتہ پر مبنی ہے ۔ کوئی بڑا کام اتحاد کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ مگر اتحاد ایک بہت بڑی قربانی مانگتا ہے ۔ یہ آدمی کے "انا" کی قربانی ہے ۔ جب زیادہ انسان ایک محاذ پر جمع ہوں گے تو لازمی ہے کہ ان میں رایوں کا اختلاف ہو ۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے ۔ بار بار نفس کو ٹھیس لگے ۔ ہر آدمی بڑا بننا چاہتا ہے ۔ ہر آدمی اپنے اندر یہ سویا ہوا جذبہ رکھتا ہے کہ "میری چلے ، دوسرے کی نہ چلے" ایسی حالت میں جب بھی کچھ لوگ جمع ہوں گے تو لازماً آپس میں ٹکراؤ ہوگا ۔ کہیں خلاف مزاج بات کو برداشت کرنا ہوگا ۔ کہیں تنقید سننی پڑے گی ۔ کہیں اپنی شکست پر صبر کرنا ہوگا ۔ کہیں اپنی بے عزتی کو سہنا ہوگا ۔ کہیں اپنے مقابلہ میں دوسرے کو ترجیح دینی ہوگی ۔ کہیں اجتماعی مصلحت کی خاطر اپنی ذاتی رائے کو قربان کرنا ہوگا ۔ کہیں ایک جائز کریڈٹ سے محرومی پر اپنے کو راضی کرنا پڑے گا ۔ غرض بے شمار قسم کی ناخوش گواریاں سامنے آئیں گی ۔ ایسی حالت میں اتحادِ عمل پر وہی قائم رہ سکتا ہے جو اپنی "انا" کو ختم کر کے مسلمان بنا ہو ۔ جو اپنی ذات کو دفن کر کے اجتماعیت میں شامل ہوا ہو ۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ کی کبریائی پر ایمان لانے کے باوجود اپنی انا کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہو وہ کبھی متحدہ جدوجہد پر ٹھیر نہیں سکتا ۔ اللہ پر ایمان ، اپنی حقیقت کے اعتبار سے ، اپنی ذات کی نفی کا نام ہے ۔ اور اتحاد میں سب سے زیادہ اسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے ۔ متحدہ جدوجہد سب سے بڑی اور یقینی کسوٹی ہے جس پر جانچ کر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ آدمی اپنی ذات کی نفی کر کے اسلام میں داخل ہوا ہے یا اپنی انا کے بت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے ۔ جو لوگ اپنی انا کے بت کو توڑ چکے ہوں ان کے لئے کوئی چیز اتحادِ عمل میں مانع نہیں ہوتی ۔ اسی لئے اسلام کے محاذ پر جب ایسے لوگ قابلِ لحاظ تعداد میں جمع ہو جائیں تو لازماً وہ کامیاب ہو کر رہتے ہیں ۔ آخرت کی جنت بھی ان کے لئے لکھ دی جاتی ہے اور دنیا کا غلبہ بھی (صف ۱۳) مگر جو لوگ اپنی انا کے بت کو لئے ہوئے ہوں ، وہ کبھی متحدہ طاقت نہیں بنتے ۔ اور اس طرح وہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا "قول" حقیقتاً قول بلا فعل تھا ۔ ایسے لوگ اللہ کی نظر میں بالکل بے قیمت ہیں ۔ خواہ اپنی خوش فہمیوں کی دنیا میں وہ کتنا ہی زیادہ بڑے نظر آتے ہوں ۔ ایمان بالعمل کی کسوٹی جو خدا نے مقرر کی ہے وہ اسلام کے لئے متحدہ عمل ہے ۔ کوئی دوسری کسوٹی خواہ بظاہر کتنی ہی بڑی دکھائی دے خدا کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ۔

امت مسلمہ کی طاقت: اتحاد

قرآن میں تکمیل دین کی آیت کے تحت ارشاد ہوا ہے — آج کفر کرنے والے لوگ تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے، اب تم ان سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو (مائدہ ۳) یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر سنہ ۱۰ھ میں نازل ہوئی۔ اس کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اور اصحاب رسول کی جدوجہد کے بعد اسلام کی تاریخ جہاں پہنچ چکی ہے وہ اتنی مضبوط ہے کہ اسلام اب اپنی ذاتی بنیادوں پر قائم ہو گیا ہے۔ اب اسلام بیرونی خطرات کی زد سے نکل گیا ہے، اب اس کے لئے خطرہ ہو سکتا ہے تو اندر کی طرف سے نہ کہ باہر کی طرف سے۔

مذکورہ آیت میں امت مسلمہ کے لئے اللہ کا یہ کھلا ہوا وعدہ ہے کہ اب اس کے لئے تشویش کی بات یہ نہیں ہے کہ اس کے اوپر اس کے دشمن غلبہ پالیں۔ بلکہ تشویش کی بات یہ ہے کہ امت کے افراد میں اللہ کا ڈر باقی نہ رہے۔ اب مسلمانوں کے لئے کمزوری کی بات خوف خدا کا نہ ہونا ہے نہ کہ کسی خارجی قوت کے مقابلہ میں ان کا کمزور ہونا۔ یہ اعتقادی بات نہیں ہے بلکہ وہ معلوم حقائق پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کے معاملہ کو اللہ نے یہاں تک پہنچایا کہ زمین کے بڑے رقبہ پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ وہ اس اندیشہ سے باہر نکل گئے کہ محض تعداد کی کمی کی وجہ سے وہ کسی کے مقابلہ میں شکست کھا سکیں۔ ان کے پاس بہترین اقتصادی خطے ہیں۔ انتہائی اہم فوجی مقامات پر ان کا قبضہ ہے۔ ہر قسم کی صلاحیتوں والے افراد رات دن ان کے یہاں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کو ایک ایسی کتاب حاصل ہے جو ان کو ساری دنیا میں فکری برتری عطا کر سکے۔ ان کی تاریخ اتنی شاندار ہے جو قیامت تک ان کی نسلوں کو جوش و ولولہ کی خوراک دینے کے لئے کافی ہے۔

جس قوم کے پاس برتری کے اتنے اسباب جمع ہو جائیں باہر کی کوئی قوم اس کو زیر کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی، الا یہ کہ اس نے اپنی حماقت سے اپنے کو کمزور کر لیا ہو۔ اور یہ حماقت دراصل اندرونی اختلاف ہے قوم کے افراد جب اللہ سے ڈرنے والے ہوں تو وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ وہ انصاف کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ پورا معاشرہ حسد اور بغض کی نفسیات سے پاک ہوتا ہے۔ اور جس معاشرہ کا یہ حال ہو اس میں باہمی اتحاد کے سوا کیا چیز جنم پائے گی۔ اس کے برعکس جب قوم کے افراد اللہ سے بے خوف ہو جائیں تو ہر ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ جاتا ہے۔ ہر آدمی خود غرضی کے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ بدخواہی، انتقام اور حسد سے پورا معاشرہ کھوکھلا ہو جاتا ہے ——— اللہ کا ڈر اتحاد کی فضا پیدا کرتا ہے جو سب سے بڑی طاقت ہے۔ اللہ سے نڈر ہو جانا اختلاف پیدا کرتا ہے اور جو قوم باہمی اختلافات کی شکار ہو جائے وہ لازماً کمزور ہو جاتی ہے خواہ اس کی تعداد بظاہر کتنی ہی زیادہ ہو۔

دو مسلمان مل کر ایک کام شروع کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی وجہ سے دونوں میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اب اگر دونوں خاموشی سے اپنے کام کو الگ کر لیں اور اپنی کوششوں کو جاری رکھنے کے لئے الگ الگ میدان تلاش کر لیں تو اس سے معاشرہ میں کوئی خرابی یا کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ جائے تو دونوں کے تعلقات میں فساد پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر معاشرہ کی کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے یہاں نکاح کا پیغام دیتا ہے۔ دوسرا مسلمان کسی وجہ سے پیغام قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اب اگر پہلا مسلمان اس سے کوئی برا اثر نہ لے اور اپنے لئے کوئی دوسرا رشتہ ڈھونڈ لے تو معاشرہ کسی خرابی کا شکار نہیں ہوتا، اس کے برعکس اگر پہلے مسلمان کے اندر دوسرے مسلمان کے خلاف دشمنی کی آگ بھڑک اٹھے۔ وہ اس کے خلاف جھوٹے مقدمے قائم کرے اور اس کی بربادی کے منصوبے بنائے تو دو مسلمان خاندان نامعلوم مدت کے لئے ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے اور نتیجۃً پورے معاشرہ میں بگاڑ پھیل جائے گا۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عمارت میں کرایہ دار ہے۔ مالک مکان کو کرایہ دار سے کوئی شکایت ہو گئی۔ اب اگر مالک مکان وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کرے تو دونوں کے تعلقات میں کوئی بگاڑ نہیں آئے گا اور ملت کا اتحاد قائم رہے گا۔ اس کے برعکس اگر مالک مکان یہ کرے کہ کرایہ دار کو اکھاڑنے کے لئے اس کو بدنام کرے۔ اس کے خلاف تخریبی منصوبے بنائے۔ اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرے تو یہ ملت کے قلعہ میں نقب لگانے کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ لوگ کرایہ دار کا ساتھ دیں گے اور کچھ لوگ مالک مکان کا۔ ملت دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ ملت کی جو طاقت ملت کی ترقی و استحکام میں لگتی وہ ملت کی بربادی میں صرف ہونے لگے گی۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ملت کے افراد ایک رویہ اختیار کر کے اپنے کو طاقت ور بناتے ہیں اور دوسرا رویہ اختیار کر کے اپنے کو اور بالآخر پوری ملت کو کمزور کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس قسم کی تمام کمزوریوں کی واحد وجہ اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہونا ہے۔ اگر آدمی اللہ سے ڈرے تو وہ ایسے الفاظ اپنی زبان سے نہیں نکالے گا جو اللہ کے یہاں بے قیمت ہو جانے والے ہیں۔ وہ ایسے عمل نہیں کرے گا جو اللہ کی میزان میں جرم ثابت ہونے والے ہیں۔ ہر آدمی اپنی غلطی کو تسلیم کرے گا۔ ہر آدمی دوسرے کو تکلیف دینے سے بچے گا اور جس معاشرہ میں یہ فضا ہو وہاں لازماً اتحاد فروغ پاتا ہے اور اتحاد ہی کا دوسرا نام طاقت ہے۔

آدمی دوسرے کی بربادی کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس سے پہلے کہ دوسرے کے خلاف اس کے ارادے پورے ہوں خود اس کی موت کا وقت آجائے گا۔ وہ دنیا سے اٹھا کر آخرت میں پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں اس کو جواب دینا ہوگا کہ خدا نے اس کو جو کچھ دیا تھا وہ خدا کی امانت تھا۔ اس کو کیا حق تھا کہ ان کو خدا کے بندوں کی بربادی کے لئے استعمال کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر صرف موت کو یاد رکھے تو وہ اس کی اصلاح کے لئے کافی ہو۔

خدا کی مدد اٹھ جاتی ہے

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں دو شریکوں کے ساتھ تیسرا ہوتا ہوں جب تک کہ ان میں کا ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ عز وجل: انا ثالث الشریکین مالم یخن احدھما صاحبہ)

مطلب یہ ہے کہ کوئی گروہ اسی وقت تک خدا کی مدد کا مستحق رہتا ہے جب تک اس کے افراد باہم ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔ اس کے برعکس جب وہ ایک دوسرے کے بدخواہ بن جائیں، جب ان کے درمیان خیانت کی فضا پیدا ہو جائے تو خدا کی مدد ان سے اٹھ جاتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا سے تعلق کا معیار بندوں سے تعلق ہے۔ اگر خدا کے ساتھ کسی کا تعلق درست ہے تو لازماً بندوں کے ساتھ بھی اس کا تعلق درست ہوگا۔ جس کا تعلق بندوں کے ساتھ درست نہ ہو، سمجھنا چاہئے کہ خدا کے ساتھ بھی اس کا تعلق درست نہیں۔ خواہ وہ بظاہر کتنا ہی زیادہ خدا کی باتیں کرتا ہو۔

خیانت کا اصل مفہوم اعتماد میں پورا نہ اترنا ہے۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں خانہ سیفہ (تلوار چوٹ گئی) یعنی تلوار مارنے سے جو امید کی تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ اسی سے مذکورہ حدیث کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔

جب بھی دو آدمی ملتے ہیں، خواہ وہ مالک اور ملازم کی حیثیت سے ملیں یا تاجر اور گاہک کی حیثیت سے۔ وہ مالک مکان اور کرایہ دار کی حیثیت سے ملیں یا دوست اور معاون کی حیثیت سے۔ خواہ جس حیثیت سے بھی ایک شخص کا ساتھ دوسرے شخص سے پڑے، دونوں ایک خاموش عہد میں بندھ جاتے ہیں۔ ہر ایک کا دوسرے کے اوپر کچھ حق قائم ہو جاتا ہے۔ یہ حقوق اور ذمہ داریاں خواہ وہ لکھی ہوئی ہوں یا بغیر لکھی ہوئی، ہر حال میں ان کی پابندی ضروری ہے۔ ان حقوق اور ذمہ داریوں کو نبھانے کا نام امانت ہے اور ان کو نہ نبھانے کا نام خیانت۔

اجتماعی زندگی میں جب بھی اس قسم کی خیانت کی جائے گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں نفرت، بے اعتمادی، ایک دوسرے کی کاٹ اور تخریبی کارروائیاں جنم لیں گی۔ وہاں ہر طرف منفی نفسیات کی فضا پیدا ہوگی اور جہاں منفی نفسیات کی فضا ہو وہاں صرف شیطان کا راج ہوتا ہے۔ خدا اور اس کے فرشتے ایسی فضا میں کبھی بسیرا نہیں لیتے۔

مسلمان آپس میں کیسے رہیں

حدثنا عبد اللہ بن مسلمۃ عن مالک عن ابن شہاب عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا، وکونوا عباد اللہ اخوانا، ولا یحل لمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال (رواہ ابوداؤد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ کرو۔ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو۔ سب اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کو تین رات سے زیادہ چھوڑے۔

اللہ کے وہ بندے جو اللہ کو حقیقی معنوں میں اپنا معبود بنائیں، ان کا دل ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کا دل خدا کی بلندیوں میں اٹکا ہوا ہو، وہ دنیا کی پستیوں میں لت پت ہو کر نہیں رہ سکتے۔ ایسے لوگ اپنے بھائیوں کے درمیان اس طرح رہتے لگتے ہیں جیسے ہوا لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے مگر وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ جیسے پھول کی مہک ہر ایک کو پہنچتی ہے مگر وہ ایک اور دوسرے میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ جیسے روشنی ہر ایک کے پاس آتی ہے مگر وہ کسی سے خوش اور کسی سے خفا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ اسی طرح ایک دوسرے کے مکمل ساتھی ہوتے ہیں جیسے باغ کے درخت ایک دوسرے کے ساتھ بغیر کسی قسم کی باہمی رنجش کے ایک مقام پر کھڑے ہوئے ہوں۔

اسلام کے رزق سے آدمی کو حصہ ملا ہے یا نہیں، اس کی ایک واضح پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے درمیان اس طرح رہنے لگے کہ اس کو نہ کسی سے بغض ہو اور نہ حسد۔ کسی قابل شکایت بات پیش آنے پر وہ اپنے بھائی سے بگڑ نہ جاتا ہو۔ وہ سارے لوگوں کو اللہ کی عیال سمجھ کر اس طرح رہ رہا ہو جیسے ایک باپ کی اولاد مل جل کر رہتی ہے۔ اس قسم کا ذہن جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایسا ہو جائے گا کہ کسی بھائی سے اگر اس کا بگاڑ ہو جائے اور وقتی تاثر سے مغلوب ہو کر وہ اس سے جدائی اختیار کرلے تو تین دن گزرتے گزرتے اس کا سینہ پھٹنے لگے گا۔ وقتی جذبہ نے اس کو جس بھائی سے دور کیا تھا، اس سے وہ اپنے رب کی خاطر دوبارہ اس طرح مل جائے گا جیسے کہ اس کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

مسلمانوں کے ۴۳ آزاد ممالک ہیں جن کی آبادی تقریباً ۷۰ کرور ہے۔ جغرافی طور پر کل دنیا کا ۲۱ فی صد وہ حصہ ہے جہاں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے۔ مسلمان دنیا کی کل آبادی کا تقریباً ۲۳ فی صد ہیں۔ دنیا کے قدرتی ذرائع کا تقریباً نصف حصہ ان کے قبضہ میں ہے۔ مگر تعلیم، باہمی اتحاد، صنعتی ترقی میں وہ دنیا بھر میں سب سے پیچھے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد اگر مذکورہ حدیث کے مطابق آپس میں بھائی بھائی بن کر تو وہ ایسی طاقت ہوگی جس کو زیر کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔

یہ دشمن کا ہتھیار ہے

اسرائیلی لیڈر موشے دایان (پیدائش ۱۹۱۵) نے اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی ہے جس کا نام ہے میری زندگی کی کہانی (The Story of my Life) اسرائیل کے سابق وزیر جنگ نے اپنے حالات کے ذیل میں عربوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔ غیر متحد عرب جو ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں، اسرائیل کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے :

The Arabs, Disunited and at odds with one another
over every Issue, big and small, present no threat

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی انسانی معاشرہ میں اختلاف نہ ہو۔ تاہم یہ انتہائی طور پر ضروری ہے کہ اختلاف کو ٹکراؤ اور دشمنی تک پہنچنے نہ دیا جائے۔ اختلاف جب تک فکری اختلاف کے درجہ میں ہو اس سے کوئی حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ مگر جب اختلاف باہمی ٹکراؤ کی صورت اختیار کرے تو اس سے بڑی کمزوری کسی معاشرہ کے لئے اور کوئی نہیں۔

اسلام میں اتحاد و اتفاق کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلم گروہ خدا کی نصرت سے محروم ہو جاتا ہے جس کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگیں۔ حدیث میں ہے کہ لیلۃ القدر کے تعین کا علم صرف اس لئے اٹھا لیا گیا کہ مدینہ میں دو مسلمان باہم لڑ پڑے تھے۔

عن عبادۃ بن الصامت قال خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیخبرنا بلیلۃ القدر فتلاحی رجلان من المسلمین فقال خرجتُ لاخبرکم بلیلۃ القدر فتلاحی فلان و فلان فرفعت (بخاری)

عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نکلے کہ ہم کو شب قدر کے بارے میں بتا دیں کہ وہ کس روز ہے۔ اس وقت دو مسلمان آپس میں (ایک قرض کے بارے میں) لڑ پڑے۔ آپ نے فرمایا، میں اس لئے نکلا تھا کہ تم کو شب قدر کی خبر دے دوں۔ مگر فلاں اور فلاں آپس میں لڑ پڑے۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا۔

حافظ ابن کثیر اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اپنی تفسیر (سورۃ القدر) میں لکھتے ہیں : ان المماراۃ تقطع الفائدۃ والعلم النافع کما جاء فی الحدیث ان العبد لیحرم الرزق بالذنب یصیبہ (آپس کا لڑائی جھگڑا لوگوں کو فائدہ سے محروم کر دیتا ہے اور نفع بخش علم ان سے اٹھا لیا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے تو وہ ملنے والے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

اتحاد کی قیمت

بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت عروہ ابن زبیر سے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذات السلاسل کے لئے ایک دستہ حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں بھیجا۔ یہ جگہ شام کے اطراف میں تھی۔ حضرت عمرو بن العاص جب وہاں پہنچے اور حالات معلوم کئے تو دشمن کی کثرت سے ان کو خوف پیدا ہوا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیج کر مزید مدد طلب کی۔ آپ نے مہاجرین کو بلایا اور دوسو آدمیوں کا ایک دستہ تیار کیا۔ اس دستہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ بھی شامل تھے۔ آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو اس دستہ کا امیر مقرر کیا اور حکم دیا کہ فوراً روانہ ہوں اور حضرت عمرو بن العاص سے جاکر مل جائیں۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کا دستہ جب منزل پر پہنچا اور دونوں دستے ساتھ ہوگئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ دونوں کا امیر کون ہو۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا: میں تم سب کا امیر ہوں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مدد کے لئے لکھا تھا تم لوگ اس کے مطابق میری مدد کے لئے بھیجے گئے ہو۔ حضرت ابو عبیدہ کے ساتھ جو مہاجرین آئے تھے انھوں نے اس کو نہیں مانا۔ انھوں نے حضرت عمرو بن العاص سے کہا: تم اپنے ساتھیوں کے امیر ہو اور ابوعبیدہ ہمارے امیر ہیں (بل انت امیر اصحابك وابوعبیدة امیر المهاجرین) حضرت عمرو بن العاص اس تقسیم پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ تمھاری حیثیت امدادی فوج کی ہے اور تم لوگ میرا ساتھ دینے کے لئے بھیجے گئے ہو (انما انتم امددت بکم فانا القائد) حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے جب یہ حال دیکھا تو کہا

تعلم یا عمرو، ان آخر ما عهد الیّ رسول الله صلی الله علیه وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا، وانك والله ان عصیتنی لاطعتك

اے عمرو تم پر واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو رخصت کرتے ہوئے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا کہ جب تم اپنے ساتھی کے پاس پہنچو تو دونوں اتفاق کے ساتھ مل کر کام کرنا، باہم اختلاف نہ کرنا۔ پس خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو گے تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابو عبیدہ نے امارت عمرو بن العاص کے حوالے کردی اور ان کی ماتحتی میں کام کرنے پر راضی ہوگئے (فسلّم ابو عبیدة الامارة لعمرو بن العاص) البدایہ والنہایہ جلد ۴

اگر دونوں اپنا اپنا اصرار جاری رکھتے تو مسئلہ ختم نہ ہوتا اور جو طاقت دشمن سے مقابلہ کے لئے بھیجی گئی تھی وہ آپس میں لڑ کر فنا ہو جاتی۔ ایسے اختلافی مواقع پر ایک شخص کا جھکنا پوری جماعت کو طاقت ور بنا دیتا ہے اور ایک شخص کے نہ جھکنے سے پوری جماعت کمزور ہو جاتی ہے۔

اختلاف کی حد

حضرت معاویہ بن ابی سفیان ہجرت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئے اور ۶۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت علی چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے تو امیر معاویہ شام کے حاکم تھے۔ اس کے بعد دونوں میں اختلاف ہوا اور باہم زبردست لڑائیاں ہوئیں۔ امیر معاویہ تقریباً ۴۰ سال تک حکمراں رہے۔ ۲۰ سال شام کے گورنر کی حیثیت سے اور ۲۰ سال تمام اسلامی دنیا کے خلیفہ کی حیثیت سے۔

جس زمانہ میں حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان اختلافات بہت بڑھے ہوئے تھے، قسطنطنیہ کی عیسائی (رومی) حکومت نے سمجھا کہ یہ وقت مسلم سلطنت پر حملہ کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس نے ایک بڑی فوج جمع کی اور ایران کے شمالی صوبوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ یہ علاقہ اس وقت حضرت علی کی حکومت میں شامل تھا۔ اس نازک موقع پر جب کہ علی و معاویہ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اگر یہ حملہ ہوجاتا تو حضرت علی کے لئے اس کو بچانا مشکل ہوجاتا۔ بظاہر دکھائی دیتا تھا کہ اسلامی خلافت کا ایک وسیع علاقہ کٹ کر عیسائی سلطنت میں شامل ہوجائے گا۔

عیسائی حکمراں قسطنطنیہ کے قلعہ میں بیٹھا ہوا تمام خبریں لے رہا تھا۔ وہ اسلامی خلیفہ (حضرت علی) کی مشکلات سے خوب واقف تھا۔ اس کو یقین تھا کہ علی، معاویہ کے لئے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ضرور علی کو کمزور کرنے کی عیسائی کوششوں سے خوش ہوں گے اور مزاحمت کرنے والوں میں شامل نہ ہوں گے۔ اس طرح معاویہ کی غیر جانبداری علی کو زیر کرنے میں نہایت مؤثر ثابت ہوگی اور اس کی مہم آسانی سے کامیابی کے مرحلہ تک پہنچ جائے گی۔

مگر امیر معاویہ ایک اونچے انسان تھے۔ وہ حضرت علی سے اختلاف کے باوجود ان کے معاند نہیں بن گئے تھے۔ وہ اس معاملہ کو اس حد تک لے جانے کے لئے تیار نہ تھے کہ ان دونوں کا باہمی اختلاف اسلامی دنیا میں رومیوں کے دوبارہ داخلہ کا سبب بن جائے۔ انھوں نے جب یہ خبر سنی تو قیصر (قسطنطنیہ کے عیسائی حکمراں) کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

> اے رومی کتے، اگر تو ہمارے آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھاکر اسلامی خلافت پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو تجھ کو معلوم ہونا چاہئے کہ علی کی قیادت میں جو لشکر تیرے مقابلہ کے لئے نکلے گا، معاویہ اس لشکر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوگا۔

یہ خط قسطنطنیہ کے عیسائی حکمراں کی امیدوں کے عین خلاف تھا۔ اس کو پڑھ کر وہ اتنا گھبرا اٹھا کہ اس نے اسلامی علاقہ پر حملہ کا ارادہ ترک کردیا۔

مشورہ پر اصرار نہیں

بدر کی لڑائی (۲ ھ) سے کچھ پہلے قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ساٹھ آدمیوں کی سرکردگی میں شام بھیجا گیا تھا۔ اس تجارتی قافلہ میں مکہ کے مردوں اور عورتوں نے اپنا تمام سرمایہ لگا دیا تھا۔ بدر کی لڑائی میں قریش کو مکمل شکست ہوئی۔ تاہم ابوسفیان کو اس میں کامیابی ہوئی کہ وہ تجارتی قافلہ کو ساحلی راستہ سے چلاکر مکہ پہنچ جائیں۔ جنگ کے بعد سارا مکہ جوش انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ قریش کے ذمہ دار افراد کا ایک اجتماع دار الندوہ میں ہوا۔ اس اجتماع میں متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ تجارتی قافلہ کے شرکا صرف اپنا اصل سرمایہ لے لیں اور منافع کی رقم پوری کی پوری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کی تیاری میں لگا دی جائے۔ منافع کی یہ رقم پچاس ہزار دینار تھی جو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اب قریش نے زبردست تیاری کی اور شوال ۳ھ میں مکہ سے نکل کر مدینہ پر حملہ کے لئے روانہ ہوئے۔

اسی جنگ کا نام جنگ احد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بڑے صحابہ میں سے اکثر کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ مگر نوجوان طبقہ اس کا پرجوش مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم یہاں ٹھہریں گے تو دشمن اس کو ہماری بزدلی اور کم زوری پر محمول کرے گا۔ اس لئے ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ عبداللہ بن ابی کی رائے بھی وہی تھی جو اکابر صحابہ کی تھی۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۷)

جن لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، اس کی بڑی وجہ مدینہ کا جغرافیہ تھا جو ایک قدرتی حصار کا کام کرتا تھا۔ مدینہ کا جائے وقوع ایسا تھا کہ اس کے جنوب میں کھجوروں کے گھنے باغات اس کثرت سے تھے کہ ادھر سے کوئی فوج بستی کے اوپر حملہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی طرح مشرق اور مغرب کے بڑے حصہ میں پہاڑیاں تھیں جو کسی فوجی پیش قدمی کے لئے قدرتی روک کا کام کر رہی تھیں۔ اس لئے کوئی دشمن صرف ایک ہی سمت سے مدینہ پر حملہ کر سکتا تھا۔ اس جغرافی پوزیشن نے مدینہ کو جنگی اعتبار سے کافی محفوظ شہر بنا دیا تھا۔ گویا مدینہ ایک قسم کا قلعہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر وہ چاروں طرف سے دشمن کی زد میں ہو جاتے تھے جب کہ مدینہ کے اندر صرف ایک طرف سے مقابلہ کا انتظام کرنا تھا۔ غزوۂ احزاب میں مدینہ کے اسی جائے وقوع سے فائدہ اٹھایا گیا اور اس کی کھلی سمت میں (شمال مغربی رخ پر) خندق کھود کر پورے شہر کو محفوظ کر لیا گیا تھا۔

بڑے صحابہ کی اکثریت اور عبداللہ بن ابی کی رائے اگرچہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی۔ مگر

آپ نے نوجوان طبقہ کی رائے کا لحاظ کیا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے نکل کر احد کی طرف روانہ ہوئے۔ عبد اللہ بن ابی نے جب دیکھا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی جو بظاہر حالات معقول بھی تھی تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ وہ مدینہ سے ساتھ نکل پڑا تھا مگر دل کے اندر غصہ باقی تھا۔ چنانچہ اسلامی لشکر ابھی مدینہ اور احد کے درمیان تھا کہ عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینہ کی طرف واپس ہوگیا۔ عبد اللہ بن ابی نے کہا:

اطاعهم وعصانی، ما ندری علام نقتل انفسنا ههنا ایها الناس

رسول اللہؐ نے ان کی بات مان لی اور میری بات نہیں مانی۔ اے لوگو! ہم کو نہیں معلوم کہ ہم اپنی جانوں کو یہاں کیوں ہلاک کریں۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸)

احد کی جنگ میں شکست نے یہ ثابت کیا کہ انھیں لوگوں کی رائے درست تھی جو مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کے لئے کہتے تھے اور باہر نکلنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد غزوۂ خندق (۵ھ) میں اسی رائے کو اختیار کیا گیا اور مدینہ میں رہ کر مقابلہ کی تدبیر کی گئی۔ تاہم تمام بڑے صحابہ اپنے اختلاف رائے کو بھول کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور جنگ میں شدید نقصان اور تکلیف کے باوجود پوری بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ صرف عبد اللہ بن ابی الگ ہوا اور اس کی بنا پر رئیس المنافقین کہلایا۔ عبد اللہ بن ابی کی رائے اصولاً درست تھی۔ تجربہ نے بھی اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی۔ مگر صحت رائے کے باوجود اطاعت سے نکلنا اس کے لئے گمراہی اور خدا کی ناراضی کا سبب بن گیا۔

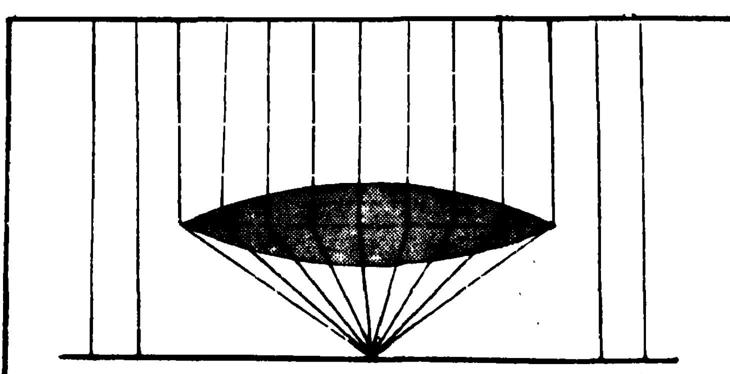
اسلام میں مشورہ کی بے حد اہمیت ہے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنا مشورہ پیش کرے۔ لیکن ہر مشورہ دینے والا اگر یہ بھی چاہے کہ اس کے مشورہ پر ضرور عمل کیا جائے تو کبھی کوئی کام نہیں ہوسکتا کیونکہ مختلف رایوں میں سے کسی ایک ہی رائے کو عملاً اختیار کیا جاسکتا ہے نہ کہ ہر رائے کو۔ سچے مسلمان وہ ہیں جو مشورہ پیش کرنے کے بعد اپنا مشورہ بھول جائیں اور ذمہ داروں کی طرف سے جو فیصلہ ہو اس کو اس طرح مان لیں جیسے وہی ان کی اپنی رائے تھی۔

"سب سے بڑی قربانی رائے کی قربانی ہے"، کسی شخص کا یہ قول بہت بامعنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے کی قربانی واحد چیز ہے جس کے اوپر کوئی مضبوط اجتماعیت کھڑی ہوتی ہے۔ کوئی عمارت صرف اس وقت بنتی ہے جب کہ کچھ اینٹیں اپنے آپ کو زمین میں دبانے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح کوئی حقیقی اجتماعیت صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ اس کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی رایوں کو اپنے سینہ میں چھپا لیں گے اور اختلاف رائے کے باوجود اتحاد عمل کا ثبوت دیں گے۔ اس قربانی کے بغیر کسی انسانی اجتماعیت کا وجود میں آنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اینٹوں کے بنیاد میں دفن ہوئے بغیر عمارت کا وجود میں آنا۔

اتحاد کی طاقت

کسی شخص نے کبھی یہ نہیں سنا ہوگا کہ سورج کی گرمی سے کاغذ جل گیا۔ حالاں کہ سورج کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ کاغذ تو کیا پورا کا پورا پہاڑ بلکہ سارا کرۂ ارض اس طرح جل سکتا ہے جیسے کسی بھڑکتے ہوئے تنور میں ایک تنکا۔ مگر یہی سورج جس کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے جنگلوں اور پہاڑوں کو بھک سے اڑا دے وہ موجودہ حالت میں ایک تنکے کو بھی جلانے پر قادر نہیں ہے، ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں لاکھوں کروڑوں میل کے دائرے میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے کسی ایک چیز پر بیک وقت اس کی شعاعیں اتنی مقدار میں نہیں پڑتیں کہ وہاں وہ اتنی گرمی پیدا کر سکیں جو کسی چیز کو جلانے کے لئے ضروری ہے۔ حالاں کہ یہی بکھری ہوئی شعاعیں اگر سمیٹ دی جائیں تو وہ خوفناک الاؤ کی شکل میں بھڑک سکتی ہیں۔

آفتابی چولھا سورج کی شعاعوں کے اسی قسم کے ارتکاز کا نام ہے۔ بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک خاص دائرے میں سمیٹ دینے کی وجہ سے اس جگہ اتنی گرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ کھانا پکنے لگتا ہے۔ آفتابی چولھا تو ابھی بہت کم رائج ہو سکا ہے مگر آتشیں شیشہ (Burning Glass) ایک ایسی چیز ہے جو اکثر اشخاص نے کبھی نہ کبھی دیکھا ہوگا۔ آتشیں شیشہ کیا ہے۔ یہ ایک محدب یا کروی عدسہ (Convex Lens) ہے جس سے کاغذ یا دوسری آتش پذیر چیزوں میں آگ لگائی جا سکتی ہے۔ عام حالات میں کاغذ پر سورج کی جو شعاعیں پڑتی ہیں، وہ اتنی زیادہ گرمی نہیں پیدا کر سکتیں کہ اس میں آگ لگ جائے۔ مگر انھیں شعاعوں کو جب مجتمع کر دیا جاتا ہے تو وہ شعلہ کی مانند بھڑک اٹھتی ہیں۔ کوئی بھی شخص تجربہ کر کے معلوم کر سکتا ہے کہ لنس ان شعاعوں کو طاقت ور بنانے کے لئے کیا کرتا ہے، ذیل کے نقشہ میں شعاعیں آتشیں شیشہ سے گزر کر مڑ رہی ہیں۔



بکھری ہوئی شعاعیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر طاقت ور ہو جاتی ہیں

اس نقشہ کے مطابق آتشیں شیشہ کا تمام تر عمل صرف یہ ہے کہ وہ ان شعاعوں کو جمع کرے جو لنس کے پورے دائرے میں پڑ رہی ہیں اور ان کو اس طرح موڑے یا منعطف کر دے کہ وہ سب اکٹھا ہو کر ایک محدود رقبہ پر پڑنے لگیں۔ سورج کی شعاعوں کا یہ اجتماع اس محدود رقبہ میں اتنی حرارت پیدا کر دیتا ہے کہ کاغذ جلنے لگتا ہے۔

یہ مثال میں نے یہ واضح کرنے کے لئے دی ہے کہ انتشار اور اجتماع میں کیا فرق ہے۔ ایک ہی چیز اگر منتشر حالت میں ہو تو وہ بے وزن ہے۔ لیکن اگر اسے اکٹھا کر دیا جائے تو اتنی زبردست طاقت بن سکتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت جس کمزوری کی حالت میں اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں وہ حقیقۃً اتنے کمزور نہیں ہیں، یہ کمزوری ان کے انتشار کی پیدا کردہ ہے۔ اگر وہ اپنے درمیان اجتماعیت کا آتشیں شیشہ فراہم کر لیں اور انفرادی طور پر بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک مقام پر مجتمع کر دیں تو یکا یک وہ دیکھیں گے کہ جو شعاعیں الگ الگ ہونے کی صورت میں تنکا جلانے کے لئے بھی ناکافی نظر آتی تھیں، انھیں کی گرمی سے شہتیر بھڑک اٹھا ہے۔ ہماری موجودہ تعداد اور موجودہ ذرائع و وسائل جو منفرد طور پر بالکل بے قیمت نظر آتے ہیں، یہی تعداد اور یہی ذرائع کروروں گنا زیادہ اہمیت اختیار کر لیں گے۔ آج ہر مسلمان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس وقت ہر شخص اپنے کو ایک پوری قوم کی مانند سمجھنے لگے گا۔ اور جب ایسا ہوگا تو دوسرے بھی ہم کو اسی نظر سے دیکھیں گے جیسا کہ فی الواقع ہم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ بتائی جاتی ہے۔ یہ دس کروڑ افراد گویا دس کرور دھاگے ہیں، اگر وہ الگ الگ ہوں تو کوئی شخص بھی انھیں باری باری توڑ سکتا ہے۔ لیکن یہی دس کروڑ دھاگے اگر مل جائیں تو وہ اتنا مضبوط رسا بن جائیں گے جنھیں ایک ہاتھ تو کیا سیکڑوں ہاتھ بھی توڑنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ جو چیز الگ سے دیکھنے میں محض ایک دھاگا ہے وہ اتحاد کی برکت سے موٹے رسے کا مقام حاصل کرے گی۔ قطرہ سمندر میں ہو تو وہ سمندر ہے اور باہر ہو تو وہ قطرہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ اتحاد اور اجتماعیت موجودہ حالات میں مسلمانوں کی شدید ترین ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حالات کے سدھار کے لئے کوئی مؤثر کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اصلاح حال کی ہر تجویز اپنی کامیابی کے لئے یہ چاہتی ہے کہ مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ ذرائع و وسائل اس کے لئے مہیا ہو سکیں، زیادہ سے زیادہ حمایت کے ساتھ اس کو مؤثر بنایا جا سکے، جب وہ دنیا کے سامنے آئے تو لوگوں کو وہ زیادہ سے زیادہ وسیع، در باوزن معلوم ہو۔

کوئی بھی اجتماعیت، خواہ وہ کتنے ہی ہلکے درجہ کی ہو، بہرحال قربانی چاہتی ہے —— وقت کی قربانی، رائے کی قربانی، حیثیت کی قربانی، ذاتی مفادات کی قربانی۔ کبھی ایسا ہوگا کہ ذاتی دائرہ میں آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے، مگر قوم کو اس کی ضرورت ہوگی، کبھی اپنی رائے کو محض اس لئے

چھوڑنا ہوگا کہ دوسروں کو آپ اس کا قائل نہیں کر سکے اور اشتراک کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ آپ اپنی رائے سے عملی طور پر دست بردار ہو جائیں۔ کبھی آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی ڈھانچہ میں آپ کی حیثیت گھٹ رہی ہے مگر اس کے باوجود ڈھانچہ کو برقرار رکھنے کے لئے آپ اپنی حیثیت کو نظر انداز کر دیں گے۔ کبھی اجتماعی تقاضے آپ کے ذاتی مفادات کو متاثر کرنے لگیں گے۔ ضرورت پکارے گی کہ اس وقت اپنا سرمایہ ذاتی خواہش میں نہیں بلکہ قوم کے کام میں لگاؤ اور آپ اس پکار کو لبیک کہیں گے، کبھی ذاتی اور خاندانی مصالح پر قوم کی مصالح کو ترجیح دینا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک ایسے معاشرہ میں یہ اجتماعیت قائم نہیں ہوسکتی جہاں صدارت اور نظامت حاصل کرنے کے لئے رسہ کشی ہوتی ہو۔ جہاں قوم کے پڑھے لکھے لوگ محض بیرونی ملکوں کی سیاحت کی قیمت پر اس کے لئے راضی ہو جائیں کہ وہ باہر جا کر قوم کی غلط نمائندگی کریں۔ جس کے افراد کو محض ایک اچھا عہدہ دے کر خریدا جا سکتا ہو، جہاں ایک مسلم گروہ دوسرے مسلم گروہ کو شکست دینے کے لئے قوم کے دشمنوں سے مل جاتا ہو، جہاں یہ حال ہو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے خفا ہو تو پولیس کے دفتر میں اس کے خلاف مخبری کرنے پہنچ جائے۔ جہاں نظر آئے کہ کچھ لوگ ایک ملی کام کے لئے اٹھیں تو بقیہ لوگ اس کا تعاون کرنے کے بجائے یہ سوچنے لگیں کہ کہیں یہ میدان پر قابض نہ ہو جائیں اور فوراً اسی کام کے لئے ایک اور علیحدہ تنظیم قائم کر کے لوگوں کو اپنی طرف بلانا شروع کر دیں۔ جہاں ملت کی ضروریات، خدمت کرنے کا میدان نہ ہوں بلکہ لیڈری حاصل کرنے کا سستا ذریعہ بن جائیں۔ جہاں لوگ اجتماعی احساس سے اس قدر ناآشنا ہوں کہ اختلافات پر گالی گلوج ہونے لگے اور ترک کلام کی نوبت آجائے جہاں لوگوں کی سطحیت کا عالم یہ ہو کہ اتحاد کے بجائے اختلاف کے اجزاء ڈھونڈتے ہوں، جہاں گروہ بندی اس شدت کو پہنچی ہوئی ہو کہ اپنے دائرہ سے باہر نہ کسی حق کو تسلیم کریں اور نہ اپنے سوا کسی کو کام کرنے کا اہل سمجھتے ہوں۔ جہاں پستی کا یہ عالم ہو اور جہاں اجتماعی اوصاف کی اس درجہ کمی ہو وہاں تمام لوگ آخر ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کس طرح ہوں گے ———— حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سب سے ضروری کام یہ ہے کہ قوم کو اخلاقی پستی سے نکالا جائے اور اس کے اندر اجتماعی احساس پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہمارے اندر کوئی اجتماعیت برپا ہوسکے۔

اتحاد اور اجتماعیت کے بغیر ہمارا کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اور اتحاد اور اجتماعیت ایسی چیز ہے جو پوری طرح ہمارے بس میں ہے۔ وہ کسی بھی طرح ہمارے لئے ناممکن نہیں۔ بقیہ تمام چیزوں کے لئے دوسروں کو بدلنا پڑتا ہے۔ جب کہ اتحاد قائم کرنے کے لئے ہمیں صرف اپنے آپ کو بدلنا ہے۔ اب اگر ایک ایسے امکان کو بھی ہم حاصل نہیں کرتے جو خود ہمارے اپنے بس میں ہو تو تاریخ ہم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ مستقبل کا مورخ یقیناً ہم کو مجرم ٹھہرائے گا، خواہ اپنے طور پر ہم دوسروں کو اپنی مصیبت کا ذمہ دار سمجھتے ہوں۔

(ماہنامہ الفرقان جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ)

مسجد کا سبق

مسجد کے صحن اور برآمدے میں نمازی بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی وضو کر رہا تھا، کوئی سنتوں میں مشغول تھا، کوئی فارغ ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ غرض برآمدے سے لے کر صحن تک مختلف لوگ مختلف حالتوں میں مشغول تھے۔ سب ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتے تھے۔ ہر ایک اپنے انفرادی عمل میں مصروف نظر آتا تھا۔

اتنے میں گھڑی نے ٹن ٹن پانچ بجائے اور امام صاحب اپنے حجرہ سے نکل کر مصلے پر کھڑے ہو گئے۔ "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی بلند آواز نے لوگوں کو بتایا کہ جماعت کھڑی ہو گئی ہے۔

امام کے پیچھے ایک کے بعد ایک صفیں بننے لگیں۔ جو لوگ مسجد کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے، آآ کر صف میں ملنے لگے۔ کچھ لوگ پہلے پہنچے۔ کچھ لوگ دیر میں آکر صف میں شامل ہوئے۔ چند منٹ کے اندر سارا پھیلا ہوا مجمع امام کے پیچھے قطار در قطار ایک منظم فوج کی طرح کھڑا ہو گیا۔ سب صف کے اندر شامل تھے۔ ہر شخص کا رخ ایک تھا۔ ہر شخص ایک آواز پر حرکت کر رہا تھا۔ سب ایک ساتھ اٹھتے، ایک ساتھ بیٹھتے اور ایک ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جاتے۔

یہ منظر دیکھ کر دل نے کہا "جو منظر مسجد کے اندر دکھائی دے رہا ہے، کیا وہی مسجد کے باہر بھی واقعہ بنے گا۔ کیا مسلمانوں کا بکھرا ہوا قافلہ سب ایک مرکز پر جمع ہو جائے گا۔ کیا یہ نماز پڑھنے والے مسجد کے باہر بھی مسجد کا سبق دہرائیں گے۔

یہ واقعہ بے شمار مسجدوں میں ہر روز ہوتا ہے۔ ہر روز نماز کے ذریعہ مظاہرہ کر کے مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کیسی ہونی چاہئے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ مسجد کا عمل مسجد سے باہر لوگوں کی زندگیوں میں واقعہ نہیں بنتا۔

مسجد کی نماز بیک وقت دو چیزوں کا سبق ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ خدا کے آگے جھک جائیں، وہ خدا کے سامنے عاجز بن کر رہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک آواز پر حرکت کریں، وہ دنیا میں نظم اور اجتماعیت کے ساتھ زندگی گزاریں۔ لوگ روزانہ پانچ بار مسجد میں یہ سبق لیتے ہیں۔ مگر مسجد کے باہر آتے ہی اسے بھول جاتے ہیں۔ ان کی مسجد سے باہر کی زندگی میں نہ عجز اور تواضع کا رنگ نظر آتا اور نہ اتحاد اور اجتماعیت کا۔ حالاں کہ یہ دونوں چیزیں اتنی اہم ہیں کہ اگر وہ مسلمانوں کی زندگی میں پوری طرح آجائیں تو ان کا وجود دنیا میں ایک عظیم انقلاب کا سبب ہو جائے۔

انتشار سے اتحاد تک

میرے سامنے دور تک پھیلا ہوا میدان تھا۔ اونچا نیچا میدان۔ اس میدان میں گڈریہ کی بھیڑ بکریاں بہت بڑی تعداد میں بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی کھلی جگہ پر تھی، کوئی جھاڑی میں گھسی ہوئی تھی کوئی گہرائی میں اتر گئی تھی، کوئی درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ غرض بھیڑ بکریوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ مگر سب منتشر۔ ہر ایک کا رخ الگ تھا۔ ہر ایک کی سرگرمیاں جدا تھیں۔

یہ منظر دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا "جو حالت ان بھیڑوں کی ہے وہی حالت اس وقت ہماری ملت کی ہے،، میں نے سوچا "کروروں کی تعداد رکھنے والی ایک قوم بالکل انتشار کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ ہر ایک اپنی پسند کے رخ پر بھاگا جا رہا ہے۔ لوگوں کی سمت سفر یکساں نہیں۔ ان کے درمیان ایسی منصوبہ بندی نہیں کہ ہر ایک کی جدوجہد بالآخر پوری ملت کے لئے مفید بن سکے۔ ان کے درمیان مقصد کا وہ اشتراک نہیں جو مختلف افراد کو ایک رشتہ میں پرو دیتا ہے۔ ان کے افراد بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کی قوت ضائع ہو رہی ہے۔ ان کو اپنا شعور نہیں ۔ ۔ ۔

میں بھیڑ بکریوں کا منظر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہونے لگی۔ اب گڈریہ کی واپسی کا وقت ہو گیا۔ اس نے آواز لگائی اور اس کی آواز سن کر تمام بھیڑیں اپنے اپنے مقامات سے نکل کر اس کی سمت میں چل پڑیں۔ گڈریہ نے اپنے دو لڑکوں کی مدد سے گلہ کو سمیٹا اور ان کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب میرے سامنے دوسرا منظر تھا۔ منتشر بھیڑیں ایک ریوڑ کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ اب وہ سب کی سب ایک گڈریہ کے ساتھ جمع تھیں۔ سب ایک سمت میں چل رہی تھیں۔ سب اکٹھا تھیں مگر ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ سب شانہ سے شانہ ملا کر چلی جا رہی تھیں۔ ان کا مقصد متعین تھا۔ ان کی منزل معلوم تھی۔ ان کو جانا تھا اور چلے جانا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے معلوم مقام پر پہنچ جائیں۔

اب میرے دل میں خیالات کا نیا طوفان امڈنے لگا۔ بھیڑ بکریوں کے "انتشار" کو "اجتماع" بنتے دیکھ کر میں نے سوچا: "کیا ہماری ملت کا منتشر انبوہ بھی کسی دن ریوڑ بنے گا۔ کیا ہم بھی ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے۔ کیا ہم بھی شانہ بشانہ مل کر چلیں گے۔ کیا ہمیں بھی اپنے مشترک مقصد کا شعور حاصل ہوگا۔ کیا ہمارا بھی رخ متعین ہوگا۔ کیا ہمارا قافلہ بھی منزل کی طرف چل پڑے گا۔ بھیڑ بکریوں کے لئے تو یہ لمحہ چند گھنٹوں کے بعد آگیا۔ ہمارے لئے یہ لمحہ کب آئے گا ۔ ۔ ۔

یہ بات ہم میں کیوں نہیں

بڑھئی پورے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس کے سامنے مختلف قسم کی لکڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کو کاٹتا، کسی کو چھیلتا، کسی میں سوراخ کرتا اور کسی پر رندہ چلاتا۔ بظاہر ان مختلف چیزوں میں کوئی باہمی ربط نہیں تھا۔ ایک انجان آدمی دیکھے تو یہی رائے قائم کرے گا کہ بڑھئی قسم قسم کی لکڑیوں کو بے مقصد طور پر ٹھونکنے پیٹنے میں مشغول ہے۔

چند روز بعد نقشہ دوسرا تھا۔ اب لوگوں نے دیکھا کہ جہاں متفرق لکڑیاں بکھری ہوئی تھیں وہاں خوبصورت کرسی اور میز رکھے ہوئے ہیں۔ اب ان کو معلوم ہوا کہ بڑھئی اگرچہ بظاہر بے ترتیب عمل کر رہا تھا مگر حقیقۃً وہ نہایت مربوط کام میں مشغول تھا۔ اس کا کئی کام دراصل ایک کام تھا۔ اس کے ذہن میں ایک مکمل نقشہ تھا اور متفرق لکڑیاں اس کے اسی مکمل نقشہ کے اجزاء تھے۔ وہ ان پر اس لئے عمل کر رہا تھا کہ ان کو اپنے کلی نقشہ سے ہم آہنگ کرے اور پھر ان سب کو اپنے نقشہ کے مطابق جوڑ کر اپنے ذہنی منصوبہ کو عملی شکل دے سکے۔

یہ دیکھ کر مجھے خیال آیا ـــــــ کاش ملت کے درمیان مختلف سرگرمیوں کی بھی یہی نوعیت ہوتی۔ ہمارے اشخاص اور ہمارے ادارے طرح طرح کی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ کوئی علمی کام کر رہا ہے اور کوئی تبلیغی کام۔ کوئی تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے اور کوئی سماجی خدمت۔ کوئی سیاسی میدان میں سرگرم ہے اور کوئی اقتصادی میدان میں۔ اگر ہمارا ذہن ایک ہو اور ہمارے درمیان ملی شعور زندہ ہو تو یہ بظاہر الگ الگ ہونے والی سرگرمیاں ایک منظم منصوبہ کی شکل اختیار کر لیں گی۔ وہ مختلف کام جو آج ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آتے ہیں، وہ مستقبل کی اس ملت اسلامی کے اجزاء بن جائیں گے جو ہر لحاظ سے مکمل ہوگی۔ جس میں وہ سب کچھ اپنی اپنی جگہ موجود ہوگا جو ایک زندہ اور مستحکم گروہ کے لئے اس دنیا میں ضروری ہے۔

جو واقعہ کرسی اور میز کی دنیا میں روزانہ پیش آتا ہے وہی ہمارے درمیان کیوں واقعہ نہیں بنتا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ کرسی اور میز کی لکڑیاں اپنے آپ کو ایک بڑھئی کے حوالے کر دیتی ہیں اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ میز اور کرسی کی صورت میں ڈھل سکیں۔ اس کے برعکس ہم کسی کو اپنا "بڑھئی" ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی میں وہ واقعہ ظاہر نہیں ہوتا جو لکڑی کی دنیا میں ہر آن ظہور میں آرہا ہے۔

ٹیم کی طرح

کھیل کے میدان میں جب کسی ٹیم کے ایک فرد کو گیند ملتا ہے تو وہ گویا پوری ٹیم کو مل جاتا ہے ہر ایک اپنے کو اس میں شریک سمجھنے لگتا ہے۔ سب مل کر اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب کے دل کی دھڑکنیں بس ایک گیند پر آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ اس وقت ہر شخص وہی چاہنے لگتا ہے جو اس کا دوسرا ساتھی چاہ رہا ہے۔

مگر ملت کی دنیا میں معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں جب اتفاقاً کسی شخص کو "گیند" ہاتھ آجائے تو وہ اس کے اپنے لئے ذاتی نمائش کا سامان ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے حسد اور رقابت کا۔ یہاں نہ گیند والا صحیح حالت پر قائم رہتا ہے اور نہ بے گیند والا۔

ملت کے جس ادارہ میں دیکھئے، ہر جگہ عہدوں اور مناصب کی جنگ نظر آئے گی۔ کہیں ایک صورت میں اور کہیں دوسری صورت میں۔ جس کو عہدہ مل گیا ہے وہ اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے اور جس کو نہیں ملا ہے وہ نہ ملنے پر صبر کرنے کے لئے راضی نہیں ہے۔ ہر آدمی سارا کریڈٹ خود لینا چاہتا ہے، کوئی اپنے سوا دوسرے کو کریڈٹ دینا نہیں چاہتا۔

ملت کی ٹیم میں کھیل کی ٹیم والی روح نہ ہونا ہماری اکثر مصیبتوں کی جڑ ہے۔ کیونکہ گیند تو ہمیشہ ایک ہوتی ہے اور ٹیم کے افراد زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر ہر شخص یہ چاہے کہ اسی کو گیند آگے بڑھانے کا سہرا ملے تو گیند تو اپنی جگہ پڑی رہ جائے گی۔ البتہ ٹیم کے افراد آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے۔ کسی ٹیم کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس کے افراد یہ جانیں کہ کب مجھ کو گیند لے کر آگے بڑھنا ہے اور کب اس کو دوسرے کے حوالے کر دینا ہے۔ ان میں یہ حوصلہ ہو کہ وہ اصل کھیل کو دیکھیں نہ یہ کہ کریڈٹ کس کو ملتا ہے اور کس کو نہیں ملتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے موجودہ دنیا کی زندگی سراسر امتحان ہے۔ بالفاظ دیگر، وہ کھیل دکھانے کی جگہ ہے نہ کہ کھیل کا انعام پانے کی جگہ۔ یہ ذہن اگر صحیح طور پر لوگوں میں پیدا ہو جائے تو ہر قسم کا ٹکراؤ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اب آدمی کی نظر اپنے فرائض پر ہوگی نہ کہ عہدوں اور مرتبوں پر۔ اس کے برعکس اگر زندگی کو امتحان نہ سمجھا جائے تو زندگی ایک دوسرے پر سبقت کا اکھاڑا بن جاتی ہے۔ باہمی ٹکراؤ کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو کسی حد پر نہیں رکتا۔ اس کے بعد وہ فضا ہی ختم ہو جاتی ہے جس میں لوگ مل کر کام کریں اور دوسرے کی کامیابی پر اپنے دل میں خوشی کی ٹھنڈک محسوس کریں۔

انتشار اور اجتماع کا فرق

ریت خواہ کتنی ہی زیادہ مقدار میں ہو، اس کے لئے کوئی جماؤ نہیں۔ ہوائیں اس کو ہر طرف اڑاتی پھرتی ہیں۔ ہر طوفان اس کو بہالے جانے کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے۔ مگر چٹان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ چٹان کے لئے ہواؤں اور طوفانوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ ہوا کا طوفان اگر ریت کو بے قیمت ثابت کرتا ہے تو چٹان کے لئے اس کا آنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس کی مضبوطی اور استحکام کو لوگوں کی نظروں میں ثابت شدہ بنا دے۔

دونوں کے درمیان یہ فرق کیوں ہے جب کہ دونوں حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ریت بکھری ہوئی چٹان ہے اور چٹان جمی ہوئی ریت۔ جب دونوں اصلاً ایک ہیں تو کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ایک پر ہوائیں قابو پالیتی ہیں۔ مگر دوسرے پر ان کا کوئی قابو نہیں چلتا۔ اس کی وجہ انتشار اور اجتماع کا فرق ہے۔ ریت منتشر ہو کر اپنے کو ہوا کے مقابلہ میں بے زور کر لیتا ہے۔ اور چٹان "مجتمع" ہونے کی وجہ سے طاقت ور اور مستحکم ہے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ کوئی گروہ اگر انتشار کی حالت میں ہو، اس کے افراد ایک دوسرے سے الگ ہو کر بکھرے ہوئے ہوں تو کثرت تعداد کے باوجود ان کی کوئی اجتماعی طاقت نہ ہوگی۔ دوسروں کے مقابلہ میں ہر جگہ وہ کمزور ثابت ہوں گے، خارجی حوادث کا طوفان ان کو ریت کی مانند اڑالے جائے گا۔ اس کے برعکس اگر اس گروہ کا حال یہ ہو کہ اس کے افراد آپس میں جڑے ہوئے ہوں، انھوں نے اپنی انفرادیت کو اجتماعیت کی صورت میں باندھ رکھا ہو تو ہر ٹکراؤ کے موقع پر وہ ناقابل تسخیر ثابت ہوں گے، باہر کے حملوں کے مقابلہ میں وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہیں گے، کوئی بھی ان کو ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں ہر وقت آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اس دنیا میں زندگی کا حق صرف اس کے لئے ہے جو امتحان کی جانچ میں پورا اترے۔ جو لوگ امتحان میں ناکام ثابت ہوں ان کو خدا کی اس دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔ حقائق کی یہ دنیا ایسے لوگوں کو بے قیمت قرار دے کر کوڑے خانہ میں پھینک دیتی ہے۔

اس دنیا میں آدمی کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ حقیقت کی سطح پر جینے کے لئے تیار ہے یا نہیں۔ جو لوگ حقیقت کی سطح پر جینے لگیں ان کے یہاں خود بخود ان چیزوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو باہمی انتشار کا سبب بنتی ہیں اور آپس کا بگاڑ اور اختلاف پیدا کر کے اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ حقیقت کی سطح پر جینے والے افراد کے باہمی تعلق ہی کا نام اتحاد ہے اور حقیقت کی سطح سے دور ہو جانے والوں کے باہمی تعلق کا نام انتشار۔

مال گاڑی کو دیکھ کر

میں ریلوے لائن کے کنارے کھڑا تھا کہ ایک مال گاڑی کی گڑگڑاہٹ نے مجھے اپنی طرف متو کرلیا۔ یہ کئی درجن ویگنوں کی ایک لمبی باہم جڑی ہوئی قطار تھی جو دیر تک میرے سامنے سے گزرتی رہی۔ کے بعد ایک اس کے ڈبے انجن سے بندھے ہوئے اس طرح چلے جارہے تھے جیسے انجن کے پیچھے چلنے کے انھیں کچھ اور معلوم ہی نہ ہو۔ ویگنوں کی اس مجموعی حرکت نے ان کے اندر ایک عجیب سماں پیدا کردیا تھا، معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حسن اور معنویت کا ایک دوڑتا ہوا نشان بن گئے ہوں۔

"یہ خوش قسمتی کیا صرف مال گاڑی کے ویگنوں کے لئے مقدر ہے،" میں نے سوچا "مال کے ڈبوا ان کے مقرر راستہ پر لے جانے کے لئے ایک انجن ہے۔ کیا ہمارے انسانی قافلہ کے لئے کوئی انجن نہیں ممکن نہیں کہ ملت کے کروڑوں افراد کا بھی ایک انجن ہو اور اس کے تمام افراد اس سے جڑ کر خدا کے بت ہوئے راستہ پر رواں دواں ہوں۔ کیا ہمارا قافلہ حسن اور معنویت کے اس مجموعہ کی صورت میں نہیں ڈھل جس کا ثبوت یہ دھات کے ڈبے دے رہے ہیں۔ مال کے ڈبے جو ہماری نظر میں اتنے حقیر ہیں کہ ہم کو سف لئے دئے جائیں تو ہم اس میں بیٹھ کر سفر کے لئے تیار نہ ہوں۔ وہ ایک انجن سے جڑ کر اپنا مشترک قاف بنا لیتے ہیں اور سب مل کر اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ کیا یہی عمل ہم اپنی زندگی میں نہیں دہرا سکتے۔

آہ وہ بھیڑ جو ایک قافلہ نہیں بن سکتی۔ اور آہ وہ قافلہ جو اپنے آپ کو ایک انجن کے سپرد کے لئے تیار نہیں۔

دھات کے مجموعوں کا اتنا کامل طور پر بامعنی کردار ادا کرنا بے سبب نہیں ہے۔ یہ انسان کے خدا کے قائم کئے ہوئے نمونے ہیں۔ یہ بے خطا کارکردگی کے نمونے اس لئے ہیں کہ جو کچھ وہ بے شعوری ساتھ کرتے ہیں اسی کو انسان شعور کے ساتھ کرنے لگے، جو کچھ وہ "جبر" کے تحت انجام دیتے ہیں ا انسان "اختیار" کے تحت انجام دے۔ یہی انسان کا امتحان ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس ک یا ناکامی کا فیصلہ ہونا ہے۔

دھات کے ٹکڑوں کے لئے ان کی معنویت کے مظاہرہ پر کوئی انعام نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ ہیں اپنی سمجھ اور ارادہ کے تحت نہیں کررہے ہیں۔ مگر انسان جب اسی بامعنی کردار کو اپنی سمجھ اور اپنے کے تحت انجام دیتا ہے تو وہ خدا کے یہاں بہت بڑے انعام کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس کے لئے دنیا میں دیا جاتا ہے اور آخرت میں جنت۔

جانوروں سے پیچھے

جنگلی ہرنوں کو اگر آپ جنگل میں دیکھیں تو وہ ہمیشہ غول کی صورت میں دکھائی دیں گے ۔ ہرن، دوسرے اکثر جانوروں کی طرح، کبھی اکیلا نہیں رہتا ۔ وہ ہمیشہ اپنی جماعت کے ساتھ رہتا ہے ۔ ہرن کی زندگی کا مقصد اگرچہ غذا اور پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں ۔ مگر جنگل کی دنیا میں ہر وقت چھوٹے جانوروں کو بڑے جانوروں کا ڈر لگا رہتا ہے ۔ ہر جانور کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ اس سے بڑا جانور اس کو اپنا شکار نہ بنالے ۔ اس لئے جنگل کے جانور الگ الگ نہیں رہتے ۔ بلکہ غول کی صورت میں زندگی گزارتے ہیں ۔ وہ ساتھ چلتے ہیں ۔ ساتھ بیٹھتے ہیں ۔ ساتھ مل کر اپنے سب کام کرتے ہیں ۔ ایسا وہ اس لئے کرتے ہیں کہ کوئی خطرہ پیش آئے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرسکیں ۔ وہ نازک موقع پر دشمن کے مقابلہ میں اکیلے نہ رہیں ۔ وحشی جانور اپنی ساری وحشت کے باوجود اپنے تحفظ کی خاطر اکھٹا ہو جاتے ہیں ۔

جنگل کا ایک جانور جانتا ہے کہ تنہا رہنا گویا اپنے آپ کو اس کے لئے چھوڑ دینا ہے کہ دشمن جب بھی چاہے اس کو اپنا شکار بنالے ۔ اس کے برعکس نظم اور اتحاد دشمن کے خلاف مضبوط دیوار ہیں ۔ قدرت نے ہر جانور کو یہ سبق فطری طور پر سکھا دیا ہے ۔ وہ اس سبق کو پوری طرح اپنے حق میں استعمال کرتا ہے ۔ وہ جنگل کی غیر محفوظ دنیا میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے ۔

انسان بھی اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے جس بات کو جانور صرف جبلّی طور پر جانتے ہیں وہ انسان کو عقلی اور شعوری طور پر معلوم ہے ۔ مگر بہت کم مثالیں ملیں گی جب کہ انسان نے اس واقفیت کو عملی طور پر پوری طرح استعمال کیا ہو ۔ وہ اکثر اس معاملہ میں ناکام ثابت ہوتا ہے ۔ انسان، انسان ہونے کے باوجود جنگل کے وحشی جانوروں سے پیچھے ہے ۔

انسان کیوں متحد نہیں رہ پاتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد ہر شخص سے ایک قربانی مانگتا ہے ۔ یہ قربانی کہ فرد اپنی انفرادیت کو اجتماع کے حوالے کردے ۔ آدمی اپنی ذات کو اہمیت دینے کے بجائے پورے مجموعہ کو اہمیت دینے لگے ۔ یہ انا کی قربانی ہے اور انا کی قربانی کسی آدمی کے لئے سب سے مشکل قربانی ہے ۔ آدمی جان کو قربان کرسکتا ہے مگر وہ اپنی انا کو دوسرے کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ۔ انسان کی یہی کمزوری ہے جو ہمیشہ اتحاد و اجتماعیت کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے ۔ جانور اس معنی میں اپنی کوئی انا نہیں رکھتے ۔ کوئی چیز ان کے لئے عزت کا سوال نہیں بنتی، یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں ۔ اتحاد کا راز بے انا ہونا ہے ۔ جہاں اتحاد نہ ہو سمجھ لیجئے کہ وہاں بے انا انسانوں کا وجود نہیں ۔

رسی کا سبق

ایک شخص کے دس لڑکے تھے۔ سب لڑکے تندرست اور ہوشیار تھے اور مل جل کر رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے ہر جگہ ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا ہر کام آسانی سے ہو جاتا تھا۔ کوئی شخص ان کے خلاف کارروائی کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اس خاندان کا اتحاد اور اس کی طاقت لوگوں کے درمیان ضرب المثل بن گئی تھی۔

لڑکوں کا باپ بوڑھا ہو کر مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کو سب سے زیادہ اندیشہ یہ ہوا کہ اس کے بعد اس کے لڑکے باہمی اختلاف کا شکار ہو کر الگ الگ نہ ہو جائیں اور اس طرح اپنے آپ کو کمزور کر لیں۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے ایک روز تمام لڑکوں کو بلایا اور کہا کہ دیکھو اب میں بہت جلد مر جاؤں گا۔ میں تم لوگوں کو ایک سبق دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم میرے اس سبق کو یاد رکھو گے تو زندگی میں کبھی ناکام نہ ہو گے۔ اس کے بعد اس نے ایک موٹی رسی نکالی اور کہا کہ اس کو توڑ دو۔

ہر ایک نے باری باری کوشش کی۔ مگر پورا زور لگانے کے بعد بھی کوئی اسے توڑ نہ سکا۔ اس کے بعد سب نے مل کر اس کو توڑنے کی کوشش کی۔ مگر اب بھی وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اب بوڑھے باپ نے یہ کیا کہ رسی کو کھولا تو اس کی دس لڑیاں الگ الگ ہو گئیں۔ اس نے ایک ایک لڑی ہر لڑکے کو دے کر کہا کہ اسے توڑ دو۔ اب معاملہ آسان تھا۔ ہر لڑکے نے معمولی کوشش سے اپنی اپنی رسی توڑ ڈالی۔ یکجا لڑیوں کو کوئی توڑ نہ سکا۔ مگر منتشر لڑیوں کو ہر ایک نے توڑ کر دو ٹکڑے کر دیا۔

اس تجربہ کے بعد باپ اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوا۔ اس نے کہا: دیکھو، جب تک رسی کی دس لڑیاں ایک ساتھ ملی ہوئی تھیں، تم لوگ اسے توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مگر وہی رسی جب الگ الگ لڑیوں میں بٹ گئی تو تم میں سے ہر شخص نے بآسانی اسے توڑ ڈالا۔ اسی مثال سے تم اپنا معاملہ سمجھ سکتے ہو۔

تم لوگ دس بھائی ہو۔ گویا یہ رسی کی دس لڑیاں ہیں جو اب تک ایک ساتھ ملی رہی ہیں۔ اس لئے تم لوگ ہر جگہ طاقت ور ثابت ہوتے رہے۔ کوئی تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ اگر تم لوگ اسی طرح ایک ساتھ ملے رہو گے تو ہرگز کوئی تم کو توڑ نہ سکے گا۔ اور اگر تم الگ الگ ہو گئے تو تمہارے دشمن تم کو اسی طرح ایک ایک کر کے توڑ ڈالیں گے جس طرح تم نے رسی کی لڑیوں کو الگ الگ ہونے کے بعد توڑ دیا۔

ایک خاندان کا معاملہ ہو یا ایک قوم کا، سب کے لئے طاقت کا سب سے بڑا راز اتحاد ہے۔ وہی تعداد جو اختلاف کے وقت دوسروں کے مقابلہ میں بے زور دکھائی دیتی ہے وہی تعداد اگر متحد ہو جائے تو وہ اتنی طاقت ور ہو جائے گی کہ اس کا حریف اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہی نہ کرے۔

یہ اختلاف کیوں

احثہ کی میز کے چاروں طرف کمرہ میں ایک درجن آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر کوئی موضوع چھیڑا جائے تو ے میں لوگوں کی رائیں مختلف ہو جائیں گی۔ ہر آدمی کوئی نیا پہلو نکالے گا اور الگ رائیں دے گا۔ ایک سیدھی ح و تعبیر کے فرق سے ایک درجن شکلیں اختیار کرے گی۔ لوگوں کو ایک متفقہ رائے پر لانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوگی۔ یں حکومت وقت کا وزیر مالیات داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں مختلف رنگ کی بہت سی گولیاں ہیں۔ ان میں ، سفید ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ اس سفید گولی پر ایک ملین ڈالر کا انعام ہے۔ میں اس کو اچھال کر گراؤں گا۔ بد گولی پائے گا اس کو ایک ملین ڈالر نقد انعام دیا جائے گا۔ اس کے بعد جب وہ گولیوں کو میز پر بکھیرے گا تو تمام جہ "سفید گولی" پر لگ جائے گی۔ دیکھنے میں اگرچہ وہاں بہت سی گولیاں ہوں گی مگر حاضرین میں سے کوئی نہ ہوگا ، کے سوا کسی اور گولی کی طرف متوجہ ہو۔ اب فرض کیجئے کہ اسی کمرہ میں دوسرا شخص داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنا بکس میز پر رکھ کر اس کو کھولتا ہے اور اس کے اندر سے ایک کالا سانپ نکل کر میز پر چلنے لگتا ہے۔ اس ، کے حاضرین کا جو حال ہوگا اس کا تصور ہر شخص کر سکتا ہے۔ دوبارہ ہر آدمی کی توجہ "سانپ" کے اوپر جم جائے گی۔ ف ایک چیز سوچے گا: بھاگ کر اپنے کو سانپ کی زد سے بچائے ——— شدتِ طلب یا شدتِ خوف رایوں کے ردیتا ہے۔ ایسے وقت میں ہر آدمی اسی ایک چیز کا طالب بن جاتا ہے جو سب سے زیادہ قابلِ طلب ہے اور ہر آدمی اسی ے ڈرنے لگتا ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے کے قابل ہے۔ ہر آدمی کی توجہ اسی ایک چیز پر لگ جاتی ہے جس پر دوسرے جہ لگی ہوئی ہے۔

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دین کے معاملہ میں آج اتنا زیادہ اختلاف کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین آج ئے بس ایک لکھنے اور بولنے کی چیز ہے، وہ ان کے لئے خوف اور محبت کی بنیاد نہیں بنا ہے۔ اگر وہ حقیقی معنوں میں خوف بنیاد بن جائے تو اچانک سارا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ لوگ جنت اور جہنم کا نام لیتے ہیں مگر جنت لوگوں کی ضرورت ور جہنم لوگوں کا مسئلہ نہیں بنی۔ یہی اختلاف کا سب سے بڑا سبب ہے۔ گویا میز کی سطح پر ایک دینی مباحثہ جاری ہے ی اس کے گرد بیٹھا ہوا اپنی قابلیت کے جوہر دکھا رہا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہو کہ جنت لوگوں کی طلب شدید بن ر جہنم سے لوگوں پر خوفِ شدید طاری ہو جائے تو دفعتہً سب کی رائیں سمٹ کر ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں گی۔ سب انعام" کے طالب بن جائیں گے اور سب ایک ہی "خطرہ" کو سب سے بڑا مسئلہ سمجھنے لگیں گے۔ یہ شدتِ طلب اور یہ ف رایوں کے تعدد کو ختم کر دے گا۔ لوگ سارے اختلافات کو بھول کر اپنی توجہ ایک ہی چیز پر مرتکز کر دیں گے۔ سلمان مل کر اتحاد کی چٹان بن جائیں گے۔ وہ دین جو "۷۲ دینوں" میں تقسیم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے وہ صرف ایک صورت میں دکھائی دینے لگے گا۔ تمام نیکیوں کی بنیاد یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ (Sincere) ہو۔ اور شدتِ طلب اور ف کے سوا کوئی چیز نہیں جو آدمی کو حقیقی معنوں میں سنجیدہ بنا سکے۔

برداشت نہ کرنا

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے زیادہ عام واحد خصوصیت ہے ـــــ اختلاف کو برداشت نہ کرنا۔ جہاں بھی دیکھئے، مسلمان بس آپس میں لڑتے بھڑتے نظر آئیں گے۔ موجودہ حالت میں چونکہ غیروں پر ان کا قابو نہیں چلتا اس لئے ان کا غصہ اکثر اپنوں پر اترتا ہے، وہ دوسروں کے لئے نرم اور اپنے بھائیوں کے لئے سخت بن گئے ہیں۔

مسلمانوں کی اس مزاجی کیفیت کی تصویر آج ساری دنیا میں نظر آرہی ہے۔ جن لوگوں کے پاس قانون کی طاقت ہے وہ قانون کے زور پر اپنے مخالف بھائیوں کو گولی مار رہے ہیں اور ان کے اوپر کوڑے برسا رہے ہیں۔ جن کے پاس قانون کی طاقت نہیں ان کے دو طبقے ہیں۔ ایک جاہل عوام کا، دوسرے خواص کا۔ مسلمانوں کے جاہل عوام کو جب اپنے کسی بھائی سے اختلاف ہو جائے تو وہ چھرے یا لاٹھی ڈنڈے سے اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ خواص اس قسم کا "غیر شریفانہ" طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ مگر اپنے مخالف کے اوپر کارروائی کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ وہ اس کے بجائے اپنے بھائی کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اس کو اجاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی اقتصادیات کو برباد کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زبان و قلم سے اس کو اتنا بدنام کریں کہ اس کا نام ذلت و رسوائی کا نشان بن کر رہ جائے۔

کسی مسلمان کے لئے یہ ناقابل معافی جرم ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اپنی طاقت کا مزا چکھائے۔ اس کا قلم اور اس کی زبان اپنے مسلمان بھائی کو بے عزت کرنے میں صرف ہونے لگے۔ اس کا پیسہ اپنے بھائی کو مٹانے اور برباد کرنے کے منصوبوں میں خرچ ہو۔ اس کی طاقت کا یہ مصرف بن جائے کہ اس سے وہ اپنے بھائی کا سر توڑے اور اپنے بھائی کی زندگی کو ویران کرے۔ جو شخص اس قسم کے جرم میں مبتلا ہو بلاشبہ وہ اللہ کے یہاں لعنتی ہے۔ اس کے بعد اس کا کوئی بھی عمل اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ وہ توبہ کرے اور اپنے ان جرائم سے باز آجائے۔

دو آدمیوں میں اختلاف پیدا ہونا بجائے خود برا نہیں، بلکہ ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ جو چیز بری ہے وہ یہ کہ اختلاف کے بعد دلوں میں نفرت اور عداوت جاگ اٹھے جس سے اختلاف پیدا ہو اس کے بارے میں آدمی انصاف کے تقاضوں کو بھول جائے۔ وہ اس کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے لگے۔ وہ اپنے بھائی کی جان اور مال اور آبرو کو اپنے لئے حلال کر لے، حالاں کہ اللہ نے ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان اور مال اور آبرو کو حرام کیا ہے۔

سچائی عوامی شور میں دب جاتی ہے

ٹورانٹو (کناڈا) میں ایک مکان میں آگ لگ گئی۔ ایک شخص تیسری منزل پر تھا۔ آگ بجھانے والے (فائر مین) آئے۔ انھوں نے چیختے ہوئے آدمی کو آواز دی کہ تم کھڑکی کے پیچھے پڑ آجاؤ۔ ہم تم کو خصوصی سیڑھی سے اتارنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ مگر فائر مین صرف چند تھے۔ دوسری طرف عمارت کے نیچے کافی مجمع اکٹھا ہو گیا۔ مجمع چلانے لگا "کود دو کود دو"۔ مجمع کے شور میں فائر مین کی آواز آدمی تک نہ پہنچ سکی۔ اس نے اپنے کمرہ سے چھلانگ لگا دی۔ وہ نیچے گرا تو شدید طور پر زخمی ہو چکا تھا۔ اس کو نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ فائر مین نے کہا: آدمی اگر ۳۰ سکنڈ اور ٹھہرا ہوتا تو ہماری سیڑھی اس تک پہنچ جاتی اور وہ بحفاظت نیچے اتر آتا۔ آدمی کی عمر ایک ون سال تھی اور اس کا نام فرینک کرٹس (Frank Curtis) تھا (ٹائمس آف انڈیا ۵ جنوری ۱۹۸۰)

لوگ بولنا جانتے ہیں۔ مگر زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ لوگ چپ رہنا جانیں۔ وہی گروہ ترقی کرتا ہے جس کے افراد یہ جانتے ہوں کہ ان کو کہاں چپ رہنا چاہئے۔ جب لوگ چپ رہتے ہیں تو در اصل وہ اہل تر کو بولنے کا موقع دیتے ہیں۔ اور جب ہر شخص بولنے لگے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ جو شخص حقیقی معنوں میں بولنے کا اہل ہے وہ بولنے کو بے فائدہ سمجھ کر چپ ہو جائے گا یا اگر بولے گا تو عوامی شور وغل میں اس کی آواز دب کر رہ جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ حال تھا کہ جب آپ صحابہ کو اکٹھا کرتے اور ان کے سامنے مشورہ کے لئے کوئی بات رکھتے تو لوگ غور سے بات کو سن کر چپ ہو جاتے۔ کیوں کہ ہر آدمی اپنا بے لاگ محاسبہ کرنے کی وجہ سے اس بات کو جانتا تھا کہ اس کے درمیان بولنے کا سب سے زیادہ اہل، رسول خدا کے بعد، جو شخص ہے وہ ابوبکرؓ ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مکمل ہو جانے کے بعد سب سے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ بولتے۔ پھر دوسرے لوگ مختصراً اپنی رائے دیتے اور اس کے بعد ہر آدمی طے شدہ عمل کے لئے تیار ہو جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا تو اب یہ ہوا کہ خلیفہ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو مشورہ کے لئے جمع کرتے۔ آپ اپنی بات کہہ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ لوگو اپنی رائے بتاؤ۔ مگر دوبارہ سب لوگ چپ رہتے۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ ان کے ڈر نے ان کو بتا دیا تھا کہ ان کے درمیان بولنے کے سب سے زیادہ اہل عمر بن خطابؓ ہیں۔ چنانچہ خاموشی کے ایک وقفہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے اور اپنی بات کہتے۔ آپ کی بات مکمل ہو جاتی تو دوسرے لوگ مختصراً اپنی رائیں ظاہر کرتے اور پھر اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔

بعد کے زمانہ میں یہ صورت حال دھیرے دھیرے بدل گئی۔ اب ہر شخص اپنے آپ کو سب سے زیادہ بولنے اور رائے دینے کا اہل سمجھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملت اسلامی میں ایسا خلفشار برپا ہوا جو کبھی ختم نہ ہو سکا۔ موجودہ زمانہ میں بھی یہ صورت حال مزید شدت کے ساتھ قائم ہے۔ آج ہر آدمی لکھنے اور بولنے کے لئے بے تاب نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسائل پر رائے دینے کا سب سے زیادہ اہل وہی ہے۔ لوگوں کو اپنا وجود حقیقت سے زیادہ دکھائی دیتا ہے اور دوسرے کا وجود حقیقت سے کم نظر آتا ہے۔ کوئی اپنی نااہلی کو نہیں جانتا۔ البتہ اپنی اہلیت کو جاننے کا ماہر ہر شخص بنا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ملت کے اختلاف اور کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

قومی ترقی کا راز

قدرت کا یہ قانون ہے کہ مقناطیسی میدان اور حرکت کو یکجا کیا جائے تو وہاں جتنے تار ہوں گے سب میں الکٹران دوڑنے لگیں گے۔ جنرٹیر اسی قانون قدرت کو استعمال کر کے بجلی پیدا کرتا ہے۔ اب اگر ایسا ہو کہ جنرٹیر چالو کرنے کے بعد کسی تار میں الکٹران دوڑیں اور کسی تار میں نہ دوڑیں تو سارا تمدنی نظام درہم برہم ہو جائے۔ کیونکہ پھر بجلی پیدا کرنے کا عمل رک جائے گا۔ اور جب بجلی پیدا نہ ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری تمدنی مشینیں ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔

ایک چرواہا سیکڑوں بھیڑ بکریوں کو لے کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں چراتا ہے۔ بکریاں چرتے چرتے اونچی نیچی کھائیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ مگر جب لوٹنے کا وقت آتا ہے تو چرواہا ایک جگہ کھڑا ہو کر آواز دیتا ہے اور اور اس کی ایک آواز پر تمام بھیڑ بکریاں اپنی اپنی جگہ سے نکل کر آواز کی طرف چل پڑتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں گلہ تیار ہو جاتا ہے اور چرواہا ان کو لے کر اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ چرواہے کی آواز کے باوجود بھیڑ بکریاں اپنی اپنی جگہ پر بہری بن کر پڑی رہیں تو چرواہی اور گلہ بانی کا کام کرنا غیر ممکن ہو جائے۔

یہی اصول قوموں کے معاملہ میں بھی ہے۔ کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ کوئی فکر اس کے افراد میں اس طرح اتر جائے کہ وہ پوری قوم کو متحرک کر سکے۔ گستاولی بان نے عربوں کا تاریخی مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

انسانی ترقی کا سب سے بڑا سبب کسی ایک تخیل کی پرستش ہے۔ یہ تخیل خواہ کوئی بھی ہو، اس قدر کافی ہے کہ وہ اتنا قوی ہو کہ قوم میں متحدہ احساس اور متحدہ امید پیدا کر دے۔ اور قوم کے ہر فرد کا اعتقاد اس کی نسبت اتنا زور آور ہو کہ وہ اس کے لئے اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جائے۔ رومیوں کا تخیل شہر روم کی ترقی تھی۔ عیسائیوں کا کا تخیل عقبیٰ کا آرام حاصل کرنا تھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی انسان نے نئے نئے معبود بنا لئے ہیں جو یقیناً فرضی ہیں مگر ان کے لئے وہ اتنے ہی مؤثر ہیں جتنا قدیم قوموں کے لئے ان کے معبود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ محض ان حوادث کی ایک سرگزشت ہے جن کو انسان نے کسی تخیل کی تلاش میں طے کیا ہے۔ اگر یہ تخیل نہ ہوتا تو انسان ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہوتا اور کسی قسم کا تمدن قائم نہ کر سکتا۔ قوم کا تنزل اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جس دن اس کے پاس کوئی ایسا تخیل نہ رہے جس کی حفاظت کے لئے ہر ایک فرد قوم اپنی جان دینے پر آمادہ ہو۔

عربوں نے ملک کے ملک فتح کئے۔ انھوں نے پہلے حکومت یونان و روم کے جانشینوں سے شکست کھائی۔ مگر وہ بالکل ہمت نہ ہارے۔ انھوں نے انھیں حریف قوموں سے فنون جنگ کو سیکھا۔ جب وہ فن جنگ میں ان کے برابر ہو گئے تو پھر وہ برابر کامیاب ہوتے رہے۔ ہر عرب سپاہی اس تخیل پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار تھا جس کے سایہ میں وہ لڑ رہا تھا۔ اس کے برعکس یونانیوں اور رومیوں کی فوج میں سارا جوش، سارا ولولہ اور سارے اعتقادات مدت دراز سے مر چکے تھے (تمدن عرب ۳۰ ـ ۶۲۹)

اتحاد کی آسان تدبیر

گاؤں کا ایک خاندان ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ چار بھائی اور ان کے بیوی بچوں کو ملا کر ڈیڑھ درجن افراد خاندان میں ہیں۔ مگر سب مل کر رہتے ہیں۔ آپس میں جھگڑا نہیں ہوتا۔ ان کا اتحاد و اتفاق ساری بستی میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ میری ملاقات ان کے بڑے بھائی سے ہوئی تو میں نے پوچھا: "آپ کے یہاں جھگڑا نہیں ہوتا، یہ بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس کا راز کیا ہے" انھوں نے جواب دیا "ایسا نہیں ہے کہ جھگڑا نہیں ہوتا۔ اتنے سب آدمی جس گھر میں ہوں وہاں کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ ہونا ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگ اس کو بڑھنے نہیں دیتے" اس کے بعد وہ اٹھے اور ایک طرف دس قدم چل کر گئے اور کہا "جب جھگڑا ہوتا ہے تو ہم اس طرح اس سے ہٹ کر دور چلے جاتے ہیں" یہ ایک معمولی پڑھا لکھا خاندان ہے۔ مگر انھوں نے زندگی کا ایک راز پا لیا ہے۔ وہ یہ کہ جھگڑا ایک وقتی چیز ہے۔ اگر اس کو کسی طرح ٹال دیا جائے تو وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس اصول پر وہ لوگ شدت سے کاربند ہیں اور اس کے زبردست فوائد ان کو حاصل ہوئے ہیں۔ باپ کے انتقال کے وقت ان کی معاشی حالت بہت خراب تھی۔ مگر اپنے اتحاد و اتفاق کے ذریعہ انھوں نے گاؤں میں مثالی ترقی حاصل کر لی۔ اب انھوں نے اپنے معاملات کے چار شعبے کر دئے ہیں اور چاروں بھائی ایک ایک شعبہ پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک بھائی کھیتی کا ذمہ دار ہے، دوسرا بھائی دکان کا ذمہ دار ہے۔ تیسرا بھائی گھر کے امور کا ذمہ دار ہے، چوتھا بھائی باہر کے امور کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کاموں کی تقسیم نے ان کے لئے باہمی اختلاف کے مواقع اور بھی کم کر دئے ہیں۔

اسی طرح میری ملاقات ایک بار دو ایسے آدمیوں سے ہوئی جو دو الگ الگ پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے باوجود دونوں بہت قریبی دوست تھے۔ روزانہ باہم ملتے اور ایک دوسرے کے کام میں شریک رہتے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سیاسی اختلاف کے باوجود اس قدر اتحاد کیسے ہے۔ ان میں سے ایک شخص نے مسکرا کر جواب دیا: "ہم نے اپنے اختلاف کو بازو میں رکھ دیا ہے" ان کی زبان سے یہ جملہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ ایک بہت بڑے مسئلہ کا کتنا سادہ حل انھوں نے دریافت کر لیا تھا ہمارے بستر میں ایک کانٹا ہو تو ہم اس کو بستر سے نکال کر "بازو" میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی طریقہ اختلاف کے بارے میں کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ دو آدمیوں میں کوئی اختلاف ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے درمیان سارے معاملات میں اختلاف ہو گیا۔ اختلاف کے باوجود بہت سے دوسرے امور ہوتے ہیں جن میں دونوں کے درمیان پورا اتفاق ہوتا ہے۔ اس لئے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ دو آدمیوں میں جب اختلاف پیدا ہو تو اختلاف کے پہلو کو "بازو" میں رکھ کر اتحاد کے پہلوؤں پر اپنا جوڑ باقی رکھا جائے۔ اسی طرح ایک بار میں ایسے دو آدمیوں سے ملا جو بالکل متضاد سیاسی خیالات رکھتے تھے۔ ایک کا تعلق ایک فرقہ وارانہ جماعت سے تھا اور دوسرے کا تعلق ایک قومی جماعت سے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے اور بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود آپ لوگ اپنے ان تعلقات کو کس طرح نبھاتے ہیں۔ یہ سن کر ان میں سے ایک شخص نے جواب دیا: ہم نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے ——
یہ واقعہ بتاتا ہے کہ زندہ انسان اختلاف کے اندر بھی اتحاد کے اسباب ڈھونڈ لیتے ہیں۔

اختلاف کے باوجود

"مجھے اپنی زندگی کے دو واقعات یاد آتے ہیں"، مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی (ہریانہ) نے کہا۔ ۵۲-۱۹۵۲ میں جب کہ میں مدرسہ سبحانیہ دہلی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میرے ساتھ یوپی کے ایک طالب علم عبدالقیوم صاحب رہتے تھے۔ وہ اپنے روپے میرے پاس امانتاً رکھتے تھے جن کو میں ان کی اجازت سے خود اپنی ضرورت کے لئے بھی استعمال کرتا تھا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ کسی بات پر ان سے میری لڑائی ہوگئی۔ عبدالقیوم صاحب کے دوستوں نے ان کو اکسایا کہ "عبدالرحیم نے تمھارے ساتھ زیادتی کی ہے تم ان سے اپنا سب روپیہ مانگ لو"۔ لوگوں نے بہت کہا مگر وہ اس کے لئے راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا: ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ لڑائی الگ چیز ہے اور روپیہ الگ چیز۔ میں لڑائی کی وجہ سے ان سے اپنے روپیہ کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

دوسرا واقعہ میوات کا ہے۔ ۱۹۵۹ میں میں گلپاڑہ (ضلع بھرت پور) کے مدرسہ میں تدریسی خدمت انجام دے رہا تھا۔ وہاں کے ایک میو حاجی دراب خاں سے میری اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اسی دوران میں ایک بار مدرسہ کے لئے چندہ کی مہم چلی۔ کچھ لوگ گھوم کر گاؤں کے ایک ایک گھر تک پہنچے اور مدرسہ کی امداد کے لئے کہا۔ کسی نے ۲۰ سیر اناج لکھوایا، کسی نے ۳۰ سیر۔ سب سے زیادہ جس نے لکھوایا وہ ایک من غلہ تھا۔ میں بھی وفد میں شامل تھا۔ لوگ حاجی دراب خاں کے گھر کی طرف چلے تو مجھے ایسا لگا کہ یہ لوگ بے کار ان کے یہاں جا رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے مدرسہ کے ساتھ کب تعاون کریں گے جس میں ان کا ایک مبغوض شخص کام کرتا ہو۔ ہم لوگ ان کے گھر پہنچے اور مدرسہ کے لئے کہا۔ انھوں نے پوچھا کہ لوگوں نے کتنا کتنا لکھوایا ہے۔ ہر ایک کی مقدار بتائی گئی جس میں سب سے زیادہ اس کا غلہ تھا جس نے ایک من لکھوایا تھا۔ انھوں نے کہا "میری طرف سے سوا من لکھ لو"۔ اس کے بعد بولے: اگرچہ میری اس مولوی سے لڑائی ہے۔ مگر مدرسہ سے میری کوئی لڑائی نہیں۔ مولوی سے لڑائی کے باوجود میں مدرسہ کی مدد کروں گا۔

زندہ آدمی اختلاف کو اسی دائرہ میں رکھتا ہے جس دائرہ میں اختلاف پیدا ہوا ہے، اس سے باہر اس کو نہیں لے جاتا۔ کسی سے ذاتی اختلاف ہو تو اس کی بنا پر اس کے ادارہ کی جڑ کھودنے کے درپے نہیں ہوتا۔ کسی سے ایک مسئلہ میں اختلاف ہو تو اس کو سارے مسائل میں اپنا مخالف نہیں سمجھ لیتا۔ کسی سے نظریاتی اختلاف ہو تو اس کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا کہ اس کو بے عزت کرے یا اس کی معاشیات کو برباد کرنے لگے۔ زندہ آدمی حد کے اندر رہنے والا ہوتا ہے نہ کہ حد سے گزر جانے والا۔

غصہ چھوڑ دیا

عرفان احمد صاحب بے حد غصہ ور آدمی تھے۔ وہ جب گھر کے اندر داخل ہوتے تو تمام لوگ سہم جاتے۔ ان کی ماں، ان کی بہنیں، ان کے چھوٹے بھائی سب اس خوف میں رہتے کہ کب کس کے اوپر برس پڑیں گے۔ کھانے پینے میں کوئی چیز خلاف مزاج ہوتی تو اس قدر بگڑ اٹھتے کہ برتن اٹھا کر پھینک دیتے۔ ان کے روز روز کے غصہ کی وجہ سے گھر کی فضا اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گھر کے اندر کسی کو چین حاصل نہ تھا۔

ایک روز وہ اپنے کمرہ میں بیوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آج وہ کسی بات پر کافی خوش تھے۔ ان کو خوشی کی کیفیت میں دیکھ کر بیوی نے کہا: آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی آپ سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ عرفان احمد صاحب نے کہا، ہاں بیگم تم صحیح کہتی ہو، تم نے کبھی خود سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ بیوی نے دوبارہ کہا: آج میں پہلی بار آپ سے ایک چیز مانگنا چاہتی ہوں، کیا آپ مجھے وہ چیز دے دیں گے۔ عرفان احمد صاحب پر بیوی کی اس بات کا بہت اثر پڑا۔ انھوں نے کہا، آج تم جو بھی مانگو میں دوں گا، حتیٰ کہ اگر تم جان مانگو تو وہ بھی نکال کر پیش کر دوں گا۔ بیوی نے کہا، نہیں آپ نہیں دیں گے۔ عرفان احمد صاحب نے جذباتی انداز میں کہا: تم مانگو تو، دیکھو میں ابھی دیتا ہوں یا نہیں۔ اس کے بعد بیوی نے کہا:

میں آپ سے کچھ اور نہیں مانگتی۔ بس یہ مانگتی ہوں کہ آپ غصہ کرنا چھوڑ دیں۔

عرفان احمد صاحب کو اس جملہ نے اس قدر متاثر کیا کہ وہ بالکل ڈھ گئے۔ انھوں نے اسی وقت اپنے دونوں کان پکڑے اور کہا کہ جاؤ، میں نے آج سے غصہ چھوڑ دیا۔

اس واقعہ کو دس سال گزر چکے ہیں اور اب عرفان احمد صاحب بالکل دوسرے انسان ہیں۔ وہ گھر میں ہر ایک سے محبت کے ساتھ بولتے ہیں۔ معاملات میں مشورہ کرتے ہیں۔ جو کھانا بھی سامنے آئے اس کو خوشی سے کھا لیتے ہیں۔ وہ خلاف مزاج باتوں کو نظرانداز کرتے ہیں نہ یہ کہ ایک ایک بات پر برہم ہو جائیں۔

یہ تبدیلی خود عرفان احمد صاحب کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اب ان کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کام کرنے لگے ہیں۔ گھر کے باہر صاحب معاملہ افراد سے ان کا سلوک بہت اچھا ہو گیا ہے۔ ان کا کاروبار بھی اب بہت بڑھ گیا ہے۔ وہ رات کو سکون کے ساتھ سوتے ہیں، جب کہ اس سے پہلے ان کا حال یہ تھا کہ رات بھر بے تابی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہتے تھے۔

اور کہہ لیجئے

ایک مولوی صاحب ایک مسلمان وکیل سے ملنے گئے۔ بات چیت کے دوران وکیل کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جو مولوی صاحب کے روایتی دینی ذوق کے خلاف تھا۔ وہ وکیل کے اوپر بگڑ گئے۔ اس کو بدتمیز، دہریہ وغیرہ سب کچھ کہہ ڈالا۔ وکیل بالکل خاموشی کے ساتھ مولوی صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ جب وہ چپ ہوئے تو وکیل نے مسکرا کر کہا:

اور کہہ لیجئے جو کچھ کہنا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وکیل کی زبان سے یہ جملہ سن کر مولوی صاحب اچانک بالکل نرم پڑ گئے۔ ان کا سارا جوش جاتا رہا۔ وکیل کے ایک ٹھنڈے جملہ نے مولوی صاحب کی غصہ کی آگ کو بالکل بجھا دیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ بالکل دوسری فضا میں ہوئی۔ ایک ملاقات جس کا آغاز ناخوشگوار کلمات کے ساتھ ہوا تھا وہ بالآخر نہایت خوشگوار فضا میں ختم ہوئی۔

معاشرتی زندگی میں اکثر جھگڑے کسی معمولی بات پر شروع ہوتے ہیں۔ کسی کی ایک بات سے ہمارے نفس کو دھکا لگتا ہے، ہمارے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ہم اس آدمی سے لڑ پڑتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ معاف کر دینا سب سے بڑا انتقام ہے۔ کسی کی بیہودہ حرکت پر اگر آدمی چپ رہ جائے تو اس کو ایک ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے جو تمام خوشیوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے حریف کو ایک ایسی کسک میں مبتلا کر دیتا ہے جو زندگی بھر اس کا پیچھا کئے رہتی ہے، وہ اس کے اوپر ایسا مسلط ہوتی ہے کہ کبھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔

اکثر لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ کوئی شخص زیادتی کرے تو "اینٹ کا جواب پتھر سے" دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور آئندہ وہ اور بھی زیادہ بری حرکتیں کرے گا۔ مگر یہ بات سراسر بے بنیاد ہے۔ جوابی کارروائی نہ کرنے سے اگر یہ اندیشہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بڑھے گا تو جوابی کارروائی کرنے میں اس سے بھی زیادہ بڑا اندیشہ یہ ہے کہ اس کے اندر انتقامی آگ بھڑک اٹھے اور وہ انتقامی جذبہ میں اندھا ہو کر پہلے سے بھی زیادہ بڑی بیہودگی پر اتر آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاف کرنا یا نظر انداز کر دینا خود ایک کارروائی ہے۔ معاف کرنے والا آدمی خود بدلہ نہ لے کر خدا کو اپنی جگہ کھڑا کر دیتا ہے، وہ فطرت کو بروئے کار آنے کا موقع دیتا ہے۔ اور یقیناً یہ صورت خود بدلہ لینے سے کہیں زیادہ مؤثر ہے۔

میں چھوٹا کیوں بنوں

ایک گھر میں میاں بیوی کا جھگڑا تھا۔ خاندان کے ایک بزرگ ان کے یہاں گئے تاکہ دونوں میں میل ملاپ کرا دیں۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے پایا کہ جھگڑے کی اصل جڑ یہ ہے کہ "گھر کا بڑا کون ہو"۔ شوہر چاہتا ہے کہ میری بات مانی جائے اور بیوی چاہتی ہے کہ میری بات چلے۔ بس یہی مزاج سارے جھگڑے کا سبب ہے۔

انھوں نے بیوی سے باتیں کیں تو اس نے جھلا کر کہا "وہ ہر بات میں اپنی چلاتے ہیں، میری کچھ سنتے ہی نہیں" بزرگ نے کہا کہ جب اتنی سی بات ہے تو تم اپنے شوہر کو بڑا مان لو سارا جھگڑا خود بخود ختم ہو جائے گا" بیوی نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، پھر تو میں مستقل طور پر احساس کمتری کا شکار ہو جاؤں گی"۔ بزرگ نے کہا کہ تم دونوں کے روزانہ کے جھگڑوں کی وجہ سے بچے تباہ ہو رہے ہیں۔ گھر کا سارا معاملہ بگڑا ہوا ہے۔ پھر اگر ان کو بڑا مان لینے سے تمھارے خاندان کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔" بیوی نے کہا: یہی بات آپ ان سے کہئے۔ وہی کیوں نہ مجھ کو بڑا مان لیں"۔

بزرگ نے جب یہ جواب سنا تو وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا: مشترکہ زندگی کا راز چھوٹا بننے میں ہے۔ دس آدمیوں کے درمیان جب نو آدمی اپنے کو چھوٹا بنا لیں تبھی یہ ممکن ہوتا ہے کہ دسواں آدمی بڑا بن کر ان کے اندر نظم اور اتحاد قائم کرے۔ جہاں ہر آدمی بڑا بننا چاہتا ہو وہاں نظم اور اتحاد پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ اور جہاں نظم اور اتحاد نہ ہو وہاں جو چیز جنم لیتی ہے وہ صرف بربادی ہے۔ نو آدمیوں کی قربانی سے دس کے دس آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور جہاں کوئی قربانی دینے کے لئے تیار نہ ہو وہاں سارے کے سارے دس آدمی برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

چھوٹا بننے پر راضی نہ ہونے کا ذہن ہی تمام برائیوں کا اصل سبب ہے۔ آدمی چھوٹا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حالاں کہ موت ہر روز یہی سبق دے رہی ہے۔ موت بہت تیزی سے ہر آدمی کو یہ بتانے کے لئے چلی آرہی ہے کہ تم چھوٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔

اپنے اندر کے ایک شخص کو بڑا مان کر اس کے مقابلہ میں چھوٹا بننے پر راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا گروہ منظم اور طاقت ور ہو جاتا ہے۔ آدمی انفرادی بڑائی کھو کر زیادہ بڑے پیمانہ پر اجتماعی بڑائی حاصل کر لیتا ہے۔ مگر کوئی شخص اس راز کو نہیں جانتا۔ وہ چھوٹی بڑائی کے احساس میں گم رہتا ہے یہاں تک کہ موت اس کو ہمیشہ کے لئے چھوٹا بنا کر قبر کی تاریکی میں دھکیل دے۔

آدمی نہ کہ گروہ

حافظ حامد حسن علوی (۱۹۵۹-۱۸۷۲) اعظم گڑھ کے ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کو جماعت اسلامی سے سخت اختلاف تھا۔ حافظ صاحب قبلہ کی بستی میں ایک دینی مدرسہ تھا۔ ایک صاحب اس مقامی مدرسہ میں استاد تھے۔ وہ جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ تاہم اسی کے ساتھ وہ تصوف سے دلچسپی رکھتے تھے اور کبھی کبھی حافظ صاحب کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔

مذکورہ استاد نے ایک روز حافظ صاحب قبلہ سے کہا کہ میں تصوف کے طریقے کا عملی تجربہ کرنا چاہتا ہوں، آپ مجھے اپنی بیعت میں لے لیں اور مجھے اس سلسلہ میں استفادہ کا موقع دیں۔ حافظ صاحب مرحوم اس وقت کافی ضعیف ہو چکے تھے اور بیعت و ارشاد کا کام اپنے خلفاء کے حوالے کر دیا تھا۔ جب ان کے سامنے مذکورہ استاد کی درخواست آئی تو انھوں نے اپنے ایک خلیفہ (مولانا سعید احمد صاحب) کو بلایا اور ہدایت کی کہ ان کو اپنے حلقہ میں لے لو اور ان کو تصوف کی تعلیم دو۔

مولانا سعید احمد صاحب کو مذکورہ استاد کے جماعتی تعلق کا حال معلوم تھا۔ چنانچہ ان کو تکلف ہوا۔ انھوں نے کہا "حضرت، یہ تو جماعت اسلامی کے رکن ہیں"۔ حافظ صاحب قبلہ نہایت ذہین اور بیدار مغز آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا:

اجی، آدمی دیکھا جاتا ہے کہ جماعت

انھوں نے مولانا سعید احمد صاحب سے کہا کہ تم ان کو اپنے حلقہ میں شامل کر لو اور ان کو تصوف کی تعلیم دو۔ دیکھنے کی چیز شخص ہوتا ہے، جماعت یا گروہ نہیں۔ چنانچہ جماعتی اختلاف کے باوجود مذکورہ استاد کو حلقہ تصوف میں شامل کر لیا گیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی کا ایک الگ سانچہ ہوتا ہے۔ یہ سانچہ ہر حال میں باقی رہتا ہے، خواہ وہ کسی بھی جماعت یا کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ دانش مندی یہ ہے کہ کسی فرد سے معاملہ کرتے ہوئے اس کی انفرادی شخصیت کو دیکھا جائے نہ کہ جماعت اور حلقہ کو۔ جو لوگ حلقہ اور جماعت کی اصطلاحوں میں سوچیں وہ اکثر نہایت قیمتی افراد کو کھو دیتے ہیں۔ وہ فرد کو جماعت یا گروہ کے لباس میں دیکھتے ہیں۔ حالاں کہ فرد ہمیشہ فرد رہتا ہے۔ وہ جماعت میں شریک ہونے کی وجہ سے جماعت نہیں بن جاتا۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ہجرت کے سفر میں عبد اللہ بن اریقط کو راز دار بنایا گیا جو کہ مشرک تھا۔ مگر مشرک ہونے کے باوجود اس نے راز کی پوری حفاظت کی۔ دوسری طرف فتح مکہ کی تیاری کے موقع پر ایک مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ نے خط کے ذریعہ مدینہ کے فوجی راز کو مکہ والوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اگرچہ خدائی اطلاع کی بنا پر ان کا قاصد راستہ میں پکڑ لیا گیا۔

زندگی کا راز: باہمی اتفاق

"مملکت عربیہ سعودیہ" ابتداءً ۱۹۰۲ میں قائم ہوئی۔ عرب ممالک میں عام طور پر بہت جلد جلد حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مگر سعودی حکومت کسی انتشار کے بغیر قائم ہے۔ اس کی اس کامیابی کا راز اتحاد ہے۔ چند ماہ پہلے امریکہ کی سی آئی اے نے اپنی حکومت کو ایک رپورٹ دی۔ اس رپورٹ میں "انکشاف" کیا گیا تھا کہ سعودی عرب کے شاہی خاندان میں اندرونی اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے بعد ایک مغربی سفیر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک سعودی شہزادہ نے کہا:

If there is one thing this royal family is agreed on, it is its own survival. We do not survive by fighting each other.

اگر کوئی چیز ہے جس پر سعودی عرب کا شاہی خاندان متفق ہے تو یہ اس کا اپنے وجود کو باقی رکھنا ہے۔ اگر ہم آپس میں لڑیں تو ہم اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۳ نومبر ۱۹۷۹)

زندگی کا یہ راز جس کو عرب کے شاہی خاندان نے جان لیا اگر مسلم قومیں بھی اس کو جان لیں تو مسلم دنیا اچانک اتنی طاقت ور ہو جائے کہ وہ تمام مسئلے خود بخود حل ہو جائیں جن کے لئے قربانیوں پر قربانیاں دی جارہی ہیں اور وہ کسی طرح حل ہونے میں نہیں آتے۔ کسی مفروضہ دشمن کو ہٹانے کے لئے تو مسلمان بار بار متحد ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام کے احیاء اور ملت کی تعمیر کے لئے ان میں اتحاد نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہ اتحاد جو مفروضہ دشمن کو ہٹانے کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر وجود میں آگیا تھا وہ دشمن کے ہٹتے ہی اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ مثبت مقصد کے لئے جب اتحاد نہ ہو سکے تو منفی مقاصد کے لئے اتحاد کی کوئی قیمت نہیں۔ اس قسم کا اتحاد مرض کی علامت ہے نہ کہ صحت مند ہونے کی علامت۔ اگر اصل مقصد "اسلام" کو کرسی پر بٹھانا ہو تو کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ "دشمن اسلام" کے ہٹتے ہی لوگ متفقہ طور پر اسلام کو کرسی پر بٹھا کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگ جائیں گے۔ مگر جب ہر شخص اپنے کو کرسی پر بٹھانا چاہے تو اختلاف پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ کرسی تو ایک ہی ہے۔ پھر سارے لوگ بیک وقت اس پر کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ جاہ طلبی اختلاف پیدا کرتی ہے اور اسلام طلبی اتحاد۔

کسی گروہ میں اتحاد نہ ہو تو اس کی وجہ ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کی سطحیت ہوتی ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے مفادات کو بچانے کی خاطر بڑی اجتماعیت کا جزء نہیں بنتے۔ دس چھوٹے حلقے ہوں تو دس آدمیوں کو صدارت حاصل ہوگی۔ اور اگر ان کو ملا کر ایک حلقہ بنا دیں تو صرف ایک شخص عہدہ حاصل کر سکے گا۔ اس لئے جاہ طلب لوگ اتحاد میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح کچھ افراد عرصہ تک ایک حلقہ سے جڑے رہیں تو بالآخر ان کے اندر عصبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی ہر چیز کے حق میں وہ ایک قسم کا تقدس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے حلقہ کو عظیم تر اجتماعیت میں ملانے کو ایسا ہی خیال کرنے لگتے ہیں جیسے مقدس کعبہ کو کوئی اپنے ذاتی مکان میں شامل کرنے کی کوشش کرے۔ پھر جو لوگ کسی حلقہ سے وابستہ نہ ہوں ان کی رکاوٹ کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اجتماعیت کو اپنی آزاد زندگی کے لئے بندھن محسوس کرتے ہیں — اتحاد بہت بڑی طاقت ہے۔ مگر اتحاد ہمیشہ ذات کی نفی کی قیمت پر قائم ہوتا ہے۔ اور قربانی کی یہ قسم ہمیشہ انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز رہی ہے۔

ذاتی رنجش سے بلند ہوکر

امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کی ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام ہے وھائٹ ہاؤس کے سال (The White House Years) اس کتاب میں مصنف نے سابق صدر رچرڈ نکسن کا ۱۹۶۹ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ مسٹر نکسن کے صدر منتخب ہونے سے چند ماہ پہلے ایک انگریز مسٹر جان فری مین نے ان پر سخت تنقید کی تھی۔ انھوں نے عوامی طور پر مسٹر نکسن کے بارے میں کہا تھا: مسٹر نکسن ایک ایسے شخص ہیں جن کا کوئی بھی اصول نہیں سوا اس کے کہ وہ اپنی ذات کی خاطر ہر چیز کو قربان کر دینا چاہتے ہیں۔

He is a man of no principle whatsoever except a willingness to sacrifice everything in the cause of Dick Nixon.

عجیب اتفاق ہے کہ مسٹر نکسن جب امریکہ کے صدر منتخب ہوئے تو اس وقت کے برطانی وزیر اعظم مسٹر ہرولڈ ولسن نے انھیں مسٹر فری مین کو امریکہ میں برطانی سفیر نامزد کیا۔ مسٹر نکسن کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انھوں نے مسٹر ولسن کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا سفیر مقرر کریں جو امریکہ کی نئی حکومت کے لئے زیادہ قابل قبول ہو۔ مگر مسٹر ولسن نے اس تجویز کو نہیں مانا۔ اس میں مزید ناگواری اس وقت پیدا ہوئی جب مسٹر نکسن نے صدر امریکہ کی حیثیت سے برطانیہ کا دورہ کیا۔ ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ (برطانوی وزیر اعظم کی سرکاری قیام گاہ) میں مسٹر نکسن کے اعزاز میں ڈنر کا انتظام کیا گیا۔ اس کے شرکاء کی فہرست میں مذکورہ مسٹر فری مین کا نام بھی تھا۔ مسٹر نکسن نے سختی سے چاہا کہ ان کا نام فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ مگر ان کی یہ خواہش بھی برطانی وزیر اعظم نے پوری نہ کی۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ ڈنر میں جب مسٹر نکسن جام صحت نوش کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو بالکل خلاف امید انھوں نے سیدھے مسٹر فری مین کی طرف دیکھا اور کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں ایک نیا نکسن ہے۔ اور وہ حیران ہیں کہ کیا یہاں ایک نیا فری مین ہے۔ میں یہ پسند کروں گا کہ پچھلی یادوں کو ہم ماضی کے خانہ میں ڈال دیں۔ آخر کار وہ ایک نئے ڈپلومیٹ ہیں اور میں ایک نیا سیاست داں ہوں۔ دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے دونوں اپنی بہترین کوشش کر رہے ہیں۔

Some say there's a new Nixon. And they wonder if there's a new Freeman. I would like to think that that's all behind us. After all, he is the new diplomat and I am the new statesman, trying to do our best for peace in the world.

ڈاکٹر کسنجر لکھتے ہیں کہ فری مین جو عام طور پر ایک مضبوط آدمی سمجھے جاتے ہیں، یہ سن کر تقریباً رو پڑے۔

The usually impurturable Freeman was close to tears,

مسٹر رچرڈ نکسن نے اپنے آپ کو بدل کر مسٹر فری مین کو بھی بدل دیا تھا۔ اس کے بعد فری مین نکسن کے لئے دوسرے فری مین تھے اور نکسن فری مین کے لئے دوسرے نکسن (۸ مئی ۱۹۸۰)

وہ اپنے خلاف تنقید سن کر بھپر اٹھا

ازرا پاونڈ (۱۸۸۵ — ۱۹۷۲) مشہور امریکی شاعر اور تنقید نگار ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور سے اس کی پہلی ملاقات ۳ جون ۱۹۱۲ کو لندن میں ہوئی۔ وہ ٹیگور کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا۔ ٹیگور کی نظم گیتان جلی کا انگریزی ترجمہ چھپا تو ازرا پاونڈ (Ezra Pound) نے لکھا کہ ٹیگور کے کلام میں وہ عظمت پائی جاتی ہے جو دانتے کی خصوصیت ہے۔ اس نے یہاں تک کہا کہ وہ ہم میں سے کسی بھی شخص کے مقابلہ میں زیادہ عظیم ہیں۔

...... greater than any one of us

ازرا پاونڈ نے ٹیگور کی بابت یہ الفاظ مارچ ۱۹۱۳ میں ایک امریکی رسالہ (Fortnightly Review) میں لکھے تھے۔ صرف ایک ماہ بعد ۲۲ اپریل ۱۹۱۳ کو اس نے رسالہ (Poetry) کے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا جس میں ٹیگور کو فضول (Superfluous) قرار دیا اور کہا کہ ان کے کلام میں صرف بعض پرانی باتوں کی تکرار ہے اور اصل بنگالی زبان میں جو ادبی چاشنی تھی وہ بھی انگریزی ترجمہ میں ختم ہوگئی ہے۔

ٹیگور کے بارہ میں ازرا پاونڈ کی رائے میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ازرا پاونڈ نے کالی موہن گھوش کی مدد سے کبیر کی نظموں کا انگریزی ترجمہ شروع کیا۔ یہ ترجمہ کتابی صورت سے پہلے میگزین میں قسط وار چھپا۔ ٹیگور نے اس ترجمہ کو دیکھا تو وہ ان کو بہت ناقص معلوم ہوا۔ انھوں نے اس کے ادبی معیار پر سخت تنقید کی۔ اس تنقید کو پڑھ کر ازرا پاونڈ بگڑ گیا اور وہی ٹیگور جس کی بابت وہ اس سے پہلے غیر معمولی تعریفی کلمہ کہہ چکا تھا، اس کی ہجو کرنے لگا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ مارچ ۱۹۷۹)

بیشتر انسانوں کے لئے سب سے زیادہ قابل نفرت چیز ان کی اپنی ذات پر تنقید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر انسانوں کے لئے پرستش کا مرکز ان کی اپنی ذات ہوتی ہے اور آدمی کی فطرت ہے کہ وہ اپنی پرستش کے مرکز پر تنقید کبھی گوارا نہیں کرتا۔

آدمی جب کسی کی تعریف کرتا ہے تو اکثر حالات میں وہ خود اپنی تعریف کی ایک صورت ہوتی ہے۔ ایک لیڈر جب اسٹیج پر کھڑا ہوتا ہے اور پنڈال میں بھرے ہوئے عوام کے سامنے فیاضانہ الفاظ کا تحفہ پیش کرتا ہے تو در اصل وہ عوام کو ان کے اس عطیہ کا بدلہ دے رہا ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کے تقریری تھیٹر میں جمع ہو کر اس کی شان میں اضافہ کیا۔ ایک شخص جب کسی ایسے شخص کے اعتراف میں قصیدہ پڑھتا ہے جو اس کا حریف نہیں ہے تو یہ در اصل اپنے وسعت ظرف اور اپنی شرافت کے اشتہار کی ایک بے ضرر صورت ہوتی ہے۔ ایک صاحب قلم جب دوسرے صاحب قلم کے تذکرہ میں الفاظ کے پھول کھلاتا ہے تو وہ یا تو بالواسطہ طور پر اس کے کسی سابقہ قصیدہ کا شکرانہ ادا کر رہا ہوتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ تم بھی اسی طرح میرا قصیدہ شائع کرنا۔ کبھی ایک تعریف اس لئے بھی شائع کی جاتی ہے کہ کسی سابقہ تنقید کی وجہ سے اپنی بگڑی ہوئی تصویر کو متوازن کیا جاسکے۔
حقیقی تعریفی کلمات وہ ہیں جو اپنے بھائی کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت نکلے ہوں۔ مگر یہی چیز دنیا میں سب سے زیادہ کم یاب ہے۔ کسی کو حقیقی خیر خواہی کا ایک کلمہ دینا اتنی بڑی فیاضی ہے جو شاذ و نادر ہی کسی خوش نصیب کے حصہ میں آتی ہے۔

لڑائی کے ساتھ تعمیر نہیں ہوتی

لنڈن بی جانسن (۱۹۷۳-۱۹۰۸) جان کینیڈی کے قتل کے بعد ۱۹۶۳ میں امریکہ کے صدر بنائے گئے۔ وہ امریکہ کے پہلے صدر تھے جن کو ۱۶ ملین ووٹوں کی اکثریت سے صدر چنا گیا۔ صدر جانسن کو امریکہ کے اندرونی مسائل سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کے چھ سالہ صدارت کے زمانہ میں ملک کی اندرونی اصلاح کے لئے سول رائٹس بل اور دوسرے کئی اہم قوانین پاس ہوئے۔ ان کے ذہن میں یہ پروگرام تھا کہ امریکہ کو عظیم سماج (Great Society) بنائیں۔ مگر جلد ہی وہ ویٹ نام کی جنگ میں الجھ گئے جو ان کے بعد اس طرح ختم ہوئی کہ اس نے امریکہ کی بنیادیں ہلادیں۔ کہا جاتا ہے کہ ویٹ نام کی بارہ سالہ جنگ میں امریکہ کے ۳۶۰۰ جیٹ طیارے اور ۵ ہزار ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے۔ اس کے علاوہ تقریباً ۵۰ ہزار امریکی مارے گئے اور تین لاکھ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اسی نسبت سے دوسرے نقصانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق دور حاضر کی اس طویل ترین جنگ میں امریکہ کے تقریباً ایک سو کھرب ڈالر برباد ہوئے۔

صدر جانسن نے امریکہ کو دنیا کا عظیم ترین سماج بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ انھوں نے امریکہ کو اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ دوسرے درجہ کی طاقت بننے کی طرف چل پڑا۔ مسلسل واقعات ثابت کر رہے ہیں کہ امریکہ زوال کی طرف جا رہا ہے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں وہ روس کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کی طاقت بن جائے گا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکہ، صدر جانسن کے زمانہ میں، ایک ایسی ہولناک جنگ میں الجھ گیا جس سے بربادی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہ تھا۔ جب بھی آدمی کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے ساتھ ضروری ہے کہ وہ مقصد کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ آپ اپنے کمرہ کی دیوار کو سفید دیکھنا چاہتے ہوں تو آپ کے لئے لازم ہے کہ کمرہ میں کوئلہ کی انگیٹھی نہ جلائیں۔ کوئی شخص اپنی معاشی زندگی کی تعمیر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ وہ قتل اور مقدمہ بازی جیسی چیزوں میں نہ الجھے۔ یہ اصول فرد کے لئے بھی ضروری ہے اور قوم کے لئے بھی۔

سیاست لڑنے بھڑنے کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے کو طاقت ور بنانے کا نام ہے۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ امن کے زمانہ میں جتنا زیادہ پسینہ بہاؤ گے۔ جنگ کے زمانہ میں اتنا ہی کم خون بہے گا۔ حقیقی جنگ یہ ہے کہ جنگ سے پہلے اتنی تیاری کی جائے کہ جنگ کے بغیر صرف دھمکی سے کام چل جائے اور اگر جنگ کرنی ہی پڑے تو معمولی نقصان کے بعد جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔ کسی قوم کو ترقی یافتہ بنانے کا کام تعمیری سرگرمیوں کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ جنگی اقدام سے۔ یقیناً زندگی میں اشتعال کے مواقع آتے ہیں جو آدمی کو جنگ اور مقابلہ آرائی کی طرف کھینچتے ہیں۔ مگر عقل مند وہ ہے جو ایسے موقع پر صبر و تحمل سے کام لے نہ کہ جوش میں آکر جنگ کے میدان میں کود پڑے۔ جنگ سے پہلے جنگ سے بچنا صرف جذبات کی قربانی مانگتا ہے مگر جنگ میں کودنے کے بعد جنگ کو چھوڑنے کے لئے مفاد کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اور پہلی چیز کے مقابلہ میں دوسری چیز یقیناً زیادہ بھاری ہے۔

اختلاف کا نقصان

پندرھویں صدی میں عرب تاجر جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان اور بیرونی دنیا کے درمیان تمام بری اور بحری راستوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ وہ ان کے ذریعہ نہایت کامیاب تجارت کر رہے تھے۔ مگر سولھویں صدی کے آغاز سے تاریخ بدلنا شروع ہوئی۔ واسکوڈی گاما (۱۵۲۴-۱۴۶۰) نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان بحری راستہ دریافت کیا۔ اس کے بعد پرتگالی تاجروں کے قافلے اس علاقہ میں داخل ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے انھوں نے ہندوستان کی بیشتر ساحلی تجارت پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو اپنی ہوشیاری سے اس علاقہ کی تجارت سے بے دخل کر دیا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے گرم مسالے بیرونی ملکوں میں بہت اچھی قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ پرتگالی جہاز یہاں سے سیاہ مرچ، دارچینی، لونگ، جاوتری وغیرہ قیمتی پیداوار اپنے جہازوں میں بھر بھر کر لے جانے لگے اور مسلمانوں کے پاس صرف ڈلی اور ناریل کی معمولی تجارت رہ گئی۔ مسلمان صرف انھیں چیزوں کی تجارت کر سکتے تھے جن کو پرتگالی لائق اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ تمام اہم اور فائدہ بخش چیزوں کی تجارت پرتگالیوں نے اپنے قبضہ میں لے رکھی تھی۔ پرتگالیوں نے اپنی ہوشیاری سے ساحلی راجاؤں کو اپنا مطیع بنا کر بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ملاکا، اشی، دناسری، وغیرہ خشکی کے راستے انھوں نے عربوں کے لئے بند کر دئے۔ حتیٰ کہ ان کے امان اور ان کے اجازت نامہ کے بغیر کوئی اس علاقہ میں بحری سفر نہیں کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کی معمولی تجارت بھی پرتگالی جہازوں کے ذریعہ ہوتی تھی

مسلمانوں کی تجارتی کامیابیوں کے جلو میں اس علاقہ میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ خصوصاً ساحلی علاقے بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کی دعوت و تبلیغ کا مرکز بن گئے تھے۔ عین اس وقت اس علاقہ کی سیاست اور اقتصادیات پر پرتگالیوں کا قبضہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اسلامی سرگرمیاں ٹھپ ہو گئیں۔ اسلام کی اشاعت کا کام رک گیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

مسلمانوں کے اوپر پرتگالیوں کی فتح کا راز کیا تھا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں نااتفاقی پھیلی ہوئی تھی۔ جب کہ پرتگالی حد درجہ اتفاق و اتحاد کے ساتھ کام کرتے تھے، سیاح زین الدین نے لکھا ہے:

"پرتگالی بڑے ہوشیار، فریبی اور اپنی مصلحت کے بڑے ماہر ہیں۔ ضرورت کے وقت اپنے دشمنوں کی خوشامد کرنے میں بھی ان کو عار نہیں ہوتا۔ ان میں بڑا اتحاد ہے۔ وہ اپنے سرداروں کے حکم سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ اپنے دارالحکومت سے دوری کے باوجود ان میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ انھوں نے اقتدار کے حصول کے لئے اپنے کسی بڑے آدمی کو قتل کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تعداد کی کمی کے باوجود وہ مالابار وغیرہ کے راجاؤں کو اپنا مطیع بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کی فوج اور ان کے سرداروں میں اختلاف ہے۔ ان کا حصول اقتدار کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اس کی خاطر وہ باہم ایک دوسرے کو قتل کر چکے۔ (تاریخ الحضارۃ العربیہ از محمد کرد علی شامی)

اتحاد کیوں نہیں

۲۹ اگست ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔ دہلی کے آزاد پارک (جامع مسجد) میں ایک ہی دن دو جلسے ہوئے۔ دونوں جلسوں کا مقصد ایک تھا مگر دونوں دو الگ الگ شامیانوں کے نیچے ہوئے۔ ایک جلسہ شام کو ۵ بجے ہوا، دوسرا جلسہ اسی دن اسی مقام پر ۹½ بجے شب میں۔ ایک جلسہ کو مسلمانوں کی "وطن دوست" جماعتوں نے بلایا تھا اور دوسرے جلسہ کو "اسلام دوست" جماعتوں نے۔

دونوں جلسوں کا مقصد ایک تھا۔ "مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی کے خلاف ہندستانی مسلمانوں کے جذبات کا اظہار کرنا" دونوں جلسوں میں ہندستان کے مسلم قائدین کے ساتھ عرب سفرا بھی بلائے گئے تھے۔ راقم الحروف دونوں جلسوں میں شریک ہوا اور دونوں قسم کے مقررین کی تقریریں سنیں۔ دونوں جلسوں میں پُرجوش تقریریں ہوئیں۔ تمام مقررین کی تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کو اس لئے شکست ہوئی کہ وہ متحد نہیں تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا "اے عربو، متحد ہو کر اسرائیل کا مقابلہ کرو"

میں جب دونوں جلسوں کو دیکھ کر واپس ہوا تو دل کی عجیب حالت تھی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا ——— ہم متحد ہو کر مشورہ بھی نہیں دے سکتے اور وہ متحد ہو کر مقابلہ کریں!

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اتحاد کی باتوں کے باوجود اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ ہمارا ہر قائد اتحاد کی باتیں کرتا ہے مگر عملاً اس کے الفاظ بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی اپنے اس کہنے میں سنجیدہ نہیں۔ ہر آدمی اتحاد کا پیغام دینے کا کریڈٹ تو لینا چاہتا ہے مگر وہ اس کے عملی تقاضے پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ لوگ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں، کیونکہ وہ اس کی قیمت دینا نہیں چاہتے۔

اتحاد کی واحد لازمی قیمت اپنی بے اتحادی کو ختم کرنا ہے۔ جب تک آدمی اپنی بے اتحادی کو ختم نہ کرے اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔ جو آدمی اتحاد کی دعوت دے رہا ہے وہ خود بھی انھیں میں سے ایک ہے جن کے ملنے سے مطلوبہ اتحاد قائم ہوگا۔ پھر اگر وہ اپنے کو اس میں شامل نہ کرے تو اتحاد کی تکمیل کس طرح ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے کو دوسروں کے ساتھ شامل کرنے کا نام اتحاد ہے اور اپنے کو دوسرے سے الگ کرنے کا نام اختلاف۔ جہاں ہر آدمی اپنی انفرادیت پر اصرار کرے، جہاں ہر آدمی ہر کام کا کریڈٹ خود لینا چاہے وہاں اتحاد کیونکر قائم ہوگا۔

اتحاد نام ہے مجموعہ کے لئے اپنی ذات کو قربان کرنے کا۔ جو لوگ اپنی ذات یا اپنے گروہ کی قربانی پر تیار نہ ہوں وہ اگر اتحاد کے لئے پکارتے ہیں تو گویا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ لوگو میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاؤ، لوگو میری سرداری کو قبول کرلو۔ ایسے لوگوں کے لئے زیادہ بہتر تھا کہ وہ لوگوں کو اختلاف کے لئے پکاریں، وہ انتشار کا جھنڈا بلند کریں۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ خدا کے یہاں کم از کم دو عملی کا مجرم قرار دئے جانے سے بچ سکتے تھے۔

اتحاد کی قیمت : شخصی جذبات کی قربانی

آپ کسی مسلم لیڈر سے ملئے۔ کسی مسلم ادارہ میں جائیے۔ ہر ایک آپ کو اپنے کارناموں کی لمبی فہرست بتائے گا۔ ہر جگہ آپ کو شان دار ایڈریس شاندار فریم میں دیواروں کی زینت بنے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ہمارا ہر لیڈر اور ہمارا ہر ادارہ اپنے بیان کے مطابق، عظیم الشان کارنامے انجام دے رہا ہے۔ مگر ان کارناموں کو ان کی مجموعی صورت میں دیکھنا چاہیں تو وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ افراد کی مجموعی صورت ہی کا نام اسلام یا ملّت اسلام ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اسلامی افراد الگ الگ فتوحات کے جھنڈے لہرا رہے ہیں مگر اسلام ساری دنیا میں مغلوب ہے۔ ملّت کے افراد الگ الگ کامیابیوں کے مینار کھڑے کر رہے ہیں مگر ملت ناکامی کی پستی میں پڑی ہوئی ہے۔ اینٹیں سونے کی ہیں مگر ان کے ملنے سے جو محل بنا ہے وہ مٹی کا ہے۔ درخت سیب کے ہیں مگر ان سے جو باغ تیار ہوا ہے وہ ببول کا خارستان ہے۔

اس عجیب و غریب تضاد کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کام کو اسلام کا کام بتایا جا رہا ہے وہ حقیقۃً اسلام کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ سب افراد کے اپنے کاروبار ہیں۔ اس لئے افراد کی سطح پر ان کے کچھ جلوے نظر آتے ہیں مگر اجتماع (اسلام) کی سطح پر ان کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ لوگوں نے اپنی قیادت کے کاروبار پر ملت کا لیبل لگا رکھا ہے۔ اپنی ذاتی تجارت کو اسلام کا نام دے دیا ہے۔ ایسی حالت میں ان کی سرگرمیوں کے نتائج اسلام یا ملت اسلام کی سطح پر کیوں کر نظر آئیں گے۔

ایک بڑے شہر میں ایک لاکھ کامیاب دکانیں ہیں۔ ہر دکان دار صبح شام پیسے کما رہا ہے۔ آپ جس دکان دار سے بھی ملیں، اس کے پاس اپنی کامیابیوں کی داستان بتانے کے لئے بے شمار الفاظ ہوں گے۔ تاہم اگر آپ چاہیں کہ ان ایک لاکھ دکان داروں کی کمائیاں کسی ایک مقام پر روپیوں کے پہاڑ کی صورت میں دکھائی دیں تو آپ کو بالکل ناکامی ہوگی۔ کیوں کہ ہر دکان دار جو کما رہا ہے وہ اپنی ذات کے لئے کما رہا ہے نہ کہ کسی "مجموعہ" کے لئے۔ چنانچہ ہر دکان دار کا اپنا مکان شان دار طور پر بن رہا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی میں اس کی کمائی کی چمک دمک آپ خوب دیکھ سکتے ہیں۔ مگر کسی مجموعہ کے لئے وہ کما ہی نہیں رہا ہے اس لئے مجموعہ کی سطح پر اس کی کامیابیاں نظر بھی نہیں آتیں۔ افراد کے کاروبار افراد کی سطح پر نظر آ سکتے ہیں، اجتماع کی سطح پر وہ کیوں کر دکھائی دیں گے۔ اسی سے اسلام کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ افراد کا اسلامی کام اسی وقت اسلامی کام ہے جب کہ اس کا فائدہ مجموعۂ اسلام کو مل رہا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ انفرادی کاروبار ہے خواہ اس کو کرتے ہوئے کتنا ہی زیادہ اسلام کی تلاوت کی جا رہی ہو۔ اور اس کے اوپر کتنے ہی عالی شان اسلامی بورڈ لگے ہوئے ہوں۔

جوتے اور کپڑے کی دکان آدمی اس لئے کھولتا ہے کہ اس سے اس کو نفع حاصل ہو، اسی مزاج کے تحت اگر کسی بظاہر اسلامی کام کو کیا جائے تو اس کا ظاہری طور پر اسلامی ہونا اس کو خدا کی نظر میں اسلامی نہیں بناتا۔ کیونکہ اسلام میں عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اللہ کو وہ عمل پسند ہے جو صرف اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہو۔ پھر جس کام کو دنیوی مقاصد کے لئے کیا جائے اس پر خدا کی برکتیں کس طرح نازل ہوں گی۔

پہاڑوں سے بے شمار چھوٹے چھوٹے جھرنے جاری ہوتے ہیں۔ اپنی انفرادی حیثیت میں وہ صرف پانی کے سوت کی مانند

ہوتے ہیں۔ مگر جب قدرت ان کو ایک دھارے میں ملا دیتی ہے تو ان کا ملنا ایک بڑے دریا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی چیز اہل ایمان کی اسلامی کوششوں کے سلسلہ میں بھی مطلوب ہے۔ "اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں (صف ۴) وہی اسلامی عمل اللہ کے نزدیک اسلامی عمل ہے جس کا رخ اجتماعیت کی طرف ہو، جب کہ انفرادی کوششیں اس طرح جاری ہوں کہ بالآخر وہ سب کی سب مل کر ایک دریا بن جائیں۔ اس کے برعکس اگر افراد کی اسلامی کوششیں الگ الگ جھرنوں کی صورت میں بہتی رہیں اور دوسروں کی اسلامی کوششوں سے مل کر ایک بڑا دھارا نہ بنیں تو وہ خدا کے نزدیک بے قیمت ہیں۔

اگر لوگ ذاتی محرک کے تحت کام کر رہے ہوں تو ان کا اسلامی عمل انفرادی عمل بن کر رہ جاتا ہے اور اگر وہ خدا کے لئے متحرک ہوئے ہوں تو ناممکن ہے کہ ان کا عمل صرف اپنی ذات کے گرد گھومے، دوسروں کے ساتھ مل کر بڑا دھارا نہ بنے۔ لوہے کے ٹکڑے اسی وقت تک الگ الگ رہتے ہیں جب کہ ان کے درمیان کوئی مقناطیس نہ ہو۔ جب ان کے درمیان ایک مقناطیس آجائے تو لازماً وہ سب مقناطیس کے گرد جڑ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اہل اسلام کی کوششیں اگر حقیقۃً خدا کے لئے ہو رہی ہوں تو خدا کی ذات ایک عظیم مقناطیس بن جاتی ہے جو تمام کوششوں کو ایک نقطہ کے گرد سمیٹ دیتی ہے۔ اہل اسلام کی کوششوں کا انتشار اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ خدا کے لئے نہ ہو بلکہ اپنی ذات کے لئے ہو۔

اجتماعی کام کے لئے جب کچھ لوگ ساتھ ہوتے ہیں تو طرح طرح کی ناموافق باتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی مزاجوں کا اختلاف دل شکنی کا باعث ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی تنقید سے خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ کبھی ایک شخص کی کمزوری سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ضرورت ہوتی ہے کہ سنانے کے شوق کو دبا کر سننے کے لئے اپنے کو آمادہ کیا جائے۔ کبھی تقاضا ہوتا ہے کہ دوسرے کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے راضی کیا جائے۔ غرض بار بار ایسے مواقع سامنے آتے ہیں جہاں اپنی انفرادیت کو کچلنے کا سوال ہوتا ہے۔ یہی مواقع آدمی کے جذبہ اتحاد کا امتحان ہوتے ہیں۔

کوئی بڑا اسلامی کام صرف وہ لوگ کرتے ہیں جن کے اندر اتنی بلندی ہو کہ وہ مفاد اور مصلحت کے بغیر جڑ سکتے ہوں۔ وہ اس وقت بھی اپنے بھائی کی قدر کریں جب کہ اس سے ان کی ذات کو خوشامد کی غذا نہ مل رہی ہو۔ وہ اپنے بھائی کے اوپر خرچ کریں مگر ان کے اندر اپنے بڑے ہونے کا احساس نہ پیدا ہو۔ وہ اپنے بھائی کی کمزوری کو دیکھیں مگر اس کو نمایاں کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہ ابھرے۔ وہ دوسرے کی زبان سے اپنے بارے میں کڑوی بات سنیں مگر ان کے دل میں دوسرے کے لئے نفرت کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ دوسرے کی طرف سے ان کے مزاج کے خلاف رویہ ظاہر ہو مگر اس کو وہ دوسرے کے بارے میں رائے قائم کرنے کی بنیاد نہ بنائیں۔ دوسرے کی ذات سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو پھر بھی وہ خدا کے لئے اس سے محبت کریں ـــــ اسی کا نام "صبر" ہے۔ اور اسی قسم کے صبر والے لوگ کوئی بڑا دینی کام کرتے ہیں اور انھیں لوگوں کے ملنے سے وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کا نام اسلامی اتحاد ہے۔

اتحاد کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ شخصی قربانی ہے۔ جس گروہ کے افراد میں یہ طاقت ہو کہ وہ شخصی تقاضوں کو اجتماع کی خاطر دبا سکیں، ان میں اتحاد قائم ہو کر رہتا ہے، اور وہی ہیں جو کوئی بڑا کام کرتے ہیں۔

[illegible]شدت کا سبب سیاست

سیاسی [illegible] ہمیشہ شدت پیدا کرتا ہے۔ قدریہ اور جبریہ فرقوں میں جو شدت نظر آتی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ دونوں فرقے سیاسی اسباب کے تحت پیدا ہوئے۔ خلافت راشدہ کے آخری دور میں سیاسی اقتدار بنو ہاشم کے ہاتھ میں تھا۔ بنو امیہ نے ان سے اقتدار چھین لیا۔ بنو ہاشم کی طرف سے کسی متوقع بغاوت کو کچلنے کے لئے انھوں نے ان کے اوپر سخت مظالم کئے۔ یہی وقت ہے جب کہ جبر و اختیار کے نظریات، مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ بنو امیہ نے اپنی سیاست کی نظریاتی توجیہہ کے لئے جبر کا سہارا لیا۔ انھوں نے کہا کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اس لئے بنو امیہ کا بنو ہاشم سے خلافت چھیننا اور ان کے افراد پر سختیاں کرنا سب خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ جو ہونا تھا وہی ہو رہا ہے، اس میں کسی انسان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ اس کے جواب میں ان کو غلط ثابت کرنے کے لئے دوسرے گروہ نے کہا کہ انسان آزاد ہے اور خود اپنی مرضی سے اپنے لئے کوئی راہ منتخب کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس طرح نظریۂ اختیار کا مطلب، اس وقت کی فضا میں یہ ہو گیا کہ بنو امیہ ظالم ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ارادہ سے کیا ہے خدا کے حکم کا اس سے کوئی تعلق نہیں ——— کوئی بحث اگر خالص علمی مقصد کے تحت نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے دوسرے مفادات و محرکات کام کر رہے ہوں تو دونوں فریقوں کی طرف سے شدت اور مبالغہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی قدریہ اور جبریہ کے ساتھ ہوا۔ قدیم کتابوں میں ان مباحث پر جو شدت پائی جاتی ہے وہ اسی سیا[سی] پس منظر کا نتیجہ ہے۔

یہی معاملہ دوسرے عنوان کے ساتھ خوارج کا تھا جنھوں نے ایمان و عمل کے بارے میں انتہا پسندا[نہ] اعتقادی مباحث پیدا کئے۔ خوارج نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت کا فتویٰ دیا۔ چوں کہ اسلام میں مسلمانوں کی قا[ئم] شدہ حکومت کے خلاف جنگ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، انھیں اپنے اقدام کے لئے ایک نظریاتی جواز درکار تھا۔ ا[س] مقصد کے لئے انھوں نے ایمان و عمل کے مسئلہ کا سہارا لیا۔ انھوں نے ایمان کی ایسی تعریف پر اصرار کیا جس میں عم[ل] بھی لازمی طور پر داخل ہو، صرف ایمان کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے کافی نہ ہو۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ وقت [کے] حکمراں مسلمان نہیں ہیں اور ان کے خلاف خروج کرنا جائز ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری جانب کے لوگوں نے ج[و] شدت اختیار کی انھوں نے اس پر زور دیا کہ صرف ایمان کسی کے مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے، اس کے لئے عمل ا[یک] شرط نہیں ہے۔ پہلے نظریہ کی صورت میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف بغاوت جائز قرار پاتی تھی، دوسرے نظریہ کی [رو سے] میں ان کے خلاف بغاوت کرنا حرام تھا۔ یہی سیاسی پس منظر تھا جس کی وجہ سے ایمان و عمل کی بحث نے وہ شدت [قدی]م کتابوں میں دکھائی دیتی ہے۔

[اس] کے تحت جو نظریہ پیدا ہو اس میں شدت کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ طلاق المکرہ کا مسئ[لہ] [اس] بنا حکومت کی نظر میں اس لئے سنگین بن گئے کہ وقت کے حالات نے ان میں سیاسی پہلو پیدا

NOVEMBER 1981

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱۔ الاسلام	۱۵—۰
۲۔ مذہب اور جدید چیلنج	۱۵—۰
۳۔ ظہورِ اسلام	۱۵—۰
۴۔ دین کیا ہے ؟	۲—۰
۵۔ قرآن کا مطلوب انسان	۵—۰
۶۔ تجدیدِ دین	۳—۰
۷۔ اسلام دینِ فطرت	۳—۰
۸۔ تعمیرِ ملت	۳—۰
۹۔ تاریخ کا سبق	۳—۰
۱۰۔ مذہب اور سائنس	۵۰—۰
۱۱۔ عقلیاتِ اسلام	۳—۰
۱۲۔ فسادات کا مسئلہ	۲—۰
۱۳۔ انسان اپنے آپ کو پہچان	۱—۰
۱۴۔ تعارفِ اسلام	۲—۵۰
۱۵۔ اسلام پندرھویں صدی میں	۲—۰
۱۶۔ راہیں بند نہیں	۳—۰
۱۷۔ دینی تعلیم	۳—۰
۱۸۔ ایمانی طاقت	۳—۰
۱۹۔ اتحادِ ملت	۳—۰
۲۰۔ سبق آموز واقعات	زیرِ طبع
۲۱۔ اسلامی تاریخ سے	"
۲۲۔ قال اللہ	"
۲۳۔ اسلامی دعوت	۳—۰
۲۴۔ زلزلۂ قیامت	۴—۰
۲۵۔ سچا راستہ	۱—۰



مکتبہ الرسالہ - دہلی ۶

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

دیوار کو ایک ہی دھکے میں نہیں گرایا جاسکتا
ایسی کوشش کا مطلب صرف ایک ہے ——
دیوار تو نہ گرے البتہ اپنا سر ٹوٹ جائے

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

الرسالہ

دسمبر ۱۹۸۱
شمارہ ٦١

جمعیۃ بلڈنگ . قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ٦ (انڈیا)

تذکیر القرآن

تذکیر القرآن کی اشاعت کا کام الرسالہ اگست ۱۹۷۹ میں شروع کیا گیا تھا۔ اب خدا کے فضل سے اس کے دس پارے مکمل ہو گئے ہیں، سورہ فاتحہ سے سورہ توبہ تک اس کی پہلی جلد انشاء اللہ عنقریب شائع کی جائے گی۔

مزید تفصیلات کے لئے آئندہ اعلان ملاحظہ فرمائیں۔

زر تعاون سالانہ ٣٦ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

توحید اور مساوات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دو لفظوں میں یہ تھا ــــــ توحید اور مساوات ۔ یعنی خدا کو ایک ماننا، اور تمام انسانوں کو برابر سمجھنا۔ آپ نے بتایا کہ اس دنیا کو بنانے والا ایک ہی خدا ہے، وہی سب کو پال رہا ہے اور اسی کے سامنے زندگی کا حساب دینے کے لئے سب کو حاضر ہونا ہے ۔

توحید

خدا ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کو مانے بغیر چارہ نہیں ۔ انسان کی فطرت اور چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات دونوں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ خدا کو ضرور مانا جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مصیبت کا لمحہ آتا ہے تو ہر آدمی کو خدا یاد آجاتا ہے ۔ خدا کا انکار کرنے والے بھی نازک وقتوں میں خدا کو پکارنے لگتے ہیں ۔ تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہے جب کہ لوگ عمومی پیمانہ پر خدا کے منکر بن گئے ہوں۔ تاہم خدا کو ماننے کے باوجود ہر دور میں دو خاص غلطیاں پائی جاتی رہی ہیں ۔

۱۔ مظاہر کائنات کو خدا سمجھ لینا ۔

۲۔ دکھائی دینے والی چیزوں پر نہ دکھائی دینے والے خدا کو قیاس کرنا ۔

آدمی کے اندر اپنے خالق کا تصور نہایت گہرائی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے ۔ اس کے دل میں جذبہ اٹھتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو مانے، وہ اس کے ساتھ اپنے کو جوڑے ۔ آدمی اگرچہ خدا کو نہیں دیکھتا ۔ مگر وہ خدا کی مخلوقات کو دیکھتا ہے ۔ یہاں آدمی نے یہ کیا کہ اس نے دکھائی دینے والی چیزوں میں جو چیز نمایاں اور برتر نظر آئی اس کو خدا فرض کر لیا ۔ مثلاً سورج، چاند، ستارے، وغیرہ ۔ اس نے اصولی طور پر خدا کے وجود کو مانا ۔ مگر اس نے اس طرح مانا کہ جو چیز خدا نہیں تھی اس کو محض اپنی اپج کی بنا پر خدا بنا لیا ۔

دوسرے لوگوں نے کائناتی مظاہر کو خدا نہیں کہا ۔ مگر انھوں نے اسی سے ملتی جلتی ایک اور غلطی کی۔ انھوں نے نظر آنے والی چیزوں پر اس خدا کو قیاس کر لیا جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا ۔ مثلاً دنیا میں ہر چیز کئی کئی ہوتی ہے ۔ انھوں نے خدا کو بھی کئی مان لیا ۔ دنیا میں بڑے لوگوں کے کچھ قریبی اور سفارشی ہوتے ہیں ۔ انھوں نے خدا کے یہاں بھی بہت سے مقرب اور سفارشی فرض کر لئے ۔ انسان بیٹے بیٹیاں رکھتا ہے ۔ انھوں نے خدا کے لئے بھی گمان کر لیا کہ اس کے بیٹے بیٹیاں ہیں ۔ وہ خالق کو مان کر اس کو مخلوق کی سطح پر اتار لائے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے عقیدہ کو اس قسم کی ملاوٹوں سے پاک کیا ۔ اور اس کو خالص توحید کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کیا ۔ قرآن میں حکم ہوا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ وہ اللہ ایک ہے ۔

اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں (سورہ اخلاص)

مساوات

انسان نے خود اپنے معاملہ میں بھی وہی غلطی کی جو اس نے خدا کے معاملہ میں کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ انسانوں میں کوئی مال دار ہے اور کوئی غریب، کوئی سفید ہے اور کوئی کالا، کوئی اونچے گھرانے کا ہے اور کوئی معمولی گھرانے کا۔ ان فرقوں کی بنا پر لوگوں نے آدمیوں میں فرق کرنا شروع کر دیا۔ انھیں بنیادوں پر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان اونچ نیچ قائم ہو گئی۔

پیغمبر اسلام نے بتایا کہ اس طرح کے فرق حقیقی نہیں ہیں، وہ محض ظاہری اور اعتباری ہیں۔ ان کا انسانی اونچ نیچ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان فرقوں کے باوجود تمام انسان برابر ہیں۔ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ کسی کو کسی دوسرے کے اوپر رنگ اور نسل اور عہدہ اور مال کی بنا پر بڑائی حاصل نہیں۔ بڑائی کا معیار آدمی کا کردار ہے نہ کہ اس کی ظاہری حیثیت۔ بڑا حقیقت میں وہ ہے جو خدا کا فرماں بردار ہے، چھوٹا وہ ہے جو خدا کا فرماں بردار نہیں۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو، خدا نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھارے کنبے اور قبیلے بنا دئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرتے والا ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے (الحجرات ۱۳)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج (۱۰ھ) کے خطبہ میں اعلان کیا:

یا ایہا الناس الا ان ربکم واحد، لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ الناس من آدم و آدم من تراب

اے لوگو، سن لو تمھارا رب ایک ہے، کسی عربی کو کسی غیر عربی پر یا کسی غیر عربی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت ہے۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے۔

اسلام یہ بتاتا ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح تمام انسان بھی ایک ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خدا کی وحدت اپنی ذات کے اعتبار سے ہے اور انسان کی وحدت اپنی تخلیق کے اعتبار سے۔

جنت والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان کو جس جنت میں داخل کیا جائے گا اس کی معرفت انھیں اسی دنیا میں کرائی جا چکی ہوگی (ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم، محمد) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ جنت کا رزق اس رزق کے مشابہ ہوگا جس کی توفیق انھیں دنیا کی زندگی میں ملی تھی (واتوا بہ متشابھا، بقرہ) حدیث میں کہا گیا ہے کہ جنت دوزخ دراصل انسان ہی کے اعمال ہیں جو آدمی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں (انما ھی اعمالکم ترد الیکم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کا آغاز اسی دنیا سے ہو جاتا ہے۔ جنتی انسان اپنی جنت کو اسی دنیا میں پالیتا ہے۔ گویا کہ جنت کا ایک مثنیٰ اسی دنیا میں ہے اور آخرت کی جنت میں وہی شخص جائے گا جس نے دنیا میں جنت کے اس مثنیٰ کو پالیا ہو۔ جنت کا یہ دنیوی مثنیٰ گویا نقد انعام ہے جو اصل انعام سے پہلے اس کی ایک ابتدائی علامت کے طور پر دے دیا جاتا ہے۔

یہ جنتی کون ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا میں ان کیفیات کا تجربہ کیا ہو جو آخرت میں اس کو جنت کا مستحق بنانے والی ہیں۔ جس کے رونگٹے کھڑے ہو کر اس کو خدائی محاسبہ کا احساس دلا چکے ہوں۔ جس کے قلب پر ٹکڑے کر دینے والی تجلیات کے نزول نے اس کو قربت خداوندی سے آشنا کیا ہو۔ جس نے بغض و انتقام کے جذبات کو اپنے اندر کچل کر عفو خداوندی کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے اپنے ندامت کے آنسوؤں میں وہ منظر دیکھا ہو جب کہ ایک مہربان آقا اپنے خادم کے اعتراف قصور پر اس سے درگزر فرماتا ہے۔ جس پر یہ لمحہ گزرا ہو کہ ایک شخص پر قابو پانے کے باوجود وہ اس کو اس لئے چھوڑ دے کہ اس کا خدا بھی اس دن اسے چھوڑ دے جب کہ وہ اس سے زیادہ عجز کی حالت میں ہوگا۔ جو ایک امر حق کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے لوگ آخرت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن جنت کا ایک پھول ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں آنے والی دنیا کا ایک ابتدائی شگوفہ ہے۔ مومن پر وہ سارے تجربات اسی دنیا میں گزر جاتے ہیں جو دوسروں پر موت کے بعد گزرنے والے ہیں۔ آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے جو حالات پیش آتے ہیں انھیں میں ہر آدمی کی جنت اور جہنم چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ان حالات میں شیطانی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور ملکوتی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جنت کا۔

شرک خفی

"اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کڑھنے لگتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوش ہو جاتے ہیں" زمر — ۴۵

آلوسی بغدادی نے اس آیت کی تفسیر میں اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کسی مصیبت میں ایک مرے ہوئے بزرگ کو پکار رہا ہے۔ انھوں نے کہا، اے شخص! خدا کو پکار۔ وہ خود فرماتا ہے کہ واذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (بقرہ) ان کی یہ بات سن کر آدمی سخت غصہ میں آگیا۔ بعد کو لوگوں نے انھیں بتایا کہ وہ کہتا تھا کہ "آلوسی اولیاء کے منکر ہیں"۔ کچھ لوگوں نے اس کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ اللہ کی نسبت ولی جلد سن لیتے ہیں۔

یہ ذہنیت کبھی کھلی کھلی غیر اللہ پر اعتماد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کو شرک جلی کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ ذہنیت شرک خفی کی صورت میں ہوتی ہے جس کو آج کل کی زبان میں شخصیت پرستی کہا جا سکتا ہے۔ آپ کثرت سے ایسے مذہبی حلقے پائیں گے جہاں بظاہر "اللہ اللہ" کا ورد ہوتا ہے اور قرآن پڑھا پڑھایا جاتا ہے، لیکن اگر وہاں کی مجلسوں میں خدا کی باتوں کا چرچا کیجئے تو لوگوں کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اپنی پسندیدہ شخصیتوں کے چرچے رات دن ہوتے رہتے ہیں اور اس سے ان کی دلچسپی کبھی ختم نہیں ہوتی۔

اکثر حالات میں شرک خفی، شرک جلی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بظاہر برا نہ دکھائی دینے کی وجہ سے اکثر لوگ اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو شرک جلی کے خلاف لسانی اور قلمی جہاد ہی کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں (البقرہ ۱۶۵) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ ہدایت یافتہ وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے (التوبہ ۱۸) اس سے معلوم ہوا کہ توحید یہ ہے کہ شدید محبت اور شدید خوف کا تعلق صرف ایک اللہ سے ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں شرک یہ ہے کہ آدمی اپنی شدید محبت اور اپنے شدید خوف کا مرکز اللہ کے سوا کسی اور کو بنا لے، خواہ وہ کوئی زندہ ہو یا مردہ۔

اس معیار پر جانچئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے لوگ جو اپنے کو شرک سے محفوظ سمجھتے ہیں وہ دراصل کچھ علامات شرک سے محفوظ ہیں نہ کہ فی الواقع حقیقت شرک سے۔

عمل کا فرق

ایک ایسا کمپوٹر بنایا جاسکتا ہے جو اپنی صورت کے اعتبار سے بالکل انسان کی طرح دکھائی دیتا ہو۔ اس سے آپ کہیں کہ "پانی لاؤ" اور وہ چل کر مقررہ مقام پر جائے اور وہاں سے پانی کا گلاس لاکر آپ کو پیش کردے۔ مگر کمپوٹر کے اس عمل پر اس کے لئے کوئی جزا نہیں ہے۔

دوسری طرف ایک انسان ہے۔ اس نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ پیاس سے بیتاب ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر اسے رحم آگیا۔ وہ روانہ ہوا کہ ٹھنڈا پانی لاکر اس پیاسے آدمی کو پلائے۔ اس وقت اس کے دل میں جذبات کا طوفان برپا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا: خدایا تو اس دن مجھے ٹھنڈا پانی پلا جس دن تیرے سوا کسی کے پاس پانی نہ ہوگا۔ اس دن مجھ کو اپنے سایہ میں لے لے جس دن تیرے سوا کسی کے لئے سایہ نہ ہوگا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لیا اور اس کو لے کر پیاسے کے پاس اس حال میں آیا کہ ایک طرف بھرے ہوئے پانی سے گلاس چھلک رہا تھا۔ اور دوسری طرف خدا کے خوف سے آنسوؤں کا طوفان اس کی آنکھوں میں امڈ رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ آدمی کا یہ عمل اللہ کو اتنا زیادہ پسند آجائے کہ اسی عمل پر اس کی بخشش ہو جائے۔

کمپوٹر اور انسان میں یہ فرق کیوں ہے۔ جو کام انسان نے کیا وہی کام کمپوٹر نے بھی کیا۔ مگر انسان کو ایک گلاس پانی کے بدلے جنت دے دی گئی۔ جب کہ کمپوٹر کو اسی قسم کے ایک گلاس پانی پر کوئی انعام نہیں ملا۔ اس کی وجہ جذبہ کا فرق ہے۔ کمپوٹر کا عمل بے شعوری کی سطح پر تھا اور انسان کا عمل شعور کی سطح پر۔ کمپوٹر نے بے حسی کے تحت اپنا کام انجام دیا اور انسان نے احساس کے تحت۔ اسی فرق کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک کو اپنے کام پر کوئی جزا نہیں ملی اور دوسرے کو اسی عمل پر ابدی جنت لکھ دی گئی۔

یہی وہ فرق ہے جس کو شریعت میں قساوت اور احتساب کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قساوت کا مطلب ہے بے حسی۔ اس سے مراد وہ عمل ہے جو محض ظاہری اعضاء سے انجام دیا جائے۔ جس میں انسان کی اپنی نفسیات شامل نہ ہو۔ اس کے مقابلہ میں احتساب کا مطلب ہے اللہ کی رضا کو سامنے رکھ کر کوئی کام کرنا۔

قساوت اور احتساب کا یہ فرق تمام معاملات میں ہے۔ کوئی بھی دینی عمل اللہ کے یہاں اسی وقت مقبول ہوتا ہے جب کہ وہ حساسیت کی سطح پر انجام دیا گیا ہو، بے حسی کی سطح پر کیا ہوا عمل ایک قسم کا مشینی عمل ہے اور مشینی عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مطلوب نہیں۔

کتنا فرق

سترھویں صدی میں جب کہ مغربی قومیں ایشیا اور افریقہ میں داخل ہوئیں، ان سے پہلے ان کے سیاح کثرت سے اِن ملکوں میں آئے۔ انھوں نے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں، لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ لمبی لمبی مدت تک یہاں رہے۔ اس کے بعد انھوں نے یہاں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے کتابیں لکھیں اور اپنی حکومتوں اور اپنی قوموں کو یہاں کے حالات سے باخبر کیا۔

انھیں میں سے ایک فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر (Bernier) ہے۔ وہ ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ طبیب تھا۔ اس کے طب نے اس کو موقع دیا کہ وہ جہاں جائے وہاں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان گھل مل کر رہ سکے۔ وہ اپنے اس فن کی وجہ سے اعلیٰ شخصیتوں تک رسائی کے قابل ہوگیا۔ برنیر ۱۶۲۰ء میں پیدا ہوا۔ ۱۶۴۷ میں اس نے جرمنی، پولینڈ، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی سیاحت کی اور ان ملکوں کی سماجی اور سیاسی زندگی کو قریب سے دیکھا۔ ۱۶۵۴ میں برنیر ایشیا کے لئے روانہ ہوا۔ چند سال تک شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں گھوما اور ۱۶۵۸ میں ہندستان میں سورت کی بندرگاہ پر اترا۔ یہ شاہ جہاں کا آخری زمانہ تھا اور اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ جاری تھی۔

برنیر ہندستان میں چودہ سال تک رہا۔ یہاں وہ سورت سے لے کر کشمیر تک بے شمار بستیوں میں گیا اور ہندستانی زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے پلوٹارک کے اس قول پر عمل کیا ہے کہ جزئی اور معمولی باتوں کو بھی ضرور جاننا چاہئے۔ کسی قوم کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے وہ بڑی بڑی باتوں سے زیادہ کارآمد ہیں۔ ہندستان سے واپس ہو کر برنیر جب فرانس پہنچا تو اس نے فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم (Louis XIV) کے سامنے اپنا سفرنامہ ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا: دریائے سین سے نکل کر دجلہ، فرات، سندھ یا گنگا جہاں بھی میں پہنچا، فرانس اور اس کے شہنشاہ کے بارے میں لوگوں کی بہت اونچی رائے پائی۔

ہندستان کے شہروں کا گہرا جائزہ لینے کے بعد برنیر نے لکھا: یہاں کے شہر اور قصبے خواہ اس وقت بظاہر خستہ حال اور ویران نہ ہوں مگر ایسا شہر کوئی نہیں جس میں جلد تباہ اور خراب ہو جانے کی علامتیں نہ پائی جاتی ہوں (۲۲۷) ہندستان کی اس وقت کی فوجوں کے بارے میں اس نے لکھا: جب میں ان بے ترتیب فوجوں کو دیکھتا تھا کہ حیوانوں کے گلوں کی مانند چلتی ہیں تو ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے صرف ۲۵ ہزار تجربہ کار سپاہی پرنس کونڈی یا مارشل تورین کی قیادت میں ہندستان کی فوج پر، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں

نہ ہو، غالب آسکتے ہیں (۵۵) برنیر نے اپنے تقریباً ۵۰۰ صفحات کے سفر نامہ میں لکھا کہ ہندستان میں تخت نشینی کے لئے جنگ ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ جانشینی کے واضح اصول نہ ہونے کی وجہ سے کسی شہزادہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ یا تو خود تخت حاصل کرے یا اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس نے لکھا کہ شاہی امراء کا اعزاز موروثی نہ ہونے کی وجہ سے یہاں ایک مستقل طبقہ امرار وجود میں نہیں آپاتا۔ جب تک ایسا نہ ہوگا سیاسی نظام کا استحکام ممکن نہیں ہے۔ وغیرہ

مغربی ملکوں کے سیاح جس زمانہ میں اپنی قوموں اور بادشاہوں کو اس قسم کی معلومات دے رہے تھے ٹھیک اسی زمانہ میں ہمارے یہاں کیا حال تھا۔ عین اس زمانہ میں لال قلعہ کے حکمراں کو اس کے قصیدہ خواں شاہ جہاں کا خطاب دے رہے تھے اور اس کے ذہن پر یہ تصور بٹھا رہے تھے کہ جو ہندستان کا بادشاہ ہے وہی سارے عالم کا بادشاہ ہے۔ اورنگ زیب کے استاد ملا محمد صالح اپنے شاگرد شہزادہ کو یہ بتا رہے تھے کہ یورپ بس ایک چھوٹے سے جزیرے کے برابر ہے، فرانس اور اندلس کے بادشاہ ایسے ہی ہیں جیسے ہندستان کے چھوٹے چھوٹے راجہ۔ وہ اورنگ زیب کو ایسے فلسفہ اور منطق کا ماہر بنا رہے تھے جو جنگی تقابلوں طرز حکمرانی اور قوموں کے ترقی و تنزل کو سمجھنے میں کام آنا تو درکنار اس قابل بھی نہ تھا کہ وہ آدمی کے اندر ایسا ذہن بنائے جو دلیل صحیح کے بغیر کسی چیز کو تسلیم نہ کرے اور اپنے اور غیر کے بارے میں حقیقی بنیادوں پر رائے قائم کر سکے۔ برنیر نے اپنے سفر نامہ میں تفصیل سے بتایا ہے کہ مغل شہزادوں کی تعلیم و تربیت کتنے غیر حقیقی انداز میں دی جاتی ہے (۵۶)

یہ تین سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ آج بھی صورت حال ہمارے یہاں زیادہ مختلف نہیں۔ آج جب کہ دوسری قوموں کے رہنما اپنی قوموں کو حقیقت پسندی کا سبق دے رہے ہیں، مسلم قائدین ہر جگہ مسلمانوں کو جذبات کی شراب پلانے میں مشغول ہیں۔ کوئی پر اسرار عملیات میں کامیابی کا راز بتا رہا ہے کوئی شاعری اور خطابت میں۔ کوئی جلسہ جلوس میں ترقی کا راستہ دکھا رہا ہے اور کوئی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں۔ کوئی تجویزوں اور بیانات کے ذریعہ ملت کی تعمیر کا یقین دلا رہا ہے اور کوئی دوروں اور تقریروں کے ذریعہ ——— ہمارے یہاں "ملا محمد صالح" تو بے شمار ہیں۔ مگر "ڈاکٹر برنیئر" کوئی ایک بھی نہیں۔ پوری ملت ایسے افراد سے خالی نظر آتی ہے جو آج کی دنیا کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں اور خالص واقعاتی انداز میں وقت کے حقائق سے ملت کو باخبر کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملا محمد صالح بننے کے لئے تو صرف ابن الوقتی کا سرمایہ کافی ہے، جب کہ ڈاکٹر برنیئر بننے کے لئے پُر مشقت عمل درکار ہے، اور اپنے کو مشقت میں ڈالنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

لشکر کا کام خط سے

یزید کے زمانہ میں عراق کا گورنر ابن زیاد تھا۔ وہ اسلامی تاریخ کا ایک بدنام شخص ہے۔ تاہم اس کے ایک واقعہ میں بڑی نصیحت ہے۔

اس کے زمانہ میں بعض سرحدی علاقوں میں بغاوت ہوگئی۔ اس کے درباریوں نے کہا کہ ہم کو فوراً لشکر بھیجنا چاہیے ورنہ باغی ہتھیار نہ رکھیں گے۔ ابن زیاد نے کہا کہ لشکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ایک خط بھیجتے ہیں اور وہ خط ہی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے کافی ہو جائے گا۔ اس موقع پر اس نے جو جملہ کہا تھا وہ عربی زبان میں اس مفہوم کے لئے ضرب المثل بن گیا ہے۔ اس نے کہا:

کتابٌ ینوبُ عن کتائب ایک خط لشکر کا قائم مقام ہے

اس کے بعد ابن زیاد نے ایک دھمکی کا خط باغیوں کے نام روانہ کیا اور خط پاتے ہی انھوں نے گھبرا کر اپنی بغاوت ختم کر دی۔

ابو فراس حمدانی نے عباسی خلیفہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا۔ اس میں وہ اسی قسم کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اذا ما أرسلَ الامراء جیشا الی الاعداء ارسلنا الکتابا

دوسرے امراء جہاں اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے لشکر بھیجتے ہیں وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں

یہی گہری سیاست کا راز ہے۔ سیاست یہ نہیں ہے کہ جہاں کوئی حریف نظر آئے اس سے براہ راست لڑائی چھیڑ دی جائے۔ یہ بیوقوفوں کی سیاست ہے جس کے نتیجہ میں خون خرابہ کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ عقل مند آدمی کی سیاست ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنایا جائے کہ جب کسی کی طرف سے کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اس کے نام ایک وارننگ لکھ کر بھیج دینا کافی ہو۔ لڑے بھڑے بغیر محض دھمکی سے معاملہ ختم ہو جائے۔

دشمن کے خلاف طاقت کا استعمال ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ دشمن کی طاقت کو اپنے خلاف استعمال کئے جانے کا خطرہ مول لیا جائے۔ دوطرفہ استعمال طاقت کے بعد فاتح کو بھی کھنڈر کے اوپر اپنا جشن فتح منانا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی لڑنے کے لئے مجبور کر دیا جاتا ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ سب سے بُری فتح وہ ہے جو لڑ کر حاصل ہو اور سب سے اچھی فتح وہ ہے جو لڑے بغیر آدمی کے حصہ میں آجائے۔

محفوظ سفر

جولائی ۱۹۶۹ میں امریکہ نے انسان بردار راکٹ چاند کی طرف بھیجا تھا۔ اس راکٹ کی خبروں میں بتایا گیا تھا کہ جب اس کی پہلی منزل کا انجن داغا گیا تو ایک بے حد ہولناک آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز اتنی تیز تھی کہ اس نے ایک سو میل کے رقبہ کو ہلا دیا۔ مگر جو خلا باز اس راکٹ میں سفر کر رہے تھے، ان کو صرف دس سکنڈ بعد یہ آواز سنائی دینا بند ہو گئی۔ وہ کان کے پردے پھاڑ دینے والی اس آواز سے محفوظ ہو کر اپنے سفر پر رواں ہو گئے۔

ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کی وجہ انسان بردار راکٹ کی تیز رفتاری تھی۔ آواز معمولاً ہوا کے ذریعہ پھیلتی ہے، اس لئے اس کی رفتار سات سو میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جب کہ راکٹ کی رفتار ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ سے بھی زیادہ تھی۔ رفتار کے اس فرق کی وجہ سے ایسا ہوا کہ صرف دس سکنڈ بعد راکٹ اس خوفناک آواز کی زد سے باہر جا چکا تھا۔ آواز سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی اور راکٹ ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ اس فرق کا یہ نتیجہ ہوا کہ ابتدائی لمحات کے بعد راکٹ کے پھٹنے کی آواز خلا بازوں کے کنٹرول روم تک پہنچنا بند ہو گئی۔ خلا باز بھیانک آواز پیدا کرنے والی سواری میں سفر کر رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود اس کی بھیانک آواز سے ان کے کان محفوظ تھے۔

اسی طرح ہر شخص اور ہر قوم کی زندگی میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ناخوش گوار حالات اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اب اگر وہ اپنی جدوجہد کی رفتار اتنی تیز کر لے کہ ناخوش گوار حالات کے مقابلہ میں اس کی رفتار بڑھ جائے تو وہ ان کی زد سے نکل جائے گا، وہ ان سے اسی طرح محفوظ ہو جائے گا جس طرح خلا باز اپنے راکٹ کے پھٹنے کی طوفانی آواز سے محفوظ ہو گئے۔

زندگی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ایک شخص یا قوم کے لئے ممکن ہے کہ یہاں بھی وہ ایسا سفر کر سکے جس میں وہ دوسروں کی زد سے محفوظ ہو۔ اگر دوسرے جلد بازی کی رفتار سے چل رہے ہوں اور آپ صبر کی رفتار سے چلنے لگیں۔ دوسرے منفی کارروائیوں کی بنیاد پر اٹھے ہوں اور آپ مثبت عمل کا طریقہ اختیار کریں۔ دوسرے مادی طاقت کے سہارے بڑھیں اور آپ اخلاقی طاقت کے زور پر کھڑے ہوں۔ دوسرے ظاہری انسان سے ٹکرا رہے ہوں اور آپ اندرونی انسان کو اپنا نشانہ بنائیں۔ تو یقینی ہے کہ آپ لوگوں کی زد سے اسی طرح باہر ہوں گے جس طرح راکٹ سوار اپنے راکٹ کی بھیانک آواز سے۔

سڑک بند ہے

سڑک کی مرمت ہورہی ہو تو سڑک کے درمیان میں ایک بورڈ لگا دیا جاتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے "سڑک بند ہے" مگر اس کا مطلب کبھی یہ نہیں ہوتا کہ سرے سے راستہ بند ہوگیا ہے اور اب آنے جانے والے اپنی گاڑی روک کر کھڑے ہوجائیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ "یہ سامنے کی سڑک بند ہے" ہر شخص کو اس قسم کے بورڈ کے معنی معلوم ہیں۔ چنانچہ سواریاں جب وہاں پہنچ کر بورڈ کو دیکھتی ہیں تو وہ ایک لمحہ کے لئے نہیں رکتیں۔ وہ دائیں بائیں گھوم کر اپنا راستہ نکال لیتی ہیں اور آگے جاکر دوبارہ سڑک پکڑ لیتی ہیں۔ اور اگر کسی وجہ سے دائیں بائیں راستہ نہ ہو تب بھی سواریوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ اطراف کی سڑکوں سے اپنا سفر جاری رکھتی ہیں۔ کچھ دور آگے جاکر دوبارہ انھیں اصل سڑک مل جاتی ہے اور اس پر اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے وہ منزل پر پہنچ جاتی ہیں۔ اس طرح کچھ منٹوں کی تاخیر تو ضرور ہوسکتی ہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان کا سفر رک جائے یا وہ منزل پر پہنچنے میں ناکام رہیں۔

یہی صورت زندگی کے سفر کی بھی ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس کا راستہ بند ہے۔ مگر اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سامنے کا راستہ بند ہے نہ کہ ہر طرف کا راستہ بند۔ جب بھی ایک راستہ بند ہو تو دوسرے بہت سے راستے کھلے ہوئے ہوں گے۔ عقل مند شخص وہ ہے جو اپنے سامنے "سڑک بند ہے" کا بورڈ دیکھ کر رک نہ جائے بلکہ دوسرے راستے تلاش کرکے اپنا سفر جاری رکھے۔

ایک میدان میں مواقع نہ ہوں تو دوسرے میدان میں اپنے لئے مواقع کار تلاش کرلیجئے۔ حریف سے براہ راست مقابلہ ممکن نہ ہو تو بالواسطہ مقابلہ کا طریقہ اختیار کیجئے۔ آگے کی صف میں آپ کو جگہ نہ مل رہی ہو تو پیچھے کی صف میں اپنے لئے جگہ حاصل کرلیجئے۔ ٹکراؤ کے ذریعہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہ آتا ہو تو مصالحت کے ذریعہ مسئلہ کے حل کی صورت نکال لیجئے۔ دوسروں کا ساتھ حاصل نہ ہورہا ہو تو تنہا اپنے کام کا آغاز کردیجئے۔ چھت کی تعمیر کا سامان نہ ہو تو بنیاد کی تعمیر میں اپنے کو لگا دیجئے۔ بندوں سے ملتا ہوا نظر نہ آتا ہو تو خدا سے پانے کی کوشش کیجئے —— ہر بند سڑک کے پاس ایک کھلی سڑک بھی ہوتی ہے۔ مگر اس کو وہی لوگ پاتے ہیں جو آنکھ والے ہوں۔

اخلاق کی طاقت

خوش اخلاقی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس سے آپ کا کوئی تعلق ہو یا جس سے کوئی فائدہ وابستہ ہو اس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنا۔ دوسرے یہ کہ خوش اخلاقی کو اپنی عام عادت بنا لینا اور ہر ایک سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنا، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ خوش اخلاقی کی پہلی قسم سے بھی آدمی کو کچھ نہ کچھ فائدہ ملتا ہے۔ مگر خوش اخلاقی کی دوسری قسم کے فائدے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

مسٹر اجوانی ۱۹۶۵ میں کلکتہ کی ایک بڑی دواساز فرم میں سیلز مین مقرر ہوئے۔ ان سے پہلے جو شخص ان کی جگہ پر کام کر رہا تھا اس کو ۱۲ سو روپے تنخواہ اور آمد و رفت کے لئے ریلوے کا کرایہ ملتا تھا۔ اجوانی نے کہا کہ میں تین ہزار روپے مہینہ لوں گا اور ہوائی جہاز سے سفر کروں گا۔ کارخانہ کے ڈائرکٹر نے کہا کہ یہ تو بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا: میں کام بھی بہت زیادہ دوں گا۔ آپ ایک بار تجربہ کر کے دیکھئے۔ بالآخر ان کا تقرر ہو گیا اور گجرات کا علاقہ ان کے سپرد ہوا۔

اس زمانہ میں گجرات میں ایک لیڈی ڈاکٹر تھی جس کی پریکٹس بہت کامیاب تھی اور اس کے یہاں دواؤں کی کھپت بہت زیادہ تھی۔ مگر وہ کسی مرد ایجنٹ سے نہیں ملتی تھی۔ ایک دواساز ادارہ کا ایجنٹ ایک بار اس کے یہاں آیا۔ باتوں کے دوران اس نے بتایا کہ میں پامسٹری جانتا ہوں اور ہاتھ بھی دیکھتا ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ ایجنٹ نے دیکھ کر کہا کہ آپ کے ہاتھ کی ریکھائیں بہت اچھی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اس واقعہ کے بعد لیڈی ڈاکٹر کو مرد ایجنٹوں سے نفرت ہو گئی اور اس نے اپنے دواخانہ میں مرد ایجنٹوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا۔

مسٹر اجوانی اپنے تجارتی سفر پر مذکورہ شہر کے لئے روانہ ہوئے تو کمپنی کے ڈائرکٹر سے لیڈی ڈاکٹر کا ذکر آیا۔ مسٹر اجوانی نے کہا کہ میں اس سے بھی آرڈر لوں گا۔ ڈائرکٹر نے اس کو ان کی سادگی پر محمول کیا۔ اس نے کہا کہ اس سے آرڈر لینا بالکل ناممکن ہے۔ لیڈی ڈاکٹر اس بارے میں اتنا زیادہ مشہور ہو چکی تھی کہ لوگوں نے اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر اجوانی اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہوائی جہاز میں ان کی سیٹ سے ملی ہوئی سیٹ پر ایک بوڑھی خاتون تھیں۔ راستہ میں ایسا ہوا کہ بوڑھی خاتون کو کھانسی اٹھی اور کف آنے لگا۔ بوڑھی خاتون پریشان ہوئی۔ مسٹر اجوانی کو اپنی عام اخلاقی عادت کے مطابق اس خاتون سے ہمدردی پیدا ہوئی اور انھوں نے فوراً اپنا رومال اس

کے منھ کے سامنے کر دیا۔ اس کا کف اپنے رومال پر لے لیا اور پھر غسل خانہ میں جاکر اسے دھولیا۔ خاتون اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئی۔ اس خاتون کو بھی وہیں جانا تھا جہاں مسٹر اجوانی جارہے تھے۔ ہوائی جہاز جب وہاں پہنچا اور بوڑھی خاتون باہر آئی تو وہ یہ دیکھ کر پریشان ہوئی کہ اس کو لینے کے لئے کوئی ہوائی اڈہ پر نہیں آیا ہے۔ یہ خاتون کسی بڑے گھر سے تعلق رکھتی تھی اور اس کو لینے کے لئے کار آنا چاہئے تھی۔ مگر اس کی آمد کی صحیح اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے اس کے گھر سے کار نہ آسکی۔ مسٹر اجوانی نے یہاں دوبارہ اس کی مدد کی۔ انھوں نے کہا کہ میں ہوٹل جانے کے لئے ٹیکسی کر رہا ہوں۔ آپ اس پر بیٹھ جائیں۔ میں پہلے آپ کو آپ کے گھر اتار دوں گا۔ اس کے بعد اپنے ہوٹل پر جاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے بوڑھی خاتون کو اپنی ٹیکسی پر بٹھایا اور اس کو لے کر اس کے گھر پہنچے۔ خاتون نے اپنے گھر پہنچ کر ان کا نام اور پتہ پوچھا۔ انھوں نے اپنا نام اور ہوٹل کا پتہ لکھ کر دے دیا اور پھر اپنے ہوٹل آ گئے۔

کچھ دیر کے بعد بوڑھی خاتون کی لڑکی اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچی تو دیکھا کہ اس کی ماں آئی ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم کو آپ کی آمد کی خبر نہ تھی اس لئے گاڑی ہوائی اڈہ پر نہ جاسکی۔ آپ کو تو بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔ ماں نے کہا کہ نہیں مجھ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور اس کے بعد اس نے مسٹر اجوانی کی پوری کہانی سنائی۔ یہ سن کر لڑکی بہت متاثر ہوئی۔ اس نے فوراً مذکورہ ہوٹل کو ٹیلی فون کر کے مسٹر اجوانی سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ ہم آپ کے بہت مشکور ہیں اور رات کا کھانا آپ ہمارے یہاں کھائیں۔ مسٹر اجوانی مقررہ پروگرام کے مطابق خاتون کے مکان پر پہنچ گئے۔ جب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے اور تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ بوڑھی خاتون کی لڑکی وہی لیڈی ڈاکٹر ہے جس کو مرد ایجنٹوں سے نفرت تھی اور وہ مرد ایجنٹوں سے ملاقات تک کی روادار نہ تھی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ مسٹر اجوانی دواساز کمپنی کے سیلزمین ہیں تو اسی وقت اس نے خود اپنی طرف سے دواؤں کا ایک بڑا آرڈر لکھوا دیا۔ اور کہا کہ ہمارے یہاں دواؤں کی بہت کھپت ہے۔ آپ تو ہم کو مستقل گاہک سمجھ لیجئے اور ہر مہینہ دوائیں بھیجتے رہئے۔

مسٹر اجوانی کھانے اور ملاقات سے فارغ ہو کر ہوٹل واپس آئے اور اسی وقت کلکتہ میں اپنے ڈائرکٹر کو ٹرنک کال کیا۔ انھوں نے اپنے ڈائرکٹر کو ٹیلی فون پر بتایا کہ مذکورہ لیڈی ڈاکٹر سے میں نے اتنے ہزار کا آرڈر حاصل کرلیا ہے۔ ڈائرکٹر نے فوراً کہا تم غلط کہہ رہے ہو۔ ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا۔ تاہم اگلی ڈاک سے جب ڈائرکٹر کے پاس مذکورہ لیڈی ڈاکٹر کا چک اور اس کا دستخط شدہ آرڈر پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ واقعہ بالفعل پیش آچکا ہے جس کو وہ اب تک ناممکن سمجھے ہوئے تھا۔

۱۲ نومبر ۱۹۸۰ کی ملاقات میں میں نے مسٹر اجوانی سے پوچھا کہ آپ کو تجارت کا بہت تجربہ ہے۔ یہ بتائیے کہ تجارت میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: میٹھی زبان، اچھا سلوک۔ میں نے کہا ہاں، اور اس وقت بھی جب کہ بظاہر اس کا کوئی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔ میٹھی زبان اور اچھا سلوک ہر حال میں مفید ہے، لیکن اگر آدمی کا عام اخلاق بن جائے تو اس کے فائدوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

مزاج کی اہمیت

ٹوائیٹا موٹر کمپنی جاپان کی ایک کار بنانے والی کمپنی ہے۔ پچھلے تقریباً ۳۰ سال میں کام کا ایک دن ضائع کئے بغیر اس نے اپنا پیداواری عمل جاری رکھا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاپان میں صنعتی ترقی کی اتنی تیز رفتاری کی وجہ کیا ہے۔ امریکہ کی جنرل موٹرس کارپوریشن اور فورڈ موٹر کمپنیز دنیا کی سب سے بڑی موٹر ساز کمپنیاں سمجھی جاتی ہیں۔ مگر امریکہ کی ان کمپنیوں میں سالانہ پیداوار کا اوسط فی مزدور گیارہ کاریں ہیں۔ جب کہ جاپان کی مذکورہ موٹر کمپنی میں سالانہ پیداوار کا اوسط فی مزدور ۳۱ کاریں ہیں۔

جاپان کی اس غیر معمولی صنعتی ترقی کا راز اس کے مزدور ہیں۔ جاپانی مزدور کا تعمیری مزاج جاپان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان میں اگرچہ کوئلہ، لوہا، پٹرول اور دوسری دھاتیں یا تو بالکل پیدا نہیں ہوتیں یا بہت کم پیدا ہوتی ہیں اس کے باوجود جاپان کی صنعتی ترقی کی رفتار دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ جاپانی مزدور کے مزاج میں وہ کون سی بات ہے جو جاپان کے لئے سب سے بڑی دولت بن گئی ہے۔ ایک مبصر کے الفاظ میں وہ حسب ذیل ہے:

> A national spirit of compromise and co-operation and a willingness to endure short-term setbacks for the long-term good of the nation, company or a family.

جاپانیوں کی یہ قومی سیرت کہ وہ ہمیشہ مصالحت اور تعاون کے لئے تیار رہتے ہیں۔ قوم یا کمپنی یا خاندان کے وسیع تر مفاد کی خاطر وہ وقتی نقصان کو سہنے کے لئے راضی ہو جاتے ہیں۔ (ہندستان ٹائمس ۲۰ اگست ۱۹۸۱)

کسی قوم کی تعمیر میں سب سے اہم چیز اس کے افراد کا مزاج ہے۔ افراد کا مزاج اگر بگڑا ہوا ہے تو قوم کو تباہ ہونے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی اور اگر افراد کا مزاج درست ہے تو ایسی قوم ضرور کامیاب ہو کر رہتی ہے خواہ اس کے دشمنوں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

قوم کی تعمیر میں افراد کا درجہ وہی ہے جو کسی عمارت میں اینٹوں کا ہے۔ کچی اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت بالکل بے اعتبار عمارت ہوتی ہے۔ کوئی بھی حادثہ اسے گرا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو عمارت پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہو اس پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ سیلاب اور طوفان کے علی الرغم زمین پر کھڑی رہتی ہے۔ ہر آندھی جو آتی ہے وہ اس سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے، وہ اس کا کچھ بگاڑنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

تھوڑا وقت زیادہ کام

سرسید احمد خاں (۱۸۹۸ — ۱۸۱۷) نے ایک بار اپنی تقریر میں کہا: وقت کم ہے اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوجاتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں (لکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین، ۱۸۹۰، صفحہ ۲۴۲)

سرسید نے جو بات اپنے لئے کہی وہی بات ہر ایک کے لئے صحیح ہے۔ ہر انسان اس مسئلہ سے دوچار ہے کہ اس کی زندگی بہت مختصر ہے۔ مگر اس کی ذمہ داریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی حد نہیں۔ آدمی کو تھوڑے سے وقت میں بہت زیادہ کام کرنا ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو وہ اپنے اوقات کے معاملہ میں بے حد سنجیدہ ہوجائے، نہ صرف غیر ضروری بلکہ کم ضروری کاموں سے بھی دور رہ کر وہ صرف انتہائی ضروری کاموں میں مشغول رہے۔

پھر اگر اس معاملہ کو آخرت تک لے جائیے تو معاملہ اور زیادہ نازک ہوجاتا ہے۔ آخرت ایک ابدی جگہ ہے وہاں آدمی کو ہمیشہ ہمیش تک رہنا ہے۔ مگر آخرت کے لئے کام کرنے کا موقع آدمی کو صرف اس محدود مدت تک ملتا ہے جب کہ وہ موجودہ دنیا میں رہ رہا ہے۔ اس دنیا سے اٹھتے ہی آخرت کے لئے عمل کرنے کا موقع ختم ہوجائے گا۔ موجودہ دنیا میں آدمی کی عمر کتنی کم ہوتی ہے اور اس کا انجام اس کو کتنی زیادہ لمبی مدت تک بھگتنا ہے، آدمی کو اگر واقعی معنوں میں اس کا احساس ہوجائے تو وہ اتنا زیادہ محتاط اور سنجیدہ ہوجائے کہ اپنے اوقات کا ایک لمحہ ضائع کرنا بھی اس کو ایسا معلوم ہو کہ جیسے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

ایک مزدور کے پاس صرف اتنا پیسہ ہو جس سے وہ اپنی دو وقت کی روٹی کا انتظام کرسکے تو وہ اس پیسہ کو محفل رقص کا ٹکٹ خریدنے میں ضائع نہیں کرے گا۔ کسی پیدل مسافر کے پاس اگر اتنا ہی وقت ہو کہ وہ رات کے اندھیرے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جائے تو وہ راستہ کی تفریح میں مشغول ہو کر یہ خطرہ مول نہیں لے گا کہ رات کا اندھیرا چھا جائے اور وہ اپنے گھر نہ پہنچ سکے۔

مگر آدمی جس بات کو اپنی دنیا کے معاملہ میں بخوبی جانتا ہے اسی کو وہ آخرت کے معاملہ میں بالکل بھول جاتا ہے۔ آدمی کے پاس آخرت کے عمل کے لئے تھوڑا وقت اور بہت معمولی اثاثہ ہے۔ مگر ہر ایک اس کو وقتی تماشوں میں اس طرح ضائع کر رہا ہے جیسے کہ اسے آخرت کی کوئی خبر ہی نہیں۔

جب یہ نوبت آجائے

انگلستان کا بادشاہ رچرڈ اول (۱۱۵۷ — ۱۱۹۹) جس نے تیسری صلیبی جنگ لڑی، وہ ایک بڑی فوج لے کر شاہ مصر صلاح الدین ایوبی (۱۱۳۷ — ۱۱۹۳) کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ رچرڈ کی فوج کے افسانے اس طرح مشہور ہو رہے تھے کہ مسلمانوں کی فوج میں پست ہمتی کے آثار پیدا ہو گئے۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنے دو خاص جاسوسوں کو طلب کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور رچرڈ کی فوج کے حالات معلوم کریں۔ جاسوس بھیس بدل کر روانہ ہوئے اور عیسائی فوج میں داخل ہو گئے۔ ایک رات اور ایک دن انھوں نے اِدھر اُدھر پھر کر عیسائی فوج کا جائزہ لیا۔ واپس آکر انھوں نے صلاح الدین ایوبی کو خبر دی کہ ہم نے عیسائی لشکر کے خیموں میں دو باتیں خاص طور پر دیکھیں۔ ایک یہ کہ ان کے فوجی شراب و کباب میں مست ہیں اور رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ فوج کے ساتھ جو پادری آئے ہیں وہ مذہبی بحثوں میں مشغول ہیں۔ ہم نے ان کو اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے پایا کہ حضرت عیسیٰ کا پیشاب پاخانہ پاک تھا یا ناپاک۔

صلاح الدین ایوبی نے یہ روداد سننے کے بعد اپنے فوجی افسروں کو بلایا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: خدا کی قسم عیسائی فوج رسوا ہو کر رہے گی۔ جس قوم کا یہ حال ہو کہ اس کے خواص عیش و عشرت میں غرق ہوں اور اس کا مذہبی طبقہ اپنے پیشواؤں کی فضیلت پر بحث مباحثہ میں مشغول ہو، خدا کے یہاں اس کا یہی انجام مقدر ہے۔ تم خدا کے بھروسہ پر آگے بڑھو۔ یقیناً تم ہی کامیاب ہو گے۔ اس کے بعد صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں اس کی فوج آگے بڑھی اور عیسائی فوج کو ایسی سخت شکست دی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

کسی قوم کے کمزور اور زوال یافتہ ہونے کی یہ خاص پہچان ہے کہ اس کے مذہبی رہنما فضول قسم کی مذہبی بحثوں میں مشغول ہوں اور اس کے دنیوی رہنما فضول قسم کی عیاشیوں میں۔ فضول قسم کی مذہبی بحثیں اس بات کی علامت ہیں کہ آدمی کا رشتہ معنوی حقیقتوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے پاس مذہب کا خول باقی رہ گیا ہے نہ کہ اس کی حقیقت۔ پھر جو لوگ الفاظ کی دنیا میں جی رہے ہوں وہ حقیقت کی دنیا میں کوئی کارنامہ کس طرح دکھا سکتے ہیں۔ اسی طرح قوم کے بڑوں کا فضول عیاشیوں میں مشغول ہونا اس بات کی علامت ہے کہ زندگی ان کے نزدیک خوش باشی کا نام ہے نہ کہ جدوجہد کا۔ وہ ذاتی خواہش میں جی رہے ہیں نہ کہ زندگی کے وسیع تر تقاضوں میں۔

طلسماتی مذہب ذہنی پستی پیدا کرتا ہے اور طلسماتی عیاشیاں عملی کمزوری۔ اور جن لوگوں میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں ان کو کوئی چیز تباہی سے بچا نہیں سکتی۔

معلومات نہیں، ذہنی رجحان

نوبل انعام کا حصول، سائنس کی دنیا میں، اعلیٰ ترین کارکردگی کا ایک مسلمہ معیار سمجھا جاتا ہے۔ یہ انعام کسی کو کیسے حاصل ہوتا ہے۔ کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ایچ۔ اے۔ کریبز (H. A. Krebs) نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اعلیٰ سائنس داں بننے کے لئے اعلیٰ ساز و سامان والی لیبارٹریوں اور جدید ترین لٹریچر پر مشتمل لائبریریوں سے بھی کہیں زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کچھ مدت کے لئے کسی بڑی سائنسی شخصیت کی صحبت و رفاقت میسر آجائے۔ "اگر مجھے اپنی جوانی کے ابتدائی چار سال" وہ لکھتا ہے "آٹو واربرگ (Otto Warburg) جیسے سائنس داں کی رفاقت میسر نہ آتی تو میرے اندر سائنس کا صحیح ذوق پیدا ہونا محال تھا"

کریبز مختلف بڑے سائنس دانوں کے اقوال پیش کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اعلیٰ سائنس دانوں کی صحبت جو سب سے بڑی چیز کسی کو دیتی ہے وہ سائنسی حقائق اور سائنسی طریقوں کے بارے میں معلومات کا انبار نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو ہر جگہ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ جو بات حقیقی فرق پیدا کرتی ہے، وہ دراصل فیضانِ نظر ہے جسے استاد اپنے شاگرد میں منتقل کرتا ہے۔ یہی فیضانِ نظر، جس کو وہ عمومی سائنسی روح (GReneral Scientific Spirit) کا نام دیتا ہے، کسی شخص کو سچا اسکالر بناتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک عظیم استاد یا سائنس داں اپنے شاگرد کے ذہن میں حقائق کے بارے میں معلومات سے کہیں زیادہ ایک ذہنی رویہ (Attitude)، منتقل کرتا ہے ۔۔۔ اس ذہنی رویہ میں دو باتیں بالخصوص بہت اہم ہیں۔ ایک عجز (Humility) دوسرا شوق (Enthusiasm)

عجز اور شوق دو سب سے بڑے زینے ہیں جن سے گزر کر آدمی اونچی ترقی کی منزل تک پہنچتا ہے۔ شوق آدمی کو اکساتا ہے کہ وہ کہیں رکے بغیر اپنا سفر جاری رکھے۔ شوق آدمی کے اندر تجسس کا جذبہ ابھارتا ہے جس کی وجہ سے وہ چیزوں کی حقیقت جاننے کی کرید میں رہتا ہے۔ تاہم جستجو کا شوق ہی کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ عجز بھی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ عجز کا مطلب ہے اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ سے کم سمجھنا۔ ایسا آدمی غلطی معلوم ہوتے ہی فوراً اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ وہ کسی بات کو ماننے سے کبھی اس لئے نہیں رکتا کہ اس کی وجہ سے اس کا وقار کم ہو جائے گا۔ وہ حق کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے نہ کہ کسی اور چیز کو۔

انسان کی تلاش

انسان کے اندر ایک عجیب خصوصیت ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں ۔ وہ ہے لامتناہی تلاش کا جذبہ ۔ ہر آدمی اپنے پیدائشی جذبہ کے تحت ایک ایسی نامعلوم چیز کی تلاش میں رہتا ہے جس کو اس نے پایا نہیں ۔ کوئی بھی کامیابی اس کو اس طلب کے بارے میں مطمئن نہیں کرتی ، کوئی بھی ناکامی اس کے اندر سے اس جذبہ کو فنا نہیں کر پاتی ۔ فلاسفہ اس کو آئیڈیل کی طلب کہتے ہیں ۔

یہ آئیڈیل کی طلب ہی تمام انسانی سرگرمیوں کی حقیقی اور آخری قوت محرکہ ہے ۔ اگر یہ طلب نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں اچانک ٹھپ ہو کر رہ جائیں ۔ انسانی ذہن کی یہی وہ زبردست طلب ہے جس کو فرائڈ نے غلط طور پر جنسی خواہش سے تعبیر کیا ۔ ایڈلر نے اس کو غلط طور پر حصول طاقت کی خواہش قرار دیا ۔ میک ڈوگل نے غلط طور پر کہا کہ یہ انسان کی تمام حیوانی جبلتوں کے مخلوطہ کا ایک پُراسرار نتیجہ ہے ۔ مارکس نے اس کو غلط طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ انسانی زندگی کی معاشی خواہش ہے اور یہی اس کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرتی ہے ۔ مگر ان توجیہات کو غلط قرار دینے کے لئے یہی واقعہ کافی ہے کہ یہ چیزیں جن لوگوں کو پوری طرح ملیں وہ بھی مطمئن نہ ہو سکے ۔ ان کی اندرونی ہستی بھی اسی طرح بے چین رہی جس طرح ان چیزوں سے محروم رہنے والے بے چین نظر آتے ہیں ۔

انسان ہزاروں برس سے اپنے اس آئیڈیل کو دنیا کی چیزوں میں تلاش کر رہا ہے ، مگر کوئی بھی شخص اس اطمینان سے دوچار نہیں ہوا کہ اس نے اپنی تلاش کا مکمل جواب پالیا ہے ۔ اس معاملہ میں بادشاہ یا امیر بھی اتنا ہی غیر مطمئن رہتا ہے جتنا کوئی بے زور اور مفلس آدمی ۔ یہ لمبا تجربہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ "نظر آنے والی" دنیا میں آدمی کی تلاش کا جواب موجود نہیں ۔ اس کا جواب اس "نظر نہ آنے والی" دنیا میں ہے جس کو آدمی محسوس تو کرتا ہے مگر دیکھ نہیں پاتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طلب خدا کی طلب ہے ۔ آدمی جس آئیڈیل کو پانے کے لئے بے قرار رہتا ہے وہ خود اس کا خالق ہے ۔ ہر آدمی جس چیز کی تلاش میں ہے وہ دراصل وہ خدا ہے جو اس کی روح میں سمایا ہوا ہے ۔ ہر آدمی اپنی فطرت کے تحت مسلسل خدا کی جستجو میں رہتا ہے وہ اپنے اس اندرونی جذبہ کے تحت دنیا کی مختلف چیزوں کی طرف دوڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید یہ چیز اس کی تلاش کا جواب ہو ۔ مگر جب وہ اس کو پالیتا ہے اور قریب سے اس کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز وہ نہیں جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا ۔

کیا تمھارا یہ گمان ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے حالاں کہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنھوں نے جہاد کیا اور جنھوں نے اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۱۶

موجودہ دنیا میں آدمی جب کسی چیز کو اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے تو اس کو حاصل کرنے میں طرح طرح کے مسائل اور تقاضے سامنے آتے ہیں۔ اگر آدمی کو اپنا مقصد عزیز ہے تو وہ ان مسائل کو عبور کرنے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے میں اپنی ساری قوت لگا دیتا ہے۔ اسی کا نام جہاد ہے۔ یہ جہاد اس دنیا میں ہر ایک کو پیش آتا ہے۔ ہر آدمی کو جہاد کی سطح پر اپنی طلب کا ثبوت دینا پڑتا ہے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی طلب میں کامیاب ہو۔ فرق یہ ہے کہ غیر مومن دنیا کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور مومن آخرت کی راہ میں۔

یہی جہاد یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے مقصد میں کتنا سنجیدہ ہے۔ ایک شخص جو ایمان کا مدعی ہو اس کے سامنے بار بار مختلف مواقع آتے ہیں جو اس کے دعوے کا امتحان ہوں۔ کبھی اس کا دل کسی کے خلاف بغض وحسد کے جذبات سے متاثر ہونے لگتا ہے اور اس کا ایمان اس سے کہتا ہے کہ اس قسم کے تمام جذبات کو اپنے اندر سے نکال دو۔ کبھی اس کی زبان پر ناپسندیدہ کلمات آتے ہیں اور ایمان کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت اپنی زبان کو پکڑ لیا جائے۔ کبھی معاملات کے دوران کسی کو ایسا حق دینا پڑتا ہے جو قلب کو بالکل ناگوار ہو مگر ایمان یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ حق دار کو انصاف کے مطابق اس کا پورا حق پہنچایا جائے۔ اسی طرح اسلام کی دعوت کبھی ایسے موڑ پر پہنچ جاتی ہے کہ ایمان یہ کہتا ہے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی جان و مال قربان کردو۔ ایسے تمام مواقع پر گریز یا فرار سے بچنا اور ہر قیمت پر ایمان واسلام کے تقاضے پورے کرتے رہنا، اسی کا نام جہاد ہے۔

جب کوئی شخص اسلام کے لئے مجاہد بن جائے تو اس کا تمام تر نفسیاتی تعلق اللہ اور رسول اور اہل ایمان سے ہو جاتا ہے۔ وہ ان کے سوا کسی کو اپنا ولیجہ نہیں بناتا۔ وَلَجَ کے معنی ہیں داخل ہونا۔ ولیجہ کسی وادی کے اس غار کو کہتے ہیں جہاں راستہ چلنے والے بارش وغیرہ سے پناہ لیں۔ اسی سے ولیجہ ہے، یعنی دلی دوست۔

موجودہ دنیا میں جب بھی آدمی کسی وسیع تر مقصد کو اپناتا ہے تو اس کو لازماً ایسا کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی مرکزیت سے وابستہ ہو۔ وہ اپنے قائد کا مکمل وفادار بنے۔ وہ اس راہ کے ساتھیوں سے پوری طرح جڑ جائے۔ مقصدیت کے احساس کے ساتھ یہ چیزیں لازم ملزوم ہیں۔ ان کے بغیر بامقصد زندگی کا دعویٰ بالکل جھوٹا ہے۔ اسی طرح آدمی جب دین کو سنجیدگی کے ساتھ اپنی زندگی میں داخل کرے گا تو لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ خدا اور رسول اور اہل ایمان اس کا "ولیجہ" بن جائیں گے۔ وہ ہر اعتبار سے ان کے ساتھ جڑ جائے گا۔ سنجیدگی کے ساتھ دین اختیار کرنے والے کے لئے اللہ اور رسول اور اہل ایمان، عملی طور پر ایسی وحدت کے اجزاء ہیں جن کے درمیان تقسیم ممکن نہیں۔

اس معاملہ کی نزاکت بہت بڑھ جاتی ہے جب یہ سامنے رکھا جائے کہ اس کی جانچ کرنے والا وہ ہے جس کو کھلے اور چھپے کا علم ہے، وہ ہر آدمی سے اس کی حقیقت کے اعتبار سے معاملہ کرے گا نہ کہ اس کے ظاہری لبادہ کے اعتبار سے۔

مشرکوں کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں حالاں کہ وہ خود اپنے اوپر کفر کے گواہ ہیں۔ ان لوگوں کے اعمال اکارت گئے اور وہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کو تو وہ آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ ایسے لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں میں سے بنیں۔ کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کے بسانے کو برابر کر دیا اس شخص کے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا، ان کا درجہ اللہ کے یہاں بڑا ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لئے دائمی نعمت ہوگی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ ہی کے پاس بڑا اجر ہے ۱۷ — ۲۲

نزول قرآن کے وقت عرب میں یہ صورت حال تھی کہ مسلمان رسول اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع تھے اور مشرکین بیت اللہ کے گرد۔ اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عظمتوں کی وہ تاریخ وابستہ نہیں ہوئی تھی جس کو آج ہم جانتے ہیں۔ لوگوں کو آپ عام انسانوں کی طرح ایک انسان دکھائی دیتے تھے۔ دوسری طرف مسجد حرام ہزاروں برس کی تاریخ کے نتیجہ میں عظمت و تقدس کی علامت بنی ہوئی تھی۔ مشرکین کی نظر میں اپنی تصویر تو یہ تھی کہ وہ ایک مقدس ترین مرکز کے خادم اور آباد کار ہیں۔ دوسری طرف جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے تو اس وقت کے حالات میں ان کو ایسا معلوم ہوتا جیسے کچھ لوگ بس ایک دیوانہ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

مگر مشرکین کا یہ خیال سراسر باطل تھا۔ وہ ظواہر کا تقابل حقائق سے کرنے کی غلطی کر رہے تھے۔ مسجد حرام کے زائرین کو پانی پلانا، اس کے اندر روشنی اور صفائی کا انتظام۔ کعبہ پر غلاف چڑھا دینا۔ مسجد کے فرش اور دیوار کی مرمت، یہ سب ظاہری نمائش کی چیزیں ہیں۔ یہ بھلا ان اعمال کے برابر ہو سکتی ہیں جب کہ آدمی اللہ کو پالیتا ہے اور آخرت کی فکر میں جینے لگتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور اپنے اثاثہ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ دوسری تمام بڑائیوں کا انکار کرکے ایک خدا کو اپنا بڑا بنا لیتا ہے۔ سچائی کو پانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کو معانی کی سطح پر پایا ہو نہ کہ ظواہر کی سطح پر۔ جو قربانی کی حد تک سچائی سے تعلق رکھنے والے ہوں نہ کہ محض سطحی اور نمائشی کارروائیوں کی حد تک۔

اللہ سے تعلق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تعلق وہ ہے جو رسمی عقیدہ کی حد تک ہوتا ہے، جس میں آدمی کچھ دکھاوے کے اعمال تو کرتا ہے مگر اپنے کو اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔ دوسرا تعلق وہ ہے جب کہ آدمی اپنے ایمان میں اتنا سنجیدہ ہو کہ اس راہ میں اس کو جو کچھ چھوڑنا پڑے وہ اس کو چھوڑ دے اور جو چیز دینی پڑے اس کو دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ یہی دوسری قسم کے بندے ہیں جو مرنے کے بعد خدا کے یہاں اعلیٰ ترین انعامات سے نوازے جائیں گے۔

اے ایمان والو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں۔ اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائیں گے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ کہو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راستہ نہیں دیتا۔
۲۳ — ۲۴

لوگوں کے لئے اپنا خاندان، اپنی جائداد، اپنے معاشی مفادات سب سے قیمتی ہوتے ہیں۔ انھیں چیزوں کو وہ سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں وہ ان کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنا سب کچھ ان کے اوپر نثار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی زندگی دنیا دارانہ زندگی ہے۔ ایسا آدمی جو کچھ پاتا ہے بس اسی دنیا میں پاتا ہے۔ موت کے بعد والی ابدی دنیا میں اس کے لئے کچھ نہیں۔ اس کے برعکس دوسری زندگی وہ ہے جب کہ آدمی اللہ اور رسول کو اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کو سب سے زیادہ اہمیت دے اور اس کی خاطر دوسری ہر چیز چھوڑنے کے لئے تیار رہے۔ یہی دوسری زندگی خدا پرستانہ زندگی ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔

ایک زندگی وہ ہے جو دنیوی تعلقات اور دنیوی مفادات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ دوسری زندگی وہ ہے جو ایمان کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ دونوں میں سے جس چیز کو بھی آدمی اپنی زندگی کی بنیاد بنائے، وہ ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ وہ اس کی خاطر دوسری چیزوں کو چھوڑ دے۔ وہ کچھ لوگوں سے تعلق قائم کرے اور کچھ دوسرے لوگوں سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ کچھ چیزوں کی بقا اور ترقی میں اپنی ساری توجہ لگا دے اور کچھ دوسری چیزوں کی بقا اور ترقی کے معاملہ میں بے پروا بنا رہے۔ کچھ نقصانات اس کو کسی قیمت پر گوارا نہ ہوں، وہ جان پر کھیل کر اور اپنا بہترین سرمایہ خرچ کر کے ان کو بچانے کی کوشش کرے اور کچھ دوسرے نقصانات کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے مگر ان کے بارے میں اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہ ہو۔ دنیا ہمیشہ ان لوگوں کو ملتی ہے جو دنیا کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیں۔ اسی طرح آخرت صرف ان لوگوں کے حصہ میں آئے گی جو آخرت کی خاطر دوسری چیزوں کو قربان کر دیں۔

ترجیح (ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے کا معاملہ) انتہائی سنگین ہے۔ حتیٰ کہ وہی آدمی کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرتا ہے۔ خدا کی دنیا میں جس طرح کھلے کافروں کے لئے کامیابی مقدر نہیں ہے اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی یہاں کامیابی کا کوئی امکان نہیں جو ایمان کا دعویٰ کریں اور جب نازک موقع آئے تو وہ آخرت پسندانہ روش کے مقابلہ میں دنیا دارانہ روش کو ترجیح دیں۔ ایسے مدعیان ایمان اگر اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہوں تو ان کو اس وقت معلوم ہو جائے گا جب اللہ اپنا فیصلہ ظاہر کر دے گا۔

ل اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تمھاری کثرت نے تم کو ناز میں مبتلا کر دیا
پھر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی۔ اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اس کے
للہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی سکینت اتاری اور ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور اللہ نے
رن کو سزا دی اور یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ جس کو چاہے توبہ نصیب کردے اور اللہ بخشنے والا
ن ہے۔ اے ایمان والو، مشرکین بالکل ناپاک ہیں۔ پس وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آئیں اور اگر تم
ی کا اندیشہ ہو تو اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تم کو بے نیاز کر دے گا اللہ علیم وحکیم ہے ۲۵-۲۸

مسلمانوں کا غلبہ کافروں کو ان کے کفر کی سزا کا اگلا نتیجہ ہے۔ مگر کافروں کا کفر مسلمانوں کے اسلام کی نسبت سے ا ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اپنی اسلامیت کھو دیں تو کافروں کا کفر کس چیز کے مقابلہ میں ثابت ہوگا اور کس بنیاد پر خدا وہ ں معاملہ کرے گا جو ایک کے لئے انعام بنے اور دوسرے کے لئے سزا۔

رمضان ۸ھ میں مسلمانوں نے قریش کو کامیاب طور پر مغلوب کرکے مکہ کو فتح کیا۔ مگر اگلے ہی مہینہ شوال ۸ھ ن کو ہوازن و ثقیف کے مشرک قبائل کے مقابلہ میں شکست ہوئی، جب کہ فتح مکہ کے وقت مسلمانوں کی تعداد ہزار تھی اور ہوازن و ثقیف سے مقابلہ کے وقت بارہ ہزار۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش سے مقابلہ کے وقت مسلمان ن اللہ کے بھروسے پر نکلے تھے۔ مگر ہوازن و ثقیف کے مقابلہ پر نکلتے ہوئے انھیں یہ ناز ہوگیا کہ اب تو ہم فاتح مکہ ۔ ہمارے ساتھ بارہ ہزار آدمیوں کا لشکر ہے، آج ہم کو کون شکست دے سکتا ہے۔ جب وہ خدا کے اعتماد پر تو انھیں کامیابی ہوئی، جب ان کو اپنی ذات پر اعتماد ہوگیا تو انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اپنی ذات پر بھروسہ آدمی کے اندر گھمنڈ کا جذبہ ابھارتا ہے جس کے نتیجہ میں خارجی حقیقتوں سے بے پروائی پیدا ہے۔ وہ نظم کی پابندی میں کوتاہ ہو جاتا ہے۔ وہ بے جا خود اعتمادی کی وجہ سے غیر حقیقت پسندانہ اقدام کرنے ہے جس کا نتیجہ اس عالم اسباب میں لازمی شکست ہے۔ اس کے برعکس خدا پر بھروسہ سب سے بڑی طاقت پر سہ ہے۔ اس سے آدمی کے اندر تواضع کا جذبہ ابھرتا ہے۔ وہ انتہائی حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ اور حقیقت ی بلاشبہ تمام کامیابیوں کی جڑ ہے۔

ابتداءً جب یہ حکم آیا کہ حرم میں مشرکوں کا داخلہ بند کر دو تو مسلمانوں کو تشویش ہوئی کیونکہ غیر زرعی ملک ہونے کی وجہ رب کی اقتصادیات کا انحصار تجارت پر تھا اور تجارت کی بنیاد ہمیشہ مشترکہ تعلقات پر ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے ا کہ جب حرم میں مشرکین کا آنا بند ہوگا تو ان کے ساتھ تجارتی رشتے بھی ٹوٹ جائیں گے۔ مگر ان کی نظر اس امکان پر گئی کہ آج کے مشرک کل کے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عربوں کے عمومی طور پر اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے تی سرگرمیاں دوبارہ نئی صورت سے بحال ہوگئیں۔ نیز اس ابتدائی قربانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر اسلام ایک بین اقوامی بن گیا۔ جو معاشی دروازے مقامی سطح پر بند ہوتے نظر آتے تھے وہ عالمی سطح پر کھل گئے۔

ان اہل کتاب سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے اپنے منھ کی باتیں ہیں۔ وہ ان لوگوں کی بات کی نقل کر رہے ہیں جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا۔ اللہ ان کو ہلاک کرے، وہ کدھر بہکے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو صرف یہ حکم تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں۔ وہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں ۲۹ — ۳۱

ایمان زندہ ہو تو آدمی ہر واقعہ کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ کسی چیز کو صرف اس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ خدا کی نسبت سے اس کے بارے میں رائے قائم کرلے۔ وہ پھول کی خوشبو کو اس وقت سمجھتا ہے جب کہ اس میں اسے خدا کی مہک مل جائے۔ وہ سورج کو اس وقت دریافت کرتا ہے جب کہ وہ اس کے معطی کو معلوم کرلے۔ ہر بڑائی اس کو خدا کا عطیہ نظر آتی ہے۔ ہر خوبی اس کو خدا کا احسان یاد دلاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر خدا سے آدمی کا تعلق گھٹ کر صرف موہوم عقیدہ کے درجہ پر آجائے تو خدا اس کے زندہ شعور کے لئے ایک لامعلوم چیز بن جائے گا۔ وہ دنیا کی نظر آنے والی چیزوں پر خدا کو قیاس کرنے لگے گا۔

دوسری قسم کے لوگ طبعی طور پر خالق کو ان دنیوی چیزوں کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں جن کو وہ جانتے ہیں۔ وہ خالق کو مخلوق کی سطح پر اتار لاتے ہیں۔ یہی حال یہود و نصاریٰ کا اپنے بگاڑ کے زمانہ میں ہوا۔ اب خدا ان کے یہاں موہوم معتقدات کے خانہ میں چلا گیا۔ چنانچہ وہ اپنے نظر آنے والے اکابر اور بزرگوں کو وہ درجہ دینے لگے جو درجہ خدائے عالم الغیب کو دینا چاہئے۔ انھوں نے دیکھا کہ یونانی اور رومی قومیں سورج کو خدا بنا کر اس کے لئے بیٹا فرض کئے ہوئے ہیں تو ان کو بھی اپنے بزرگوں کے لئے یہی سب سے اونچا لفظ نظر آیا۔ انھوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں اب اور ابن کے الفاظ کی خود ساختہ تشریح کر کے خدا کو باپ اور اپنے پیغمبر کو اس کا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ خدا صرف ایک ہی ہے، وہ ہر مشابہت سے پاک ہے، وہی تنہا اس کا مستحق ہے کہ اس کو بڑا بنایا جائے اور اس کی عبادت کی جائے۔

رسول اللہ کے خلاف جارحیت کرنے والے مشرکین (بنو اسماعیل) بھی تھے اور اہل کتاب (بنو اسرائیل) بھی۔ مگر دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ کیا گیا۔ مشرکین کے ساتھ جنگ یا اسلام کا اصول اختیار کیا گیا۔ مگر اہل کتاب کے لئے حکم ہوا کہ اگر وہ جزیہ (سیاسی اطاعت) پر راضی ہو جائیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلاً مخاطب تھے اور اہل کتاب تبعاً۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم پر پیغمبر کے ذریعہ براہ راست دعوت پہنچائی جاتی ہے اس سے اتمام حجت کے بعد زندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے کسی ریاست میں ایک شخص کے باغی ثابت ہونے کے بعد اس سے زندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک دوسرے گروہوں کا تعلق ہے ان کے ساتھ وہی سیاسی معاملہ کیا جاتا ہے جو عام بین اقوامی اصول کے مطابق درست ہو۔

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منھ سے بجھا دیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کئے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کردے خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو ۳۳ – ۳۲

ان آیتوں میں خدا نے اپنے اس مستقل فیصلہ کا اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے دین کو قیامت تک پوری طرح محفوظ رکھے گا، ماضی کی طرح اب ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا کہ لوگ اپنی ملاوٹوں سے خدا کے دین کو گم کردیں یا کوئی طاقت اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے میں کامیاب ہو۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو زمین پر بسایا تو اسی کے ساتھ اس کے لئے اپنا ہدایت نامہ بھی انسان کے حوالے کردیا۔ بعد کے دور میں جب لوگ غفلت اور دنیا پرستی میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے خدا کے الفاظ کو بدل کر اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق بنا لیا۔ مثلاً اپنے بزرگوں کو خدا کے یہاں سفارشی مان کر یہ عقیدہ قائم کرلیا کہ ہم جو کچھ بھی کریں، ہمارے بزرگ اپنی سفارش کے زور پر ہم کو خدا کے یہاں نجات دلا دیں گے یا یہ کہ جنت اور جہنم سب اسی دنیا میں ہیں۔ اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ لوگ جو کچھ خود چاہتے تھے اس کو انھوں نے خدا کی طرف منسوب کرکے خدا کی کتاب میں لکھ دیا۔ اس کے بعد خدا نے دوسرا نبی بھیجا جس نے خدا کے دین کو انسانی ملاوٹوں سے الگ کرکے دوبارہ اس کو صحیح شکل میں پیش کیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں لوگوں نے اس کو بھی بدل ڈالا۔ یہی بار بار ہوتا رہا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ ایک آخری رسول بھیجے اور اس کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کرے کہ خدا کا دین ہمیشہ کے لئے اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہو جائے۔ پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تاریخ نبوت کا یہی عظیم کارنامہ انجام پایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس وقت لوگوں نے خود ساختہ طور پر بہت سے دین بنا رکھے تھے۔ عرب کے مشرکین کا ایک دین تھا جس کو وہ دین ابراہیم کہتے تھے۔ یہود کا ایک دین تھا جس کو وہ دین موسیٰ کہتے تھے۔ نصاریٰ کا ایک دین تھا جس کو وہ دین مسیح کہتے تھے۔ یہ سب خدا کے دین کے خود ساختہ ایڈیشن تھے جن کو انھوں نے غلط طور پر خدا کی طرف سے آیا ہوا دین قرار دے رکھا تھا۔ خدا نے ان سب دینوں کو رد کردیا اور پیغمبر عربی کے دین کو اپنے دین کے واحد مستند اڈیشن کے طور پر قیامت تک کے لئے قائم کردیا۔

آج اسلام واحد دین ہے جس کے متن میں کوئی تبدیلی ممکن نہ ہوسکی جب کہ دوسرے تمام ادیان انسانی تحریفات کا شکار ہوکر اپنی اصلی تصویر گم کرچکے ہیں۔ اسلام واحد دین ہے جو تاریخی طور پر معتبر دین ہے جب کہ دوسرے تمام ادیان اپنے حق میں تاریخی اعتباریت کھوچکے ہیں۔ اسلام واحد دین ہے جس کی تمام تعلیمات ایک زندہ زبان میں پائی جاتی ہیں جب کہ دوسرے تمام ادیان کی ابتدائی کتابیں ایسی زبانوں میں ہیں جو اب مردہ ہوچکی ہیں۔ اسلام کی صورت میں خدا نے مذہب کی جو روشنی جلائی وہ کبھی مدھم نہیں ہوئی اور نہ بجھائی جاسکی۔ وہ کامل طور پر دنیا کے سامنے موجود ہے اور ہر دوسرے دین کے اوپر اپنی اصولی برتری کو مسلسل قائم رکھے ہوئے ہے۔

اے ایمان والو، اہل کتاب کے اکثر علمار و مشائخ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ اس دن اس مال پر دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی ——— یہی ہے وہ جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کیا تھا۔ پس اب چکھو جو تم جمع کرتے رہے ۳۵ — ۳۴

دوسرے کا مال لینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو حق کے مطابق لیا جائے۔ یعنی آدمی دوسرے کی کوئی واقعی خدمت کرے یا اس کو کوئی حقیقی نفع پہنچائے اور اس کے بدلے میں اس کا مال حاصل کرے۔ یہ بالکل جائز ہے۔ باطل طریقے سے دوسرے کا مال لینا یہ ہے کہ دوسرے کو دھوکے میں ڈال کر اس کا مال حاصل کیا جائے۔ یہ دوسرا طریقہ ناجائز ہے اور خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہے۔

باطل طریقہ سے دوسرے کا مال کھانا وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں استغلال (Exploitation) کہا جاتا ہے۔ یہود کے اکابر بہت بڑے پیمانہ پر اپنے عوام کا مذہبی استغلال کر رہے تھے۔ وہ عوام میں ایسی جھوٹی کہانیاں پھیلائے ہوئے تھے جس کے نتیجہ میں لوگ بزرگوں سے غیر معمولی امیدیں وابستہ کریں اور پھر ان کو بزرگ سمجھ کر ان کی برکت لینے کے لیے آئیں اور انھیں ہدیے اور نذرانے پیش کریں۔ وہ خدا کے دین کی خدمت کے نام پر لوگوں سے رقمیں وصول کرتے تھے حالاں کہ جو دین وہ لوگوں کے درمیان تقسیم کر رہے تھے وہ ان کا اپنا بنایا ہوا دین تھا نہ کہ حقیقۃً خدا کا اتارا دین۔ وہ ملت یہود کے احیار کے نام پر بڑے بڑے چندے وصول کرتے تھے حالانکہ احیار ملت کے نام پر وہ جو کچھ کر رہے تھے وہ صرف یہ تھا کہ لوگوں کو خوش خیالیوں میں الجھا کر انھیں اپنی قیادت کے لئے استعمال کرتے رہیں۔ وہ تعویذ گنڈے میں پر اسرار اوصاف بتا کر ان کو لوگوں کے ہاتھوں فروخت کرتے تھے۔ حالاں کہ ان کا حال یہ تھا کہ خود اپنے نازک معاملات میں وہ کبھی ان تعویذ گنڈوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

آدمی کے پاس جو مال آتا ہے اس کے دو ہی جائز مصرف ہیں۔ اپنی واقعی ضرورتوں میں خرچ کرنا، اور جو کچھ واقعی ضرورت سے زائد ہو اس کو خدا کے راستہ میں دے دینا۔ اس کے علاوہ جو طریقے ہیں وہ سب آدمی کے لئے عذاب بننے والے ہیں۔ خواہ وہ اپنے مال کو فضول خرچیوں میں اڑاتا ہو یا اس کو جمع کرکے رکھ رہا ہو۔

جو لوگ یہود کی طرح خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر کسی گروہ کے اوپر اپنی قیادت قائم کئے ہوئے ہوں اور خدا کے دین کے نام پر لوگوں کا استغلال کر رہے ہوں وہ کسی ایسی دعوت کو سخت ناپسند کرتے ہیں جو خدا کے سچے اور بے آمیز دین کو زندہ کرنا چاہتی ہو۔ ایسے دین میں انھیں اپنی مذہبی حیثیت بے اعتبار ہوتی نظر آتی ہے۔ انھیں دکھائی دیتا ہے کہ اگر اس کو عوام میں فروغ حاصل ہوا تو ان کی مذہبی تجارت بالکل بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گی۔ وہ ایسی تحریک کے اٹھتے ہی اسے سونگھ لیتے ہیں اور اس کے مخالف بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کی کتاب میں جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی ہے سیدھا دین۔ پس ان میں تم اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔ اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ مہینوں کا ہٹا دینا کفر میں ایک اضافہ ہے۔ اس سے کفر کرنے والے گمراہی میں پڑتے ہیں۔ وہ کسی سال حرام مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں تاکہ خدا کے حرام کیے ہوئے کی گنتی پوری کر کے اس کے حرام کیے ہوئے کو حلال کر لیں۔ ان کے برے اعمال ان کے لئے خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔ اور اللہ انکار کرنے والوں کو راستہ نہیں دکھاتا ۳۷ — ۳۶

دینی احکام پر ہر شخص الگ الگ بھی عمل کر سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ تمام اہل ایمان ایک ساتھ ان پر عمل کریں تاکہ ان میں اجتماعیت پیدا ہو۔ اسی اجتماعیت کے مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر عبادات کی ادائگی کے لئے متعین اوقات اور تاریخیں مقرر کی گئی ہیں۔ یہ تاریخیں اگر شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے رکھی جائیں تو ان کے زمانہ میں یکسانیت آجاتی۔ مثلاً روزہ ہمیشہ ایک موسم میں آتا اور حج ہمیشہ ایک موسم میں۔ مگر یکسانیت آدمی کے اندر جمود پیدا کرتی ہے اور تبدیلی سے نئی قوت عمل بیدار ہوتی ہے۔ اس بنا پر دینی امور کے اجتماعی نظام کے لئے چاند کا قدرتی کیلنڈر اختیار کیا گیا۔

اسی اصول کی وجہ سے حج کی تاریخیں مختلف موسموں میں آتی ہیں، کبھی سردیوں میں اور کبھی گرمیوں میں۔ قدیم زمانہ میں جب کہ حج کا اجتماع زبردست تجارتی اہمیت رکھتا تھا، مختلف موسموں میں حج کا آنا تجارتی اعتبار سے مضر معلوم ہوا۔ اہل عرب کو دینی مصلحتوں کے مقابلہ میں دنیوی مصلحتیں زیادہ اہم نظر آئیں۔ انھوں نے چاہا کہ ایسی صورت اختیار کریں کہ حج کی تاریخ ہمیشہ ایک ہی موافق موسم میں پڑے۔ اس موقع پر یہود و نصاریٰ کا کبیسہ کا حساب ان کے علم میں آیا۔ اپنی خواہشوں کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے وہ ان کو پسند آگیا اور انھوں نے اس کو اپنے یہاں رائج کر لیا۔ یعنی مہینوں کو ہٹا کر ایک کی جگہ دوسرے کو رکھ دینا۔ مثلاً محرم کو صفر کی جگہ کر دینا اور صفر کو محرم کی جگہ۔

نسیٔ کے اس طریقہ سے اہل عرب کو دو فائدے ہوئے۔ ایک یہ کہ حج کے موسم کو تجارتی تقاضے کے مطابق کر لینا۔ دوسرے یہ کہ حرام مہینوں (محرم، رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ) میں کسی کے خلاف لڑائی چھیڑنا ہو تو حرام مہینہ کی جگہ غیر حرام مہینہ رکھ کر لڑائی کو جائز کر لینا۔ اہل عرب کے سامنے حضرت ابراہیم کا طریقہ بھی تھا۔ مگر ان کے ذہن پر چونکہ تجارتی مقاصد اور قبائلی تقاضوں کا غلبہ تھا۔ اس لئے ان کو نسیٔ کا طریقہ زیادہ اچھا معلوم ہوا اور انھوں نے اپنے معاملات کے لئے اس کو اختیار کر لیا۔

"تم بھی مل کر لڑو جس طرح وہ مل کر لڑتے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ خدا سے بے خوفی پر متحد ہو جاتے ہیں، تم خدا سے خوف (تقویٰ) پر متحد ہو جاؤ۔ وہ منفی مقاصد کے لئے باہم جڑ جاتے ہیں تم مثبت مقاصد کے لئے آپس میں جڑ جاؤ۔ وہ دنیا کی خاطر ایک ہو جاتے ہیں تم آخرت کی خاطر ایک ہو جاؤ۔

اے ایمان والو، تم کو کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے لگے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کا سامان تو بہت تھوڑا ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو دردناک سزا دے گا اور تمھاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر تم رسول کی مدد نہ کرو گے تو اللہ خود اس کی مدد کر چکا ہے جب کہ کافروں نے اس کو نکال دیا تھا، وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور اللہ نے کافروں کی بات نیچی کر دی اور اللہ ہی کی بات تو اونچی ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے　۳۸ ــ ۴۰

یہ آیتیں غزوہ تبوک (۹ ھ) کے ذیل میں اتریں۔ اس موقع پر مدینہ کے منافقین کی طرف سے جو عمل ظاہر ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمزور ایمان والے لوگ جب کسی اسلامی معاشرہ میں داخل ہو جاتے ہیں تو نازک مواقع پر ان کا کردار کیا ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام سے تعلق کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی سے آدمی کی تمام وفاداریاں وابستہ ہو جائیں۔ وہ آدمی کے لئے زندگی و موت کا مسئلہ بن جائے۔ دوسرے یہ کہ آدمی کی حقیقی دلچسپیاں تو کہیں اور اٹکی ہوئی ہوں اور اوپری طور پر وہ اسلام کا اقرار کرے۔ پہلی قسم کے لوگ سچے مومن ہیں اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو شریعت کی اصطلاح میں منافق کہا گیا ہے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ عام حالات میں بھی وہ اسلام کو پکڑے ہوئے ہوتا ہے اور قربانی کے لمحات میں بھی وہ پوری طرح اس پر قائم رہتا ہے۔ اس کے برعکس منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بے ضرر اسلام یا نمائشی دینداری میں تو بہت آگے دکھائی دیتا ہے۔ مگر جب قربانی کی سطح پر اسلام کے تقاضوں کو اختیار کرنا ہو تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مومن کے سامنے اصلاً آخرت ہوتی ہے اور منافق کے سامنے اصلاً دنیا۔ مومن آخرت کی بے پایاں نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا، اس لئے جب بھی دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے راستہ میں حائل ہو تو وہ اس کو نظر انداز کر کے دین کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس منافق ایسے اسلام کو پسند کرتا ہے جس میں دنیا کو بگاڑے بغیر اسلامیت کا کریڈٹ مل رہا ہو۔ اس لئے جب ایسا موقع آتا ہے کہ دنیا کو کھو کر اسلام کو پانا ہو تو وہ دنیا کی طرف جھک جاتا ہے، خواہ اس کے نتیجہ میں اسلام کی رسی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔

اسلام اور غیر اسلام کی کش مکش کے جو لمحات موجودہ دنیا میں آتے ہیں وہ بظاہر دیکھنے والوں کو اگرچہ دو انسانی گروہوں کی کش مکش دکھائی دیتی ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک خدائی معاملہ ہوتا ہے۔ ایسے ہر موقع پر خود خدا اسلام کی طرف سے کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے کسی واقعہ کو اسباب کے روپ میں اس لئے ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ ان لوگوں کو خدمت دین کا کریڈٹ دیا جائے جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے حوالے کر چکے ہیں۔

ہلکے اور بوجھل اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اگر نفع قریب ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے ہو لیتے مگر یہ منزل ان پر کٹھن ہو گئی۔ اب وہ قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں ۴۲ — ۴۱

مدینہ کے جن لوگوں کو منافق کہا گیا وہ کوئی جاسوس نہ تھے بلکہ کمزور عقیدہ کے مسلمان تھے۔ انھوں نے اسلام کو حق سمجھ کر اس کا اقرار کیا تھا۔ وہ اسلام کی ان تمام تعلیمات پر عمل کرتے تھے جو ان کی دنیوی مصلحتوں کے خلاف نہ ہوں۔ مگر جب اسلام کا تقاضا ان کے دنیوی تقاضوں سے ٹکراتا تو ایسے موقع پر وہ اسلامی تقاضے کو چھوڑ کر اپنے دنیوی تقاضے کو پکڑ لیتے۔ مدینہ کے معاشرہ میں مومن اس شخص کا نام تھا جو قربانی کی سطح پر اسلام کو اختیار کئے ہوئے ہو اور منافق وہ تھا جو اسلام کی خاطر قربانی کی حد تک جانے کے لئے تیار نہ ہو۔

تبوک کا معاملہ ایک علامتی تصویر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں مومن کون ہوتا ہے اور منافق کون۔ اس موقع پر روم جیسی بڑی اور منظم طاقت سے مقابلہ کے لئے نکلنا تھا۔ زمانہ شدید گرمی کا تھا۔ فصل بالکل کاٹنے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ہر قسم کی ناسازگاری کا مقابلہ کرتے ہوئے شام کی دور دراز سرحد پر پہنچنا تھا۔ پھر مسلمانوں میں کچھ سامان والے تھے اور کچھ بے سامان والے۔ کچھ آزاد تھے اور کچھ اپنے حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ مگر حکم ہوا کہ ہر حال میں نکلو، کسی بھی چیز کو اپنے لئے عذر نہ بناؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے یہاں اصل مسئلہ مقدار کا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کو پیش کر دے۔ یہی دراصل جنت کی قیمت ہے، خواہ وہ بظاہر دیکھنے والوں کے نزدیک کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

منافق کی خاص پہچان یہ ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ بے مشقت سفر کرکے خدمت اسلام کا ایک بڑا کریڈٹ مل رہا ہے تو وہ فوراً ایسے سفر کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا سفر درپیش ہو جس میں مشقتیں ہوں اور سب کچھ کرکے بھی بظاہر کوئی عزت اور کامیابی ملنے والی نہ ہو تو ایسی دینی مہم کے لئے اس کے اندر رغبت پیدا نہیں ہوتی۔

ایک حقیقی دینی مہم سامنے ہو اور آدمی عذرات پیش کرکے اس سے الگ رہنا چاہے تو یہ صاف طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے خدا کے دین کو اپنی زندگی میں سب سے اونچا مقام نہیں دیا ہے۔ عذر پیش کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ پیش نظر مقصد کے مقابلہ میں کوئی اور چیز آدمی کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا عذر کسی آدمی کو خدا کی نظر میں بے اعتبار ثابت کرنے والا ہے نہ یہ کہ اس کی بنا پر اس کو مقبولین کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ منافقت دراصل خدا سے بے پروا ہو کر بندوں کی پروا کرنا ہے۔ آدمی اگر خدا کی قدرت کو جان لے تو وہ کبھی ایسا نہ کرے۔

اللہ تم کو معاف کرے، تم نے کیوں انھیں اجازت دے دی۔ یہاں تک کہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔ جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ وہ اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد نہ کریں اور اللہ ڈرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ تم سے اجازت تو وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ پس وہ اپنے شک میں بھٹک رہے ہیں۔ اور اگر وہ نکلنا چاہتے تو ضرور وہ اس کا کچھ سامان کرلیتے۔ مگر اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہ کیا اس لئے انھیں جمارہنے دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ۴۶ — ۴۳

منافق وہ ہے جو اسلام کے نفع بخش یا بے ضرر پہلوؤں میں آگے آگے رہے مگر جب اس کے مفادات پر زد پڑتی نظر آئے تو وہ پیچھے ہٹ جائے۔ ایسے مواقع پر اس قسم کے کمزور لوگ جس چیز کا سہارا لیتے ہیں وہ عذر ہے۔ وہ اپنی بے عملی کو خوبصورت توجیہات میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سربراہ اگر اجتماعی مصالح کے پیش نظر ان کے عذر کو قبول کرلے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ انھوں نے اپنے الفاظ کے پردے میں نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی بے عملی کو چھپالیا۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ اصل معاملہ انسان سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اور وہ ہر آدمی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ خدا ایسے لوگوں کا راز کبھی دنیا میں کھول دیتا ہے اور آخرت میں تو بہرحال ہر ایک کا راز کھولا جانے والا ہے۔

کسی کا لڑکا بیمار ہو یا کسی کی لڑکی کی شادی ہو تو اس وقت وہ اپنے آپ کو اور اپنے مال کو اس سے بچاکر نہیں رکھتا۔ اس کی زندگی اور اس کا مال تو اسی لئے ہے کہ ایسا کوئی موقع آئے تو وہ اپنا سب کچھ نثار کرکے ان کے کام آسکے۔ ایسا کوئی وقت اس کے لئے بڑھ کر قربانی دینے کا ہوتا ہے نہ کہ عذرات کی آڑ تلاش کرنے کا۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ جو شخص اپنے دین میں سنجیدہ ہو وہ دین کے لئے قربانی کا موقع آنے پر کبھی عذر تلاش نہیں کرے گا۔ اس کے سینہ میں جو ایمانی جذبات بے قرار تھے وہ تو گویا اسی دن کے انتظار میں تھے کہ جب کوئی موقع آئے تو وہ اپنے آپ کو نثار کرکے خدا کی نظر میں اپنے کو وفادار ثابت کرسکے۔ پھر ایسا موقع پیش آنے پر وہ عذر کا سہارا کیوں ڈھونڈے گا۔

مومن خدا سے ڈرنے والا ہوتا ہے اور ڈر کا جذبہ آدمی کے اندر سب سے زیادہ قوی جذبہ ہے۔ ڈر کا جذبہ دوسرے تمام جذبات پر غالب آجاتا ہے۔ جس چیز سے آدمی کو ڈر اور اندیشہ کا تعلق ہو اس کے بارے میں وہ آخری حد تک سنجیدہ اور حقیقت پسند ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص ڈر کی سطح پر خدا کا مومن بن جائے تو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ کس موقع پر اسے کس قسم کا ردعمل پیش کرنا چاہئے۔

آخرت کا نفع سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آدمی اس کے لئے قربانی دینے میں شک میں پڑجاتا ہے۔ مگر اس شک کے پردہ کو پھاڑنا ہی اس دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔

اگر یہ لوگ تمھارے ساتھ نکلتے تو وہ تمھارے لئے خرابی ہی بڑھانے کا باعث بنتے اور وہ تمھارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے اور تم میں ان کی سننے والے ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ یہ پہلے بھی فتنہ کی کوشش کر چکے ہیں اور وہ تمھارے لئے کاموں کا الٹ پھیر کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہوگیا اور وہ ناخوش ہی رہے ۴۸—۴۷

دین کو اختیار کرنا ایک مخلصانہ ہوتا ہے اور دوسرا منافقانہ، مخلصانہ طور پر دین کو اختیار کرنا یہ ہے کہ دین کے مسئلہ کو آدمی اپنی زندگی کا مسئلہ بنائے، اپنی زندگی اور اپنے مال پر وہ سب سے زیادہ دین کا حق سمجھے۔ اس کے برعکس منافقانہ طور پر دین کو اختیار کرنا یہ ہے کہ دین سے بس رسمی اور ظاہری تعلق رکھا جائے۔ دین کو آدمی اپنی زندگی میں یہ مقام نہ دے کہ اس کے لئے وہ وقف ہو جائے اور ہر قسم کے نقصان کا خطرہ مول لے کر اس کی راہ میں آگے بڑھے۔

اپنی غلطی کو ماننا اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں کمتر تسلیم کرنا ہے اور اس قسم کا اعتراف کسی آدمی کے لئے مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے موقف کو صحیح ثابت کر دے۔ چنانچہ منافقانہ طور پر اسلام کو اختیار کرنے والے ہمیشہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی موقع ملے تو مخلص مومنوں کو مطعون کریں اور ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو زیادہ درست ثابت کر سکیں۔

مدینہ کے منافقین مسلسل اس کوشش میں رہتے تھے۔ مثلاً غزوۂ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو مدینہ میں بیٹھ رہنے والے منافقین نے رسول اللہ ؐ کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ان کو معاملات جنگ کا تجربہ نہیں ہے۔ انھوں نے جوش کے تحت اقدام کیا اور ہماری قوم کے جوانوں کو غلط مقام پر لے جاکر خواہ مخواہ کٹوا دیا

انسانوں میں کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مسائل کا گہرا تجزیہ کر سکیں اور اس حقیقت کو جانیں کہ کسی بات کا قواعد زبان کے اعتبار سے صحیح الفاظ میں ڈھل جانا اس کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ وہ بات معنی کے اعتبار سے بھی صحیح ہوگی۔ بیشتر لوگ سادہ فکر کے ہوتے ہیں اور کوئی بات خوبصورت الفاظ میں کہی جائے تو بہت جلد اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر کسی مسلم گروہ میں منافق قسم کے افراد کی موجودگی ہمیشہ اس گروہ کی کمزوری کا باعث ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے کو درست ثابت کرنے کی کوشش میں اکثر ایسا کرتے ہیں کہ باتوں کو غلط رخ دے کر ان کو اپنے مفید مطلب رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ اس سے سادہ فکر کے لوگ متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر غیر ضروری طور پر شبہ اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

منافقین کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود جب بدر کی فتح ہوئی تو عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے کہا: اِنَّ هٰذَا اَمْرٌ قَدْ تَوَجَّهَ۔ یعنی یہ چیز تو اب چل نکلی۔ اسلام کا غلبہ ظاہر ہونے کے بعد انھیں اسلام کی صداقت پر یقین کرنا چاہئے تھا مگر اس وقت بھی انھوں نے اس سے حسد کی غذا لی۔

کل کو یاد رکھئے

ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم آخرت کے مسافر ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی ہماری اصل زندگی کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ ہم بہت جلد اپنی مستقل زندگی کے مرحلہ میں داخل ہونے والے ہیں۔ اس حقیقت واقعہ کو یاد رکھنا اور آج کی دنیا کے نفع نقصان کے بجائے آنے والی ابدی دنیا کے نفع نقصان کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنا، اسی کا نام دین یا اسلامی زندگی ہے۔

دوسروں کے مقابلہ میں آپ کو کوئی بڑائی یا عزت مل جائے تو دوسروں کو حقیر نہ سمجھئے۔ کیونکہ بڑے اور چھوٹے دونوں بالآخر برابر ہو جانے والے ہیں۔ اس کے بعد بڑائی اسی کے لئے ہوگی جس کو خدا بڑا بنائے اور چھوٹا وہ ہوگا جو خدا کے نزدیک چھوٹا قرار پائے۔

کسی نے اپنی دنیوی زندگی کو کامیاب بنا لیا ہو تو اکثر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی آخرت بھی ضرور کامیاب رہے گی۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں۔

اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کل ان کا کیا انجام ہونے والا ہے تو ان کا آج ان کے لئے بے لذت ہو جائے۔ یہ آنے والے کل سے بے خبری ہے جس نے لوگوں کے آج کو ان کے لئے لذیذ بنا رکھا ہے۔

جب کسی سے معاملہ پڑتا ہے تو آدمی ایک جواب دے کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو احساس ہو کہ آخری جواب کسی انسان کو نہیں بلکہ خدا کو دینا ہے تو وہ بولنے کے بجائے چپ رہنا پسند کرے۔

آج لوگوں کے لئے سب سے آسان کام بولنا ہے اور سب سے مشکل کام چپ رہنا۔ مگر بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ بولنا اتنا سنگین کام معلوم ہوگا کہ لوگ سوچیں گے کہ کاش وہ ساری عمر چپ رہتے، کاش انھوں نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہوتا۔

ہر آدمی اپنے آج میں الجھا ہوا ہے، کسی کو اپنے کل کی خبر نہیں۔ حالاں کہ موت ہر روز ہمارے آج کو باطل کر کے یہ ثابت کر رہی ہے کہ آج کی اور آج کی چیزوں کی اس کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں۔

حرا — فطرت کا مطالعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز نبوت کا ذکر کرتے ہوئے ابن ہشام لکھتے ہیں: اللہ نے جب ارادہ کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے منصب پر مقرر کرے تو آپ کا یہ حال ہوا کہ جب آپ اپنی کسی ضرورت کے لئے بستی سے نکلتے تو بہت دور چلے جاتے، یہاں تک کہ مکانات نظر نہ آتے۔ آپ مکہ کی پہاڑیوں اور وادیوں میں کھو جاتے۔ ابن ہشام نے عبداللہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال میں ایک مہینہ حرا پہاڑ میں چلے جاتے اور اس کے ٹروس میں رہتے (کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجاور فی حراءٍ من کل سنۃ شہراً) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوطالب کے کچھ اشعار ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔ ایک مصرعہ یہ ہے:

وَرَاقٍ لِیَرْقیٰ فی حِرَاءٍ وَنَازِلِ

(وہ حرا پر چڑھنے والے ہیں اور پھر اس سے اترنے والے ہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جب حقیقت کی تلاش کا جذبہ ابھرا تو آپ کا یہ حال ہوا کہ انسانی بستیوں سے نکل کر آپ پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے۔ یہ گویا ایک صالح روح کا واقعات انسانی کا ماحول چھوڑ کر واقعات خداوندی کے ماحول میں جانا تھا ——— صحرائی جغرافیہ خصوصیت سے اس کام کے لئے موزوں ترین جگہ ہوتی ہے۔

رومانیہ کے مستشرق کونستان ورژیل جارج (-۱۹۱۶) نے اسلام کے جغرافیہ کو سمجھنے کے لئے خود عرب کا سفر کیا تھا۔ وہ اپنی کتاب "پیغمبر اسلام" میں لکھتے ہیں:

جب تک کوئی انسان عرب اور مشرق کے جنگلوں میں ایک مدت نہ گزارے، وہ اس کو سمجھ ہی نہیں سکتا کہ صحرا کی وسعت اور اس کا سکوت کس طرح فکر انسانی کی وسعت کا سبب ہوتا ہے اور خیال کو تقویت دیتا ہے۔ عرب کی گھاس اور یورپ کی گھاس میں بہت فرق ہے۔ گرم جنگلوں میں کوئی گھاس ایسی نہیں جس میں خوشبو نہ ہو۔ یہاں تک کہ عرب جنگلوں کے ببول بھی خوشبو دار ہیں۔ ۳۰ لاکھ کیلو میٹر والا مسطح جنگل اور گرم عربستان ایسی جگہ ہے جہاں انسان گویا بلا واسطہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

دوسرے ملک ایسی عمارت کے مثل ہیں جن کے درمیان بڑی بڑی دیواریں حائل ہیں۔ مگر عرب کے جنگلوں میں ایسا کوئی مانع نہیں جو دیدار حق کو روک سکے۔ لوگ جس طرف بھی نظر ڈالتے ہیں، لامحدود جنگل اور بے کنار آسمان انھیں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں خدا اور فرشتوں کی شناسائی کے لئے کوئی چیز مانع نہیں۔

برتر اخلاقیات

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا ہے : انک لعلیٰ خُلق عظیم (تم ایک اعلیٰ کردار پر ہو) امام عطیہ نے خلق عظیم کی تفسیر ادب عظیم سے کی ہے (تفسیر ابن کثیر) یہ بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کیا ہے، اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقوال سے ہوتی ہے :

عن حذیفة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکونوا اِمَّعَةً تقولون اِن اَحسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِن اَسَاؤا ظَلَمنا ولکن وَطِّنوا انفسکم اِن احسنَ الناسُ اَن تحسنوا واِن اساؤا فلا تظلموا (مشکوٰۃ باب الظلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ اِمّعہ نہ بنو، یہ کہنے لگو کہ لوگ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی اچھا سلوک کریں گے۔ اور لوگ برا کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ظلم کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کا خوگر بناؤ کہ لوگ اچھا سلوک کریں تب بھی تم اچھا سلوک کرو اور لوگ برا سلوک کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : صِل مَن قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّن ظلمك واحسن الیٰ من اَسَاءَ اِلیك

جو تم سے کٹے تم اس سے جُڑو۔ جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو اور جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

یہ اعلیٰ اخلاق جو حدیث میں بتایا گیا ہے اس اخلاق میں آپ بلند ترین مرتبہ پر تھے۔ عام مسلمانوں سے یہ اعلیٰ اخلاق عزیمت کے درجہ میں مطلوب ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ لازم تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھ کو نہ دے میں اسے دوں۔ جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں (امرنی ربی بتسع ۔ ۔ ۔ وان اصل من قطعنی واعطی من حرمنی واعفو عمن ظلمنی)

اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ ایک معمولی سطح اور دوسری برتر سطح۔ اخلاق کی معمولی سطح یہ ہے کہ آدمی کا اخلاق جوابی اخلاق ہو "جو مجھ سے جیسا کرے گا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کروں گا"۔ یہ اس کا اصول ہو جو شخص اس سے کٹے وہ بھی اس سے کٹ جائے۔ جو شخص اس پر ظلم کرے وہ بھی اس پر ظلم کرنے لگے۔ جو شخص اس کے ساتھ برائی کرے وہ بھی اس کے لئے برا بن جائے۔

یہ عام اخلاق ہے۔ اس کے مقابلہ میں برتر اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویہ کی پروا کئے بغیر اپنا رویہ متعین کرے۔ اس کا اخلاق اصولی ہو نہ کہ جوابی۔ اعلیٰ اخلاقیات اس کا ایک عام اصول ہو جس کو وہ ہر جگہ برتے، خواہ معاملہ موافق کے ساتھ ہو یا مخالف کے ساتھ۔ وہ جُڑنے والا ہو حتیٰ کہ اس سے بھی جو اس سے قطع تعلق کرے۔ وہ بہتر سلوک کرنے والا ہو حتیٰ کہ اس کے ساتھ بھی جو اس سے برا سلوک کرے۔ وہ نظر انداز کرنے والا ہو حتیٰ کہ اس سے بھی جو اس پر ظلم کرتا ہو۔

مقام عبدیت

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ خلافت کے زمانہ میں ایک روز وہ اپنے گھر پر تھے اور معمولی گھریلو کام کر رہے تھے جو عام طور پر خادموں کے کرنے کا ہوتا ہے۔ عین اس وقت عرب کے کچھ بڑے لوگ آپ سے ملاقات کے لئے آئے۔ خلیفۂ وقت کو ایک معمولی کام میں مشغول دیکھ کر انھوں نے کہا: آپ نے کسی عبد (غلام) سے یہ کام لے لیا ہوتا۔ حضرت عمر نے یہ سن کر فرمایا: اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ (مجھ سے زیادہ غلام اور کون ہو سکتا ہے)

حضرت عمر کا یہ جواب بتاتا ہے کہ جو کام وہ کر رہے تھے وہ ان کے لئے محض ایک خشک کام نہ تھا بلکہ ان کی روح اس میں لذت پا رہی تھی۔ انکساری اگر نمائشی نہ ہو بلکہ حقیقی ہو تو وہ آدمی کے لئے لذیذ ترین چیز ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی اصل حیثیت کا اعتراف ہوتی ہے۔ بندہ جب تواضع اور انکساری کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ خدا کے قریب ترین ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے دربار میں کسی بندہ کے لئے جو سب سے قریبی نشست ہے وہ تواضع ہی ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ بندہ اپنے رب سے اس وقت سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہوتا ہے (اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد، رواہ مسلم)

شعوری سجدہ پستی اور بے نفسی کی آخری حالت ہے۔ بندہ جب حقیقی سجدہ میں ہو تو وہ اس قریب ترین مقام پر ہوتا ہے جہاں کوئی انسان خدا کی بارگاہ میں پہنچ سکتا ہے۔

لوگوں کو عبدیت کے مقام کی خبر نہیں، یہی وجہ ہے کہ عبدیت ان کے لئے لذیذ چیز نہیں بنی۔ لوگ امتیاز میں جیتے ہیں پھر مساوات کی لذت کو وہ کس طرح پائیں۔ لوگ اپنی انا میں جیتے ہیں پھر خدا کی کبریائی کے اعتراف کی لذت انھیں کیسے ملے۔ لوگ دوسروں کو غلط ثابت کرکے خوش ہونا چاہتے ہیں پھر انھیں اپنی غلطی کو جاننے اور ماننے کی خوشی کیسے حاصل ہو۔ لوگ اپنے کو ایک پیمانہ سے ناپتے ہیں اور دوسروں کو دوسرے پیمانہ سے پھر وہ کیسے جانیں کہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک پیمانہ رکھنا اتنی بڑی دولت ہے کہ دنیا کی تمام دولتیں اس پر قربان کی جا سکتی ہیں۔

مومن وہ ہے جس کے لئے دینی عمل ہی سب سے بڑی لذت بن جائے۔ صرف ذکر اور عبادت کے معاملہ میں نہیں بلکہ ہر معاملہ میں۔ حسد کے جذبات کو کچلنا، انتقام کی آگ کو بجھانا، گروہی عصبیت سے اپنے کو اوپر اٹھانا، اختلاف کے باوجود انصاف کرنا، خوشامد کے بجائے حق کی بنیاد پر انسان کی قدر کرنا، یہ سب چیزیں اس کے لئے اس طرح لذیذ بن جائیں کہ ان کو چھوڑنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔

الفاظ کم ہوجاتے ہیں

مسٹر لزلی براؤن شمالی انگلستان کے ایک ٹرک ڈرائیور ہیں۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ ان کی بیوی کے جسمانی نظام میں بعض حیاتیاتی فرق کی وجہ سے دونوں کا مادۂ حیات رحم مادر میں یکجا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ عین وقت پر سائنس نے ان کی مدد کی۔ لندن کے ڈاکٹر پیٹرک اسٹیپٹو جو برسہا برس سے اس میدان میں تجربہ کر رہے تھے انھوں نے اپنی لیبورٹری میں لزلی براؤن کا مادۂ تولید (اسپرم) نکالا اور مسز براؤن کے جسم سے ایک بیضہ لیا۔ دونوں کو انھوں نے ایک خصوصی قسم کے ٹسٹ ٹیوب میں رکھا۔ قدرتی قانون کے تحت وہ دونوں مل کر زرخیز ہو گئے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر نے اس کو مصنوعی طور پر رحم مادر میں پہنچا دیا۔ اب رحم مادر میں اس "بچہ" کی پرورش ہونے لگی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اگست ۱۹۷۸ میں تاریخ کا پہلا "ٹسٹ ٹیوب بے بی" وجود میں آگیا۔ اس پورے عمل کی تصویر لی جاتی رہی، اور پیدائش کے بعد اس کو مکمل طور پر ٹیلی وژن پر دکھایا گیا۔

ٹیوب بے بی (لوئی براؤن) کے باپ سے اس پورے واقعہ پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے کہا "بیوٹی فل"، یعنی یہ حد حسین۔ اس ایک لفظ کے سوا وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

غم کی گھٹنا خوشی سے زیادہ بڑی گھٹنا ہوتی ہے۔ انڈین نیوی کے ایک افسر کی اہلیہ مسز اوما چوپڑہ کو ۲۶ اگست ۱۹۷۸ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے دونوں بچے گیتا (۱۷) اور سنجے (۱۵) کو نئی دہلی میں وحشیانہ طور پر کسی نے قتل کر دیا ہے تو اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ سات گھنٹے تک وہ ایک لفظ نہ بول سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاثر جتنا شدید ہو الفاظ اتنا ہی کم ہو جاتے ہیں۔ بے حد خوشی ہو تب بھی آدمی زیادہ بول نہیں پاتا اور بے حد غم ہو تب بھی زیادہ بولنا آدمی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ دین وملت کے "غم" میں ہر روز الفاظ کے دریا بہاتے رہتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ دین وملت کے غم میں وہ سب سے پیچھے ہیں۔ جو شخص درد وغم میں مبتلا ہو اس کو تو چپ لگ جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظی اکھاڑوں میں لسانی پہلوانی کے کرتب دکھانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو نہ اس کے منعم کے روپ میں پایا ہے اور نہ منتقم کے روپ میں۔ اگر وہ دونوں میں سے کسی روپ میں بھی خدا کو پا لیتے تو یہ صورت باقی نہ رہتی کہ ہر آدمی ایسے الفاظ کا بھنڈار بنا ہوا ہے جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔

دنیا اور آخرت

انسان کی سب سے بڑی طلب کیا ہے۔ یہ کہ اس کو خوشیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی حاصل ہو۔ یہی ہر زمانہ میں آدمی کا سب سے بڑا خواب رہا ہے۔ ہر آدمی اسی تمنا کو لے کر جیتا ہے۔ مگر ہر آدمی اس تمنا کی تکمیل کے بغیر مرجاتا ہے۔ سارے فلسفے اور نظریات، تمام انسانی کوششیں اسی ایک چیز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ مگر آج تک انسان نہ فکری طور پر اس کو دریافت کر سکا اور نہ عملی طور پر اس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔

اس ناکامی کی وجہ صرف ایک ہے۔ تمام لوگ اپنے خواب کی تعبیر اسی موجودہ دنیا میں پانا چاہتے ہیں۔ مگر ہزاروں برس کے تجربہ نے صرف ایک چیز ثابت کی ہے۔ یہ کہ موجودہ دنیا اس آرزو کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے۔ موجودہ دنیا کی محدودیت، موجودہ دنیا میں انسانی آزادی کا غلط استعمال انتہائی فیصلہ کن طور پر اس میں مانع ہے کہ موجودہ دنیا انسانی خوابوں کی تعبیر بن سکے۔

ہم زندگی کو کامیاب بنانے کی طرف ابھی سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم کو موت آجاتی ہے۔ ہم مشینی ترقیاں وجود میں لاتے ہیں مگر صنعتی مسائل پیدا ہو کر ساری ترقی کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ ہم بے پناہ قربانیاں کر کے ایک سیاسی نظام کو وجود میں لاتے ہیں مگر اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والوں کا بگاڑ اس کو عملاً بے نتیجہ بنا دیتا ہے۔ ہم اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کا بغض، حسد، گھمنڈ، ظلم اور انتقام ظاہر ہو کر ہم کو الجھا لیتا ہے اور ہم اپنے آشیانہ کو خود اپنی آنکھوں سے بکھرتا ہوا دیکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

مسلسل تجربات ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے خوابوں کی دنیا موجودہ زمینی حالات میں نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے دوسری دنیا اور دوسرے حالات درکار ہیں۔ آدمی کی تمنائیں بجائے خود ایک حقیقی انسانی طلب ہیں۔ مگر اس طلب کی تکمیل کی جگہ موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا ہے نہ کہ موت سے پہلے کی موجودہ دنیا۔

یہی واحد چیز ہے جو ہماری دنیا کی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ اس کے بعد موجودہ دنیا جدوجہد کی دنیا بن جاتی ہے اور اگلی دنیا جدوجہد کا انجام پانے کی دنیا۔ اس کے بعد آدمی اپنی وہ منزل پالیتا ہے جس کی طرف وہ مطمئن ہو کر بڑھ سکے۔ موجودہ دنیا کو منزل سمجھنے کی صورت میں آدمی بالآخر مایوسی اور انتشار ذہنی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچتا۔ جب کہ آخرت کی دنیا کو منزل سمجھنے کا عقیدہ اس کے سامنے ابدی سکون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو وہاں وہی نظریہ صحیح ہو سکتا ہے جو کھونے میں پانے کا راز بتا رہا ہو۔

کیسا عجیب

کرناٹک کے گورنر مسٹر گووند نرائن کی لڑکی نندنی کی عمر ابھی صرف ۳۸ سال تھی کہ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ کو نئی دہلی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ایک ہنستی ہوئی زندگی اچانک خاموش ہوگئی۔

نندنی بہت ذہین اور تندرست تھی۔ اس کی تعلیم خالص انگریزی طرز پر ہوئی۔ اس کے بعد اس نے امریکہ سے جرنلزم (صحافت) کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ہندستان ٹائمس میں سینیر رپورٹر تھی۔ اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے نندنی اپنے اخباری ساتھیوں کے درمیان بہت مقبول تھی۔ اس کے ایک ساتھی کے الفاظ میں نندنی کی زندگی کا نظریہ یہ تھا:

She loved life to the full and wanted to live it to the full

وہ زندگی سے آخری حد تک پیار کرتی تھی اور زندگی کے ساتھ آخری حد تک رہنا چاہتی تھی۔

نندنی کی وفات پر اس کے ساتھی رپورٹروں نے ایک یادداشت (ہندستان ٹائمس ۱۷ ستمبر ۱۹۸۱) شائع کی ہے۔ اس یادداشت کے خاتمہ پر وہ لکھتے ہیں ——— نندنی کی موت اس حقیقت کی ایک بے رحم یاددہانی ہے کہ ہر آدمی کا ایک بے حد مقرر وقت ہے:

It is a cruel reminder of the fact that there is a deadline for everyone.

کیسی عجیب بات ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی اچانک بجھ جاتی ہے۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ ایک لمحہ میں اس طرح ختم ہوجاتا ہے جیسے کہ وہ مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت تھا۔ حوصلوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ایک روح دفعتاً اس طرح منظر سے ہٹادی جاتی ہے جیسے اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

زندگی کس قدر بامعنی ہے۔ مگر اس کا انجام اس کو کس قدر بے معنی بنادیتا ہے۔ آدمی بظاہر کتنا آزاد ہے مگر موت کے سامنے وہ کتنا مجبور نظر آتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنا زیادہ عزیز رکھتا ہے، مگر قدرت کا فیصلہ اس کی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنی بے رحمی سے کچل دیتا ہے۔

آدمی اگر صرف اپنی موت کو یاد رکھے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔ کامیاب اجتماعی زندگی کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی اپنی حد کے اندر رہنے پر راضی ہوجائے اور موت بلاشبہ اس حقیقت کی سب سے بہتر معلم ہے۔

جب گاڑی پٹری سے اتر جائے

گاڑی چلنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مقررہ سڑک پر چل رہی ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ سڑک کے دائیں بائیں اتر کر کسی پگڈنڈی پر دوڑنے لگے۔ بظاہر گاڑی دونوں صورتوں میں چل رہی ہوگی۔ مگر گاڑی کا چلنا وہی چلنا ہے جب کہ وہ اپنی شاہراہ پر چل رہی ہو۔ اگر وہ شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر کے راستوں پر چلنے لگے تو یہ چلنا نہیں بلکہ صرف بھٹکنا ہوگا۔ اور بھٹکنے والی گاڑی کبھی اپنے مسافروں کو منزل پر نہیں پہنچاتی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دین کا ہے۔ دین کی بھی ایک شاہراہ ہے۔ اور اسی کے ساتھ شاہراہ کے دائیں بائیں بہت سی پگڈنڈیاں ہیں۔ دین کی گاڑی اگر اپنی شاہراہ سے اتر کر ادھر ادھر کے راستوں پر دوڑنے لگے تو بظاہر یہ بھی دینی سفر نظر آئے گا۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بھٹکنا ہوگا۔ کیونکہ دینی سفر کا مقصد اپنے آپ کو خدا تک پہنچانا ہے اور خدا کسی آدمی کو شاہراہ پر ملتا ہے نہ کہ ادھر ادھر کی پگڈنڈیوں پر۔

موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر دینی سرگرمیاں وجود میں آئی ہیں۔ مگر اکثر سرگرمیاں اطراف کے راستوں پر بھٹکنے والی سرگرمیاں ہیں نہ کہ شاہراہ ہدایت پر چلنے والی سرگرمیاں۔

ان سرگرمیوں میں سے کوئی ہے جس نے اسلام کی دعوت کو جنت کی بشارت کی بنیاد پر اٹھا رکھا ہے حالانکہ صحیح اسلامی دعوت وہ ہے جو جہنم سے ڈرانے کی بنیاد پر اٹھے۔ کوئی اسلام کے نام پر احتساب اغیار کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے حالاں کہ اسلام کا اصل رخ ہمیشہ احتساب خویش ہوتا ہے۔ کوئی ہے جس نے دین کی جزئیات کو اپنا مرکز و محور بنا رکھا ہے حالاں کہ دین کا مرکز و محور کلیاتی مسائل ہیں نہ کہ جزئیاتی مسائل۔

کوئی ملت کو دنیوی یا مادی مصائب سے بچانے کے نام پر اسلامی جہاد میں مصروف ہے۔ حالانکہ اسلامی جہاد صرف وہ ہے جو لوگوں کو آخرت کے مصائب سے بچانے کے لئے کیا جائے۔ کسی نے کسی "ظالم" اور کسی "کافر" کو ختم کرنے کے لئے ہنگامہ جاری رکھا ہے حالانکہ اسلام کی مہم وہ ہے جو ظلم اور کفر کے خلاف اٹھے نہ کہ ظالم اور کافر کے خلاف۔

جب چلتی ہوئی گاڑی پٹری سے اتر جائے تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ مگر دین کی گاڑی ہر ایک پٹری سے اتار کر دوڑا رہا ہے اور کسی کو اس کے ہولناک انجام کا احساس نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام گاڑی کے پٹری سے اترنے کا انجام فوراً سامنے آجاتا ہے اور دین کی گاڑی کو پٹری سے اتار کر دوڑانے کا انجام موت کے بعد آدمی کے سامنے آئے گا۔

عمل کے بغیر

آج کاغذ کی اتنی افراط ہے کہ جہاں بھی دیکھیں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ملے گا۔ مگر کاغذ کے ان ٹکڑوں کی کوئی قیمت نہیں۔ نوٹ بھی کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ مگر اس کی قیمت ہے۔ اس کی قیمت اتنی یقینی ہے کہ کوئی بھی آدمی اس پر شبہ نہیں کرتا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عام کاغذی ٹکڑے کی کسی نے ضمانت نہیں لی ہے جبکہ نوٹ کے پیچھے سرکاری بینک کی ضمانت ہے۔ ہر نوٹ پر سرکاری بینک کی یہ ضمانت ثبت ہوتی ہے کہ وہ اس کے پیش کرنے والے کو وہ رقم پوری پوری ادا کر دے گا جو اس پر چھپی ہوئی ہے۔ یہی ضمانت ہے جس نے نوٹ کے کاغذ کو لوگوں کے لئے قیمتی بنا دیا ہے۔

یہی معاملہ الفاظ کا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج جتنے الفاظ بولے جا رہے ہیں تاریخ کے کسی دور میں اتنے الفاظ نہیں بولے گئے۔ مگر ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ ان کے پیچھے اٹل ارادہ کی ضمانت شامل نہیں ہے۔ آپ سے ایک شخص وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کا فلاں کام کر دے گا۔ مگر جب آپ مقررہ وقت پر اس کی حمایت مانگتے ہیں تو وہ بہانہ کر دیتا ہے۔ آپ مذکورہ شخص کے پاس جو چیز لے کر گئے وہ اس کے بولے ہوئے الفاظ تھے۔ جب اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو گویا اس نے اپنے الفاظ کی قیمت ادا نہیں کی۔ اس نے الفاظ کا کاغذ تو دے دیا مگر جو عمل اس کاغذ کی قیمت تھا اس کو دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس کے بولے ہوئے الفاظ ردی کاغذ کے ٹکڑے تھے نہ کہ بینک کا جاری کیا ہوا نوٹ۔

آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ الفاظ کی سطح پر ہر آدمی بڑے بڑے الفاظ بول رہا ہے مگر اپنے الفاظ کی عملی قیمت دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ اسی طرح ردی کے پرزے بن کر رہ گئے ہیں جیسے پرزے گلی کوچوں میں ہر وقت پڑے رہتے ہیں اور ہر آدمی ان کو بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایک شخص مظلوموں کی حمایت میں بیانات اور تجویزوں کے انبار لگا رہا ہے مگر جب اس کے قریب کا ایک شخص اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میری مظلومیت پر میری مدد کرو تو وہ اس کو برف کی طرح بالکل سرد پاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی جو لفظ بول رہا تھا اس کے پیچھے اس کا حقیقی ارادہ شامل نہ تھا۔ وہ محض زبانی الفاظ تھے نہ کہ کوئی حقیقی فیصلہ۔ ایک شخص لوگوں کے سامنے شرافت اور تواضع کی تصویر بنا رہتا ہے مگر جب اس کی انا پر چوٹ لگتی ہے تو اچانک وہ حسد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی شرافت محض ظاہری تھی، وہ اس کی روح میں اتری ہوئی نہ تھی۔

زندگی کا اسٹیج

حیدر آباد کا واقعہ ہے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۱ کو مسٹر بی کے راما ریڈی (۹۰ سال) اور ان کی ۸۰ سالہ بیوی پھولا بائی رات کے وقت اپنے گھر واقع بنجارہ ہلز میں سو رہے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے گھر میں اس وقت صرف ان کا ملازم رامیا (۵۰ سال) تھا۔ رامیا نے عین نیند کی حالت میں کلہاڑی سے بوڑھے میاں بیوی پر حملہ کیا اور نہایت بے دردی کے ساتھ دونوں کو مار ڈالا۔ اس کے بعد رامیا نے بکس سے تقریباً ایک لاکھ روپے کے ہیرے اور زیورات نکالے اور رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکل گیا۔

راستہ چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں پولس کے دو آدمی رات کی ڈیوٹی میں پہرہ دے رہے تھے۔ ان کو شبہ ہوا چنانچہ انھوں نے رامیا کو پکڑ لیا۔ پوچھ گچھ اور ڈرانے دھمکانے کے بعد اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور چرایا ہوا مال پولس کے حوالے کر دیا۔ دونوں پولس کے آدمیوں نے رامیا کو اور اس سے برآمد شدہ مال کو لے جا کر تھانہ میں جمع کر دیا۔ ان کا نام شیخ محبوب اور ایس ایم رشید بتایا گیا ہے۔

محکمہ پولس کے افسران کے علم میں یہ واقعہ آیا تو وہ شیخ محبوب اور ایس ایم رشید کی کارکردگی اور دیانت داری سے بہت خوش ہوئے اس کے بعد دونوں کو نقد انعامات دئے گئے اور اسی کے ساتھ دونوں کو ترقی بھی دے دی گئی۔ شیخ محبوب کو اسٹیشن آفیسر کے عہدہ پر متعین کر دیا گیا اور ایس ایم رشید کو ہیڈ کانسٹبل بنا دیا گیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک واقعہ بیک وقت دو آدمیوں کے لئے دو معنی کا حامل ہوتا ہے۔ ایک واقعہ پیش آتا ہے مگر اسی ایک واقعہ سے ایک شخص کو کریڈٹ دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ڈسکریڈٹ کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو قاتل ثابت کر کے مجرم کے خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ایماندار اور فرض شناس ظاہر کر کے انعام کا مستحق بنا دیا جاتا ہے۔

دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں سب کی نوعیت یہی ہے۔ یہاں کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ یہاں کوئی شخص کسی کو نہ فائدہ پہنچا سکتا اور نہ نقصان۔ نہ کوئی کسی کو زندگی دے سکتا اور نہ موت۔ تاہم یہ سارے واقعات یہاں ایک یا دوسرے کے ہاتھ سے پیش آتے ہیں۔ دنیا ایک قسم کا خدائی اسٹیج ہے۔ یہاں مختلف حالات پیدا کر کے خدا ہر ایک کو یہ موقع دیتا ہے کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو وہ علی الاعلان ظاہر کر دے۔ جو شخص مجرمانہ ذہن لئے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات پا کر جرم کرے اور خدا کے قانون کے مطابق سزا کا مستحق ہو۔ جو شخص اپنے اندر حق پرستی کا ذہن لئے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات میں حق اور انصاف کا معاملہ کرے تاکہ وہ خدا کے یہاں انعام اور قدر افزائی کے لائق ٹھہرے۔

ظاہر فریب

ایر مارشل عبداللطیف ہوائی جہاز چلانے کا چالیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ۲۵ راگست ۱۹۸۱ کو انھوں نے روسی ساخت کا آواز سے تیز چلنے والا لڑاکا جہاز مگ ۲۵ آزمائشی طور پر اڑایا۔ آدھ گھنٹہ تک پرواز کرنے کے بعد انھوں نے جہاز کو نیچے اتارا۔ ایر مارشل جب ہوائی جہاز سے باہر آئے تو انھوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

The flight made even the Himalayas look small

ہماری پرواز کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی چھوٹا دکھائی دیتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اگست ۱۹۸۱)

آواز سے تیز رفتار جہاز ہمالیہ کے اوپر اڑانیں بھر رہا ہو تو اس وقت جہاز کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کو ہمالیہ واقعی حقیر دکھائی دیتا ہے، اور اپنی عظمت کا ایک عجیب احساس پیدا کرتا ہے مگر یہ غلط فہمی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ جہاز ہمالیہ کی کسی چوٹی سے ٹکرا جائے۔ چٹان کے معمولی ٹکراؤ سے بھی فی الفور جہاز میں آگ لگ جاتی ہے اور اچانک جہاز اور اس کا مسافر دونوں اس طرح راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

موجودہ دنیا میں کسی کو کوئی بڑائی ملتی ہے تو وہ بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ دنیا کی ہر بڑائی ایسی ہی ہے جیسے تیز رفتار ہوائی جہاز کے اوپر سے کسی آدمی کا پہاڑ کو دیکھنا۔ ایسے مسافر کو بظاہر اپنی سواری عظیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک خیالی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ حالات کا معمولی فرق بھی اس کو یہ بتانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

دنیا میں کسی چیز کو پانے کے لئے جن بے شمار اسباب کی موافقت ضروری ہے ان کی فراہمی کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام موافق اسباب کو یکجا کر کے کسی واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے۔ تاہم اس سارے معاملہ پر ظاہری اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا اعتراف کرلے۔ وہ بظاہر اپنی کوششوں سے پائے مگر اس کو خدا کی طرف سے آیا ہوا سمجھے۔ وہ بظاہر بڑا بنا ہوا ہو مگر اپنے کو چھوٹا یقین کرے۔ وہ بظاہر بلندی پر اڑ رہا ہو مگر اپنے کو پستی میں اترا ہوا محسوس کرے۔

آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری فریب سے گزر کر اصل حقیقت کو پالے، یہاں کی ہر بڑائی کو چھوٹی بڑائی سمجھے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس فریب کا پردہ پھاڑنے میں کامیاب ہوتے ہوں۔

ضمیر کے خلاف

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵ — ۱۸۸۹) نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ فلسطین پر یہودیوں کا بطور تاریخی وطن اپنا حق جتانا ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین قبائل کناڈا کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ یہودیوں نے نازیوں کے ظلم پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں مگر خود یہودی فلسطینی عربوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں وہ بالکل اسی قسم کا ہے جو نازیوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔

ٹائن بی نے اپنا یہ بیان کناڈا میں دیا تھا۔ اس وقت کناڈا میں حکومت اسرائیل کے سفیر مسٹر ہرزگ تھے۔ مسٹر ہرزگ نے برطانی مورخ کو دعوت دی کہ اس مسئلہ پر وہ اس سے مباحثہ کریں۔ آرنلڈ ٹائن بی نے اس کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد مانٹریل کی میک گل یونیورسٹی میں ایک تقریب ہوئی جس میں دونوں جمع ہوئے۔ مسٹر ہرزگ نے کہا: جرمن نازیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو مار ڈالا تھا۔ اس کے مقابلہ میں فلسطین میں جو عرب بے گھر ہوئے ہیں ان کی تعداد بہت معمولی ہے۔ ان دونوں کو ایک جیسا کس طرح کہا جا سکتا ہے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے جواب دیا کہ میں نے جب نازیوں اور اسرائیلیوں کے مظالم کو ایک جیسا کہا تھا تو اس سے مراد تعداد نہیں بلکہ جرم کی نوعیت تھی۔ کسی شخص کے لئے سو فی صد سے زیادہ برا ہونا ممکن نہیں۔ قاتل کہلانے کے لئے ایک شخص کو قتل کر دینا کافی ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ میرے الفاظ پر کیوں اس قدر بوکھلا اٹھے ہیں۔ میں نے وہی بات کہی ہے جو تم میں سے ہر ایک کا ضمیر کہہ رہا ہے۔

جب بھی آدمی کسی سچائی کی تردید کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ خود اپنی تردید کر رہا ہوتا ہے۔ سچائی ہمیشہ آدمی کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے مگر آدمی ضد، تعصب اور اپنی چھوٹی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر اس کو نہیں مانتا، وہ اپنے انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ بولتا ہے جن کے بارے میں خود اس کا دل گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔

آدمی کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا ساتھ نہ دے سکے۔ ضد اور تعصب اور مصلحت سے مغلوب ہو کر وہ ایسے رخ پر چلنے لگے جس کے متعلق اس کا اندرونی ضمیر آواز دے رہا ہو کہ وہ صحیح رخ نہیں ہے۔ یہ اپنی تردید آپ کرنا ہے یا اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں قتل کرنا ہے۔ یہ اپنے مجرم ہونے پر خود گواہ بننا ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ محرومی۔ مگر جب آدمی کی بے حسی بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنی محرومی کی ان کارروائیوں کو اپنی فتح سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہوتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو زندگی دے رہا ہوں۔

نفسیات کا دخل

جدید مغربی فکر یہ ہے کہ انسان اور دوسرے تمام حیوانات ارتقائی عمل کے ذریعہ وجود میں آئے ہیں۔ انیسویں صدی میں اس سلسلے میں مغرب کے سامنے دو مختلف نظریات آئے۔ ایک وہ جس کو فرانسیسی عالم لامارک (۱۸۲۹ - ۱۷۴۴) نے پیش کیا تھا۔ دوسرا وہ جس کو انگریزی عالم ڈارون (۱۸۸۲ — ۱۸۰۹) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مغرب میں ڈارون کے نظریہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور اس کے مقابلہ میں لامارک کے نظریہ کو ناقابل لحاظ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ لامارک کے نظریہ کے مقابلہ میں ڈارون کا نظریہ زیادہ طاقت ور یا زیادہ ثابت شدہ تھا۔ اس کی وجہ زیادہ تر نفسیاتی تھی۔ ڈارون کے نظریہ میں انیسویں صدی کے مغربی انسان کو نفسیاتی ملتی تھی جو جدید قوتوں سے مسلح ہو کر سارے عالم کو اپنی نوآبادی بنا دینا چاہتا تھا، جب کہ لامارک کے نظریہ میں یہ نفسیاتی تسکین موجود نہ تھی۔

لامارک اور ڈارون دونوں زندگی کو ایک ارتقائی واقعہ مانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ لامارک کا زور زیادہ تر وراثتی اوصاف پر ہے اور ڈارون کا زور تنازع للبقاء کے درمیان انتخاب فطری پر۔ یعنی لامارک کے نزدیک کسی ابتدائی نوع سے زیادہ ترقی یافتہ نوع اس طرح بنتی ہے کہ ایک فرد کے اکتسابی اوصاف وراثتی طور پر اگلی نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ یہ انتقال نسل در نسل عرصہ دراز تک جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک نوع بالآخر دوسری نوع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسری طرف ڈارون کے مطابق یہ ہوتا ہے کہ ایک حیوان کے کئی بچوں میں سے ایک بچہ پیدائشی طور پر کسی خصوصیت میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ بقائے حیات کی جدوجہد میں یہ اضافی خصوصیت والا حیوان باقی رہتا ہے اور دوسرے حیوانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی یہ اضافی خصوصیت توالد و تناسل کے ذریعہ اگلی نسلوں میں منتقل ہوتی ہے۔ اس طرح بقائے حیات کی جدوجہد کے دوران زیادہ صالح کا انتخاب ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ صالحیت نسل در نسل جمع ہوتے ہوتے ایک بالکل نئی نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

نظریات میں اکثر اوقات نفسیات کا دخل ہوتا ہے۔ آدمی ایک چیز کو اختیار کرتا ہے اور اس کو نظریاتی صداقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ حالاں کہ یہ محض اپنی برائی پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ اس نے اپنی خواہش کے تحت ایک چیز کو چھوڑا اور دوسری چیز کو لے لیا۔ مگر جب اس کی تشریح کرنے کا وقت آیا تو اس انداز میں اس کی تشریح کرنے لگا گویا کہ اس کو حق پا کر اس نے اسے اختیار کیا تھا۔

امتحان کا مقام

کالج میں امتحان ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوا۔ مگر اس نے امتحان کی کاپی پر کچھ نہیں لکھا۔ وہ بس بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور تین گھنٹہ گزار کر باہر چلا آیا۔ اس کے بعد وہ لائبریری میں گیا اور وہاں کتابوں کے درمیان بیٹھ کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیا۔ امتحان ہال میں اس نے اپنی کاپی سادہ چھوڑ دی تھی مگر لائبریری میں اس نے اپنی کاپی بھر ڈالی۔

آپ کہیں گے کہ یہ فرضی کہانی ہے۔ کوئی طالب علم اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ امتحان ہال میں پرچہ حل نہ کرے اور لائبریری میں بیٹھ کر کاپی بھرنے لگے۔ اور اگر یہ واقعہ سچا ہو تو یقیناً وہ کوئی ایسا طالب علم ہو گا جس کا دماغ صحیح نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کی حرکت کوئی پاگل طالب علم ہی کر سکتا ہے۔ مگر دنیا کے امتحان کے معاملہ میں جو بات لوگوں کو اتنی عجیب معلوم ہوتی ہے، آخرت کے معاملہ میں ہر شخص اسی طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ کالج کے ذمہ دار طلبہ کا امتحان جہاں لینا چاہتے ہیں وہ امتحان ہال ہے نہ کہ لائبریری۔ اسی طرح خدا کے بھی امتحان لینے کے مقامات ہیں۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا نے امتحان کے جو مقامات مقرر کئے ہیں وہاں لوگ امتحان میں پورا اترنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ دوسرے دوسرے مقامات پر خدا پرستی اور دین داری کا کمال دکھا رہے ہیں۔

خدا آدمی کے ایمان کا ثبوت دل کی انابت میں دیکھنا چاہتا ہے اور لوگ اپنے ایمان کا ثبوت کلمۂ ایمان کے مخارج میں دے رہے ہیں۔ خدا آدمی کی عبادت کو خشوع کے معیار پر جانچ رہا ہے اور لوگ مسائل کی پابندی میں اپنی عبادت گزاری کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ خدا لوگوں کے دین کو کردار اور معاملات کی سطح پر جانچ رہا ہے اور لوگ اشراق اور چاشت کے نفضائل میں اپنی دین داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی اپنے آپ پر خدا کی حکومت قائم کرنے والا بنے اور لوگ کسی خارجی شخص کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کر کے حکومت خداوندی کے قیام کا کریڈٹ لینے میں مصروف ہیں۔ خدا کسی آدمی کو جہاں مظلوموں کی حمایت کرنے والا دیکھنا چاہتا ہے وہ مظلوم فرد ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ظلم و فساد کے اجتماعی واقعات پر تقریریں اور بیانات پیش کر کے اپنے کو مظلوموں کا حامی ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی طالب کی وہ کاپی بالکل بے کار ہے جو امتحان ہال کے بجائے لائبریری میں بیٹھ کر بھری گئی ہو۔ کاش لوگ جانتے کہ ٹھیک اسی طرح وہ عمل بے حیثیت ہے جو خدا کے مطلوبہ مقام کے علاوہ کہیں اور پیش کیا گیا ہو۔

اسلامی تخریب کاری

ایک خبر پڑھئے: نائجیریا کی احمد و بیلو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں عرصہ سے شراب کی ایک کینٹین قائم تھی۔ یونیورسٹی کے "اسلام پسند" طلبہ اس کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر انتظامیہ اس کو نہیں مان رہی تھی۔ معاملہ اسی طرح ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ لڑکوں نے نوٹس دے دیا کہ شراب خانہ اگر ہال سے ہٹایا نہیں گیا تو وہ اس کو توڑ ڈالیں گے۔ یونیورسٹی کے حکام نے اس کے جواب میں کہا کہ جو لوگ ایسا کریں گے ان کو سخت نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ طلبہ اور انتظامیہ کی یہ کشمکش بالآخر ۵ مئی ۱۹۸۱ کو بھڑک اٹھی۔ طلبہ نے دھاوا بول کر شراب خانہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد انتظامیہ نے اس تخریبی کارروائی میں ملوث ۳۲ طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد اور آگ بھڑکی۔ طلبہ نے یونیورسٹی حکام کے "غیر اخلاقی رویہ" کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ یونیورسٹی کے در و دیوار کو اسلامی نعروں سے بھر دیا۔ اس واقعہ کے بعد یونیورسٹی کی دو طالبات نے قومی ترانہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے مطابق قومی ترانہ میں "خدا پرستی کے بجائے قوم پرستی کا ذکر ہے" اب حکومت نے مزید ۲۷ طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ اس ہنگامہ آرائی میں ہزاروں طلبہ کا تعلیمی نقصان ہوا اور مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔ (۷ اگست ۱۹۸۱)

عرب کے لوگ شراب پیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سالوں تک ان کو سمجھاتے رہے اور ان کے دل کو نرم کرتے رہے تاکہ وہ شراب کی برائی کو سمجھ جائیں اور خود اپنے ہاتھ سے شراب کے مٹکے توڑ ڈالیں۔ آج ان کے ماننے والے ان کے نام پر تخریب کاری کے ذریعہ شراب کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ اس کھلے ہوئے تضاد کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عین اسلام پر عمل کر رہے ہیں۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "شراب پینے والوں" کے پاس ایک دن بھی اس جذبہ سے نہیں گئے کہ ان کو دل سوزی اور خیر خواہی کے انداز میں سمجھائیں۔ ان کی ایک رات کی نیند بھی ان کے حق میں دعائیں کرنے میں خراب نہیں ہوئی۔ انھوں نے ایک بار بھی اس بات کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ فی الواقع اپنے بھائیوں کی گمراہی پر تڑپ رہے ہیں اور ان کے برے انجام کے غم میں ان کا یہ حال ہو رہا ہے گویا کہ وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ ان کا سارا شوق بس یہ ہے کہ لوگوں کے اوپر خدائی فوجدار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ وہ خدا کی نظر میں داعی اور مصلح بننا چاہتے ہیں حالانکہ انھوں نے ایک دن بھی دعوت اور اصلاح کا عمل نہیں کیا۔

اس قسم کی اسلامی تخریب کاری آج بہت بڑے پیمانہ پر مسلم دنیا میں جاری ہے۔ مگر ان چیزوں کا کوئی بھی تعلق اسلام سے نہیں۔ یہ سراسر لیڈری ہے۔ کچھ لوگ اِس نام پر لیڈری کے ہنگامے برپا کئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ اُس نام پر۔ کچھ لوگ ایک عنوان پر اپنے حریف کو نیچا دکھانے میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ دوسرے عنوان پر۔ جو لوگ اس تخریبی سیاست میں مصروف ہیں وہ بلاشبہ مجرم ہیں اور جو لوگ اس تخریب کاری کے حق میں اسلامی جواز پیش کر رہے ہیں وہ مجرموں کے لیڈر۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے۔ یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

... نظر ... ر حے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع

…. R. N. NO. 28822/76 ISSUE NO. 61
…. NO. D. (DN) 532 DECEMBER 1981

AL-RISALA MONTHLY

…MIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231